قدیم تاریخِ ہند
وی۔ اے۔ سمتھ
ترجمہ: پروفیسر محمد جمیل الرحمٰن جامعہ عثمانیہ
www.KitaboSunnat.com

قدیم تاریخِ ہند

وی۔ اے۔ سمتھ

ترجمہ : پروفیسر محمد جمیل الرحمٰن جامعہ عثمانیہ

علی پلازہ، 3۔ مزنگ روڈ، لاہور، فون : 7238014

Email: takhleeqat@yahoo.com

ناشر	تخلیقات' لاہور
زیر نگرانی	لیاقت علی
سن اشاعت	2001ء
کمپوزنگ	آزاد کمپوزنگ سنٹر: لاہور 7597988
پرنٹرز	اُجالا پرنٹرز' لاہور
ٹائٹل	خواجہ افضل
قیمت	300 روپے

ضخامت : 588

فہرست

❖❖❖

پیش لفظ

ہندوستان کو تاریخی' سماجی' ادبی یا حتیٰ کہ جغرافیائی لحاظ سے بھی ایک "وحدت" قرار دینا مشکل ہے۔ جس طرح آج ہم برصغیر میں بیٹھ کر مغرب' یورپ' وسط ایشیاء یا عرب جیسی اصطلاحات میں قطعی مختلف اقوام و تہذیبوں کو اکٹھا کر دیتے ہیں اُسی طرح یونانیوں اور یورپیوں نے ہندوستان کو "ایک" قرار دیا۔ اِس خطے کی تاریخ کے ابتدائی ترین ماخذ یونانی سیاحوں کے سفرنامے ہیں۔ اُن کے بعد چینی اور پھر عرب سیاح کچھ حوالوں سے مواد فراہم کرتے ہیں۔۔ قدیم ہندوستان میں باقاعدہ تاریخ نویسی یا ریکارڈ رکھنے کا رجحان نہیں تھا۔ اگر مندروں اور درباروں میں کچھ ریکارڈ موجود بھی تھے تو وہ ضرور بت شکنوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہوں گے۔ اسی لیے آج ہم اپنی تاریخ کو غیروں کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ بلکہ منظر دکھانے والے بھی مصنف کتاب ہذا جیسے "غیر" ہیں۔۔ کننگھم' ٹاڈ' مارشل' ایلفنسٹن' ٹی۔ ایس روز اور وی اے سمتھ کی قبیل کے دیگر انگریز محققین نے اپنی ذاتی لگن اور جستجو کے ذریعہ ہندوستان کو اُس کا قدیم روپ دکھایا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے گوشوں کو بھی اُجاگر کیا جنہیں کسی دیسی شخص کی نظر محض عام بات ہونے کی بناء پر نظرانداز کر جاتی۔

شمال کا ہندوستان ہمیشہ سے بیرونی اقوام کے لائے ہوئے انقلابات کی تماشہ گاہ بنا رہا۔ جنوب نے اِن تبدیلیوں کا اثر زیادہ قبول نہیں کیا۔ اسی لیے ہمیں قدیم رزمیہ داستانوں اور لوک ادب میں بھی شمال اور جنوب کا فرق واضح دکھائی دیتا ہے۔۔۔ مثلاً شمالی لوگ آریاؤں کے نمائندہ رام (سفید) کے پیروکار بنے جبکہ جنوبی باشندے کرشن (کالا) کو پوجتے رہے۔ اِن کے اعتقادات' رسوم اور تاریخ میں بھی واضح فرق ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی تالیف کے زمانے تک یونانی و چینی سیاحوں کی تحریروں پر تو کافی کام ہو چکا تھا مگر موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیبوں پر خاطرخواہ کام نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا شمال کی تاریخ و تہذیب بھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوئی تھی' جنوب کی بات تو دور کی ہے۔ خود مصنف نے بھی اِس کی کا ذکر جا بجا کیا۔ ہم اس کتاب کو شمالی "ہند" کی ایسی تاریخ قرار دے

سکتے ہیں جو غیر ملکی سیاحوں اور زائرین کے حوالوں کی مدد سے لکھی گئی۔ مصنف اپنے اِس مقصد میں کامیاب رہا ہے کہ "جس حد تک ممکن ہو ہندوستان قدیم کی تاریخ ایک مسلسل بیان کی صورت میں ناظرین کے سامنے پیش کر دے اور یہ بیان تا حد امکان صرف محقق اور معتبر ثبوت پر مبنی ہو۔" کسی بھی خطے کی تاریخ اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب اُس کے مختلف زمانوں کو مذہبی' تہذیبی سیاسی اور ادبی پس منظر میں پیش کیا جا سکے۔ لیکن ہندوستان نامی خطے کی تاریخ زیادہ تر بیرونی حملوں کے بیان کے طور پر ہی لکھی گئی۔ یہاں کے ادب پر خاطر خواہ کام کے بعد اب اِس کے دیگر مذہبی و ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا بھی ممکن ہو گیا ہے۔ لیکن "قدیم تاریخ ہند" جیسی کتب کی اہمیت ہمیشہ رہی کیونکہ یہ ہمیں اپنی تاریخ کو سمجھنے اور دیکھنے کا ایک سائنسی انداز مہیا کرتی ہیں۔ مصنف نے کتاب کے آخر میں اُمید ظاہر کی ہے کہ "میرے بعد کے علماء اُن مقامات سے' جہاں ہر قدم پر میرا پیر پھسلتا تھا اور لغزش پیدا ہوتی تھی' نہایت اطمینان قلب کے ساتھ گزریں گے۔"

"قدیم تاریخ ہند" اکیسویں صدی میں متعدد حوالوں سے اہم ہے: اول' یہ بنیادی تاریخی حوالوں کو ایک عہد بہ عہد سلسلے میں پیش کرتی ہے۔ دوم' اِس میں عیسوی دور کے پہلے ایک ہزار سال کے ہندوستان کے بارے میں کافی مواد موجود ہے جو پہلے تاریکی میں کھوئے ہوئے تھے۔ سوم' مصنف کی استعمال کردہ حوالہ جاتی کتب مزید تحقیق کی راہ کھولتی ہیں۔ چہارم' اس کے ذریعہ سے ہمارے ذہن میں قدیم ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک واضح خاکہ تشکیل پاتا ہے۔ پنجم' یہ رومانی و جذباتی خیالات کی بجائے مستند ماخذوں پر مبنی ہونے کے باعث حقیقی معنی میں ایک "تاریخ کی کتاب" ہے۔ اور آخری اہمیت کا نکتہ خود مصنف کے الفاظ میں:---"اِس (کتاب) کے وجود سے وقت و سنہ کے لحاظ سے مزید دلچسپ کتابوں کو لکھا جانا ممکن ہو گا۔"

ایک دو کوتاہیوں یا غلطیوں کا ذکر بھی کر دینا چاہیے۔ شمالی ہند میں بدھ مت کے پھیلنے اور ختم ہونے کی وجوہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ سماجی ساخت کے حوالے سے بھی گفتگو ناکافی ہے۔ ویدانتی مفکرین اور بھگتی تحریک کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ایک دو جگہوں پر "انگریزی راج کی برکتوں کے اثر" کی بات کی گئی جو غیر ضروری تھی۔

راقم الحروف نے کتاب کی پروف ریڈنگ کے دوران ترجمہ کے کچھ نقائص درست کرنے کے علاوہ (اپنی دانست کے مطابق) مقامات اور شخصیات کے متعدد ناموں کا تلفظ بھی صحیح کرنے کی کوشش کی۔

یاسر جواد

لاہور 2001ء

پہلا باب

1۔ مقدمہ

ہندوؤں کے زمانے کی تاریخ پر ایلفنسٹن اور کاول کی رائے

فاضل مورخ ایلفنسٹن نے اپنی تاریخ ہند مطبوعہ 1839ء میں لکھا تھا کہ "سکندر اعظم کے ہندوستان پر حملے سے پہلے کسی واقعے کی تاریخ کا تعین ناممکن ہے اور مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر کی کوئی مسلسل تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔" اس کے ستائیس برس بعد پروفیسر کاول نے ایلفنسٹن کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے اپنے ناظرین کو متنبہ کر دیا تھا کہ یہ قول ہندوؤں کے زمانے کی تاریخ کے دوران ہمیشہ پیش نظر رکھیں' اور اس تنبیہہ کی وجہ اُس نے یہ قرار دی تھی کہ "صرف اسی وقت' جبکہ بیرونی اقوام ہندوؤں سے ملی ہیں' ہم قدرے یقین کے ساتھ کسی واقعے کی تشریح اور تعین کر سکتے ہیں۔"

ایلفنسٹن کے قول کے پہلے حصے کو اگر ہم اب نہایت سختی سے جانچیں تو وہ اب بھی درست نکلے گا' کیونکہ اس وقت بھی سکندر اعظم کے حملے سے پہلے کے کسی واقعے کی تاریخ کا تعین ناممکن ہے۔ مگر اس قول میں موجودہ تحقیقات کی وجہ سے بہت کچھ ضعف آگیا ہے اور سکندر کے زمانے سے قبل کے بہت سے واقعات تقریباً اس قدر صحت کے ساتھ معلوم ہو چکے ہیں جتنا کہ عام طور سے ضرورت پڑتی ہے۔

موجودہ تحقیقات کے نتائج

لیکن جب ہم اس قول کے دوسرے حصے کو کہ مسلمانوں کے حملے اور فتح ہند سے پہلے کی کوئی مسلسل تاریخ نہیں لکھی جا سکتی' تاریخ ہند کی موجودہ معلومات سے جانچیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ گذشتہ ستر سال کے عرصے میں اس گم شدہ تاریخ کے متعلق ہم کو بہت کچھ معلومات حاصل

ہو گئی ہیں۔ مختلف عالموں کی تحقیقات نے' جو انہوں نے مختلف علوم میں کیں' ہمارے سامنے تاریخ ہند کے اس قدر مواد کو ظاہر کر دیا ہے جس کی بالکل توقع نہ تھی اور اس مواد سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ زمانہ قدیم کی تاریخ ہند لکھی جا سکے۔ تمام ضروری ابتدائی مرحلے اس قدر طے ہو چکے ہیں کہ یہ روز افزوں مواد جو فراہم ہوا ہے اس کو مہذب اور مدون کر سکتے ہیں۔ اب یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ محققین نے زمانہ قدیم کے مطالعے سے جو نتائج نکالے ہیں ان کو ایک مسلسل بیان کی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ یہ عام قارئین کے لیے اتنا ہی صاف اور قابل فہم ہو گا جتنی ایلفنسٹن کی مسلمانوں کے زمانے کی تاریخ ہند ہو سکتی ہے۔

سیاسی تاریخ

اس کتاب کی طبع اول میں پہلی مرتبہ یہ کوشش کی گئی تھی کہ اٹھارہ سو برس کی تاریخ ہند کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس وقت بھی اگرچہ اس کتاب میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے مگر یہ کوشش صرف سیاسی واقعات اور تغیر و تبدل بیان کر دینے تک ہی محدود ہے۔ ہندوستان کی مذہبی' ادبی اور فنون لطیفہ کی تاریخ لکھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم شاہی خاندانوں کی تاریخ عزل و نسب سے کماحقہ واقف ہو جائیں۔ اگرچہ اس کتاب میں ہندوستان کے مذہب' علم' ادب اور فنون لطیفہ کی طرف صرف اشارہ ہی کیا گیا ہے' مگر کتب کے جو حوالے ضمناً دیئے گئے ہیں وہ شاید قارئین کو یہ باور کرانے کے لیے کافی ہوں کہ ان سب کے لیے مختلف خاندانوں کی تاریخ کا تعین نہایت ضروری ہے۔

مشرق و مغرب

یورپ کے وہ عالم جن کی تمام تر توجہ اس بات کی طرف رہی ہے کہ موجودہ ترقی و تہذیب کی بنیاد یونانی رومی تہذیب ہے' شاید جرمن فلسفی کے اس قول کو ماننے کے لیے تیار ہوں کہ "چینی' مصری اور ہندی آثار قدیمہ کسی حالت میں بھی عجائبات سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔" مگر یہ خیال گوئٹے کے زمانے میں خواہ کتنا ہی صحیح تسلیم کیا جائے لیکن اس زمانے میں کسی طرح مسلمہ تسلیم نہیں ہو سکتا۔ گذشتہ سو سال کے اندر مستشرقین کی علمی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ مشرق قدیم اور مغرب موجودہ میں بہت کچھ تعلق ہے' اور اس وقت یونانی علوم کا کوئی ماہر مصری اور بابلی تہذیب سے بالکل ناواقفیت ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ یہی دونوں عناصر ہیں جن پر موجودہ یورپ کے تمام آئین و قوانین مبنی ہیں۔ یہاں تک کہ چین کا تعلق بھی یورپ سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک کی زبانوں' علم و ادب اور فلسفے کا تعلق ہندوستان کے ساتھ بے

شمار امور سے ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ زمانہ حال میں ہندوستان کے بڑے طاقتور بادشاہوں کے ناموں سے بھی عام ناظرین ناواقف ہیں اور ان سے صرف وہی لوگ حظ اُٹھاتے ہیں جو اس علم کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کر چکے ہیں' لیکن یہ بات کچھ بعید از قیاس نہیں کہ اگر ہندوستان قدیم کے جو حالات دریافت ہو چکے ہیں ان کو یکجا کر کے مرتب کر دیا جائے تو وہ ان مخصوص علماء کے علاوہ ناظرین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ اور جس طرح رفتہ رفتہ لوگ اس مضمون سے زیادہ تر مانوس اور آشنا ہوتے جائیں گے اسی طرح معلوم ہوتا جائے گا کہ یہ بھی اس قدر توجہ اور فکر و غور چاہتا ہے جیسے اور تاریخی علوم کے لیے ضرورت ہے۔ زمانہ حال کے ایک ہندوستانی مصنف نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "دنیا میں ہندوستان کی بے قدری کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہندیوں نے کوئی بڑا نمایاں کام انجام نہیں دیا' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام کاموں سے جو ہندیوں نے کیے ہیں دنیا بالکل ناواقف اور نابلد ہے۔"[1] اس کتاب کے صفحات شاید یہ ثابت کر سکیں کہ قدیم ہند کے لوگوں نے بھی ایسے کام کیے ہیں جو اس قابل ہیں کہ ان کو یاد رکھا جائے اور فراموشی اور نسیان کے ان گہرے غاروں سے ان کو پھر نکالا جائے جن میں وہ صدیوں سے دبے پڑے ہیں۔

سکندر اعظم

اس کتاب کا وہ حصہ جو سکندر اعظم کے حملے سے متعلق ہے شاید ان ناظرین کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث ہو گا جن کی توجہ تمام تر یونانی اور رومی مضامین پر مبذول رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو زیادہ شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں سکندر کے اس عجیب و غریب حملے کے متعلق جتنے تذکرے اب تک شائع ہوئے ہیں (اور ان میں سے تھرلول کا بیان شاید سب سے اچھا ہے) وہ عام طور پر اس قصے کو تاریخ یونان کے ضمیمے کے طور پر بیان کرتے ہیں نہ کہ تاریخ ہند کا ایک حصہ سمجھ کر۔ اسی وجہ سے وہ موجودہ جغرافیہ دانوں اور آثار قدیمہ کے عالموں کی تحقیقات سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس کتاب میں یہ تمام حملہ تاریخ ہند کا ایک مشہور و معروف اور قابل یادگار فسانہ سمجھ کے لکھا گیا اور کوشش کی گئی ہے کہ جدید تحقیقات کی پوری روشنی کو جمع کر کے قدیم مصنفوں کے بیانات پر ڈالا جائے۔

مصنف کا مقصد

اس کتاب میں مصنف کا مقصد یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو ہندوستان قدیم کی تاریخ ایک [illegible] بیان کی صورت میں ناظرین کے سامنے پیش کر دے اور یہ بیان تا حد امکان صرف محقق [illegible] ہو۔ تمام واقعات جو کسی طرح ثابت ہو چکے ہیں [illegible] رعایت ان کو مدون

کردے اور تاریخی مسائل پر منصفانہ بحث کرے۔ اس نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے گوئٹے کے مندرجہ ذیل قول پر عمل کرے: "مورخ کا فرض یہ ہے کہ سچ کو جھوٹ سے، صحیح کو غلط سے اور مشکوک کو غیر مشکوک سے الگ کردے۔ ہر ایک محقق کو چاہیے کہ ہر وقت اس بات کو پیش نظر رکھے کہ اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جو حکم مقرر کیا گیا ہو۔ اس کا صرف یہ کام ہے کہ وہ شہادت کی صراحت اور تکمیل پر غور کرے اور اس کے بعد نتیجہ نکال کے اپنی رائے دے اور یہ نہ سوچے کہ اس کی رائے صدر (فورمین) کی رائے کے موافق ہے یا نہیں۔"[1]

اگر اس اصول کی پابندی التزام سے کی جائے تو ضرور تمام روایات کے مقابلے میں محض بے سرد پا افسانوں اور کہاوتوں سے قطعی انکار کرنا پڑتا ہے اور بہت سی دلکش نقلیں اور حکایتیں رد کرنی پڑتی ہیں جو ہندوستان کے بزرگوں کی طرف سے منسوب ہیں۔

روایات کی قدر و قیمت

ہر قدیم قوم کے مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان روایات پر زیادہ بھروسہ کرے جو عام طور سے اس کے ادبیات میں جابجا پائی جاتی ہیں، اور یہ تسلیم کرلے کہ جب کبھی اس کی تحقیقات کے نتائج ان قومی روایات پر مبنی ہوں تو وہ بہرحال اس قدر قابل یقین نہ ہوں گے جتنا کہ اس زمانے کے تاریخی واقعات جس کے بارے میں ہمعصر لوگوں کی شہادت دستیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان بیانات پر، جو مذکورہ واقعات کے بہت بعد کی تاریخ کے لکھے ہوئے ہوں، ایک تنقیدی نظر ڈالنے سے یہ شہادت بہم پہنچ سکتی ہے کہ وہ بیانات روایتی طور پر چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح کے ہیں۔

تنقید کی ضرورت

ہمعصر شہادت جب کبھی وہ مابعد کے زمانے کے لیے دستیاب ہو بھی جائے تو بغیر تنقید و تنقیح قابل تسلیم نہیں ہوتی۔ درباریوں کی خوشامد خود بادشاہوں کی خود بینی اور خود نمائی اور اسی قسم کے اور دیگر اسباب سچائی پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ ان کو جانچنا اور ان سے خبردار رہنا چاہیے۔ علاوہ بریں کسی مورخ کے لیے خواہ وہ مضمون کی اہمیت کو کتنا ہی سمجھ کر لکھنے کی کوشش کرے یہ ناممکن ہے کہ وہ ذاتی خصوصیات کو بالکل معدوم کردے۔ ہر قسم کی شہادت، خواہ وہ کیسی ہی بلاواسطہ کیوں نہ ہو، جب دنیا کے سامنے ایک بیان کی صورت میں آئے گی تو وہ لکھنے والے کے دماغ کا محض ایک عکس ہوگی، اور یہ ممکن ہے نادانستہ اس میں فرق ہو گیا ہو۔ اس کتاب میں مصنف نے کوشش کی کہ جہاں تک ممکن ہو تحکم کے عنصر کو دور رکھے اور کسی واقعے کو بغیر حوالے

اور سند کے بیان نہ کرے اور ساتھ ہی ہر واقعے کے لیے اپنی سند میں ذاتی تحقیق یا شہادت کا ذکر بھی کردے۔

مگر اس لفظ کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے کسی سند کو قبول کرنا ضروری نہیں مانا گیا۔ کتاب کے بیانات بسا اوقات ایسی صورت اختیار کرلیتے ہیں جو بظاہر شہادت کے اعتبار سے صحیح ہوتے ہیں' خواہ وہ مشہور مصنفوں کی اس رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں جو ان کی کتابوں میں درج ہے۔ تاریخ ہند ایک مدت سے وہم اور قیاس کا تختہ مشق رہی ہے اور کبھی کبھی ناکافی تنقید سے شہادت اور واقعات کی جانچ بھی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے گوئٹے کے موافق صدر حکم (فورمین) کی رائے ضمناً قابل تسلیم نہیں ہے۔

ہندوستان کا اتحاد

اگرچہ بظاہر اس کتاب کا منشاء ہندوستان کی قدیم تاریخ کو بیان کرنا ہے مگر اس عنوان کو ایک حد تک معناً محدود سمجھنا چاہیے۔ ہندوستان فی الواقع پہاڑوں اور سمندروں سے گھرا ہوا ہے اور اس طرح جغرافیائی لحاظ سے وہ بلاشک و شبہ ایک جداگانہ ملک ہے اور بالکل صحیح طور پر اس کا ایک ہی نام رکھا گیا ہے۔ اس کی تہذیب بھی بعض صورتوں میں ایسی ہے جو دنیا کے دوسرے حصوں کی تہذیب سے بالکل مختلف ہے۔ پھر بھی وہ صورتیں تمام ملک یا اس چھوٹے براعظم میں اس طرح پائی جاتی ہیں کہ اس کو کلیتہ "ایک ملک مان کر انسان کی معاشرتی مذہبی اور عقلی ترقی میں اس کو شریک قرار دیں۔

مگر ہندوستان کا کامل سیاسی اتحاد' جس میں کہ صرف ایک طاقت بلا شرکت غیرے تمام ملک پر حکمرانی کرتی ہو' کل کی بات ہے اور دراصل صرف ایک ہی صدی اس حالت کی گذری ہے۔ زمانہ قدیم میں ہندوستان کے تمام مشہور بادشاہوں کو اس بات کی امنگ تو ضرور رہی کہ تمام ملک کو اپنے زیر نگیں کرلیں اور ان میں سے چند ایک حد تک اپنی اس آرزو میں کامیاب بھی ہوئے مگر کامل طور پر ایک بھی ایسا نہ ہوا کہ تمام ملک پر حکمرانی کرتا' اور یہی ناکامیابی اس سیاسی اتحاد کی کمی کا باعث ہوئی جس نے مورخ کے کام کو اور بھی زیادہ مشکل کردیا۔

یہی مشکل یونان کے مورخ کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ لیکن اس ملک میں جونہی اتحاد حاصل ہوگیا تاریخی دلچسپی قطعی طور پر جاتی رہی۔ ہندوستان کے متعلق تمام صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے اور ناظرین کی دلچسپی اس سیاسی اتحاد کے قائم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کی تفصیل ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر اس وقت جبکہ اس تفصیل کا تمام ملک پر بالعموم اطلاق ہوسکے۔

غالب و مشہور شاہی خاندان

ہندوستان کی سیاسی تاریخ کو دلچسپ بنانے کی صرف یہی صورت ہے کہ اس میں ملک کے غالب اور مشہور خاندانوں کا ذکر کیا جائے اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حالات کو یا تو بالکل نظرانداز کر دیا جائے یا کم از کم ان کو بڑے خاندانوں کے حالات کے بعد جگہ دی جائے۔ ایلفنسٹن نے اسی اصول پر کام کیا اور عملی طور پر اپنی تاریخ میں صرف سلاطین دہلی اور ان کے مغل جانشینوں کے حالات درج کیے۔ یہی اصول اس کتاب میں بھی اختیار کیا گیا ہے اور تمام توجہ ان غالب خاندانوں پر ختم کر دی گئی ہے جنھوں نے وقتاً فوقتاً تمام ملک پر حکمرانی کرنے کی کوشش کی یا حکمراں ہو گئے۔

ان تمام صدیوں کے دوران میں، جن کا ذکر اس تاریخ میں آئے گا، دو مرتبہ ایسا ہوا کہ ہندوستان کی سیاسی یگانگت تقریباً کامل ہو گئی۔ اول مرتبہ راجا اشوک کے زمانے میں یعنی تیسری صدی قبل مسیح میں جبکہ اس کی سلطنت تقریباً مدراس کے عرض بلد تک پہنچ گئی تھی، اور دوسرے چوتھی صدی عیسوی میں جب سمدرگپت نے اپنی فتوحات کو دریائے گنگا سے لے کر تامل قوم تک وسیع کیا۔ ان کے علاوہ دوسرے بادشاہوں کی فتوحات اس قدر وسیع نہ تھیں، مگر وہ اس آرزو میں کامیاب ہو گئے کہ ایسی سلطنت قائم کر لیں اور ایک مدت تک اس کو برقرار رکھیں جو ملک کی سب سے زبردست سلطنت کہلا سکے۔ ایسے ہی خاندانوں کی تاریخ لکھنا اس کتاب کا پہلا مقصد ہے۔ ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حالات یا تو نہایت اختصار سے بیان ہوئے ہیں یا قطعاً نظرانداز کر دیے گئے ہیں۔

شمالی ہند کی عظمت

ایسی زبردست سلطنت جب کبھی ہندوستان میں قائم ہوئی تو اس کا مستقر ہمیشہ شمالی ہند ہی رہا۔ یعنی دریائے گنگا کا وہ میدان جو ان جنگلوں سے گھرے ہوئے پہاڑوں کے شمال میں واقع ہے جو دکن اور ہندوستان میں حد فاصل ہیں۔ یہ قدرتی سلسلہ کوہ بندھیاچل اپنے وسیع معنے کے لحاظ سے ہے۔ یا اور زیادہ اختصار کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ حد دریائے نربدا ہے جو خلیج کھمبایت میں گرتا ہے اور ست پڑا اور بندھیاچل پہاڑوں کے درمیان بہتا ہے۔[5]

دکن کی تاریخ قدیم

ڈاکٹر فلیٹ' پروفیسر کیلہارن اور دوسرے سنجیدہ علماء کی تحقیقات نے چھٹی صدی عیسوی کی تاریخ دکن یعنی دریائے نربدا اور دریائے کرشنا اور تنگبدرا کے درمیانی علاقے کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ منکشف کر دیا ہے۔ مگر یہ تمام تفصیلات زیادہ طور پر محض مقامی دلچسپی کا باعث ہیں اور بیرونی دنیا کی توجہ کسی طرح بھی اپنی طرف اس قدر مبذول نہیں کرا سکتیں جتنی کہ شمالی ہند کی سلطنتیں' جن کے تعلقات ہمیشہ بیرونی ممالک سے رہے ہیں۔

انتہائے جنوبی ہند کی بے تعلقی

جنوب بعید کی قدیم سلطنتیں جن میں دراوڑی قوم کے لوگ آباد تھے' اگرچہ دولتمندی' آبادی اور تہذیب کے لحاظ سے ہر شمالی آریا حریف سلطنتوں کے ہم پلہ تھیں' مگر عام طور پر باقی مہذب دنیا سے (جس میں کہ شمالی ہند بھی شامل ہے۔) اس قدر علیحدہ تھیں کہ ان کے معاملات و واقعات دوسری قوموں کی نظروں سے بالکل پوشیدہ رہے۔ اور کیونکہ خود ان کے ہاں کوئی مورخ پیدا نہ ہوا اس لیے ان کی 900ء سے پہلے کی تاریخ بالکل ناپید ہو گئی ہے۔ صرف اس وقت جبکہ شمال کے کسی دلیر اور عالی ہمت بادشاہ نے یا تو جنگلات کی حد فاصل کو قطع کیا یا اس کے گرد ہو کر جنوب پر حملہ کیا' صرف ایک لحظہ کے لیے جنوبی بادشاہوں پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور ان کی ناپید ہستی کو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ ورنہ اس کے علاوہ 600ق م سے لے کر 900ء تک کے جنوب کے تمام سیاسی واقعات بالکل صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ یہاں ایلفنسٹن کا قول صادق آتا ہے کہ جنوبی ہند کی کوئی مسلسل تاریخ لکھنا ناممکن ہے۔ اور اسی وجہ سے مجبوراً تاریخ قدیم سے مراد صرف شمالی ہند کی تاریخ ہو سکتی ہے۔

تاریخ میں غیر آریہ عنصر

اگرچہ نو برس گزرنے کے بعد بھی یہ کہنا ایسا ہی درست ہے جیسا کہ اس وقت تھا جبکہ یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی کہ 900ء سے قبل کے جنوبی ہند کی تامل سلطنتوں کی تاریخ تکمیل اور صحت کے ساتھ لکھنا اس وقت بالکل ناممکن ہے اور غالباً ایسی تاریخ بالکل نہیں لکھی جا سکتی۔ مگر میرے لکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ جنوبی ہند کی قدیم تاریخ بالکل ناممکن الحصول یا دلچسپی سے قطعاً معرا ہے۔ بخلاف اس کے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہم سنین کی صحت کے خیال کو دل سے نکال دیں تو اس وقت بھی مواد موجود ہے کہ ہم دراوڑی اقوام کے آئین و قوانین کی تاریخ ایک حد تک

مرتب کرسکیں اور اگر وہ علماء جو ان تامل اقوام کے ادبیات ' زبان اور رواج سے کماحقہ واقف ہیں ایسی تاریخ مرتب کرلیں تو یقیناً ہندوستان کے مورخ کے لیے وہ نہایت ہی ضروری اور اہم خدمت انجام دیں گے اور اس سے ہندوستانی تہذیب کا مطالعہ کرنے والے کے لیے آسان ہو جائے گا کہ وہ اس تمام مضمون کو اس کی اصلی ہیئت میں دیکھ سکے۔

ایک مدت سے تمام توجہ شمالی ہند کی سنسکرت کی کتابوں اور ہندی آریہ خیالات پر صرف ہوئی ہے۔ مگر اب وقت آگیا ہے کہ ہم غیر آریہ عناصر پر بھی نظر و غور کریں۔ کیونکہ یہ کتاب صرف ہندوستان کی سیاسی تاریخ کو مجملاً "بیان کرنے کے لیے مخصوص کردی گئی ہے' اس لیے میں اس تحقیق میں شریک نہیں ہو سکتا۔ مگر میں ایک ہندوستانی عالم کے ذیل کے بیان کو درج کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس کی قبل از وقت وفات نے اس کی تمام امنگوں کو ختم کردیا۔ یہ بیان اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔

اصل ہندوستان جنوب میں ہے!

"ہندوستان کی تہذیب کے بنیادی عناصر کو سنسکرت زبان اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم کرنے کی کوشش کرنا کسی مسئلے کو حل کرنے کی بدترین صورت اختیار کرنا ہے۔ حقیقی اور اصلی ہندوستان اس وقت تک بندھیاچل کے جنوب میں جزیرہ نما ہند کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں اس وقت تک لوگوں کے خط و خال آریوں کے آنے سے پہلے کے زمانے کے ہیں۔ ان کی زبانیں آریہ زبانوں سے اور ان کے آئین و قوانین آریہ آئین و قوانین سے قدیم تر ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہاں بھی آریائی تاثرات اس حد تک اپنا کام کرچکے ہیں کہ مورخ کے لیے مشکل ہے کہ موجودہ تہذیب کی بناوٹ میں اندرونی و بیرونی تانے بانے کی تفریق کرسکے۔ لیکن اگر کسی مقام میں ممکن ہے کہ اس تانے بانے کو کامیابی کے ساتھ جدا کردیا جائے تو اس کا امکان صرف جنوبی ہند ہی میں ہو سکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم جوں جوں جنوب کی طرف بڑھتے جائیں یہ زیادہ ممکن ہوتا جائے گا۔

"پس تاریخ ہند کے محقق کو اپنی تحقیقات کا آغاز کرشنا۔ کاویری اور ویگائی کی وادیوں سے کرنا چاہیے نہ کہ دریائے گنگا کے میدانوں سے جس کا کہ ایک مدت سے دستور ہو گیا ہے۔"[1]

جب ہندوستان قدیم کی اصلی تاریخ لکھی جائے گی' جس میں نہ صرف سیاسی تغیر و تبدل مذکور ہوں بلکہ آئین و قوانین کا بھی ذکر ہو تو اس وقت یہ ممکن ہو گا کہ فاضل پروفیسر کی رائے پر عمل کیا جائے۔ اس وقت ضرور مورخ جنوبی ہند کے حالات سے اپنی کتاب کو شروع کرے گا مگر ابھی تک وقت نہیں آیا کہ ایسا انقلابی طرز تحریر اختیار کیا جائے۔ فی الحال میں پرانے ہی قاعدے کا

پابند رہنا پسند کرتا ہوں۔

اس کتاب کا مطمع نظر

لہٰذا اس کتاب کی اصل غایت یہ ہے کہ شمالی ہند کے غالب شاہی خاندانوں کے حالات کو مسلسل بیان کی صورت میں ناظرین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ جنوبی سلطنتوں کی تاریخ اتنی زیادہ معلوم نہیں ہے کہ وہ شمالی ہند کی تاریخ کی طرح لکھی جا سکے۔ اس لیے اس کو کم جگہ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار چھوٹی ریاستیں جو ملک کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی تھیں کسی صورت سے اس قدر تاریخی دلچسپی نہیں رکھتیں کہ ان کے حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ چودھویں باب میں ناظرین کو ایک مختصر سا بیان ملے گا جس میں زمانہ وسطیٰ میں شمال کی متفرق سلطنتوں کے مشہور اور نمایاں واقعات درج ہیں۔ اس کے بعد کے دو ابواب دکن کی سطح مرتفع کے بیان میں ہیں اور جزیرہ نما ہند کی سلطنتوں کی تاریخ کا ایک خاکہ جہاں تک معلوم ہو سکا کھینچ دیا گیا ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے جس میں تاریخی عہد کے آغاز سے زمانہ اسلام (جو چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہوتا ہے) تک کے واقعات ہیں۔

اس کتاب میں جس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ تاریخی زمانے کے آغاز یعنی 650 ق م یا 600 ق م سے لے کر شمالی ہند میں مسلمانوں کے حملے یعنی 1200ء تک ہے جو جنوب میں اس کے ایک صدی بعد تک ہے۔ قدیم ترین سیاسی واقعہ جس کی تاریخ کا ہندوستان کی تاریخ میں تقریباً پوری صحت کے ساتھ یقین ہو سکتا ہے' وہ مگدھ میں 600 ق م میں ششناگ خاندان کا قائم ہونا ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح ایک عجیب و غریب عہد ہے جو انسان کی تاریخ میں سب سے افضل اور سب سے اہم وقت ہے۔

2۔ تاریخ ہند کے ماخذ

چار ماخذ

ہندوستان کی قدیم تاریخ کے ماخذ یا اصلی اسناد چار حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ سب سے اول وہ روایات ہیں جو ہندوستان کے ادبیات میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ دوسرے مورخین اور سیاحوں کی کتابیں جن میں ہندوستان کے حالات کا ذکر پایا جاتا ہے۔ تیسرے آثار قدیمہ کی شہادت جس میں کتبے' عمارات اور سکے شامل ہیں۔ چوتھے حصے میں ہمعصر یا تقریباً ہمعصر لوگوں کی لکھی

ہوئی وہ چند کتابیں ہیں جو انہوں نے مخصوص فن تاریخ پر لکھی ہیں۔

روایات صرف قدیم ترین زمانے کے لیے ہیں

سکندر کے حملے کے زمانے سے پہلے یعنی 600 ق م سے لے کر 326 ق م تک کے لیے ضرور ہے کہ تقریباً صرف ادبی روایات پر اکتفا کیا جائے جو مختلف زمانوں کی مختلف کتابوں میں منتشر پائی جاتی ہیں اور بسا اوقات متفرق نوشتوں میں اتفاقیہ مل جاتی ہیں۔ خالص ہندی روایات پر یونانی مصنفین کیٹیسیس، ہیروڈوٹس، سکندر کے مورخین میگاسھینز اور دیگر مورخین کے بیانات اضافہ کیے جا سکتے ہیں۔

کشمیر کی تاریخ

کشمیر کی تاریخ بارھویں صدی میں لکھی گئی اور تمام سنسکرت ادبیات میں ایک یہی کتاب ہے جو باقاعدہ تاریخ کے فن میں تحریر ہوئی۔ اس میں کثرت سے ایسی بے سروپا قدیم روایتیں پائی جاتی ہیں جو سخت احتیاط کے بعد کام میں لائے جانے کے قابل ہوں گی۔ اس کی قدر و قیمت اس وقت زیادہ ہو جاتی ہو جبکہ مورخ اپنے زمانے کے یا اپنے سے کچھ پہلے کے واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ ؎

سنسکرت کی رزمیہ نظمیں

سنسکرت زبان کی عظیم الشان رزمیہ نظمیں مہابھارت اور رامائن اگرچہ رزمیہ زمانے کی معاشرت اور رسم و رواج پر ضرور روشنی ڈالتی ہیں مگر تاریخی زمانے کی مختلف سلطنتوں کے سیاسی تعلقات کے متعلق کچھ زیادہ مواد ان سے نہیں مل سکتا۔

اتفاقیہ اخبارات

زبان کے محققین نے نحویوں اور دوسرے مصنفوں کی کتابوں سے بہت سے ایسے اتفاقیہ بیانات نکالے ہیں جن سے زمانہ قدیم کی روایات کا پتہ چلے۔ اس قسم کے تمام بیانات سے جو مجھے دستیاب ہو سکے اس کتاب کے لکھنے میں مدد لی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے چند کو میں خود دیکھنا بھول گیا ہوں۔

جین کی مذہبی کتابیں

جین فرقے کی مذہبی کتابیں اب تک قعر گمنامی سے باہر نہیں نکلیں۔ ان میں سے بہت کچھ

تاریخی مواد مل سکتا ہے۔[8]

جاتک کی حکایتیں

جاتک یا بدھ کی پیدائش کی حکایات اور بدھ مذہب کی دوسری مذہبی کتابوں میں اس قسم کے اتفاقی بیانات بکثرت ملتے ہیں جن سے پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کے ہندوستان کے سیاسی حالات معلوم ہو سکیں۔ اگرچہ یہ کتابیں ہمعصر واقعات بیان نہیں کرتیں مگر پھر بھی اصلی تاریخی روایات کو ہم تک پہنچاتی ہیں۔[9]

لنکا کی پالی تاریخیں

لنکا کی پالی زبان کی تاریخوں میں دیپاومس جو چوتھی صدی مسیحی میں اور مہاومس جو اس کے ڈیڑھ صدی بعد لکھی گئی بہت مشہور ہیں۔ ان میں قدیم ہندوستان اور خصوصاً موریا خاندان کے متعلق بہت سی بے سروپا اور مختلف روایات ملتی ہیں۔ یہ لنکا کی تاریخیں جن کی بعض اوقات مبالغے سے تعریف کی جاتی ہے' اتنی ہی محتاط تنقید کی محتاج ہیں جتنی کہ اور مذہبی اور ادبی کتابیں ہو سکتی ہیں۔[10]

پُران

ہندی تاریخی روایتوں کا سب سے اچھا اور مرتب ذخیرہ پُرانوں کے شاہی خاندانوں کی فہرست میں محفوظ ہے۔ ان اٹھارہ پُرانوں میں سے پانچ یعنی وایو' متسیہ' وشنو' برہمانڈ اور بھاگوت میں ایسی فہرستیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے متسیہ سب سے زیادہ قدیم اور مستند ہے۔ ان کتابوں کے موضوع کے لحاظ سے پُران میں مندرجہ ذیل پانچ مضمون ہونا ضروری ہیں۔ ابتدائی پیدائش' ثانوی پیدائش' جو منو گذر چکے ہیں ان کی پیدائش' دیوتاؤں اور خاندانوں کے بزرگوں کے نسبی شجرے' حکمرانوں کے حالات اور قدیم شاہی خاندانوں کی تاریخیں۔ ان پانچ مضامین میں سے صرف آخری ہی مورخ کے کام کا ہوتا ہے۔[11] یورپ کے موجودہ علماء پُرانوں کی قدر کو کم کرنے کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہیں۔ لیکن غور و تحقیق سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں بہت کچھ اصلی اور صحیح تاریخی مواد موجود ہے۔

دارا کٹیسیس اور ہیروڈوٹس

ہندوستان کے متعلق بہت قدیم حالات کا ذکر جو غیر ملکوں میں ملتا ہے' وہ ان کتبوں میں درج

ہے جو دار اگشتاسپ نے اصطخر اور نقش رستم میں کندہ کرائے تھے۔ موخر الذکر کتبہ کم از کم 486 ق م [12] م کا ہے۔ ہیروڈوٹس جس نے اپنی کتاب پانچویں صدی ق م کے آخری حصے میں لکھی، ہندوستان اور ایران کی سلطنتوں کے باہمی تعلقات پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے اور یہ حالات مذکورہ بالا کتبوں کے مجمل بیانات پر اضافہ کرتے ہیں۔ کینڈولس کے رہنے والے کٹیسیس نے بھی (جو اردشیر کے زمانے میں شاہی طبیب تھا) مشرقی ممالک کے متعلق مختلف حکایتیں جمع کی تھیں، مگر اس کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں ہے۔ [13]

سکندر کے افسر اور ایلچی

سکندر کی فوج کشی اور اس کے افسروں کی خبروں کے شائع ہونے کے وقت تک یورپ ہندوستان سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کے مرنے کے بیس برس بعد شام اور مصر کے بادشاہوں نے اپنے سفیر موریا شہنشاہوں کے دربار میں روانہ کیے۔ انہوں نے اس ملک کے حالات نہایت ہی احتیاط کے ساتھ لکھے ہیں۔ یہ حالات مختلف رومی اور یونانی مورخین اور مصنفین کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان میں سے میگاستھینز کی کتاب کے اجزاء سب سے زیادہ کار آمد ہیں۔ [14]

آرین وغیرہ

آرین نے جو دوسری صدی عیسوی کا ایک یونانی رومی عامل تھا، ہندوستان کا نہایت ہی عمدہ حال لکھا ہے جو قابل قدر ہے۔ اس کے علاوہ اس نے سکندر اعظم کے ہندوستانی حملے کے حالات بھی نہایت ہی تدقیق کے ساتھ جمع کیے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں لیگاس کے بیٹے ٹولمی، سکندر کے دوسرے افسروں اور دیگر یونانی سفیروں کے حالات پر مبنی ہیں۔ اس لیے جہاں تک ہندوستان کی چوتھی صدی قبل مسیح کی تاریخ کا تعلق ہے تو یہ تقریباً ہمعصر تاریخی سند کا حکم رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئنٹس کرٹیس وغیرہ دیگر مصنفین، جنہوں نے سکندر کے ہندوستانی حملے کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی، ایسے مستند نہیں مانے جا سکتے۔ مگر وہ بھی بجائے خود ایک اچھی چیز ہیں۔ [15]

طوانہ کا اپولونیئس

فلاسٹریٹاس نے 18 – 215ء میں ملکہ جیولیا ڈومنا کی فرمائش سے طوانہ کے اپولونیئس کی مدح میں ایک فلسفیانہ قصہ لکھا تھا۔ اس میں اس نے بظاہر ہندوستان کے نہایت ہی مفصل اور دلچسپ حالات جمع کیے تھے جو بقول مصنف ممدوح کے چشم دید ہیں جس نے شمال مغربی ہند کی سیر کی تھی۔
پروفیسر [illegible] 49-44ء [illegible] گیا تھا۔ مگر وہ تمام حالات [illegible] نے لکھے

ہیں مستند ہوتے تو اس کی کتاب نہایت ہی قیمتی ہوتی۔ مگر کتاب کا ایک بڑا حصہ ایسی کہانیوں سے پُر ہے جس کی وجہ سے مصنف کے کسی قول کو بھروسے اور اعتماد کے ساتھ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ بھی اب تک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا کہ اپولونیس کبھی ہندوستان آیا بھی تھا یا نہیں۔[16]

چینی مورخین

چین کے موجد تاریخ سوماچین نے 100ق م میں اپنی کتاب کی تکمیل کی۔ چینی مورخین کے تمام طویل سلسلے میں سب سے پہلا شخص وہ ہے جس کی تصنیفات سے ہندوستان قدیم کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ چینی مورخین واقعات کی تاریخ کے تعین میں زیادہ صحت سے کام لیتے ہیں اور اس لیے زیادہ قابل قدر سمجھے جانے چاہئیں۔[17]

چینی سیاح فاہیان

چینی جاتریوں (سیاحوں) کی بھیڑ جو کئی صدیوں تک ہندوستان میں (جس کو وہ اپنی "ارض مقدس" سمجھتے تھے) آتی رہی' فاہیان سے شروع ہوتی ہے۔ اس نے اپنا سفر 399ء میں شروع کیا تھا اور پندرہ برس کے بعد چین واپس پہنچا۔ وہ کتاب جس میں اس نے اپنے سفر کے حالات لکھے ہیں' تمام و کمال ہم تک پہنچی ہے اور ایک مرتبہ فرانسیسی زبان میں اور چار مرتبہ انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس میں دریائے گنگا کے متصل صوبوں کے حالات چندر گپت دوم بکرماجیت کی حکمرانی کے زمانے کے نہایت ہی دلچسپ اور قابل قدر ملتے ہیں۔[18] اس کے علاوہ اور بہت سے جاتریوں نے اپنے سفرنامے لکھے ہیں اور ان میں سے ہر ایک ہندوستان کی قدیم تاریخ پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ چنانچہ آئندہ ہر ایک کا حوالہ کتاب میں دیا جائے گا۔

ہیون سانگ

ان چینیوں میں سب سے بڑا اور مشہور جاتری ہیون سانگ ہے۔ عالم مذہب و شریعت ہونے کی حیثیت سے اب تک بدھ مذہب کے پیروؤں میں اس کی بڑی شہرت ہے۔ اس کے سفر نامے کا نام "مغربی دنیا کے حالات" ہے اور اس کا فرانسیسی' انگریزی اور جرمنی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے سفر کا زمانہ 629ء سے لے کر 645ء تک ہے اور اس کی سیر و سیاحت کا رقبہ نہایت ہی وسیع ہے۔ اس میں تقریباً تمام ہندوستان سوائے انتہائے جنوب کے شامل ہے۔ اس کی کتاب صحیح حالات کا ایک ایسا قیمتی ذخیرہ ہے جس سے واقف ہوتا تاریخ ہند قدیم کے ہر ایک طالب

علم کے لیے ضروری ہے۔ اس کتاب نے آثار قدیمہ سے بھی کہیں زیادہ گم گشتہ تاریخ ہند کی تحریر میں مدد دی ہے۔ اگرچہ ہیون سانگ کی کتاب کا اصل تاریخی وصف یہ ہے کہ اس سے ہم اس عہد کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی آئین و قوانین کو معلوم کر سکتے ہیں۔ مگر ہم اس کے اور بھی زیادہ اس وجہ سے ممنون ہیں کہ اس نے قدیم روایتوں کو اپنی کتاب میں درج کر کے محفوظ کر دیا ہے ورنہ کوئی شک نہیں کہ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ تمام ضرور ضائع ہو جاتیں۔ اس کے دوست ہیوی لی نے اس کی سوانح عمری لکھی اور اس کی کتاب [19] کے حالات پر کچھ اور بڑھایا مگر وہ باتیں اس کی کتاب کی طرح مستند اور معتبر نہیں۔

البیرونی

مسلمانوں میں شاید فاضل مہندس اور ہیئت داں البیرونی ہی ایک ایسا شخص گذرا ہے جس نے سنسکرت پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ورنہ عام طور پر مسلمان اس کو بت پرستوں کی زبان سمجھتے رہے اور اس لیے ان کے نزدیک وہ قابل نفرت ہی رہی۔ البیرونی محمود کی فوج کے ساتھ ہندوستان میں آیا۔ اس کی کتاب تحقیق الہند 1030ء میں تمام ہوئی اور ہندی رسم و رواج، فنون اور علم و ادب کے لیے نہایت ہی قابل قدر ہے۔ مگر اس میں اس قسم کے حالات بہت کم ملتے ہیں جو سیاسی تاریخ کو مرتب کرنے میں مدد دے سکیں۔ [20]

مارکوپولو

وینس کا مشہور سیاح مارکوپولو 95-1294ء میں جنوبی ہند میں آیا اور اس طرح اس کی سیاحت اس تاریخ کے عین خاتمے پر واقع ہوئی۔ [21]

مسلمان مورخین

مسلمان مورخین اسلامی فتوحات کے بیان کرنے ہی میں کار آمد ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اوائل اسلام کے مسلمان سیاحوں کے سفرناموں سے زمانہ وسطیٰ کی ہندی سلطنتوں کے حالات معلوم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ [22]

قدیم عمارات کی شہادت

علم آثار قدیمہ کا وہ حصہ جو عمارات سے متعلق ہے اگر اس کو ان عمارات کی دیواروں کے کتبوں سے الگ کر کے دیکھیں تو وہ باوجود اس کے کہ سیاسی تاریخ کے لیے زیادہ مواد بہم نہیں پہنچا

سکتا، مگر پھر بھی اس کی تشریح اور توضیح میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ طالب العلم کو گذشتہ شاہی خاندانوں کی عظمت و جبروت کا صحیح اندازہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔

کتبے

مگر اس میں کچھ بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ قدیم تاریخ ہند کے سب زیادہ ضروری اور کثیر التعداد ماخذ کتبے ہیں۔ تاریخ کے گمشدہ حصوں کا صحیح علم جو اب ہم کو حاصل ہو گیا ہے وہ صرف گذشتہ ستر یا اسی سال میں ان ہی کتبوں کے پڑھنے اور استقلال کے ساتھ ان کے حل کرنے سے ہی حاصل ہوا ہے۔ یہ کتبے کئی قسم کے ہیں۔ مہاراجا اشوک کے فرامین یا پند و نصائح جو پتھر پر کندہ ہیں اور تمام کتبوں سے بالکل جدا ہیں کیونکہ اس کے بعد کسی بادشاہ نے اس کی طرح اس قسم کے مواعظ کبھی چٹانوں پر کندہ نہیں کرائے۔ اسی طرح اجمیر میں دو اور دھار کے مقام پر ایک سنسکرت ڈراما پتھر پر کندہ پایا جانا بھی اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ چتور کے عظیم الشان مینار پر جو کتبہ کندہ ہے وہ دراصل علم تعمیر کی ایک کتاب کا حصہ ہے۔ مگر ان کے علاوہ کتبوں کا بڑا حصہ یا تو بطور یادگار ہے یا بطور نذرانہ اور بطور بخشش۔ اول اور دوسری قسم کے کتبوں میں مختلف اقسام کے حالات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں تو صرف کسی جاتری کا نام یا صرف دستخط ہی پایا جاتا ہے اور بعض میں کامل طولانی قصیدے نہایت فصیح و بلیغ سنسکرت میں ملتے ہیں۔ عام طور پر یہ پتھر پر کندہ ہیں۔ تیسری قسم کے کتبے وہ ہیں جن میں انعام یا عطیہ کا ذکر ہے۔ عموماً تانبے کی لوحوں پر ہیں کیونکہ یہی دھات ہے جس کے ذریعے سے غیر منقولہ جائداد کے انتقال کا دائمی ثبوت رکھا جاتا ہے۔

جنوبی ہند کے کتبے

جنوبی ہند میں تقریباً ہر قسم کے کتبوں کی خاص طور پر کثرت ہے۔ یعنی پتھر اور تانبے دونوں پر کندہ کیے ہوئے پائے جاتے ہیں اور ان میں سے بعض بہت طولانی ہوتے ہیں۔ جنوبی ہند کے جو کتبے دریافت ہو چکے ہیں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور بہت سے ابھی دریافت نہیں ہوئے۔ مگر یہ کتبے باوجود اپنی کثرت کے اتنے دلچسپ اور مفید نہیں جتنے کہ شمالی حصے کے کمیاب اور نادر الوجود کتبے ہیں، کیونکہ وہ نسبتاً زمانہ حال کے قریب ہیں۔ سن مسیحی سے قبل کا کوئی کتبہ سوائے میسور کے، جہاں مہاراجا اشوک کے مختصر فرامین کی نقل اور بھٹی پرولو کا صندوق ہے، جنوبی ہند میں نہیں پائے گئے۔ اصل یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے پہلے کے کتبے کم ہیں۔

بہت قدیم کتبے

ایک زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ شمالی ہند کا سب سے قدیم کتبہ وہ ہے جو پپراوا کے مقام پر بدھ کے تبرکات کے نذرانے کے طور پر لکھا ہوا تھا۔ یہ عام خیال تھا کہ وہ 450ق م کا کندہ کیا ہوا ہے۔ مگر موجودہ تنقیح نے اس خیال کے صحیح ہونے میں شبہ پیدا کر دیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ شمال اور جنوب دونوں حصوں میں مہاراجا اشوک کے زمانے یعنی تیسری صدی قبل مسیح سے پہلے کا کوئی ایسا کتبہ دستیاب نہیں ہوا جسے یقین کے ساتھ ان سے زیادہ قدیم کہا جا سکے۔ سن قبل مسیح کے کتبوں کی تعداد شمال میں بہ نسبت جنوب کے کہیں زیادہ ہے۔ تیسری صدی عیسوی کے بعد کے بہت کم کتبے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن اگر کشان بادشاہوں کی تاریخیں (جن پر اس کتاب میں عمل کیا گیا ہے) درست ہیں تو دوسری صدی کے کتبے بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔

اس سلسلے کا کام جو باقی رہ گیا ہے

اگرچہ آثار قدیمہ کے سلسلے میں بہت کچھ مفید کام ہو چکا ہے' لیکن اب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندی کتبوں کی دریافت کا کام ختم ہو گیا۔ ابھی بہت کام ہے۔ کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافے کی ضرورت ہے یہ لوگ ایسے ہوں جن کو ذاتی شوق ہو' جو کام ہی کو اور معلومات ہی کے حاصل کرنے کو اپنی اجرت قرار دیں اور دنیا کے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں۔ [۲۳]

سکے

بہ حیثیت مجموعی سکوں کی شہادت بہ نسبت کتبوں کے زیادہ دستیاب ہو سکتی ہے۔ ہندی سکوں کی اکثر اقسام پر مخصوص کتابوں میں بحث ہو چکی ہے اور ان سے تمام تاریخی مواد اخذ کر لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر ریپسن کی کتاب ہے جس میں اس نے تمام سکوں کو ایک جگہ فراہم کر کے ان پر بحث کی ہے' عام ناظرین کو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کو سکوں کی موجودگی سے کہاں تک مدد ملی۔

سکندر کے حملے کے بعد مورخ کو سکوں کے ذریعے سے تاریخ کے ہر زمانے کے متعلق اپنی تحقیقات میں بہت مدد ملتی ہے۔ مزید برآں سلطنت ہائے باختر ہندی' یونانی اور ہندی پارتھیا کے لیے دراصل صرف یہی ایک قابل اعتبار ماخذ ہو سکتے ہیں۔ [۲۴]

اُسی زمانے کے ادبیات

تاریخ قدیم کا چوتھی قسم کا ماخذ اسی زمانے یا تقریباً اسی زمانے کے ادبیات ہیں۔ مگر ایسی کتابیں بہت ہی کم ہیں جن کو ہم علم تاریخ کی کتابیں کہہ سکیں۔ ان میں کشمیر کی تاریخ (راج ترنگنی) اور آسام اور نیپال کی مقامی تاریخوں کے علاوہ سنسکرت اور پراکرت کی معدودے چند کتابیں اور تامل زبان کی کچھ نظمیں شامل ہیں۔ ان میں سے کوئی کتاب خالص تاریخ کے فن پر نہیں اور سب کم و بیش حکایات کی قسم کی کتابیں ہیں۔ اس لیے واقعات کو بہت کچھ افراط و تفریط کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

ان میں سب سے مشہور کتاب "ہرش چرت" ہے جسے بان نے 620ء میں اپنے بادشاہ اور مربی ہرش شاہ تھانیسر و قنوج کی مدح میں لکھا تھا۔ یہ کتاب باوجود چند ظاہری نقائص کے نہایت ہی کار آمد ہے۔ اس میں قدیم روایات کے علاوہ اس عہد کی تاریخ کا حال بھی پایا جاتا ہے۔[25] اسی قسم کی ایک اور کتاب "وکرامانک چرت" بھی ہے جو بارھویں صدی عیسوی کے ایک شاعر کلہن کی لکھی ہوئی ہے اور دراصل ایک زبردست بادشاہ کی شان میں ایک قصیدہ ہے جو 1076ء اور 1126ء کے درمیان جنوب اور مغرب کے ایک بڑے علاقے پر حکمراں تھا۔[26] ایک اور قابل قدر نظم "رام چرت" بھی بنگال کے پال خاندان کے متعلق ایک قصیدہ ہے جو 1897ء میں دریافت ہوئی اور 1910ء میں شائع ہوئی۔ ان کتابوں کے علاوہ اور کتابیں بھی ہیں جو کلہن کے سوا عموماً اور جین مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں مغربی ہند کے چالوکیہ خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ ملتی ہے۔[27] تامل زبان کی نظموں میں قدیم ترین نظم کے متعلق خیال ہے کہ وہ پہلی یا دوسری صدی عیسوی کی لکھی ہوئی ہے۔ ان نظموں میں سے جو عموماً تو رزمیہ ہیں یا جنوب کے مشہور بادشاہوں کے متعلق قصائد ہیں بہت کچھ تاریخی مواد حاصل ہو سکتا ہے۔[28]

تعین تاریخ کی مشکلات

وہ چیز جو اس قدر مدت تک ہندوستان قدیم کی مسلسل تاریخ لکھے جانے میں مزاحم رہی' یہ نہ تھی کہ تاریخ کے مواد کی کمی ہو۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ تاریخوں کا صحیح تعین ناممکن تھا جس کی طرف ایلفنسٹن اور پروفیسر کاول نے بھی اشارہ کیا ہے۔ مگر غیر مرتب تاریخی مواد کی اس قدر کمی نہیں جتنا کہ فرض کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قدیم اقوام کی تاریخ کے ڈھانچے کو کھڑا کرنے کے لیے مواد ہر جگہ کم ہی ہوتا ہے اور جو کچھ ہوتا بھی ہے وہ ایسے بے سروپا اور لایعنی بیانات پر مبنی ہوتا ہے جو آخر میں عوام کے دماغ میں خرافات اور قصص اصنام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ہندوستان قدیم کے مورخ کے پاس ان روایات' فہرس اور قصص اصنام کی کمی نہیں۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ زمانے کے ان تنقیدی اصولوں کو ان پر استعمال کیا جائے جو مشرق و مغرب کی قدیم تاریخوں کے لکھنے میں کام آتے ہیں۔ تاریخ ہند کے متعلق ان اصولوں کا استعمال کسی طرح بھی اس سے زیادہ مشکل نہیں تھا جتنا کہ بابل' مصر' یونان اور روم کی تاریخ کے متعلق ہو سکتا ہے۔ حقیقی مشکل یہ ہے کہ تاریخوں کے تعین کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا۔ تاریخ کے لیے ضروری ہے کہ اس کے واقعات کی تاریخوں کا تعین یقین اور وثوق کے ساتھ ہو سکے اور بغیر اس کے تاریخ کا لکھا جانا ناممکن ہے۔

بے شمار سنین کا رواج

ہندوستان کی مختلف اقوام نے اپنی تاریخ کو اگر محفوظ رکھنے کی کوشش بھی کی تو اس کے طریقے نرالے اختیار کیے جن کا اب سمجھ میں آنا مشکل ہے اور چند سال پہلے بالکل ناممکن تھا۔ جن سنین کا انہوں نے اپنے تاریخی واقعات کے تعین کے لیے اختراع کیا ہے وہ نہ صرف دنیا بھر کی قوموں کے سنین سے مختلف ہیں' بلکہ تعداد میں بے شمار اور اپنی ابتداء اور استعمال کے لحاظ سے بالکل پوشیدہ اور نامعلوم ہیں۔ کننگھم نے اپنی کتاب "سنین ہند" میں بیس سے زیادہ سنین گنوائے ہیں جو ہندوستان کے مختلف حصوں اور اس کی تاریخ کے مختلف زمانوں میں جاری رہے ہیں۔ اس پر بھی اس کی فہرست کامل نہیں کہی جا سکتی۔ علماء نے یکے بعد دیگرے اپنی زندگی ہندوستان کے مختلف مقامی سنین کے تحفظ اور ان کے ذریعے سے بھولی ہوئی تاریخ کے دریافت کرنے کے لیے وقف کر دی ہے۔ ان کی بے لوث کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ان سنین کا علم جو کتبوں وغیرہ میں استعمال ہوئے ہیں بالکل کامل اور صحیح ہو گیا ہے۔[29] ان تمام نتائج کو کام میں لا کر اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہند قدیم کا مورخ ہر ایک واقعہ کے تعین اور سن کے لحاظ سے تاریخ کو مسلسل صورت میں مرتب کر لے۔ آج سے اسی تو کیا چالیس برس پہلے بھی یہ بات ناممکن تھی۔

یونانی ہمعصر تاریخیں

ایک زمانے تک ہندوستان قدیم کی تمام تاریخ میں وہ واقعہ جس کی تاریخ تقریباً بالکل صحت کے ساتھ متعین ہوئی تھی صرف چندر اگپتا موریا کی تخت نشینی کا واقعہ تھا۔ اس کا تعین اس وجہ سے ممکن ہو گیا تھا کہ یونانی مورخوں نے "سنڈراکوٹس" ایک ہندی بادشاہ کو سیلوکس نیکیٹر کا ہمعصر بتلایا اور یہ مان لیا گیا تھا کہ سنڈراکوٹس سے چندر اگپتا موریا ہی مراد ہے۔ اس کے بعد 1838ء میں چندر اگپتا کے پوتے راجا اشوک کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ سیلوکس کے پوتے

انٹیاکس تھیوس اور دوسرے چار یونانی بادشاہوں کا ہم عصر تھا۔ اس طرح موریا خاندان کے بادشاہوں کے سنین کا پوری صحت کے ساتھ تعین ہو گیا اور اب اس میں کسی قسم کا شک باقی نہیں رہا۔

ان دو متعینہ تاریخوں اور ساتویں صدی عیسوی کے بعض واقعات کے سنین کے سوا، جن کا تعین چینی جاتری ہیون سانگ کے سفرنامے سے ہو گیا تھا، تاریخ ہند کے تمام سنین کا تقرر نہ ہو سکا تھا اور ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق ان کو ہیر پھیر کر سکتا تھا۔

خاندان گپت کا مروجہ سن

جب ڈاکٹر فلیٹ نے خاندان گپت کے سن کا تعین کر دیا جو اب تک محض وہم کا تختہ مشق رہا تھا تو تاریخ ہند کے سنین کے باب میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ اس فیصلے سے کہ خاندان گپت کا سن 319ء یا 320ء سے شروع ہوتا ہے ہندوستان قدیم کے ایک مشہور خاندان کے سنین کا تعین ہو گا اور جس پر اس سے پہلے صرف تاریکی چھائی ہوئی تھی اب وہ روز روشن کی طرح نمایاں ہو گیا۔ اسی سے پانچویں صدی عیسوی کے فاہیان کا لکھا ہوا بیان اپنی اصلی جگہ پر قائم ہو گیا اور یہ معلوم ہوا کہ اس کا سفرنامہ ہندوستان کے سب سے نامی بادشاہ چندر گپت ثانی یا بکرماجیت کی سلطنت کا گویا ایک مرقع ہے۔ اس اہم دریافت کے بعد، جس کو ڈاکٹر فلیٹ نے 1887ء میں شائع کیا، خاندان گپت کے سنین کے متعلق اور تمام باقی ماندہ مشکلات کا فیصلہ اس وقت ہو گیا جب ایم۔ سلوین لیوی نے اس بات کا تعین کیا کہ سمدر گپت اور میگھ ورن شاہ لنکا ہمعصر تھے۔ (تقریباً 352ء سے لے کر 379ء تک کا زمانہ)۔

اندھر خاندان کی ہمعصر تاریخیں

اسی طرح اندھر خاندان کی ایک مسلسل فی الجملہ ناکامل تاریخ کا لکھا جانا اس طرح ممکن ہو گیا ہے جبکہ اندھر خاندان کے بادشاہ اور مغربی ایرانی ستراپ (صوبہ دار Satrap) ہمعصر ثابت ہوئے۔

شمالی ہند کی تمام تاریخیں سوائے کشان خاندان کے متعین ہو چکیں

مختصر یہ ہے کہ متعدد علماء کی محنتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شمالی ہند کی قدیم تاریخ کا ایک ڈھانچہ قائم کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ یہ وہ تاریخی زمانہ ہے جو عہد قدیم سے شروع ہو کر اسلامی فتوحات پر ختم ہوتا ہے۔ مگر اس میں بھی کشان یا ہندی سیتھیا خاندان کا زمانہ اب تک زیر بحث

ہے۔ کشان خاندان کے وہ سنین جو اس کتاب میں استعمال کیے گئے ہیں ایسے ہیں جن کے لیے مزید غور کی ضرورت ہے مگر وہ بالفعل کام چلانے کے لیے بھی کافی ہیں۔ اگر بالا خران کو بھی مان لیا گیا تو شمالی ہند کی تاریخ بالکل کامل ہو جائے گی۔ اگرچہ پھر بھی بہت سی تفصیلی باتیں رہ جائیں گی۔

جنوبی ہند کی تاریخیں

جنوبی ہند کے خاندانوں کے متعلق بھی بہت سی تاریخوں کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ پلوا خاندان کی تاریخیں بھی، جس کے نام سے بھی 1840ء سے پہلے یورپ کے لوگ بالکل ناواقف تھے، بہت کامیابی کے ساتھ حل ہو چکی ہیں۔

مسلسل تاریخ لکھے جانے کا امکان

تمام مذکورہ بیان کے پڑھنے سے میرے نزدیک ناظرین کے ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ اب اس قدر مواد موجود ہے اور سنین کا تعین اس حد تک ہو چکا ہے کہ فتوحات اسلامی سے قبل کی تاریخ ہند ایک مسلسل اور مرتب صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دی جائے۔

ضمیمہ الف

پُرانوں کا زمانہ تصنیف

اس کی تاریخ کے متعلق ایچ۔ ایچ ولسن کا غلط خیال

ایچ۔ ایچ ولسن نے پُرانوں کی چند عبارتوں کا غلط مطلب سمجھ لیا کہ ان میں مسلمانوں کا ذکر پایا جاتا ہے اور اسی بناء پر اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ وشنو پُران 1045ء میں تصنیف ہوئی۔ یہ غلطی ولسن کے زمانے میں قابل معافی تھی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ چند سال پیشتر کے واقعات سے اس کی تردید بھی ہو چکی ہے لیکن پھر بھی اب تک یہ خیال برابر دہرایا جاتا ہے۔ اس اعادے کی وجہ سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعے پر چند ایسے عام فہم اور قطعی ثبوت بیان کر دیئے جائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ پُران اصل میں اس سے کہیں زیادہ قدیم ہیں، جیسا کہ ولسن کا خیال تھا۔

البیرونی کی شہادت

البیرونی نے ہندوستان کے حالات پر اپنی کتاب 1030ء میں لکھی۔ وہ اٹھارہ پُرانوں کی فہرست نقل کرتا ہے جن کو "نام نہاد رشیوں" نے لکھا تھا۔ ان میں سے تین پُران خود اس نے اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ یعنی متسیہ، آدیتیا اور وایو پُرانوں کے حصے۔ اس کے علاوہ وہ پُرانوں کی اٹھارہ کتابوں کے مختلف نام بھی دیتا ہے جو وشنو پُران میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اب یہ ظاہر ہے کہ آج کل کی طرح 1030ء میں بھی پُران تعداد میں اٹھارہ ہی تھے اور سمجھا جاتا تھا کہ یہ عہد قدیم سے اسی طرح چلے آتے ہیں اور قدیم رشی جن کا ذکر محض افسانہ ہے اس کے مصنف تھے۔

بان کی شہادت

ہرش بادشاہ کے قصیدے "ہرش چرت" کا مصنف جو 620ء میں زندہ تھا، پُران کی قدامت

کو اور چار صدی پیشتر لے جاتا ہے۔ جب وہ اپنے گاؤں کو گیا جو دریائے سون پر واقع تھا (جسے آج کل ضلع شاہ آباد کہتے ہیں) تو اس نے سدرشتی کو وایو پران گاتے ہوئے سنا۔[۴۰] ڈاکٹر فیوہرر کو یقین تھا کہ یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ بان نے اگنی بھگوت' مارکندیا اور ان کے علاوہ وایو پران سے خود استفادہ کیا تھا۔[۴۱]

بنگال کا قدیم نسخہ

سکند پران کے اسی عہد میں موجود ہونے کا مستقل ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس وقت کا قلمی نسخہ اسی کتاب کا خاندان گپت کے زمانے کے خط میں لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے "جس کے متعلق خط کی قدامت کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ساتویں صدی کا لکھا ہوا ہے۔"[۴۲]

کتاب سوالات مِلندا

کسی نہ کسی صورت میں کتاب "سوالات ملندا" کا مصنف بھی پرانوں سے واقف تھا جو اس زمانے میں ویدوں اور رزمیہ نظموں کے ساتھ قدیم مذہبی کتابوں میں شمار ہوتی تھیں۔ اس کتاب کا پہلا باب (جس میں پرانوں کا ذکر آتا ہے) بلاشبہ اصلی اور حقیقی کتاب کا جزو ہے اور اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ وہ 300ء سے قبل لکھا گیا تھا۔[۴۳]

گپتا خاندان

اس کے علاوہ بیوہلر نے پرانوں کی بہت سی عبارتیں اور دوسرے حوالے جمع کیے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ "وایو پران' وشنو پران' متسیہ پران اور برہمانڈ پران میں زمانہ مستقبل کے بادشاہوں کا تذکرہ گپت اور اس کے ہمعصر خاندانوں پر آکر ختم ہوتا معلوم ہوتا ہے۔"[۴۴] بیوہلر نے زمانہ آئندہ کے بادشاہوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ پرانوں میں تمام تاریخی واقعات پیشین گوئی کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں تاکہ ان کے بے انتہاء قدیم ہونے کی صورت قائم رہے' اس میں شک بھی نہیں کہ وہ اصلی اور پرانی شکل میں بہت قدیم ضرور ہیں۔

مسٹر پرگیٹر کی تحقیقات کے نتائج

مسٹر پرگیٹر اپنی مفید کتاب "دی ڈائنسٹیز آف دی کالی ایج" (کیرنڈن پریس۔ آکسفورڈ 1913ء) میں اس کے متعلق اور زیادہ کامل ثبوت بہم پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے "بھاویش پران" اپنی قدیم تر شکل میں دراصل متسیہ اور وایو پرانوں کے شاہی

خاندانوں کی فہرستوں کا حقیقی ماخذ تھا۔ ان تمام فہرستوں کا حال جو متسیہ' وایو' برہمانڈ پُرانوں میں موجود ہے۔ "اور ان کا در حقیقت ایک اور صرف ایک ہی ماخذ ہو سکتا ہے۔ "مگر متسیہ پُران کی فہرست ان سب میں قدیم اور بہتر ہے۔ وشنو اور بھگوت پُران اسی کی مختصر فہرستیں ہیں۔ اور بھاویش پُران اپنی موجودہ شکل میں تاریخی لحاظ سے بالکل بیکار کتاب ہے کیونکہ اس میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔ تاریخ کیلئے صرف متسیہ' وایو اور برہمانڈ پُران ہی کار آمد ہو سکتی ہیں۔ ان میں بعض باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی خاندانوں کا سنسکرت زبان میں لکھا ہوا حال' جیسا کہ آج کل ان کتابوں میں پایا جاتا ہے' دراصل پراکرت کی نظموں سے ماخوذ ہے اور اس کے باور کرنے کی بھی وجہ موجود ہے کہ یہ کتابیں سب سے قدیم زمانے میں کروشٹی خط میں لکھی ہوئی تھیں۔

مسٹر پرگیٹر کی رائے ہے کہ تاریخی مواد کی سنسکرت زبان میں ترتیب اندھر خاندان کے بادشاہ یجنسری کے عہد یعنی دوسری صدی عیسوی میں شروع ہوئی اور یہ ترتیب 260ء میں بھاویش پُران میں داخل کر کے اس پر اور اضافہ کر دیا گیا۔ 20-315ء میں بھاویش پُران پر نظر ثانی ہوئی اور وہ وایو پُران کے نسخے میں شامل کر دیا گیا' اور پھر 25 تا 32ء کے درمیان اس پر مکرر نظر ثانی ہوئی اور وایو کے دوسرے نسخے اور برہمانڈ میں شامل کر دیا گیا اور اس وقت سے پُرانوں میں بھاویش کی تاریخی روایتیں محفوظ ہو گئیں۔ متسیہ پُران سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاویش پُران کی فہرستیں کسی قدر قدیم صورت میں محفوظ ہیں۔ جن کی تاریخ شاید تیسری صدی عیسوی کا آخری حصہ ہو۔

مسٹر پرگیٹر کی کتاب چھتیس مختلف نسخوں کے مطالعے پر مبنی ہے اور اس وجہ سے اس قابل ہے کہ اس پر غور و فکر کیا جائے۔ انہوں نے بکثرت حوالے بھی دیئے ہیں۔

پُران چوتھی صدی قبل مسیح میں

اس تمام بیان پر میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی صورت میں پُران چوتھی صدی قبل مسیح ہی میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ ارتھ شاستر کا مصنف اتھروید اور اتہاس کو چوتھا اور پانچواں وید مانتا ہے۔ (باب اول فصل 3) اور بادشاہ کو صلاح دیتا ہے کہ تیسرے پہر کو اتہاس کا مطالعہ کیا کرے۔ اس میں چھ چیزیں شامل ہیں۔ (1) پُران (2) اتیورت (تاریخ)' (3) آکھیائیکا (حکایات)' (4) ادا ہرن (تمثیلات)' (5) دھرم شاستر اور (6) ارتھ شاستر۔ (باب اول فصل 5)۔

ضمیمہ ب

چینی سیاح

چینی نام: فاہیان

چند در چند وجوہ سے چینی ناموں کے لکھنے میں اس قدر دقت واقع ہوتی ہے کہ ان کو مختلف ہجوں سے لکھا جاتا ہے سب سے پہلے سیاح کا نام فاہین (لیگ)' ف۔ ہیان' (لیڈلے اور بیل) ف۔ ہسین (گائل اور ویٹرس) لکھا جاتا ہے۔ فاہیان کی کتاب "فو۔کو۔کی" یعنی "بدھ مذہب کی سلطنتوں کے حالات" میں 399ء سے لے کر 414ء تک کے حالات ملتے ہیں۔[۳۵]

فرانسیسی ترجمہ

فاہیان کی کتاب کا فرانسیسی ترجمہ ریموسٹ' کلپراتھ اور لینڈرس نے 1838ء میں شائع کیا تھا۔ 1848ء میں اس ترجمے سے جے۔ڈبلیو۔لیڈلے نے انگریزی میں ترجمہ کرکے کلکتہ میں بغیر اپنا نام ظاہر کیے شائع کیا اور بہت سے حاشیے اس پر زیادہ کیے۔ یہ اس وقت بھی اس قابل ہے کہ اس سے استفادہ کیا جائے

بیل کا انگریزی ترجمہ

بیل نے 1869ء میں "بدھسٹ پلگرمز" کے نام سے ایک بالکل نیا ترجمہ شائع کیا۔ مگر اس میں بے شمار غلطیاں تھیں۔ یہی ترجمہ ترمیم کے بعد "بدھسٹ ریکارڈ آف دی ویسٹرن ورلڈ" کی پہلی جلد میں شائع ہوا (ٹریوبنر' اورینٹل سیریز 1885ء) مگر گزشتہ ایڈیشن کے تمام حاشیے اس میں نقل نہیں کیے گئے تھے۔

گائل کا ترجمہ

گائل کا انگریزی ترجمہ 1877ء میں لندن اور شنگھائی سے بیل کے دونوں ترجموں پر سخت تنقیدیں ہیں اور ان میں ایسی باتیں کم ملتی ہیں جن سے جاتری کے بیانات سے ہندوستان کے حالات کے اخذ کرنے میں مدد مل سکے۔ مگر مسٹر گائل کا اب نایاب ترجمہ اس سبب سے ضرور قابل قدر ہے کہ وہ ایک نہایت لائق زبان دان کا بالکل اچھوتا ترجمہ ہے۔ اس کی بعض غلطیوں کو ویٹرس نے اپنے مضامین "ف ہین اور اس کا انگریز مترجم" میں درست کر دیا ہے۔ (چاچنا ریویو۔ جلد 8)

لیگ کا ترجمہ

ڈاکر لیگ کا نیا ترجمہ (آکسفورڈ کلیرنڈن پریس 1886ء) بہ حیثیت مجموعی سب سے زیادہ کار آمد ہے کیونکہ مصنف کو گذشتہ مترجمین کی کتابوں سے بھی مدد لینے کا موقع ملا ہے۔ مگر حاشیوں میں کچھ اور بڑھانے کی ضرورت باقی ہے۔ فاہیان کے سفرنامے کا آخری ترجمہ، جس میں ایسی شرح بھی شامل ہو جو ہندوستان اور چین دونوں کی تاریخی ضرورتوں کو پورا کر سکے، ابھی تک نہیں ہوا اور اصل یہ ہے کہ ایسے ترجمے کا صرف ایک شخص کی ہمت سے انجام پانا تقریباً محال ہے۔

ہیون سانگ کا نام

ہیون سانگ کے صحیح ہجے کے متعلق تمام معاملہ زیر بحث رہا ہے اور کسی زمانے کا کیا ذکر اب تک اس میں اختلاف کافی ہے۔[۳۶]

مگر اب مسئلے کو پروفیسر چاؤ نیز کی رائے کے مطابق بالکل طے شدہ امر قرار دے دینا چاہیے۔ اس کا خیال ہے کہ اس نام کا تلفظ در حقیقت ہیون سانگ ہی ہے اور پروفیسر ڈی لاکو پرے بھی اس سے متفق ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب میں یہی نام استعمال ہوا ہے۔ مسٹر بیل کا مستعملہ نام ہیون سیانگ جس سے تمام انگریزی داں واقف ہو گئے تقریباً یہی ہے۔

جولین اور بیل کے ترجمے

ایم۔ جولین کی مہتمم بالشان کتاب جس میں ہیون سانگ کی سوانح عمری اور سفرنامے کا فرانسیسی ترجمہ شامل تھا، اب تک بجائے خود لاجواب ہے۔ اگرچہ اب وہ بہت نادر الوجود ہو گئی

ہے اور اس کا دستیاب ہونا مشکل ہے۔ (پیرس 58-1853ء) مسٹر بیل کا کیا ہوا سفرنامے کا انگریزی ترجمہ 1885ء میں ان جلدوں میں شائع ہوا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ 1888ء میں اس کا سوانح عمری کا ترجمہ بھی شائع ہوا۔ اس پر حاشیہ زیادہ تر ڈاکٹر برگس کا لکھا ہوا ہے۔ تاریخ ہند کا لکھنے والا بعض دفعہ مجبور ہو جاتا ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں ترجموں کو کام میں لائے۔ دونوں ترجموں کی شرحیں اب پرانی ہو چکی ہیں مگر یہ نقصان ایک حد تک مسٹر ویٹرس کی کتاب نے پورا کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب "آن یون چانگس ٹریولز ان انڈیا" دو جلدوں میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے 1904ء میں شائع کی۔ ہیون سانگ کی سوانح عمری اور سفرنامے کے قابل اعتبار مشرح ترجمے کے لیے علماء کی ایک جماعت کی ضرورت ہے جو مل کر کام کریں اور اس فرض کو انجام دیں۔ اس کی کتاب "تا تانگ۔ سی۔ یو۔ چی" یعنی "تانگ زمانے میں مغربی ممالک کے حالات" اپنی ابتدائی صورت میں 646ء میں شہنشاہ چین کے سامنے پیش کی گئی مگر موجودہ کتاب 648ء سے قبل اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ غالباً مصنف کی زندگی ہی میں یا اس سے کچھ بعد اس کے قلمی نسخے ابتدائی صورت ہی میں نقل ہوئے اور لوگوں میں پھیل گئے۔ آج کل اس کے مختلف ایڈیشن ملتے ہیں جن میں نہ صرف متن میں بلکہ حاشیوں' شرحوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ "ہن سشن" کی تالیف ہی شاید اب تک یورپ میں پہنچی ہے اور یہ منگ زمانے کی مطبوعہ کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ویٹرس نے تین اور ایڈیشنوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور زیادہ اہم اختلاف کو ظاہر کیا ہے۔ (آن یون چانگ۔ باب اول) سیاح کے راستے کا پتہ ان نقشوں سے لگ سکتا ہے جو اس تاریخ کے مصنف نے ویٹرس کی کتاب کی دوسری جلد میں زیادہ کیے ہیں۔

باب 10 تا 12 کی بے وُقعتی

ناظرین کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہیون سانگ کے سفرنامے کے باب 10' 11 اور 12 شروع کے ابواب سے کہیں کم مستند ہیں۔ اس کے متعلق مسٹر ویٹرس کے خیالات حسب ذیل ہیں۔

"حالات" کے بیان کے مطابق جاتری ملکوت سے سنگ کا یو یعنی لنکا کی طرف روانہ ہوا۔ مگر سوانح عمری سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ان ملکوں کے صرف نام اور حالات سنے تھے۔ اگر ہمارے پاس "حالات" کے سوا اور کوئی کتاب موجود نہ ہوتی تو ہم بڑے شوق سے یہ ماننے کے لیے تیار ہو جاتے کہ وہ لنکا بھی گیا تھا اور وہاں سے دراود واپس آیا تھا۔ مگر شاید یہ خیال زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس نے ملکوت اور لنکا کے حالات دراود میں سنے یا کتابوں میں پڑھے تھے۔ دسویں اور گیارہویں باب میں بہت کچھ ایسی باتیں ہیں جو اصلی نہیں معلوم ہوتیں اور یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ بعد کے قدیم نسخوں مثلاً سی (C) میں ان دو بابوں کا تالیف کرنے والے پین۔ چی کو

نہیں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ دو باب معہ بارہویں باب کے "پی" کے لفظ سے ممیز کر دیئے گئے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشتبہ ہیں۔ اس لیے یہ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ سفرنامے کے اس حصے کی کہانیوں اور حکایتوں پر زیادہ محنت کی جائے۔" (جلد دوم' صفحہ 233)

سنگ یون اور یو کنگ

سنگ یون اور یو کنگ کی چھٹی صدی کے ابتدائی حصے کی سفارت کے مختصر حال کا ترجمہ مسٹر بیل نے "ریکارڈس" کی پہلی جلد میں شائع کر دیا ہے۔ اس کے بعد ایم۔ چاؤنیز نے ایک ترمیم شدہ فرانسیسی ترجمہ معہ حاشیئے کے شائع کیا ہے۔ [۳۷]

اوکنگ کے سفرنامے کا جو آٹھویں صدی میں زیارت کے لیے آیا' سلوین لیوی اور ایم۔ چاؤنیز نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے۔ [۳۸]

ساتویں صدی کے ساٹھ چینی سیاح

ایم چاؤنیز نے یی سنگ کی کتاب کا ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔ (پیرس 1894ء)۔ اس سے بدھ مذہب کے ساٹھ سیاحوں کا حال معلوم ہوتا ہے جو ساتویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان آئے۔

یی سنگ

یی سنگ جو 713ء میں 79 برس کی عمر میں فوت ہوا' خود بھی ایک مشہور سیاح تھا۔ "یہ عظیم الشان راہب جو چین میں اتنا ہی مشہور ہے جتنا کہ ہیون سانگ' دراصل ایک عالم اور ان تمام چینی سیاحوں میں' جن سے کہ ہم واقف نہیں ہیں' سنسکرت داں شخص تھا۔ وہ ساٹرا میں ہندو مدرسوں میں ایک مدت تک رہا۔ اس کے بعد دس برس تک وہ نلندا کی مشہور و معروف جامعہ میں مقیم رہا' جہاں اس کو اس زمانے کے بہترین استاد ملے۔ اسی وجہ سے وہ سنسکرت کے پڑھانے اور اس زبان کے پورے تعلیمی نصاب سے جو اس زمانے میں مروج تھا کامل طور سے واقف تھا اور اسی لیے وہ اس کو نہایت صحت کے ساتھ بیان کرنے میں کامیاب ہوا۔ یہ عجیب و غریب بیان اس کی کتاب "بدھ مذہب کی رسوم و رواج ہندوستان میں" کے چونتیسویں باب پر مشتمل ہے۔" [۳۹]

اس کی دلچسپ کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر جے۔ تککسو نے نہایت عمدگی سے کیا ہے۔ (آکسفورڈ' کلیرنڈن پریس 1896ء)۔ یہ کتاب اگرچہ بدھ مذہب کی تاریخ اور سنسکرت کے علم و ادب کے لیے بہت کافی ہو سکتی ہے مگر سیاسی تاریخ کے لیے بہت ہی کم مواد اس میں سے ملتا ہے۔

حوالہ جات

ؔ1 ”کمبرز اینڈر ۔فلکٹنز آف گوئٹے“ نمبر325‘ مترجمہ بیلے سانڈرس۔

ؔ2 سی۔این۔کے۔ایر۔کتاب سری شنکر آچاریہ۔ہز لائف اینڈ ٹائمز دیباچہ۔ صفحہ 4

ؔ3 کمبرز اینڈر۔فلکٹنز آف گوئٹے نمبر453 تا 543

ؔ4 یہ یگانگت کہہ سکتے ہیں کہ 1818ء سے شروع ہوئی جبکہ پنڈاریوں اور مرہٹوں کی جنگوں کا فیصلہ ہوا۔

ؔ5 مسٹر پرگیٹر کا خیال ہے کہ ”مارکنڈیا پُران کے 57 ویں باب کے تمام دریاؤں اور پہاڑوں کے ناموں پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں بندھیاچل کے نام کا اطلاق صرف دریائے نربدا کے مشرقی جانب کے پہاڑوں پر ہوتا تھا جن کا سلسلہ بھوپال سے بہار تک ہے۔ زیادہ مغربی حصے کا نام معہ کوہ اراولی کے پارپاتر کے نام میں شامل تھا۔(جے۔آر۔اے۔ایس 1894ء صفحہ 258) جدید مصنفین بندھیاچل کے نام کا اطلاق دریائے نربدا کے شمال کے تمام سلسلہ کوہ پر کرتے ہیں صفحہ 12۔

ؔ6 پروفیسر سند ارام پلے۔از تامیلین اینٹیکویری۔نمبر2(1908ء)۔صفحہ 4۔

ؔ7 کلہن کی راج ترنگنی کا ترجمہ مع ایک مقدمے اور چند ضمیموں کے ایم۔اے۔اسٹین نے کیا ہے۔(2 جلد۔کانسٹیبل 1900ء)

ؔ8 جین مذہب کی چند مشہور کتابیں پروفیسر ہرمان جیکوبی نے ترجمہ کی ہیں (ایس۔بی۔ای۔جلد 22 و45)۔جین مذہب پر تمام شائع شدہ کتابوں کے متعلق دیکھو ڈاکٹر گیورینو کی کتاب ”ایسے دی ببلیوگریفی جینا“ (پیرس 1906ء صفحہ 568) اور اس کا ضمیمہ ”نوٹ دی ببلیوگریفی جینا“۔ (جرنل ایشیاٹک۔جولائی و اگست 1909ء) ناظرین بروڈیہ کی کتاب ”ہسٹری اینڈ لٹریچر آف جین ازم“ بھی دیکھیں۔(بمبئی 1909ء)۔مسز سٹیلنر کی کتاب ”نوٹس اون موڈرن جین ازم۔“ (بلیکوال آکسفورڈ 1910ء) جین مت کی تاریخ کا بہترین مختصر بیان ڈاکٹر ہارنل کے خطبہ صدارت میں ملے گا جو انہوں نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے سامنے دیا تھا۔

(پروسیڈنگس اے-ایس-بی 1898ء صفحہ 53--39) بیوہلر کا رسالہ "اویبروی انڈش سکٹ ڈرجینا" (1887ء) کو 1903ء میں برگس نے چھپوایا اور اکثر جگہ سے غلط ترجمہ کیا (زیڈ-ڈی-ایم-جی 1906ء صفحہ 384)۔

؎۹ جاتک کا مکمل ترجمہ جو پروفیسر کاول نے شروع کیا اور ڈاکٹر ڈبلیو-ایچ-ڈی-روس اور دوسرے لوگوں نے ختم کیا- یہ شائع ہو چکا ہے (کیمبرج 1907ء--1895ء انڈکس 1913ء) جاتک کی تاریخ کے متعلق دیکھو رہس ڈیوڈس کی "بدھسٹ انڈیا" صفحہ 208--189۔

؎۱۰ لنکا کی تاریخوں کے تعریفی حالات کے لیے دیکھو رہس ڈیوڈس کی بدھسٹ انڈیا اور دوسرے پہلو کے لیے دیکھو فولکس کے "دیپیٹوڈس آف دی بدھسٹ لٹریچر آف سیلون" (انڈین انٹی کویری جلد 17 صفحہ 100) "بدھاگھوسا" (انڈین-انٹی کویری جلد 19 صفحہ 105) ٹا-سین-کو-"کلیانی انس کرپشنز" (انڈین انٹی کویری جلد 22' جلد 14) وی-اے-سمتھ-اشوکا دی بدھسٹ امپرر آف انڈیا- دوسری ایڈیشن 1909ء- مہاومس کے تین مختلف نسخے ملتے ہیں مگر ہم نے اس نسخے کا حوالہ دیا ہے جس کا ٹرنر نے ترجمہ کیا ہے اور وجیسمبا نے اس پر نظرثانی کی ہے- سب سے آخری ترجمہ پروفیسر گیگر اور مسز بوڈ کا ہے (جے پالی ٹکسٹ سوسائٹی 1912ء) مسٹر جان سٹک کا "انڈکس ٹو دی مہاومس" بھی مفید کتاب ہے (کولمبو 1907ء)- دیپاومس کا ترجمہ پروفیسر اولڈنبرگ نے کیا ہے اور دیکھو گیگر کا دیپاومس انڈ مہاومس (لپزگ 1905ء) انگریزی ترجمہ انڈین انٹی کویری 1906ء صفحہ 153۔

؎۱۱ میکڈانل کی "ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" صفحہ 301- وشنو پُران کا ترجمہ ایچ-ایچ ولسن نے کیا تھا اور ہال نے اس کے ترجمے کی نظرثانی کی اور اس پر حاشیئے ایزاد کیے- مختلف پُرانوں کی تاریخیں جو بھنڈارکر نے "ارلی ہسٹری آف دی دکن" (بمبئی گزٹیئر جلد اول' حصہ دوم (1896ء) میں لکھی ہیں انہیں مسٹر پرگیٹر نے درست کیا ہے- دیکھو ضمیمہ الف اس باب کے آخر میں-

؎۱۲ رالنسن- ہیروڈوٹس- جلد دوم- صفحہ 403' جلد چہارم' صفحہ 207۔

؎۱۳ ان کا میک کرنڈل نے انڈین انٹی کویری جلد 10 صفحہ 296 میں ترجمہ کیا ہے- یہ ترجمہ علیحدہ بھی کلکتہ میں 1883ء میں شائع ہوا ہے-

؎۱۴ اس کو شوینبک نے 1846ء میں صحیح کر کے شائع کرایا اور میک کرنڈل نے 1877ء میں ترجمہ کیا-

؎۱۵ ہندوستان کے متعلق رومی اور یونانی مصنفین کے لکھے ہوئے بیانات کو ایک بڑی تعداد میں ڈاکٹر میک کرنڈل نے چھ کتابوں میں جمع کیا ترجمہ کیا اور ان پر بحث کی- یہ 1882ء اور 1901ء کے درمیان شائع ہوئیں- (1) کیٹیسس' (2) میگاستھینز اور آرین کی کتابیں "انڈکا" (3)

"پیریپلس آف دی اریتھرین سی" (4) ٹولمی کی جغرافیہ۔ (5) "سکندر کا حملہ""
(6) این شنٹ انڈیا۔ رومی اور یونانی مورخین کے تاریخوں کے مطابق۔

۱۶ؔ اس کتاب کے معتبر ہونے کے متعلق دیکھو "انڈین ٹریولز آف اپولونیس آف ٹائیفانہ۔" مصنفہ پریلو۔ 1873ء پروفیسر فلنڈرس پٹری کی کتاب۔ "پرسنل ریلیجن ان ایجپٹ بیفور کرسٹینیٹی" 1909ء اور ان کے علاوہ فلاسٹریٹاس کے کتاب کے دو ترجمے جو پروفیسر فلیمور اور فی۔ سی کونی بیر نے 1913ء میں شائع کیے ہیں۔

۱۷ؔ ایم۔ چاؤنیز نے سوماچین کی کتاب کی نو جلدوں میں سے پانچ شائع کر دی ہیں۔ فرانسیسی چینی علوم کے ماہر خاص طور پر چینی علم و ادب میں ہندوستان کی تاریخ معلوم کرنے پر مائل رہے ہیں اور ان کی بہت سے کتابوں کے حوالے اس تاریخ میں دیئے جائیں گے۔

۱۸ؔ ہم نے اس کتاب میں موریا خاندان کے شہنشاہ کو چندراگپتا اور گپت خاندان کے بادشاہ کو چندرگپت لکھا ہے' تاکہ دونوں ناموں میں تفریق رہے اور ان میں ابہام نہ ہونے پائے۔
12۔

۱۹ؔ دیکھو ضمیمہ "ب" چینی جاتری اس باب کے آخر میں۔

۲۰ؔ اس کتاب کے ذخاد نے تصحیح کی اور ترجمہ کیا۔ مصنف کا پورا نام ابو ریحان محمد ابن احمد تھا۔ مگر آخر میں وہ استاد ابو ریحان کے نام سے مشہور ہو گیا اور البیرونی اس کا لقب ہو گیا۔

۲۱ؔ ایم کارڈیر نے 1903ء مینوئل کے ترجمے کو نئے سرے سے شائع کیا۔

۲۲ؔ مسلمان مورخین اور سیاحوں کی کتابیں پڑھنے کا بہترین ذریعہ ایلیٹ اور ڈوسن کی کتاب "ہسٹری آف انڈیا ایز اٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹوریئنز" ہے۔ (8 جلد 1827ء سے 1877ء تک) یہ نہایت قیمتی کتاب ہے۔ اگرچہ غلطیوں سے بالکل پاک نہیں۔ یہ غلطیاں اکثر جگہ ریورٹی نے درست کر دی ہیں۔ بیلی اور ڈومن کی ہسٹری آف گجرات (1886ء) جس کی صرف ایک جلد ہی شائع ہوئی ہے' بڑی کتاب کا ایک طرح ضمیمہ ہے۔ اس کے علاوہ دیکھو ابو تراب کی تاریخ گجرات تصحیح کنندہ ڈینی سن راس۔ شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔

۲۳ؔ دیکھو ڈاکٹر فلیٹ کا مضمون انڈین اینٹی کویری 1901ء صفحہ 1' اور اسی کا لکھا ہوا باب "ایپی گریفی" انڈین گزیٹیئر جلد دوم۔ 1908ء ہندی کتبوں کے متعلق تمام شائع شدہ کتابوں کی فہرست کا درج کرنا بالکل ناممکن ہے۔ مگر اچھے تصحیح کردہ کتبے مندرجہ ذیل کتب میں ملیں گے۔ انڈین اینٹی کویری ایپی گریفیا انڈکا' ساؤتھ انڈین انسکرپشن۔ ان کتب کے علاوہ ہندی آثار قدیمہ کے محکمے کی تمام رپورٹوں میں کتبوں کا کچھ نہ کچھ اچھا خاصا حال مل جاتا ہے۔ مسٹر لیوس رائس نے "ایپی گریفیا کرناٹیکا" وغیرہ میں ہزارہا کتبوں کا حال لکھا ہے جن کا خلاصہ "میسور اینڈ کرگ فرام انسکرپشنز" میں درج ہے۔ (کانسٹیبل 1909ء) پروفیسر کیلہارن اور پروفیسر

لیوڈر کی "لسٹ" اور ایپی گریفیا انڈکا کے ضمیمہ نمبر 5' 7' 8' 10 بیش بہا چیزیں ہیں۔

۲۴؎ ہندی سکوں کے متعلق چند جدید کتابیں یہ ہیں: ریپسن کی "انڈین کائنز" (سٹربرگ 1898ء) "کیٹلاگ آف دی کائنز آف دی اندھرا ڈائنسٹی ان دی برٹش میوزیم" کننگھم کی "کائنز آف اینشنٹ انڈیا" (1891ء) کائنز آف میڈیول انڈیا 1894ء۔ فان سیلٹ کی کتاب "ڈی نیخ فولکرا لکزینڈرس دی گراسن ان بکٹرین اینڈ انڈین" (برلن 1879ء) پی۔ کارڈنر کی کتاب دی کائنز آف دی گریک اینڈ سیتھک کنگس آف باکتریا اینڈ انڈیا ان دی برٹش میوزیم (1886ء) دی۔اے سمتھ دی خاندان گپت کے سکوں پر تین مضامین (جے۔اے۔ایس۔بی جلد 53' حصہ اول 1884ء۔ جے۔اے۔ایس۔بی۔ جلد 63' حصہ اول 894ء جے۔آر۔اے۔ایس جنوری 1899ء) "اندھرا ہسٹری اینڈ کائینج" (زیڈ۔ڈی۔ایم۔جی) کیٹلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم' جلد اول (1906ء)۔ ایلیٹ کی کتاب "کائنز آف سدرن انڈیا" ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کتابیں اس قدر ہیں کہ وہ درج نہیں کی جا سکتیں۔ جیمز پرنسپ اور دوسرے لوگوں کی کتابیں اب پرانی ہو کر بیکار ہو گئی ہیں۔

۲۵؎ اس کتاب کا پروفیسر کاول اور ٹامس نے ترجمہ کیا ہے (اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ۔ آر۔اے۔ایس 1897ء)

۲۶؎ بیوہلر نے ایک انگریزی مقدمے کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ (بمبئی سنسکرت سیریز نمبر 14' 1875ء) اور انڈین انٹی کویری (جلد 5' صفحہ 324' 317 — 1876ء و جلد 30 — 1901ء صفحہ 12) میں اس پر مکمل بحث کی ہے — 3 میمائرس۔اے۔ایس۔بی۔ جلد سوم 1910ء صفحہ 56—1

۲۷؎ پروسیڈنگس۔ اے۔ ایس۔ بی 1901ء — صفحہ 28 — جی۔ ایچ اوجھا کی کتاب "ارلی ہسٹری آف دی سولنکیز" حصہ اول صفحہ 2' اجمیر 1907ء یہ کتاب ہندی میں ہے۔

۲۸؎ مسٹر وی کے پلے نے اس پر انڈین کویری جلد 18' صفحہ 259 — و جلد 19 صفحہ 329 و جلد 22 صفحہ 141 میں بحث کی ہے — اس کے علاوہ دیکھو "دی تاملز ایٹین ہنڈرڈ ییرس اگو" مدراس 1904ء —

۲۹؎ پروفیسر کیلہارن' پروفیسر جیکوبی' مسٹر آر سیول اور ڈاکٹر جے۔ ایف فلیٹ نے سنین کے متعلق سب سے زیادہ اہم کام انجام دیا ہے — ان کے علاوہ دیگر حضرات بھی اس طرف متوجہ اور ہمارے علم میں ایزاد کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں — ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ قابل قدر کام دیوان ایل۔ ڈی سوامی کنو پلے نے کیا ہے —

۳۰؎ کاول اور ٹامس کا ترجمہ صفحہ 27 — 12

۳۱؎ نورتھ اورینٹل کانگریس کی روئداد — جلد 3 — صفحہ 25 —

۳۲؎ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1903ء صفحہ 93 —

۳۔ ایس۔بی۔ای۔جلد 35۔ صفحہ 6 و صفحہ 247۔

۴۔ انڈین انٹی کویری جلد 25 (1896ء) صفحہ 323۔

۵۔ ایم۔چاونیز اس بات میں ویٹرز اور لیگ سے متفق ہے کہ فاہیان نے اپنا سفر 399ء میں شروع کیا تھا۔

۶۔ ہیون سانگ کے نام کے اختلاف حسب ذیل ہیں:۔
ہیودن تسانگ' (جولین اور وید) ہیون چانگ (میرس)' یون چانگ (ویلی)' ہیون سیانگ (بیل)' یہون چانگ (لیگ)' ہیون کانگ (نجیو)' یان چانگ (رہس ڈیوڈس)۔ یہ فہرست کامل نہیں۔

۷۔ وانجز دی سنگ یون دمنٹس لی اودیا نا ایٹ لاگنذ ھارا۔ (ہنوئی 1903ء) اس قابل قدر کتاب میں اور بھی قدیم سیاحوں کے حالات ملتے ہیں۔ جن میں چی۔منگ بھی (جو 402ء میں فاہیان سے صرف پانچ سال بعد چین سے روانہ ہوا) اور فاینگ (جو 420ء میں روانہ ہوا) کے نام بھی شامل ہیں۔

۸۔ جرنل ایشیاٹک 1895ء۔

۹۔ جے۔اینڈ۔پروسیڈ نگز اے۔ایس۔بی۔1911ء صفحہ 12۔309

دوسرا باب

سکندر سے قبل کے خاندان

600 تا 366 ق م

تاریخ سنین کے علم کے ساتھ محدود ہے

ایک راسخ الاعتقاد ہندو کے لیے ہندوستان کی سیاسی تاریخ تین ہزار برس قبل مسیح سے اس وقت شروع ہوتی ہے جبکہ دریائے جمنا کے کنارے پر کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان مہابھارت کی مشہور و معروف جنگ ہوئی۔[1] مگر موجودہ زمانے کے ایک نقاد مورخ کو ان نظموں میں کہیں صحیح معنوں میں تاریخ کا نام و نشان نہیں ملتا اور اس کو مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ایک طولانی زمانے کو نظرانداز کر دے اور آخر میں اس زمانے میں پہنچے جب اس کو اصلی اور تحقیقی واقعات تاریخ کا پتہ لگ سکے۔ تاریخی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ واقعات ایسے ہوں جن کو سنین کے سلسلے میں لا سکیں۔ اور اگر پوری صحت کے ساتھ ان کی تاریخوں کا تعین نہ ہو سکے تو کم از کم ایسا تو ہو کہ وہ صحت کے نزدیک تر ہو جائیں۔ ایسے واقعات جن کی تاریخ نہ معلوم ہو سکے علم زبان، علم نسل اور دیگر علوم و فنون کے لیے شاید کار آمد ہو سکیں، مگر مورخ کے لیے کبھی مفید نہیں ہو سکتے۔ جدید تحقیقات نے ہندوستان کے زمانہ قبل تاریخ کے متعلق بہت سی نہایت ہی کار آمد اور مفید باتوں پر روشنی ڈالی ہے مگر ازبسکہ ان تمام باتوں کے سنین کا تعین یقین کے ساتھ نہیں ہو سکتا اس لیے مورخ کو مجبوراً انہیں پس پشت ڈال دینا پڑتا ہے، کیونکہ وہ کسی حالت میں بھی اس حد سے باہر نہیں جا سکتا جو سنین معینہ اور غیر معینہ کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔

تاریخی زمانے کا آغاز

ہندوستان کی تاریخ کی اس حد بندی کے لحاظ سے اگر اس کے قدیم ترین زمانے کو لیا جائے تو ابتداء ساتویں صدی قبل مسیح کے نصف سے ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں کہ بحری تجارت کو ترقی ہوئی اور جس میں غالباً رسم تحریر عام ہو گیا۔ اس وقت تک ہندوستان کے سب سے شائستہ باشندے بھی رسم تحریر سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتے ہیں اور ان میں علم کے حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا صرف یہی ذریعہ تھا کہ اپنی یادداشت پر بھروسہ کریں۔[1]

شمالی ہند کی سولہ سلطنتیں

اس زمانے میں ملک کے بہت بڑے بڑے حصوں میں گنجان جنگل تھے، جن میں یا تو وحشی جانور رہتے تھے اور یا کہیں کہیں جنگلی آدمیوں کی بستیاں دکھائی دیتی تھیں۔ مگر اس وقت بھی شمالی ہند کے وسیع قطعات میں بے شمار صدیوں سے ایسی قومیں آباد تھیں جو کم و بیش شائستہ تھیں اور زمانہ قبل تاریخ میں شمال مغربی سرحد کے پہاڑوں کو عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں۔۔ وہ اور قومیں جو غالباً ان قوموں کے مثل ہی متمدن تھیں، کب، کہاں سے اور کس طرح ہندوستان میں داخل ہوئیں اور کس طرح بتدریج تمام دکن اور جنوبی ہند میں پھیل گئیں۔ ان تمام باتوں کا علم ہم کو بالکل نہیں۔ ہمارا تمام مبلغ علم اس قوی اور مضبوط قوم کی تاریخ تک محدود ہے جو ایک آریہ زبان بولتی ہوئی کوہ ہندوکش اور پامیر کی سطح مرتفع کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئی اور پنجاب اور دریائے گنگا کے بالائی میدانوں کو ایک مضبوط اور قوی دماغ کی نسل سے معمور کر دیا، جو بلا شک و شبہ ملک کے اصلی باشندوں پر کہیں فوق رکھتے تھے۔ کوہ ہمالیہ سے لے کر دریائے نربدا تک کا تمام علاقہ متعدد خود مختار ریاستوں میں منقسم تھا۔ جن میں سے بعض تو بادشاہ کے ماتحت تھیں اور بعض میں جمہوری حکومت قائم تھی۔ یہ تمام سلطنتیں کسی بڑے شہنشاہ کے زیر اثر نہ تھیں، دنیا سے بالکل جدا تھیں اور اپنی مرضی سے آپس میں آزادانہ جنگ و جدال میں مشغول ہو سکتی تھیں۔ سب سے قدیم ادبی روایتیں جو غالباً چوتھی یا پانچویں صدی قبل مسیح میں جمع کی گئیں، اور ان میں اس سے بہت قدیم زمانے کے حالات موجود ہیں، اس قسم کی سولہ مختلف سلطنتوں کے حالات بیان کرتی ہیں جو پنجاب کے انتہائے شمال مشرقی علاقے گندھارا سے لے کر، جس میں آج کل پشاور اور راولپنڈی کے اضلاع شامل ہیں، اونتی یا مالوا تک (جس کا دارالسلطنت اُجین تھا اور وہی پرانا نام اب تک قائم ہے) پھیلی ہوئی تھیں۔[2]

مذہب اور تاریخ

قدیم ہندی مصنفین کی وہ کتابیں جن سے ہم اپنی تاریخ کا تمام مواد اخذ کرتے ہیں، دراصل حقیقی معنوں میں تاریخ کے فن کی کتابیں نہیں بلکہ مذہبی مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں مذہبی عنصر ہر حالت میں زیادہ ہوتا ہے اور دنیاوی معاملات پر کم توجہ کی جاتی ہے۔ سیاسی تاریخ کے وہ واقعات جن کا ضمناً ان کتابوں میں ذکر آجاتا ہے۔ صرف ان ملکوں کے متعلق ہوتے ہیں جن میں ہندوستان کے مذاہب نے نشوونما پائی ہو۔

جین مت اور بدھ مت

وہ مذاہب جو آج کل جین مت اور بدھ مت کے نام سے مشہور ہیں دراصل زمانہ قبل تاریخ کے فلسفیوں کی فراموش شدہ موشگافیوں سے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن جس صورت میں کہ وہ ہمارے سامنے آئے ان کے بانی وردھمان مہاویر اور گوتم بدھ تھے۔ یہ دونوں فلسفی جو ایک مدت تک ہمعصر بھی رہے ہیں، سلطنت مگدھ یا موجودہ جنوبی بہار کے علاقے میں یا اس کے قریب پیدا ہوئے، وہیں زندگی بسر کی اور وہیں مرگئے۔ مہاویر ویشالی کے جو دریائے گنگا کے شمال میں ایک مشہور شہر تھا ایک امیر کا بیٹا اور سلطنت مگدھ کے شاہی خاندان کا قریبی رشتہ دار تھا وہ موجودہ ضلع پٹنہ کے قریب پاوا کے مقام پر اسی سلطنت کے حدود میں فوت ہوا۔

گوتم بدھ اگرچہ انتہائے شمال میں نیپال[4] کی پہاڑیوں کے دامن میں شاکیہ ریاست کی حدود کے اندر پیدا ہوا، مگر اس نے مگدھ کے علاقے کے اندر گیا کے مقام پر اپنی تمام ابتدائی اور قابل یاد ریاضتوں کو پورا کیا۔ اُس کے مذہب کی تبلیغ کا ایک زمانہ اسی سلطنت میں گزرا۔ اس لیے بدھ اور جین مذہبوں کی کتابیں وریجی اتحاد پر (جس کا دارالسلطنت[5] ویشالی تھا) اور مگدھ اور اس کی ماتحت سلطنت (بھاگلپور) کے واقعات پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں۔

کوشل اور کاشی

کوشل کی ہمسایہ سلطنت یعنی موجودہ اودھ کا صوبہ بہت سے تعلقات کی وجہ سے مگدھ کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس کا دارالسلطنت سراوستی، جو دریائے راپتی کے کنارے شمال میں پہاڑوں کے دامن میں واقع تھا، بدھ کے بہت سے وعظوں اور کتھاؤں کے لیے مشہور ہے۔[6]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی قبل مسیح میں کوشل کی سلطنت کی وہی قدرومنزلت تھی جو آخر میں مگدھ کو حاصل ہوگئی اور وہ شمالی ہند کی سب سے عظیم سلطنت شمار ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے

حریف سلطنت کے پہلو بہ پہلو اس کا ذکر بھی آتا ہے۔ ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی زمانے کے شروع ہی میں کاشی یا بنارس کی چھوٹی سلطنت کی خودمختاری سلب ہو چکی تھی اور وہ کوشل کے ساتھ اس طرح ملحق ہو چکی تھی کہ اب اس کے تمام تعلقات اسی کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ یہ مختصر سی سلطنت صرف اسی وجہ سے مشہور نہیں کہ کوشل کی عظیم الشان ہمسایہ سلطنت سے اس کا تعلق تھا۔ بلکہ اس سبب سے بھی مشہور ہے بدھ مذہب کی تاریخ میں وہ ایک سب سے پاک مقام اور وہ جگہ ہے جہاں بدھ نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی اور "دھرم کے پہیئے کو گھمایا۔"

سلطنت مگدھ کے بادشاہ

مگدھ کی سلطنت میں بنارس اور گیا کی جو شہرت راسخ الاعتقاد ہندوؤں میں ہے اس کی وجہ سے حاصل شدہ تاریخی مواد میں کچھ زیادتی نہیں ہوتی۔ یہ تمام مواد جین اور بدھ مذہب کی کتابوں سے حاصل ہوتا ہے جنہیں قدیم دیوتاؤں کے پوجنے والے کافر سمجھتے تھے۔ مگر پرانوں میں' جو صدیوں بعد ان ہی دیوتاؤں کی مدح میں تالیف ہوئے' خوش قسمتی سے مگدھ سلطنت کے (جو ان کی تالیف کے زمانے سے قبل ہی ہندوستان کا سیاسی اور مذہبی مرکز ہو گیا تھا) بدھ مذہب کے اور بادشاہوں کی فہرست محفوظ رہ گئی ہے۔ اس طرح جین' بدھ اور برہمنوں کے مذہب کی یہ سب کتابیں مل کر ہم کو مگدھ' انگا' کوشل' کاشی اور ویشالی کی تاریخ کے بہت سے حالات سے آگاہ کرتی ہیں۔ مگر ان کے علاوہ ملک کے اور سب حصوں کے حالات بالکل تاریکی میں رہ جاتے ہیں۔

شیش ناگ خاندان

پرانوں کی ان فہرستوں میں سب سے قدیم خاندان جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے' اپنے بانی خاندان شیش ناگ کے نام سے مشہور ہے۔ بظاہر وہ ایک چھوٹی سی ریاست کا راجا یا بادشاہ تھا جس میں موجودہ زمانے کے اضلاع پٹنہ اور گیا شامل تھے۔ اس کا دارالسلطنت گیا کی پہاڑیوں کے قریب راج گری (راج گریہہ) کے مقام پر تھا۔ اس کے عہد کی تاریخ کے متعلق کچھ معلوم نہیں' سوائے اس کے کہ اس نے اپنے بیٹے کو بنارس میں چھوڑا اور راج گری کے قریب گری یوارج میں رہنے لگا۔ اس کے بعد کے دوسرے تیسرے اور چوتھے بادشاہوں کے متعلق بھی سوائے نام کے کچھ معلوم نہیں۔

بمب سار (تقریباً 530ق م)

سب سے پہلا بادشاہ جس کے کچھ حالات واقعی طور سے معلوم ہیں بمب سار یا سرنیک تھا اور وہ اپنے خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے نیا راج گریہہ قدیم قلعے کی پہاڑیوں کے سلسلے کے باہر شمال کی طرف تعمیر کرایا۔ علاوہ بریں اس نے انگا کی چھوٹی سلطنت کو جو مشرق میں آج کل کے ضلع بھاگل پور کے مقام پر واقع تھی اور جس میں ضلع منگھیر[8] شامل تھا اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کر لیا۔ انگا کی سرزمین کا قبضہ مگدھ سلطنت کی اس عظمت و شان کا پیش خیمہ تھا جو آئندہ صدی میں اسے حاصل ہوئی۔ اس طرح بمب سار کو ہم حقیقتاً مگدھ سلطنت کی عظمت کا حقیقی بانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس نے ہمسایہ سلطنتوں کے خاندانوں میں شادی کر کے اپنی قوت میں اور بھی اضافہ کیا۔ ایک شادی اس نے کوشل کے شاہی خاندان میں کی اور دوسری ویشالی[9] کے زبردست لکھوی خاندان میں۔ اس موخر الذکر شاہزادی کا بیٹا اجات شترو تھا جو کُونِک یا کونیہ بھی کہلاتا ہے۔ یہی آخر میں بمب سار کا ولی عہد مقرر ہوا۔ اگر ہمارے اسناد قابل اعتبار سمجھے جائیں تو بمب سار نے اٹھائیس برس حکومت کی اور روایت ہے کہ اپنی حکومت کے آخر میں اس نے تمام شاہی طاقت کی باگ اپنے چہیتے بیٹے کے ہاتھ میں دے دی تھی اور خود سلطنت سے دست کش ہو گیا۔ مگر نوجوان شہزادہ اپنے باپ کی موت کیلئے بے چین تھا اور اتنا طویل انتظار نہ کرنا چاہتا تھا کہ فطرت اپنا کام آہستہ آہستہ کرے۔ نہایت قابل اطمینان شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پدر کشی کا مجرم تھا اور یہ کہ اس نے اپنے باپ کو فاقہ دے کر ہلاک کر ڈالا۔

دیودت

بدھ مذہب کے راسخ الاعتقاد پیروؤں کی روایات کے مطابق بدھ کے چچازاد بھائی دیودت نے اس قبیح جرم پر اجات شترو کو اکسایا تھا۔ دیودت ایک بداندیش اور شریر تفرقہ انداز ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔[10] مگر اس الزام کے لگانے میں یہ بھی ممکن ہے کہ مقتدایان مذہب بھی شریک ہوں۔ دیودت نے یقیناً گوتم بدھ کی تعلیمات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور گزشتہ بدھوں کی تعلیمات کو مرجح سمجھ کر خود ایک مذہبی فرقے کا بانی ہو گیا تھا جو ساتویں صدی عیسوی تک باقی رہا۔[11]

راسخ الاعتقاد لوگوں کے خیال کے مطابق فرقہ بندی بدترین گناہوں میں شمار ہوتی ہے اور ہر زمانے میں مذہب کا وہ منکر جو اپنے حریف کے مقابلے میں ناکامیاب رہا ہو' فاتح فریق کی نگاہ میں

بد ترین خلائق ہو جایا کرتا ہے۔ غالباً دیودت کے بہت سے فتنہ و فساد کی حکایتوں کی اصلی غایت یہی امر ہے' اور اس کے ساتھ ممکن ہے کہ اپنے مربی کو اس کے باپ کے قتل کے لیے اشتعال دلانا بھی اس قسم کی حکایتوں میں شامل ہو۔

اس میں بظاہر کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ جین مت کا بانی وردھمان مہابیر اور آخری بدھ گوتم جو بدھ مت کا بانی ہوا عب سار ہی کے عہد حکومت میں مگدھ کی سلطنت میں اپنے مذاہب کی تبلیغ کر رہے تھے۔ مگر ان روایات کے سنین کو واقعات سے مطابقت دینی مشکل ہے۔

مہابیر اور بدھ کی موت

جین مت کا بانی جو اجات شترو کی ماں کا قریبی رشتہ دار تھا' غالباً عب سار کے عہد حکومت کے آخری زمانے میں فوت ہوا اور گوتم بدھ کی موت اجات شترو کی سلطنت کے آغاز میں مہابیر کی موت کے تھوڑی مدت بعد ہی واقع ہوئی۔ یہ باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ بدھ کی تاریخ وفات 487 ق م یا اس کے قریب ہے۔[۱۲]

بدھ اور اجات شترو کی ملاقات

جس وقت کہ اجات شترو یا بقول جین کونک مگدھ کے تخت پر 502 ق م یا 500 ق م میں بیٹھا تو بدھ بلاشک و شبہ عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اجات شترو نے کم از کم ایک مرتبہ ضرور اس سے ملاقات کی۔

بدھ مذہب کی ایک قدیم کتاب میں بدھ کی اجات شترو سے ایک ملاقات کا نہایت ہی مفصل حال محفوظ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اجات شترو نے اپنے گناہ پر افسوس اور ندامت کا اظہار کیا' بدھ کو مانا اور اس نے اس کے گناہ کا کفارہ قبول کیا۔ اس حکایت کا آخری حصہ یہاں اس وجہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے بدھ مذہب کے خیال کے مطابق حکومت اور مذہب کا آپس میں تعلق معلوم ہوتا ہے۔

اور جب یہ سب کچھ وہ کہہ چکا تو راجا اجات شترو نے مقدس بزرگ سے کہا "اے بزرگ آپ کا یہ ارشاد بہت بجا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شخص گری ہوئی چیز کو پھر اس کی جگہ پر رکھ دے یا پوشیدہ راز کو ظاہر کر دے' یا راہ گم کردہ شخص کو سیدھے راستے پر لگا دے یا اندھیرے میں چراغ لے آئے تاکہ آنکھوں والے گردوپیش کی چیزوں کو دیکھ سکیں۔ بالکل اسی طرح اے بزرگ مقدس بزرگ نے راستی کو کئی شکلوں میں میرے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب اے بزرگ میں مقدس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں تاکہ اس کے دامن میں پناہ لوں اور

سچائی اور سچے مذہب سے ہم آغوش ہو جاؤں۔ دعا ہے کہ وہ بزرگ مجھ کو اپنا چیلا بنالیں۔ ایسا چیلا جو آج کے دن سے لے کر تمام بقیہ زندگی ان ہی چیزوں کی پناہ میں گذارنا چاہتا ہے۔ اے بزرگ گناہ مجھ پر غالب آگیا چونکہ میں کمزور بے عقل اور غلط کار تھا۔ میں نے بادشاہت کے لیے اپنے پارسا باپ کو قتل کر دیا۔ دعا ہے کہ وہ مقدس بزرگ میرے اقرار جرم کو قبول فرمالیں گے۔ مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے تاکہ میں آئندہ اپنے نفس کو قابو میں رکھ سکوں۔"

"اے راجا بیشک اس کام میں گناہ تم پر غالب آگیا۔ مگر اس لیے کہ اب تم خود اس گناہ کو سمجھتے ہو اور سچائی سے گناہ کا اعتراف کرتے ہو، ہم اس کے متعلق تمہارے اعتراف کو قبول کرتے ہیں۔"

"کیونکہ اے بادشاہ! شرفاء کی ریاضت کے متعلق یہ دستور ہے کہ ان میں سے جو اپنے قصور کو قصور سمجھ لے اور پھر راستبازی سے اس کا اعتراف کر لے وہ مستقبل میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے قابل ہوتا ہے۔"

جب وہ یہ سب کچھ کہہ چکا تو اجات شترو نے کہا کہ "اے بزرگ اب میں جانے کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ میں بہت مصروف ہوں اور کام بہت زیادہ ہے۔"

"اے راجا جو تمہارے خیال میں اچھی بات ہے کرو۔"

تب راجا اجات شترو مقدس بزرگ کی گفتگو سے خوش و خرم ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور مقدس بزرگ کو سلام کر کے اس کے دست راست کی طرف سے گذرتا ہوا باہر چلا گیا۔

اب مقدس بزرگ نے راجا اجات شترو کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی بھائیوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ "اے بھائیو! یہ راجا سخت متاثر ہوا ہے اور بہت غمگین تھا۔ اگر راجا اس پارسا انسان اور پرہیزگار بادشاہ یعنی اپنے باپ کو ہلاک نہ کرتا تو اس کی راستی کی صاف شفاف آنکھ ضرور یہیں بیٹھے بیٹھے کھل جاتی۔"[13]

یہ تھا جو مقدس بزرگ نے کہا۔ تمام لوگ اس کی باتوں سے خوش و خرم ہو گئے۔

اس واقعے پر رائے

مگر بھائیوں کی اس خوشی و خرمی میں شریک ہونا ذرا مشکل ہے۔ بدھ کی گفتگو میں ایسے بدترین گناہ کی ملامت کے لیے وہ زوردار اور خوفناک الفاظ نہیں ملتے جن کی اخلاق کے معلم سے امید ہونی چاہیے اور ایک درباری کے طریق سے وہ بات پوری نہیں ہوتی۔ بہرحال تائب بادشاہ کی صدق دلی اور اس کے معترف ہونے کے متعلق ناظرین کا خواہ کچھ ہی خیال ہو مگر بدھ مذہب کی روایتوں کے متفق ہونے سے یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب ضرور ہوا اور واقعی

اجات شترو نے تخت حاصل کرنے کے لیے اپنے باپ کو قتل کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب لنکا کی تاریخیں ہمیں یہ بتلائیں کہ اس کے بعد بھی اور چار پدر کش بادشاہ ایک دوسرے کے بعد تخت پر بیٹھے اور آخر میں چوتھے کو اس کے وزیر نے خود اس کی رعایا کی مرضی کے موافق تخت سے اتار دیا تو ان واقعات کا ماننا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے' باوجود اس کے کہ بعینہ اس قسم کے واقعات پارتھیا کی تاریخ میں ملتے ہیں۔[۱۴]

کوشل کے ساتھ جنگ

وہ جرم جس سے کہ اس نے تخت حاصل کیا قدرتی طور پر کوشل کے راجا کے ساتھ ایک جنگ کا سبب ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس راجا کی بہن یعنی بمب سار کی ملکہ نے اپنے شوہر کے غم میں جان دے دی۔ جنگ میں قسمت نے کبھی ایک فریق کا ساتھ دیا اور کبھی دوسرے فریق کا۔ اور ایک موقع پر کہا جاتا ہے کہ اجات شترو قید ہو کر اپنے دشمن کے دارالسلطنت میں بھیج دیا گیا تھا۔ آخر میں صلح ہو گئی اور کوشل کی ایک شہزادی مگدھ کے راجا سے بیاہی گئی۔ اس جنگ کے تمام واقعات تاریکی میں ہیں۔ کیونکہ وہ مختلف حکایتوں میں اس طرح پوشیدہ ہیں کہ ان سے ان کا نکالنا بالکل ناممکن ہے۔ مگر غالباً اجات شترو نے کوشل کے بادشاہ پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ اس کے بعد کوشل کی خود مختار سلطنت کا پھر کبھی ذکر نہیں آتا اور چوتھی صدی قبل مسیح میں وہ صریحاً مگدھ کی سلطنت کا ایک جزو قرار پا جاتی ہے۔

ویشالی کی فتح

کوشل کی تسخیر سے اس کی فتوحات کی حرص پوری نہ ہوئی اور اب اجات شترو نے دریائے گنگا کے شمالی حصے کو' جسے آج کل ترہٹ کہتے ہیں' فتح کرنے پر کمر باندھی۔ اس میں اس وقت لکھوی قوم آباد تھی جو بدھ مذہب کی روایتوں میں بہت مشہور ہے اور جو غالباً تبتی نسل سے ہے۔ اسی قوم کا اس علاقے میں دور دورہ تھا۔ یہ حملہ بالکل کامیاب ثابت ہوا۔ لکھوی قوم کا پایۂ تخت فتح ہو گیا اور اس طرح اجات شترو اپنے نانا کی سلطنت کا مالک ہو گیا۔[۱۵] یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس فتح کے بعد بھی فاتح نے دم نہیں لیا بلکہ پہاڑوں کے دامن تک کا تمام علاقہ زیر کر لیا' اور یہ کہ اس وقت دریائے گنگا اور ہمالیہ کے درمیان کا تمام علاقہ مگدھ سلطنت کے ماتحت ہو گیا۔

پاٹلی پتر کی بناء

فاتح نے پاٹلی گاؤں کے مقام پر دریائے سون اور گنگا کے سنگم پر اپنی حریف لکھوی قوم کو قابو

میں رکھنے کے لیے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اسی قلعے کے زیرِ پناہ ایک شہر کی بنیاد اس کے پوتے اُدیا نے ڈالی۔ اس طرح جو شہر آباد ہوا تھا مع دوسری بستیوں کے جو مختلف زمانوں میں اس کے قریب پیدا ہو گئیں، کسم پور یا پاٹلی پتر کے ناموں سے مشہور ہو گیا اور اس نے بتدریج شان و شوکت اور وسعت میں اس قدر ترقی کی کہ موریا خاندان کے زمانے میں وہ نہ صرف مگدھ بلکہ تمام ہندوستان کا دار السلطنت بن گیا۔[16]

شاکیہ کا قتل عام

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بدھ اجات شترو کے عہد حکومت میں فوت ہوا اور بقول مہاومس کے (جو اور تفاصیل کیلئے قابل اعتبار نہیں) یہ واقعہ اس کی حکومت کے آٹھویں سال میں واقع ہوا۔[17] اس کی موت سے کچھ عرصے قبل اس کے وطن کپل وستو کو کوشل کے راجا ورودھک نے فتح کیا اور روایت کے مطابق بدھ کی قوم شاکیہ کا نہایت بے دردی سے قتل عام کرایا اور یہ تمام واقعات اس قدر خوارق عادات کی حکایتوں سے بھرے ہوئے ہیں کہ اس کی تفصیل پورے یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ تمام رنگ آمیزی ضرور ہے کہ واقعات ہی پر ہوئی ہو اور ہم یہ مان سکتے ہیں کہ داقعی شاکیہ کی قوم نے ورودھک کے ہاتھوں بہت مصیبت اٹھائی تھی۔[18]

ایرانی فتوحات

اگر سنین و تواریخ کا وہ سلسلہ جو اس کتاب میں استعمال کیا گیا ہے تقریباً صحیح ہو تو بھی بمب سار اور اجات شترو دارا گشتاسپ شاہ ایران کے (جس نے 521ق م سے 485ق م تک حکومت کی) ہمعصر سمجھے جا سکتے ہیں۔ دارا ایک نہایت ہی لائق بادشاہ تھا اور اس نے اپنے افسروں کو مختلف مہموں پر روانہ کر کے ایشیاء کے ایک بڑے حصے کو چھان ڈالا۔

تقریباً 500ق م

ان میں ہی سے ایک مہم 516ق م کے بعد روانہ کی گئی تاکہ دریائے سندھ کے دہانے اور ایران کے درمیان بحری راستہ دریافت کرے۔ اس کے امیر البحر سکائلیکس نے جو کیریا کے ایک قصبہ کرنیڈا کا رہنے والا تھا گندھار کے علاقے میں پنجاب کے دریاؤں پر جہازوں کا ایک بیڑا تیار کرایا اور وہاں سے بحر ہند کو عبور کرتا ہوا 30ویں مہینے میں بحیرۂ قلزم میں داخل ہوا۔ اس عجیب و غریب سفر کے تمام حالات بالکل ضائع ہو گئے ہیں۔ مگر یہ معلوم ہے کہ اس امیر البحر نے جو خبریں اثنائے سفر میں جمع کیں وہ ایسی تھیں جن پر عمل کر کے دارا نے دریائے سندھ کے میدانوں پر قبضہ

کرلیا اور اپنے جہاز بحر ہند تک پہنچا دیئے۔ چنانچہ دارا کی فوج میں ہندی تیر اندازوں کا دستہ سب سے زیادہ قابل سمجھا جاتا تھا اور وہ پلاٹیا کے مقام پر مارڈونیئس کی شکست میں شریک تھا۔ (469ق-م)

ہندی سترابی (صوبہ)

ہندوستان کا مفتوحہ حصہ ایک علیحدہ بیسویں سترابی (یا صوبہ) بنایا گیا اور وہ تمام ایرانی سلطنت میں سب سے زیادہ دولت مند اور آباد صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا خراج 360 ٹیلنٹ سونا' یا 185 ہنڈرڈ ویٹ تھا جو انگریزی سکے کے ایک ملین کے برابر ہوتا ہے۔ یہ خراج ایرانی سلطنت کے تمام ایشیائی صوبوں کے خراج کا ایک تہائی حصہ تھا۔ اگرچہ اس وقت اس صوبے کی صحیح حدود کا پتہ نہیں لگ سکتا مگر ہم کو یہ معلوم ہے کہ وہ اریا (ہرات) اراکوسیا (قندھار) اور گندھاریا (شمالی مغربی پنجاب) کے علاقے نہ تھے اور اس لیے وہ دریائے سندھ کے گرد کا علاقہ ہوگا یعنی کالاباغ سے سمندر تک کی تمام زمین جس میں تمام سندھ اور شاید دریائے سندھ کے مشرق میں پنجاب کا ایک بڑا حصہ تھا۔ لیکن اس زمانے کے دو سو برس بعد جب سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دریائے سندھ ہندوستان اور سلطنت ایران کے درمیان حد فاصل تھا اور سندھ اور پنجاب پر بے شمار ہندی راجا حکمران تھے۔ [19] زمانہ قدیم میں دریاؤں کے راستے آج کل کے راستوں سے بالکل مختلف تھے اور پنجاب اور سندھ کے دو وسیع قلعے جو آج کل ویران اور غیر آباد پڑے ہیں کسی زمانے میں سرسبز و شاداب تھے۔ [20] یہی بات اس خراج کی عظیم مقدار کو سمجھنے کے لیے کافی ہے جو سلطنت ایران کو اپنے بیسویں صوبے سے وصول ہوتا تھا۔

تقریباً 475ق م' درسک

جب اجات شترو کی خونخوار زندگی ختم ہوگئی تو پرانوں کے بیان کے مطابق اس کا بیٹا درسک نامی اس کا جانشین ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا اُودیا [21] تخت پر بیٹھا۔ بدھ مذہب کی کتابیں غلطی سے درسک کے درمیانی نام کو حذف کر جاتی ہیں اور اُودیا کو اجات شترو کا جانشین اور بیٹا بتلاتی ہیں۔ مگر درسک کے وجود اور اس کے راجا مگدھ ہونے کا ثبوت بھاس کے ڈراما واسودت کی دریافت سے ملتا ہے جو شاید تیسری صدی بعد مسیح میں لکھا گیا اور جس میں درسک کا ذکر ہے کہ وہ وتس کے راجا اُدیان اور اونتی کا اُجین کے راجا مہاسین کا ہمعصر تھا۔ [22]

اُودَیاوغیرہ ' تقریباً 450 ق م

اودیا کی حکومت قیاساً 450 ق م میں شروع ہوئی اس کے متعلق صرف یہی روایت ہے کہ اس نے پاٹلی پتر یا زیادہ صحیح طور پر کسم پور کو تعمیر کرایا۔

417 ق م

پُرانوں کی فہرستوں کے مطابق اس کے جانشین نندوردھن اور مہانندن ہوئے۔ ان کے صرف نام ہی نام معلوم ہیں اور کچھ اور حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کا طولانی عہد حکومت یعنی نندوردھن کے چالیس یا بیالیس سال اور مہانندن کے تینتالیس سال جو مجموعاً تراسی یا پچاسی برس کی مدت ہے ' بظاہر غلط نہیں ہو سکتا۔ خاندان کے آخری بادشاہ مہانندن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شودر یا نیچ ذات کی عورت سے اس کا ایک بیٹا مہاپدم نند ای تھا۔ اس نے تخت کو غصب کر لیا اور اس طرح نند خاندان کا بانی ہوا۔

نند خاندان ' 372 ق م

یہ واقعہ غالباً 372 ق م ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کے ہماری تمام سندیں فہم اور اعتبار کے قابل نہیں رہتیں۔ پُرانوں کے مطابق نند خاندان نے صرف دو پشت حکومت کی جس میں ایک مہاپدم تھا جو اٹھاسی برس حکمراں رہا اور اس کے بعد اس کے آٹھ بیٹے جنہوں نے مجموعی طور پر صرف بارہ سال حکومت کی اور جن میں سے پہلے کا نام سکلپ تھا ' جس کا نام مختلف طور پر لکھا جاتا ہے۔ [۲۳] اس طرح یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ان دو پشتوں نے سو برس حکومت کی۔ جین مذہب والے اور بھی زیادہ عقل سے بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس خاندان کا زمانہ حکومت 155 برس بتاتے ہیں ان کے بعد بدھ مذہب والوں کی کتابیں مہاومس ' دیپاومس اور اسوکاودان ایسی متضاد اور پریشان حکایات بیان کرتی ہیں جن کا ذکر تک کرنا بالکل بیکار ہے۔ اس سے تمام حالات پر اور زیادہ تاریکی چھا جاتی ہے "نونندون" کی تاریخ کو اس طرح تمام روایات میں خراب کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی مگر اس وقت اس وجہ کے متعلق کسی قسم کا خیال ظاہر کرنا بھی مشکل ہے۔

یونانی بیانات

یونانی اور [illegible] مؤرخین نے ہندوستان کے متعلق تمام معلومات میگاستھنیز یا سکندر کے

ساتھیوں سے حاصل کی تھیں اور اس طرح ہم ان کو ایسی ہمعصر شہادت مان سکتے ہیں جنہوں نے دوسرے کی باتیں بیان کی ہوں۔ یہ لوگ حقیقی تاریخ پر تھوڑی بہت روشنی ڈالتے ہیں جب سکندر دریائے ہائے فے سس (جہلم) پر آکر 326 ق م میں رک گیا تو ایک ہندی راجا بھگل یا بھگیل نے اسے بتایا اور پورس نے اس کی تصدیق کی۔ گنگیر دی اور پارسی قوم کا بادشاہ جو دریائے گنگا کے کنارے پر حکمراں تھا اور اس کا نام' جہاں تک کہ یونانی ان غیرمانوس الفاظ کو ادا کر سکتے تھے' زندرامس یا اگر امیس تھا۔ اس راجا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کی فوج میں 20000 سوار 200000 پیادے' 2000 رتھیں' 3000 اور 4000 ہاتھی شامل تھے۔ کیونکہ بلاشک و شبہ پارسی قوم کا پائے تخت پاٹلی پتر میں تھا۔ اس لیے یہ تمام خبریں جو سکندر کو دی گئیں صرف مگدھ کے راجا کے متعلق ہو سکتی ہیں اور مگدھ کا یہ بادشاہ ضرور دیسی روایتوں کے مطابق نند خاندان کا کوئی نہ کوئی راجا ہو گا۔[۲۴] اس بیان کے مطابق راجا اپنے مظالم اور اپنے کمینہ پن کی وجہ سے بہت ہی بدنام تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایک حجام کا بیٹا ہے۔ جس نے شاہی خاندان کے آخری بادشاہ کی ملکہ کے ساتھ تعلق پیدا کیا تھا اور بالآخر بادشاہ کو قتل کر کے اس کے بیٹوں کا سرپرست بننے کے بہانے سے ان پر قبضہ کیا' اور آخر تمام شاہی خاندان کے افراد قتل کر کے تخت حاصل کر لیا۔ اس کے بعد اس کا ایک بیٹا پیدا ہوا جو سکندر کے حملے کے وقت برسر حکومت تھا اور "اپنے باپ کے آبائی پیشے سے زیادہ مناسبت رکھنے کی وجہ سے اپنی رعایا میں نہایت حقیر و ذلیل تھا۔"[۲۵]

ہندی روایات

یہ حکایت پُرانوں کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہے کہ نند خاندان کی ابتداء مشتبہ تھی اور اس کی صرف دو پشتوں نے حکومت کی۔ سب سے قدیم پُران میں نند خاندان کے پہلے بادشاہ مہاپدم کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ "قسمت نے اس کی یاوری کی اور اس کے حکمراں ہونے سے چھتری یعنی اعلیٰ ذات کے بادشاہوں کی حکومت ختم ہو گئی اور نیچ ذات یعنی شودروں کی سلطنت کا آغاز ہوا۔" کتاب مہاومس جس میں نند خاندان کے آخری بادشاہ کو "دھن" یعنی "دولت" کا خطاب دیا ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پہلے نند کو حریص اور لالچی ہونے کا الزام لگا رہی ہے۔ چینی سیاح ہیون سانگ بھی نند خاندان کے راجا کو بہت دولتمند بیان کرتا ہے۔[۲۶]

خلاصہ

تمام حالات کو خیال میں رکھ کے ہم تقریباً پوری صحت کے ساتھ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ نند

خاندان کی ابتداء واقعی نیچ ذات سے ہوتی ہے' کہ اس نے اصلی بادشاہ کو قتل کر کے سلطنت حاصل کی اور صرف دو پشتوں تک اس پر قابض رہے۔ ان غاصبوں کی فوجی قوت کی عظمت' جس کا ثبوت یونانی شہادت سے ملتا ہے۔ دراصل بمب سار اور اجات شترو کی فتوحات کا نتیجہ تھی جس کو ان کے جانشینوں نے بھی بظاہر جاری رکھا۔ مگر نند خاندان کی سلطنت کی حدود کا صحیح اندازہ نہیں لگ سکتا اور نہ ان کے سنین کا تعین صحت اور یقین کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یہ یقینی ہے کہ دو پشتیں ایک سو پچاس برس تک قائم نہیں رہیں اور قرین قیاس ہے کہ وہ سو برس تک بھی نہ ہی ہوں گی۔ بہرحال ان کی صحیح مدت کا تعین ناممکن ہے۔[۲۷] پچاس برس کا زمانہ زیادہ قرین قیاس سمجھ کے اس کو سنین کے سلسلے میں جگہ دی گئی ہے۔ کیونکہ سو برس کی مدت کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

چندر اگپتا موریا کا عروج

"نو نند" کی تعداد بلاشبہ نو تھی تو اس میں شک نہیں کہ ان کے آخری بادشاہ کو چندر اگپتا موریا نے جو اس خاندان کا شاہزادہ ناجائز تعلق سے تھا' تخت سے اتار کے قتل کیا۔[۲۸] اس روایت کا ماننا کسی طرح دشوار نہیں کہ اس انقلاب میں معزول بادشاہ کے تمام عزیز تہ تیغ کیے گئے۔ کیونکہ مشرق میں ایسے انقلاب بغیر بے انتہاء خونریزی کے نہیں ہوتے۔ علاوہ بریں یہ بیان بھی ناقابل اعتبار نہیں کہ غاصب پر تمام شمالی قوتوں نے جن میں کشمیر بھی شامل تھا' متحد ہو کر حملہ کیا تھا اور یہ حملہ چندر اگپتا کے کیماویلی قسم کے وزیر کی سازشوں کی وجہ سے بالکل ناکام رہا۔ اس وزیر کا نام مختلف طور پر چانکیا' کوٹلیا' یا وشنو گپتا بیان کیا جاتا ہے۔ مگر تفصیل کے متعلق ہم کو اپنی صرف واحد سند پر اعتماد کرنا مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ ڈراما واقعات مذکورہ سے صدیوں بعد کا لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح ان عجیب و غریب حکایتوں کا اعادہ بالکل فضول ہوگا جو زیادہ تر دنیا کی عام کہاوتوں میں شامل ہیں اور مختلف کتابوں میں ہو بہو مذکورہ ہیں اور ان میں یہ بیان ہے کہ ہندوستان کے پہلے شہنشاہ چندر اگپتا کی پیدائش اور جوانی کے زمانے میں بہت سے خوارق عادات ظہور میں آئے۔[۲۹]

چندر اگپت کی تخت نشینی

مگدھ کے تخت پر اس کا سن جلوس بالکل صحت کے ساتھ 322 ق م قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں مگدھ کے راجا کی سلطنت وسیع تھی اور یقینی طور پر اس میں ان قوموں کے علاقے شامل تھے جنہیں یونانیوں نے پارسی' گنگریڈی لکھا ہے اور غالباً کوشل' ترہوت یا شمالی بہار اور

بنارس کی سلطنتیں بھی اس کے ساتھ ملحق تھیں۔پاٹلی پتر کے اس انقلاب سے تین یا چار برس پہلے سکندر اعظم طوفان برق و باد کی طرح پنجاب اور سندھ میں سے گذرا تھا اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت چندر اگپتا جو بالکل جوان تھا' عظیم الشان مقدونوی سے ملا تھا۔ [1] بہرحال یہ حکایت خواہ صحیح ہو یا غلط اور میرے نزدیک اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔اتنا یقینی ہے کہ 323 ق م میں سکندر کی وفات کے بعد جو فتنہ و فساد برپا ہوا اس نے نوجوان چندر اگپتا کو اپنے لیے ہاتھ پیر مارنے کا موقع دیا۔ وہ پردیسیوں کے برخلاف دیسی بغاوت کا سرغنہ ہو گیا اور بہت سی مقدونوی افواج کو برباد کیا۔ ہماری سندوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی نند خاندان کی بربادی دریائے سندھ کے پردیسیوں کے علاقے کے حملے سے پہلے واقع ہوئی۔ یہ انقلاب ایک لمحے میں کامل نہیں ہوا۔ کیونکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تمام منزلیں اور مرحلے طے کرنے میں کم سے کم ایک سال گذرا ہو گا۔ جب تمام مخالفت کا بزور شمشیر یا دھوکہ اور فریب سے خاتمہ ہو گیا تو چندر ا گپتا عین ایام شباب میں تمام شمالی ہند کا بادشاہ بن کر نمودار ہوا۔ مگر قبل اس سے کہ ہم چندر اگپتا اور اس کے ان جانشینوں کے حالات بیان کریں جو مگدھ کے تخت پر بیٹھے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم "فلپ کے جنگجو بیٹے" کے ہندی حملے کی تاریخ بیان کر دیں۔

ضمیمہ ت

سنین خاندان ہائے شیش ناگ و نند

امور متعینہ

اگرچہ ممکن الحصول مگر متفرق روایتی مواد سے شیش ناگ اور نند خاندانوں کے سنین کا تعین صحت کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ مگر پھر بھی میں یہ خیال کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ یہ ممکن ہے کہ صحت کے قریب تر درجہ حاصل کر لیا جائے۔ وہ متعینہ امر جس سے کہ گذشتہ زمانے کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔ چندر اگپتا موریا کا سن جلوس یعنی 322 ق م ہے جو یقیناً بالکل درست ہے یا غلطی کا امکان صرف تین سال کے اندر محدود ہے جو یقیناً بالکل درست ہے یا غلطی کا امکان صرف تین سال کے اندر محدود ہے۔ دوسرا متعینہ شیش ناگ کے دس بادشاہوں کی فہرست ہے جو پُرانوں یعنی متسیہ اور وایو کی قدیم ترین تاریخی سندوں میں ملتی ہے۔ ان کی صحت کا ثبوت چند اور شہادتوں سے بھی ہوتا ہے تیسرا امر بدھ کا اغلب ترین سن وفات ہے۔

عہد حکومت کی مدت

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شیش ناگ کے خاندانوں میں دس بادشاہ ہوئے لیکن پُران نے اس خاندان کے عہد حکومت کی بہ ہیئت مجموعی یا انفرادی طور سے جو مدت قرار دی ہے وہ ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ طولانی سلسلے میں ایک پشت کے لیے پچیس سالہ اوسط شاذ و نادر ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ اوسط اور بھی زیادہ اس وقت شاذ ہو جاتی جب کہ ہم ایک پشت کی جگہ مختلف ادوار حکومت پر نظر رکھیں۔

تاریخ انگلستان میں دس بادشاہوں یعنی چارلس ثانی سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک کا عہد حکومت، اگر چارلس ثانی کو ہم اس کے باپ کی موت ہی سے بادشاہ قرار دے دیں، تو 1649ء سے

1901ء تک صرف 252 کا ہوتا ہے۔ اس میں ملکہ وکٹوریہ اور جارج ثالث کی طولانی حکومتیں بھی شامل تھیں۔ اس لیے 252 برس کی اوسط کو بڑی سے بڑی مقدار قرار دیا جاسکتا ہے۔ پُرانوں کی تعداد یعنی 321 اور 332 جو مختلف بادشاہوں کے عہد حکومت کو جمع کرنے سے حاصل ہوتی ہے' اس قابل ہے کہ اس کو بلا تامل ناممکن قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ متسیہ کا بیان ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔ "یہ دس شیش ناگ (خاندان) کے بادشاہ ہوں گے۔ شیش 360 برس تک جاری رہیں گے اور چھتریوں کے بادشاہ رہیں گے۔" مسٹر پرگیٹر تجویز کرتے ہیں کہ 360 کے بجائے 163 پڑھا جائے۔ اگر یہ تاویل قبول کرلی جائے تو ہر ایک بادشاہ کی حکومت کا اوسط 16ء3 پڑتی ہے۔ اس حالت میں بدھ کو (سن وفات تقریباً 487 ق م) بمب سار اور اجات شترو کا ہم عصر ثابت کرنا ناممکن ہوگا۔ مگر بہرحال یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ خاندان دو صدیوں سے زیادہ قائم رہا۔

سن کی پیشیں حدود

جیسا کہ نفس کتاب میں بیان ہوا ہے نند خاندان کی دو پشتوں کے لیے 100 یا 155 برس کی مدت جو روایتاً مذکور ہے قابل تسلیم نہیں۔ دفع الوقتی کے لیے پچاس برس قرین عقل مدت قرار دی جاسکتی ہے۔ اس طرح شیش ناگ اور نند خاندانوں کے لیے مجموعاً 302 (50+252) برس کی مدت قرار پاتی ہے اور سن متعینہ (322 ق م) سے پیچھے کی طرف شمار کرنے سے 624 ق م کا سن پہلے بادشاہ شیش ناگ کے ~~لیے~~ سب سے قدیم تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اصلی تاریخ شاید یا ضرور اس کے کچھ بعد ہوگی۔ کیونکہ یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ بارہ حکومتوں (یعنی دس شیش ناگ اور دو نندوں) کی اوسط 16ء25 برس ہو۔

قرین قیاس اصلی ادوار حکومت

پانچویں اور چھٹے بادشاہ بمب سار یا سرینک اور اجات شترو یا کونک کے عہد حکومت اس وجہ سے اچھی طرح یاد رہیں کہ ان میں تاریخ مذہب کے متعلق محاربے اور معرکے پیش آئے۔ اس لیے ہم فرض کرسکتے ہیں کہ ان حکومتوں کے زمانے کی تعداد کم و بیش صحت کے ساتھ یاد رہی ہوگی اور اس طرح ہم دایو اور متسیہ کی اس شہادت کو قبول کرنے میں حق پر ہیں کہ بمب سار نے اٹھائیس برس کی حکومت کی تھی۔

اجات شترو کا عہد حکومت مختلف پُرانوں میں پچیس یا ستائیس سال اور تبت اور لنکا کی بدھ مذہب کی روایتوں میں بیس برس بتایا گیا ہے میں سب سے قدیم پُران متسیہ کی فہرست کو صحت کو مان کر اس کی مدت حکومت کو ستائیس سال قرار دیتا ہوں۔ درسک کا اصلی وجود (جس کو متسیہ نے

غلطی سے ومسک لکھا ہے) بھاس کے ڈرامے (واس ودت) سے ثابت ہو چکا ہے۔ متسیہ کی فہرست کے مطابق اس کا عہد چوبیس سال کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اودیا جس کا ذکر بدھ مذہب کی کتابوں میں آتا ہے اور جس کے متعلق روایت ہے کہ اس نے پاٹلی پتر کو تعمیر کیا پرانوں میں اس کا عہد حکومت بتیس برس کا قرار دیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے۔

وایو اور متسیہ نویں اور دسویں بادشاہوں کے لیے ایک دوسرے کے بعد پچاسی اور تراسی برس کا عرصہ قرار دیتی ہیں۔ مگر یہ اعداد خلاف قیاس ہیں اور یہ بھی خلاف قیاس ہے کہ ان دو حکومتوں نے پچاس برس سے زیادہ کا زمانہ لیا ہو۔ اس لیے 46 کے عدد کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے۔

جہاں تک شہادت سے ثبوت ملتا ہے اور دراصل یہ ثبوت کچھ قوی نہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخر حکومتوں کی مدت طبعی عدد سے بہت زیادہ تھی اس لیے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ شروع کی چار حکومتیں جن کے متعلق ہم کو کچھ علم نہیں مقابلتاً قلیل مدت کی تھیں اور مجموعی طور پر ستریا اسی برس سے زیادہ نہ ہوں گی۔ اگر یہ فرض کرلیں کہ یہ حکومتیں بھی طولانی تھیں تو خاندان کی مجموعی مدت جس کا آغاز کا سن 600 ق م یا اس سے ذرا قبل تھا بے طرح زیادہ ہو جاتی ہے۔

مہابیر اور گوتم کے روایتی سنین

بہت سی مفصل روایتوں کے موجود ہونے سے جو محض لایعنی حکایتیں ہی نہیں۔ یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ مہابیر جین مت کا بانی اور گوتم بدھ بہت زمانے تک ایک دوسرے کے ہمعصر رہتے تھے اور بمب سار اور راجات شترو کے معاصر تھے۔ [1]

روایتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مہابیر بدھ سے پہلے فوت ہوا تھا۔ ان دونوں بانیان مذہب کی موت ہندوستان کی تاریخ مذاہب کے نہایت ہی روشن زمانوں کا آغاز ہے اور مذہبی مصنفین سنین کے ظاہر کرنے کے لیے ان کے برابر حوالے دیتے ہیں۔ اس لیے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ ان دونوں واقعات کے روایتی سنین فوراً خاندان سنین کا پتہ اور سراغ دیں گے۔ مگر متضاد روایتوں پر غور کرنے سے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ مہابیر کی وفات کا سب سے زیادہ مشہور سن یعنی 527 (8-527) ق م محض بہت سے روایتی سنین [2] میں سے ایک ہے اور یہ ناممکن ہوتا ہے کہ جین روایات کو آپس میں یا چندر اگپتا کی تقریبی صحت کے ساتھ دریافت شدہ تاریخ کو کسی طرح مطابقت دی جا سکے۔

بدھ کا سن وفات 487ء

بدھ کی وفات [3] کے واقعے کی تاریخ کا اختلاف اس قدر ہے کہ وہ شمار نہیں ہو سکتا۔ مگر

تین بالکل مستقل دلیلوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تقریباً صحیح تاریخ 487 یا 486 ق م ہے۔ (۱) نقطوں سے شمار کا دفتر جو کینٹن میں 489 تک رکھا گیا ہے' اس سن تک 975 نقطے ظاہر ہوتے ہیں یعنی 489-975-486 کے (فلٹس ۔ جے ۔ آر ۔ اے ۔ ایس ۔ 1905ء صفحہ 51)۔

(۲) سوانح واسوبندھو کے مصنف پرمارتھ نے ورش گن اور وندھیا واس دو مبلغوں کا موجود ہونا' جو دراصل پانچویں صدی عیسوی میں زندہ تھے' نروان کے دس صدی بعد بتلایا ہے۔ (900=413+487)

ختن کی روایت کی ایک صورت دھرم اشوک کا بدھ کے نروان کے 250 برس بعد واقع ہونا بیان کرتی ہے اور اس کو چینی شہنشاہ شی یانگ ٹی سد چین (جس کو دیوار قہقہہ کہتے ہیں) کے بانی کا ہمعصر بتلاتی ہے۔ یہ شہنشاہ 246 ق م میں تخت پر بیٹھا اور 221 ق م "بادشاہ عالم" ہو گیا اور 210 ق م تک حکومت کی۔ (سرت چندر داس ۔ جے ۔ اے ۔ ایس ۔ بی حصہ اول 1886 صفحہ 193-302)

امور جو اس طرح حاصل ہوئے

اگر یہ فرض کر لیں کہ بدھ 487 ق م کے قریب قریب مرا ہے تو اس کا لابدی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اجات شترو نے اس سال سے قبل حکومت کرنی شروع کی اور اس طرح شیش ناگ کے خاندان کے سنین کے لیے ٹھیک اور معینہ مواد مل جاتا ہے۔

پروفیسر گیگر کے خیالات

میں نے پروفیسر گیگر کے مہاومس کے ترجمے کے مقدمے کو نہایت غور سے پڑھا ہے۔ مگر مجھے کوئی وجہ نہیں معلوم نہیں ہوتی کہ میں معاملات زیر بحث کے متعلق اپنی رائے کو بدلوں۔ درسک حالات سے مہاومس کے قدیم ہندی راجوں کی فہرست کا مقابلہ پُرانوں کی فہرستوں سے کم حیثیت ہونا ظاہر ہو گیا ہے۔ میں اب بھی کالاسوک کو باور نہیں کرتا۔ وہ روایات جو مگدھ کے علاقے میں محفوظ رہیں بہرحال ان روایات سے زیادہ قابل اعتبار ہیں جو ایک مدت بعد دور دراز کے ملک لنکا میں چند راہبوں نے جمع کی ہوں۔

موریا سے قبل کے بادشاہوں کے سنین کا صحت کے ساتھ تعین ناممکن ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ میں ان کے نام اور سلسلے کو جیسا کہ متیہ اور وایو قدیم پُرانوں کی فہرستوں میں پایا جاتا ہے صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مگر ان کی حکومت کی مدت پر کسی قسم کا اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ ان میں بعض ممکن ہے کہ صحیح ہوں مگر چند کے متعلق یقین ہے کہ وہ غلط ہیں۔

حوالہ جات

لہ کلجگ کا زمانہ 3102 ق م سے شروع ہوتا ہے اور یدمشتر کے سن اور مہابھارت کی جنگ کا ایک ہی زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر ہیئت داں اس جنگ سے چھ صدی بعد کا واقعہ قرار دیتے ہیں۔ (کننگھم۔ "انڈین ایران" صفحہ 13۔6) دیکھو فلیٹ کا مضمون جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1911ء صفحہ 675 اور آر۔ شام شاستری "گوام آیانا" (میسور 1908ء)۔

ٹہ جے کینیڈی کا مضمون "دی ارلی کامرس آف انڈیا ودھ ۔بلون" 700 ق م سے 300 ق م۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ 1890ء صفحہ 288۔۔241) بیوہلر۔ انڈ۔ انٹی۔ جلد 33' 1904ء ضمیمہ "آن دی اوریجن آف دی ابراہم اینڈ کھروشتی ایلفیٹ" بارنل این ایسی گریفیکل نوٹ آن پام لیف پیپر اینڈ برچ بارک (جے۔ اے۔ ایس بی جلد 69' حصہ اول۔ 1900ء)۔ طرقہ تحریر ممکن ہے کہ آٹھویں صدی قبل مسیح میں یا اس سے بھی پہلے سوداگروں نے مغربی ساحل پر لاکر پھیلاتی ہو۔ وہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ شمالی ہند میں پھیلا' جہاں یہ غالباً ساتویں صدی قبل مسیح میں عام طور پر مروج ہوگیا۔ مگر بہرحال صحیح سنین قائم کرنے کے لیے کوئی مواد موجود نہیں۔ مگر اتنی بات بالکل صاف ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح کے کتبوں کے لکھے جانے سے پہلے رسم تحریر ضرور عام ہوگیا ہوگا۔

سٹہ ان کی مفصل فہرست کے لیے دیکھو رہس ڈیوڈس کی کتاب "بدھسٹ انڈیا" صفحہ 23' اس کتاب کے پہلے دو باب میں پالی زبان کی کتابوں کے کامل حوالے ملتے ہیں جن سے پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کی سلطنتوں اور قبائل کا حال معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر رہس ڈیوڈس ان پالی کتابوں کو دوسرے علماء کی رائے کے برخلاف زیادہ قدیم بتلاتے ہیں۔

ٹہ شاکیہ سلطنت جو موجودہ بستی اور گورکھپور کے اضلاع کے شمال میں واقع تھی اور کوشل سلطنت کی ماتحت تھی۔ "وہ مبارک ذات کوشلا کی رہنے والی تھی۔" (راک ہل کی کتاب "لائف آف بدھ" صفحہ 114) دیکھو جاتک نمبر 465 (کیمبرج کا ترجمہ جلد 4' صفحہ 95)۔

ھہ بساڑ اور بکھیرا کا قریب کا موقع جو ضلع مظفرپور میں پٹنہ کے 27 میل شمالی مغرب میں واقع ہے'

بلاشبہ وہ مقام ہے جہاں ویشالی کا شہر آباد تھا۔ (وی۔ اے۔ سمتھ۔ "ویشالی" جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ 1902ء صفحہ 267 سے صفحہ 288 تک) دیکھو ڈاکٹر بلاک کا مضمون "اکسکویشنز ایٹ بساڑ" آرکیالوجیکل سروے رپورٹ 1904۔1903ء صفحہ 122۔81

۶؎ لیکن اس بات کا نہ ماننا ذرا مشکل ہے کہ شمالی اودھ میں اضلاع گونڈا اور بہرائچ کی سرحد پر سیٹھ میٹھ کے مقام پر جو کھنڈر پائے جاتے ہیں وہ دراصل قدیم سراوستی ہی کے ہیں۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 69۔1068) یہ بات اب بھی باقی رہ جاتی ہے کہ یہ جائے وقوع فاہیان اور ہیون سانگ کے سفرناموں کے مطابق نہیں۔ کیونکہ وہ اس کا موقعہ دریائے راپتی کے کنارے پر نیپال کی سرزمین میں بتاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ 1898ء صفحہ 31۔502 میں دکھایا ہے اور نقشہ دیا ہے۔ (ایضاً 1900ء صفحہ 24۔1) میں بغیر کسی عذر کے یہ نہیں مان سکتا کہ دونوں سیاحوں نے غلطی کی۔ اس بیان میں سراوستی کے قریب جن چار قصبوں کا ذکر ہے ویسے ہی چار قصبے سیٹھ میٹھ کے قریب بھی پائے جاتے ہیں' زیادہ قابل ثبوت ہے۔

۷؎ متسیہ جو سب سے قدیم پُران ہے موجودہ شکل میں غالباً تیسری صدی بعد مسیح کی تالیف ہے اور وایو پُران چوتھی صدی کے نصف اول کی۔

۸؎ جیکوبی۔ انٹروڈکشن۔ جلد 22۔ ایس۔ بی۔ ای۔ راج گری گیا سے شمال مشرق اور پٹنہ سے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ان پہاڑیوں کے دائرے کے اندر کا نہایت ہی قدیم شہر روایت کے مطابق راجا جراسندھ نے آباد کیا تھا۔ اور کوساگار پور کے نام سے مشہور تھا۔ اس وسیع جگہ کا بہترین حال مارشل نے ایونکل رپورٹ آرکی آلوجیکل سروے آف انڈیا 6۔1905ء میں لکھا ہے۔ اس میں اس نے گزشتہ مطبوعات کا حوالہ بھی دیا ہے اور ایک عمدہ نقشہ بھی ساتھ لگایا ہے۔ مگر اس دلچسپ جگہ پر اب تک جتنی کچھ کہ تحقیقات ہوئی ہے برائے نام ہی ہے۔ پوری کھدائی کا کام شاید کئی برس میں ختم ہو گا۔ ہندوستان کے قدیم شہروں کے مخفی رازوں کو کھولنے کی ابھی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔

۹؎ لکھوی قوم بدھ مذہب کی کتابوں میں بہت مشہور ہے۔ جین اسی قوم کو لچھکی (لچھوی) کہتے ہیں (جیکوبی ایس۔ بی۔ ای۔ جلد 22' صفحہ 266' نسبتی تلفظ کے متعلق دیکھو انڈ' انٹی۔ 1903ء صفحہ 233۔

۱۰؎ رہس ڈیوڈس کی "بدھسٹ انڈیا" صفحہ 14' راک ہل کی "لائف آف بدھ" صفحہ 90' 94۔

۱۱؎ فاہیان نے ان منکروں کو 405ء میں سراوستی کے مقام پر دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ "دیودت کے پیروؤں کی ایک تعداد اب تک موجود ہے۔ وہ باقاعدہ طور پر گزشتہ تین بدھوں کے نام پر قربانی چڑھاتے ہیں اور شاکیہ منی کے نام پر نہیں چڑھاتے۔" (لیگ کا ترجمہ' سفرنامہ' باب

22' اس واقعے کے متعلق تمام تراجم متفق ہیں۔) ساتویں صدی عیسوی میں ہیون سانگ نے کرسنورن (بنگال) میں دیودت کے پیروؤں کی تین خانقاہیں دیکھی تھیں۔ (بیل کی ریکارڈ جلد 3' صفحہ 201۔ لائف صفحہ 131) دیودت کے متعلق مفصل حالات راک ہل کی لائف آف بدھ میں ملیں گے اور اسی کتاب میں اس کے فرقے کے ریاضت کے طریقے صفحہ 887 میں درج ہیں۔ اشوک نے کنک منی کے ستوپ کی دو دفعہ مرمت کرائی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے بدھ مذہب کو اختیار کرنے سے ان لوگوں کی کم عزت نہیں کی جاتی تھی۔ ان گزشتہ بدھوں کی تعلیمات کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ ان میں سے تین دراصل موجود تھے: یعنی کرکوچنڈ' کنک منی اور کشیپ۔

۱۲ اختلاف سن کے متعلق دیکھو اس باب کے آخر میں ضمیمہ ج۔

۱۳ رہس ڈیوڈس نے سامنا پھالا سُوتر سے ترجمہ کیا۔ (ڈائیلوگس آف بدھ 1899ء صفحہ 94) اسی سُوتر کا تبتی ترجمہ کا راک ہل نے ترجمہ کیا ہے۔ (لائف صفحہ 95) یہ ملاقات ہرہت کے ستوپ پر منقش بھی ہے۔ (دیکھو کننگھم کی "ستوپا آف بھرہت" صفحہ 16 اور رہس ڈیوڈس کی "بدھسٹ انڈیا" صفحہ 14' شکل 2)

۱۴ مہاومس۔ باب چہارم۔ پارتھیا کے بادشاہوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ اردوڈچس۔ فراٹیس چہارم۔ فراٹیس پنجم۔ جنوبی بہار کی مقامی جین روایات اس کو پدرکشی کا مرتکب نہیں سمجھتیں اور اس کی عمدہ حکومت کے متعلق کہتی ہیں کہ "اس نے ملک پر 80 سال اپنے باپ کے قوانین کے مطابق حکومت کی۔" جو جین مذہب کا تھا اور بھاگلپور وغیرہ میں بہت سی عمارتوں کا بانی ہوا ہے۔ انڈین انٹی کویری جلد 31 (1902ء) صفحہ 71

۱۵ جین روایتوں کے مطابق اجات شترو کی ماں چلنا نامی' ویشالی کے راجا چتک کی بیٹی تھی۔ (دیکھو جیکوبی انٹروڈکشن۔ ایس۔ بی۔ ای جلد 22) تبتی کتاب دُلو کے مطابق اس کی ماں کا نام واسوی تھا اور وہ گوپال کی بھتیجی تھی۔ (راک ہل۔ لائف آف دی بدھ صفحہ 63)

۱۶ کسم پور اور پشپ پور دونوں نام مترادف ہیں۔ یعنی "گلزار شہر۔" پاٹلی کے معنی ایک قسم کے پھول کے ہیں۔ اس قلعے کا تمام حال بدھ مذہب کی کتاب "آزار عظیم" (مہاپارستان) میں درج ہے جس کے تبتی ترجمے کا خلاصہ راک ہل نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ (صفحہ 127) اُدیا کا شہر تعمیر کرنے کا حوالہ وایو پُران میں ملتا ہے۔ اشوک نے پاٹلی پتر کو باقاعدہ پائے تخت مقرر کر لیا۔ مگر اس کے دادا چندر گپت کے زمانے میں ہی جب میگا ستھینز اس کے دربار میں آیا (اس کو بادشاہ کی سکونت کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔) ہیون سانگ' بیل' ریکارڈ۔ جلد دوم صفحہ 85) مختلف بادشاہوں کے پائے تخت غالباً ایک ہی جگہ پر واقع نہ تھے۔

۱۷ تبتی کتابوں کے مطابق بدھ اجات شترو کی' جس نے 32 سال حکومت کی' حکومت کے پانچویں

سال فوت ہوا۔ (راک ہل۔ لائف آف دی بدھ۔ صفحہ 91 و صفحہ 233) مگر یہ تمام بیانات خواہ سیلون کی کتابوں میں پائے جائیں اور یا دوسری کتابوں میں' قابل اعتبار نہیں ہو سکتے۔

۸ یہ حکایت بدھ مذہب کی ہر ایک کتاب میں پائی جاتی ہے۔ رہس ڈیوڈس (بدھسٹ انڈیا صفحہ 11) نے پالی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ کپل وستو کے جائے وقوع اور کھنڈرات کے متعلق دیکھو مکرجی اور وی۔ اے سمتھ کی کتاب "انٹی کویٹزان دی ترائی۔ نیپال" (کلکتہ 1901ء) یہ دراصل آرکی آلوجیکل سروے رپورٹ امپیریل سیریز کی جلد 201 کا حصہ اول ہے؛ اور ہیسٹنگس کی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس۔

۹ سکائلیکس بحری سفر (ہیروڈوٹس جلد چہارم۔ صفحہ 44)۔ کتاب "پیری پلس" جو سکائلیکس کے نام پر منسوب ہے' اگرچہ حقیقت میں 338 اور 335 ق م میں لکھی گئی لیکن اس میں ہندوستان کا ذکر نہیں۔ (دیکھو میلر کی جغرافیہ یونان جلد اول۔ صفحہ 11 اور 9۔ 156) پکٹین کے ملک کے شہر کس پے ٹائی روس کو جہاں سے سکائلیکس نے اپنا سفر شروع کیا' ہیکاٹائس نے ملک گندھار کا کس پے پیروس بیان کیا ہے۔ اس شہر کا موقعہ معلوم نہیں ہو سکتا اور اس وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ شہر کا اصلی نام کیا ہے۔ گندھار موجودہ ضلع پشاور اور گردونواح کے تھوڑے سے علاقے کا نام تھا۔ کس پے ٹائی روس یا کس پے پی روس کا کشمیر سے (جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے) کوئی تعلق نہیں۔ (دیکھو سٹائن کی راج ترنگنی۔ ترجمہ جلد دوم صفحہ 353) ستراپیوں کے متعلق دیکھو ہیروڈوٹس جلد سوم صفحہ 106۔ 88' خصوصاً صفحہ 94۔ یونانی ٹیلنٹ کا وزن 6ء57 پاؤنڈ ہوتا تھا۔ اس طرح 360 ٹیلنٹ = 2073 پاؤنڈ۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایک اونس چاندی کی قیمت 5 شلنگ (یعنی ایک ساورن کا چوتھائی حصہ) یا چار ساورن فی پاؤنڈ ہوگی اور چاندی اور سونے میں 1:13 کی نسبت ہوگی تو 360 ٹیلنٹ 1,07,82,721 ساورن ہونے چاہئیں اور یونانی ٹیلنٹ کا وزن بجائے 78 کے 70 مِنا قرار دیا جائے تو وہ ہیروڈوٹس کے بیان کے مساوی نکلے گا۔ 360 سونے کے ٹیلنٹ 4680 چاندی کے ٹیلنٹ کے برابر ہوں گے۔ تمام ایشیائی صوبوں کا خراج بھی شامل تھا۔ جس میں افریقہ کا چھوٹا سا صوبہ لیبیا' چاندی کے وزن میں 145607 ٹیلنٹ تھا۔ (دیکھو کننگھم کی کتاب ہندوستان قدیم کے سکہ جات صفحہ 12' 14' 26' 30۔

516 ق م کے بہستان کے کتبے میں ہندوستان ایرانی سلطنت کے صوبوں میں شامل نہیں' مگر اصطخر اور نقش رستم کے کتبوں کی فہرستوں میں شامل ہے۔ موخر الذکر کتبہ جو دارا کی قبر پر کندہ ہے سب سے زیادہ مفصل ہے۔ (دیکھو رالنسن کی کتاب ہیروڈوٹس جلد دوم صفحہ 403۔ حاشیہ اور جلد چہارم صفحہ 177 اور 207۔

دارا کی فوج میں ہندوستانی دستے کے حال کے لیے جو روئی کے کپڑے پہنے تھا اور بید کی کمانوں اور بید ہی کے تیر جن میں لوہے کے پیکان تھے مسلح تھا' دیکھو ہیروڈوٹس جلد ہفتم صفحہ

65۔ ہندوستانی سپاہیوں میں لوہے کا 480 ق م میں استعمال قابل ذکر ہے۔

۲۰ دیکھو ریورٹی کا مضمون سندھ کا دریائے مہران اور اس کے معاون (جے۔اے۔ایس۔بی۔ 1892ء حصہ اول۔ خصوصاً صفحہ 301' 311' 340' 361' 375' 377' 435' 489)

۲۱ اُودیا کا نام پُرانوں میں مختلف طرز پر لکھا ہے۔ مثلاً اُدَین' اُدَیا سو وغیرہ۔ بدھ مذہب والے اسے اُدَی بَھد (اُدَیی بَھدرک) کہتے ہیں اور اسے اجات شترو کا بیٹا بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ پُرانوں کے مطابق وہ اجات شترو کا پوتا تھا۔ (دیکھو مہاومس باب 4' ڈلو۔) راک بل کی کتاب سوانح بدھ صفحہ 91' اور رہس ڈیوڈس کی کتاب مکالمات (1899ء صفحہ 68) وایو پُران میں اُدَیا کا پاٹلی پتر۔ یا "اپنی تخت نشینی کے چوتھے سال میں کسم پور کے دریائے گنگا کے جنوبی کنارے پر آباد" کرنے کا ذکر ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسم بہت پرانا شہر یعنی کسم پور دریائے گنگا کے کنارے پر واقع تھا اور زمانہ مابعد کے دار السلطنت پاٹلی پتر سے بہت دور تھا جو سون کے کنارے پر واقع تھا۔

۲۲ مہاسین کی بیٹی راجا اُدَیان کی ملکہ تھی جس کی سلطنت بینہ کوسامبی کا علاقہ تھی۔ راجا درسک کی بہن پدماوتی تھی اور اونتی کے راجا پرادیوت مہاسین کے بیٹے کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کے لیے اس کی خواہش کی تھی (جیکوبی۔ ترجمہ واسودت جو علوم کی بین الاقوامی ماہانہ رسالے میں شائع ہوا ہے۔ مارچ 1913ء) اس بات سے یہ پتہ لگتا ہے پُران کی فہرستیں مہاومس کے پراگندہ اور پریشان بیانات سے کہیں زیادہ وقعت رکھتی ہیں۔ مگر پروفیسر جیکوبی مہاومس کو "بلاکم و کاست ترجیح دینے میں بالکل تامل نہیں کرتے" فاضل پروفیسر کہتے ہیں۔ "پُرانوں میں اجات شترو اور اُدَیان کے درمیان ایک بادشاہ درسک وغیرہ کا نام مذکور ہے اور یہ ایک صریح غلطی ہے۔ پالی کتاب میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اُدیبی بھد اجات شترو کا بیٹا اور غالباً اس کا جانشین بھی تھا۔ (ترجمہ مہاومس 1912ء صفحہ 44) مگر بدقسمتی سے یہ صاف بیانی اکثر جگہ غلط ہے۔

۲۳ پُرانوں کے بعض قلمی نسخے مہاپدم کی حکومت کو صرف اٹھائیس سال بتاتے ہیں مگر بظاہر اس بات پر سب متفق ہیں کہ خاندان نے کل سو برس حکومت کی۔

۲۴ کرٹیس' باب نہم فصل دوم۔ اصلی کتاب کے نام بھگیلس کو بھگل سلوین لیوی کے بیان کے مطابق پڑھا گیا ہے (جرنل ایشیا ٹک 1890ء صفحہ 239)۔ شمالی ہند میں بھگیلو نام اب بھی سننے میں آتا ہے۔ گنگریڈی اور پارسی اقوام کے نام بعض نسخوں میں بہت بگڑ گئے ہیں۔

۲۵ اگرائیس (کرٹیس باب نہم فصل دوم) زندرامس ڈوڈورس باب 17 فصل 93) اس حکایت کے متعلق تمام ہندی اور یونانی روایتوں کو ایچ۔ایچ ولسن نے مدرارا کشس کے دیباچے میں جمع کر دیا ہے۔ (تھیٹر آف دی ہندوز۔ جلد دوم صفحہ 150 — 119) درہت کتھا اور میکنزی کے قلمی

نسخے کی حکایتیں محض کہاوتیں ہیں۔

۲۶ے پاٹلی پتر کے پانچ ستوپ جو اشوک کے نام سے منسوب ہیں ایک اور روایت کے مطابق نند خاندان کے راجا سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے خزانے سمجھے جاتے ہیں۔ (بیل۔ جلد دوم صفحہ 94) مدرارا کشس ایکٹ اول میں چانکیا نند کی "حریص روح" کا نہایت حقارت سے ذکر کرتا ہے۔

۲۷ے بادشاہوں کی دو پشتوں کا طویل ترین زمانے کا ذکر اڑیسہ کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ چورگنگ نے شک سن 998 سے 1069 تک حکومت کی تھی جو تقریباً 1076ء سے 1147ء تک کا زمانہ بنتا ہے۔ اس کے چار بیٹوں نے جو یکے بعد دیگرے جانشین ہوئے 1198ء تک حکومت کی۔ ان پانچ بادشاہوں اور پشتوں کی حکومت کا زمانہ 122 برس ہوتا ہے (دیکھو ایم۔ ایم۔ چکرورتی "سنین مشرقی گنگ شاہان اڑیسہ" جے۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول' جلد 72' 1903ء

۲۸ے کلنگ کے جین بادشاہ سری کھارویل مہامیگھ واہن کے ادیاگری کے کتبے میں نند راجا کا دو دفعہ ذکر آتا ہے۔ یہ کتبہ جو بدقسمتی سے بہت ناقص ہے اس بادشاہ کے عہد حکومت کی تاریخ ہے جس نے اپنے جلوس کے دوسرے سال ساتاکنی (اندھر بادشاہ) کے علی الرغم مغرب کی طرف ایک فوج روانہ کی اور پانچویں سال میں پانی کے اُس راستے کی مرمت کی جو نند راجا یا راجاؤں کے وقت سے 103 برس سے بالکل استعمال نہ ہوا تھا۔ نند راجا کے متعلق دوسرا حوالہ ذرا مجمل سا ہے۔ 103 برس کا ذکر ہی سنین کے متعلق بڑا اہم امر ہے۔ اس کے سوا اس کتبے میں اور کوئی تاریخ نہیں پائی جاتی۔ اس کتبے کا نہایت ہی قابل اطمینان بیان پروفیسر لیوڈرس نے اپی گریفیکا انڈ کا جلد دہم۔ ضمیمہ صفحہ 166' میں "فہرست کتب ہائے براہمی" کے مقام پر کیا ہے۔ اس نے گزشتہ شرحوں اور ترجموں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اگر ہم 322 ق م نند خاندان کی آخری تاریخ فرض کرلیں تو کھارویل کا پانچواں سن جلوس 103 برس بعد یعنی 219 ق م میں ہوگا اور اس کی تخت نشینی کی تاریخ 223 ق م قرار پائے گی۔ اس طرح ساتاکنی اس وقت برسرحکومت ہوگا۔

سرجی۔ گریئرسن سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ نند خاندان کے راجا برہمنوں کے سخت دشمن مشہور تھے اور اسی وجہ سے سنین کے شمار میں بارہویں صدی عیسوی میں چاند شاعر نے ان کی مدت حکومت کو سنین کے شمار میں داخل نہیں کیا۔ اس نے "انند" (یعنی بغیر نند) بکرم سنین کا استعمال کیا جو معمولی حساب سے نوے' یا اکانوے سال کم ہوتا ہے۔ نند کا لفظ معلوم ہوتا ہے کہ "نو" کے مترادف کے طور پر استعمال ہوا تھا۔ (90' 100' 91)

۲۹ے مدرارا کشس کے ڈرامے میں انقلاب کا نہایت ہی مفصل اور دلچسپ حال موجود ہے۔ علماء کا

خیال تھا کہ یہ ڈراما ساتویں صدی عیسوی کا ہے۔ (رپلسن۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1900ء صفحہ 535) جیکوبی نے یہ دیکھ کر کہ بعض قلمی نسخوں میں چندر اگپتا کے بجائے اونتی ورمن شاہ کشمیر کا نام مندرج ہے' یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ اسی بادشاہ کے سامنے 2 دسمبر 860ء کو دکھایا گیا تھا۔ (دائنا اورینٹل جرنل۔ جلد دوم 1888ء صفحہ 212) مگر ہلبرنٹ' سپیر اور ٹانی اس کو بہت قدیم مانتے ہیں اور ان کا یقینی خیال ہے کہ پنچ تنتر کے قدیم ترین نسخے اور بھرتری ہری سے جو 651ء میں فوت ہوا۔ یہ کتاب زیادہ قدیم ہے۔ یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ممکن ہے ڈراما چندر گپت ثانی کے زمانے میں 400ء کے لگ بھگ لکھا گیا ہو۔ میں پروفیسر ہلبرنٹ سے متفق ہوں کہ مصنف نے "اپنے ڈرامے کو بہت کچھ صحیح اور اصلی درباری روایتوں پر مبنی کیا ہے۔" ٹانی کے بیان کے متعلق دیکھو جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ 1908ء صفحہ 910۔

نسخہ پلوٹارک' سوانح سکندر باب 62۔ پلوٹارک کے الفاظ یہ ہیں: اندراکوٹس جو اس وقت بالکل جوان تھا' خود سکندر سے ملا اور بعد میں کہا کرتا تھا کہ سکندر بڑی آسانی سے تمام ملک پر قبضہ کر سکتا تھا کیونکہ راجا کی رعایا اس کے فطرتی ظلم و جور اور اس کی کمینہ اصل کی وجہ سے اس سے متنفر تھی اور اسے حقیر سمجھتی تھی۔ (میک کرنڈل۔ ترجمہ)

لسہ جیکوبی' مقدمہ ایس۔ بی۔ ای۔ جلد 32۔۔۔45 کونیا (اجات شترو کی ملاقات کا ذکر جین کتاب "اُواسگ دَساوٗ" صفحہ 9 میں (ببلو تھیکا انڈ کا۔ مترجمہ ہارنل) اور بدھ مذہب کی کتاب ڈلو میں (راگ ہل' سوانح بدھ صفحہ 104) میں پایا جاتا ہے۔ یہ حوالے ڈاکٹر ہارنل نے براہ عنایت مجھے بتلائے ہیں۔

لسہ برگیس۔ انڈین انٹی کویری۔ جلد دوم صفحہ 139۔ ہارنل (انڈ' انٹی۔ جلد 20' صفحہ 360) جین کے متضاد سنین پر بحث کرتا اور لکھتا ہے کہ اگرچہ دیگامبر اور سویتامبر دونوں فرقے مہاویر کی موت کے واقعہ کو 470 قبل بکرمی کے بتاتے ہیں' جس کا سن 58 ق م میں شروع ہوا' مگر فرقہ دیگامبر بکرم کی پیدائش سے اور سویتامبر اس کے سن جلوس سے اپنی تاریخوں کا شمار شروع کرتے ہیں۔ کتابوں میں معلوم ہوتا ہے کہ 551 یا 543 یا 527 ق م روایتی تاریخ مانی جا سکتی ہے۔ جین کے سنین کے متعلق دیکھو انڈ' انٹی جلد 2 صفحہ 363' جلد 9 صفحہ 158' جلد 11 صفحہ 245' جلد 13 صفحہ 279' جلد 21 صفحہ 57' جلد 33 صفحہ 169۔ خاص طور پر اس بیان پر غور کرو کہ ستھولبھدر مہاویر نویں جانشین مہاویر کے 215 یا 219 برس بعد اس سن میں فوت ہوا جس سال کہ چندر اگپتا نے نند کے آخری بادشاہ کو قتل کیا۔ (انڈ' انٹی' جلد 11 صفحہ 246) میرتنگ نے پشپامتر کو جو تقریباً 185 ق م میں تخت پر بیٹھا مہاویر کے بعد 323 سے 353 تک حکمراں بتلایا ہے۔ (دیکھو ویبر کی سیکرڈ لٹریچر آف دی جینز صفحہ 133)

سہ بدھ کی وفات کے مختلف سنین جو چینی سیاحوں اور دیگر اسناد سے نقل ہوئے ہیں' اس قدر بے

شمار اور عام ہیں کہ ان کا اعادہ فضول ہے۔ ڈاکٹر فلیٹ ایک زمانے میں 482 ق م کے متعلق یہ سمجھتے تھے "کہ یہ تاریخ سب سے زیادہ قرین قیاس اور تشفی کے قابل ہے۔" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1902ء صفحہ 667) اب بظاہر ہر ایک اس بات پر متفق ہو گیا ہے کہ یہ واقعہ 490 اور 480 ق م کے درمیان ہوا۔ اس کے برخلاف لنکا کی روایتی تاریخ یعنی 544 یا 543 ق م کو اب کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ 483 ق م کو اب ڈاکٹر فلیٹ اور پروفیسر گیگر ترجیح دیتے ہیں۔

سکھ تبتی روایات کی دوسری صورتیں سرت چندر داس اور راک ہل (سوانح بدھ صفحہ 233 یا صفحہ 237) نے بیان کی ہیں۔

سنین۔(قرین قیاس) خاندان ہائے شیش ناگ و نند

نشان سلسلہ	بادشاہوں کے نام (متیہ پُران)	مدت حکومت (متیہ پُران)	قرین قیاس سن جلوس	کیفیت
	خاندان شیش ناگ:۔		ق۔م	
1	شیش ناگ	40 (126)	602	
2	کاک ورن	26	---	ان کے متعلق کچھ حال معلوم نہیں
3	کشیمدھرمن	36	---	
4	کشیجت (یا کشتراجس)	24	---	
5	بمب سار	28	تقریباً530	نیاراج گرہہ تعمیر کرایا انگا پر قبضہ کیا مہاویر اور بدھ کا ہمعصر تھا۔
6	اجات شترو	27	502 "	پدر کش بدھ کی وفات 487 ق م پاٹلی پتر کا قلعہ تعمیر کیا کوشل اور ویشالی سے جنگ
7	درسک	24	475 ق م "	دیکھو بھاس کا "واسودت"
8	اُداسن یا اُدَیا	33	451 "	کسم پور کو شہر پاٹلی پتر کے قریب آباد کیا۔
9	نندی وَردھن	40 (83)	418 "	ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں مدت حکومت غالباً کم تھی۔
10	مہانندن	43		46 برس لگائے گئے ہیں۔
	میزان	321	تقریباً230	
	اوسط	32ء1	23ء0	متیہ۔360 یا 163 برس(؟) (برگیٹر ص69) اس خاندان کے لیے مقرر کرتا ہے۔
	خاندان نند:۔			
11	مہاپدم وغیرہ تعداد	100	372 ق م	50 برس انداز
12	نو + دو پشت			
	موریا خاندان:۔			
13	چندراگپتا	24	322 ق م	

تیسرا باب

ہندوستان پر سکندر کی فوج کشی

پیش قدمی

سکندر اعظم نے باختر کو زیر نگیں کرنے کے بعد کارناموں میں ڈائیو منی ساس ہر کلیس اور سیمیر س کے ساتھ ہمسری کرنے بلکہ ان سے سبقت لے جانے کے دلی مقصد کو ہندوستان پر حملہ کرکے پورا کرنا چاہا۔ 327 ق م کے موسم بہار کے آخر میں جب آفتاب کی تمازت نے برف کو کافی طور پر پگھلا دیا تھا تو سکندر نے اپنی فوج کے ساتھ، جس میں شاید 50 یا 60 ہزار یورپین سپاہی تھے، کوہ ہندوکش یا ہندی کوہ قاف کے دروں خاوک اور کوشاں کو قطع کیا اور دس روز کے سخت تکلیف دہ کوہستانی سفر کے بعد اس سرسبز میدان میں نمودار ہوا جو اب کوہ دامن کے نام سے مشہور ہے۔[1]

یہاں پر اس سے دو سال قبل باختر پر فوج کشی کے وقت اس نے ایک شہر کی بنیاد ڈالی تھی اور حسب معمول اس کا نام سکندریہ رکھا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مجوزہ حملے کے وقت وہ فوجی چوکی کا کام دے سکے۔ اس شہر کا عامل جس کی حکومت ناکام ثابت ہوئی تھی برطرف کیا گیا اور نکنور جو بادشاہ کے ندیم پارے تین کا بیٹا تھا اس کی جگہ مقرر ہوا۔ گردونواح کے اضلاع سے اور لوگوں کو جمع کرکے آبادی بڑھائی گئی۔ شہر کی مقیم فوج میں ان سپاہیوں کو شامل کرکے اس کو اور مضبوط کیا گیا جن کا آئندہ حملے میں ساتھ لے جانا بالکل بیکار معلوم ہوا۔[2]

نیکیا

اس طرح حسب معمول احتیاط کے ساتھ سکندریہ کی اہم جگہ کو، جو تینوں کوہستانی راستوں کی نگہبانی کیلئے کافی تھی، قابو میں لانے کے بعد ان دروں اور دریائے کوفین یا کابل کے درمیانی

علاقے کے انتظام کیلئے ٹائی ریشپیز کو صوبہ دار مقرر کیا۔ اسطرح جب سکندر کو اطمینان ہو گیا کہ اس کا آمد و رفت کا راستہ بالکل محفوظ ہو گیا ہے تو وہ اپنی فوج کے ساتھ نیکیا نامی شہر کی طرف بڑھا جو کابل سے ہندوستان کے راستے پر موجودہ جلال آباد کے مغرب میں واقع تھا۔ [13]

جون یا جولائی 327 ق م ہے فس ٹیان اور پرڈکس

یہاں پر بادشاہ نے اپنی فوج کی تقسیم کی: ہے فس ٹیان اور پرڈکس دو جرنیلوں کو حکم دیا گیا کہ وہ تین پیادہ دستوں' آدھے رسالے اور جملہ تنخواہ دار سپاہیوں کو لے کر سیدھے ہندوستان کی طرف روانہ ہو جائیں۔ ان کو حکم تھا کہ دریائے سندھ کا راستہ لیں اور پیو کیلوٹس پر قبضہ کرلیں جو اس علاقے میں واقع ہے جس پر آج کل یوسف زئی کا قبضہ ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ وہ بجائے درہ خیبر کے دریائے کابل کی وادی میں ہو کے گذرے ہونگے۔ [14]

اگست 327 ق م: دیسی حکمرانوں کا طریق عمل

بہت سے قبائل کے سرداروں نے اطاعت قبول کرنا پسند کیا۔ مگر ایک ہستی نام سردار نے مقابلے کی جرات کی۔ اس کا قلعہ جس نے تیس روز تک دشمنوں کا مقابلہ کیا' مفتوح ہونے کے بعد برباد کر ڈالا گیا۔ مشرق کی طرف سفر کے اثناء میں ہیفی اشان اور پرڈکس کے ہمراہ دریائے سندھ کے پار کے عظیم الشان شہر ٹیکسلا کا راجا بھی تھا جس نے فوراً سکندر کی دعوت کو قبول کیا اور حملہ آور کے سامنے اپنی تمام امدادی قوت پیش کر دی۔ دریائے سندھ کی مغربی جانب کے سرداروں نے بھی یہی طریق عمل اختیار کیا اور ان مقامی سرداروں کی مدد سے مقدونوی جنزل اس قابل ہو گئے کہ دریائے سندھ پر پل باندھنے کا کام جلد مکمل کرلیں جو بادشاہ نے ان کے سپرد کیا تھا جلد ختم کرلیں۔

اگست' ستمبر 327 ق م: سکندر کا یکطرفہ کوچ

سکندر نے فوج کے دوسرے حصے کی کمان اپنے ہاتھ میں لی جس میں پیادہ جو ہائی پس پسٹ کے نام سے مشہور تھا' پیادہ سپاہی اگر سینین یا تھرسیین ہلکے ہتھیاروں سے مسلح پیادہ فوج' تیرانداز سوار اور تمام خاصے کی سوار فوج شامل تھی۔ اس فوج کے ساتھ اس نے دریائے کابل کے شمال کی دشوار گزار پہاڑیوں میں سے ایک ایک جانب محفوظ رکھنے کے لیے کوچ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ تاکہ وہ اس علاقے کی ان وحشی قوموں کو جو اس زمانے میں اور اب بھی وہاں آباد ہیں محکوم کرلے اور اس طرح آمد و رفت کے ذرائع بھی محفوظ ہو جائیں اور فوج کے پہلو اور پشت کی طرف سے

حملے کا خطرہ بھی نہ رہے۔ اس تمام کام کی مشکلیں ملک کی ناہمواری، موسم گرما کی سخت گری، موسم سرما کی برف باری اور خود ان قبائل کی جنگجوئی سے پیدا ہوتی تھیں۔ مگر ہر مشکل سکندر کی ہمت اور اسکی قابلیت کے مقابلے میں ہیچ تھی۔[۵]

اس کے راستے کی تفصیل معلوم نہیں

اگرچہ اس کی تمام نقل و حرکت کا صحت کا ساتھ پتہ لگانا یا ان قبیلوں کا نام قرین قیاس صحت کے ساتھ بتلانا جن سے کہ اس کا مقابلہ ہوا یا ان قلعوں کے نام گنوانا جن کو اس نے اپنے پانچ ماہ کوچ کے زمانے میں فتح اور برباد کیا، قطعی ناممکن ہے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ اس نے دریائے کونر یا چترال کے کنارے ایک بڑے فاصلے تک سفر کیا تھا۔ ان ہی پہاڑیوں میں ایک گمنام شہر کے مقام پر اس کے شانے میں برچھے سے زخم آیا اور اس واقعے نے اس کے سپاہیوں کو ایسا برافروختہ کر دیا کہ انہوں نے تمام قیدیوں کا قتل عام کیا اور شہر کو مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا۔[۶]

فوج کی دوسری تقسیم

اس افسوس ناک واقعے کے بعد سکندر نے اپنی فوج کو پھر تقسیم کیا اور کریٹروس کو جو اس کا سب سے زیادہ وفادار ملازم تھا اور جسے وہ اپنے مثل ہی سمجھا کرتا تھا،[۷] پیچھے چھوڑا کہ دریائے کونر کے میدان کے قبائل کو مطیع کرے اور خود بادشاہ چیدہ سپاہ لے کر اسپسین قوم کے مقابلے کو روانہ ہوا جن کو خونریز جنگ کے بعد شکست دی۔

باجوڑ میں داخلہ

اس کے بعد پہاڑوں کو قطع کرتا ہوا وہ اس میدان میں داخل ہوا جس کو آج کل باجوڑ کہتے ہیں۔ جہاں اسے ایک شہر آریگیان ملا جس کو اس کے باشندوں نے جلا کر ویران چھوڑ دیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ شہر باجوڑ کے موجودہ صدر مقام نواگئی کے قریب واقع ہو۔[۸] کریٹروس دریائے کونر کے میدان میں اپنا کام پورا کرنے کے بعد پھر اپنے آقا سے آملا۔ اب ایسی تدابیر و تجاویز اختیار کی گئیں جن سے اقصائے مشرق کے اقوام کو زیر فرمان کیا جاسکے۔ کیونکہ ان کا مطیع ہونا پہلے ہی ضروری تھا تاکہ کامل اطمینان کے ساتھ ہندوستان پر فوج کشی کی جاسکے۔

اسپسین لوگوں کی آخری شکست

بالآخر اسپسین لوگوں نے ایک دوسری بڑی جنگ میں شکست فاش کھائی جس میں کہ کہا جاتا

ہے انہوں نے چالیس ہزار قیدیوں اور دو لاکھ تیس ہزار بیلوں کا نقصان اٹھایا۔ سکندر کے اپنے یورپی مقبوضات کے سلسلہ آمد و رفت کے انتظام کی تکمیل کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس شکست کے بعد اس نے بہت سے عمدہ اور خوبصورت بیل چھانٹ کر مقدونیہ روانہ کر دیئے تاکہ وہاں زراعت میں کام آسکیں۔

نیسا

یونانی حکایات کو نیسا اور ڈیونی ساس کے ایک خیالی تعلق کی وجہ سے یونانیوں کو پہاڑی ریاست نیسا کے ساتھ ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس وجہ سے انہوں نے اور جگہوں کے ساتھ اب اس پر حملہ کیا۔[9] دریا کے عمق کی وجہ سے وہ یورش کر کے اس قلعے کو فتح کرنے میں ناکامیاب ہوئے' اس لیے سکندر نے اس کے محاصرہ کرنے کی تیاری شروع کی ہی تھی کہ اس اثنا میں وہاں کے باشندوں نے خود بخود اس کی اطاعت قبول کر لی اور اس کی طرف سے مزید کوشش کی ضرورت نہ رہی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس بنا پر رحم کی درخواست کی کہ ڈیونی ساس اور یونانیوں کے وہ قریبی عزیز ہیں۔ کیونکہ انگور اور ایک خاص قسم کی بیل ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہے اور وہ تکونا پہاڑ جو شہر کے سرے پر واقع تھا' دراصل کوہ میراس ہی تھا۔ سکندر نے جو اس قسم کے تمام خیالات کو اپنے اداس سپاہیوں کی طبیعتوں کو متحرک کرنے کا اچھا ذریعہ خیال کرتا تھا' اس ڈیونی ساس کی قرابت کے سلسلے کی بہت کچھ زیادہ تحقیق نہ کی۔ بلکہ نیسا کے باشندوں کی درخواست کو منظور کیا اور ان کے ساتھ رحم و آشتی کا برتاؤ کیا۔

جشن

خود اپنے تجسس و تفحص کے خیالات کو پورا کرنے اور دوسرے اپنی بہترین فوج کو دم لینے کا وقت دینے کے لیے سکندر اس پہاڑ پر گیا جسے آج کل غالباً کوہ مُور کہتے ہیں۔ سوار اور پیادوں کی ایک جماعت اس کے ہمرکاب تھی۔ موجودہ زمانے کے کافروں کے ان آباؤ اجداد کا رقص و سرود یونانیوں کی مے نوشی کے جلسوں سے اس قدر مشابہہ تھا کہ اس سے ان لوگوں کے یونانیوں کے قرابتی ہونے کی پوری پوری تصدیق ہوتی تھی جو نیسا کہ باشندوں کے دعوے کا بیّن ثبوت تھا۔ اور یہ بات فوج کے سپاہیوں کے دل میں یہ خیال پیدا کرنے کے لیے کافی تھی کہ وہ اپنے وطن سے اس دور دراز مقام میں بھی ایسے لوگوں میں بیٹھے ہیں جو ان کے ہم مذہب ہیں اور جن کے متعلق یہ خیال ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے قریبی عزیز بھی ہیں۔ سکندر نے بھی اس مناسب وقت فریب کو نہ کھولا اور فوج کو رخصت دی کہ اپنے دیس کے دوستوں کے ساتھ مل کر دس دن جنگلوں میں

خوشی و خرمی سے گزاریں۔ نیسا کے لوگوں نے اپنی طرف سے اس کے رحم کے شکریہ کا اظہار اس طرح کیا کہ تین سو سوار سکندر کو مستعار دیئے جو تمام فوج کشی کے زمانے میں اس کے ساتھ رہے اور اکتوبر 326ق م سے قبل' جبکہ دریاؤں کے راستے سے بحری سفر کی تیاری ہو رہی تھی' وطن کو واپس نہ بھیجے گئے۔ [۱۰]

اسکنوئی اور مسگا

سکندر نے اب بذات خود اسکنوئی نام ایک زبردست قوم کو مفتوح کرنے کا تہیہ کیا کیونکہ ان کے متعلق یہ بیان کیا گیا تھا کہ وہ بیس ہزار سوار' تیس ہزار پیادے اور تیس ہاتھیوں سے اس کے مقابلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ باجوڑ کے علاقے کو چھوڑ کر سکندر نے دریائے گوریس (پنجکوڑہ) کو چیدہ فوج کے ساتھ (جس میں حسب معمول سواروں کی تعداد زیادہ تھی) عبور کیا اور اسکنوئی قوم کے علاقے میں مسگا کے شہر پر حملہ کرنے کے لیے داخل ہوا جو اس نواح میں سب سے بڑا شہر اور سلطنت کا مستقر تھا۔ یہ زبردست قلعہ جو غالباً درۂ مالاکنڈ کے شمال میں قریب ہی واقع تھا مگر جس کے موقعے کا تعین اب تک نہیں ہوا' قدرتی اور مصنوعی طور پر بہت مضبوط واقع ہوا۔ [۱۱] مشرق کی طرف ایک بڑے زور سے بہتے ہوئے تیز رفتار پہاڑی نالے کے بلند کنارے حائل تھے اور جنوب و مغرب میں مہیب چٹانیں' عمیق غار اور دھوکا دینے والی دلدلیں واقع تھیں جو حملہ آور فوج کو گزرنے سے روکتی تھیں۔ جہاں کہیں قدرت نے قلعے کے کسی حصے کو اچھی طرح مضبوط نہ کیا تھا وہاں انسانی صنعت نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا اور قلعے کے گرد ایک زبردست اینٹ' پتھر اور لکڑی کی فصیل بنا دی تھی جس کا محیط تقریباً چار میل (35 سٹیڈیا) تھا اور ایک گہری خندق اس کے گرداگرد بنی ہوئی تھی (لیوکرٹس باب 8۔ فصل 10) اس مہیب قلعے کے گرد پھرنے اور محاصرے کی تیاری کی تجاویز میں سکندر کے شانے میں پھر زخم لگا۔ مگر یہ زخم ایسا نہ تھا جو اس کو محاصرے کے اہتمام سے باز رکھتا۔ یہ محاصرہ کلیتہً اس کے عالی دماغ نے خود تجویز کیا تھا اور خود ہی اس نے اس کی نگرانی کی تھی۔

قلعے پر حملہ

ایسے سپہ سالار کے ماتحت کام کرنے سے ایک معمولی سپاہی بھی غیر معمولی کام انجام دے سکتا ہے۔ فوج نے اس قدر تندہی سے کام کیا کہ نو دن میں انہوں نے ایک ایسا ٹیلہ بنا لیا جو قلعے کی سطح کی ہموار ہو اور اس سے خندق پر پل بندھ سکے اور اس کے علاوہ متحرک برجوں کے قلعے کے قریب لے جایا جا سکے۔ محصور فوج اپنے جنرل کی ناگہانی موت کی وجہ سے جو منجنیق کے ایک گولے

کے لگنے سے واقع ہوئی بالکل ناامید ہو گئی' اور پھر پہلے ہی ہلے میں قلعہ سر ہو گیا۔ اس مقتول سردار کی زوجہ کلیوفس اور اس کا یتیم بچہ سکندر کے پاس قید ہو کے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ کلیوفس سکندر کے محل میں داخل ہوئی اور اس سے سکندر کا ایک بچہ بھی ہوا۔ [۲۱]

تنخواہ دار فوج کا قتل عام

مسگا کی محصور فوج میں سات ہزار ہندوستان کے میدانوں کے رہنے والے تنخواہ دار سپاہی بھی شامل تھے۔ ایک خاص معاہدے کے مطابق سکندر نے ان لوگوں کو اس شرط پر امان دے دی تھی کہ یہ اپنے بادشاہ کا ساتھ چھوڑ کر اس سے مل جائیں اور اس کی فوج میں شامل ہو جائیں۔ اس عہد نامے کی رو سے ان کو اجازت دی گئی کہ وہ قلعے کو چھوڑ کر مقدونوی کیمپ کے سامنے کی ایک پہاڑی پر خیمے لگالیں جو کیمپ سے تقریباً 9 میل (80 سٹیڈیا) کے فاصلے پر واقع تھی۔ ان سپاہیوں کو یہ پسند نہ تھا کہ ایک اجنبی شخص کو اپنے بادشاہ کے مطیع کرنے میں مدد دیں اور اس لیے وہ اس ناگوار عہد کو پورا کرنے سے بچنا چاہتے تھے جس کو انہوں نے طوعاً و کرہاً منظور کرایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ رات کے وقت چپ چاپ وہاں سے چلے جائیں اور اپنے گھروں کی راہ لیں۔ سکندر کو ان کے اس ارادے کی اطلاع ہو گئی۔ اس نے عین اس وقت جب کہ یہ ہندوستانی چین سے سو رہے تھے ان پر دفعۃً حملہ کر دیا اور ان کو سخت نقصان پہنچایا۔ مگر جونہی وہ اس اچانک حملے بیدار ہوئے اور ہوش میں آئے' انہوں نے ایک دائرے کی شکل اختیار کر لی اور بچوں اور عورتوں کو درمیان میں لے کر سکندر کا بڑی سختی اور بہادری سے مقابلہ کیا جس میں کہ عورتوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ لیکن بالآخر ان چند دلیر جنگجو سپاہیوں کی سکندر کی فوج کی تعداد کے سامنے کچھ نہ چلی اور ایک قدیم مورخ کے الفاظ کے مطابق "وہ اس طرح لڑتے ہوئے کام آگئے اور اس قسم کی موت پر انہوں نے ذلت کی حیات کو ترجیح نہ دی۔" فوج کے غیر مسلح ہمراہیوں اور عورتوں کو امان دی گئی۔ [۲۳]

اس واقعے پر رائے

اس واقعے کے متعلق قدیم اور دور حاضرہ کے مصنفین سکندر کو بہت کچھ مطعون کرتے ہیں کہ اس کا یہ فعل نہایت شرمناک طور پر نقض معاہدہ تھا۔ مگر جیسا کہ ڈیوڈرس نے فرض کر لیا ہے یہ کسی طرح بھی سکندر کی طرف سے تنخواہ دار سپاہیوں کے ساتھ بے رحمی کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ جیسا کہ ایرین نے بیان کیا ہے کہ اس فوج کے قتل عام کی وجہ وہ پیماں شکنی تھی جس کا خود ہندوستانی ارادہ کر چکے تھے اور اگر یہ بیاں صحیح ہے تو جو سزا ان کو دی گئی وہ اس کے مستحق تھے۔ کیونکہ اگر یہ

تربیت یافتہ اور بہادر سپاہی سکندر کی قلیل فوج میں شامل ہو جاتے تو اس کی طاقت میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا۔ لیکن اس کے برعکس ان کا دشمن سے مل جانا میدانوں میں خود اس کے لیے سخت تکلیف کا باعث ہوتا اور اسی لیے میرے نزدیک وہ بالکل حق پر تھا کہ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔

قبائل کا آرناس میں نقل مکان

اس کے بعد سکندر نے ایک شہراورا یا نورا فتح کیا اور ایک اہم مقام بزیرا پر قبضہ کیا۔ جس کے باشندوں نے دیگر شہروں کے باشندوں کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے [۱۴] آرناس قلعے کو اپنا امن قرار دیا تھا۔ سکندر کو اس قلعے کی فتح کا خیال جس کی تسخیر محال سمجھی جاتی تھی، دو وجہ سے تھا۔ اول تو فوجی ضرورتوں سے اس پر قابض ہونا ضروری تھا اور دوسرے یہ روایت چلی آتی تھی کہ ہرقل، جس کو کہ وہ اپنا جد اعلیٰ سمجھتا تھا، اس قلعے کی تسخیر میں ناکامیاب رہا تھا۔

آرناس کی کیفیت

ڈیوڈرس کے بیان کے مطابق اس پہاڑ کی جنوبی جانب دریائے سندھ بہتا تھا جو ہندوستان کا سب سے بڑا دریا ہے۔ یہ خاص اس مقام پر بہت گہرا تھا اور ایسے ناہموار اور بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا کہ اس طرف سے قلعے تک پہنچنا ناممکن تھا۔ دوسری جانب مسگا کی طرح یہاں بھی ایسے غار، چٹانیں اور دلدلیں موجود تھیں جو بہادر سے بہادر حملہ آور کی ہمت کو پست کر دیں۔ ایرین کا بیان ہے کہ صرف ایک راستہ پہاڑ کی چوٹی پر جاتا تھا جہاں پانی کثرت سے دستیاب ہو سکتا تھا اور اس قدر قابل زراعت زمین وہاں موجود تھی کہ اس کی کاشت کے لیے ایک ہزار مزدوروں کی ضرورت ہوتی۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک ایسی ڈھلوان اور بلند چٹان واقع تھی جو بجائے خود ایک قدرتی قلعے کا کام دے۔ اور بلاشک وشبہ مصنوعی طور سے بھی اس کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کیا گیا تھا۔ [۱۵]

ابتدائی کارروائیاں

اس زبردست قلعے کا محاصرہ شروع کرنے سے پہلے سکندر نے جبلی پیش بینی سے اپنے عقب کو محفوظ رکھنے کے لیے مسگا، بزیرا اور ونٹیس کے شہروں اور سوات اور بُنیر کی پہاڑیوں میں فوجوں کی چھاؤنیاں ڈالیں۔

اس کے علاوہ اس نے قلعے کو دوسرے وسائل سے اس طرح اور بھی قطع کر دیا کہ وہ بذات خود غالباً درۂ شاہ کوٹ [۱۶] سے اتر کر میدان میں داخل ہوا اور ایک اہم شہر پیو کیلوٹس (چارسدہ)

اور اس کے ارد گرد کے اس علاقے کو زیر نگیں کیا جسے آج کل یوسف زئی کا ملک کہتے ہیں۔ اس تمام فوجی کارروائی کے اثناء میں دو مقامی سرداروں نے اس کی مدد کی۔ اس کے بعد وہ کسی طرح امبو لے جایا گیا جو دریائے سندھ کے کنارے پر ایک چھوٹے سے شہر آرناس کے دامن میں واقع تھا۔ یہاں پر اس نے کریٹراس کی ماتحتی میں ایک فوجی مرکز قائم کیا کہ اگر حملہ کرنے میں فوج ناکامیاب ہو اور محاصرے کے دائرے کو تنگ کرنا پڑے تو اس حالت میں یہ مرکز اگر محاصرے کو طول ہو تو پورے فوجی مرکز کا کام دے۔

ابتدائی فوجی تحقیقات

آخر اس طرح غور و فکر سے محاصرے کے تمام معاملات کو درست کرنے کے بعد سکندر نے ایک مختصر فوج لے کر' جس میں زیادہ تر ہلکے اسلحہ سے مسلح سپاہی تھے' دو دن بذات خود قراولی میں صرف کیے۔ خود تمام موقعے اور جگہ کا معائنہ کیا۔ مقامی بدرقے کی مدد سے' جس کو انعام کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا گیا تھا' لیگاس کے بیٹے ٹولمی نے پہاڑ کے مشرقی جانب ایک نہایت مفید مطلب جگہ پر قبضہ کر لیا جہاں اس نے اپنے آدمیوں کو خندق سے گھیر کر ٹھہرا دیا۔ اس موقعے پر بادشاہ کی طرف سے اس کو مدد دینے کی کوشش میں ناکامیابی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندیوں نے ٹولمی کی خندقوں پر نہایت دلیرانہ حملہ کیا جس کو سخت لڑائی کے بعد پسپا کیا گیا۔

راستوں کی تیاری

سکندر کی یہ دوسری کوشش کہ اپنے نائب افسر کے ساتھ جا کر مل جائے' باوجود محصورین کی بے حد جدوجہد کے کامیاب ہوئی اور اب مقدونیائی سپاہ اطمینان سے اس مفید موقعے پر قابض ہو گئی جہاں سے قدرتی قلعے پر حملہ کرنا آسان ہو گیا۔

حملہ آور جس کام کو کرنا چاہتے تھے وہ سخت دشوار تھا۔ کیونکہ سب سے اونچی چٹان اور بلندیوں کی طرح ارتفاع کی مناسبت سے کوئی ڈھال نہ رکھتی تھی بلکہ سرے سے نہایت ناہموار مثلث کی صورت میں بالکل سیدھی قائم تھی۔ مقام کے معائنہ سے یہ معلوم ہوا کہ خط مستقیم حملہ کرنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ بعض غاروں کو بھر نہ دیا جائے۔ گردونواح کے پہاڑوں میں جنگل کثرت سے تھا اس لیے سکندر نے درختوں کو کاٹ کے راستہ بنانے کے لیے کام میں لانا چاہا۔ خود اس نے اپنے ہاتھ سے پہلا درخت غار میں پھینکا۔ اس کے اس فعل کی تمام فوج نے داد دی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ فوج بھی دل سے اس کام کی خواہاں ہے جس میں بادشاہ ان کا شریک حال ہوا اور اس سے وہ کسی طرح باز نہ رہ سکتے تھے۔

محصور فوج کا قلعے کو خالی کرنا

چار ہی دن میں سکندر ایک ایسی چھوٹی سی پہاڑی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا جو اس چٹان سے بالکل مسطح تھی اور اس طرح سب سے اہم مقام اس کے قبضے میں آ گیا۔ اس کارروائی کی کامیابی کے بعد محصور فوج کو بالکل یقین ہو گیا کہ قلعے پر قبضہ کرنے کے لیے کچھ مدت ہی چاہیے ورنہ اور کوئی مشکل حائل نہیں رہی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دینے کی شرائط کی بحث کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کر دیا۔

محصورین دراصل بجائے ایک عہد نامے کی تکمیل کے فرار ہو جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے رات کے وقت اس سنگستان کو خالی کر کے تاریکی میں بھاگ جانے کی کوشش کی۔ مگر سکندر کی ان تھک بیدار مغزی نے ایک حد تک ان کی اس کوشش پر پانی پھیر دیا۔ اپنے ساتھ 700 آدمیوں کو لے کر عین اس وقت جبکہ محصور فوج قلعے کو چھوڑ رہی تھی' وہ پہاڑی پر چڑھ گیا اور ان میں سے اکثر کو قتل کر ڈالا۔

مقدونیائی فوج کا قیام

اس طرح یہ قلعہ جس کے فتح کرنے میں ہرقل بھی ناکامیاب رہا تھا' سکندر کے ہاتھوں سر ہوا۔ بادشاہ کا فخر اس کامیابی پر بالکل بجا تھا۔ اس نے دیوتاؤں کی پرستش کی۔ ان کے نام پر بھینٹ چڑھائی۔ ایتھنے اور نیکے کے نام پر مندر تعمیر کرائے اور ایک قلعہ بنوایا جس میں اس نے اپنی فوج مقیم کی۔ اس اہم جگہ کا افسر ایک شخص سی سی کوٹس (سسی گپتا) نامی ایک ہندو کو مقرر کیا جو بہت دن پہلے باختر کے باغی صوبہ دار بیس کی فوج کے ہندی رسالے سے نکل آیا تھا اور اس وقت سے مقدونیائی فوج میں نہایت ناداری سے کام کر رہا تھا۔

دریائے سندھ کی طرف کوچ

اس فتح کے بعد سکندر نے اسکنوئی قوم کی فتح کی تکمیل کے لیے ان کے ملک پر از سر نو دھاوا کیا اور شہر ڈرٹا پر قبضہ کر لیا جو غالباً آرناس کے شمال میں واقع تھا۔ اس شہر کے نواح کے تمام علاقے کے باشندے اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور دریائے سندھ کو عبور کر کے دریائے ہائی ڈس پیز (جہلم) اور اکے سینز (دریائے چناب) کے درمیان ابھسار کے کوہستانی علاقے میں پناہ لی تھی۔ [1] اس کے بعد آہستہ آہستہ وہ جنگلوں میں سے گزر کر اوہند تک پہنچا۔ اگرچہ سیدھے راستے فاصلہ کچھ زیادہ نہ ہو سکتا تھا' مگر ایسا راستہ بنانے کا کام جس میں سے فوج گزر سکے اس قدر

دشوار تھا کہ ہے فس ٹیان کے کیمپ تک پہنچنے کے لیے پندرہ یا سولہ منزلیں طے کرنا پڑیں۔[18]

اوہند کے مقام پر پُل

دریائے سندھ پر پل کے اصلی مقام کے متعین کے متعلق بہت اختلاف رائے ہے۔ مصنفین کی کثیر تعداد کا رجحان اس طرف ہے کہ وہ پل اٹک کے مقام پر تھا جہاں دریائے سندھ کا پاٹ بہت ہی کم رہ گیا ہے۔ مگر ایم خوشے کی تحقیقات نے یہ بات صاف طور پر ثابت کر دی ہے کہ یہ پل جو غالباً کشتیوں کا بنا ہوا تھا۔ اوہند یا اُند کے مقام پر اٹک کی شمال کی جانب سولہ میل کے فاصلے پر تھا۔ پل کے مقام پر پہنچ کر سکندر نے نہایت شان و شوکت سے دیوتاؤں کے نام بھینٹ چڑھائی اور اپنی فوج کو تیس دن کی تعطیل آرام لینے کے لیے دی اور کھیل کود سے ان کا دل بہلائے رکھا۔[19]

جنوری 336ق م سے فروری 326ق م تک ٹیکسلا سے سفارت

اوہند کے مقام پر امبھی (آمفس[20]) کی ایک سفارت سکندر کو ملی۔ یہ ٹیکسلا کے تخت پر متمکن تھا۔ یہ عظیم الشان شہر دریائے سندھ سے تین منزل کے فاصلے پر واقع تھا۔ امبھی کا پیشرو سکندر سے نیکیا کے مقام پر ملا تھا اور اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس کے بیٹے کی طرف سے اس سفارت نے اسی اطاعت کی تجدید کی۔ ساتھ ہی اس معاہدے کی استواری کے اظہار کے لیے 700 سوار امداد کے طور پر روانہ کیے اور ان کے علاوہ اور بہت سا اسباب جس میں 30 ہاتھی' 300 فربہ بیل' 10000 بھیڑیں اور 200 ٹیلنٹ چاندی شامل تھی' اس کے پاس بھیجا۔

ٹیکسلا کے راجاؤں کی اس آسانی کے ساتھ اطاعت قبول کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ہمسایہ سلطنتوں کے مقابلے میں اس سے مدد لینا چاہتے تھے۔ اس وقت ٹیکسلا کی سلطنت ابھسار کی کوہستانی ریاست اور اس سلطنت کے ساتھ برسرپیکار تھی جس کے بادشاہ کا نام یونانیوں کے بیان کے مطابق پورس تھا اور جس کے علاقے میں موجودہ جہلم' گجرات اور شاہ پور کے اضلاع شامل تھے۔[21]

فروری یا مارچ 326ق م' دریائے سندھ کو عبور کرنا

اس وقت موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا اور چونکہ نیک شگون اور فال نے بھی راہ دی اور فوج بھی آرام لے چکی اس لیے اب اس چست و چالاک فوج نے ایک دن علی الصباح دریا کو عبور کرنا شروع کیا اور ٹیکسلا کے بادشاہ کی مدد سے بخیر و خوبی ہندوستان کی زمین پر قدم رکھنے کے قابل ہو گئی

جہاں اس سے قبل کبھی کوئی یورپی سیاح یا حملہ آور نہ پہنچا تھا۔ [۴۲]

عجیب واقعہ

ٹیکسلا کے کوچ کے آخری دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جب سکندر شہر سے صرف 4 یا 5 میل کے فاصلے پر تھا تو وہ اچانک ایک زبردست فوج کو اپنی طرف مقابلے کے لیے بڑھتا ہوا دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کو فوراً خیال ہوا کہ بے ایمانی اور دغابازی سے اب اس کے ساتھ مقابلہ کیا جائے گا اور اس نے ہندیوں پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ عین اس وقت امبھی چند حاشیہ نشینوں کے ساتھ بھاگا ہوا اس کی طرف آیا اور بیان کیا کہ اس فوج کے اجتماع کا مطلب اظہار اطاعت ہے اور اب اس کا مالک سکندر ہے۔ اس طرح جب یہ اشتباہ صاف ہو گیا تو مقدونیائی فوج آگے بڑھی اور شہر میں پہنچ کر شاہانہ شان و شوکت سے اس کی مہمان نوازی کی گئی۔

ٹیکسلا

ٹیکسلا جس کے کھنڈر آج کل بارہ میل کے رقبہ میں راولپنڈی کے شمال مغرب اور حسن ابدال کے جنوب مشرق میں پائے گئے ہیں' اس نواح کے سب سے بڑے شہروں میں سے تھا۔ شمالی ہند میں یہ شہر ہندوؤں کے علوم و فنون کے مرکز کی حیثیت سے مشہور تھا۔ یہاں تمام طبقوں کے طالب علم تعلیم اور خصوصاً علم طب کی تحصیل کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ [۴۳]

امبھی کا مطیع ہونا

امبھی نے سکندر کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا اور اس سے اپنے باپ کے ٹیکسلا میں باضابطہ جانشین ہونے کی باقاعدہ سند حاصل کی۔ اس عزت افزائی کے بدلے میں جو حملہ آور کی جانب سے ہوئی امبھی نے مقدونیائی فوج کو بے حد و حساب سامان رسد بہم پہنچایا اور سکندر کے سامنے اسی ٹیلنٹ مسکوک چاندی [۴۴] اور اس کے اور تمام دوسرے دوستوں کے لیے سونے کے تاج پیش کیے۔ سکندر بھی اس فیاضی میں پیچھے نہ رہنا چاہتا تھا اس نے ان تمام تحائف کو واپس کیا اور ان کے پیش کرنے والے کو مال غنیمت میں سے ایک ہزار ٹیلنٹ اور ان کے علاوہ بہت سے سونے اور چاندی کے برتن' ایرانی قالین اور تیس خاصے کے گھوڑے دیئے جن پر کہ وہ خود سوار ہو چکا تھا۔ یہ بے انتہا فیاضی اگرچہ اس کے مقدونوی افسروں کو ناپسند تھی مگر اس کی اصل غایت محض نمود اور نمائش نہیں بلکہ حکمت عملی تھی۔ اس نے 5000 سپاہیوں کی ایک امدادی فوج کو "خرید لیا" اور نہایت ہی مفید دوست کی وفاداری کو پختہ کر دیا۔ (کرٹیس۔ باب 8 فصل 12' ڈیوڈرس باب 17

فصل 86‘ ایرین باب 5 فصل 8)

ابھسار کا راجا اور پورس

اس اثنا میں کہ سکندر ٹیکسلا ہی میں مقیم تھا‘ ابھسار کے کوہستانی علاقے کے راجا نے (جو درحقیقت پورس کے ساتھ شامل ہو کر سکندر کو ملک سے نکال دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔) (ڈیوڈرس باب 17۔ فصل 87) سکندر کے پاس اپنے سفیر روانہ کیے جنھوں نے اپنے راجا کی طرف سے اس کے تمام مقبوضات سکندر کے حوالے کر دیئے۔ اس سفارت کی اچھی طرح خاطر مدارت کی گئی اور سکندر کو یہ امید ہوئی کہ پورس بھی اپنے ساتھی کی طرح اطاعت قبول کر لے گا۔ مگر جب اس کو دعوت دی گئی کہ وہ اطاعت اور خراج دینا منظور کرے تو اس نے مغرورانہ جواب دیا کہ وہ حملہ آور سے ملاقات کے لیے سرحد پر ضرور آئے گا‘ مگر فوج کے ساتھ جو جنگ کے لیے تیار ہو گی۔

دریائے جہلم کی طرف پیش قدمی ‘اپریل 326 ق م

سکندر کچھ مدت تک ٹیکسلا کے آرام دہ مقام پر چند روز ٹھہرا اور اپنی فوج کو آرام لینے کا موقع دیا۔ (ڈیوڈرس باب 17 فصل 87)۔ اس کے بعد وہ فوج کو لے کر‘ جس میں اب ٹیکسلا کے آدمی اور چند ہاتھی بھی شامل تھے‘ مشرق کی طرف سے پورس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ ہائی ڈس پیز (دریائے جہلم) تک کا جنوب مشرقی راستہ‘ جس کا فاصلہ اس راستے کی مناسبت سے جو اختیار کیا گیا 100 یا 110 میل ہو گا‘ غالباً پندرہ دن میں طے ہوا کیونکہ راستہ دشوار گزار تھا۔ [۲۵] موسم گرما زوروں پر تھا۔ مگر سکندر کے لیے فوج کشی کے واسطے سب موسم برابر تھے اور وہ فوج کو لیے ہوئے کوچ پر کوچ اور فتح پر فتح کرتا ہوا برف پوش پہاڑوں اور میدانوں کی آگ کی سی گرمی کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتا تھا۔

مئی 326 ق م

مئی کے شروع میں وہ جہلم کے مقام پر پہنچا اور دریائے جہلم کو پہاڑوں کی برف کے پگھلنے کی وجہ سے طغیانی کی حالت میں پایا۔ وہ کشتیاں جن سے کہ سندھ کو عبور کیا گیا تھا ٹکڑے ٹکڑے کر کے گاڑیوں میں لاد کر ساتھ لائی گئی تھیں اور اب ان کو پھر کام میں لایا گیا اور دریائے جہلم کے کنارے پر ان کو جوڑ کر ان کے ذریعے سے پھر دریا کو عبور کیا گیا۔ (ایرین باب 5۔ فصل 8)

دریا کو عبور کرنے کی تیاریاں

تمام محنت طلب تیاریوں کے باوجود دشمن کی زبردست فوج کے روبرو دریائے جہلم کے عبور کرنے کا مسئلہ بغیر مقامی حالات کی دقیق واقفیت کے حل نہ ہو سکتا تھا اور سکندر کو آخری فیصلے سے پہلے مجبور ہونا پڑا کہ اول تمام ضروری مقامی حالات سے واقف ہو جائے۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ پورس کی فوج جو تعداد میں 50000 تھی دریا کے دوسرے کنارے پر پڑی ہے۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ مقدونوی سواروں کے گھوڑے جن پر کہ سکندر کو سب سے زیادہ اعتماد تھا ہاتھیوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں بلند کناروں پر نہ چڑھ سکیں گے' اور اس لیے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کسی نہ کسی حیلے کی ضرورت ہے۔

کشتیوں کی تیاری

اس وجہ سے ایرین کے الفاظ کے مطابق سکندر نے فیصلہ کیا کہ "راستے کو چرالے"۔ آسان ترین طریقہ یہ تھا کہ حملہ آور فوج اکتوبر یا نومبر تک صبر کے ساتھ وہیں پر انتظار کرتی رہے۔ کیونکہ اس وقت پانی کا زور کم اور دریا قابل عبور ہو جائے گا۔ اگرچہ سکندر کے عالی خیالات اس قسم کی حکمت عملی کو پسند نہ کر سکتے تھے۔ مگر اس نے دشمن کو دھوکا دینے اور اس کو خواب خرگوش میں ڈالنے کے لیے فوج میں یہ مشتہر کر دیا کہ وہ موسم کی تبدیلی کا وہیں ٹھہر کر انتظار کرے گا۔ اور زیادہ وثوق کے لیے اس نے اپنی فوج کو گرد و نواح کے علاقے میں لوٹ مار اور سامان رسد کا بڑا ذخیرہ جمع کرنے کے واسطے روانہ کیا۔ ساتھ ہی اس کے جہازوں کا بیڑا بھی دریا میں اِدھر اُدھر چکر لگاتا اور کسی پایاب جگہ کی تلاش میں رہا۔ جیسا کہ ایرین نے لکھا ''اس تمام کارروائی کی وجہ سے پورس نہ تو آرام لے سکا اور نہ اپنی تمام تیاریوں کو ایک جگہ جمع کر سکا تاکہ مقابلے کے لیے کسی ایک جگہ کو سب پر ترجیح دے کر وہاں اپنی فوج کو اکٹھا کر دے۔" (باب 5- فصل 9) بڑے جہاز اور چھوٹی کشتیاں پوشیدہ طور پر بنائی گئیں اور ان کو دریا کے بالائی حصوں کے جنگلوں اور ٹاپوؤں میں چھپا دیا گیا۔ ان ابتدائی تیاریوں میں چھ یا سات ہفتے تمام ہو گئے۔ اس اثناء میں برسات کا آغاز ہو گیا تھا اور طغیانی میں زیادتی ہو گئی تھی۔ زمین کے حالات پر نہایت غور و فکر کے بعد سکندر کو یہ معلوم ہوا کہ دریا کو سلامتی کے ساتھ عبور کرنے کی بہترین جگہ کیمپ سے آگے 100 میل کے فاصلے پر ہے جہاں دریا یکایک ایک طرف مڑ جاتا ہے اور وہاں اس کا کشتیوں میں سوار ہونا بھی کنارے کی ساخت اور ایک ٹاپو کے سبب جو گھنے جنگل سے معمور ہے چھپا رہے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد سکندر نے فوراً اس پر عمل کیا اور یہ عمل ایرین کے قول کے

مطابق نہ صرف "بے انتہا دلیرانہ" بلکہ کامل پیش بینی اور احتیاط پر مبنی تھا۔

شروع جولائی 326ق م' پس انداختہ فوج

اس نے ایک بڑی فوج کے ساتھ 'جس میں ٹیکسلا کے 5000 آدمی بھی شامل تھے' کرٹیراس کو پیچھے چھوڑا کہ وہ جہلم کے کیمپ کی حفاظت کرے اور اس کو نہایت دقیق ہدایات کیں کہ کس طرح وہ اس فوج کو عام حملے کے وقت مدد کرنے میں استعمال کرے۔ کیمپ اور عبور کرنے کی جگہ کے عین درمیان میں تین افسر مع تنخواہ دار سوار اور پیادہ فوج کے مقرر کیے گئے اور ان کو حکم دیا گیا کہ جونہی وہ دیکھیں کہ ہندوستانی لڑائی میں مشغول ہو گئے ہیں تو دریا کو عبور کر لیں۔ فوج کے تمام حصے ان سنتریوں کے ذریعے سے جو کنارے پر مقرر تھے 'ایک سلسلے میں جکڑے ہوئے تھے۔

شب خون کی تیاری

جب پیش بندیوں کی تکمیل ہو چکی تو سکندر نے بذات خود 11000 یا 12000 آدمیوں کی چیدہ جماعت کو جس میں پیادے سوار تیرانداز اور 5000 مختلف قسم کے سوار شامل تھے' دریا کو عبور کرنے کے لیے اپنے ساتھ لیا۔ نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے رات کے وقت کیمپ سے تھوڑی دور کوچ کیا۔ اس کی نقل و حرکت اس رات کے طوفان ابر و باد کے سبب اور بھی پوشیدہ رہی اور مقام عبور پر وہ بلا دوسواس آ پہنچا اور چھوٹے اور بڑے جہازوں اور کشتیوں کے بیڑے کو بالکل تیار پایا۔ دشمن کو اس تمام معاملے کا اس وقت تک کوئی شبہ بھی نہ ہوا جب تک کہ یہ بیڑا اس ٹاپو سے جس پر گنجان جنگل تھا آگے نکل کر کھلے دریا میں نہ پہنچ گیا اور اس طرح صبح کے وقت بغیر کسی مزاحمت کے سکندر نے اپنی فوج کو دوسرے کنارے پر اتار دیا۔ جب وہ اتر چکا تو اس کو یہ معلوم کر کے مایوسی ہوئی کہ اس کے آگے ایک اور عمیق رود موجود ہے جس کو عبور کرنا ضروری ہو گا۔ بہت مشکل سے ایک پایاب جگہ ملی اور اسی میں سے سواروں نے' جو گلے تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور جن کے گھوڑوں کے صرف سر ہی پانی سے باہر تھے' بہ ہزار دقت دریا کو عبور کیا۔ پورس کے کیمپ کا صرف ایک ہی راستہ تھا جس سے گذرنا ممکن تھا۔ یہ راستہ بڑے پھیر کا تھا۔ اسی سبب سے فوری مزاحمت بالکل ناممکن ہو گئی اور سکندر کو بلا مزاحمت موقعہ مل گیا کہ اپنی شوربور فوج کو بغیر کسی مزاحمت کے خشکی پر اتار کر آراستہ کر لے۔

میدان جنگ

اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہندی بادشاہ کا بیٹا 2000 سوار اور 120 رتھوں کے ساتھ بعجلت

تمام مقابلے کے لیے آیا۔ اس ناکافی فوج کو آسانی سے شکست دی گئی اور ان میں 400 آدمی مارے گئے اور تمام رتھیں ضائع ہوگئیں۔ مفرور سپاہیوں نے اس حادثے کی خبر پورس کے کیمپ میں پہنچائی۔ اب وہ خود اپنی فوج کی ایک کثیر تعداد کو ہمراہ لے کر لڑائی کے لیے نکلا اور تھوڑی سی فوج وہاں چھوڑ آیا کہ کرٹیراس کے مقابلے میں حفاظت کرے جو اس کے انتظار میں دریا کے پار کنارے پر پڑا ہوا تھا۔ ہندوستانی فوج اس مقام پر آراستہ ہوئی جو ان کو مل سکتا تھا۔ یعنی وہ میدان جسے کِرّی کہا جاتا ہے۔ یہ شمال و مشرق میں نیچی نیچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا اور عرض میں زیادہ سے زیادہ پانچ میل تھا۔

ہندوستانی فوج

یہ فوج جو ہندی بادشاہ نے ایک دلیر بیرونی حملہ آور کی زد سے اپنے ملک کو بچانے کے لیے اس وقت مہیا کی نہایت ہی شاندار تھی۔ دو سو قوی ہیکل ہاتھی تھے جو ایک دوسرے سے کم از کم ایک سو فٹ کے فاصلے پر کھڑے کیے گئے تھے۔ اس طرح ان کی آٹھ قطاریں بنائی گئی تھیں۔ یہ قلب فوج کے سامنے کا حصہ تھا۔ پورس کو ان مہیب جانوروں پر سب سے زیادہ بھروسہ تھا۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ وہ اجنبی سپاہیوں کو مرعوب کر دیں گے اور اس طرح یونانیوں کے خوفناک سواروں کے رسالے تتر بتر ہو کے قابو سے نکل جائیں گے۔ ہاتھیوں کے عقب میں 30000 پیادوں کا انبوہ کثیر تھا جو دہنے بائیں دونوں طرف ہاتھیوں کی قطاروں کے بیچ سے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ پیادے آگے بڑھا دیئے گئے تھے۔ اس حالت میں ہندوستانی فوج نے "ایک شہر کی سی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہاتھی گویا اس شہر کے برج تھے اور مسلح سپاہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دو برجوں کے درمیان کی فصیل ہے۔" (ڈیوڈرس۔ باب 17 فصل 87) میسرہ اور میمنہ کی حفاظت کے لیے مقابل میں سوار تھے اور ان کے سامنے رتھیں کھڑی تھیں۔ سواروں کی تعداد 4000 تھی اور رتھوں کی 300۔ ہر ایک رتھ میں 4 گھوڑے جتے ہوئے تھے اور چھ آدمی ان میں سوار تھے ان میں سے دو تیر انداز تھے جو گاڑی کے دونوں جانب مقرر کیے گئے تھے۔ دو سپر بردار اور دو گھوڑوں کو ہانکنے والے تھے جو گھمسان لڑائی کے موقعوں پر گھوڑوں کی باگوں کو چھوڑ بھالوں سے جنگ کرنے لگتے تھے۔ (کرٹیس۔ باب 8۔ فصل 14)

ہندوستانی اسلحہ

پیادوں میں سے ہر ایک آدمی ایک بھاری اور چوڑی تلوار اور بیل کے چمڑے کی لمبی ڈھال سے مسلح تھا۔ ان ہتھیاروں کے علاوہ ہر شخص کے پاس یا تو ایک برچھی ہوتی تھی اور ایک کمان۔

کمان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ "وہ تیرانداز کے قد کے برابر ہوتی ہے۔ اس کو وہ زمین پر ٹکا کر اور اپنے بائیں پیر سے اس کو پیچھے کی طرف دبا کر تیر لگاتے ہیں اور اس طرح کمان کے وتر کو پیچھے کی طرف کھینچتے ہیں۔ ان کا تیر لمبائی میں تین گز سے ذرا ہی کم ہوتا ہے۔ ہندی تیرانداز کے تیر کی مزاحمت نہ تو ڈھال کر سکتی ہے اور نہ چار آئینہ اور نہ کوئی اور حفاظت کا آلہ' اگر کوئی ایسی ایجاد ممکن ہو۔" (ایرین۔ انڈیکا' باب 16)

ہندی کمان کا زور بہت تھا مگر وہ ایسی بے ڈھنگی تھی کہ تیز رفتار مقدونیائی سواروں کے حملے کو نہ روک سکتی تھی۔ سطح زمین پر پھسلن تھی اس وجہ سے ہندی سپاہی اپنے ہتھیار کو زمین میں نہ گاڑ سکے۔ اور سکندر کے سپاہیوں نے اس سے پہلے اُن پر حملہ کر دیا کہ وہ اپنے ہتھیاروں کو ٹھیک کر سکیں۔ (کرٹیئس۔ باب 8' فصل۔14) ہندی سوار جن میں سے ہر ایک کے پاس دو برچھے اور ایک ڈھال تھی' سکندر کے سپاہیوں کے مقابلے میں جسمانی طاقت اور فوجی تربیت و ترتیب میں کچھ نہ تھے۔ (ایرین۔ باب 5۔ فصل 17)

اس فوج اور ان ہتھیاروں کے زعم میں پورس اس سپاہ دار کے مقابلے کے لیے تیار تھا جس کا نظیر دنیا میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔

سکندر کی فوجی تدابیر

سکندر کو معلوم ہو گیا کہ اگر مختصر سی فوج نے دشمن کے قلب پر حملہ کیا تو کامیابی کی امید بے سود ہے۔ اس لیے اس نے ارادہ کیا کہ سوار فوج ہندی میسرہ پر حملہ کرے تو کامیابی کا قوی احتمال ہے۔ اس نے چھ ہزار پیادہ سپاہ کے افسروں کو حکم دیا کہ وہ خاموش کھڑے رہیں اور اس وقت تک جنگ شروع نہ کریں جب تک یہ نہ دیکھ لیں کہ ان سواروں کے حملے نے' جو بذات خود سکندر کے زیر کمان تھے' ہندی پیادوں اور سواروں میں اضطراب نہیں پیدا کیا۔

جنگ کا پہلا حصہ

اس نے جنگ کا آغاز اس طرح کیا کہ ایک ہزار سوار تیراندازوں کو ہندی فوج کے میسرہ کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ جو یقیناً دریا کے کنارے کے قریب تک پھیلی ہوئی ہوگی۔ ان تیراندازوں نے اپنے تیروں سے ایک طوفان برپا کر دیا اور نہایت تندہی سے حملے کیے۔ ان کے پیچھے سوار فوج تھی جس پر سکندر خود کمان کر رہا تھا۔ ہندی میمنہ کی سوار فوج بعجلت تمام عقب کے راستے سے میسرہ کے ساتھیوں کو بچانے کے لیے روانہ ہوئی۔ مگر اس اثناء میں یونانیوں کے دو رسالے کیانوس کے زیر کمان' جن کو خاص اسی مقصد کے لیے سکندر نے فوج سے علیحدہ رکھا تھا'

نہایت تیزی سے پورس کی جمی ہوئی فوج کے سامنے سے گزرے اور میمنہ کے گرد پھر کر ہندی رسالے اور رتھوں پر عقب سے حملہ آور ہوئے۔ اب اس وقت جبکہ ہندی رسالے کوشش کر رہے تھے کہ اپنے مقابل کو اس حملے سے بچانے کے لیے کچھ تبدیلی کریں' ان میں خواہ مخواہ کچھ اضطرابی حرکت پھیل گئی اور سکندر کو موقع مل گیا۔ اس نے عین اسی وقت جب کہ ہندی فوج کا رسالہ اپنا رخ بدل رہا تھا' ان پر سخت ہلہ کیا۔ ہندی میمنہ و میسرہ دونوں بالکل پاش پاش ہو گئے اور لوگ "ہاتھیوں کے زیر سایہ اس طرح پناہ لینے کے لیے بھاگے جس طرح کوئی قلعے کی دیوار کے نیچے پناہ لیتا ہے۔" اس طرح جنگ کے پہلے حصے کا خاتمہ ہوا۔

جنگ کا دوسرا حصہ

اب مہاوتوں نے کوشش کی کہ مقدونوی فوج کے درمیان اپنے جانوروں کو بڑھایا جائے تاکہ اس مصیبت کو کسی طرح روکیں۔ مگر اب فلینکس آگے بڑھا اور اس نے لڑائی میں حصہ لینا شروع کیا۔ مقدونوی سپاہیوں نے ہاتھیوں پر اور ان کے سواروں پر متواتر برچھیاں برسانی شروع کیں۔ یہ جانور دیوانہ وار آگے بڑھے اور فلینکس کی ان گندھی ہوئی قطاروں کو' جن میں اضطراب پیدا کرنا انسان کی طاقت سے باہر تھا' اپنے پیروں سے روند ڈالا۔ ہندی سواروں نے اس نازک موقع کو غنیمت سمجھا اور پہلی شکست کا بدلا اتارنے کے لیے پھر کر سکندر کی سوار فوج پر حملہ آور ہوئے۔ مگر ہندی اس کام کے قابل نہ تھے جس کے پورا کرنے کی انہوں نے کوشش کی اور پسپا ہو کر ہاتھیوں کے درمیان پھنس کر رہ گئے۔ لڑائی کا دوسرا حصہ اب ختم ہوا۔

جنگ کا تیسرا حصہ

تیسرا اور آخری حصہ مقدونوی سواروں کے حملے سے شروع ہوا جنہوں نے ہندی فوج کی شکستہ قطاروں پر گھوڑے ڈال کے خون کے دریا بہا دیئے۔ دن کے آٹھویں ساعت (پلوٹارک۔ لائف۔ باب 60) کشت و خون کے اس تلاطم میں جنگ ختم ہوئی جس کو ایرین کے لفظوں میں بہترین طریقے سے بیان کیا جا سکتا ہے' کیونکہ اس کا بیان ان لوگوں کے چشم دید بیانات پر مبنی ہے جو اس جنگ میں شریک تھے۔

ہندیوں کی شکست

وہ لکھتا ہے کہ "اب چونکہ ہاتھی ایک تنگ مقام میں گھر گئے تھے۔ انہوں نے اپنوں کو بھی اتنا ہی نقصان پہنچایا تھا جتنا کہ دشمنوں کو۔ انہوں نے ان کو رخ بدلنے اور بھاگنے کی حالت میں

روند ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سواروں کا کثیر تعداد میں قتل عام ہوا کیونکہ وہ ہاتھیوں کے گرد ایک تنگ مقام میں گھرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے مہاوت مارے گئے اور ہاتھیوں میں سے بھی چند زخمی ہو گئے تھے۔ ان کے سوا جتنے اور بچے انہوں نے زخمی ہونے اور مہاوت کے نقصان کی وجہ سے جنگ میں اپنے فریق کا ساتھ نہ دیا۔ بلکہ زخموں کی تکلیفوں کی وجہ سے دیوانہ وار بلا تمیز دشمن و دوست سب کو دھکیلنا' روندنا اور ہر ممکن طریقے سے مارنا شروع کیا۔ اس کے برخلاف مقدونوی فوج کھلے ہوئے وسیع میدان میں تھی۔ اس کی نقل و حرکت کو کوئی چیز مانع نہ تھی۔ جب ہاتھی حملہ کرتے تو وہ ان کے راستے سے ہٹ جاتی اور جب وہ واپس جانے لگتے تو تعاقب کر کے ان پر برچھیوں سے حملہ کرتی۔ اس کے برعکس ہندی جوان جانوروں میں گھرے ہوئے تھے وہ ان کے غیظ و غضب کے بہت کچھ شکار ہوئے۔

"جب ہاتھی بالکل تھک گئے اور ان کی شورش کم ہوئی تو وہ ان جہازوں کی طرح جو پانی پر ڈگمگا رہے ہوں پیچھے ہٹے اور دشمن کی طرف منہ نہ کیا۔ اس وقت سکندر نے اپنے رسالے سے تمام ہندی فوج کو گھیر لیا اور اشارہ کیا کہ پیادہ فوج اپنے پیر جمائے اپنی ڈھالوں کو ملائے ہوئے فلینکس کی طرح آگے بڑھے۔ اس طرح ہندیوں کے رسالے کے تھوڑے ہی سوار بچے ہوں گے۔ باقی تقریباً بالکل تباہ ہو گئے۔ پیادہ فوج کا بھی یہی حشر ہوا کیونکہ مقدونوی ہر طرف سے ان کو گھیرے ہوئے آگے بڑھے چلے آتے تھے۔

"یہ حالت دیکھ کر سب کے سب مقدونوی فوج میں' جہاں کہیں ان کو ذرا سی راہ نظر آئی' بھاگ کر نکل گئے۔"

پورس کی گرفتاری

اس اثناء میں کریٹراس اور دوسرے افسروں نے جو مقابل کے کنارے پر چھوڑے گئے تھے' دریا کو عبور کیا اور ان کی تازہ دم فوج نے ہزیمت خوردہ سپاہیوں کا تعاقب شروع کیا۔ ہندی فوج بالکل فنا ہو گئی۔ ہاتھی یا تو مارے گئے یا قید ہوئے۔ رتھیں برباد ہو گئیں۔ 3000 سوار اور کم از کم 12000 پیادے مارے گئے اور 9000 قید ہوئے۔ مقدونیوں کا نقصان زیادہ سے زیادہ 1000 کا ہوا۔

خود پورس جو ساڑھے چھ فٹ قد کا اونچا مضبوط اور توانا آدمی تھا' آخری وقت تک لڑتا رہا۔ مگر آخر کار نو زخم کھا کر نیم جان حالت میں گرفتار ہوا۔

سکندر اپنے بہادر حریف کے ساتھ نہایت ہی عالی ہمتی سے پیش آیا اور بہ کشادہ پیشانی اس کی مغرورانہ درخواست کا جواب دیا کہ "وہ شاہانہ سلوک کا متمنی ہے۔" فاتح نے نہ صرف مفتوح

راجا کو پھر اس کا آبائی ملک دے دیا بلکہ اپنی طرف سے بہت وسیع علاقہ اس میں بڑھا دیا اور اس فیاضی کی وجہ سے ہندوستان کے قلیل قیام کے دوران اس کو اپنا ممنون احسان اور وفادار دوست بنا لیا۔[۲۶]

بیوس فلا

اس فتح کی یادگار قائم کرنے کے لیے دو شہروں کی بنیاد ڈالی گئی۔ ایک نیکیتیا جو میدان جنگ کے مقام پر ہی واقع تھا اور دوسرا بیوس فلا جو اس مقام پر واقع تھا جس جگہ سکندر نے جہلم دریا کو عبور کیا تھا۔ اس دوسرے شہر کا نام سکندر کے مشہور گھوڑے کے نام پر رکھا گیا تھا' جس نے اس کو اتنے خطرناک مقامات سے صحیح و سلامت گذار دیا تھا اور اب تکان' ماندگی اور بڑھاپے کے سبب آخر کار جان دی۔ بیوس فلا اپنے موقع کے لحاظ ایسے مقام پر تھا جہاں سے مغرب کی سمت سے ہندوستان کے وسط کے علاقے میں شاہراہ گذرتی تھی۔ اس لیے یہ ایسا مشہور اور اہم شہر ہو گیا کہ پلوٹارک نے اس کو سکندر کے سب سے بڑے شہروں میں شمار کیا۔ یہ شہر تقریباً اسی مقام پر واقع تھا جہاں آج کل جہلم شہر آباد ہے۔ اس کے موقع کا نشان زیادہ صحت کے ساتھ وہ بڑا ٹیلا ہے جو موجودہ شہر کے مغرب میں واقع ہے۔

نیکیتیا

نیکیتیا کے موقع کا جس کو بیوس فلا کی سی شہرت کبھی نصیب نہ ہوئی' اس قدر صحت کے ساتھ تعین نہیں کیا جا سکتا۔ مگر وہ غالباً میدان کری کے جنوب میں سکھ چین پور گاؤں کے مقام پر آباد تھا۔ یہی وہ مقام ہے جو سکندر کا میدان جنگ تھا۔[۲۷]

جنگ کا یادگار تمغہ

اس جنگ کی یادگار سکے کی صورت میں وہ مشہور عجیب و غریب شئے ہے جو اب برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ "اس کے ایک طرف تو ایک مقدونوی سوار اپنے سامنے ایک بھاگتے ہوئے ہاتھی کو ہانک رہا ہے۔ جس پر دو آدمی سوار ہیں اور دوسری طرف سکندر کھڑا ہے۔ رعد کا ایک چابک اس کے ہاتھ میں ہے اور سر پر ایرانی خود ہے۔ مسٹر برکلے ہیڈ سمجھتا ہے کہ یہ وہ تمغہ ہے جسے سکندر نے ان مقدونوی افسروں کو انعام دینے کے لیے ہندوستان میں مسکوک کیا تھا جو اس جنگ میں شریک تھے۔"[۲۸]

گلاسیا اور پورس ثانی

سکندر نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ مقتولین کی تجہیز و تکفین کرنے کے بعد حسب دستور قربانیاں کیں اور تفریح کا سامان بہم پہنچایا۔ اس کے بعد اس نے کریٹروس کو فوج کے ایک حصے کے ساتھ پیچھے چھوڑا اور حکم دیا کہ چوکیوں کو قلعہ بند کرے اور وسائل آمد و رفت کو کھلا رکھے۔ خود بادشاہ نے فوج کے چند دستوں کو ساتھ لے کر گلاسیا یا گلا کنیکوئی نامی ایک قوم پر حملہ کیا جس کا علاقہ پورس کے ملک سے ملحق تھا۔ 37 بڑے بڑے شہروں اور بے شمار قصبوں نے فوراً اطاعت قبول کی اور وہ پورس کے وسیع ملک میں شامل کر دیئے گئے۔ نیچے کی پہاڑیوں کے بادشاہ نے، جس کو یونانیوں نے ابی سریز لکھا ہے، مقاومت کو فضول اور بے سود دیکھ کر دوبارہ اطاعت قبول کی۔ ایک اور پورس نام کا راجا جو ہزیمت خوردہ راجا پورس کا بھتیجا تھا گنڈرس نام کے ایک علاقے پر حکمراں تھا۔ اس نے ایلچی بھیجے اور اس بادشاہ کے مطیع ہونے کا وعدہ کیا جس پر غالب آنا محال تھا۔ دوسرے اور خود مختار قبائل نے بھی ان بادشاہوں کی پیروی کی۔

وسط ماہ جولائی 326 ق م' عبور دریائے چناب

سکندر پہلے سے زیادہ مشرقی جانب کو روانہ ہوا اور اکیسنز (دریائے چناب) کو ایک نامعلوم مقام پر عبور کیا۔ مگر یہ مقام یقینی طور پر دامن کوہ کے قریب واقع تھا۔ دریا کو عبور کرنے میں اگرچہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوئی۔ مگر یہ کام اس وجہ سے دشوار ہو گیا کہ دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا اور دھارا اس زور سے چل رہا تھا کہ وہ عرض میں 3000 گز (15 سٹیڈیا) تھا اور دریا میں بہت سی زبردست چٹانیں تھیں جن سے ٹکرا کر بہت سی کشتیاں پاش پاش ہو گئیں۔[۲۹]

دریائے راوی کا عبور

سکندر کمک' سامان رسد اور وسائل آمد و رفت کا مناسب انتظام کرنے کے بعد مشرق کی طرف بڑھتا چلا گیا اور غالباً سیالکوٹ کے قدیم قلعے کے پاس سے گذرا۔ ہائڈریٹس (دریائے راوی) کو کیونکہ بغیر کسی مزاحمت کے عبور کر لیا تھا اس لیے ہے فس ٹیان کو واپس روانہ کیا گیا کہ نوجوان پورس کو پھر مطیع کرے جس نے کہ اپنے دشمن چچا کے ساتھ سکندر کے سلوک کو دیکھ کر حسد و رشک کی وجہ سے بغاوت کی راہ اختیار کر لی تھی۔

خود مختار قبائل

سکندر نے جنگ کے لیے ان اہم متحدہ خود مختار قبائل کو اپنا حریف منتخب کیا جن کا سردار کتھوئی کا قبیلہ تھا جو دریائے راوی کے بائیں یا مشرقی جانب آباد تھا اور جنگی معاملات میں بہت کچھ شہرت رکھتا تھا۔ ان کے ہمسائے قبائل آکسی ڈریکائی جو دریائے ہائی فے سس کے میدان میں' اور ملوئی جو دریائے ہائڈریٹس کے زیریں جانب لاہور کے جنوب میں آباد تھے' اب تک شامل نہ ہوئے تھے۔ کتھوئی کی مدد کے لیے اس وقت تک قرب و جوار کے چھوٹے چھوٹے قبیلے بھی آمادہ تھے اور وہ ہولناک مصیبت جو ملوئی پر آنے والی تھی چند روز کے لیے ملتوی ہو گئی۔ [30]

پم پرام اور سنگلا

راوی کے عبور کے دوسرے دن سکندر نے پم پرام نامی ایک شہر کو چند شرائط پر مطیع کیا۔ یہ شہر ایک قوم کا ملک تھا جس کو ایرین نے اڈرایسٹائی لکھا ہے۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد اس نے سنگلا کا محاصرہ کر لیا جس کو کتھوئی اور دوسرے متحدہ قبائل نے اپنا سب سے اہم قلعہ قرار دیا تھا۔ ان قبائل نے اپنے کیمپ کو جو نیچی نیچی پہاڑیوں کے دامن میں واقع تھا' گاڑیوں کی تین قطاروں سے محفوظ کر کے سخت مقابلہ کیا۔

اسی اثناء میں بڑا پورس محاصرین کی کمک کے لیے 5000 فوج' ہاتھی اور محاصرے کی مشین لے کر پہنچ گیا۔ مگر قبل اس سے کہ فصیل شہر میں کسی قسم کا شگاف ہو مقدونوی فوج سیڑھیاں لگا کر قلعے پر چڑھ گئی اور متحدین کو شکست دی جن میں سے ہزاروں مارے گئے۔ سکندر کا نقصان مقتولین میں تو صرف 100 کا ہوا۔ مگر بارہ سو آدمی زخمی ہوئے جو یقیناً بہت بڑی تعداد تھی۔

اس سخت مقابلے کی سزا دینے کے لیے' جو سنگلا کے آدمیوں نے کیا سنگلا کو مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ [31]

دریائے بیاس پر آمد

ان دریاؤں کے علاوہ ہائی فے سس (دریائے بیاس) اس اولوالعزم بادشاہ کے راستے میں ابھی اور حائل تھا اور وہ اس کے کنارے پر پہنچ کر اس کو عبور کرنے کی فکر کرنے لگا تاکہ اس کے پار کی اقوام کو بھی زیر نگیں کر لے کیونکہ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ نہایت جنگجو کاشتکار ہیں' ایک قابل تعریف حکومت امراء کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی زمینیں سرسبز و زرخیز ہیں جن میں زبردست' اور قوی ہیکل ہاتھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔

سکندر کی تقریر

سکندر نے یہ دیکھ کر کہ اس کی فوجیں پرانی خوشی اور جوش کے ساتھ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں اور نہ وہ اس بات پر راضی ہیں کہ دور و دراز مقامات پر اس کی ہمرکاب رہیں' ان کے جوش و خروش کو نئے سرے سے مشتعل کرنے کے لیے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں ان کو مخاطب کیا۔ اس نے ہیلس پونٹ سے لے کر دریائے ہائی فے سس تک کے تمام قطعہ زمین کی فتح کا حال بتلایا اور ان سے وعدہ کیا کہ تمام ایشیا کی دولت ان کے ہاتھ میں دے دے گا۔ مگر اس کے ان جملوں کا بالکل کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ فوج نے اس تقریر کو نہایت ہی تکلیف دہ خاموشی کے ساتھ سنا اور بہت دیر تک ساکت رہی۔

کیانوس کا جواب

آخر کار رسالے کے معتمد علیہ افسر کیانوس کو' جس نے پورس کی فوج پر حملے میں پیش قدمی کی تھی' اتنی ہمت ہوئی کہ سکندر کو جواب دے۔ اس نے بہ لائل یہ ثابت کرنا چاہا کہ فوج کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی کوئی انتہا ہونی چاہیے۔ اس نے اصرار کیا کہ بادشاہ اس بات کو یاد رکھے کہ ان یونانیوں اور مقدونیوں میں سے جنھوں نے آٹھ برس قبل ہیلس پونٹ کو عبور کیا تھا' بعض تو بیمار ہو کر وطن واپس چلے گئے اور بعض نو آباد شہروں میں بلا طیب خاطر جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بعض زخموں کی وجہ سے بیکار ہیں اور ایک بہت بڑی تعداد وباء اور تلوار کی نذر ہو چکی ہے۔

ستمبر 326 ق م

مگر امر واقعی یہ تھا کہ اب سکندر کے جھنڈے تلے بہت ہی کم آدمی رہ گئے تھے اور جو تھے وہ بھی مفلس قلاش دائم المرض' غیر مسلح اور مایوسی کی حالت میں تھے۔ اس نے اپنے خطبے کو مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم کیا۔

"اے بادشاہ! عین کامیابی کے دوران اعتدال بہترین خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ایسی بہادر فوج کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی انسانی دشمن کی پروا یا خوف نہ ہونا چاہیے۔ مگر پھر بھی انسان خدا کے قضاء و قدر کو نہ تو پیش از وقت معلوم کر سکتا ہے اور نہ اس سے محفوظ رہ سکتا ہے۔"[۳۲]

مراجعت کے احکام

کیانوس کے یہ الفاظ جس گرم جوشی سے قبول کیے گئے' اس سے اب فوج کے سپاہیوں کے مزاجوں کے متعلق کوئی شک وشبہ نہ رہ گیا۔ سکندر سخت شکستہ دل ہو گیا۔ مگر پھر بھی اپنی بات پر اڑا رہا اور اپنے خیمے میں چلا گیا۔ جب تیسرے دن باہر آیا تو اس کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اب آگے بڑھنے کا خیال بالکل عبث ہے۔ عین اسی وقت منجموں نے بڑی عقلمندی سے یہ بتلایا کہ دریا کو عبور کرنے کے لیے شگون اچھے نہیں۔ چنانچہ سکندر نے بادل ناخواستہ ستمبر 326 ق م میں فوج کو مراجعت کا حکم دے دیا۔

قربان گاہ

اپنی پیش قدمی کے انتہائی مقام پر یادگار کے طور سے اس نے بارہ قربان گاہ تعمیر کرائے جو مربع پتھروں سے بنائے گئے تھے اور پچاس مکعب بلند تھے۔ ان میں سے ہر ایک کسی ایک دیوتا کے نام منسوب کیا گیا تھا۔ اگرچہ فوج نے دریا کو عبور نہ کیا تھا۔ مگر پلائنی کے خیال کے مطابق (جس کو بظاہر غلط خبر پہنچی تھی۔) یہ قربان گاہ دریا کے دوسرے کنارے پر تعمیر کئے گئے تھے جہاں وہ مدت تک آنے جانے والوں کے لیے حیرت اور عبرت کے منظر بنے رہے۔ ممکن ہے کہ ان کے نشانات اب تک باقی ہوں۔ ان کو بیاس کے سب سے قدیم دور میں کوہستانی اضلاع گرداسپور' ہوشیار پور یا کانگڑے میں سے کسی میں تلاش کرنا چاہیے' جہاں سوائے [۴۳] و گننے کے اب تک کسی نے انہیں نہیں ڈھونڈا۔ دانشمند ایرین صرف یہ لکھتا ہے کہ "سکندر نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جس کو اس نے حکم دیا کہ بارہ قربان گاہ تیار کریں جو اونچائی میں سب سے بلند فوجی برجوں کے برابر ہوں۔ وہ ان کو دیوتاؤں کی شکر گذاری میں کہ انہوں نے اس مقام تک فتح وظفر میں اس کا ساتھ دیا' قربان گاہ کے طور پر بھی استعمال کرنا چاہتا تھا۔ جب یہ قربان گاہ تعمیر ہو چکے تو اس نے دستور کے مطابق ان پر قربانی کی اور شکار و تفریح میں وقت گذارا۔"

قربان گاہ پر چندر گپت کی عبادت

اس قدر مذہبی رنگ کے ساتھ دیوتاؤں کے نام سے منسوب کردہ یہ عمارات دو مقاصد کو پورا کرنے کے لیے تھیں تاکہ دنیا کے سب سے بڑے جرنیل کی دینداری اور اس کے کارناموں کی سب سے بہتر اور عمدہ یادگار ہو۔ ہندوستان کی سلطنتوں نے' جنہوں نے سکندر کی قوت کے آگے سر تسلیم خم کیا تھا' ان کی کماحقہ قدر کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے پہلے شہنشاہ

چندر اگپتاموریا' جو سکندر کی فتوحات کا مالک ہوا' اور اس کے جانشین صدیوں تک برابر ان قربان گاہوں کی تعظیم کرتے رہے اور وہ ان پر قربانی چڑھانے کے لیے وہ دریا عبور کر کے آیا کرتے تھے۔ ۴۴

سیاحوں کی حکایتیں

لیکن اگر کرٹیس اور ڈیوڈرس کے بیان پر اعتبار کر لیا جائے تو ان یادگار قربان گاہوں کی عظیم الشان سادگی کو بادشاہ کی طفلانہ خودنمائی نے ایک اضافہ کر کے بدنما اور بدصورت کر دیا تھا۔ یہ حکایت سب سے مفصل طور پر ڈیوڈرس نے بیان کی ہے۔ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ لکھتا ہے کہ ان قربان گاہوں کی تکمیل کے بعد سکندر نے حکم دیا کہ فوج کا ایک کیمپ تیار کیا جائے جو اس کی فوج کی قیام گاہ سے تین گنا زیادہ ہو اور اس کے گرد ایک خندق پچاس فٹ چوڑی اور چالیس فٹ گہری ہو' اور ایک فصیل بھی تعمیر ہو جس کا طول عرض بلندی معمول سے بہت زیادہ ہو۔ آگے چل کر حکایت میں بیان کیا گیا ہے کہ "اس نے یہ بھی حکم دیا کہ پیادوں کے لیے مکانات تعمیر ہوں اور ان میں سے ہر ایک میں ایک شخص کے لیے دو پلنگ چار ہاتھ لمبے بنائے جائیں۔ اس کے علاوہ دو مکان جو معمولی مکانات سے دگنے ہوں ہر ایک سوار کے لیے بنائے جائیں۔ اسی طرح جو کچھ مال و اسباب پیچھے چھوڑا جانے والا تھا اس کے متعلق بھی حکم ہوا کہ نسبتاً وہ بھی دوچند تعداد میں چھوڑا جائے۔" اس تمام قصے کا یہ منشا ہے کہ ہم سمجھیں کہ ان تمام احمقانہ باتوں سے سکندر ملک کے باشندوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ حملہ آور عام آدمیوں سے زیادہ قد آور اور قوی الجثہ تھے۔ ۴۵

اس بات کا یقین کرنا بالکل ناممکن ہے کہ سکندر اس قسم کی خودنمائی کا مرتکب ہوا ہو اور اس حکایت کو بے تامل اس بناء پر رد کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان حکایتوں کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے جو ان سیاحوں نے بیان کی ہوں گی' جنھوں نے یہ قربان گاہیں دیکھی تھیں۔

ضمیمہ ث

سکندر کا کیمپ' دریائے جہلم کو عبور کرنے کی جگہ اور جنگ کا موقع

یہ مسائل قابل حل ہیں!

میرے نزدیک دریائے جہلم کے کنارے پر سکندر کے کیمپ' اس دریا کی جائے عبور اور میدان جنگ کا موقع ایسے سوالات ہیں جو کافی صحت کے ساتھ حل ہو سکتے ہیں' بشرطیکہ قدیم مورخین کے بیانات اور اصلی جغرافیائی حالات پر بغور و فکر نظر کی جائے۔

دریائے جہلم

دریائے ہائی ڈس پیز (وتستا' بہت یا جہلم) نے پنجاب کے اور دریاؤں کے مقابلے میں اپنا راستہ بہت کم تبدیل کیا ہے اور جلال پور کے شمال کا حصہ جو کہ اس وقت زیر بحث ہے اور بھی کم تبدیل ہوا ہے۔ اس طرح متنازعہ سوالات کا حل اس وجہ سے کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہوا کہ دریا کے قدیم راستے کے متعلق ان میں شکوک کو جگہ دی جائے۔[۳۶]

ٹیکسلا

اسی طرح ہندوستان کے اس عظیم الشان شہر ٹیکسلا کے متعلق بھی جہاں سے سکندر نے اپنا کوچ اندرونی ملک میں دریائے جہلم کی طرف شروع کیا کوئی شک و شبہ نہیں۔ اگرچہ اس شہر کے کھنڈروں کے متعلق کننگھم کا بیان اکثر وجوہ سے ناکافی ہے' مگر اس کا ٹیکسلا کے موقعے کو شاہ ڈھیری یا اس کے قریب کے مقام کو قرار دینا یقیناً صحیح ہے۔ یہ کھنڈر جو محض ٹیلوں کی صورت میں

مختلف کھیتوں میں منتشر ہیں راولپنڈی کے شمال مغرب میں 200 میل کے فاصلے پر اور حسن ابدال کے گاؤں کے جنوب مشرق میں تقریباً نو میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ [ے]

ٹیکسلا سے جہلم تک کا فاصلہ

ٹیکسلا سے جہلم شہر کا فاصلہ جیسا کہ موجودہ نقشوں سے ظاہر ہوتا ہے' صرف 90 میل کا ہے۔ اور ٹیکسلا سے جلال پور کا فاصلہ تقریباً تیس اور دریا کے جنوب میں چند میل اور زیادہ ہے۔ شاہ ڈھیری (ٹیکسلا) سے جہلم کا شمالی یا بالائی فاصلہ براہ روہتاس و درۂ بکرال 94 انگریزی میل ہے۔ وہ راستے یا پگڈنڈیاں جو براہ دوھیال و درۂ بنہار شاہ ڈھیری سے جلال پور کو جاتی ہیں طول میں 109 اور 114 میل کے درمیان ہیں۔ [۸]

اس بات پر ہر ایک کو اتفاق ہے کہ سکندر دریائے جہلم پر ضرور جہلم یا جلال پور کے مقام پر پہنچا ہو گا اور ان کے سوا دوسرے مقامات سب بعید از قیاس ہیں۔ یہ دونوں مقام ان قدیم راستوں پر واقع ہیں۔ جہاں پرانے معبر موجود تھے۔

جہلم کا راستہ

بظاہر بلاشک و شبہ حملہ آور کا مطمع نظر ضرور جہلم ہی ہو گا' جو ٹیکسلا کے مقام سے بہت نزدیک ہے اور جہاں پر وہ معبر ہے جو "بہت آسان گذار اور جلال پور کے معبر سے عرض میں صرف ایک تہائی ہے۔" [۹] ان دونوں معبروں کی طرف جانے کا راستہ ناہموار اور دشوار گذار ہے۔ مگر بہرحال جلال پور کی طرف ایک بڑی فوج کو کوچ کرتے ہوئے پیچ در پیچ نمک کے پہاڑوں میں پھنس جانے کا زیادہ اندیشہ اور زیادہ دقتوں کا سامنا ہو گا' بہ نسبت اس کے کہ وہ جہلم کے راستے کو اختیار کرے اور اسی لیے قیاس یہ ہے کہ سکندر نے قریب اور آسان راستہ اختیار کیا ہو گا اور جہلم کے قریب چھاؤنی ڈالی ہو گی۔ یہ رائے کہ اس نے یہ قدرتی اور بظاہر آسان راستہ اختیار کیا تھا برنس کورٹ اور ایبٹ نے ظاہر کی اور یہ تینوں اپنے فوجی تجربے اور مقامی معلومات کی صحت کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ معاملہ زیر بحث میں ان کی رائے مستند سمجھی جائے۔

مگر اس کے برعکس یہ قیاس کہ سکندر کی چھاؤنی جلال پور کے مقام پر قائم کی گئی تھی اور یہ کہ دریا کو اسی شہر کے چند میل شمال میں عبور کیا گیا تھا' ایسے لوگوں کی ذات سے وابستہ ہے جیسے ایلفنسٹن' کننگھم اور جزنی۔ چونکہ یہ لوگ یورپ میں اپنے مدمقابل علماء سے زیادہ مشہور اور نامور تھے اس لیے باوجودیکہ جلال پور والا نظریہ بعید از قیاس ہے' تاہم وہ دنیا کو اس کے منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

کننگھم کے خیالات

اس نظریئے کو نہایت تفصیل کے ساتھ کننگھم نے ثابت کیا ہے۔ اس کے دلائل اور بھی زوردار ہو جاتے اگر وہ اس مقام کو بغور دیکھ لیتا جس کو ایبٹ نے کالل پیائش کے بعد سکندر کا میدان جنگ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ایبٹ کا خیال ہے 'اگر جنگ کری کے میدان میں ہی ہوئی تھی تو سکندر کی چھاؤنی ضرور جہلم کے مقام پر یا اس کے قریب ہوگی اور دریا کو بھی ضرور اس شہر کے ذرا شمال میں عبور کیا گیا ہوگا۔ مگر بدقسمتی سے کننگھم نے نہ ایبٹ کے دلائل پر غور کیا اور نہ شہر کے شمال میں دریائے جہلم کے راستے کو غور سے دیکھا۔ 1846ء میں یہ نظریہ قائم کر کے کہ سکندر کی چھاؤنی جلال پور ہی کے مقام پر تھی' اس نے 1863ء میں جلال پور کے مقام کو گہری نظر سے دیکھا اور اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح جغرافیائی حالت کو اپنے نظریئے کے مطابق بنا لے۔ وہ جنرل ایبٹ کے مضمون کی طرف صرف "ایک عالمانہ مضمون" کہہ کے اشارہ کرتا ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے اس کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ [۹۵]

اس کے دریا کے فاصلے کی دلیل

کننگھم نے جلال پور کو سکندر کی چھاؤنی قرار دینے کے تین بڑے دلائل بیان کیے ہیں۔ ان میں سے تیسرا یہ ہے کہ ایرین کے مطابق (اناباسس آف الیگزینڈر' باب 6 فصل 40) جہازوں کا بیڑا جب لیکتیا کے مقام سے دریائے جہلم پر سے گذر رہا تھا تو وہ کان نمک کے بادشاہ سوفائی ٹیز کے پایہ تخت تین دن میں پہنچا۔ کننگھم کے خیال کے مطابق سوفائی ٹیز کا یہ پایہ تخت احمد آباد کے مقام پر واقع تھا جو ایک باربردار کشتی کے لیے جلال آباد سے "ٹھیک تین دن کا راستہ ہے" حالانکہ وہ جہلم سے چھ دن کے فاصلے پر ہے۔ [۹۶] اور اس لیے جلال پور جہلم سے زیادہ ان حالات کے لیے موزوں ہے۔ یہ دلیل جس پر کننگھم نے سب سے زیادہ زور دیا ہے اس بات پر منحصر ہے کہ سوفائی ٹیز کے پایہ تخت کے موقعے کا صحیح پتہ لگایا جائے اور کیونکہ یہ نشان جو کننگھم نے بتلایا ہے محض قیاس ہی قیاس ہے اور کسی شہادت سے ثابت نہیں ہوتا' اس لیے وہ دلیل جو ایسے دعوے پر قائم ہو قابل بحث نہیں۔

سٹریبو کی کتاب سے دلیل

دوسری اور زیادہ اہم دلیل وہ ہے جو سٹریبو (باب 15۔ فصل 32) کے اس بیان پر مبنی ہے کہ سکندر کا "راستہ دریائے جہلم تک زیادہ تر جنوب کی طرف تھا اور اس کے بعد ہائی پس (یعنی

دریائے بیاس) تک زیادہ مشرقی جانب ہو گیا۔ مگر ہر حالت میں وہ میدانوں کی نسبت پہاڑوں سے نزدیک تر تھا۔"

جلال پور بالکل جنوب میں واقع ہے اور اس کے برخلاف جہلم ٹیکسلا سے تقریباً جنوب مشرق میں ہے۔ اس لیے سرسری نظر سے دیکھنے پر جلال پور کا موقع' چھاؤنی کے لیے سٹریبو کے بیان کے پہلے حصے کے مطابق بمقابلہ جہلم کے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

اس دلیل کی تردید

مگر حقیقت میں دونوں مقام عبارت کے مطابق درست ہیں۔ ہم کو ان مقامات کا کچھ حال معلوم نہیں۔ جہاں پر سکندر نے دریاؤں کو ایک دوسرے کے بعد عبور کیا۔ یعنی چناب' راوی اور سب سے آخری دریا ہائی فے سس (بیاس)۔ یہ خیال کہ سکندر نے دریائے چناب کو وزیر آباد کے مقام پر عبور کیا تھا کسی شہادت پر مبنی نہیں۔ کننگھم اور دیگر مصنفین جو جلال پور کے نظریئے پر زور دیتے ہیں سٹریبو کی عبارت کے اس آخری حصے کو بھول جاتے ہیں کہ تمام راستہ دامن کوہ کے قریب ہی طے کیا گیا تھا۔ ایک اور جگہ (باب 15 فصل 26) سٹریبو یہ ظاہر کرتا ہے کہ سکندر نے اس راستے کو اس وجہ سے اختیار کیا تھا کہ جو دریا اس راستے میں آتے ہیں وہ اپنے منبع کے قریب بہ نسبت اور جگہ کے زیادہ آسانی سے عبور کیے جاسکتے ہیں۔

میک کرنڈل

میک کرنڈل نے اس عام بیان کو فراموش کر کے جس میں ٹیکسلا سے بیاس تک کا راستہ شامل ہے ایک نقشہ تیار کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر پہاڑیوں سے دور رہا اور جلال پور' وزیر آباد' لاہور اور امرتسر کے پاس سے ہوتا ہوا پنجاب کے میدانوں میں اتر آیا۔ مگر کوچ کا اصلی راستہ ضرور بہت کچھ شمال کی طرف ہو گا۔ دریائے جہلم جس جگہ جہلم کے شمال میں پہاڑوں سے نکلتا ہے' اسی جگہ عبور کیا گیا ہو گا اور اس طرح فوج لامحالہ ریاست کشمیر (جموں) کی سرحد کے قریب قریب ہوتی ہوئی سیالکوٹ اور گرداسپور کے پاس سے گذری ہو گی۔

یہ قیاس کہ سکندر نے فوج کے کوچ کے لیے یہی راستہ اختیار کیا ہو گا' سٹریبو کی عبارت کے عین مطابق ہے۔ اگر جہلم سے سیالکوٹ یا اس کے شمال میں ایک لکیر کھینچی جائے تو وہ ٹیکسلا سے جہلم کی لکیر کی بہ نسبت کہیں زیادہ مشرقی سمت میں ہو گی۔

اس طرح جلال پور کے نظریئے کو ثابت کرنے کے لیے کننگھم کی دوسری دلیل بھی تیسری دلیل کی طرح ناقابل قبول ہے۔

پلائنی کی کتاب سے دلیل

وہ دلیل جس کو کننگھم نے سب سے پہلے بیان کیا ہے اور جس پر کہ وہ سب سے زیادہ زور دیتا ہے' پلائنی کے ان اعداد پر مبنی ہے جو اس نے پیو کیلوٹس (چارسدہ) براہ ٹیکسلا سے دریائے جہلم کے فاصلے کے متعلق بیان کیے ہیں (باب 6- فصل 21) پلائنی نے مندرجہ ذیل فاصلے بیان کیے ہیں- (1) پیو کیلوٹس سے ٹیکسلا تک 60 رومی = 55 انگریزی میل' (2) ٹیکسلا سے دریائے جہلم تک 120 رومی = 110 انگریزی میل- اور کننگھم بہ لائل ثابت کرنا چاہتا ہے کہ یہ فاصلے جہلم کی بہ نسبت جلال پور سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں- مگر ایک مشہور بات ہے کہ پلائنی کے اعداد عام طور پر غلط ہوتے ہیں- مثلاً اسی عبارت میں جس کا حوالہ دیا گیا ہے پلائنی نے دریائے جہلم سے بیاس تک کا فاصلہ 390 رومی میل قرار دیا ہے' جو ظاہر ہے کہ بالکل غلط ہے- اس لیے پلائنی کی موجودہ کتاب کے اعداد پر بھروسہ کرنا تحقیق کے خلاف ہے- خود کننگھم کو بھی یہ معلوم تھا کہ پیو کیلوٹس اور ٹیکسلا کے درمیان کا فاصلہ براہ اُہند' جہاں سکندر نے دریائے سندھ کو عبور کیا' پلائنی کے بیان کیے ہوئے فاصلے سے زیادہ ہے اور اس بناء پر اس نے تجویز کیا تھا کہ کتاب کی عبارت کو صحیح کر دیا جائے- (رپورٹ جلد دوم- 112)

اس دلیل کی تردید

لیکن اگر ٹیکسلا سے دریائے جہلم کے 120 رومی میل کے فاصلے کو صحیح مان لیا جائے' تو بھی یہ نظریہ رد نہیں ہوتا کہ سکندر کی چھاؤنی جہلم کے مقام پر ہی تھی- کننگھم کے بیان کے مطابق (رپورٹ جلد دوم صفحہ 179) ایک پرانی سڑک کے لحاظ سے یہ فاصلہ 94 میل کا ہے- پلائنی کے بیان سے فاصلہ 110 انگریزی میل ہے اور اس طرح دونوں میں صرف 16 میل کا فرق ہے' اور یہ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ زیادہ نہیں کہ نہایت دشوار ملک میں سے سکندر کے راستے کا ہم کو علم نہیں اور نہ یہ ہم کو معلوم ہے کہ بائیس صدیوں میں کیا کیا تغیرات وقوع میں آچکے ہیں- اس طرح یہ دلیل جو پلائنی کے اعداد پر مبنی ہے' خواہ وہ اعداد صحیح ہوں یا غلط' بالکل فضول اور ہیچ ہے-

میں نے اس طرح یہ ثابت کر دیا ہے کہ جلال پور کے نظریئے کو ثابت کرنے کے لیے کننگھم کے تمام دلائل ناکامیاب ہیں اور یہ کہ جہلم کا نظریہ (بجائے اس کے سٹریبو کی شہادت کے مخالف ہو) عین اس کے مطابق ہے-

سرزمین متعلقہ

ایلفنسٹن اور کننگھم کا نظریہ سٹریبو کے بیان کے علاوہ سرزمین گردونواح کے حالات کی وجہ سے اور بھی زیادہ خلاف ہے۔

ایرین ایک محقق مصنف ہونے کے علاوہ بہترین ہمعصر اسناد سے مستفید ہوا تھا اور ان کی ہر ایک شہادت کو پرکھ چکا تھا۔ اس کے بیانات اِس مسئلے کے متعلق نہایت صاف ہیں۔

دریا کے شمال میں وہ جگہ جہاں سکندر رات کے وقت پوشیدہ دریا کو عبور کرنے کے لیے گیا' دریا میں ایک "عجیب و غریب موڑ" پر واقع تھی اور اس نے اس کی نقل و حرکت کو پوشیدہ رکھنے میں مدد دی۔ جلال پور کے شمال میں مندیالہ اور کو تھیرا کے گاؤں کے درمیان جہاں کننگھم معبر قرار دینا چاہتا ہے کوئی ایسا موڑ واقع نہیں (رپورٹس' جلد دوم لوح 66)۔ مگر جہلم کے قریب بھونا کے مقام پر (جہاں ایبٹ معبر قرار دیتا ہے) ایسا موڑ موجود ہے۔

رات کا کوچ

ایرین کے نہایت ہی عمدہ اور شگفتہ بیان (باب 5 فصل 11) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سکندر نے یہ رات کا کوچ دریا کے بالکل متوازی کیا تھا۔ جنگل سے گھری ہوئی بلند زمین اور اس عجیب و غریب موڑ کے قریب کے ٹاپو کا ذکر کرنے کے بعد وہ کہتا ہے:

"یہ بلند زمین اور ٹاپو اس زبردست چھاؤنی سے 150 سٹیڈیا (یعنی تقریباً 17 انگریزی میل) تھے۔ مگر تمام کنار دریا کے ساتھ ساتھ اس نے کچھ کچھ فاصلے پر اس طرح ہرکارے مقرر کر دیئے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں اور فوج میں ان احکام کو سرعت کے ساتھ شائع کر دیں جو رات کو بادشاہ کسی مقام سے صادر کرے۔"

چھاؤنی اور معبر کے عین درمیان میلیگر اور دوسرے افسر مقرر کیے گئے تھے اور ان کو حکم تھا کہ وہ جونہی یہ دیکھیں کہ ہندی فوج جنگ میں مشغول ہو گئی ہے تو فوراً تھوڑی تھوڑی تعداد میں دریا کو عبور کر لیں۔ اس کے بعد مورخ لکھتا ہے کہ "سکندر دریا کے کنارے بہت کچھ دور چلا گیا تاکہ نظر نہ آ سکے۔" ان بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سکندر نے اپنے رات کے کوچ میں دریا کے کنارے کے متوازی تقریباً سیدھا راستہ اختیار کیا۔ مگر پھر بھی اتنا دور تھا کہ وہ دشمن کی نظر سے بچا رہا۔

کننگھم کا قیاس غلط ہے

یہ تمام باتیں کننگھم کے اس نظریئے کے بالکل برعکس پڑتی ہیں جو اس نے اپنے نقشے (رپورٹس جلد دوم لوح 66) میں ظاہر کیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کوہستان نمک کے غاروں میں سے ایک مستطیل کے تین اضلاع کے گرد گھوما اور جلال پور سے تقریباً بالکل شمال میں سات یا آٹھ میل ملک کے اندرونی حصے میں داخل ہوا اور پھر مشرقی سمت میں سات میل جانے کے بعد آخر کار دو یا تین میل دریا کی طرف واپس آیا۔ جلال پور کے مقامی حالات کسی طرح بھی رات کے کوچ کے اس بیان کی مطابقت نہیں کرتے جو ایرین نے بیان کیے ہیں۔ کننگھم کے نقشے میں دراصل ایک سخت کوشش اس امر کی گئی ہے کہ امور غیر مطابق کو ایک دوسرے سے مطابقت دے دی جائے اور حسب دلخواہ اپنے نظریئے کو غلط بیانات کی بناء پر قائم کر دیا جائے۔

دریا کا بیان

دریا کے وہ حالات بھی جن کو قدیم مورخین نے اس وقت کے متعلق بیان کیا ہے' جب سکندر نے اسے عبور کیا تھا' جلال پور والے نظریئے کے بالکل برخلاف ہیں۔ تمام اسناد اس بات پر متفق ہیں کہ عبور کے وقت کوہستان پر برف پگھلنے اور بارش کی کثرت کی وجہ سے دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ مگر باوجود اس کے دریا کا عرض صرف چار سٹیڈیا (یا 809 گز) تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں (اواخر جون یا آغاز جولائی میں) جلال پور کے مقام پر دریا کا پاٹ اس کے دگنے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ دریا کی روانی میں بہت سے ٹاپو اور زیر آب چٹانیں بھی حائل تھیں۔ مگر جلال پور کے مقام پر نہ تو چٹانیں ہیں اور نہ ٹاپو۔ [۴۲]

صحیح نظریہ

اگر جلال پور کے نظریئے کو بالکل ترک کر دیا جائے اور سکندر کی چھاؤنی جہلم میں یا جہلم کے قریب قرار دی جائے تو جغرافیائی مشکلیں سب حل ہو جاتی ہیں۔ اس وقت یہ معلوم ہو گا کہ سکندر کا رات کا کوچ دریا کے مغربی کنارے کچھ تھوڑے سے فاصلے پر دریا کے تقریباً متوازی کیا گیا اور اس کا رخ دریا کے "عجیب وغریب موڑ" کی طرف اس کی چھاؤنی کے مفروضہ موقع سے خط مستقیم 13 یا 14 میل تھا۔ اس فاصلے کو کوچ کے لیے سہولت کے ساتھ 17 میل قرار دیا جا سکتا ہے' بشرطیکہ راستہ ذرا پیچ دار ہو۔ مگر یہ بالکل ناممکن ہے کہ سکندر کے کیمپ کے اصلی موقعے اور جگہ کا پتہ صحت کے ساتھ لگایا جا سکے جہاں کہ فوج اس خطرناک سفر کے لیے کشتیوں میں سوار ہوئی۔

اور یہ ممکن ہے کہ جنرل ایبٹ کے نقشے میں دو یا تین میل کا فاصلہ زیادہ کر دیا جائے۔
منگلا کے جنوب مشرق میں بھونا کے قریب "عجیب وغریب موڑ" کے پاس کوچ کرنے سے سکندر کو یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ اس قابل ہو گیا کہ ایک محفوظ علاقے میں سے گذر جائے۔ اس کے برعکس دریا کے دوسرے کنارے پر اس کے دشمن کو مجبوراً ایک موڑ کے گرد سے گذرنا پڑا۔ اگر سکندر کے زمانے میں بھی ریگ رواں ایسی جگہ پر موجود تھا جہاں وہ اب ہے تو پورس کی فوجوں کو مقدونوی فوجوں تک پہنچنے میں ضرور ایک بڑا چکر پڑتا ہو گا۔ بہر حال وہ فاصلہ جو ہندی فوجوں کو طے کرنا پڑا اس سے کہیں زیادہ تھا جو سکندر نے طے کیا۔

میدان جنگ

مقدونوی فوج میں 11000 آدمی شامل تھے۔ جب وہ دریا کو عبور کرنے کے تمام مصائب پر غالب آگئی اور خشکی پر اتری تو ایک میدان میں داخل ہوئی جسے "کری" کہتے ہیں اور جو شمال و مشرق میں نیچی نیچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہ میدان زیادہ سے زیادہ پانچ میل چوڑا ہے اور اس میں جنگ کے لیے اگر بہت زیادہ نہیں تو کم از کم کافی جگہ ضرور ہے۔ معبر کے پاس دریا پتھروں کے اوپر سے گذرتا ہے اور ایک ٹاپو جو اس وقت بھی موجود ہے اور "دوسروں سے بڑا ہے" اس جگہ سے بہت مناسبت رکھتا ہے جہاں یونانی مورخین کے بیان کے مطابق سکندر پہلے خشکی پر اترا تھا اور جو اس وقت سے اب تک شاید باقی رہا ہو یا نہ رہا ہو۔

سکندر کی ندی

وہ ندی جسے "سکندر کی ندی" کہا گیا ہے اور جو اب بہت کچھ بند ہو گئی ہے، وہی معلوم ہوتی ہے جسے مقدونوی فوج نے عبور کیا تھا۔ اور وہ اگر بالکل وہی نہ ہو تو کم از کم اسی ندی کے قریب ہو گی جسے سکندر نے عبور کیا۔ جنرل ایبٹ اپنے نقشے کے متعلق یہ کہنے میں بالکل حق پر ہے کہ "اس وقت 1848ء) دریا کی حالت سکندر کے مورخین کے بیانات کے اس قدر مطابق ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقشہ بجائے دور آخر کے قدیم زمانے کا ہے۔" جنرل ایبٹ کا "فاضلانہ مضمون" صبح سے شام تک پورے دو دن کی محنت شاقہ سے کی ہوئی حقیقی پیمائش پر مبنی ہے اور اس کے خیالات کی نہ تو مخالفت ہوئی اور نہ وہ رد کیے گئے۔ کننگھم نے ان کو محض نظر انداز ہی کر دیا تھا۔

گروٹ کی رائے

یونان کا مورخ گروٹ ہی ایک ایسا مشہور مصنف ہے جس نے ایبٹ کی محنت کی داد دی ہے اور اس نے مان لیا ہے کہ جنرل کا مضمون "اس نظریئے کے لیے کہ معبر جہلم ہی کے قریب تھا بہت کچھ قابل قبول دلائل و براہین سے مملو ہے۔" مسٹر گروٹ کی یہ رائے بلاشک وشبہ تمام علمی دنیا کی رائے ہو جاتی اگر جنرل ایبٹ کا مضمون اس طرح شائع کیا جاتا کہ وہ سب کے پاس پہنچ جائے۔ مگر چونکہ وہ ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک پرانے رسالے میں تقریباً مدفون ہو گیا ہے' اس لیے بہت کم لوگوں نے اس کو پڑھا ہے۔ اس کے برخلاف سر الیگزینڈر کننگھم کی اشاعتیں سرکاری تھیں' اس لیے زیادہ شائع ہوئیں اور لوگوں نے بلا ردو قدح ان کو تسلیم کر لیا۔

حاصل کلام

مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ سکندر نے دریائے جہلم کی طرف کوچ کے لیے سب سے قریب اور آسان راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ دریا کے کنارے جہلم یا اس کے قریب کے مقام پر پہنچا تھا جہاں اس نے چھاؤنی ڈالی۔ اس نے دریا کو اس مقام پر عبور کیا جہاں وہ تنگ اور پتھریلا تھا' اور پورس کے ساتھ جنگ کری کے میدان میں واقع ہوئی تھی۔ دریائے جہلم اور بیاس کے درمیان کے کوچ کا راستہ صحت کے ساتھ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مگر وہ یقیناً جہاں تک ممکن تھا دامن کوہ کے پاس پاس واقع تھا اور ضرور سیالکوٹ کے پاس سے گذرا ہو گا۔ میجر ریورٹی آنجہانی کی بھی یہی رائے تھی۔ اس نے مجھے 1905ء میں لکھا تھا: "سکندر کے دریائے جہلم کے معبر کے متعلق میں تم سے بالکل متفق ہوں۔ مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب جنگ گجرات کے بعد ہم نے سکھوں اور افغانوں کے تعاقب میں دریا کو عبور کیا تھا تو اسی مقام کو اختیار کیا تھا جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔ اس وقت بھی اس معاملے پر بحث ہوئی اور جنرل ایبٹ کے نظریئے کے موافق ہی فیصلہ ہوا تھا۔ ہم کو بہرحال سکندر کی جنگی معلومات کا تو معترف ہونا چاہیے۔ یہی وجہ اس کے لیے کافی ہو گی کہ وہ دریاؤں کے منبع کے قریب قریب رہے تاکہ ان کو بہ آسانی عبور کر سکے۔ اس طرح شمالی کوہستان نے اس کی فوج کے پہلو کو محفوظ رکھا ہو گا۔" [43]

ضمیمہ ج

جنگ جہلم کا سن وقوع

اصل سن مشکوک ہے

قدیم مورخین کی اس شہادت کا ذکر گزشتہ ضمیمہ (ش) میں آچکا ہے کہ دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی اور جنگ سے پہلے' اس کے دوران میں اور اس کے بعد بارش لگاتار ہوتی رہی۔ اسی شہادت سے بلاشک و شبہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جنگ ضرور اواخر جون یا آغاز جولائی میں ہوئی ہوگی۔ لیکن اس کے علاوہ چند اور صریح بیانات ایسے ہیں جو سنین کے تعین کا ادعا کرتے ہیں اور ضروری ہے کہ ان پر غور کر لیا جائے۔

ایرین کا پہلا بیان

ایرین کا پہلا بیان یہ ہے کہ یہ جنگ گرمی میں آفتاب کے انقلاب صیفی کے بعد واقع ہوئی' کیونکہ یہ دریا کی حالت کے متعلق شہادت اور ڈیوڈرس کے اس بیان کے مطابق ہے کہ جب فوج بیاس پر پہنچی تو وہ 70 دن تک برق و باد کے طوفان کا مقابلہ کر چکی تھی۔

ایرین کا دوسرا بیان

مگر ایرین کا دوسرا بیان (اناباسس آف الیگزینڈر۔ باب 5 فصل 9) ایک حد تک غلط ہے کہ جنگ "ماہ ممنی کیئان میں اس سال لڑی گئی جبکہ ہے گے مان ایتھنز میں آرکن تھا۔" اس کے علاوہ ڈیوڈرس کا یہ بیان (باب 17 فصل 87) کہ جنگ سے پہلے موسم بہار میں ٹیکسلا میں داخلہ اس سال ہوا "جبکہ کرمس ایتھنز کا آرکن تھا جس میں کہ رومیوں نے ببلیس کارنی لیئس اور آلس پوسٹیومیس کو اپنا قونصل مقرر کیا" بظاہر قطعی غلط ہے۔ اس میں قونصل اور آرکن میں سے

کوئی بھی درست نہیں۔

مقدونوی تقویم

اس واقعے کے اصلی ماخذ یعنی سکندر کی فوج کے مقدونوی افسروں نے اس کی تاریخ کو مقدونوی تقویم کے مطابق بیان کیا ہو گا اور ممکن ہے کہ مورخین کے بیان میں اس غلطی کی وجہ سے تفاوت پڑ گیا ہو جو مقدونوی سنین کو رومی یا ایٹک سنین میں تبدیل کرنے سے واقع ہو گئی ہو۔ اور جیسا کہ مسٹر ہو گر تھ نے لکھا ہے کہ موجودہ زمانے کے عالم کے لیے یہ ناممکن ہے کہ اس تبدیلی کی جانچ پڑتال کر سکے کیونکہ مقدونوی تقویم کے متعلق ہماری معلومات نہایت ہی ناقص ہیں اور ان طریقوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں جن سے کہ مقدونوی سنین کو دوسرے سنین میں تحویل کر کے بیان کیا جاتا تھا۔ [۴]

مُنی کیئان

یہ یقینی ہے کہ جنگ 326 ق م میں واقع ہوئی اور اس کے مقابلے کے ایٹک سن (ال 2، 113) کے متعلق فرض کیا جاتا ہے کہ وہ 25 جون 327 ق م کو شروع ہوا اور 15 جون 326 ق م کو ختم ہوا۔ [۵] لیکن دسویں مہینے منی کیئان کو اگر ہم سال میں ایک فاضل مہینہ بھی شامل کر دیں تب بھی 13 جون کے بعد تک اس کو نہیں لایا جا سکتا۔ اگر ایک اور مہینہ زیادہ نہ کیا جائے تو منی کیئان 14 مئی یا اس کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔ مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنگ 21 جون کے بعد واقع ہوئی تھی اور اس طرح یہ بالکل ظاہر ہے کہ "ایرین نے ایٹک مہینے کا نام غلط لکھا ہے۔ قلمی نسخے میں بجائے منی کیئان کے میٹاجیتان پڑھنے کی تجویز جیسا کہ گروٹ نے لکھا ہے "محض قیاس" ہی ہو گا۔ اس کے علاوہ یہ تاریخ ہے گے مان کے آرکن ہونے سے اور بھی زیادہ دور پڑتی ہے۔

آرکن

کرمس یقیناً ہے گے مان کے بعد آرکن ہوا اور اگر انگر ایٹک سن 7-326 ق م کو 15 جون کو ختم کرنے میں حق پر ہے تو ڈیوڈرس 'اگرچہ اس کا ٹیکسلا میں داخلے کو کرمس کے آرکن ہونے کے ساتھ مطابقت دینا غلط ہی ہو مگر اس حالت میں وہ بالکل صحیح ہو گیا' اگر وہ اپنے ناظرین پر صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہو کہ جنگ اس وقت واقع ہوئی جب کرمس آرکن ہو چکا تھا۔ لیکن جیسا کہ دیگر مصنفین کا خیال ہے 'اگر کرمس 28 جولائی سے پہلے آرکن ہی نہیں ہوا تو ایرین کا یہ بیان صحیح ہو گا کہ جب جنگ ہوئی تو ہے گے مان آرکن تھا۔

اس غلطی کی تصریح

اریین کی منی کیئان کا ذکر کرنے کی غلطی کی بظاہر اس طرح تاویل کی جاسکتی ہے کہ سکندر اس مہینے میں دریا کے کنارے پر پہنچا تھا اور ایک ذرا سی غلطی کی وجہ سے اس کے دریا کے کنارے پر پہنچنے کی تاریخ کو جنگ پورس کی تاریخ قرار دے دیا گیا ہے۔ بادشاہ کے دریا عبور کرنے کے لیے زبردست خفیہ تیاریوں میں ضرور بہت سا وقت 'کم از کم چھ یا سات ہفتے' خرچ ہوئے ہونگے۔ اور اگر چھاؤنی ماہ منی کیئان یعنی اوائل مئی میں قائم کی گئی تھی تو لڑائی ضرور جون کے اواخر میں یا غالباً اوائل جولائی میں ہوئی ہوگی۔

حاصل کلام

کامل اور یقینی صحت ناممکن الحصول ہے اور گروٹ کے ان الفاظ کی حد سے باہر جانا بھی ناممکن ہے کہ "جہاں تک رائے قائم کی جاسکتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ آخر جون یا شروع جولائی 326 ق م میں موسم برسات کے شروع ہونے کے بعد ہوئی تھی۔ وہ ہے گے مان کے آرکن ہونے کے زمانے کا ختم اور کریمس کے آرکن ہونے کے زمانے کا آغاز تھا۔"[٦] میں ہے گے مان کے آرکن ہونے کو اریین کی سند پر مان لیتا ہوں اور یقین کیے لیتا ہوں کہ جنگ اوائل جولائی 326 ق م میں ایٹیک سن کے آخری مہینہ سیکر فورین میں کریمس کے آرکن ہونے سے چند روز قبل ہوئی تھی۔

حوالہ جات

۱؎ ارین کے قول کے مطابق یہ اپریل کے آخر یا مئی کے اوائل کا زمانہ تھا۔ دروں کی شناخت کے لیے دیکھو ہولڈچ کی "رپورٹ آف پامیر باؤنڈری کمیشن" صفحہ 29,30۔ انڈیا آفس کے نقشہ ہندوستان کے مطابق درۂ خاوک کی بلندی 13200 فٹ ہے۔ اس فوج کی تعداد معلوم نہیں جس کے ساتھ سکندر نے ہندوکش کو قطع کیا معلوم نہیں۔ پلوٹارک کا بیان ہے (اسکندر، باب 66) کہ وہ 120000 پیادوں اور 15000 سواروں کے ساتھ داخل ہوا۔ یہ ممکن ہے کہ درست ہو اور ممکن ہے کہ غلط ہو۔ بہرحال اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔

۲؎ اس کو اسکندریہ "زیر کوہ قاف" پر "پروپنی سڈیئ" کہتے ہیں تاکہ اس کو اس نام کے اور شہروں سے تمیز کی جا سکے۔ اس کا اصلی موقعہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ ممکن ہے (میک کرنڈل، انویشن آف انڈیا بائی سکندر دی گریٹ، دوسری ایڈیشن صفحہ 58۔ اور نوٹ A کننگھم این شنٹ جیاگرانی آف انڈیا صفحہ 26۔21۔ خان شوارز نے اس سکندریہ کو کابل سمجھا ہے۔ (سکندر دس گراس فلڈ زوگ ان ترکستان صفحہ 102، 101، 94)

۳؎ میک کرنڈل نے نیکیا کے موقع کے متعلق تمام مخالف رایوں کو جمع کر دیا ہے۔ (دیکھو کتاب مذکورہ حاشیہ گذشتہ۔ نوٹ بی) میں یہاں جنرل ایبٹ کی رائے کو مانتا ہوں کیونکہ وہ بالکل صحیح لکھتا ہے کہ جلال آباد ہی وہ مقام ہے جہاں قدرتی طور سے فوج کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ بعض مقامی امیر، مثلاً سلاطین چنچ اپنے آپ کو سکندر کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ (ریورٹی، نوٹس آف افغانستان صفحہ 51۔48)

۴؎ قدیم راستہ درۂ خیبر میں سے نہ گذرتا تھا (دیکھو ہولڈچ کی انڈین بارڈرلینڈ 1901ء صفحہ 38)۔ فوشے کے "قدیم گندھرکی جغرافیہ پر نوٹ" (ہنوئی 1902ء۔ رسالہ انجمن فرانسیسی برائے زمانہ ہائے مشرق بعید) درۂ خیبر کا راستہ غالباً ایک دفعہ محمود اور یقیناً چند مرتبہ بابر اور ہمایوں کام میں لائے۔ اٹھارہویں صدی میں نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور اس کا پوتا شاہ زماں سب درۂ خیبر سے گذر کر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ (ریورٹی کی نوٹس آن افغانستان صفحہ 73، 38)۔

۵؎ اس تمام احتیاط کی جنوبی راستے کے لیے ضرورت نہ تھی کیونکہ وہاں پہاڑیاں "ایسی نہیں کہ جنگجو جتھوں کی گنجائش ہو۔" (ہولڈچ' دی گیٹس آف انڈیا صفحہ 95)

۶؎ قیاسی شناخت شدہ قوموں اور جگہوں کے ناموں کی ایک فہرست بیلو کی کتاب "اے تھنوگرافی آف افغانستان" صفحہ 67 – 64 (ووکنگ 1891) میں ملے گی۔ کننگھم اور دوسرے مصنفوں کے خیالات بھی بالکل تشفی بخش نہیں ہوتے۔ میں مسٹر ینکوٹ سے اس بات میں متفق نہیں کہ شمال میں سکندر چترال تک پہنچا ہوگا۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1894ء صفحہ 681) مگر بالفعل یہ ناممکن ہے کہ اس جگہ کا صحیح پتہ لگایا جائے جہاں سے وہ مشرق کی طرف پھرا اور پہاڑوں کے پار باجوڑ میں داخل ہوا۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ اس نے دروں کی راہ اختیار کی تھی جن میں کوئی تغیرو تبدل واقع نہیں ہوتا' اور انہی میں سے ہو کے باجوڑ کے علاقے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ریورٹی دیسی خبروں کی بناء پر باجوڑ میں داخل ہونے کے دو راستے بیان کرتا ہے اور ممکن ہے کہ سکندر باجوڑ میں مشرقی راستے سے ہو کر داخل ہوا ہو جس پر کہ کوزدھائی گاؤں آباد ہے اور جہاں سے دو راستے ہو جاتے ہیں۔ ایک چترال کو جاتا ہے اور دوسرا باجوڑ کے پائے تخت شہر کو (ریورٹی کی کتاب کے نوٹ صفحہ 118 – 113)

۷؎ ایرین' انبس' باب 7 فصل 12

۸؎ ہولڈچ' دی گیٹس آف انڈیا 1910ء صفحہ 103۔

۹؎ کرٹیس (باب ہشتم فصل 10) نے نیسا کی فتح کو مسگا کے محاصرے سے پہلے کا واقعہ قرار دیا ہے۔

۱۰؎ ایرین اناباسس باب 5 فصل 1' باب 6 فصل 2' کرٹیس باب 8 فصل 10' جسٹن باب 12 فصل 7' پلوٹارک' سکندر باب 58' سٹریبو باب 15 فصل 9 – 7 وہ قیاسات جو میک کرنڈل نے اپنے ضمیمہ (جی) میں نیسا کے موقع کے متعلق جمع کیے ہیں ان سے تشفی نہیں ہوتی۔ سر ایچ-ٹی-ہولڈچ' سرحدی معاملات میں جس کی مہارت سب سے بڑھی ہوئی تھی' کرنڈل سے زیادہ اس معاملے میں کامیاب ہوا ہے اور نیسا کے موقع کو تقریباً صحت کے ساتھ پیدا کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے' "کسی اور جگہ پر (جیاگرافیکل جرنل' جنوری 1872ء) میں نے وہ تمام وجوہات بیان کی ہیں جن کے سبب سے میں سمجھتا ہوں کہ کافرستان کے کافر جنہوں نے غلام قید کر کے اس کی فوج میں یرغمال بھیجے تھے' ان نیسا کے لوگوں کی اولاد سے ہیں جنہوں نے سکندر کو اپنا ہم مذہب اور ہم وطن ظاہر کیا تھا اور اسی وجہ سے سکندر نے ان کے ساتھ رحم کا سلوک کیا تھا۔ وہ کوہ مور (یونانی کوہ میراس) کے دامن میں سوات کے میدان میں اس قدر قدیم زمانے سے آباد تھے کہ اہل مقدونیہ ان کے وہاں آنے اور آباد ہونے کا کوئی پتہ نہ دے سکتے تھے۔ یہ لوگ سوات کے ملک میں بدھ مذہب کے زمانے تک آباد رہے۔ کوہ مور کا زیریں حصہ اور میدان وہ جگہ ہے جہاں کسی زمانے میں نیسا (یا نوسن) شہر آباد تھا۔ بظاہر روئے زمین پر اس کا اب کوئی نشان نہیں'

مگر تیس برس پرانے نقشوں میں اس کا نام باقی تھا اور اپنے نام کی وجہ سے ایک اہم مقام سمجھا جاتا تھا۔ مے نوشی کے جلوس اور سرود اس وقت بھی کافروں میں پائے جاتے ہیں۔" (ہولڈچ دی انڈین بورڈرلینڈ' میتھیون 1601ء صفحہ 200,342' دی گیٹس آف انڈیا 1910ء صفحہ 123)۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ میرا اس تین چوٹیوں والے پہاڑ کی صرف ایک چوٹی کا نام ہے۔ باقی دو چوٹیوں کا نام کندسمی اور کندسمی تھا۔ یہ تینوں چوٹیاں پشاور سے نظر آتی ہیں کنالی اور "رشتہ دار کافروں" کی حکایت کا مقابلہ کرو۔ (ریوزٹی۔ نوٹس صفحہ 129)۔ فلاسٹریٹس (اپولینیاس باب دوم' فصل 9) بیان کرتا ہے کہ "نیسا کے باشندے اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ سکندر پہاڑ پر چڑھا تھا۔" اور آگے چل کر لکھتا ہے کہ "اس واقعہ کو سکندر کے ساتھیوں نے صحیح نہیں لکھا۔"

سلہ یونانی اور رومی مورخین اس نام کو مختلف طریقوں سے لکھتے ہیں۔ یعنی مسًا' مَسکا' مزاگا' مسوگا۔ ہولڈچ کا بیان ہے کہ یہ قلعہ منگنائی مقام پر یا اس کے قریب واقع تھا۔ (دی گیٹس آف انڈیا 1910ء صفحہ 128)۔ ایم فوشے کا خیال ہے کہ وہ کنگلا (کانگلا) تھا جو چند میل شمال میں واقع ہے۔ (ہندوستان وافغانستان کی سرحد' پیرس 1901ء صفحہ 158)۔ منگلور یا مَنگلور کا مقام جو اس کے موقع کے لیے تجویز کیا گیا ہے اور بعض وجوہ سے مناسب بھی ہے' بہت دور مشرق میں واقع ہے۔ منگلور کے لیے دیکھو ریورٹی نوٹس آن افغانستان صفحہ 200,234۔ اسٹین' آرکیالوجیکل ٹوران بُنیر' لاہور 1898ء صفحہ 53۔ ڈین۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1896ء صفحہ 655۔

سلہ ایرین (اناباسس باب 4 فصل 27) "ایساکیناس کی ماں اور بیٹی کا" ذکر کرتا ہے۔ کرٹیس باب 8 فصل 10) کا بیان ہے کہ "اسکنس اس شہر کا بادشاہ مرچکا تھا اور اس کی ماں کلیوفس اس شہر اور سلطنت پر حکمراں تھی۔" اور وہ آگے بیان کرتا ہے کہ "ملکہ نے اپنے بیٹے کو جو ابھی بچہ ہی تھا سکندر کی گود میں دے دیا اور اس طرح امان بھی حاصل کی۔ بہرحال آخر میں اس کے ایک بچہ ہوا جس کا نام (خواہ اس کا باپ کوئی بھی ہو۔) سکندر رکھا گیا۔" کلیوفس اُس سردار کی بیوہ ہوگی جو اس محاصرے میں ایرین کے بیان کے مطابق مارا گیا تھا۔

سلہ ایرین' انبس۔ باب 4' فصل 27۔ ڈیوڈرس' باب 17 فصل 84۔ باب 8 فصل 10۔

سلہ ہولڈچ کے خیال کے مطابق اورا اور بزیرا رستم کے مقام پر یا اس کے قریب مردان اور درۂ امبیلا کے درمیان واقع تھا (دی گیٹس آف انڈیا صفحہ 106)۔ مگر میرے خیال میں یہ جگہ بہت دور جنوب میں واقع ہے۔

سلہ ایرین باب 4' فصل 28۔ ڈیوڈرس باب 18 فصل 86۔ کرٹیس باب 8' فصل 11۔ سٹریبو باب 15' فصل 8۔ مختلف لوگ کسی پہاڑ کے محیط کا اندازہ اس وجہ سے جدا جدا کریں گے کہ وہ

سلسلہ کوہ کے ساتھ کی پہاڑیوں کو چھوڑ دیں یا ان کو شامل کرلیں۔ مگر ڈیوڈرس کا اندازہ کہ پہاڑ کا محیط 100 سٹیڈیا یا ساڑھے گیارہ میل تھا' ایرین کے اندازے یعنی 200 سٹیڈیا کی نسبت زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ایرین نے ان پہاڑوں کی سب سے کم بلندی کا اندازہ 11 سٹیڈیا یا 6700 فٹ کیا ہے جو ڈیوڈرس کے اندازے یعنی 16 سٹیڈیا کی نسبت زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ آرناس کے موقع کے تعین کے متعلق تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ اس کے موقع کو مہابن قرار دینے کے بظاہران سب وجوہ کو سرایم۔ اے اسٹین کی تحقیقات نے غلط ثابت کردیا ہے (رپورٹ آف آرکیالوجیکل سروے ان دی این' ڈبلیو فرنٹیئر پراونس 5۔ 1904ء)۔ یہ باور کرنا ذرا مشکل ہے کہ یونانی مصنفین نے اس قلعہ کو دریائے سندھ پر قرار دینے میں غلطی کی ہو۔ یونانی افسراس دریا کے موقع سے بخوبی واقف تھے' کیونکہ وہ اس پر پل باندھنے میں مشغول تھے۔ کرٹیس کے قول کے مطابق (باب 8 فصل 12) سکندر امبولیما سے کوچ کرکے دریائے سندھ اس وقت تک نہیں پہنچا جب تک اس نے سولہ منزلیں طے نہیں کرلیں۔ اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کم از کم 70 یا 80 میل کا سفر نہایت ہی دشوار گذار علاقے میں کیا ہوگا۔ میں سربلڈ سے اس بات میں متفق ہوں کہ آرناس کے موقع کو دریائے سندھ پر مہابن کے اوپر اور شاید بیاؤ کے قریب تلاش کرنا چاہیے جو کوتکلی کے قریب دریا کے گھماؤ سے اوپر کی طرف واقع ہے۔ یہ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ دریائے سندھ اس قلعہ کی جنوبی دیوار سے ٹکرا کر بہتا تھا۔ (دیکھو ہولڈچ کی دی گیٹس آف انڈیا صفحہ 121)۔ میں سمجھتا ہوں کہ اغلب یہ ہے کہ سکندر واپس پھر کر درۂ امبیلا میں سے گذرا تھا اور پھر رستم کے مقام پر اس کے قریب دریا کی طرف مڑا ہوگا۔ یہ ضروری ہے کہ اس نے ایک وسیع چکر لگایا ہو۔ مسٹر مرک اس شہادت کو قبول نہیں کرتا کہ آرناس کو دریائے سندھ پر تلاش کیا جائے۔ اس کے نزدیک وہ سواد کے علاقے میں واقع تھا۔ (جرنل رائل سوسائٹی آف آرٹس 1911ء صفحہ 720)

اس سے قبل کے تمام بیان اس کتاب کی طبع دوم کے ڈی ضمیمہ میں بیان کیے گئے ہیں مگر اب ان کو دوبارہ شائع کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

لہ وہ قدیم راستہ جس کو ہیون سانگ نے اختیار کیا تھا وہ ہے پو-لو-شا- سے درۂ شاہ کوٹ ہوتا ہوا سوات جاتا ہے۔ یہی درۂ شاہ کوٹ ہے جس کو موجودہ زمانے میں ہندوستانی "ہاتھی لار" کہتے ہیں۔ وہ 1895ء سے قبل سب سے زیادہ اہم پہاڑی مقام مانا جاتا تھا۔ مگر جب اس سن میں انگریزوں نے مالاکنڈ کو چترال کی سڑک کا فوجی مرکز قرار دیا تو اس کی اہمیت جاتی رہی (فوشے' کتاب مذکورۂ بالا صفحہ 40)

کلہ ڈرتا کے موقع کے تعین کی متعدد اور مختلف کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ ابھسار کے

موقع کا صحیح پتہ سب سے پہلے ایم اے اسٹین نے لگایا۔ وہ لکھتا ہے "دارو ابھسار (یعنی دارو اور ابھسار) میں وہ تمام علاقہ شامل تھا جو وتستا (جہلم) اور چندر بھاگا (دریائے چناب) کے درمیان واقع ہے۔ راجپوری کی کوہستانی ریاست اس میں شامل تھی۔ ایک عبارت کی بناء پر اس نام کا اطلاق محدود ہو جاتا ہے اور اس میں صرف نیچے کی پہاڑیاں ہی شامل رہتی ہیں۔" راجپوری اور بھمبر (قدیم ابھسار) کی ریاستیں آج کل کی کشمیر کی ریاست کی حدود کے اندر واقع ہیں۔ ابھسار کسی زمانے میں غلطی سے ہزارہ کا علاقہ سمجھا جاتا تھا جو دراصل ارسا یا آرسیکس کی سلطنت کا علاقہ ہے۔ (دیکھو اسٹین کی کتاب راج ترنگنی' ترجمہ حصہ اول صفحہ 180' حصہ پنجم صفحہ 217' میکرنڈل صفحہ 375) آرناس سے آگے کوچ کا راستہ معلوم نہیں۔

۱۸ کرٹیئس (باب 7' فصل 12) کا نام ان پندرہ یا سولہ منازل کی تعداد کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔ "درہ (امیلا) سے گذرنے کے بعد سولہ منزلیں طے کر کے وہ دریائے سندھ پہنچا۔"

۱۹ ایرین باب 5' فصل 3۔ ڈیوڈرس' باب 17 فصل 86۔ دریائے کابل کی وادی سے ہندوستان میں داخل ہونے کا قدیم راستہ پُرشپور (پشاور)' پشکلاوتی (پیوکے لیناس)' ہوتی مردان اور شاہ باز گڑھی (جس کو چینیوں نے پو-لو-شا لکھا ہے) سے گذر کر اوہند یا اُند کے مقام پر پہنچتا تھا۔ اٹک کا براہ راست راستہ دور حاضرہ ہی میں صاف کیا گیا ہے۔ اُند کا تلفظ خود اُس شہر کے باشندے استعمال کرتے ہیں جس کو پشاور اور مردان کے لوگ اُوہَند کہتے ہیں۔ اس کا سنسکرت نام اُوَبھاندپور ہے۔ (دیکھو کننگھم 'اینشنٹ جیاگریفی' صفحہ 52' اسٹین راج ترنگنی۔ ترجمہ حصہ دوم صفحہ 336۔ فوشر کی کتاب مذکورہ بالا صفحہ 46 معہ نقشہ) میجر ریورٹی کا خیال ہے کہ اُوہند صحیح تلفظ اور ہجے ہیں اور یہ ہی شکل سنسکرت سے قریب تر ہے۔

۲۰ امبھی کے نام کو دوبارہ رواج دینے میں ایم۔ سلوین لیوی کا ممنون ہونا چاہیے۔ (جرنل ایشیاٹک 1890ء صفحہ 234)۔

۲۱ کرٹیئس باب 8 فصل 12 پورس کا ملک ہائی ڈس پیز (جہلم) اور اکے سینز (چناب) کے درمیان واقع تھا اور اس میں 300 شہر آباد تھے (سٹریبو باب 15 فصل 29)۔ یونانیوں نے جس نام کو پورس لکھا ہے اس کی ہندی صورت کا پتہ نہیں لگتا۔ یہ قیاس کہ وہ پَورَو ہو گا قابل تسلیم نہیں۔

۲۲ سِنین کا تعین سٹریبو باب 15 فصل 17 سے کیا ہے۔ اس نے ارسٹوبولس کی سند پر جو سکندر کا ندیم اور مورخ تھا' بیان کیا ہے کہ "وہ موسم سرما میں اس کوہستانی علاقے میں رہے جو اسپاسوئی اور اسکنوئی اقوام کے قبضے میں تھا۔ موسم بہار کے آغاز میں وہ میدانوں اور ٹیکسلا کے عظیم الشان شہر میں اترے جہاں سے وہ دریائے جہلم اور پورس کی سلطنت کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلی

بارش اُسی وقت ہوئی جبکہ وہ ٹیکسلا میں ٹھہرے ہوئے تھے۔" اس طرح دریائے سندھ کے عبور کرنے کا وقت فروری یا مارچ 326 ق م ہی ہو سکتا ہے۔ مسٹر پیرسن کا بیان ہے کہ "جب برنز راجا رنجیت سنگھ کے ساتھ لاہور میں تھا تو بہار کے موسم کا تیوہار نہایت دھوم دھام سے 6 فروری کو منایا گیا تھا۔ (انڈین انٹی کوئیری 1905ء صفحہ 275) ٹیکسلا کی بارش کی وجہ ضرور کوئی اتفاقیہ طوفان ہو گا۔ کیونکہ باقاعدہ بارش کا موسم جون سے پہلے نہیں شروع ہوتا۔

ؔ یونانی اور رومی مصنفین نے اس کا نام ٹیکسلا لکھا ہے جو پالی یا پراکرت کے لفظ ٹیکسلا سے قریب تر ہے۔ سنسکرت نام تکشِ شلا ہے۔ شاہ ڈھیری جو حسن ابدال سے آٹھ میل جنوب مشرق میں واقع ہے اور دیگر دیہات کی ابتدائی پیائش اور بیان کننگھم نے شائع کیا تھا (رپورٹ جلد دوم صفحہ 51–111) مگر اس موقع پر اور زیادہ غور و فکر کے ساتھ تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے جس کو محکمہ آثار قدیمہ نے اب شروع کر دیا ہے۔ تین ماہ کی تحقیقات کے نتائج ڈاکٹر جے۔ ایچ۔ مارشل نے ایک لیکچر موسومہ "آرکیالوجیکل ڈسکوریز ایٹ ٹیکسلا" میں جو 4 ستمبر 1913ء کو پنجاب ہسٹوریکل سوسائٹی کے سامنے دیا گیا' بیان کر دیئے ہیں۔ ان کھنڈروں میں تین جدا جدا شہروں کے نشان ملتے ہیں۔ یعنی بیر' موریا خاندان اور اس سے قبل کے زمانے کا' سرکپ' ہندی یونانی' پارتھی اور کڈفائی سس اول کا اور سرسکھ کنشک کے زمانے کا۔ زمین کی تہہ کے مقابلہ کرنے سے یہ بات بالکل صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اول تو کنشک پارتھی اور کڈفائی سس بادشاہوں کے بعد ہوا اور دوسری یہ کہ وہ پہلی یا دوسری صدی مسیحی میں حکمران تھا۔ جتنے کھنڈر اب تک دریافت ہوئے ہیں وہ بدھ مت کے زمانے کے ہیں۔ لیکن اس زمانے سے قبل کے آثار غالباً ابھی تک زیر زمین ہی ہیں۔ بدھ مت کی عمارتیں جب ہیون سانگ آیا ہے تو بربادی کی حالت میں تھیں۔ (بیل جلد اول 43–136۔ ویٹرس جلد اول صفحہ 240) اور اُس وقت یہ سلطنت کشمیر کی باج گذار تھی۔ جاتک کی حکایات ٹیکسلا کے جائے علوم و فنون کے حوالوں سے مملو ہیں۔ مثلاً جلد 2 (مترجم راؤس) صفحہ 2'32'59۔ وغیرہ ہُسم جاتک کے مطابق یہ گندھر کے ملک یعنی پیو کے لیناٹس اور پشاور کے علاقے میں واقع تھا۔ جاتک اکثر غالباً سکندر کے بعد کی ہیں۔ طیانہ کے اپولونس کی تاریخ میں' جس کا مصنف فلاسٹریٹاس ہے' پہلی صدی عیسوی کے ٹیکسلا کی بابت۔ (اگر ہم اس کتاب پر یقین کر سکیں۔) بہت دلچسپ باتیں ملتی ہیں۔ (مترجم رِفلی مور' آکسفورڈ 1913۔ باب دوم فصل 20–42 تک) پروفیسر فلینڈرس کا خیال ہے کہ اپولونس نے ضرور ہندوستان کا سفر 42–43ء میں کیا تھا۔ (پرسنل ریلیجن ان ایجپٹ 1909ء صفحہ 141)

ؔ "یہ مسکوک" یا "ممہور" چاندی غالباً چاندی کے مسطح ٹکڑے تھے جسے کہ علم سکہ کے ماہر "چھدا ہوا سکہ" کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ کسی سانچے میں ڈھلے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ مختلف

مقامات پر بے قاعدہ طور پر چھدے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے عجیب و غریب سکے کے لیے جو اس وقت تمام ہندوستان میں مستعمل تھا' دیکھو ریپسن کی "انڈین کائنز" فقرہ 6-4' کننگھم کی "کائنز آف اینشنٹ انڈیا" ' صفحہ 60-54 لوح 2,1' فہرست "کائنز ان دی انڈین میوزیم" جلد اول صفحہ 42-131۔ یہ سکے ایران کے شاہی خاندان "اکیمنین" کے سکوں سے ماخوذ ہیں۔ (558 ق م سے 330 ق م تک) جیسا کہ ایم۔جے۔اے دیکورومانش نے ثابت کیا ہے۔ (دیکھو جرنل ایشیاٹک (جنوری' فروری 1912ء صفحہ 130-117۔) ٹیکسلا کے قدیم تانبے کے سکے کا حال اُن کتابوں میں موجود ہے جن کا ذکر کیا گیا۔

ص۱۵ سکندر نے ضرور یا تو شمالی راستہ اختیار کیا ہوگا جو درۂ بکرال میں گذرتا ہے اور روہتاس کے پاس سے ہوتا ہوا جہلم کے مقام پر پہنچتا ہے اور یا 20 میل اور جنوب کا راستہ لیا ہوگا جو درۂ بُنہار میں سے ہو کر جلال پور کو آتا ہے۔ غالباً اس نے دونوں راستوں کو اختیار کیا۔ دریا کے کنارے پہنچنے کے بعد وہ میدان جنگ کو خود منتخب کر سکتا تھا۔ (پیرین کا مضمون "اسکندر' پورس اور پنجاب۔ "انڈین انٹی کویری 1905ء صفحہ 253 مع نقشہ)

ص۱۶ عبور دریا۔ تاریخ و موقع جنگ کے باعث نزاع مسائل کے لیے دیکھو ضمیمہ ہائے ث و ج۔ کیانوس کی نقل و حرکت کے متعلق اختلاف آراء ہے۔ مگر مجھے کتاب کی عبارت بالکل صاف معلوم ہوتی ہے۔ آسانی سے نقل و حرکت کرنے والے رسالے کے لیے یہ کچھ مشکل کام نہ تھا کہ وہ پورس کی فوج کے سامنے سے گذر جائے۔ اگرچہ یہ کام اُس وقت ناممکن ہوتا اگر اس فوج کے پاس بندوقیں ہوتیں۔ ارین کے جنگ کے متعلق صاف بیان کو اگرچہ زیادہ اہمیت دی گئی ہے مگر دوسرے مصنفوں سے بھی اس میں مدد لی گئی ہے۔

ص۱۷ ارین نے (باب 5 فصل 20) بیوس فیلس کی موت کا ذکر صحیح کیا ہے۔ بیوس فلا کے موقع کو میری تسلی و تشفی کے قابل ایبٹ نے معلوم کیا (آن دی سائٹ آف نیکیا اینڈ بوک فلا جے۔اے۔ ایس۔بی۔ 1852ء صفحہ 231) مذکورۂ بالا ٹیلا مقامی طور پر پنڈی کے نام سے مشہور ہے۔ اور بڑی بڑی پرانی اینٹیں اور یونانی سکے اس میں پائے جاتے ہیں۔ بیوس فلا کا ذکر پلائی نے وشنگر کی فہرست (باب 6 فصل 20)' پیرپلس کے مصنف نے فصل 47 اور پلوٹارک نے فارچون آف سکندر' خطبہ اول 9 میں کیا ہے۔ کننگھم کا دریافت کیا ہوا موقع اس وجہ سے رد کر دیا گیا ہے کہ اس نے عبور دریا کا مقام جلال پور کو قرار دیا ہے۔

ص۱۸ دیکھو نیومسمیٹک کرانیکل 1906ء صفحہ 8' لوح اول نمبر 8

ص۱۹ یہ تمام باتیں جو ارین نے بیان کی ہیں (باب 5 فصل 40) صاف ظاہر کرتی ہیں کہ اکسینز کو دامن کوہ میں وزیر آباد سے 25' 30 میل شمال کی جانب عبور کیا ہوگا جہاں میک کرنڈل نے معبر قرار دیا ہے۔ دریائے چناب نے اپنا راستہ بہت کچھ بدل دیا ہے اور نیچے اتر کر 30 میل کے

رقبے میں اپنا رخ تبدیل کیا ہے۔ (ریورٹی صفحہ 343)

ان قبائل کے صحیح موقع کے متعلق دیکھو مصنف کا مضمون "دی پوزیشن آف دی اٹانومس ٹرائبز آف دی پنجاب کنکرڈ بائی سکندر دی گریٹ۔" (جے۔ آر۔ ایس اکتوبر 1903ء)۔ دیکھو نقشہ۔ یہ اسی رسالے سے منقول ہے اور کچھ تبدیل کر دی گئی ہے۔

سنگلا کے موقع کے متعلق بہت کچھ لغویات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ مقام ہندو مصنفین اور ہیون سانگ کی ساکل نام کی جگہ سے بالکل مختلف تھا۔ کننگھم کا خیال کہ یہ دونوں مقامات ایک ہی ہیں۔ یہ اس کے یہ ماننے کی بنیاد ہوا کہ سانگلا ٹبہ یعنی ضلع جھنگ کے ایک مقام کو سکندر کا سنگلا مقام بتلائے۔ متوفی مسٹر سی۔ جے۔ راجرس نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ (رپورٹ آف سانگلا ٹبہ۔ نیوز پریس لاہور۔ 1906ء۔ پروسیڈنگس آف اے۔ ایس۔ بی 1892ء صفحہ 81) سنگلا کا موقعہ جس کو مسمار کر دیا گیا تھا' صحت کے ساتھ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ مگر وہ گرداسپور کے ضلع میں واقع تھا۔ ساکل' مہر کل کے پائے تخت کے مقام پر موجودہ سیالکوٹ کا شہر آباد ہے۔

کیانوس کا یہ خطبہ جس کو ایرین نے پورا نقل کیا ہے' مجھ کو اصلاً ایک حقیقی خطبے کی صحیح روئداد معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود مورخ نے ایک مناسب حال عبارت گڑھ لی ہو۔

وگنے کی کتاب "اے پرسنل نیریٹو آف اے وزٹ ٹوغزنی' کابل اینڈ افغانستان" صفحہ 11۔ ممکن ہے کہ اب کوئی مقامی افسر اس مسئلے کو حل کر دے۔

"اس طرح سکندر نے ہرقل کے نام اور انڈراکوٹس (چندراگپتا) نے سکندر کے نام کی عزت کرتے ہوئے خود بھی اعزاز اور وقار حاصل کیا۔" (پلوٹارک تقریباً 90ء) "کس طرح ایک شخص بلا بغض و حسد پیدا کیے اپنی تعریف کر سکتا ہے۔" (فقرہ 10) مواعظ معصومہ ٹیوبنر مترجمہ شلیٹو) یہی مصنف لائف آف الیگزینڈر میں لکھتا ہے کہ "اس نے دیوتاؤں کے نام پر قربان گاہ تعمیر کرائے' جن کی کہ پردیسی قوم (یعنی مگدھ) کے بادشاہ اس وقت تک تعظیم و تکریم کرتے ہیں' اور دریا کو عبور کر کے ان پر یونانی طریقے سے قربانیاں چڑھاتے ہیں۔ ایرین' کرٹیس اور ڈیوڈرس اس بات پر متفق ہیں کہ بارہ قربان گاہیں تعمیر ہوئی تھیں۔ کرٹیس نے "مربع پتھروں" کا ذکر کیا ہے اور ڈیوڈرس نے پچاس مکعب کی بلندی کا۔ فلاسٹریٹس نے مندرجہ ذیل بیان میں ان سے اختلاف کیا ہے۔ "ہائی ڈریٹس کو عبور کرنے اور چند اقوام میں سے گذرنے کے بعد وہ دریائے ہائی فےسس پر پہنچے۔ 30 سٹیڈیا اس دریا کے پار وہ ان قربان گاہوں پر پہنچے جن پر یہ عبارت کندہ تھی۔ اب محترم ایمان اس کا بھائی ہرقل' اےتھمنا' قضا و قدر کے خدا اولمپیا کے زویں' ساموتھریس کے کبیرائی' ہندوستان کے سورج اور ڈیلفیا کے اپالو کے نام

پر۔ کہتے ہیں کہ ایک پیتل کی لاٹ بھی تھی جس پر یہ الفاظ کندہ تھے: "یہاں سکندر نے قیام کیا۔"

ان قربان گاہوں کو ہم سکندر کا بنایا ہوا سمجھ سکتے ہیں جس نے اس طرح اپنی سلطنت حدود کی شان دکھائی۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ کتبہ دریائے ہائی فے سس کے دوسری جانب کے رہنے والے ہندوستانیوں نے نصب کیا تھا کہ اس سے خود ان کی شان زیادہ ہو جائے کہ انہوں نے سکندر کو یہاں سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قربان گاہیں جو سات دیوتاؤں کے نام سے معنون کی گئی تھیں دریا کے مغربی کنارے پر واقع تھیں اور غالباً بات بھی یہی ہے۔

۵ے ڈیوڈرس باب 17 فصل 95۔ کرٹیس باب 9 فصل 3۔

۶ے سنسکرت میں اس دریا کا نام وتستا ہے۔ پراکرت میں دوستا' کشمیری میں ویتھ۔ پنجابی میں وہت یا ہَت۔ مسلمان مصنفین اس کو دریائے جہلم لکھتے ہیں۔ یعنی وہ دریا جو شہر جہلم کے پاس سے گذرتا ہو' جہاں شاہ گذر واقع تھا۔ موجودہ دستور کے مطابق دریا کا نام ہی جہلم ہو گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ دریائے چناب کے سنگم کے مقام پر اس میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہو دریا کے راستے میں اور کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ مگر خود چناب اکثر اور بڑی حد تک تبدیل ہو گیا ہے۔ (ریورٹی "دی مہران آف سندھ اینڈ اِٹس ٹری بیوٹریز" جے۔اے۔ایس۔بی حصہ اول 1892ء صفحہ 318۔ 329۔ 332 شائن کا ترجمہ جلد دوم صفحہ 411)

۷ے شاہ ڈھیری شمالی عرض بلد 33° ۔ 17' اور مشرق طول بلد 72° ۔ 49' پر واقع ہے۔ (امپیریل گزیٹیئر 1900ء)۔ یہ کھنڈر بیس مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں اور کننگھم نے وہاں 55 ستوپ 28 خانقاہیں اور 9 منادر گنے تھے۔ (رپورٹ جلد دوم صفحہ 151)

۸ے کننگھم کی آرکیالوجیکل سروے رپورٹ جلد دوم صفحہ 112 و صفحہ 122۔

۹ے ایبٹ۔ جے۔اے۔ایس۔بی 1852ء صفحہ 219۔

۱۰ے ریورٹس۔ جلد دوم صفحہ 174۔

۱۱ے ریورٹس جلد دوم صفحہ 180' 38' 37۔ صفحہ 38 پر کننگھم بیان کرتا ہے کہ بھیرہ سوفائی ٹیز کا پائے تخت تھا مگر صفحہ 37 میں وہ یہی دعویٰ احمد آباد کے متعلق کرتا ہے جو دوسرے کنارے پر واقع ہے۔

۱۲ے جنگ سے قبل جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے پڑی ہوئی تھیں تو طرفین کے سپاہی تیر کر ان ٹاپوؤں میں آجاتے تھے اور دست بدست لڑتے تھے۔ دریا جو دونوں طرف سے بلند کناروں سے گھرا ہوا تھا زیر آب چٹانوں کے اوپر سے نہایت تیزی کے ساتھ بہتا تھا (کرٹیس باب 8 فصل 13)۔ دریائے بیاس کی طرف کوچ کے عرصے میں 70 دن تک فوج ابر و باد کے

طوفان میں گھری رہی ۔ (ڈیوڈرس باب 18، فصل 94 ۔ سٹریبو باب 15 فصل 27) ۔ جولائی میں ایلفنسٹن نے دریا کو جلال پور کے مقام پر ایک میل ایک فرلانگ اور 35 پرچ عریض اور 9 سے 14 فٹ عمیق پایا تھا ۔ (تھارنٹن گز۔ٹیئر مضمون جہلم) جہلم کے مقام پر بہ نسبت جلال پور' معبر عرض میں صرف ایک تہائی ہے اور موخرالذکر مقام پر کوئی ٹاپو نہیں پائے جاتے ۔ (ایبٹ۔ جے۔ اے۔ ایس۔ بی 1852ء صفحہ 219) ۔ مسٹر پیرسن کہتا ہے کہ "جہلم اور جلال پور کے درمیان میں داراپور کے مقام پر اب بھی ایسے ٹاپو پائے جاتے ہیں جن پر گھنے جنگل ہیں ۔"

۳ے جنگ گجرات 21 فروری 1849ء کو ہوئی اور اس کے نتیجہ میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا ۔

۴ے ہوگرتھ کی فلپ اینڈ الیگزینڈر آف میسیڈون (مرے 1897ء ضمیمہ ۔

۵ے دیکھو انگر کی "رومی و یونانی علم سنین و تواریخ" ' آلزتھم "اقوام قدیم کا خاکہ" صفحات 44' 743' 752' 755 ۔ مگر ان تحقیقات کے نتائج مشکوک معلوم ہوتے ہیں ۔ دیکھو اس کے علاوہ کننگھم کی انڈین ایرا ز صفحہ 103' 44' 39 ۔ اور میک کرنڈل کے "ان ویشن آف انڈیا بائی الیگزینڈر دی گریٹ" (طبع دوم) کا پہلا حاشیہ صفحہ 274 ۔

۶ے ہسٹری آف گریس ۔ جلد 12 صفحہ 51 ۔ حاشیہ مطبوعہ 1869ء مگر مسٹر پیرسن جس کی رائے دریاؤں کے متعلق تمام سال اور ہر حالت میں اس کے ذاتی علم پر مبنی ہے' لکھتا ہے کہ "جہلم کے عبور کرنے کی اصلی تاریخ جیسا کہ ایرین نے لکھا ہے گے مان کے آرکن ہونے کے زمانے ہی میں منی کیتان کے مہینے میں تھی اور یہ کہ منی کیتان اس سال بجائے جون کے اپریل میں واقع ہوا تھا ۔ یہ نہایت ضروری تھا کہ طغیانی سے پہلے دریا کو عبور کر لیا جائے اور اس "مفروضہ دیر" کی کوئی وجہ نہیں بتلائی جاتی ۔" (انڈین انٹی کویری 1905ء' صفحہ 257) مسٹر پیرسن اس طرح اس بات پر مجبور ہے کہ ہماری تمام تاریخی اسناد کے موسم کے متعلق بیانات کو رد کردے ۔ مگر "اس مفروضہ دیر" کی نہایت سادہ تصریح یہ ہے کہ سکندر اس سے پہلے پوشیدہ طور پر دریا کو عبور نہ کر سکا اور اس طرح مجبوراً اس کو سب سے بدتر حالات سے کام پڑا جن میں کہ پورس کے ہوشیار رہنے کی وجہ سے وہ پڑ گیا تھا ۔

چوتھا باب

سکندر کی ہندوستان پر فوج کشی' مراجعت

دریائے چناب کی طرف مراجعت

مراجعت کرتی ہوئی فوج پھر انہیں قدموں واپس ہوئی اور بلا کسی قسم کے واقعات و مزاحمت کے اکسنیز (دریائے چناب) کے کنارے پر پہنچی۔ ہے فے اسٹیئن نے ایک قلعہ بند شہر کی تعمیر اسی وقت ختم کی تھی۔ گرد و نواح کے علاقے میں سے بطیب خاطر آباد ہونے والے اور تنخواہ دار سپاہیوں میں سے وہ لوگ جو لڑنے بھڑنے کے قابل نہ تھے اس قلعے اور شہر میں بسا دیئے گئے اور سکندر نے دریاؤں کی راہ سے بحر اعظم کے سفر کی تیاری کی۔

صوبہ دار کا تقرر

اسی وقت تحت کوہستانی علاقوں (جو آج کل راجوری اور بھمبر اور برطانوی علاقہ ہزارہ کے نام سے مشہور ہیں) کے بادشاہوں کے ایلچی خراج لے کر حاضر ہوئے۔ سکندر نے جو ہندی مفتوحات کو اپنی سلطنت کا مستقل جزو سمجھتا تھا اور یقیناً اس ملک میں واپسی کا ارادہ رکھتا تھا' ابھسار (بھمبر اور راجوری) کے علاقے کے بادشاہ کو اپنی طرف سے صوبہ دار مقرر کیا اور اُرسا (ہزارہ) کے بادشاہ پر بالادستی کے اختیارات عطا کیے۔ اس بادشاہ کا نام ایرین نے آرسیکنر لکھا ہے۔[1]

کمک

اسی اثناء میں ایک امدادی فوج' جس کی بہت ہی ضرورت تھی' تھریس سے 500 سوار اور 7000 پیادوں کے مجموعی اندازے میں آئی جس کو بادشاہ کے چچازاد بھائی ہرپلس صوبہ دار بابل نے بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ 250000 زرہ بکتر تھے جس میں سنہری و روپہلی کام تھا۔ یہ نئے اسلحہ

فوراً فوج میں تقسیم کر دیئے گئے اور پرانے جلا دیئے گئے۔[1]

سفر کے لیے تیاریاں

پھر سکندر دریائے جہلم کی طرف بڑھا اور اس کے کنارے پر غالباً اس مقام پر ٹھہرا جہاں پہلے پورس کی چھاؤنی تھی۔ اب چند ہفتے دریائی سفر کی آخری تیاریوں میں صرف ہوئے۔ تمام دیسی ساخت کی کشتیاں جو دریا پر موجود تھیں اس کے لیے بیگار میں لے لی گئیں اور جو کمی رہ گئی تھی اس کو نئی کشتیاں تیار کر کے پورا کیا جن کے لیے قرب و جوار کے جنگلوں میں بکثرت سامان موجود تھا۔ بحری کام سے واقف جو قومیں ساحل پر آباد تھیں ان کی امدادی افواج یعنی فینیقیا۔ قبرص اور مصر کے لوگوں سے ملاحی کا کام لیا گیا جو فوج کے ساتھ تھے۔ چنانچہ اکتوبر 326ق م کے آخر تک تیاری پوری ہو گئی تھی۔ یہ بیڑا جس میں تیس تیس چپوؤں کے آٹھ جہاز اور گھوڑوں اور دیگر ہر قسم کے سامان کے لیے باربرداری کی کشتیاں تھیں' غالباً سب مل کے 3000 کشتیوں پر مشتمل تھا۔[2]

پورس کے درجے میں ترقی

سفر شروع کرنے سے پہلے سکندر نے اپنے افسروں اور ہندی راجاؤں کے ایلچیوں کو ایک مجلس میں جمع کیا اور ان کے سامنے پورس کو دریائے جہلم اور بیاس کے درمیان کے تمام مفتوحہ علاقے کا بادشاہ بنا دیا۔ ان علاقوں میں بیان کیا گیا ہے کہ سات قومیں گلاسائی' کتھوئی وغیرہ آباد تھیں اور ان میں 2000 شہر تھے۔ اسی موقعے پر پورس اور اسکے قدیم دشمن راجا ٹیکسلا کے درمیان صلح کرا دی گئی۔ چنانچہ اس صلح کو خاندانوں کے باہمی ازدواج نے بھی تقویت دی۔ ٹیکسلا کا راجا' جو فاتح حملہ آور کی خدمت گزاری میں اپنے حریف سے سبقت لے جانا چاہتا تھا' اپنے مقبوضہ علاقے دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے درمیانی ملک کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔

سوبھوتی کی سلطنت

سکندر اپنی فوج کے عقب اور پہلوؤں کی نگرانی اور یورپ سے اپنے دور دراز فوجی مرکزوں کے ساتھ سلسلہ آمدورفت کے قائم رکھنے سے کبھی غافل نہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ہے فے اسٹیئن اور کریٹراس کو حکم دیا کہ بعجلت کوچ کر کے راجا سوبھوتی (سوفائی ٹیز) جو دریائے جہلم سے دریائے سندھ تک کے کوہستان نمک کے زیریں علاقے کا بادشاہ تھا' اس کے پایۂ تخت پر فوراً قبضہ کر لے۔ اس نے بغیر جنگ اطاعت قبول کر لی۔[3]

سپہ سالاران فوج

بیڑے کو 120000 آدمیوں کی ایک فوج سے اور زیادہ محفوظ کیا گیا' جو دریا کے دونوں کناروں پر مذکورہ بالا سپہ سالاروں کی سرکردگی میں کوچ کرتی تھی۔ دریا کے داہنے یا مغربی کنارے کی فوج کی کمان کریٹراس کے ہاتھ میں تھی اور فوج کا بڑا حصہ جس میں کہ دو سو ہاتھی بھی شامل تھے بائیں یا مشرقی کنارہ دریا پر ہے فے اسٹیئن کے ماتحت تھا۔ دریائے سندھ کے مغربی ممالک کے صوبہ دار فلپس کو حکم تھا کہ تین دن بعد عقب کی فوج کے ساتھ ان کے پیچھے آئے۔

اکتوبر 326 ق م' پہلے اِتصال دریا کی طرف سفر

اس طرح محفوظ ہو کر اس عظیم الشان بیڑے نے اپنا مشہور سفر شروع کیا۔ سکندر نے دریا کے دیوتاؤں' اپنے جد اعلیٰ ہرقل' ایمان اور دوسرے دیوتاؤں کے نام پر جن کی وہ پرستش کرتا تھا سونے کے ایک پیالے میں شراب چڑھائی اور طبل بجوا کے کوچ کا حکم دیا۔ نہایت شاندار جلوس کی صورت میں بغیر کسی قسم کی بے ترتیبی یا بدنظمی کے جہازروں نے لنگر اٹھایا اور ان دیسیوں کی حیرت بھری نگاہوں کے سامنے جو دونوں طرف کناروں پر کھڑے تھے اپنا دریائی سفر شروع کیا۔ ہزار ہا ڈانڈوں کی چھپ چھپ' حکموں کی پکار اور ملاحوں کے گیتوں نے قرب وجوار میں ایک ہمہمہ پیدا کر دیا جو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گونج رہا تھا اور منہ کھلے حیرت زدہ تماشائیوں کے مزید تحیر کا باعث تھا۔ تیسرے دن یہ بیڑا ایک مقام پر پہنچا جو غالباً بھیرا تھا۔ جہاں کریٹراس اور ہے فے اسٹیئن کو حکم دیا گیا تھا کہ دریا کے دونوں کناروں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے اپنے خیمے لگائیں۔ یہاں دو دن قیام کیا گیا تا کہ فلپس کی عقب کی فوج بھی آ ملے۔ اس سپہ سالار کے وہاں پہنچنے پر حکم دیا گیا کہ اسے عقب کے بجائے مقدمتہ الجیش میں تبدیل کر دیا جائے اور وہ دریا کے کنارے کنارے کوچ کرے۔

اس جگہ سے سفر کر کے پانچویں دن بیڑا اس مقام پر پہنچا جہاں دریائے جہلم اپنے سے بڑے دریا چناب سے ملتا تھا۔ وہ راستہ جہاں کہ ان دونوں دریاؤں کے پانی ملتے تھے' اس وقت ایسا تنگ تھا کہ وہاں بہت خطرناک گرداب پڑتے تھے اور ان کی وجہ سے بیڑے میں بہت بے ترتیبی اور بدنظمی پڑ گئی۔ دو جنگی جہاز مع اپنے آدمیوں کی ایک بڑی تعداد کے غرق ہو گئے اور قریب تھا کہ وہ جہاز جس میں سکندر سوار تھا اسی ورطہ بلا میں پڑ جائے۔ بادشاہ اور دوسرے افسروں کی نہایت ہی سخت محنت و مشقت کے بعد بیڑے کا بڑا حصہ ایک محفوظ راس کے قریب لنگر انداز ہوا اور تلافی مافات کی تدبیریں کی گئیں۔

اتصال کا موقعہ

اس مقام کو صحت کے ساتھ معلوم کرنا جہاں یہ واقعات پیش آئے ناممکن ہے۔ تمو کے مقام پر اس وقت ان دونوں دریاؤں کا اتصال نہایت سکون کے ساتھ ہو جاتا ہے اور اب وہ خصوصیتیں نظر نہیں آتیں جن کا ذکر ایرین اور کرٹیئس نے اس شدومد کے ساتھ کیا ہے۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ سکندر کے زمانے میں یہ مقام اتصال بہت کچھ شمال کی طرف واقع ہو گا۔

دریاؤں کے راستے

پنجاب اور سندھ کے دریاؤں کے راستوں کے متعلق ہمارا صحیح علم 712ء میں سکندر کی فوج کشی سے ایک ہزار سال سے زیادہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ان تبدیلیوں کے متعلق جو ان ہزار سال میں واقع ہوئیں ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ مگر اس بارہ سو برس میں جو عربوں کی فتوحات کے بعد گزری ہیں یہ معلوم ہے کہ بے انتہاء تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں اور یہ یقینی ہے کہ ایسی ہی تبدیلیاں سکندر اعظم اور محمد بن قاسم کے درمیانی زمانے میں بھی ہمیشہ فطرتی اسباب و علل سے ہوتی ہوں گی۔ اس زمانہ معلومہ کے دوران میں زلزلے، طغیانیاں، سطح زمین کے نشیب و فراز میں تبدیلیاں، زمین کی تباہی اور افزونی اور آب و ہوا کی تبدیلی، یہ سب وہ اسباب و علل ہیں جنہوں نے سطح زمین کے تغیر و تبدل میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ دریائے سندھ کا ڈیلٹا 50 میل سے زیادہ آگے بڑھ گیا اور اس طرح دریاؤں کے راستوں کو بہت بڑھا دیا ہے اور ساتھ ہی ان کے پانی کے زور اور اتار چڑھاؤ کو کم کر دیا ہے۔ ایک زبردست دریا یعنی ہاکرا یا واہندہ جو بیکانیر، بہاول پور اور سندھ کے ویران میدانوں کو سرسبز و شاداب کرتا تھا معدوم ہو گیا ہے۔ دریائے بیاس نے اپنا قدیم اور غیر مشترک راستہ چھوڑ دیا ہے اور ستلج کا ایک معاون دریا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے دریاؤں مثلاً سندھ، جہلم، چناب اور راوی کے راستے اور مقامات اتصال متعدد مرتبہ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

تعین موقعہ کی کوشش بیکار ہے

یہ امور اگرچہ بلاشک و شبہ درست ہیں، مگر ان کو عملی طور پر سکندر کے تمام مورخین فراموش کر دیتے اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ موجودہ نقشوں سے وہ اس کے دریائی سفر کا خاکہ دکھا سکتے ہیں اور مختلف دریاؤں کے کناروں پر تمام شہروں کے موقعے قرار دے سکتے ہیں۔ مگر یہ سب تعینات عبث ہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ قدیم راستوں میں سے کس میں دریائے چناب یا

کوئی اور دوسرا دریا بہتا تھا۔ اور یہ بالکل صاف ہے کہ جب دریاؤں کے موقعے متعین نہیں ہو سکتے تو ہم ان کے کناروں پر شہروں کے محل وقوع معلوم کرنے میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ سفر کے راستے کو اندازا بتا دیا جائے اور ان اقوام کے محل سکونت کو ظاہر کر دیا جائے جن سے سکندر کو سابقہ پڑا۔ ان شہروں اور دریاؤں کے سنگم اور معابر کے موقعوں کا پتہ لگانا جن کو قدیم مورخین نے لکھا ہے محال ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں دریاؤں کا طول آجکل کے زمانے سے بہت کم تھا۔ اس لیے ان کے مقامات اتصال آجکل کے مقامات سے بہت زیادہ شمال کی طرف ہوں گے اور اس نتیجے کو دریاؤں کے قدیم راستوں کے مشاہدے سے اور زیادہ تقویت پہنچتی ہے۔ ان چار مقامات اتصال سے جن کا ذکر ایرین نے کیا ہے چناب اور جہلم کا سنگم اس زمانے میں غالبا موجودہ شہر جھنگ سے بہت دور واقع نہ ہو گا اور تقریبا شمالی عرض بلد °31 ہو گا۔[6]

سیبوئی اور اگلسوئی

سکندر نے یہاں اپنی فوجوں کو خشکی پر اتارا کہ قرب وجوار کی قوموں سیبوئی اور اگلسوئی کو مطیع کرے اور ان کو قریب کی زبردست قوم ملوی (سنسکرت مالوا) سے نہ ملنے دے جو دریا کے زیریں حصے میں بستی تھی اور جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ مقابلے کی تیاری کر رہی ہے۔ سیبوئی نے جو بیان کیا جاتا ہے کہ وحشی قومیں تھیں اور جنگلی جانوروں کی کھالیں پہنے ہوئے اور ڈنڈوں سے مسلح تھیں' اطاعت قبول کر لی اور ان کی آزادی برقرار رکھی گئی۔ اگلسوئی 40000 پیادے اور 3000 سوار جمع کر لینے میں کامیاب ہو گئے اور مقابلہ کرنے کی ہمت کی۔ ان کا انجام نہایت عبرت انگیز ہوا۔ انبوہ کے انبوہ تلوار کی نذر ہوئے اور بے شمار غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے۔ سکندر ان کے ملک کے اندرونی حصے میں تیس میل تک چلا گیا اور ان کے پایہ تخت کو فتح کر لیا۔ ایک اور شہر پر اسے سخت مقابلہ پیش آیا۔ جس میں کہ بہت سے مقدونیوں کا نقصان ہوا۔ باشندے جو تعداد میں 20000 کہے جاتے ہیں' جب کامیابی سے مایوس ہو گئے تو شہر کو آگ لگا دی اور اپنے آپ کو مع بیوی بچوں کے اس آگ میں جھونک دیا۔ مگر قلعہ اس آگ کی زد سے بچ رہا اور ایک حصہ فوج وہاں چھوڑ گیا۔ اس کے محافظین میں سے 3000 کی جاں بخشی کی گئی۔[7]

دوسرے مقام اتصال کی طرف سفر

یہ واقعات غالبا جھنگ کے شمال مشرق میں پیش آئے اور یہ تمام فوجی کارروائی سکندر کے معمول کے مطابق اپنی فوج کے عقب اور پہلو کو محفوظ رکھنے کے لیے کی گئی تھی۔

یہاں یہ خبر معلوم ہوئی کہ ملوئی آکسی ڈریکائی اور دریائی وادیوں کی رہنے والی دوسری خود مختار قومیں اس غرض سے اتحاد کرنا چاہتی ہیں کہ سکندر کے حملے کا سختی سے مقابلہ کریں۔ یہ سن کر سکندر نے اپنے بیڑے اور فوج کو بعجلت تمام کوچ کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ ان اتحادیوں کو قبل اس سے کہ وہ اپنی تجویزوں کو پختہ اور افواج کو متحد کر سکیں' جالے اور پیہم ان کو شکست دے۔ بیڑے اور فوج کے بڑے حصے کو حکم دیا گیا کہ اگلے سنگم یعنی راوی اور چناب' (جس میں جہلم بھی شامل تھا) کے مقام اتصال پر جمع ہوں۔

متحد اقوام

سکندر بذات خود ایک چیدہ فوج کے ساتھ' جس میں حسب دستور سواروں کی تعداد زیادہ تھی' خشکی پر اترا تاکہ ان متحدین میں سے سب سے زیادہ زبردست قوم ملوئی پر حملہ کرے جو دریائے ہائی ڈروٹیز (راوی) کی زرخیز وادی میں دریا کے دونوں کناروں پر آباد تھی۔ ان کے ہمسائے آکسی ڈریکائی جو بیاس کے شمالی جانب اس کے کناروں پر آباد تھے اگرچہ عام طور پر ملوئی سے برسرپیکار رہا کرتے تھے لیکن اس وقت انہوں نے اپنی پرانی دشمنی اور رقابت کو فراموش کر دیا اور حملہ آور کے مقابلے کے لیے اپنے دشمنوں سے میل کر لیا۔ ان دونوں حریف قوموں نے اس اتحاد کو کثرت سے شادیاں کر کے مضبوط کیا۔ چنانچہ ہر ایک قوم نے دوسرے کو دس ہزار عورتیں شادی کرنے کے لیے دے دیں۔[8] مگر ذاتی رقابتیں جنہوں نے ہر زمانے میں ہندوستان کے سیاسی اتحادات کو بیکار اور ہیچ کر دیا ہے' اس وقت بھی بروئے کار آئیں اور اس اتحاد سے کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوا۔ اس اثناء میں کہ یہ متحدین ہم پلہ جرنیلوں کے دعووں کا فیصلہ کر رہے تھے اور یہ تصفیہ ہو رہا تھا کہ ان میں کون فوج کی کمان کرے' سکندر نے نہایت ہوشیاری سے ملوئی پر حملہ کیا اور قبل اس سے کہ آکسی ڈریکائی ان کی مدد کو پہنچ سکیں اس نے ان کی فوجی طاقت کا خاتمہ کر دیا۔ ان اتحادیوں کے پاس جس قدر فوج تھی اگر صحیح طور پر اس سے کام لیا جاتا تو وہ سکندر کے مختصر سے رسالے کو تباہ و برباد کر دینے کے لیے کافی تھی۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ان کی فوج میں 80000 یا 90000 کامل مسلح پیادے' 10000 سوار 700 سے 900 تک رتھیں شامل تھیں۔

سکندر کی فوجی حکمت عملی

مقدونوی فوج کی صحیح تعداد بیان نہیں کی گئی۔ مگر ضرور ہے کہ وہ بہت ہی مختصر ہو گی اور اس میں چند ہزار سے زائد سپاہی شامل نہ ہوں گے۔[9] مگر تعداد کی کمی کو فوج کی با آسانی نقل و حرکت اور اس کے جنرل کی طباعی پورا کر دیتی تھی۔ مقدونوی سپاہ مقابل فوج کی تعداد و مقدار کو دیکھ کر

خوف زدہ ہو گئی اور سکندر نے بہ وقت تمام اپنے ایک فصیح و بلیغ خطبے کے ذریعے سے بیاس کے عذر کے اعادہ کو روکا تھا۔ ان بے آب و گیاہ سطحات مرتفع میں سے' جن کو آج کل بار کہتے ہیں اور جو دریائے چناب اور راوی کی وادیوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں' سکندر یلغار کرتا ہوا گزرا اور دو ہی منزلوں میں راستوں کو طے کر کے دفعتہ "اس وقت ملوئی پر جا پڑا جبکہ وہ بے فکر نہتے اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے بد قسمت بغیر کسی قسم کے مقابلے اور مزاحمت کے نہایت ظلم اور بے دردی سے قتل کیے گئے اور جو قتل سے بچ رہے وہ شہروں میں قلعہ بند ہو گئے۔

شہروں کی فتح

ان میں سے ایک شہر جس کا قلعہ ایک بلندی پر بنا ہوا تھا پر خود سکندر نے حملہ کیا اور محصورین میں سے 2000 آدمی مارے گئے۔ ایک اور شہر جس کے برخلاف پرڈکس کو روانہ کیا گیا تھا' معلوم ہوا کہ اس کے باشندے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور شہر غیر آباد ہے۔ باشندے دریا کی وادی کی دلدلوں میں فرار ہو گئے۔ مگر یہاں سرکنڈوں اور جھاڑیوں کے جنگلوں میں بھی مقدونوی سواروں کے اسلحہ سے ان کو نجات نہ ملی۔ سکندر اس کے بعد دریائے راوی تک چلا گیا اور پسپا ہونے والے ملوئی کو معبر کے پاس جا لیا اور دل کھول کے قتل و غارت کی۔ اس نے ان کو دریا کے مشرق کی طرف اس علاقے میں دھکیل دیا جس کو آج کل ضلع منٹگمری (ساہیوال) کہا جاتا ہے اور ایک قلعہ جس میں برہمن آباد تھے سرنگیں لگا کر اور دیواروں پر چڑھ کر فتح کر لیا۔ سکندر نے حسب معمول خطرے کی کچھ پروانہ کی اور سب سے پہلے دیوار پر چڑھ گیا۔ شہر کو نہایت بہادری سے بچانے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ "ان میں سے تقریباً 5000 آدمی مارے گئے اور چونکہ وہ جوشیلے اور جنگجو لوگ تھے اس لیے بہت کم قید ہوئے۔"

ملوئی قوم کی مراجعت

ملوئی لوگ اب بہت شکستیں کھا چکے تھے اس لیے انہوں نے راوی کو عبور کیا اور سکندر کی فوج کے عبور کرنے میں 50000 آدمیوں سے مزاحم ہوئے۔ مگر یورپی قوم کے سپاہیوں کے سامنے ان کی کچھ نہ چلی اور وہ "سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔" اور قریب ہی ایک سب سے بہتر قلعہ بند شہر میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہ چھوٹا سا شہر جس کے موقعے کا اب صحیح پتہ نہیں لگ سکتا' غالباً کہیں جھنگ اور منٹگمری کی سرحد پر ملتان سے 80 یا 90 میل مشرق میں واقع تھا اور سکندر کی زندگی کے ایک سب سے عجیب واقعے سے اس کا تعلق ہے جسے ایرین نے نہایت خوبی سے اس مواد کی بناء پر

بیان کیا ہے جو اسے ٹولمی نے بہم پہنچایا تھا۔ [۱]

سکندر کا خطرناک زخم

مقدونوی جو پہلے اس شہر کے مالک ہو گئے تھے' اس کے قلعے پر سیڑھیاں لگا کر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت سکندر نے یہ سمجھ کر کہ سپاہی خواہ مخواہ لیت و لعل کر رہے ہیں' ایک سیڑھی سپاہی کے ہاتھ سے چھین کر دیوار سے لگائی اور اس پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھ تین آدمی پیوکس لس' لیوناٹاس اور ابریس تھے۔ اپنے زرق برق اسلحے پہنے ہوئے سکندر دیوار پر کھڑا ہوا تھا اور ہر قسم کے تیرو نیزوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ اور یہ خیال کر کے کہ جہاں وہ کھڑا ہے وہاں سے وہ بغیر مدد کے کچھ نہیں کر سکتا' وہ نہایت دلیری سے اپنے ساتھیوں سمیت دیوار پر سے قلعے میں کود پڑا۔ ابریس فوراً مارا گیا اور سکندر ایک درخت سے جو دیوار کے قریب ہی تھا اپنی پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اسی حالت میں ہندی گورنر کو قتل کیا اور تمام حملہ آوروں کے مقابلے میں اپنی حفاظت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا سینہ ایک تیر سے چھد گیا اور وہ گر پڑا۔ پیوکس لس جہاں وہ گرا تھا اس پر کھڑا ہو گیا اور اس متبرک ڈھال سے جو الئیان سے لائی گئی تھی اس کو چھپائے رہا۔ لیوناٹاس نے جو اگرچہ اپنے ساتھی کی طرح سخت زخمی تھا' اس کو اردگرد کے حملوں سے محفوظ رکھا۔ سیڑھیاں چونکہ ٹوٹ گئی تھیں اس لیے مقدونوی اپنے بادشاہ کی مدد کرنے سے بالکل عاجز تھے۔ مگر آخر کار ان میں سے چند کچی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے اور دوسرے دروازے کے راستے سے داخل ہو کر سکندر کو بچا لیا جو صرف بے ہوش ہی ہوا تھا۔

صحت یابی

تیر کو عمل جراحی کے ذریعے نکالا گیا جس کی وجہ سے بہت کچھ خون بہہ گیا اور فوری موت کا اندیشہ تھا۔ مگر سکندر کی قدرتی طاقت اس پر آخر کار غالب آئی اور یہ خطرناک زخم مندمل ہو گیا۔ غیظ و غضب سے بھری ہوئی فوج نے باشندوں پر حملہ کیا اور بلا تمیز مرد و زن و بچہ سب کو تہ تیغ کیا۔

جب سکندر رو بصحت ہو گیا تو اسے راوی کی طرف لے گئے اور وہاں سے کشتی میں دریائے چناب کے سنگم کو لے گئے۔ یہاں اسے اس کی فوج اور بیڑے ملے جو بالترتیب ہے فے اسٹیان اور نیارکس کے زیر کمان تھے۔

قوم ملوی اور آکسی ڈریکائی کا اطاعت قبول کرنا

ملوی کے بقیۃ السیف افراد نے، جن کی قوم سکندر کے ظلم و تعدی کو پورے طور پر برداشت کر چکی تھی، اب نہایت عاجزی سے اس کی اطاعت قبول کر لی اور آکسی ڈریکائی جو اپنے تذبذب اور التواء کی بدولت بچ رہے تھے اب مقاومت اور مقابلے کو بے سود سمجھ کر فاتح سے رحم کے طالب ہوئے اور خراج اور تحفے دے کر اس کے مطیع ہو گئے۔ سکندر نے جو اپنا مقابلہ کرنے والے کے ساتھ درشتی اور کبھی کبھی بے رحمی سے پیش آتا تھا مگر اپنے مطیع کے ساتھ ہمیشہ دوستی اور اخلاق کا سلوک کرتا تھا، ان کی عرضداشتوں اور تحفوں اور قوم کے ایلچیوں کے عذرات کو فوراً قبول کر لیا۔ یہ ایلچی تعداد میں سو تھے اور بیان کے مطابق نہایت رعب دار اور قوی جثہ آدمی، سرخ زریں لباس پہنے ہوئے رتھوں میں سوار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان تحفوں میں 1030 چار گھوڑوں کی رتھیں، 1000 دیسی ساخت کی سپریں، 100 ٹیلنٹ فولاد، بے شمار روئی کا سامان، ایک بڑی مقدار کچھوے کی ہڈیاں، بڑے بڑے مگرمچھوں کے چمڑے، پالتو شیر ببر اور شیر شامل تھے۔ ان کے علاوہ 300 سواروں کی امدادی فوج تھی۔[11]

دریائے سندھ کے مقام اتصال کی طرف سفر

اس کے بعد فلپس کو مفتوحہ اقوام کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور بیڑا اس سنگم سے گزر کر (جہاں بیاس بڑے دریا سے ملتا تھا) چوتھے سنگم کی طرف گیا۔ یہاں چناب میں دریائے جہلم، راوی اور بیاس بھی شامل تھے اور اس دریا سے ملتے تھے جسے قدیم مورخین دریائے انڈس (سندھ) کہتے ہیں۔ لیکن غالباً اس زمانے میں "سندھ کا مفقود دریا" ہاکرا یا وہندہ اس وقت موجود تھا اور پنجاب کے تمام دریا مع دریائے سندھ کے اس میں جا ملتے تھے۔ اس طرح یہ عظیم الشان دریا بن جاتا تھا جو بعد ازاں دریائے مہران کے نام سے نامزد ہوا۔

دریاؤں میں تغیرات

یہ قطعی ناممکن ہے کہ سکندر کے زمانے کے مقامات اتصال کا پتہ صحیح طور پر لگایا جا سکے۔ لیکن بہت زمانے بعد شروع شروع کے عرب مصنفوں کے زمانے میں تمام دریا ایک مقام پر ملتے تھے جو "دوش آب" کہلاتا تھا اور موجودہ ریاست بہاول پور کے علاقے میں واقع تھا۔[12] ہم چونکہ دریاؤں کے تمام راستوں سے قطعی ناواقف ہیں جو (جیسا کہ قدیم راستے ظاہر کرتے ہیں) آخری مقام اتصال سے کم و بیش ایک سو دس میل کے علاقے میں چکر لگاتے رہے ہیں، اس لیے

سکندر کا باقی ماندہ دریائی سفر ہمارے لیے بہت زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں ہے۔ بالائی سندھ میں اس کا راستہ اندازا بھی نہیں بتایا جا سکتا اور یہ ناممکن ہے کہ صحت کے ساتھ ان شہروں کے موقعے یا قوموں کے محل سکونت کا تعین کیا جائے جن کا مورخین ذکر کرتے ہیں۔

نظم و نسق کے انتظامات

پنجاب کے دریاؤں کا دریائے "سندھ" کے ساتھ اتصال جہاں کہیں وہ واقع ہو' فلپوس کے صوبے کی جنوبی سرحد قرار دی گئی اور تھریس کی تمام فوج مع ایک ایسی تعداد سواروں کے جو اس صوبے کو قابو میں رکھ سکے' حوالے کی گئی۔ اسی زمانے میں ملک باختر کے ایک امیر اکسیرٹیز جو سکندر کی بیوی روشنک کا باپ تھا صوبہ کابل کا بجائے ثائی رسپینز کے (جس کی حکومت قابل اطمینان ثابت نہ ہوئی تھی) صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا۔ اور تمام دریاؤں کے سندھ کے ساتھ سنگم کے مقام پر ایک شہر بسایا گیا جس کے متعلق سکندر کو امید تھی کہ پھلے پھولے گا۔ ایک بحری گودام بھی وہاں تعمیر کیا گیا۔ بعض خود مختار قبائل نے جن کے نام ایرین ابستنوی' زتھروئی یا کستھروئی اور آسڈوئی بتلاتا ہے یا تو اطاعت قبول کر لی یا ان کو مطیع کیا گیا اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ تیس ڈانڈ کے جہاز اور باربرداری کشتیاں زتھروئی نے بنائیں اور سکندر کی خدمت میں پیش کیں۔[13] اگرچہ یہ ناممکن ہے کہ شمالی سندھ کے ان قبائل کا صحیح نام یا اصلی مقام سکونت کا پتہ لگایا جا سکے جن کا ذکر قدیم مورخوں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے' لیکن اندازا وہ علاقہ جس میں یہ اقوام آباد تھیں شمال عرض بلد °28 کے شمال جنوب' مشرق طول بلد °69 اور '30- '70 کے درمیان واقع تھا۔ مہم کے اس زمانے میں کریٹراس جو شروع ہی سے تمام دریاؤں کے دہنے یا مغربی کنارے پر سفر کرتا رہا تھا اب مشرقی یا بائیں جانب کو منتقل کر دیا گیا۔ جہاں نقل و حرکت آسان تھی اور دوسرے کنارے کی بہ نسبت وہاں ایسی قومیں آباد تھیں جن سے مزاحمت کی امید تھی۔[14]

موسی کناس کی مملکت

اس کے بعد سکندر بعجلت تمام آگے بڑھا تاکہ اس بادشاہ پر جس کا نام ایرین نے موسی کناس لکھا ہے اور جس نے نہایت ہی نخوت اور غرور کے ساتھ نہ تو حملہ آور کی خدمت میں ایلچی روانہ کیے تھے اور نہ تحائف پیش کیے تھے' دفعۃً جا پڑے۔ اس سرکش بادشاہ کا پائے تخت غالبا الور یا آرور کے مقام پر واقع تھا جو سندھ کا قدیم دارالسلطنت تھا۔ یہ اب ضلع سکھر میں شمال اور شمال عرض بلد °27 -'39 اور مشرق طول بلد °68 -'59 میں واقع ہے۔ اس سلطنت کی خصوصیتوں نے مقدونیوں کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا۔ مشہور تھا کہ اس ملک کے باشندے

عام طور پر ایک سو تیس برس کی عمر کو پہنچتے ہیں اور اس طول عمری کی وجہ یہ ہے کہ وہ غذا میں اعتدال رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ملک میں چاندی اور سونا دونوں کی کانیں موجود تھیں۔ مگر وہ ان دونوں دھاتوں کے استعمال سے محترز رہتے تھے۔ دوسری ہندی قوموں کے برعکس ان میں غلام نہیں پائے جاتے تھے اور ان کی بجائے "جس طرح کریٹ کے لوگ افیموٹی قوم کے افراد کو اور لیسیڈیمونیا کے باشندے ہیلوت (گھریلو غلام) کو استعمال کرتے تھے یہ بھی نوجوانوں سے محنت مشقت کا کام لیتے تھے۔" وہ اس امر میں لیسیڈیمونیا کے باشندوں سے مشابہ تھے ان کے ہاں بھی خوان یغما کا دستور تھا۔ جس پر شکار کیے ہوئے جانور چنے جاتے تھے۔ وہ طب کے سوا تمام علوم و فنون کے مطالعے کے بالکل منکر تھے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے ہاں کوئی ضابطہ دیوانی نہیں بلکہ عدالتوں کے اختیارات قتل اور اسی قسم کے سنگین جرائم کے فیصلے تک محدود ہیں۔ [۱۵]

موسی کناس کی اطاعت و بغاوت

سکندر ملوئی قوم کی مانند موسی کناس پر اس طرح اچانک جا پڑا کہ قبل اس سے کہ پرانی چھاؤنی سے اس کے کوچ کی اطلاع ملے وہ بادشاہ کے ملک میں داخل ہو گیا۔ اس کے سوا اور کوئی مصرنہ تھا کہ فاتح کی ملاقات کے لیے آئے۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھ تمام ہاتھی اور عمدہ عمدہ تحائف لے کر آیا جو ہندوستان میں مہیا ہو سکتے تھے۔ سکندر جو عادتاً التماس اطاعت کو جلد منظور کر لیا کرتا تھا، بادشاہ کے ساتھ بااخلاق پیش آیا۔ اس کی سلطنت اور پایۂ تخت کی بہت تعریف کی اور اس کو اس کی بادشاہت پر مستقل کر دیا۔ مگر موسی کناس جو اپنے برہمن مشیروں کا تابع تھا اس طرح فوری اطاعت قبول کرنے سے پچھتایا اور بغاوت کی۔ اگینور کا بیٹا پیتھون جو فلپوس کی صوبہ داری کے جنوبی علاقے کا عامل تھا، باغی کے تعاقب میں بھیجا گیا، [۱۶] اور سکندر نے بذات خود شہروں کو فتح کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ ان میں سے چند خراب و برباد کر دیے گئے اور چند میں فوجیں مقیم کی گئیں۔ موسی کناس جس کو پیتھون نے قید کر لیا تھا مع اپنے برہمن مشیروں کے قتل کیا گیا جنھوں نے اسے بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ [۱۷]

آکسی کیناس اور سمباس

اس کے بعد سکندر ایک چالاک فوج لے کر آکسی کیناس نام ایک سردار کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا اور اسے قید کر لیا۔ جب اس کے دو بڑے شہر خراب و برباد کیے جا چکے تو دوسرے شہروں نے اپنے آپ کو بلا مزاحمت اس کے حوالے کر دیا۔ "ہندوستانیوں کے دل و دماغ کی حالت سکندر کے خوف اور اس کی فتوحات کی وجہ سے یہ ہو گئی تھی۔ [۱۸]" ایک اور سردار

سمباس نے جس کا پایۂ تخت سند من[19] تھا اور جو سکندر کے ڈر سے بھاگ گیا تھا' اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اور بہت سے برہمن قتل کیے گئے جنھوں نے ایک بے نام و نشان شہر کے باشندوں کو بغاوت پر اکسایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دریائے سندھ کے نیچے کے علاقے کی اس مہم کے دوران میں 80000 ہندی مارے گئے اور بے شمار غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے۔

موسی کناس کے قتل کے بعد ڈیلٹا (جسے یونانیوں نے پٹلینی لکھا ہے) کا حکمران اپنے دار السلطنت پٹالہ سے سکندر کے کیمپ میں آیا اور اپنی بادشاہت کے لیے سکندر کی اطاعت قبول کی جو منظور ہوئی۔ وہ پھر اپنے ملک میں واپس بھیج دیا گیا تاکہ فوج کے استقبال کی تیاری کرے۔

کریٹراس وطن بھیج دیا گیا

اس زمانے میں کریٹراس جو سکندر کا سب سے بڑا معتمد علیہ افسر تھا فوج سے الگ کیا گیا اور اسے حکم ہوا کہ فوج کے ایک بڑے حصے کو براہ ارکوسیہ (قندھار) اور ڈرنگیانہ (سیستان) کرمانیہ میں لے جائے۔ اس فوج میں جسے کریٹراس کے حوالے کیا گیا اٹلاس' میلیگر اور انٹی جینز کے رسالے اور ان کے علاوہ کچھ تیر انداز محافظ پیادوں کا دستہ اور وہ مقدونوی سپاہی شامل تھے جو فوجی حیثیت سے بیکار ہو گئے تھے۔ اسی فوج کے ساتھ تمام ہاتھی بھی بھیج دیے گئے۔

سکندر کی پٹالہ کی طرف سبقت

سکندر نے بذات خود اس فوج کی کمان لی جو سفرمینا کا کام کرتے تھے اور باقی فوج کا افسر ہے فے اسٹیشان کو بنایا اور وہ دریا کے دہنے کنارے پر روانہ ہوا۔ کریٹراس کو' جو دریائے سندھ کے بالائی حصے میں بائیں کنارے تبدیل کیا گیا تھا' جب وطن واپس جانے کا حکم ملا تو اسے لامحالہ دریا کو نئے سرے سے عبور کرنا پڑا۔ بائیں کنارے پر اس کی جگہ اب اگینور کا بیٹا پیتھون قائم مقام ہوا۔ اس کو کچھ نیزہ بردار سوار اور اگریری فوج دی گئی اور حکم ہوا کہ بعض قلعہ بند شہروں میں نئے آباد کار بسائے' بغاوت کی روک تھام کرے' انتظام قائم رکھے اور بالآخر پٹالہ کے مقام پر سکندر سے آملے۔ اس شہر کا حکمراں اور اس کے باشندے سکندر کے خوف سے شہر کو چھوڑ کر بھاگ گئے مگر ان میں سے اکثروں کی تسلی کر دی گئی اور ان کو اپنے گھروں میں واپس آنے کی ترغیب دی گئی۔[20]

پٹالہ

شہر پٹالہ کے موقعے کے متعلق بہت کچھ بحث ہوئی ہے۔ مگر سب سے بہتر رائے یہ ہے کہ

وہ قدیم شہر بہمن آباد کے مقام پر یا اس کے قریب ہی یعنی شمال عرض بلد °25 ‘52 مشرق طول بلد °65 ‘30 میں واقع تھا۔ سکندر کی نقل و حرکت پر بحث کرنے کے لیے پٹالہ اور بہمن آباد کے موقعوں کو فرض کر کے تسلیم کیا جا سکتا ہے‘ اگرچہ اس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ [۲۱]

ڈیلٹا کی تفتیش

سکندر نے یہ سمجھ کر کہ پٹالہ کا مقام بہت فوجی اہمیت رکھتا ہے‘ ہے فے اسٹیشان کو حکم دیا کہ وہاں ایک قلعہ تعمیر کروائے اور گردونواح میں کنوئیں کھدوائے۔ اس نے تجویز کیا کہ عین اس مقام پر جہاں دریا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ایک زبردست بحری چھاؤنی قائم کرے اور اسی وجہ سے وہ وہاں کافی مدت تک ٹھہرا کہ گودی اور بندر کی تعمیر جو شروع ہو گئی تھی اس کی فی الجملہ تکمیل بنظر خود دیکھ لے۔ اس کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ وہ بذات خود دریا کی دونوں شاخوں کا سمندر تک معائنہ کر کے ان کی تفتیش کرے۔ وہ پہلے مغربی یا دہنے جانب کی شاخ پر روانہ ہوا جو دیبل کے قریب یا اس کے ذرا نیچے غالباً ایک تنگ راستے سے گذرتی تھی۔ دیبل سندھ کا قدیم بندرگاہ تھا اور ٹھٹھہ سے پندرہ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کے ملاح جو بحیرۂ روم کے ٹھہرے ہوئے سمندر کے عادی تھے مدوجزر کو دیکھ کر پریشان اور خوف زدہ ہو گئے۔ لیکن بالآخر سکندر اس بات میں کامیاب ہوا کہ اپنے چند تیز رفتار جہازوں کو لے کر کھلے سمندر میں اتر آئے۔ وہ سمندر میں چند میل آگے بڑھا چلا گیا۔ وہاں اس نے پوسیڈن کے نام پر بیلوں کی قربانی چڑھائی۔ اس کے بعد شراب کے چڑھاوے کی رسم ادا کی اور سونے کے برتن جو اس رسم کے ادا کرنے میں استعمال ہوئے تھے شکریہ کے طور پر سمندر میں ڈال دیئے۔ [۲۲]

ہندوستان کو خیرباد کہنے کی تیاری

اس کے بعد وہ پٹالہ واپس آیا جہاں اس نے دیکھا کہ بحری چھاؤنی کے کام میں بہت ترقی ہو چکی ہے اور وہ دریا کی مشرقی یا بائیں شاخ کی تفتیش کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے دہانے کے قریب وہ ایک بڑی جھیل میں سے گذرا جو غالباً موجودہ زمانے کی جھیل سمارا ہو گی جو امرکوٹ کے مغرب میں واقع ہے‘ اور پھر وہ ساحل سمندر پر تقریباً عرض بلد °25 میں پہنچا [۲۳]۔ یہاں ساحل پر تین دن تک پھرنے اور کنوؤں کے متعلق انتظام کرنے کے بعد وہ پٹالہ کو واپس آیا۔ جھیل کے ساحل پر بندرگاہ اور گودیاں تعمیر کی گئیں اور ان میں فوج رکھی گئی۔ چار مہینے کے لیے فوج کے واسطے رسد مہیا کی گئی اور ان دو دلیرانہ مہموں کے لیے جن کا اس نے قصد کیا تھا تمام ضروری تیاریاں کی گئیں۔ مہمیں یہ تھیں کہ بیڑا خلیج فارس کے ساحل کے پاس پاس روانہ ہو اور وہ خود

فوج کے ساتھ گدروسیہ کے علاقے میں سے ہوتا ہوا جہاں تک ممکن ہو بیڑے کے متوازی فوج کے ساتھ رہے۔

سکندر کے منصوبے

اس کے منصوبے نہایت ہی وسیع تھے۔ نیارکس یعنی اس امیرالبحر کو جس نے نہایت کامیابی سے بیڑے کی دریائے جہلم سے لے کر سمندر تک دس مہینے کے سفر میں رہنمائی کی تھی' اس کو حکم دیا گیا کہ وہ تمام بیڑے کو ساحل سمندر کے گرد ہوتا ہوا خلیج فارس میں دریائے فرات کے دہانے تک لے آئے اور راستے میں جتنے عجیب و غریب ممالک اور سمندروں میں سے گزرے ان کے حالات نہایت احتیاط کے ساتھ لکھتا جائے۔ سکندر نے بذات خود فوج کی کمان لی تاکہ اسے وہ جنگلی علاقے میں سے ایران کو لے جائے جسے اس زمانے میں گدروسیہ اور آج کل مکران کہتے ہیں اور جس میں سے اس سے قبل سوائے سیمیرمس کی فوجوں کے (جس کا محض فسانہ چلا آتا ہے) اب تک کوئی اور نہ گذرا تھا اور ان دونوں سے وہ اس معاملے میں سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ بادشاہ کے سفر پر ہوا اور موسم کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ اکتوبر 325ق م میں روانہ ہو گیا۔ نیارکس موسمی ہواؤں کی تبدیلی کے بعد ہی روانہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے اسے مجبوراً سکندر کے چلے جانے کے دو یا تین ہفتوں کے بعد لنگر اٹھانا پڑا۔ [۲۴]

گدروسیہ

اگرچہ گدروسیہ کا علاقہ عام طور پر ہندوستانی فرمانروائی یا سیاست کے دائرے سے باہر ہے۔ مگر یہ تمام صوبہ یا اس کا کچھ حصہ وقتاً فوقتاً ہندی راجاؤں کی سلطنتوں کے ساتھ ملحق رہا ہے اور اسی وجہ سے اس کی تاریخ بھی تاریخ ہند سے کسی طرح جدا اور غیر متعلق نہیں سمجھی جا سکتی۔ مگر بلاشک و شبہ گدروسیہ کی ستراپی (صوبہ) ہندوستان کی اصل حدود سے باہر تھی اور نیارکس کو اس کے ساحل پر اور اس کے بادشاہ کو اس کے صحرا میں جو واقعات پیش آئے ان کا مجمل ذکر سکندر کی ہندی مہم کی تاریخ کو مکمل کرنے کے لیے کافی ہو گا۔

سکندر کا بندرگاہ

نیارکس کو دریا میں چند روز ٹھہرنا پڑا۔ آخرکار بہت وقت کے بعد وہ اپنا بیڑا بندرگاہ کی ایک رکاوٹ کو' جو مغربی شاخ کے دہانے کو بالکل روکے ہوئے تھی' دور کر کے پار لے جانے میں کامیاب ہوا۔ [۲۵] باد مخالف کی وجہ سے اسے آگے چل کر 24 دن تک ایک محفوظ بندرگاہ میں پناہ

لینی پڑی جس کا نام اس نے سکندر کا بندرگاہ (الیگزینڈرز ہیون) رکھ دیا۔ ساحل افزائش زمین اور اس کی بربادی کی وجہ سے اس قدر بدل گیا ہے کہ دریا کے دہانے کے قریب کے مقامات کے موقع کے تعین کی کوشش کرنا بالکل بے حاصل ہے۔ مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بندرگاہ جہاں نیارکس نے پناہ لی تھی موجودہ شہر کراچی کے قریب واقع ہو گا۔ اس کے بعد امیرالبحر نہایت احتیاط سے اس خطرناک ساحل کے پاس پاس آگے بڑھا اور اس عرصے میں اس کے بیڑے کے لوگوں کو اکثر پانی اور خوراک کی کمی کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ 100 میل یا اس کے قریب قریب (850 سٹیڈیا) سفر کرنے کے بعد بیڑا دریائے اربس (پرالی) کے دہانے پر پہنچا جو اربوی یعنی ہندی نسل کی آخری قوم جو اس اطراف میں آباد تھی اور اورٹی قوم کے درمیان حد فاصل تھا جو دریا کے مغربی جانب ایک وسیع قطعے میں آباد تھی۔ [۲۶]

اورٹی قوم

اندازاً 800 سٹیڈیا کا فاصلہ اور طے کرنے کے بعد بیڑا ایک مقام پر پہنچا جسے کوکلا کہتے تھے۔ یہاں جو لوگ تھکے ماندے تھے ان کو اجازت دی گئی کہ وہ خشکی پر اتریں اور آرام لیں جس کی ان کو بہت ضرورت تھی۔ اس اثناء میں کہ ملاح ایک قلعہ بند چھاؤنی میں آرام لے رہے تھے۔ (انڈیکا۔ 23) نیارکس نے لیوناٹاس کی خبر سنی جسے سکندر نے ایک فوج کے ساتھ اورٹی قوم کو زیر کرنے کے لیے روانہ کیا۔ (اناباسس آف الیگزینڈر۔ باب 6 فصل 22) یہ معلوم ہوا کہ ایک عظیم جنگ میں ہولناک قتل و خونریزی کے بعد لیوناٹاس نے دیسی لوگوں کو شکست دی۔ اورٹی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں ان کے 6000 آدمی اور تمام سردار کام آئے۔ ان کی فوج کی کل تعداد 8000 پیادے اور تین سو سوار [۲۷] تھی۔ مقدونیوں کا نقصان اگرچہ بہت نہیں ہوا تھا، مگر اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں لیوناٹاس کا ساتھی اپالوفینز جو کچھ عرصے پہلے ہی اس علاقے کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا، شامل [۲۸] تھا۔ اس طرح اب چونکہ نیارکس اور لیوناٹاس کے درمیان سلسلہ آمدورفت قائم ہو گیا تھا، اس لیے بیڑے کے جہازوں کی مرمت کی گئی اور نئی رسد مہیا کی گئی۔ وہ ملاح جو سمندر کے کام میں بیکار ثابت ہوئے تھے فوج میں داخل کر دیے گئے اور ان کی جگہ لیوناٹاس کی فوج میں سے آدمی منتخب کیے گئے۔

وحشی لوگ

سفر میں آگے بڑھ کر بیڑا ساحل کے پاس پاس گزرتا ہوا دریائے ٹومیرس [۲۹] کے دہانے کے پاس سے گذرا۔ یہاں ایک وحشی قوم آباد تھی جو لوہے کے استعمال سے بالکل بے خبر تھی اور

صرف لکڑی کی برچھیوں سے مسلح تھی جس کے سرے تیز کرنے کے لیے جلائے جاتے تھے۔ ان وحشیوں کے تمام بدن پر جھبرے بال تھے۔ ان کے ناخن پنجے کی قسم کے اور اتنے مضبوط تھے کہ ان سے وہ کچا گوشت چیر پھاڑ سکتے تھے اور نرم قسم کی لکڑیوں کو چیر لیتے تھے۔ ان کا لباس وحشی جانوروں یا بڑی بڑی مچھلیوں کی کھالوں کا بنا ہوا تھا۔ ان وحشیوں سے ایک چھوٹی سی لڑائی کے بعد بیڑا وہاں پر پانچ دن تک مرمت کے لیے ٹھہرا رہا اور چھٹے دن وہ اس کوہ راس پر پہنچا جسے ملنا (یا راس مالن) کہتے ہیں جو قوم اور ٹی کی مغربی سرحد تھی۔ یہ لوگ خود وحشی نہ تھے بلکہ ہندوستان کے باشندوں کی طرح مسلح اور ملبوس تھے۔ اگرچہ زبان اور رسم و رواج کے لحاظ سے ان سے مختلف تھے۔ [۳۰]

اقوام گدروسئسو اور اختھنوفے گئو

راس مالن سے گذرنے کے بعد اندرونی ممالک کے ساحلی باشندوں کا نام گدروسئسو تھا نہ کہ اورٹی [۳۱]۔ ساحل سمندر کے رہنے والوں کے اوضاع واطوار اور رسوم سے اب بھی یہ اجنبی مسافر متحیر ہوتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ان کم نصیبوں کے پاس مچھلی کے سوا اور کچھ کھانے کو نہ تھا۔" اسی لیے یونانیوں نے ان کا نام "اختھنوفے گئو" یعنی "ماہی خور" رکھ دیا۔ ویلز جو بکثرت ساحل سمندر پر پائے جاتے تھے اگرچہ بیڑے کے ملاحوں کے لیے باعث خوف و تردد تھے لیکن ساحل کے باشندوں کے لیے بہت کار آمد تھے۔ کیونکہ انہیں کی ہڈیوں سے ان کے اچھے اچھے مکان بنتے تھے اور ان کے زبردست جبڑے جیسے آج کل دروازوں کا کام دیتے ہیں اس وقت بھی دیتے تھے۔ [۳۲]

مسحور جزیرہ

نیارکس کے بیڑے کے ملاح، جو ہر زمانے اور ہر ملک کے ملاحوں کی طرح سخت اوہام پرست تھے، ایک غیر آباد جزیرے کی (جسے ایرین نوسلا (انڈیکا 30) کہتا ہے) بہت سی جادو سحر کی باتیں سن کر نہایت خوف زدہ ہو گئے تھے۔ یہ جزیرہ آج کل اسٹولا، استلو، ہشتلو یا ہفتلا کہلاتا ہے اور یہی جزیرہ ہے جسے فلاسٹریٹاس نے سلیر الکھا ہے۔ یہ راس ہائے اُرمیرا اور پسنی کے درمیان میں واقع ہے اور اس وقت بھی وہ ماہی گیروں کے لیے ایسا ہی ترددانگیز ہے جیسا کہ اس وقت یونانی ملاحوں کے لیے باعث فکر و خوف تھا۔ [۳۳]

بیڑے کا اُرمز کے مقام پر پہنچنا

اس طرح تمام حقیقی یا خیالی خطرات میں سے گذرتا ہوا یہ بیڑا بدیس کی بندرگاہ پر پہنچا جو راس جیسک کے قریب آبنائے اُرمز کے دہانے پر واقع تھا' اور اب وہ کرمانیہ کے زیادہ شائستہ علاقے میں داخل ہوا۔ آبنائے کے اندر جا کر شاداں و فرحاں ملاح ہرموزیہ (ہرمز' ارمز) کے مقام پر پہنچے۔ یہ نہایت ہی خوشگوار جگہ تھی اور سوائے زیتون کے سب ضروری چیزیں وہاں پیدا ہوتی تھیں۔ یہاں یہ لوگ خشکی میں اترے اور جب سب آرام و استراحت میں مشغول تھے تو چند لوگ اندرون ملک کی طرف روانہ ہوئے اور ایک شخص کو یونانی لباس پہنے اور یونانی زبان بولتے دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ اس دور و دراز اور اجنبی ملک میں اپنی زبان سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دونوں طرف سے سوال و جواب کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ سکندر کی فوج کا ایک راہ گم کردہ شخص تھا اور اس نے ان کو یہ خوشخبری سنائی کہ بادشاہ بھی وہاں سے صرف پانچ منزل کے فاصلے پر مقیم تھا۔

سکندر اور نیارکس کی ملاقات

نیارکس اور آرکٹس نے فوراً اپنے بادشاہ سے ملاقات کے لیے اندرون ملک میں جانے کا انتظام کیا اور بہت کچھ تکالیف و مصائب برداشت کرنے کے بعد بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مگر ان کی حالت ایسی ردی تھی کہ شروع شروع میں سکندر ان کو شناخت نہ کر سکا۔ انجام کار جب اسے اپنے دونوں افسروں کی شخصیت کے متعلق اطمینان ہو گیا تو اس نے فوراً یہ فرض کر لیا کہ یہی دو شخص اس کے تمام بیڑے سے بچے ہوئے ہیں اور بیڑا تباہ ہو گیا۔ اس خیالی مصیبت کا خیال کر کے وہ بہت غمگین ہو گیا۔ مگر جلد ہی نیارکس نے اسے اطمینان دلا دیا اور کہا کہ جہاز صحیح و سالم دریائے انمل کے دہانے پر مرمت کے لیے ٹھہرے ہوئے ہیں۔

دریائے دجلہ کی طرف بحری سفر

امیر البحر نے اپنے آپ کو اس کی خدمت پر پیش کیا کہ وہ بیڑے کو خلیج سوسہ تک لے جائے گا۔ اس کے بعد وہ ساحل کی طرف واپس ہوا' مگر وہاں پہنچنے کے لیے اس کو لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اس کے بعد وہ سفر کے لیے روانہ ہو گیا اور بغیر کسی بڑے واقعے کے دریائے فرات کے دہانے پر پہنچ گیا۔ اب اس نے سنا کہ سکندر سوسہ کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس لیے وہ واپس پھرا اور اس سے ملنے کے لیے دریائے دجلہ میں داخل ہوا۔" اس طرح وہ مہم جو دریائے سندھ کے دہانے

سے روانہ کی گئی تھی پھر صحیح و سالم سکندر سے آملی۔" (ایرین انڈیکا42)

سکندر کی فوج کے مصائب

وہ مصائب جو سکندر کی زیر کمان فوج کو برداشت کرنے پڑے ان سے کہیں زیادہ تھے جن کا نیارکس کے بیڑے نے مقابلہ کیا اور ان پر غالب آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سکندر سلسلہ کوہ ہالہ کے وجود سے بالکل ناواقف تھا جو راس مالن کے قریب آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اس بڑی رکاوٹ نے جس کے گرد گھوم کر اس کو گذرنا پڑا اس کے تمام منصوبوں اور تدبیروں پر پانی پھیر دیا۔ وہ مجبور ہو گیا کہ بہت دور اندرون ملک میں چلا جائے۔ اس طرح ایک عرصے کے لیے اس کا تعلق بیڑے سے بالکل جاتا رہا۔ فوج نے پیاس سے سخت تکلیف اٹھائی اور بد قسمت سپاہی ہزاروں کی تعداد میں مر گئے۔ ایرین لکھتا ہے کہ "دھوپ جھلسائے دیتی تھی اور پانی کی کمی نے فوج کے ایک بڑے حصے کو تباہ و برباد کر دیا۔ خاص کر بار برداری کے جانوروں نے بہت نقصان اٹھایا اور ریت کی گہرائی کی وجہ سے مر گئے۔ گرمی آگ کی طرح سب کو جھلسائے دیتی تھی اور آدمیوں کی ایک کثیر تعداد پیاس کے مارے تڑپ کے مر گئی۔" آخر کار باقی ماندہ فوج بمشکل تمام ساحل کی طرف واپس روانہ ہوئی اور پسنی کی بندرگاہ کے پاس تقریباً اس جگہ جہاں آج کل تار برقی کا تار جاتا ہے، ساحل پر نمودار ہوئی۔ اب اس کے مصائب و شدائد کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر سپاہیوں نے مجبور ہو کر "اس تمام مال غنیمت کو جلا کر خاک کر دیا جو انہوں نے اپنے دشمنوں سے حاصل کیا تھا اور جس کے حاصل کرنے کے لیے وہ مشرق اقصیٰ کی حد تک ہو آئے۔" سپہ سالار کی عالیشان کامیابی کا خاتمہ بربادی پر ہوا۔

پنجاب میں بغاوت

فوج ابھی کرمانیہ ہی میں مقیم تھی کہ یہ خبر ملی کہ فلپوس، جو دریائے چناب اور دریائے سندھ کے مقام اتصال کے شمالی صوبوں کا سٹرپ (صوبہ دار) تھا، اپنی غدار تنخواہ دار فوج کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اگرچہ اس منحوس خبر کے ساتھ یہ تفصیل بھی تھی کہ صوبہ دار کی مقدونوی محافظ فوج نے قاتلوں کا قلع قمع کر دیا ہے۔ مگر سکندر کی اس وقت حالت ایسی نہ تھی کہ کوئی مستقل انتظام کر سکتا اور مجبوراً اس کو اسی پر قانع ہونا پڑا کہ وہ ایک پیغام ہندوستان بھیج دے کہ ٹیکسلا کا راجا امبھی اور تھریس کے حصہ فوج کا افسر یوڈمس جو بالائے دریائے سندھ میں مقیم تھا (کرٹیس باب 10، فصل 111) صوبے کا کام اس وقت تک اپنے ہاتھ میں لے لیں جب تک کہ کوئی مستقل صوبہ دار مقرر نہ کیا جائے۔ مگر آئندہ ~~مطابق~~ (جون 323 ق م ۴ ؎) میں سکندر کی موت اس امر میں قطعی طور

پر موثر ثابت ہوئی کہ دریائے سندھ کے مشرقی مقبوضہ علاقے پر کسی قسم کی نگرانی قائم نہ رہ سکی۔

مقدونیوں نے ہندوستان کو بالکل چھوڑ دیا

321ق م میں جب ٹری پراڈے سوس کے مقام پر سکندر کی تمام سلطنت کی دوبارہ تقسیم ہوئی تو انٹی پیٹر نے پورس اور امبھی کو دریائے سندھ کی وادی اور پنجاب کا بادشاہ مقرر کر کے بہ ہیئت مجموعی ہندوستان کی خود مختاری تسلیم کرلی۔ پیتھون جس کو سکندر نے دریائے سندھ کے ڈیلٹا کا سترپ (صوبہ دار) مقرر کیا تھا' اب ان صوبوں میں منتقل کر دیا گیا جو پروپنی سڈی کے ساتھ ملحق تھے۔ یعنی دریائے سندھ کے مغرب میں ارکوسیہ وغیرہ کے علاقے۔ اس طرح مقدونوی حکومت نے ہندوستان کو در حقیقت اگر بظاہر نہ سہی بالکل ترک کر دیا۔[۳۵] تمام مقدونوی افسروں میں صرف یوڈیمس نے ہی تقریباً 317ق م تک دریائے سندھ کی وادی میں اپنا کچھ اقتدار قائم رکھا۔

سکندر کی مہم کی مدت

بہ ہیئت مجموعی سکندر کی ہندی مہم کی مدت تین سال ہے' یعنی مئی 327ق م سے جب اس نے کوہ ہندوکش کو قطع کیا' مئی 324ق م تک جب وہ سوسہ کے مقام میں داخل ہوا۔ اس مدت میں سے تقریباً انیس مہینے دریائے سندھ کے مشرق میں پورے ہوئے' یعنی فروری یا مارچ 326ق م سے جب اس نے اوہند کے مقام پر پل عبور کیا' ستمبر یا اکتوبر 325ق م تک جب وہ اربوئی قوم کے علاقے میں داخل ہوا۔

سکندر کی طبعی ذہانت

اگر ان تمام واقعات کو ایک سپاہی کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کے وہ کارنامے جو اس نے اس محدود مدت میں پورے کیے یقیناً عجیب و غریب اور بے نظیر ہیں۔ اس کی صف آرائی' فوجی پیش بندی اور فوجی عملدرآمد کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ان کاموں کو تکمیل کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ ممکن ہے کہ ایک سپاہی پیشہ شخص سکندر کے سپاہیوں کی طرح اس کے ذاتی تہور کی وجہ سے اس کو مورد الزام بنائے' کیونکہ وہی ایک فرد تھا جس کی زندگی پر تمام فوج کی سلامتی منحصر تھی۔ مگر اس قسم کی تنقید تعریف و توصیف میں آ کر گم ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ بادشاہ کے اس قسم کے تہورانہ افعال کا ان فوجیوں کی بہادری اور دلیری پر کتنا گہرا اثر پڑتا ہوگا جو عموماً اعلیٰ فتح اور کامیابی سے ایوس ہو جاتے ہیں۔

تین بڑے کارنامے

دریاؤں کے راستے سے سمندر میں ایسی شائستہ اور مسلح اقوام کے علاقوں سے گذر کر داخل ہوتا جو مسلم طور پر ایشیاء کی سب سے بہادر ترین قومیں تھیں اور نیارکس کا دریائے سندھ سے دجلہ کا بحری سفر ایسے کارنامے ہیں جو بلا کم و کاست کامیاب کارنامے کہے جاسکتے ہیں۔ تیسرا کارنامہ یعنی سکندر کی زیر کمان فوج کا گدروسیہ کے علاقے میں سے گذرنا بھی ایسا ہی کامیاب ثابت ہوتا اگر اس میں بعض قدرتی موانع حائل نہ ہو جاتے جن کو خبروں کے ناتمام ہونے کی وجہ سے بادشاہ پہلے سے نہ معلوم کرسکا۔ مگر بہرحال اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بالکل ناکامیابی ہوئی۔ باوجود ان تکلیفوں کے جو اس کو برداشت کرنا پڑیں اور ان ناقابل تلافی نقصانات کے جو اسے اٹھانے پڑے یہ فوج پھر بھی جب اس ریگستان سے نکلی تو پہلے جیسی ترتیب یافتہ اور منظم تھی اور اس کے علاوہ اس کے سپہ سالار کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔

حقیقی کامیابی

مجموعاً سکندر کی ہندی مہم بالکل کامیاب رہی اور اس کامیابی میں دریائے بیاس پر فوج کے غدر نے کوئی رخنہ نہیں ڈالا۔ اگر اس کے سپاہی اور اندرون ملک میں چلے جانے پر راضی ہوتے تو غالباً وہ یورپ کے ساتھ اپنے فوجی مرکز کا سلسلہ آمدورفت قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہوتا، جس پر کہ اس کی سلامتی کا انحصار تھا اور اس کا تن تنہا لشکر دشمنوں کی محض تعداد کے نرغے میں آکر مغلوب ہو جاتا۔ کیانوس اور اس کے ہمراہیوں کی مخالفت کی قدر کرنی چاہیے کہ انہوں نے مقدونوی فوج کو کامل بربادی اور تباہی سے بچالیا۔

ایشیائی ممالک کی کمزوری

سکندر کے کوہستان ہمالیہ سے لے کر سمندر تک فاتحانہ کوچ نے عظیم الشان ایشیائی فوجوں کی اصلی کمزوری کو بمقابلہ یورپین اقوام کی ماہرفن اور تربیت یافتہ افواج کے بخوبی روشن کردیا۔ مہیب ہاتھیوں کا خوف و خطر زائل ہوگیا اور یہ ثابت ہوا کہ مقدونوی سواروں کے مقابلے میں ان پر اعتماد کرنا بالکل ہیچ ہے۔ سندھ سے لے کر کریٹراس کے ایران کی طرف بلا مزاحمت سفر سے ایک اور خشکی کا راستہ کھل گیا اور خشکی کی راہ سے یورپ اور ایشیا کے درمیان راستے کا مسئلہ حل ہوگیا۔ نیارکس کے ساحل سمندر کے پاس سفر کرنے سے سکندر کے لیے ایک تیسرا بحری راستہ قائم ہوگیا اور اگر وہ زندہ رہتا تو یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اسے سندھ اور پنجاب پر اپنا

تسلط قائم رکھنے میں کوئی دقت پیش آتی۔

سکندر کی موت کا اثر

اس کے تمام کاموں سے بلا خوف تردید یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان صوبوں کو مستقل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہتا تھا' اور وہ ذرائع جو اس نے اس کام کو پورا کرنے کے لیے اختیار کیے بظاہر کامیابی کے لیے کافی تھے۔ لیکن سکندر کی قبل از وقت موت نے اس کی تمام کامیابیوں اور ذریعوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کی مراجعت کے بعد تین ہی سال کے اندر اس کے افسروں کو نکال باہر کیا گیا۔ اس کی فوجیں تباہ و برباد ہو گئیں اور اس کی حکومت کے تمام نشان و آثار مٹ گئے۔ وہ نئی بستیاں جو اس نے ہندوستان میں قائم کیں وہ ایشیائی صوبوں کی بستیوں کے برخلاف یہاں بالکل نہ پھلیں پھولیں۔ یہ مہم آخر میں اپنے حقیقی نتائج کے لحاظ سے وسیع پیمانے پر ایک نہایت کامیاب یورش سے زیادہ ثابت نہ ہوئی اور اس نے ہندوستان پر سوائے کشت و خون کے اور کوئی اثر نہ چھوڑا۔

ہندوستان میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی

اس مہم سے ہندوستان میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔ جنگ نے جو زخم دیئے تھے جلد اچھے ہو گئے اور ویران اور اجاڑ کھیت بارش اور محنتی کاشتکاروں کی تندہی سے (جو چند سال سے بے جتے پڑے تھے) پھر ہرے بھرے ہو گئے اور بے شمار مقتولوں کی جگہ روز افزوں آبادی نے بھر دی جس میں انسان کے ظلم اور فطرت کے بے رحمانہ عمل کے سوا اور کوئی رکاوٹ کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان پر یونانی تہذیب نے کوئی اثر نہیں کیا اور وہ پہلے کی طرح اب بھی اپنی "شاندار علیحدگی" کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس نے مقدونوی طوفان کو بہت جلد فراموش کر دیا۔ [۳۶] کوئی ہندی مصنف خواہ وہ ہندو ہو یا بدھ یا جین سکندر یا سکندر کے کارناموں کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتا۔

سکندر اعظم کی ہندی مہم کا جدول تاریخ

از مئی 327 ق م تا مئی 324 ق م

واقعات	تاریخ ق م
ہندوستان میں داخلہ	
کوہ ہندوکش کو دریائے خاوک اور کوشان میں سے ہو کر قطع کرنا۔	اوائل مئی 327
نیکتیا (غالباً جلال آباد) کے مقام سے سکندر چیدہ فوج کو ہمراہ لے کر کوہستانی علاقے کو مطیع کرنے کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ ہے فے اسشان باقی ماندہ فوج کے ساتھ غالباً دریائے کابل کی وادی سے ہوتا ہوا دریائے سندھ کی طرف بڑھتا ہے۔	جون
ہے فے اسشان نے استیز (ہستی) کا قلعہ تیس دن کے محاصرے کے بعد فتح کیا۔	اگست
سکندر نے اپنی فوج کی تقسیم کی اور بذات خود قوم اسپسئن کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ دریائے گوروس (پنجکوڑ) کو عبور کیا اسکینسئن قوم کے شہر مسگا کو فتح کیا اور 7000 ہندی سپاہیوں کا قتل عام کیا۔	ستمبر
ارناس کا محاصرہ	نومبر
ارناس کی فتح	دسمبر 326
سکندر کی اوہند کے پل پر آمد۔	جنوری
تیس دن تک فوج کا قیام۔	جنوری سے فروری تک
"موسم بہار کے شروع میں" دریائے سندھ کو عبور کرنا' ٹیکسلا میں قیام۔	فروری سے مارچ تک
مشرق کی طرف بڑھنا۔	اپریل
دریائے جہلم پر آمد۔	مئی
جنگ جہلم' پورس کی شکست۔	اوائل جولائی
نیکتیا اور بیوس فلا کی بناء۔ (دامن کوہ کے قریب دریائے چناب، کو عبور کرنا۔	جولائی
دریائے راوی کو عبور کرنا اور کیتھئن قوم کے ساتھ جنگ۔	اگست
دریائے بیاس پر آمد اور فوج کا آگے بڑھنے سے انکار۔	ستمبر
مراجعت	
دریائے جہلم کی طرف واپس ہونا۔	ستمبر۔ اکتوبر

تاریخ ق م	واقعات
ختم اکتوبر 327	دریائی سفر کا آغاز اور بیڑے کی محافظ فوج کے کوچ کا شروع۔
جنوری	ملوئی قوم کی طاقت کا خاتمہ۔
ستمبر تک	بحری سفر کا جاری رہنا' سگدئی' سمباس' موسی کناس وغیرہ کے ساتھ جنگ۔
اوائل اکتوبر	سکندر کی گدروسیہ کے ذریعہ کوچ کرنے کی غرض سے روانگی۔
آخر اکتوبر 324	نیارکس کا خلیج فارس میں سفر کے لیے روانہ ہونا۔
اوائل جنوری	سکندر کی پورا (بامپور) گدروسیہ کے دارالسلطنت پر آمد جو اور اس سے ساٹھ دن سفر کے فاصلے پر واقع تھا۔
جنوری	فوج کا پورا مقام پر قیام
فروری	کرمانیہ میں گذرنا۔ تقریباً 300 میل کا فاصلہ۔
اپریل کا ختم یا مئی کا شروع 323	ایران میں سوسہ کے مقام پر کرمانیہ کے مغربی سرحد پر سے تقریباً 500 میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد آمد۔
جون	بابل کے مقام پر سکندر کی موت۔

نوٹ: خاص ہندوستان میں اس کے دریائے سندھ کو مارچ 326 ق م میں عبور کرنے کے بعد سے لے کر اواخر ستمبر یا اوائل اکتوبر 325 ق م میں گدروسیہ کے کوچ کے لیے روانگی تک سکندر نے تقریباً 19 مہینے بسر کیے۔ اس مدت میں دس مہینے دریائی سفر میں گذرے اور ہندوستان سے سوسہ کی طرف کوچ میں سات مہینے گذرے۔ باختر کی سرحد یعنی ہندوکش سے لے کر دریائے سندھ تک اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر کوہستانی اقوام کے مطیع کرنے میں دس مہینے گذرے۔

اول: مئی 327 ق م سے فروری 326 ق م تک (جس میں فروری شامل ہے) ہندوکش سے دریائے سندھ تک کوچ۔ تقریباً دس ماہ۔

دوم: مارچ 326 سے ستمبر 325 تک (جس میں ستمبر شامل ہے) خاص ہندوستان میں تقریباً انیس ماہ۔

سوم: اکتوبر 325 سے اپریل 324 تک (جس میں اپریل شامل ہے) سوسہ کی طرف کوچ۔ تقریباً سات ماہ۔

کل مدت مہم: تین سال

حوالہ جات

ا۔ آرسکینز کا نام غالباً اُدنہ اُبی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور اس کی بظاہر بار تھیائی شکل محض اتفاقی ہے۔

۲۔ کرٹیس باب 9 فصل 3۔ ڈیوڈرس (باب 15 فصل 95) نے اس سے زیادہ بڑی اور بعید از قیاس تعداد بیان کی ہے یعنی 30000 پیادے اور 6000 سوار۔ مگر زرہ بکتر کی تعداد کے متعلق دونوں مورخوں کا اتفاق ہے۔ ان کے لیے بار برداری کی بہت کچھ ضرورت ہوتی ہوگی۔ ڈیوڈرس یہ اور اضافہ کرتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی 100 ٹیلنٹ دوائیں بھی آئی تھیں۔

۳۔ ارین (انا باسس آف الیگزینڈر باب 6 فصل 2) نے لیگاس کے بیٹے ٹولمی کی سند پر بیان کیا ہے جو آخر میں مصر کا بادشاہ ہوگیا۔ یہی مصنف اپنی کتاب انڈیکا میں (فصل 19) غالباً نیارکس کی سند پر جہازوں کی تعداد 800 بیان کرتا ہے۔ کرٹیس اور ڈیوڈرس کا اندازہ 1000 کا ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ 8000 فوج 'کئی ہزار گھوڑے اور بے شمار سامان ساتھ لے جانا تھا' ٹولمی کا بڑھا ہوا اندازہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بعض مولفین نے محض اپنے خیال کی بناء پر انڈیکا کے 800 کے بجائے 1800 لکھ دیا ہے مگر اصلی اور صحیح تحریر 800 ہی ہے۔

۴۔ سوفائی ٹیز کی سلطنت کے موقع سٹربیو (باب 15 فصل 30) کے اس بیان سے بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس میں "ایک نمک کا پہاڑ شامل تھا جو تمام ہندوستان کے ملک کے لیے کافی تھا۔" کرٹیس (باب 9 فصل 1) نے سوفائی ٹیز کی سلطنت بیاس کے مغربی کنارے پر غلط بیانی کی ہے اور میک کرنڈل نے اسی کی پیروی کی ہے۔ اس کے نقشے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلطنت امرتسر کے شمال میں واقع تھی جو بالکل ناممکن ہے۔ کننگھم (این شنٹ جیاگرافی صفحہ 155) سوفائی ٹیز کے پایۂ تخت کو جہلم کے مغربی کنارے پر بھیرا کے مقام کو قرار دیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ غلط ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صحیح ہو۔

۵۔ ریورٹی نے اس دریا کے نام کا تلفظ مختلف طور پر ستلج، سُتلاج اور شتلج لکھا ہے۔ اس دریا کو جسے سنسکرت میں ستدرو کہتے ہیں شاذونادر ہی یونانی اور رومی مصنفین نے ہے سی ڈرس میں لکھا

ہے۔ سٹربیو کا بیان کیا ہوا ہائی پے فس' دراصل ہائی فے سس ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔ پہلے ایڈیشن کا ایک نقاد لکھتا ہے۔ "اس عجیب و غریب بیان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے' کہ قدیم زمانے میں بیاس دریائے ستلج کا معاون نہ تھا۔ (صفحہ 85) کیونکہ رگ وید میں لکھا ہے کہ ایک دریا دوسرے سے مل جاتا۔" صرف وہ مقام جہاں رگ وید میں وپاس کا ذکر ہے' تیسرا باب-33 راگ ہے۔ اور اس کی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ دونوں دریا ایک دوسرے کے کم و بیش متوازی بہتے تھے نہ یہ کہ وہ مل بھی جاتے تھے۔ وپاس اور ستدرے کے متعلق بری ہدیو تاز معموہ میک ڈانل' (جلد اول صفحہ 114) میں حوالے کا موازنہ کرو۔ پنجاب کے تمام دریاؤں میں ستلج سب سے زیادہ بدلنے والا دریا ہے۔ جب سے کہ بیاس کا نام تاریخ میں سنا جاتا ہے' اس نے 1790ء میں پہلی دفعہ اپنا راستہ بدلا اور مشرق کی طرف ہو کر ستلج سے جاملا' جو اسی وقت مغرب کی طرف ہٹ گیا۔ (ریورٹی صفحات 504'505۔ دیکھو آئندہ حاشیہ)

لے یہ بیان ریورٹی کے قابل قدر مضمون "دی مہران اینڈ اِٹس ٹری بیوٹریز۔ اے جیاگر یفیکل اینڈ ہسٹاریکل سٹڈی" (جے۔اے۔ایس۔بی۔1892ء حصہ اول) پر مبنی ہے جس میں بے شمار نقشے ہیں اور جس پر اب تک ویسی توجہ نہیں کی گئی جیسی چاہیے تھی۔ یہ مضمون جس میں 590 حاشئے ہیں اپنے طرز بیان میں ایسا ناقص ہے کہ اس کا مطالعہ مشکل ہے۔ سکندر کی ہندی مہم کے متعلق خیالات تمام مضمون اور حاشیوں میں پراگندہ ہیں اور مختلف قسموں کے مضامین میں ملے جلے ہوئے ہیں۔

موجودہ تقرر موقعہ کی بیکاری کے متعلق دیکھو صفحہ 155'226'250'469 اور نوٹ 539 وغیرہ۔ دریائے ہائی ڈس پیز (جہلم) کے لیے دیکھو صفحہ 52۔336' اکسنیز (چناب) صفحہ 52۔336' ہائی ڈروٹیز (راوی) صفحہ 71۔352' ہائی فے سس (بیاس) صفحہ 90۔371' ستلج صفحہ 418۔391' ہاکرا صفحہ 22۔418 و صفحہ 66۔454۔ نتائج صفحہ 508۔469۔ زلزلے اور سیلاب صفحہ 392'468'470 وغیرہ۔ سطح زمین کی تبدیلی صفحہ 300 و صفحہ 470۔ سال کی توسیع صفحہ 272 (نوٹ 235)' صفحہ 317'469'501 وغیرہ۔ آب و ہوا کی تبدیلی۔ صفحہ 282'354'417۔ تمام مضمون اس قابل ہے کہ اس کا نہایت غور سے مطالعہ کیا جائے۔ مصنف نے پورے حوالے بھی دیئے ہیں اور اس طرح اس کے تمام بیانات کی تصدیق بھی کی جاسکتی ہے۔

کے ایرین۔ اناباسس آف الیگزینڈر۔ باب 6 فصل 5۔ کرٹیس باب 9 فصل 4۔ ڈیوڈرس باب 17 فصل 96۔ اگلوئی کو صرف ڈیوڈرس نے مشہور کیا ہے جس کا بیان ہے کہ سکندر نے شہر کو آگ لگائی۔ شہر کے باشندوں کے بطیب خاطر جل مرنے کے بیان میں کرٹیس کا تتبع کیا گیا تھا کیونکہ یہ واقعہ ہندوؤں کے رسم و رواج کے عین مطابق ہے اور آئندہ بہت دفعہ ایسا ہوا

ہے۔ سیوئی غالباً ان نیم وحشی خانہ بدوش جاٹوں کے آباء و اجداد تھے جو اب اس علاقے میں رہتے ہیں۔ جغرافیائی حالت کے مباحثے کے لیے دیکھو میرا مضمون "دی پوزیشن آف دی آٹونومس ٹرائبس آف دی پنجاب کنکرڈ بائی الیگزینڈر دی گریٹ۔" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ اکتوبر 1903ء) ان اقوام کا ذکر سنسکرت ادبیات میں ساتھ ہی ساتھ آتا ہے۔ ویبر لکھتا ہے کہ آپیلی جس کا ذکر پلائنی نے کیا ہے' مرکب لفظ "کشوداک مالوا" کا بیان کرتا ہے۔ "یعنی کشوداک اور مالوا کی فوج" (جے۔ اے۔ ایس۔ بی۔ حصہ اول جلد 61 صفحہ 60)۔ مہابھارت میں ان کو ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ کورو کی فوج میں شامل تھے۔ (پرگیٹر جے۔ آر۔ ای۔ ایس۔ 1908ء صفحہ 329 جس میں مہابھارت باب ششم 2106' 2854' 2646' 3852' 3853' 4808' 5484۔ باب ہفتم 183۔ ہشتم 137۔ کا حوالہ دیا گیا ہے۔)

۸؎ ڈیوڈرس۔ باب 17۔ فصل 98۔

۹؎ اس میں ہائی پیس پسٹ پیادے' پیادے تیر انداز اور تھریس کے ہلکے اسلحہ سے مسلح سوار۔ پیادہ فوج پیتھان کے زیر کمان تمام سوار تیر انداز اور نصف سوار فوج شامل تھی۔ یہ تمام فوج بمشکل 7000 ہوگی۔

۱۰؎ یہ شہر چھوٹا سا تھا۔ (سٹریبو۔ باب 15' فصل 33) موجودہ بیان کہ اسے ملتان کا شہر مُولستھان پور۔ (دیکھو بیل کی کتاب ہیون سانگ جلد دوم صفحہ 274) قرار دیا جائے' بالکل بے سند ہے۔ اشتقاق کی رو سے ملتان کے نام اور ملوئی میں کوئی تعلق نہیں اور ملتان کا شہر بہت جنوب میں واقع ہے۔ ملوئی کے برخلاف جنگ دریائے راوی کی وادی میں ہوئی تھی جہاں یہ لوگ اس زرخیز کوہستان کے دامن کی زمین کے مالک تھے جو آج کل ضلع منٹگمری اور ضلع جھنگ کا کچھ حصہ ہے۔ دیکھو ریوڑٹی صفحہ 364۔ اور میرا مضمون جے۔ آر۔ اے۔ ایس اکتوبر 1903ء۔ ٹولمی نے جیسا کہ بعض مصنفین کا خیال ہے' سکندر کی حفاظت میں شرکت نہیں کی تھی۔

۱۱؎ یہ تمام تفصیل کرٹیس (باب 9 فصل 78) سے لی گئی ہے۔ ایرین (باب 6' فصل 14) 500 رتھوں ہی کا ذکر کرتا ہے۔ مگر غالباً کرٹیس کے پاس اپنے بیان کے ثبوت میں اچھے دلائل موجود تھے۔ قدیم مصنف ہندی روئی کو "کتان" لکھتے ہیں۔ جو ہندوستان میں کبھی تیار نہیں ہوئی۔ اعلیٰ درجے کا فولاد بہت قدیم زمانے سے ہندوستان میں بنتا تھا۔ کرٹیس اس کو "فیرم کندیدم" کہتا ہے' یعنی "فولاد۔" کچھوے کی ہڈیاں پہلی صدی عیسوی کے زمانے میں بھی ہندی تجارت کا جزو تھیں۔ (پیری پلس۔ دیکھو انڈین انٹی کویری' جلد 8' صفحہ 111) کرٹیس (باب 9' فصل 7) کا یہ بیان کہ سکندر نے ملوئی اور آکسی ڈریکائی پر "ایک خراج لگایا تھا جو وہ باقساط ارکوسیہ کی قوم کو ادا کیا کرتے تھے" ناقابل فہم ہے۔ اور خود ارکوسیہ کا نام بھی غلط معلوم ہوتا ہے ارکوسیہ' یعنی قندھار کا علاقہ' کسی طرح ممکن نہیں کہ مشرقی پنجاب کی اقوام

سے خراج وصول کرتا ہوں۔ بیکن نے آکسی ڈریکائی کا ایک عجیب وغریب اور غلط حوالہ اپنے مضمون "آن دی دسی سی ٹیوڈس آف تھنگس" میں دیا ہے۔ اور وہ براہ راست فلاسٹریٹاس کی کتاب "لائف آف اپولونیس آف ٹیانہ" جلد دوم۔ 33۔ (انڈین انٹی کویری 1906ء صفحہ 335) سے نقل کرتا ہے۔

۱۲؎ ریورٹی۔ صفحہ 473۔ دوش آب کا مقام بھکل یا بگھل کے مقام پر تھا۔ جو انڈیا آفس کے ہندوستان کے نقشے پر تقریباً شمال عرض بلد 28^0 – '20 اور مشرق طول بلد 70^0 – '30 پر واقع ہے۔ آرین نے چاروں مقامات اتصال کو اناباسس آف الیگزینڈر میں بیان کیا ہے۔ اسی مصنف کی کتاب انڈیکا کا متناقض اور ناقابل فہم بیان بالکل خبط ہو گیا ہے۔

۱۳؎ ایرین (اناباسس آف الیگزینڈر باب 6، فصل 15)۔ کرٹیئس (باب 9، فصل 8) کے بیان کے مطابق سکندر کی مڈبھیڑ ایک اور قوم ملی نام سے (جسے میک کرنڈل نے دریائے راوی کی ملوئی قوم کے ساتھ خبط کر دیا ہے) اور اس کے بعد ایک اور قوم سبرسی سے ہوئی جو بڑی طاقتور تھی اور بغیر بادشاہ کے جمہوری طرز کی حکومت رکھتی تھی۔ ان کی فوج کے متعلق بیان تھا کہ اس میں 60000 پیادے، 6000 سوار اور 500 رتھیں شامل تھیں اور وہ تین مشہور و معروف جرنیلوں کے زیر کمان تھی۔ اس قوم نے اطاعت قبول کر لی۔ زتھروی (یا کستھروئی) معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت یا کشتری کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ سبرسی کو ڈیوڈورس سمبس ٹئی لکھتا ہے اور وہ کرٹیئس کے ساتھ ان کی طرز حکومت اور فوج کی تعداد کے متعلق متفق ہے۔ ڈیوڈورس (باب 17، فصل 102) یہ اضافہ کرتا ہے کہ دو اور قومیں سوڈرئی اور مسانوئی دریا کے دونوں کناروں پر سکونت پذیر تھیں اور ان کی حدود کے اندر ایک شہر سکندریہ بنایا گیا تھا جس میں 10000 آباد کار چھوڑے گئے تھے۔ میک کرنڈل اور دیگر مصنفین کی یہ کوشش کہ ان اقوام و قبائل کی اصلی جائے سکونت کا پتہ لگائیں بالکل بیکار ہے۔ کیونکہ ہم کو یہی معلوم نہیں کہ اس وقت دریا کہاں واقع تھا۔ اناباسس آف الیگزینڈر (باب 6، فصل 15) میں اکسیرٹیز کا بیتھان۔ تھریس کی وہ فوج جو فلپس کے حوالے کی گئی بظاہر پیادہ فوج معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ لگرینین ہلکے اسلحہ سے مسلح رسالہ جو تھریس کا ہی تھا۔ آئندہ کی جنگوں میں شریک رہا تھا۔

۱۴؎ ایرین (اناباسس آف الیگزینڈر باب 6، فصل 15) کے الفاظ جن میں وہ کریٹراس کے داہنے کنارے سے بائیں کنارے پر منتقل ہونے کا ذکر کرتا ہے، بظاہر محض ایک حاشیہ ہے جو غلطی سے متن کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ ڈیلٹا کے شروع کی طرف سے کریٹراس کو "کرمانیہ میں براہ ارکوئی اور زرنگوئی روانہ کر دیا گیا تھا۔" جیسا کہ فصل 17 میں مذکور ہے۔ میک کرنڈل کا یہ قیاس کہ کریٹراس پہلے فصل 15 کے مطابق روانہ کیا گیا تھا اور بعد میں پھر واپس بلا لیا گیا، میرے نزدیک قابل تشفی نہیں۔ اس سے قبل میں نے اسی باب کی اور غلطی کو بھی ظاہر کیا تھا

جس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی کہ غلطی سے زائد عبادت کو متن میں جگہ دے دی گئی۔

۱۵ سٹریبو باب 15' فصل 34۔54۔ سٹریبو اُنیکریٹاس کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ اور مصنفین یہ بیان کرنے میں حق پر نہیں کہ تمام ہندوستان میں غلامی کا وجود نہ تھا۔ میگاستھینز (ایرین۔ انڈیکا۔ باب 10) کا بیان ہے کہ ہندوستان میں بڑی اچھی بات یہ تھی کہ تمام ہندی آزاد تھے اور کوئی ہندی غلام موجود نہ تھا۔ مگر درحقیقت نہایت قدیم زمانے سے ہندوستان میں خانگی قسم کی غلامی نہایت معتدل حالت میں موجود تھی۔

۱۶ پیتھون دریائے سندھ کے جنوبی علاقے کا بلا شرکت غیرے صوبہ دار تھا۔ اکسیرٹیز کے اس کے ساتھ شریک رتبہ ہونے کے ذکر کی وجہ سے متن کتاب میں خرابی پڑ جاتی ہے۔ (دیکھو گزشتہ حاشیہ)۔

۱۷ اس فقرے کا ترجمہ میک کرنڈل نے یہ کیا ہے کہ سکندر نے باغی کو پھانسی دیئے جانے کا حکم دیا۔

۱۸ یہ ترجمہ میک کرنڈل کا ہے۔ کرٹیس اس قوم کا ذکر کر کے جو مسکنی کہلاتے تھے۔ اور وہ آکسی کیناس کو پورٹیکنس کہتا اور بیان کرتا ہے کہ اس کی رعایا پرستی قوم تھی' اس کے مطابق پورٹیکنس مارا گیا۔ یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ سمباس کی فوج زہر آلود تلواریں استعمال کرتی تھی (باب 9 فصل 3)۔

۱۹ سندمن ممکن ہے سہوان (سیہون) ہو۔ اس کو صرف اس وجہ سے سہوان کا مترادف مان لیا جاتا ہے کہ دونوں نام سین سے شروع ہوتے ہیں۔ قلمی نسخے میں سندوٹلیا ہے۔ سٹریبو کی کتاب کے ناموں کے متعلق بہت کچھ شک کی گنجائش ہے۔ دیکھو کتاب مصحح ڈیوبز۔ پیرس 1853ء۔

۲۰ تمام ماہرین فن اس بات میں متفق ہیں کہ کریٹراس نے قلات کے قریب سے درۂ ملا میں سے ہوتا ہوا قافلوں کا موجودہ زیادہ آسان اختیار کیا ہوگا۔ بولان اور کوئٹہ کا راستہ بہت عنقریب زمانے سے کام میں لایا گیا ہے۔ (ہولڈچ' گیٹس آف انڈیا۔ 1910ء۔ صفحہ 147۔ سائیکس۔ ٹین تھاؤزنڈ مائلز ان پرشیا۔ صفحہ 49)۔ درۂ ملا تمام سال سفر کے لیے کھلا رہتا ہے۔ (میسن کا سفرنامہ۔ جلد دوم' صفحہ 120)۔

۲۱ بھمن آباد۔ یا بھمنہ یا بھمنو' نہ کہ برہمن آباد جیسا کہ عرف عام غلط طور پر لکھا جاتا ہے۔ یہ شہر بھمن آباد کے نام سے اسفندیار کے بیٹے بھمن نے "گشتاسپ ایران زمین کے فرمانروا کے عہد" میں آباد کیا تھا۔ بھمن آرٹرز خیز لانگیملن یا اہالورس کا ایک دوسرا نام ہے جس نے 465 ق۔م سے 425 ق۔م تک حکومت کی۔ (ریورٹی کا مضمون' نوٹس۔ صفحہ 510) ریناڈ۔ انڈین انٹی کویری جلد 8' صفحہ 336) وہ گشتاسپ کا پوتا تھا۔ مگر یہ جگہ اور بھی زیادہ قدیم ہے اور اس میں بڑے وسیع قبل تاریخی زمانے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ (پروگرس رپورٹ۔ آرکیالوجیکل سروے ڈبلیو۔ آئی 97-1896ء صفحہ 50-30۔ ایضاً 1903ء صفحہ

144 – 133) بہمن آباد کے مقام کو مسٹر بلیس نے 1854ء میں دریافت کیا تھا (جر۔ بو۔ پر۔ آر۔ اے۔ ایس۔ جنوری 1856ء)۔ منصوریہ پرانے شہر کے کھنڈر کے ملبے سے تقریباً اسی موقع پر قائم کیا گیا تھا۔ (لوئس۔ اینوئل رپورٹ۔ اے۔ ایس۔ ڈبلیو۔ انڈیا 4 – 1903ء صفحہ 44 – 132 – 9 – 1908ء صفحہ 87 – 79)۔ ریورٹی (کتاب مذکورہ صفحہ 205 – 192) کا پیچ دار نوٹ بہت کچھ معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ ڈیلٹا کے سرے اور پٹالہ کے شہر کے موقع کے متعلق دیکھو مضمون مذکورۂ بالا۔ صفحہ 226' 461' 462۔ جنرل ہیگ کی رائے جو ڈیلٹا کے بڑھنے کے اندازے کو بہت کچھ کم کر دیتا ہے' یقیناً اس امر میں غلط ہے کہ پٹالہ حیدر آباد کے عرض بلد کے نیچے واقع تھا۔ اسی مصنف کو ان تمام شہادتوں کی خبر نہ تھی جن کی بنا پر ریورٹی نے ڈیلٹا کے قدیم ترین معلوم شدہ سرے کو بہمن آباد سے 40 میل شمال میں قائم کیا تھا۔ (دیکھو دی انڈس ڈیلٹا کنٹری۔ صفحہ 1 – 129 – 135 – 136۔ شائع کردۂ کیگن پال اینڈ کو 1894ء)۔ بہت سی کتابیں (مثلاً بلفور کی سائکلوپیڈیا) بالکل غلط طور پر پٹالہ کو حیدر آباد کا موجودہ شہر بتاتی ہیں۔

۲۲؎ کرٹیس نے (باب 9' فصل 9) نہایت ہی مفصل اور جوشیلے حالات پٹالہ سے سمندر تک کے سفر کے لکھے ہیں۔ سترھویں صدی میں (سر ٹامس ہربرٹ۔ تھیونو وغیرہ) دیبل یا دیول سندھ کا انتہائے جنوب کا شہر تھا اور اس طرف کا بڑا بندرگاہ اور ٹھٹھہ سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ شہر اب بالکل معدوم ہو چکا ہے۔ مگر یقیناً وہ پیر پتھو کی درگاہ کے قریب یا ایک ذرا جنوب مغرب کوہ لکھی کے دامن میں دریائے سندھ کے معاون دریائے بھاگر کے پاس جو اس زمانے میں اچھا بڑا دریا تھا' آباد تھا۔ (ریورٹی۔ مہران آف سندھ صفحہ 31 – 371۔ حاشیہ 315)۔ ہیگ اس کو ٹھٹھہ کے جنوب مغرب میں 20 میل کے فاصلے پر پرانے کھنڈروں کے مقام پر بیان کرتا ہے۔ (ہولڈچ' دی گیٹس آف انڈیا۔ صفحہ 310)۔ یہ موقع درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ریورٹی (صفحہ 321) نے یہ غلطی کی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ ہربرٹ دیول کے مقام پر اترا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سورت کے قریب "سوالی روڈ" پر لنگر انداز ہوا تھا۔ (سفرنامہ مطبوعہ 1677ء۔ صفحہ 42) اس نے صفحہ 80 پر دیول کا بندرگاہ کے طور پر ذکر کیا ہے۔

۲۳؎ جھیل سماراہ کے حال کے لیے دیکھو۔ ریورٹی (مضمون مذکورۂ بالا) صفحہ 477' 465۔ انڈیا آفس کے نقشہ ہندوستان پر اسے سمرو لکھا ہے۔ سکندر کے زمانے میں رن کچھ یقیناً سمندر کی شاخ یا کھاڑی ہوگی اور شمال کی طرف تقریباً 25^{0} تک پھیلی ہوگی' جہاں پر اس بڑے دریا کی یہ شاخ اس میں گرتی تھی۔ جھیل دریا کے دہانے سے بہت تھوڑے فاصلے پر تھی۔ (اریین' اناباسس آف الیگزینڈر۔ باب 6 فصل 20)۔ ساحل سمندر بہت کچھ آگے بڑھ گیا ہے۔ مغل ہیں کا مقام جہاں ملکہ الزبتھ کے وقت میں اکبر کا امیر آکر سمندر کا نظارہ دیکھنے کے لیے کھڑا ہوا

تھا۔ آج کل سمندر سے 80 میل کے فاصلے پر ہے۔ اور زیادہ مغرب کی طرف دریائے پرالی کے قریب سومیانی کے مقام پر ساحل سمندر سکندر کے وقت سے اس وقت تک کم از کم 20 میل آگے بڑھ گیا ہے۔ بوین کے جنوب میں جو شمال عرض بلد °24 - '40 میں واقع ہے' زمین کا بہت سا حصہ اکبر کے زمانے سے اب تک پیدا ہوا ہے۔ ساحل سمندر آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کے حملے کے وقت اوسطاً "°24 - '30 تھا۔ اس وقت سے ہزار برس پہلے سکندر کے زمانے میں ساحل یقیناً بہت کچھ شمال کی طرف ہوگا۔ مگر اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس کا ایسا اندازہ لگا سکے جو صحت کے قریب ہو۔ °25 کے متوازی خطوط کے متعلق فرض کیا جا سکتا ہے کہ سکندر نے وہیں سفر کیا تھا۔ دریائے کھترائی کے دہانے پر زمین اب °23 - '30 تک پھیلتی جاتی ہے۔ (دیکھو ریورٹی۔ صفحات 468' 469' 470' 477 وغیرہ۔ ہیگ۔ صفحات 136 تا 139 اور مسٹر آر۔ سیورائٹ کا قابل قدر مضمون "کچھ اینڈ دی رن"۔ جیاگرافیکل جرنل جلد 29 (1907ء) صفحہ 518۔ ان کے علاوہ دیکھو سر بارٹل فرر کا مضمون "نوٹس آن دی رن آف کچھ" رسالہ مذکورہ۔ 1871ء۔

۴۴؎ نیارکس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دریا میں سے ایتھنز کے مہینے بودرومان کی بیسویں تاریخ کو روانہ ہوا تھا (یعنی ستمبر اکتوبر 325 ق-م)۔ یہ تاریخ بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ سکندر نے دریا تین ہفتے قبل ہی اپنا سفر شروع کیا ہو۔ ارسٹو بیولوس (سٹریبو باب 15' فصل 17) کو اس بات کی سند میں پیش کیا جاتا ہے کہ دریاؤں کے سفر میں دس مہینے لگے تھے۔ بیڑا پٹالہ میں جولائی یا اگست میں پہنچا تھا۔ ان تمام کاموں میں جو پٹالہ میں کیے گئے یا اختتام پر پہنچائے گئے بہت کچھ وقت صرف ہوا ہوگا۔

۴۵؎ بعض مصنفوں نے اس لفظ کا ترجمہ بجائے "رکاوٹ" کے "چٹان" کیا ہے اور اس ترجمے کی بناء پر "موقع" کا تعین کرتے ہیں۔ مگر ایرین آگے کہتا ہے کہ نیارکس نے اس "رکاوٹ" کے "نرم حصے میں ایک نہر کھودی تھی"۔

۴۶؎ دریائے اربس یا اربیئس کا راستہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔

۴۷؎ کرٹیس۔ باب 9' فصل 9

۴۸؎ ایرین۔ انڈیکا۔ 23۔ مگر یہی مصنف اپنی کتاب اناباسس (باب 6' فصل 27) میں بیان کرتا ہے۔ کہ سکندر نے گدروسیہ کے پایۂ تخت پورا (موجودہ بام پور) میں پہنچ کر اپالوفینز کو معزول کر دیا تھا۔ کیونکہ اس نے اس کی ہدایتوں پر بالکل عمل نہیں کیا تھا۔ ایرین اس کے بعد بیان کرتا ہے کہ تھوس جو اس کا جانشین ہوا جلد مر گیا۔ سبرٹناس اس کے بعد مقرر ہوا۔ کرٹیس لکھتا ہے (باب 9' فصل 10) کہ سبرٹناس سے پہلے میمنن صوبہ دار تھا "جو کسی بیماری سے مر گیا" میں ان متضاد باتوں کو کسی طرح حل نہیں کر سکتا۔

۹ ؎ آج کل اس کو ہنگول کہتے ہیں۔

۱۰ ؎ ڈیوڈرس اس امر میں متفق ہے کہ اورٹی بہت سی باتوں میں ہندوستانیوں کے مشابہ تھے۔ مگر وہ یہ اضافہ کرتا ہے کہ وہ لوگ اپنے مُردوں کو ننگا کرکے جنگلوں میں چھوڑ آتے تھے کہ وحشی جانوران کو کھا جائیں۔

۱۱ ؎ ایرین گدروسئو کی اصطلاح کو سٹریبو کی نسبت زیادہ محدود معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ موخرالذکر تو بیان کرتے ہوئے (باب 15' فصل 2۔ صفحہ 8'9) اس کی حدود کو مشرق میں دریائے سندھ تک وسعت دیتا ہے۔ مگر اس میں کسی قسم کا تناقض نہیں۔ گدروسیہ کے صوبے میں بلاشک وشبہ اورٹی اور اربوئی کا ملک اور اصل صوبہ گدروسیہ شامل تھا۔ اورٹی کے متعلق فرض کیا جاتا ہے کہ اب ان کے قائم مقام لسیلا کے لُمری قبائل ہیں جو راجپوت ہونے کے مدعی ہیں۔ گدور جو لُمری قوم میں ہی شامل ہیں ممکن ہے کہ گدروسئو کے قائم مقام ہوں۔

۱۲ ؎ ساحل کے ان باشندوں کی عادات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ مرد و زن' بچے' کتے' اونٹ اور مویشی سب مچھلیاں کھاتے ہیں۔ (جیاگرافیکل جرنل 1896ء۔ صفحہ 388)۔ فلاسٹریٹاس کو بالکل صحیح بتلایا گیا تھا کہ "ان باشندوں کی بھیڑیں عجیب ہیں۔ ان کے گڈریئے انہیں مچھلیاں کھلاتے ہیں جیسا کہ کیریا میں کتوں کو۔" اپالونیئس باب 3' فصل 55۔

۱۳ ؎ ہولڈچ کی "دی انڈین بورڈرلینڈ۔" (شائع کردہ۔ میوتھن 1901ء) صفحہ 206۔ دی گیٹس آف انڈیا' صفحہ 160۔ اس مصنف کے خیال کے مطابق مکران کے ساحل میں بہت تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور نیارکس کے بہت سے بندرگاہوں کا تعین ہو سکتا ہے۔ مگر بعض جزائر کٹ کٹ کر برباد ہو گئے ہیں۔ اس صوبے کے نام کو ریورٹی مکران لکھتا ہے۔ گدروسیہ کے درمیان کوچ کے لیے ہولڈچ کا لکچر: "اے ریٹریٹ فرام انڈیا" موجودہ سند ہے۔ (جرنل یونائیٹڈ انسٹیٹیوٹ۔ انڈیا 1894ء' صفحہ 112۔ مع نقشہ) یہی مصنف اپنے مضمون "نوٹس آن اینشنٹ اینڈ میڈیول مکران" (جیاگرافیکل جرنل 1896ء) میں سکندر کے راستے کا ایک نقشہ دیتا ہے۔

۱۴ ؎ جرمن علماء کی تاریخ و ماہ کو صحت کے ساتھ تعین کرنے کی کوششیں ناکافی اسناد پر مبنی ہیں۔ (دیکھو ہوگرتھ۔ "فلپ اینڈ الیگزینڈر آف میسیڈون" ضمیمہ)

۱۵ ؎ ڈیوڈرس (باب 18' فصل 39) لکھتا ہے: "انٹی پیٹر نے پھر صوبوں کو نئے سرے سے تقسیم کیا۔ اور ہندوستان کے علاقے جو پرڈپی سڈئی سے ملحق تھے اگنور کے بیٹے پیتھون کو دے دیئے۔ سات علاقوں میں سے اس نے اس علاقے کو جو دریائے سندھ کے ساتھ تھا پورس کو' اور دریائے جہلم کے ساتھ کے علاقوں کو ٹکسلا کے راجا کو دیا۔ کیونکہ ان بادشاہوں کو ان علاقوں سے دلائل شاہی فوج اور ... عبارت

میں پورس اور سبھی کے نام بدل گئے ہیں۔ دریائے سندھ کی وادی بظاہر ٹیکسلا کے راجا کے قبضہ میں جانی چاہیے تھی۔ کیونکہ پورس کی سلطنت دریائے جہلم کے مشرق میں واقع تھی۔ نیس کا بعید از عقل خیال کہ سکندر کے حملے کے بعد ہندوستانی ترقیوں کا راز اس کے قائم کیے ہوئے دستور میں مضمر ہے' میرے نزدیک کسی طرح درست نہیں۔ اور نہ کوئی واقعہ اُس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک میتھیو آرنلڈ کے یہ الفاظ ہندوستان پر صادق آتے ہیں: "مشرق نے طوفان کے آگے نفرت و حقارت سے سر تسلیم خم کر دیا۔ فوجیں تمام تباہیوں کو ہمرکاب لیے ہوئے اس کے سر پر سے گزر گئیں' اور وہ پھر اپنے خیال میں محو ہو گیا۔"

پانچواں باب

چندرا گپتا موریا اور بندوسار

321 ق م تا 272 ق م

یوڈیمس

جب سکندر پنجاب سے گیا تو اس نے اس صوبے میں کوئی مقدونی فوج نہیں چھوڑی، بلکہ اپنے تمام کام کو راجا پورس کے سپرد کر دیا، جو یقیناً عملی طور پر خود مختار ہی ہو گا۔ ٹیکسلا کا راجا بھی پورس کے شریک کے طور پر مقرر کیا گیا۔ فلپوس کے قتل کے بعد سکندر نے کرمانیہ سے یوڈیمس کے نام، جو دریائے سندھ پر تھریس کی فوج کا افسر اعلیٰ تھا، احکامات جاری کیے تھے کہ جب تک کوئی خاص صوبہ دار مقرر نہ ہو اس وقت تک وہ وہاں ریذیڈنٹ کا کام انجام دے اور دیسی راجاؤں پر نگرانی قائم رکھے۔ مگر اس افسر کے پاس ایسی کوئی فوج نہ تھی جس سے وہ اپنے اختیارات کو برقرار رکھ سکتا اور اسی وجہ سے یہ اقتدارات بالکل برائے نام ہوں گے۔ بہرحال اس نے اتنا ضرور کیا کہ غالباً دریائے سندھ کی وادی میں کسی نہ کسی طرح 317 ق م تک ہندوستان میں ٹھہرا رہے۔ اس کے بعد وہ انٹی گونوس کے مقابلے کو یومینیز کی مدد کے واسطے اپنے ساتھ ایک سو بیس ہاتھی اور سوار اور پیادوں کی ایک چھوٹی سی جمعیت لے کر روانہ ہو گیا۔ ہاتھی اس نے بے ایمانی سے ایک ہندی راجا کو قتل کر کے حاصل کیے تھے۔ یہ راجا غالباً پورس ہو گا جس کا سکندر نے اس کو شریک مقرر کیا تھا۔

پیتھون وغیرہ

سندھ کا صوبہ یعنی جنوبی دریائے سندھ اور دریاؤں کے مقام اتصال کے نیچے کا علاقہ جس کو

سکندر نے پیتھون اگینور کے بیٹے کے سپرد کیا تھا' اس سے بھی کم مدت تک یونان کے زیر اثر رہا۔ 321 ق م میں سکندر کی سلطنت کی دوسری مرتبہ تقسیم کے وقت انٹی پیٹر کے لیے صاف طور پر ناممکن تھا کہ وہ ہندوستانی راجاؤں پر کسی قسم کی نگرانی قائم رکھ سکے اور اس سے قبل ہی پیتھون مجبور ہو گیا تھا کہ وہ دریائے سندھ کے مغرب میں ہٹ آئے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دریا کی مشرقی جانب کے ہندی صوبوں کو اس تقسیم کے وقت بالکل نظرانداز کر دیا اور پیتھون نے غنیمت سمجھ کر صرف کابل کے علاقے کو قبول کر لیا۔ غالباً یہ ملک بدستور سابق روشنک کے باپ آکسیرٹیز کے زیر انتظام رہا جس کو سکندر نے وہاں کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ سبر ٹیناس کو اراکوسیہ اور گدروسیہ کی سلطنت پر مستقل کر دیا۔ سٹسنڈ راس کو اریہ اور ڈرنگیانہ کے ممالک دیئے گئے اور اس کے ہم وطن سٹینار کو باختر اور صغدانیہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔[1] ان تمام انتظامات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ 321 ق م میں سکندر کی موت سے دو سال کے اندر ہی اندر دریائے سندھ کے مشرق میں یونانی طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا تھا اور اس سے صرف وہی علاقہ' جہاں کہیں کہ وہ واقع ہو' مستثنیٰ تھا جس پر کسی نہ کسی طرح یوڈیمس نے چار سال تک اپنا قبضہ قائم رکھا۔

ہندوستانیوں کی بغاوت

نو مفتوحہ ہندی صوبوں میں مقدونی طاقت کا غیر محفوظ ہونا تو فلپوس کے قتل سے ثابت ہو چکا تھا۔ اس واقعے کی خبر جبکہ سکندر کرمانیہ ہی میں تھا اسے پہنچ گئی تھی اور اس زمانے میں یہ ہر طرح ممکن تھا کہ وہ پھر کسی وقت ہندوستان میں واپس آ جائے۔ جون 323 ق م میں اس کی موت نے تمام خوف و خطر کو زائل کر دیا اور ہندی راجاؤں نے بلاشک و شبہ جس قدر جلد ممکن تھا اپنی گئی ہوئی خود مختاری کو پھر حاصل کر لیا اور غیر ملکی کمزور فوج کو تباہ و برباد کر دیا۔ سکندر کے مرنے کی خبر غالباً ہندوستان میں اگست ہی کے مہینے میں معلوم ہو گئی ہو گی۔ مگر معمولی افسروں نے موسم سرما کے شروع ہونے یعنی اکتوبر سے پہلے کسی قسم کی فوجی کارروائی نہ کی ہو گی کیونکہ سکندر کی طرح ہندی راجا موسم اور آب و ہوا سے بالکل بے پروانہ تھے' بلکہ فوجی نقل و حرکت میں اپنے سلف کے پیرو تھے۔ ہم کو یقین کر لینا چاہیے کہ جونہی فاتح سکندر کی موت کا یقین ہو گیا اور اب اور موسم آیا جس میں فوجی نقل و حرکت آسانی سے ہو سکے تو تمام ہندیوں نے ایکا کر کے بغاوت کی اور ہندوستان میں مقدونی طاقت کا خاتمہ اوائل 322 ق م ہی میں ہو گیا' سوائے اس علاقے کے جو یوڈیمس کے پاس کچھ مزید مدت تک رہا۔

چندر اگپتا کی زندگی کے ابتدائی حالات

غیر ملکی قوم کے مقابلے میں اس بغاوت کا سرغنہ ایک شخص چندر اگپتا نامی تھا۔ یہ اس زمانے میں بالکل نوجوان تھا اور غالباً اس کی عمر اس وقت پچیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ اگرچہ وہ باپ کی طرف سے شمالی ہند کی سب سے بڑی سلطنت مگدھ کے شاہی خاندان کا ایک فرد تھا مگر اس کی ماں یا بقول بعض اس کی نانی ایک نیچ ذات کی عورت تھی۔ ہندوؤں کے قانون کے بموجب اس کا تعلق بجائے باپ کے ماں کی ذات سے تھا اور اسی وجہ اسے نیچ ذات ہونے کی تمام ذلتیں برداشت کرنا پڑیں۔ موریا کا خاندانی نام جو چندر اگپتا کے قائم کردہ شاہی خاندان کے افراد نے اختیار کیا تھا کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں یا نانی کے نام مورا سے مشتق تھا۔ کسی نہ کسی وجہ سے اس نوجوان چندر اگپتا سے اس کا رشتہ دار فرمانروا راجا مہاپدمانند ناراض ہو گیا تھا اور اسے جلاوطنی اختیار کرنی پڑی تھی۔[1] اس جلاوطنی کے اثناء میں اس کی قسمت نے یاوری کی اور اسے سکندر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ رائے دی تھی کہ اگر مقدونوی بادشاہ آگے بڑھتا تو وہ بڑی آسانی سے دریائے گنگا کے آس پاس کی سلطنت کو فتح کر لیتا' چونکہ اس وقت کا حکمران بادشاہ اپنی رعایا میں نہایت ہی بدنام تھا۔ مہاپدمانند کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایک نائی کا بیٹا تھا جس نے متوفی راجا کی ملکہ کے ساتھ تعلق پیدا کر لیا تھا۔ ان دونوں مجرموں نے بادشاہ کو قتل کر دیا اور نائی نے اس کے تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کا جو بیٹا اب برسر حکومت تھا' بخیل اور حد درجہ بدچلن تھا اور اسی وجہ سے بہت کم لوگ اس کے یار و مددگار تھے۔

مگدھ کے تخت کو غصب کرنا' 322 ق م

اپنی جلاوطنی کے زمانے میں چندر اگپتا نے شمال مغربی سرحد کی جنگجو لٹیری اقوام سے ایک بڑی زبردست فوج جمع کی اور سکندر کی موت کے بعد مقدونی فوجوں پر حملہ کر کے پنجاب کو فتح کیا۔ غالباً غیر ملکی افواج کو ملک بدر کرنے سے پہلے اس نے اپنے بدنام رشتہ دار یعنی مگدھ کے نند راجا کو مغلوب کر لیا تھا اور اسے تخت سے اتار کر قتل کر ڈالا تھا۔ ناٹک لکھنے والا' جس نے یہ تمام واقعہ لکھا ہے' بلاشک و شبہ صحیح بیان کرتا ہے کہ نند خاندان کی نسل بالکل برباد ہو گئی اور اس کا کامل استیصال ہو گیا۔ اس انقلاب کے اثناء میں نوجوان اور ناتجربہ کار چندر اگپتا کا مشیر کار ایک لائق اور ہوشیار برہمن چانکیا یا کوتلیا نامی تھا جس کی مدد سے وہ تخت و تاج کا مالک اور متصرف ہو گیا۔ لیکن عام رعایا کو بادشاہوں کے رد و بدل سے کوئی فائدہ نہ پہنچا کیونکہ چندر اگپتا نے "اپنی فتح و نصرت کے بعد ظلم و تعدی کی وجہ سے آزاد کنندہ کے نام کو برقرار نہ رکھا۔ بلکہ ان ہی لوگوں

کے ساتھ جنہیں اس نے دوسروں کی غلامی سے آزادی دلائی تھی خود ایسا سلوک کیا جو غلاموں سے کیا جاتا ہے۔ اپنے نند پیشرو سے اسے ایک زبردست فوج ورثے میں ملی تھی۔ اس میں اس نے مزید اضافہ کیا یہاں تک کہ اس کی تعداد 30000 سوار' 9000 ہاتھی' 600000 پیادے اور ایک بڑی تعداد رتھوں تک پہنچ گئی۔ اس ناقابل مقاومت فوج کو لے کر اس نے تمام شمالی سلطنتوں کو غالباً دریائے نربدا یا اس سے بھی آگے دور تک زیر فرماں اور مطیع کر لیا۔ اس طرح چندر اگپتا کی سلطنت' جو شمالی ہند کا از روئے تاریخ سب سے پہلا قیصریا شہنشاہ ہوا' خلیج بنگالہ سے لے کر بحیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔

سائلوکس نیکٹار کا حملہ

عین اس وقت جبکہ چندر اگپتا اپنی سلطنت کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں مشغول تھا۔ اس کا ایک حریف مغربی اور وسطی ایشیاء میں اپنی طاقت کی بنیاد قائم کر رہا تھا اور سکندر کی ہندی فتوحات کو دوبارہ حاصل کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ سکندر کے مختلف جرنلوں کی آپس کی خانہ جنگی کے اثناء میں دو جرنیل ایشیاء میں طاقت قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے کے مدمقابل تھے' یعنی انٹی گونوس اور سائلوکس جو آخر میں نیکتار یعنی فاتح کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اول اول انٹی گونوس کی قسمت نے یاوری کی اور اس نے اپنے حریف کو ملک بدر کر دیا۔

312 ق م

لیکن 312 ق م میں سائلوکس نے بابل پر دوبارہ قبضہ کیا اور چھ سال کے بعد اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ بادشاہ کا لقب اور خطاب اختیار کرنے میں بالکل حق پر ہے۔ وہ عام طور پر بادشاہ شام کے نام سے مشہور ہے۔ مگر دراصل وہ مغربی اور وسطی ایشیا کا بادشاہ تھا۔ اس کی سلطنت کے مشرقی صوبے ہندوستان کی سرحد تک پہنچتے تھے اور قدرتی طور پر اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ اس ملک میں بھی ان مقدونی مفتوحہ علاقوں کو نئے سرے سے حاصل کر لے جن سے کہ اس کے ہم وطن گویا دست بردار ہو گئے تھے' اگرچہ حقیقتاً ان کا دعویٰ ابھی تک ان ملکوں پر قائم تھا۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سائلوکس نے 305 ق م میں دریائے سندھ کو عبور کیا اور سکندر کے فاتحانہ راستے پر قدم بقدم چلنے کی کوشش کی۔ اس مہم کی تفصیل معلوم نہیں اور صحت کے ساتھ یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ حملہ آور فوج اگر دریائے گنگ کی وادی میں بڑھی بھی تو کہاں بڑھتی چلی گئی۔ مگر بہرحال جنگ کا نتیجہ یقینی ہے۔

سائلوکس اور چندر اگپتا کے صلح نامے

جنگ میں چندر اگپتا کی فوج کے سامنے حملہ آور فوج نہ ٹھہر سکی اور سائلوکس کو مجبور ہو کے پیچھے ہٹنا پڑا اور نہایت بے عزتی سے صلح کی۔ صرف یہی نہیں کہ اس کو ہندوستان فتح کرنے کے خیال سے قطعاً دست بردار ہونا پڑا بلکہ وہ ایسا مجبور ہوا کہ اس نے چندر اگپتا کو دریائے سندھ کے مغرب میں آریانہ کا ایک بہت بڑا حصہ تفویض کر دیا۔ نسبتاً ہیچ اور ناچیز تحفہ یعنی پانچ ہاتھیوں کے بدلے میں اس نے چندر اگپتا کو پیروپنی سڈی' آریہ اور اراکوسیہ کے علاقے دیدیئے جن کے مستقر حکومت آج کل کابل' ہرات اور قندھار کے نام سے مشہور ہیں۔ گدروسیہ سترا پی (صوبہ) یا کم از کم اس کا مشرقی حصہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس مفوضہ علاقے میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ دونوں بادشاہوں نے شادی کے ذریعے اس اتحاد کو مضبوط کیا' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائلوکس نے اپنی ایک بیٹی اپنے ہندی حریف سے بیاہ دی تھی۔

303ق م

یہ عہد نامہ غالباً 303ق م میں ہوا۔ جونہی اس عہد نامے پر دستخط ہو گئے۔ سائلوکس اپنے دور دراز مسافت پر انٹی گونوس کے مقابلے کے لیے مغرب کی طرف روانہ ہوا اور 301ق م میں اسے اپساس کے مقام پر فرانگیہ کے علاقے میں شکست دی اور اسے قتل کیا۔[1] اپساس دریائے سندھ سے کم از کم 2500 میل کے فاصلے پر ہے' اس لیے اس کوچ میں ایک سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ وقت صرف ہوا ہو گا۔

شمال مغربی سرحد

اس طرح ہندوکش کا سلسلہ کوہ جسے یونانیوں نے کوہ پیروپنی ساس یا ہندی کوہ قاف لکھا ہے جنوب میں چندر اگپتا کے صوبہ ہرات و کابل اور شمال میں سائلوکس کے صوبہ باختر کی سرحد قرار پایا۔ آج سے دو ہزار برس پہلے ہندوستان کے اول شہنشاہ کو وہ "سائنٹیفک سرحد" حاصل ہو گئی تھی جس کے لیے اس کے جانشین انگریز صرف سرد آہیں بھر کے رہ جاتے ہیں اور جسے سولھویں اور سترھویں صدی میں مغل بادشاہ بھی پوری طرح قابو میں نہ رکھ سکے۔

چندر اگپتا کے کارنامے

اٹھارہ برس کے عرصے میں چندر اگپتا نے مقدونی افواج کو پنجاب اور سندھ سے باہر نکالا'

سائلوکس فاتح کو شکست دے کر ذلیل کیا اور اپنے آپ کو بلا شرکت غیرے کم از کم تمام شمالی ہند اور آریانہ کے ایک بڑے حصے کا شہنشاہ بنا لیا۔ یہ ایسے کارنامے ہیں جو اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ دنیا کے عظیم الشان اور سب سے کامیاب بادشاہوں کی صف میں جگہ پائے۔ وہ سلطنت جو چندر اگپتا کی سلطنت کی طرح وسیع ہو اور جس میں مختلف عناصر جمع ہو گئے ہوں کمزور شخص کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔ وہ زبردست ہاتھ جس نے اس سلطنت کو حاصل کیا اس پر حکومت کرنے میں بھی کامیاب ہوا۔ تمام نظم و نسق کا کام نہایت درشتی اور سختی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔[۵]

298ق م

سائلوکس کے واپس جانے کے تقریباً چھ سال بعد چندر اگپتا یا تو تخت سے دست بردار ہو گیا یا مر گیا (298ق-م) اور تخت و سلطنت کو اپنے بیٹے بندوسار کے حوالے کیا' جو "امترگھاٹ" یعنی "دشمنوں کے قاتل" کے نام سے مشہور ہے۔

میگاستھینز

303ق م یا اس کے قریب کے عہد نامے کے بعد سائلوکس نے ایک افسر میگاستھینز کو' جو پہلے سپرٹناس اراکوسیہ کے صوبہ دار کی خدمت میں رہا تھا' اپنا ایلچی بنا کر چندر اگپتا کے دربار میں بھیجا تھا۔ یہ ایلچی ایک مدت تک پاٹلی پتر (یعنی پٹنہ) میں رہا جو سلطنت ہند کا دارالسلطنت تھا اور اپنا فرصت کا وقت اس نے ہندوستان کے جغرافیہ' پیداوار اور نظم و نسق کے متعلق ایک بیش بہاء تالیف میں گزارا۔ یہی تالیف زمانہ حال تک سب سے زیادہ اس مضمون کی مستند کتاب خیال کی جاتی تھی۔ اگرچہ بسا اوقات سنی سنائی باتوں کو لکھ لینے سے اس کو مغالطہ ہوا ہے لیکن باوجود اسکے میگاستھینز ان معاملات کے متعلق جو خود اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے ایک نہایت سچی اور معتبر سند ہے۔ اور چندر اگپتا کے فوجی اور ملکی انتظامات کے متعلق اس کا صاف اور روشن بیان بلا تامل صحیح اور درست مانا جا سکتا ہے۔[۶] اگرچہ اس بیان کے چند اجزاء ہی اب محفوظ رہ گئے ہیں لیکن پھر بھی وہ ایسا مفصل ہے کہ ایک موجودہ زمانے کا پڑھنے والا بعض امور میں چندر اگپتا کے زمانے کے معاملات سے زیادہ تر واقف ہو سکتا ہے بہ نسبت اور ہندی بادشاہوں کے' حتیٰ کہ اکبر کا زمانہ جو ملکہ الزبتھ کا معاصر ہے۔

دارالسلطنت پاٹلی پتر

شہنشاہی دارالسلطنت پاٹلی پتر جس کی بنیاد پانچویں صدی قبل مسیح میں ڈالی گئی تھی دریائے

سون اور گنگا کے سنگم پر پہلے دریا کے شمالی کنارے پر اور دوسرے سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اسی موقع پر اب پٹنہ کا ہندوستانی شہر اور بانکی پور کی یورپین آبادی واقع ہے۔ مگر متعدد صدیاں ہوئیں کہ دریاؤں نے اپنا راستہ بدل دیا ہے اور زمانہ حال میں سنگم دیناپور کی چھاؤنی کے قریب پٹنہ سے تقریباً 12 میل اوپر کی طرف ہوتا ہے۔ یہ قدیم شہر جو اپنے موجودہ جانشین شہر کے نیچے مدفون ہے' اسی کی طرح ایک لمبے اور تنگ مستطیل کی شکل میں آباد تھا اور 9 میل لمبا اور صرف ڈیڑھ میل چوڑا تھا۔ اس کے گرد لکڑی کے شہتیروں سے بنی ہوئی ایک فصیل تھی جس میں 64 دروازے تھے اور اس کے اوپر 571 برج تھے۔ باہر کی طرف سے وہ ایک وسیع اور عمیق خندق کے ذریعے سے محفوظ کیا گیا تھا جو دریائے سون کے پانی سے بھرا جاتا تھا۔ [ے]

شاہی محل

شاہی محل اگرچہ زیادہ تر چوبی تھا مگر اپنی شکوہ و شوکت اور تزک و احتشام کے لحاظ سے سوسہ اور ہمدان کے محلات سے زیادہ شاندار سمجھا جاتا تھا اور اس کے ستونوں اور رواق پر سونے کے پانی پھرا ہوا تھا اور ان پر سونے کی بیلیں اور چاندی کے پرندے منقوش تھے۔ تمام عمارتیں ایک وسیع میدان میں تھیں جس میں کہ مچھلیوں کے تالاب اور انواع و اقسام کے نمائشی درخت اور بیلیں پائی جاتی تھیں۔

شاہی دربار

یہاں شاہی دربار وحشیانہ اور عیش و عشرت کی شان سے نمودار تھا۔ سونے کے آفتابے اور پیالے جن میں سے بعض چھ چھ فٹ چوڑے ہوتے تھے' نہایت ہی عمدہ مرصع میزیں اور شاہانہ کرسیاں' تانبے کے برتن جو جواہرات سے مرصع ہوتے تھے اور زر بفت کے زرق برق لباس ہر طرف نظر آتے تھے اور ان کی وجہ سے عام درباروں کے موقعے پر چہل پہل اور شان و شوکت زیادہ ہو جاتی تھی۔ جب کبھی بادشاہ مہربانی کر کے شاہی جشنوں کے موقع پر اپنی رعایا کے سامنے ظاہر ہوتا تو وہ ایک سونے کی پالکی میں سوار ہوتا۔ جس میں موتیوں کی جھالر لٹکی ہوتی اور خود بادشاہ کا ملبوس خاص نہایت باریک ململ ہوتی جس پر قرمزاور سونے کا کام ہوتا تھا۔ جب کبھی وہ چھوٹے سے سفر پر کہیں جاتا تو گھوڑے پر سوار ہوتا تھا۔ لیکن اگر مسافت ذرا طولانی ہوتی تو وہ آج کل کے راجاؤں کی طرح ہاتھی پر سوار ہوتا جس کا ساز و سامان سونے کا ہوتا تھا۔ [۸] جانوروں کی لڑائیاں آج کل ہندی راجاؤں کے درباروں کی طرح اس وقت بھی تفریح طبع کے لیے مناسب سمجھی جاتی تھیں اور بادشاہ ہمیشہ سانڈوں' مینڈھوں' ہاتھیوں' گینڈوں اور دوسرے جانوروں کی

لڑائیوں کے دیکھنے سے خوش و خرم رہتا تھا۔ دو آدمیوں کے درمیان جنگ بھی اکثر اس کے تفریح طبع کا باعث ہوا کرتی تھی۔ ایک عجیب و غریب سامان تفریح بیلوں کی دوڑ تھی جس کا اب پتا نہیں ملتا۔ اس میں بہت بڑی بڑی شرطیں لگائی جاتی تھیں اور بادشاہ نہایت دلچسپی سے اس کا تماشا دیکھتا۔ دوڑ کے میدان کا طول 30 سٹیڈیا یا 6000 گز ہوتا تھا اور بیلوں کو گاڑیوں میں جوت کر دوڑاتے تھے' اور ان میں سے ہر ایک میں گھوڑے اور بیل جتے ہوتے تھے' اس طرح کہ گھوڑے دو طرفہ اور ان کے بیچ میں بیل ہوتا تھا۔ بیل آج کل بھی ہندوستان کے ہر حصے میں سواری کی گاڑیوں میں جوتے جاتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ دوڑنے والے بیلوں کی نسل بالکل معدوم ہو گئی ہے۔[9]

شکار

بادشاہ کا سب سے بڑا سامان تفریح شکار تھا۔ یہ نہایت تکلف اور نمود سے کیا جاتا تھا۔ ایک گھرے ہوئے میدان میں جانور ایک چبوترے تک لائے جاتے تھے جہاں بادشاہ بیٹھتا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے وہ ان کو مارتا تھا۔ لیکن اگر شکار کھلے میدان میں ہوتا تو بادشاہ ہاتھی پر سوار ہوتا تھا۔ جب وہ شکار کے لیے جاتا تو اس کے ہمرکاب عورتوں کی فوج کا ایک دستہ ہوا کرتا تھا جن کو دوسرے ملکوں سے خرید کرلاتے تھے اور یہ تمام قدیم ہندی راجاؤں کے دربار کا ایک ضروری جزو ہوا کرتی تھیں۔ شاہی گذر کی سڑکوں کے دونوں جانب رسی بندھی ہوتی تھی اور اس کے پار جانے والے کی سزا موت تھی۔[10] شاہی شکار کے دستور کو چندر اگپتا کے پوتے راجا اشوک نے 259 ق م میں موقوف کیا۔

بادشاہ کی عادات

عام طور پر بادشاہ محل میں زیادہ رہتا تھا اور عورتوں کی فوج اس کو گھیرے رہتی تھی۔ محل سے باہر صرف مقدمات کی سماعت یا بھینٹ چڑھانے یا فوج کشی یا شکار کے موقعوں پر نکلا کرتا تھا۔ غالباً اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ کم از کم ہر روز ایک مرتبہ وہ ضرور اپنی رعایا کے سامنے آئے' جو عرائض وہ پیش کریں وہ سنے اور بذات خود ان کے مقدمات کا تصفیہ کرے۔ موجودہ ہندوستانیوں کی طرح چندر اگپتا کو بھی چپی کرانے میں خاص لطف آتا تھا اور دستور یہ تھا کہ جب وہ باہر رعایا میں ظاہر ہو تو ساتھ ساتھ چپی بھی کرا تا جائے۔ جب وہ لوگوں کے مقدمے سنتا تو چار نوکر آبنوس کے تکیوں سے اس کو چپی کرتے جاتے۔[11] ایرانی دستور کے مطابق' جس کا اثر ہندی درباروں اور نظم و نسق پر بہت پڑا تھا' بادشاہ اپنی سالگرہ میں نہایت تزک و احتشام سے اپنے سر

کے بال دھوتا۔ سالگرہ کے موقع پر بڑی بھاری عید منائی جاتی تھی اور اس وقت بڑے بڑے امراء سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ بیش بہاء نذرانے بادشاہ کی خدمت میں گذرانیں گے۔ [12]

سازشیں

اس تمام تزک واحتشام اور شان وشوکت اور ہر قسم کی حفاظت کے باوجود بادشاہ کبھی بھی سازشوں اور بغاوتوں سے بے خوف نہ ہوتا تھا۔ بادشاہ کی زندگی سازشوں کی وجہ سے اس طرح متواتر خطرے میں رہتی تھی کہ وہ دن کے وقت سونے یا دو راتوں کو لگاتار ایک ہی کمرے میں سونے کو اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا۔ [13] ناٹک نویس نے ہمارے سامنے نہایت بین طور پر وہ سین کھینچ دیا ہے کہ کس طرح زیرک اور تیز فہم برہمن مشیر سازشوں اور زہر خورانی کا سراغ لگایا کرتا تھا اور کس طرح ان بہادر لوگوں کی کھوج لگایا کرتا تھا جو "زیر زمین ان راستوں میں چھپے رہتے تھے جو چندر اگپتا کے سونے کے کمرے میں جاتے تھے تاکہ رات کے وقت اس میں داخل ہوں اور سوتے ہوئے اس کو قتل کردیں۔" [14]

فوجی طاقت

فوج میں جس پر چندر اگپتا کی سلطنت اور تخت کا انحصار تھا' تعداد میں بہت زیادہ تھی۔ اس کا نظام تربیت اور اسلحہ ایسے تھے کہ ایشیائی افواج کے لحاظ سے وہ نہایت تکمیل کے درجے کو پہنچ گئی تھی۔ یہ قومی اور رضاکار سپاہیوں کی فوج نہ تھی بلکہ ایک مستقل فوج تھی جس کو نہایت عمدہ اور باقاعدہ تنخواہ ملا کرتی تھی اور سرکار کی طرف سے ہی اس کے لیے گھوڑے' اسلحہ' سامان حرب رسد اور آذوقہ مہیا کیا جاتا تھا۔ [15] مہاپدما نند کی فوج کی تعداد 80000 سوار' 200000 پیادے' 8000 رتھیں اور 6000 لڑنے والے ہاتھی کہی جاتی ہے۔ اس عظیم الشان فوج میں چندر اگپتا نے اور اضافہ کیا۔ پیادوں کی تعداد کو 600000 کردیا اور 30000 سوار' 9000 ہاتھی اور رتھیں اس کے سوا تھیں۔ یہ تمام فوج باقاعدہ طور پر تنخواہ دار عملے میں شامل تھی۔ [16] تمام شاہی فوج میں سے ہاتھی سب سے زیادہ قیمتی سمجھے جاتے تھے کیونکہ جیسا کہ چانکیا لکھتا ہے "دشمنوں کی فوج کی تباہی کا انحصار ان پر ہی تھا۔" [17]

اسلحہ

ہر ایک سوار کے پاس دو نیزے ہوتے تھے جو یونانیوں کے سونیا سے زیادہ مشابہ تھے اور ان کے علاوہ ایک ڈھال ہوتی تھی۔ تمام پیادے سپاہیوں کا اصلی اور حقیقی ہتھیار ایک تلوار ہوتی

تھی۔ مگر اس کے علاوہ یا تو ایک بھالا اور یا تیر کمان بھی اپنے پاس رکھتے تھے۔ کمان کو زمین پر رکھ کر اور بائیں پاؤں سے اس پر دباؤ ڈال کر تیر چلایا جاتا تھا۔ مگر اس تیر کی زد ایسی سخت ہوتی تھی کہ نہ زرہ اور نہ ڈھال اس کو روک سکتے تھے۔[8]

رتھیں اور ہاتھی

ہر ایک رتھ میں جس میں چار یا دو گھوڑے جتے ہوتے تھے ہانکنے والے کے علاوہ دو سپاہیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور ہاتھی پر مہاوت کے سوا تین تیرانداز سوار ہوتے تھے۔[9] اس طرح 9000 ہاتھیوں کا مطلب یہ ہے کہ 36000 آدمی فوج میں اور زیادہ تھے اور کم از کم 8000 رتھوں کے لیے جو مہاپدمانند کے زمانے میں موجود تھیں 24000 آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ اس طرح اگر فوج کی تعداد کو جمع کیا جائے تو 600000 پیادے اور 30000 سوار' 36000 آدمی ہاتھیوں پر اور 24000 رتھوں پر تھے۔ یعنی نوکر چاکر کو چھوڑ کر فوج کی کل تعداد 690000 تھی۔

ہندی فوجوں کی تعداد

یہ عظیم تعداد جو بادی النظر میں بالکل قصہ کہانی معلوم ہوتی ہے اس وقت بالکل قرین قیاس ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زمانہ وسطیٰ میں ہندی راجاؤں کی فوج کی تعداد کس قدر زیادہ ہوا کرتی تھی۔ مثلاً پرتگیزی مورخ' نونیز جو بیجانگر کے راجا کرشن دیو کا سولھویں صدی میں (1509ء سے لے کر 1530ء تک) ہمعصر تھا بیان کرتا ہے کہ اس راجا کے رائچور پر حملہ کرنے کے وقت فوج کی تعداد 703000 پیادے' 32600 سوار اور 551 ہاتھی تھے اور نوکر چاکر ان کے علاوہ۔[10]

جنگ کا محکمہ

یہ فوجی انبوہ کثیر چندر اگپتا کے اشارے پر کام کرتا اور اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اور عظیم الشان تھا۔ اس کے نظام اور نگرانی کے لیے ایک فوجی محکمہ مقرر تھا جس کا انتظام نہایت ہی اعلیٰ پیمانے پر تھا۔ تین ارکین کی ایک مجلس کو چھ پنچایتوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر ایک پنچایت کے سپرد بہ تفصیل ذیل ایک محکمہ تھا۔ پہلی پنچایت۔ امیرالبحر کی ہمراہی میں' بحری جنگ کے معاملات۔ دوسری پنچایت' بار برداری' سامان رسد اور فوجی خدمات جس میں طبلچیوں' سائیسوں' گھسیاروں اور دیگر کاریگروں کا مہیا کرنا بھی شامل تھا۔ تیسری پنچایت' پیادہ فوج۔ چوتھی پنچایت' سوار فوج۔ پانچویں پنچایت' جنگی رتھیں۔ چھٹی پنچایت' ہاتھی۔

فوج کی ترکیب و ترتیب

نہایت قدیم زمانے سے تمام ہندی فوجوں کو عام طور پر چار حصوں یعنی سوار' پیادے' ہاتھی اور رتھوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور طبعی طور پر فوج کا ہر حصہ ایک جداگانہ افسر کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ مگر اس نظام میں رسد اور امیرالبحر کے محکمے کا اضافہ چندرا گپتا کی جدت طبع معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ فوجی نظام جس طرح بظاہر مکمل تھا اسی طرح جنگ کے موقعے پر ضرور کامل ثابت ہوتا ہوگا۔ کیونکہ اسی کے بل بوتے نہ صرف اس نے بقول پلوٹارک "تمام ہندوستان کو مفتوح و مغلوب کیا" بلکہ مقدونی افواج کو نکال دیا اور سائکوکس کے حملے کو روکا۔

ملکی انتظام

چندرا گپتا کی سلطنت کے اندرونی اور ملکی انتظامات کے متعلق جتنی تفصیلیں ہم کو پہنچی ہیں اگرچہ وہ اتنی وسیع تو نہیں جتنی کہ چاہییں تھیں مگر بہرحال اس قدر ہیں کہ ہم ان کے ذریعے سے اس کے زمانے کے سلسلہ حکومت کو کافی طور پر سمجھ سکیں۔ یہ نظام حکومت اگرچہ اس کا انحصار تمام تر بادشاہ کی خودمختاری پر ہی تھا' مگر ظلم و جور کی بے قاعدہ سلطنت سے پھر بھی کہیں بہتر تھا۔

مجلس بلدیہ

دارالسلطنت یعنی پاٹلی پتر کے نظم و نسق کے لیے مجلس بلدیہ مقرر تھی جس میں تیس آدمی شامل تھے اور محکمہ جنگ کی طرح اس کو بھی چھ پنچایتوں یا کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ پنچایتیں دراصل عام پنچایتوں کی ایک سرکاری صورت تھی جن کے ذریعے سے نہایت قدیم زمانے سے ہندوستان کی مختلف ذاتیں اور پیشہ ور اپنے باہمی قضیوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔

صنعت و حرفت

بلدیہ کی پہلی پنچایت کے ذمے صنعت و حرفت کے متعلق تمام معاملات کی نگرانی تھی اور غالباً مزدوری کی شرح کا تعین بھی اسی کے ہاتھ میں تھا اور شاید یہ ہروقت اس امر کے لیے تیار رہتی ہو کہ کاریگروں کو مجبور کرے کہ عمدہ اور خالص چیز استعمال کریں اور حکومت نے جتنی مزدوری ان کے لیے مقرر کر دی ہو اتنا ہی کام تمام دن میں انجام دیں۔ صناع اور کاریگروں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ خاص طور سے شاہی ملازم ہیں اور اگر کوئی شخص کسی صناع کے ہاتھ یا آنکھ کو گزند پہنچا کر اس کی کارگزاری کو کم کر دیتا تو اس کی سزا موت ہوا کرتی تھی۔

بیرونی ممالک کے لوگ

بلدیہ کی دوسری پنچایت کے اختیار میں غیر ممالک کے رہنے والوں اور مسافروں کے معاملات تھے اور وہ وہی فرائض ادا کرتے تھے جو آج کل موجودہ یورپ میں دول خارجہ کے قونصل ادا کرتے ہیں۔ تمام اجنبیوں کو سرکاری افسر اپنی نگاہوں میں رکھتے تھے اور ان کے لیے ان کے حسب حیثیت مکانات بدرقہ اور ضرورت کے وقت طبی امداد بہم پہنچاتے تھے۔ جو اجنبی مرجاتے ان کی تجہیز و تکفین معقول طور پر کی جاتی۔ ان کی جائدادوں کا انتظام اسی پنچایت کے اراکین کرتے اور ان کا منافع ان کے وارثوں کو بھیجتے رہتے۔ [1] ان تمام کامل انتظامات کا وجود ہی اس بات کا نہایت بین ثبوت ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں ہی ہندوستان کی موریا کے رہنے والوں کے تعلقات بیرونی سلطنتوں کے ساتھ قائم تھے اور کاروبار کے لیے غیر ممالک کے رہنے والوں کی ایک بڑی تعداد دارالسلطنت میں آتی جاتی رہتی تھی۔

اعداد ممات وحیات

تیسری پنچایت کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ اموات اور پیدائش کا باقاعدہ طور پر اندراج کرتی رہے۔ اور ہم کو صاف بتلایا گیا ہے کہ یہ اندراج اول تو حکومت کو اعداد سے باخبر رکھنے کے لیے اور دوسرے محاصل کے عائد کرنے میں آسانی کے لیے ہوا کرتا تھا۔ یہ محصول جس کا ذکر کیا گیا ہے کچھ رقم فی کس کے حساب سے سالانہ وصول کیا جاتا تھا۔ چندرا گپتا کے تمام قوانین میں ایسے شخص کے لیے جو عام ایشیائی حکومتوں کی بے ضابطگی سے واقف ہو کوئی چیز اس سے زیادہ قابل تعجب و حیرت نہیں ہوتی جتنا کہ یہ اموات اور پیدائش کا باقاعدہ اندارج۔ موجودہ زمانے کی ہندوستانی ریاستوں میں آج کل ایسا ہونا بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بخود اس قسم کی کسی تجویز پر عمل کریں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ ایک پرانی وضع کے راجا کے متعلق یہ خیال کیا جائے کہ اس کو یہ احساس پیدا ہوگا کہ وضیع و شریف ہردو قسم کے لوگوں کی اموات و پیدائش کا حال کسی طرح پوشیدہ نہ رہ جائے۔" یہاں تک کہ انگریزی حکومت نے بھی اپنے پیچیدہ نظام حکومت اور اعداد و شمار کی قدر و قیمت کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے کی زمانہ حال سے پہلے کبھی کوشش نہیں کی اور اب بھی برابر اسے صحیح اعداد بہم پہنچانے میں دقت پیش آتی ہے۔

تجارت

چوتھی پنچایت کے ہاتھ میں تجارت اور بیوپار کے اہم معاملات تھے۔ یہ لوگ خرید

وفروخت کا انتظام اور بندوبست کرتے تھے اور باضابطہ مہر کیے ہوئے اوزان اور پیمانوں کے استعمال پر لوگوں کو مجبور کرتے تھے۔ سوداگر اجازت نامہ کے لیے ایک محصول ادا کرتے تھے، اور وہ سوداگر جو ایک سے زیادہ اشیاء کا بیوپار کرتا تھا دوگنا محصول ادا کیا کرتا تھا۔

دست کاری

پانچویں پنچایت دست کاری کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ ایک عجیب وغریب قانون کی رو سے پرانے اور نئے مال کو جدا جدا رکھنا پڑتا تھا اور اس قاعدے کی خلاف ورزی کرنے والا سزا کا مستوجب تھا۔ اس قانون کی اصل یہ وجہ تھی کہ پرانے مال کا لین دین خواہ خرید وفروخت کے لیے ہو اور خواہ رہن رکھنے کے لیے ممنوع تھا۔ تاوقتیکہ اس کے لیے حکومت سے اجازت نہ حاصل کرلی جائے اور یہ اجازت چند شرطوں سے دی جاتی تھی۔ [۲۲]

فروخت پر محصول

چھٹی پنچایت کا کام یہ تھا کہ فروخت شدہ اسباب کی قیمت سے ایک برائے نام حصہ محصول کے طور پر وصول کرنے اور اس محصول کی ادائیگی سے چشم پوشی کی سزا بھی موت ہوا کرتی تھی۔ فروخت شدہ اشیاء پر اس قسم کے محصول کا رواج عام طور پر ہندوستان میں رہا ہے۔ مگر شاذ ونادر ہی اس کو اس سخت وسنگین سزا کا مستوجب سمجھا گیا تھا جیسا کہ چندر گپتا کے زمانے میں۔

شہروں کا عام انتظام

ہم تک صرف پاٹلی پتر یعنی دارالسلطنت کے انتظام کی تفاصیل پہنچی ہیں۔ مگر ان سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سلطنت کے اور بڑے شہروں یعنی اجین، ٹیکسلا وغیرہ کا بھی اسی اصول سے انتظام ہوتا ہوگا۔ راجا اشوک کے "صوبوں کے نام فرمان" میں کلنگ کے صوبے کے شہر توسل کے ان افسروں کو مخاطب کیا گیا ہے جو اس کے انتظام کے مجاز تھے۔ [۲۳]

ان جدا جدا محکموں کے فرائض کے علاوہ جن کی تفصیل اوپر دی گئی، مجلس بلدیہ کے ارا کین کا یہ بھی فرض تھا کہ بہ ہیئت مجموعی شہر کے معاملات کی نگرانی کریں اور بازاروں، مندروں، بندرگاہوں اور عام طور پر تمام عمارت ہائے عامہ کی تنظیم وترتیب اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ [۲۴]

نائبین سلطنت

دوردراز صوبوں کی حکومت نائبین سلطنت کے سپرد کی جاتی تھی جو عموماً شاہی خاندان کے

افراد ہوا کرتے تھے۔ نائبین سلطنت کے متعلق ہماری معلومات راجا اشوک کے زمانے میں چندر اگپتا کے زمانے کی نسبت زیادہ ہے۔ اس لیے اس کے زمانہ حکومت کے نظم و نسق کا ذکر کرتے وقت ہم پھر اس مضمون کی طرف رجوع کریں گے۔

وقائع نویس

تمام ایشیائی سلطنتوں کے عام طرز عمل کے مطابق شاہی دربار دور دراز مقامات کے حکام پر خاص لوگوں یعنی وقائع نویسوں کے ذریعے اپنی نگرانی قائم رکھتا تھا جن کو یونانی مصنفین نے منتظم اور مہتمم لکھا ہے اور ان کا ذکر اشوک کے فرامین میں شاہی "ملازمین" (یعنی پلسائی' ستون کا فرمان نمبر6) یا "اخبار نویس" کے نام سے کیا گیا ہے۔ (پٹی ویدکا' سنگی فرمان نمبر6)۔ ان افسروں کا کام یہ تھا کہ شہر اور دیہات کے واقعات پر نظر رکھیں اور خفیہ طور پر ان کی خبر صدر حکومت کو دیتے رہیں۔ ایرین کا بیان ہے کہ ایسے افسر ہندوستان میں خود مختار اقوام کی حکومتیں اور شاہی حکومتیں دونوں مقرر کیا کرتی تھیں۔ یہ حکومتیں اس بات میں بھی کسر نہ کرتی تھیں کہ چھاؤنی یا بازار کی فاحشہ عورتوں کو ان وقائع نویسوں کے شریک کے طور پر استعمال کریں اور یقیناً یہ عورتیں اکثر اپنے افسران بالا کے پاس بہت سے خفیہ بازاری چہ میگوئیوں کے حالات پہنچاتی ہونگی۔[۲۵] ایرین کے خبر رساں نے اس کو یقین دلایا تھا کہ یہ خبریں جو بھیجی جاتی تھیں ہر حال میں درست ہوتی تھیں۔ مگر اس بیان کی صحت کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش ہے' باوجود اس امر کے کہ قدیم ہندوستان کی اقوام اپنی راست گوئی اور دیانت داری میں نزدیک و دور کے تمام ممالک میں عام شہرت رکھتی تھیں۔[۲۶]

ضابطہ تعزیرات

عوام الناس کی عام ایمان داری اور دیانت داری اور قانون جرائم کے عمل کا ثبوت میگا ستھینز کے اس بیان سے ملتا ہے کہ جب وہ چندر اگپتا کے کیمپ میں' جس میں کہ 400000 آدمی جمع تھے' رہتا تھا تو روزانہ چوری کی مقدار دو سو درم یا تقریباً آٹھ انگریزی پاؤنڈ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ مگر جب کبھی کوئی جرم واقع ہوتا تو اس کی سزا بہت سخت دی جاتی تھی۔ قطع عضو کے خفیف زخم دینے کی سزا میں مجرم کو بھی ویسا ہی زخم لگایا جاتا تھا اور اس کے علاوہ اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جاتا تھا۔ اگر زخمی کوئی کاریگر ہوتا جو شاہی ملازم ہوتو اس جرم کی سزا موت ہوا کرتی تھی۔ جھوٹی گواہی دینے کے جرم کی سزا ہاتھ اور پاؤں کا قطع کرنا تھی اور چند جرموں کی سزا یہ دی جاتی تھی کہ مجرم کے سر کے بال کٹوا دیئے جاتے تھے اور یہ سزا اور تمام سزاؤں میں سب سے زیادہ

شرمناک سمجھی جاتی تھی۔[27] کسی متبرک درخت کو گزند پہنچانا،[28] فروخت شدہ مال پر بلدیہ کے محصول سے گریز کرنا اور شاہی جلوس میں (جبکہ وہ شکار کے لیے جا رہا ہو) دخل دینا' یہ سب ایسے جرائم تھے جن کی سزا موت تھی۔ درشتی اور سختی کی ان بیان کی ہوئی مثالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قانون تعزیرات بہ ہیئت مجموعی نہایت سخت اور ظالمانہ ہوگا اور انسانی زندگی کی اس میں کچھ زیادہ پروا نہ کی جاتی ہوگی۔

محصول اراضی

ہندوستان کے دیسی قانون کی رو سے ہمیشہ تمام مزروعہ زمین بادشاہی ملک قرار دی گئی ہے اور بادشاہ کا یہ حق تسلیم کرلیا گیا کہ اس سے لگان یا محصول وصول کرے جو اس کی پیداوار کی قیمت کا ایک معتدبہ حصہ ہوتا تھا۔[29] انگریزی قانون بھی جو عام قدیم دستور کے برعکس مزروعہ اراضی میں حق مالکانہ تسلیم کرتا ہے' اس بات پر مصر ہے کہ محصول اراضی کی ادائیگی نہایت ضروری ہے اور وہ اپنے افسروں کو اس کے نہ ادا ہونے کی صورت میں یہ اختیار دیتا ہے کہ زمین کو فروخت کرکے وصول کرلیا جائے۔ اس وقت بھی محاصل زمین ہندوستانی مالیہ کا سب سے بڑا جزو ہے اور یہی حال یقیناً چندراگپتا کے زمانے میں ہوگا۔ اس کے زمانے میں بندوبست اراضی کی تفصیل ہم تک نہیں پہنچی اور ہم کو یہ معلوم نہیں کہ آیا ہر سال نیا بندوبست ہوا کرتا یا اس سے زیادہ مدت میں برائے نام تمام پیداوار کا چوتھائی حصہ سرکار محصول کے طور پر جمع کیا کرتی تھی۔ مگر عملی طور پر بلاشک وشبہ اس نسبت میں کمی وبیشی ہوتی رہتی تھی' جیسے کہ آج تک کے زمانے میں بھی ہوتی ہے۔ اور یہ ناممکن تھا کہ تمام صوبوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ اس کے علاوہ چند اور غیر مصرحہ ابواب بھی وصول کیے جاتے تھے۔ چونکہ فوج میں سپاہی پیشہ نوکر رکھے جاتے تھے اور ان کو جنگجو اقوام سے منتخب کیا جاتا تھا اس لیے کاشتکار فوجی خدمت سے بالکل مستثنیٰ تھے' اور میگاستھینز نہایت تعجب اور حیرت سے یہ بیان کرتا ہے کہ عین اس وقت جب کہ دو حریف بادشاہوں کی فوجوں میں مقابلہ ہو رہا ہو کاشتکار نہایت اطمینان اور امن کے ساتھ اپنا کام کرتا رہتا تھا۔[30]

آبپاشی

ہندوستان میں آبپاشی کا مناسب انتظام ایک نہایت ہی اہم امر ہے اور اس بات سے چندراگپتا کی سلطنت کی خوبی معلوم ہوتی ہے کہ اس نے ایک خاص محکمہ آبپاشی قائم کیا جس کا یہ فرض تھا کہ زمینوں کی پیمائش کرے اور پانی کی نالیوں کا ایسا انتظام کرے کہ ہر ایک شخص کو حصہ

رسدی معتدبہ مقدار پانی کی مل سکے۔ اراضی کی پیمائش کی طرف سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ پانی کا محصول ضرور لگایا جاتا ہوگا اور نالیوں کے ذکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آبپاشی کا انتظام بالکل باقاعدہ تھا۔[۱۲۹]

سندرسن جھیل

ستر پ رردرامن کے کتبے سے جو 150ء میں کاٹھیاواڑ کے مقام گرنار کی اس مشہور و معروف چٹان پر کندہ کیا گیا جس پر چار صدی قبل راجا اشوک نے اپنے فرمان کو کندہ کرایا تھا جو ہمیشہ برقرار رہے گا' یہ صاف اور صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کو اپنے دور و دراز صوبوں کی آبپاشی کا بھی کتنا خیال تھا۔ اگرچہ گرنار بحیرۂ عرب کے پاس موریا سلطنت کے مستقر سے تقریباً 1000 میل کے فاصلے پر واقع ہے مگر وہاں کے کاشتکاروں کی ضرورتیں بھی شہنشاہ کی آنکھ سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ پشی گپتا نے جو چندراگپتا کی حکومت کی طرف سے مغربی صوبوں کا عامل تھا' دیکھا کہ ایک چھوٹی سی ندی کو روک لینے سے آبپاشی کے لیے ایک نہایت عمدہ تالاب بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک جھیل سندرسن (یعنی خوبصورت) نامی قلعے کی مشرقی جانب ایک پہاڑی اور اس کے آگے "کتبے کی چٹان" تک مشرقی زمین لے کر تیار کی۔ مگر اس سے سوا اور ضروری نالیاں بنانے میں وہ کامیاب نہ ہوا۔ یہ چندراگپتا کے پوتے راجا اشوک کے زمانے میں اس کے نائب راجا تشاسف ایرانی کی زیرِ نگرانی تیار ہوئیں جو اس وقت وہاں کا گورنر تھا۔ یہ سودمند تعمیر جو موریا بادشاہوں کے عہد حکومت میں تیار ہوئی تھی چار سو برس تک کام دیتی رہی لیکن 150ء کے ایک طوفان نے (جو غیر معمولی طور پر نہایت شدید تھا) اس کے بند کو توڑ دیا اور ساتھ ہی اس جھیل کو بھی فنا کر دیا۔

بند کی از سرِ نو تعمیر

بند نئے سرے سے "سہ چند استحکام" کے ساتھ قوم شک کے ستر پ رردرامن کے حکم سے تعمیر کیا گیا اور اس نے اس کی تاریخ ایک پتھر پر کندہ کرادی جو اپنی وضع میں اس وجہ سے نادر و بے نظیر ہے کہ یہی کتبہ ہے جس میں چندراگپتا اور اشوک دونوں کے نام پائے جاتے ہیں۔ مگر باوجود رردرامن کی تعمیر کی سہ چند مضبوطی کے بند عناصر کی شدت کا مقابلہ نہ کر سکا اور وہ پھر برباد ہوا۔ 258ء میں سکند گپت کے زمانے میں وہاں کے گورنر نے پھر اس کی مرمت کی۔ ایک غیر معلوم وقت میں یہ تعمیریں بالکل منہدم ہو گئیں اور یہ جھیل آخر کار معدوم ہو گئی۔ اس کا موقعہ جو نہایت گھنے جنگل میں واقع ہے اس طرح لوگوں کے دلوں سے محو ہو گیا تھا کہ موجودہ محققین کو اس

کی اصلی جگہ کے پتہ لگانے میں دقت ہوئی۔

شاہی فکر و احتیاط

یہ امر کہ سلطنت کے ایک ایسے دور و دراز صوبے میں آبپاشی کے کام پر اتنا روپیہ اور محنت صرف کی گئی صاف ظاہر کرتا ہے کہ موریا خاندان کے بادشاہ کھیتوں کے لیے پانی کا بہم پہنچانا اپنا ایک اہم فرض تصور کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی یہ ایک نہایت صریح مثال ہے میگاستھنیز کے اس بیان کی صحت کی کہ شاہی عمال "جیسا کہ مصر میں دستور تھا یہاں بھی زمین کی پیمائش کرتے اور ان راجباہوں کی نگہداشت کرتے ہیں جن کے ذریعے سے چھوٹی نالیوں میں پانی تقسیم کیا جاتا تھا تاکہ ہر شخص اپنا حصہ اس میں سے لے لے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔ [۳۲]

کڑی نگرانی

مرکزی حکومت مقامی عمال کے ذریعے سے تمام چیزوں کی نہایت سخت نگرانی کرتی تھی اور اس کی ایسی ہی نگرانی آبادی کی تمام جماعتوں اور ذاتوں پر قائم تھی۔ یہاں تک کہ برہمن، منجم اور جوتشی اور قربان گاہ کے مذہبی پیشوا، (جن کو میگاستھنیز غلطی سے فلسفیوں [۳۳] کی ایک علیحدہ جماعت قرار دیتا ہے)، اس سرکاری نگہداشت سے نہ بچ سکتے تھے اور ان کو ان کی پیش گوئیوں کے صحیح یا غلط ہونے کے مطابق یا تو انعام و اکرام ملتا تھا یا ان کو سزا دی جاتی تھی۔ کاریگروں اور صناعوں کے طبقے میں اسلحہ سازوں اور جہاز سازوں کو سرکار کی طرف سے تنخواہ ملتی تھی اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان کو سوائے سرکار کے اور کسی کے کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لکڑی کاٹنے والے، نجار، لوہار اور کان کن بعض خاص قواعد و ضوابط کے پابند تھے۔ مگر ان قواعد کی نوعیت کا ذکر ہم تک نہیں پہنچا۔

سواری کے قواعد

سٹریبو کے بیان کے مطابق ہر کس و ناکس مجاز نہ تھا کہ گھوڑا یا ہاتھی رکھے۔ ان کا رکھنا صرف بادشاہوں کا منصب سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس بیان کا اطلاق اگر تمام ملک پر کیا جائے تو بلاشک و شبہ یہ غلط ہے اور راریین (انڈیکا 17) کے تفصیلی اور قابل فہم بیان سے اس کی صحت ہوتی ہے۔ یہ مصنف بیان کرتا ہے کہ عام طور پر سواری کے لیے گھوڑے، اونٹ، گدھے اور ہاتھی استعمال ہوتے تھے۔ ان میں سے ہاتھی صرف امیر اور دولتمند لوگ کام میں لاتے تھے اور وہ خاص طور پر بادشاہوں کی خدمت کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ گدھوں کی سواری جن کو کہ آج کل نہایت

حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جن کا استعمال کمہاروں اور دھوبیوں کی باربرداری کے جانوروں تک رہ گیا ہے' سٹریبو کا بیان موجودہ ہندوستان کی حالت کے عین مطابق ہے۔[۴۴] وہ کہتا ہے کہ ہاتھی یا اونٹ پر سوار ہونا یا چار گھوڑوں کی رتھ کو استعمال کرنا اعلیٰ رتبے کا نشان تھا۔ لیکن ہر شخص مجاز تھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو یا اسے رتھ میں جوتے۔[۴۵] یکہ جو آج کل بھی شمالی ہند میں بکثرت استعمال ہوتا ہے' ہندوستان کی ایک نہایت قدیم سواری ہے۔

سڑکیں

سڑکوں کا انتظام ایک خاص محکمے کے افسران کے ہاتھ تھا۔ 10 سٹیڈیا یعنی ہندوستانی حساب سے آدھ کوس اور انگریزی حساب سے 22.5 گز کے فاصلے پر ستون تعمیر کیے گئے تھے تاکہ وہ فاصلے کی علامت اور نشان کا کام دے سکیں۔ اس طرح شاہان مغلیہ کے زمانے سے جنہوں نے ہر کوس پر ایک ستون قائم کرایا تھا اس زمانے میں ان مفید علامات کا انتظام بہتر تھا۔ ایک شاہراہ جو مسافت میں 10000 سٹیڈیا تھی' شمال مغربی سرحد کو دارالسلطنت سے ملاتی تھی۔[۴۶]

تہذیب کا نہایت بلند معیار

مذکورہ بالا ملکی اور فوجی نظام حکومت سے جو چندر اگپتا کے زمانے میں قائم تھا' یہ بات بالکل صاف ظاہر ہوتی ہے کہ سکندر اعظم کے زمانے میں شمالی ہند تہذیب کے بلند مرتبے پر پہنچ چکا تھا اور یہ تہذیب یقیناً چند گذشتہ صدیوں کے ارتقاء کے بعد ہی پیدا ہوئی ہو گی۔ بدقسمتی سے اب تک کوئی ایسی یادگار دریافت نہیں ہوئی جو کامل یقین کے ساتھ چندر اگپتا یا اسکے بیٹے کے زمانے کی کہی جاسکے' اور اسی وجہ سے آثار قدیمہ کے ماہر اب تک کوئی ایسی بین شہادت نہ پیش کر سکے جو یونانی مصنفین کے بیان کو ثابت کرتی ہو۔ ہندوستانی عمارتیں اور فنون لطیفہ کی سب سے قدیم مثالیں سوائے چند غیر ضروری مستثنیٰ اشیاء کے اشوک ہی کے زمانے کی ہیں۔ لیکن اگر پاٹلی پتر' ویشالی' ٹیکسلا اور دوسرے قدیم اور مشہور مقامات کھودے گئے اور ان کی تفتیش و تحقیق کماحقہ کی گئی تو یہ ممکن ہے کہ موریا خاندان کے اوائل اور اس سے بھی قدیم زمانے کے آثار ظاہر ہو جائیں۔ یہ بات ممکن نہیں کہ کسی عمارت کے ایسے کھنڈر پائے جائیں جسے پہچان سکیں کیونکہ موجودہ برما کی طرح ہند قدیم کی بڑی بڑی عمارتیں عام طور پر لکڑی کی بنی ہوئی ہوتی تھیں اور اینٹ کو صرف بنیاد رکھنے اور ستون کے نیچے کے حصے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اشوک کے زمانے سے پہلے کی کسی پتھر کی بنی ہوئی عمارت کے نشان اب تک دریافت نہیں ہوئے۔ چندر اگپتا کے زمانے سے بہت پہلے فن تحریر ~~تہذیب~~ کی بعض جماعتوں میں عام طور پر رائج ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں یونانی

مصنفین کی تحریروں کے مطابق درختوں کی چھال اور روئی کے کپڑے کو کاغذ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ [7] لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ اس کے زمانے کا کوئی کتبہ اس وقت تک دریافت نہیں ہوا جو زیادہ پائیدار چیز پر کندہ کیا گیا ہو۔ مگر غالباً پتھر یا دھات پر کندہ کیے ہوئے کتبے موجود ہیں اور ممکن ہے کہ جب کبھی اصلی قدیم جگہوں کو کھودا گیا اور ان کی تحقیق کی گئی تو وہ دریافت ہوں۔

چانکیا کا "سیاست نامہ"

چندر اگپتا موریا کے دربار میں ملکی اور فوجی انتظام کے متعلق تمام مواد یونانی اسناد سے اخذ کیا جاتا تھا اور اس مواد کی 1904ء میں' جب اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا' صحت یا عدم صحت کی جانچ کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مگر اس دوران میں ایک ہندوستانی عالم نے ترجے کے ذریعے سے ایک کتاب سیاست نامہ کو (جس کا مصنف چانکیا یا کوتلیا چندر اگپتا کا زیرک اور تیز فہم وزیر کہا جاتا ہے) دنیا سے روشناس کرا دیا ہے۔ جرمن علماء کی تحقیق نے اس بات کو قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ارتھ شاستر یقیناً موریا خاندان کے زمانے کی ایک مصدقہ کتاب ہے۔ یہ بات کہ آیا یہ کتاب چانکیا ہی کی لکھی ہوئی ہے یا نہیں' کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ کتاب ان اصولوں پر بحث کرتی ہے کہ جو سیاست مدن کے متعلق مصنف کے زمانے میں رائج تھے اور جن کے ذریعے سے اس کے زمانے کی پالیسی ایسی کامیاب ہوئی تھی۔ یہ ایک نہایت ہی بیش قیمت اور دلچسپ چیز ہے اور "یہ ہندوستان قدیم کی حالت' خصوصاً اس کے انتظام' قوانین' تجارت' جنگ اور صلح کے متعلق اتنی روشنی ڈالتی ہے کہ جتنی اور کوئی کتاب نہیں ڈال سکتی۔" یہ کتاب اس طرح بھی استعمال کی جا سکتی ہے کہ ہم اس کو یونانی مصنفین کی باتوں کی شرح یا تفصیل سمجھیں۔ چند تفاصیل کے متعلق اس کی تھوڑی سی عبارتوں کا حوالہ پہلے بھی حاشیوں میں دیا جا چکا ہے۔ مگر اس کے مضامین کا ایک تفصیلی بیان لابدی اور ضروری ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو گا کہ اب یونانی مصنفین کے بیانات کے علم پر اس کے ذریعے سے بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

ارتھ شاستر میں خاندان موریا سے قبل کے حالات درج ہیں

ارتھ شاستر کے قواعد و ضوابط اور یونانی مصنفین کے بیانات کو آپس میں ایک دوسرے سے ملانا نہ چاہیے' کیونکہ یہ صرف اس اثر کا تذکرہ کرتے ہیں جو ایک اجنبی کے دل پر ان قواعد و ضوابط نے کیا جو ایک خاص وقت یعنی غالباً 300 ق م میں ہندوستان میں موریا خاندان کے عہد میں موجود تھے۔ اس کے برخلاف ارتھ شاستر میں ان قواعد کا ذکر ہے جن کو برہمن وزراء اچھا سمجھتے ... مفید

اور سودمند ثابت ہوسکتے ہیں۔ ارتھ شاستر دیگر قدیم مصنفین کے اقوال بھی نقل کرتا ہے جن کی قدامت کے متعلق ہم کو کچھ بھی معلوم نہیں اور اس میں ہندوستان کی اس وقت کی سیاسی حالت درج ہے جو ایک عظیم طاقت یعنی موریا[8] خاندان کے قیام سے پہلے تھی۔ اس کو ہم ایک نہایت ہی مستند کتاب ہندوستان کی سیاسی اور معاشی حالت کے متعلق سکندر اعظم یعنی 325 ق م کے زمانے کی تسلیم کرسکتے ہیں۔ اس کتاب کا جنوبی ہند کی دراوڑ سلطنتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا نظام حکومت بالکل جداگانہ تھا۔

خود مختار حکومت میں برہمنوں کا ادب ملحوظ رکھا جاتا تھا

کتاب میں جس قسم کی حکوت کا ذکر ہے وہ شاہانہ خود مختاری حکومت ہے۔ پچھوی یا دیگر اقوام کے جمہوری نظام حکومت کے صرف سرسری طور پر حوالے ہی دیے گئے ہیں۔ خود مختار بادشاہ کی مرضی جو کسی دستوری حکومت کی روایتوں یا آئین کی رو سے محدود نہ تھی' ایک حد تک رسم و رواج کے لحاظ سے برہمنوں کے ادب کی وجہ سے دبی رہتی تھی۔ یہ ادب اس زمانے سے بہت پہلے پورے طور پر اپنا سکہ جما چکا تھا۔ عام طور پر برہمن سزائے موت یا اور سنگین سزاؤں سے بالکل مستثنیٰ تھے۔ اس قاعدے سے صرف وہ برہمن مستثنیٰ تھے جن پر بادشاہ سے بغاوت کا الزام لگایا گیا ہو۔ ان کو یہ سزا دی جاتی تھی کہ وہ پانی میں غرق کرکے مار ڈالے جاتے تھے اور دوسری ذاتوں کے لوگوں کی طرح اس جرم میں ان کو زندہ نہ جلوایا جاتا تھا'[9] اور چند جرائم میں ماخوذ برہمنوں کے چہرے پر گرم لوہے سے داغ لگادیا جاتا تھا۔ اس کے بعد یا تو ان کو جلاوطن کردیا جاتا یا وہ کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیے جاتے تھے۔ برہمن اور تارک الدنیا سادھو اقبال جرم کے لیے بھی عذاب و عقاب برداشت کرنے سے مستثنیٰ تھے۔[10]

کتاب کے قواعد صرف چھوٹی سی سلطنت کے لیے ہیں

مصنف شروع میں ہی یہ فرض کرلیتا ہے کہ وہ اصول جن کی اس نے تشریح کی ہے محض ایک چھوٹی سے سلطنت میں کام آئیں گے جو اپنے ہی مثل چھوٹی چھوٹی سلطنتوں سے گھری ہوئی ہو اور یہ سب آپس میں یا تو کھلم کھلا یا خفیہ ایک دوسرے سے برسرنزاع و پرخاش ہوں۔ اس کتاب کے قواعد و ضوابط بلاشک و شبہ ایک وسیع اور مستحکم سلطنت کی ضروریات بھی مہیا کرتے ہیں۔ اور یہ تو بالکل صریح ہے کہ کتاب اس وقت کی حالت سے بحث کرتی ہے جو موریا خاندان کے ہندوستان میں استحکام و استقلال سے پہلے کی تھی۔

تمام سلطنتیں حقیقی یا انتظامی طور پر ایک دوسرے کی دشمن ہوتی ہیں

ہمسایہ سلطنتوں میں دائمی امن و صلح ناممکن تسلیم کی گئی ہے اور یہ تعلیم دی گئی ہے کہ

"جو زیادہ طاقتور ہو دوسرے پر فوج کشی کرے [۴۱] اور جس کی طاقت رفتہ رفتہ زیادہ ہو رہی ہو وہ بلاپس و پیش صلح کے معاہدے کو توڑ دے۔ [۴۲]

کوئی بادشاہ جو فاتح کی سلطنت کی سرحد کے قریب قریب واقع ہو اس کا دشمن ہوتا ہے۔" [۴۳]

جب مساوی طاقت کا بادشاہ صلح کو پسند نہ کرے تو اس کے حریف جس کو اس نے تکلیف دی ہو بدلے میں اسی قدر تکلیف اس کو بھی پہنچانی چاہیے۔ کیونکہ طاقت کے وجود اور استعمال ہی سے دو بادشاہوں میں صلح اور امن قائم رکھی جاسکتی ہے۔ کبھی کوئی لوہا جو گرم کرکے پہلے سرخ نہ کر لیا گیا ہو' دوسرے لوہے کے ساتھ ضم نہیں ہوا کرتا۔ [۴۴]

سیاست مدن میں اخلاق کوئی چیز نہیں

اس حالت کا نتیجہ یہ تھا کہ موریا سلطنت کے استحکام اور قیام سے پہلے سلطنتوں کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہتے تھے اور ان میں تنازع للبقاء ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ زبردست کا بول بالا رہا کرتا تھا۔ کوئی بادشاہ کسی دوسرے حکمران پر ایک لمحے کے لیے بھی بھروسہ نہ کر سکتا تھا اور نہ پرانے وعدوں کو توڑنے میں تامل کرتا تھا' بشرطیکہ وہ یہ محسوس کرلے کہ وہ ان کو توڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ کسی قسم کے اخلاق و تہذیب کے خیالات کو سیاست میں جگہ نہ دی جاتی تھی اور اس میں بالکل کھلم کھلا عیاری اور دغابازی (جس میں چھپ کر قتل کرنا بھی شامل تھا) کے وسائل و ذرائع اختیار کیے جاتے تھے۔ یہ اصول کہ عوام کے معائب بادشاہوں کے محاسن ہوتے ہیں' صریحاً جاری وساری تھا اور تاریخ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر متواتر عمل بھی کیا جاتا تھا۔ سازش اور منصوبہ سازی میں مہارت اور دسترس بادشاہت کے لیے طاقت یا حزم سے زیادہ قابلیت متصور ہوتی تھی۔ [۴۵]

عام حالت شک اور جاسوسی

جس طرح دور راجاؤں کے تعلقات گہرے اور عام شکوک پر مبنی ہوتے تھے' اس طرح ہر ایک بادشاہ اپنے افسروں اور رعایا کے لیے ان ہی اصول پر کاربند ہوتے تھے۔ کسی شخص کو معتبر نہ سمجھا جاتا تھا۔ حکومت ایک نہایت ہی باقاعدہ محکمہ تفتیش و تجسس پر بھروسہ کرتی تھی جو سلطنت

کے تمام محکموں اور رعایا کی ہر ایک جماعت پر حاوی ہوتا تھا۔ جاسوسوں کے متعلق قواعد و ضوابط کو اس کتاب میں نہایت ممتاز جگہ دی گئی ہے اور اس کے ہر باب میں یہ بات فرض کر لی گئی ہے کہ حکومت کی مشینری کے ٹھیک کام کا انحصار زیادہ تر اس بات پر ہے کہ خفیہ طور پر جو خبریں وصول ہوں ان کو کام میں لائیں۔[۶]

فاحشہ عورتوں کی ملازمت

فاحشہ عورتوں سے جاسوسی کا کام لیے جانے کی بابت سٹریبو کے بیان کی تصدیق اس مضمون کے متعلق ان قواعد سے ہوتی ہے جو اس کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ یہ فاحشہ عورتیں ایک بڑی حد تک دربار کی ملازم خیال کی جاتی تھیں اور اس قسم کی عورتیں ناظم اور نائب ناظم کے حکم کے مطابق شاہی چھتر کے تھامنے، سونے کے آفتابے اور پنکھے کے اٹھانے اور جب کبھی بادشاہ تخت پر بیٹھے یا رتھ یا پالکی میں سوار ہو تو اس کے ہمرکاب رہنے کا کام کرتی تھیں۔ ایک طول و طویل باب ان ہی فاحشہ عورتوں کے متعلق قواعد و ضوابط سے بھرا ہوا ہے۔[۷] جاسوس خط مرموز استعمال کرتے تھے اور خفیہ خبروں کے پہنچانے کے لیے پیغامبر کبوتر سے کام لیا جاتا۔[۸] خفیہ پولیس کا محکمہ "جاسوسی کے قواعد و ضوابط" کے زیر نگرانی تھا اور ان ہی قواعد و ضوابط کے موافق تمام رپورٹوں کو جانچا جاتا تھا۔

شہزادے کیکڑوں کی مانند متصور ہوتے تھے

بادشاہ اپنے خاندان کے ارکین سے ہمیشہ ڈرتا رہتا تھا: "سلطنت کی وجہ سے باپ سے بیٹے اور بیٹا باپ سے دشمنی کرتا تھا۔"[۹] جہانگیر نے صدیوں بعد اسی اصول کا اعادہ ان الفاظ میں کیا کہ "بادشاہت کے معاملے میں بیٹے اور داماد کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا اور بادشاہ کا کوئی حقیقی رشتہ دار نہیں ہوتا۔"[۵۰] اسی قسم کا ایک اور مقولہ یہ ہے کہ "شہزادے کیکڑوں کی مانند ہیں اور وہ ان کی طرح اپنے والدین کو کھا کر ہضم کر جانے میں مشاق ہوتے ہیں۔"[۵۱]

بادشاہ کے فرائض

ایک خود مختار اور ذمہ دار بادشاہ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ سخت محنت دتندہی سے کام کرے گا۔ ان الفاظ میں جس سے پڑھنے والے کو عام طور پر اشوک کے فرامین کا شبہ ہوتا ہے ہمارا مصنف کہتا ہے کہ "بادشاہ کو چاہیے کہ وہ بذات خود دیوتاؤں، ملحدوں، برہمنوں، وید کے عالموں، مویشیوں، عبادت گاہوں، کم عمروں، مصیبت زدوں، بیکسوں اور عورتوں کے کاموں کو انجام

دے۔ یہ تمام کام جس طرح لکھے گئے ہیں اس ترتیب سے یا جس طرح کہ ان کی ضرورت محسوس ہو انجام دینے چاہئیں۔

تمام ضروری مقدمات کی سماعت فوراً کرنی چاہیے اور ان کو ملتوی کبھی نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر ان کو ایک مرتبہ معرض التواء میں ڈال دیا گیا تو پھر ان کو سنبھالنا اور انجام دینا ناممکن ہو جائے گا۔[۵۲]

شاہی مجلس

بادشاہ کی مدد کے لیے ایک شاہی مجلس مقرر تھی۔ جس کے اراکین کی تعداد بعض مصنفوں کی رائے کے مطابق بارہ یا سولہ ہونی چاہیے۔ لیکن چانکیا کی رائے کے مطابق ان مشیروں کی تعداد اتنی ہونی چاہیے جتنی کہ سلطنت کی ضرورت کے لیے کافی ہو۔[۵۳]

محکمے

حکومت کے بارہ محکموں کا مفصل ذکر ہے اور تمام بڑے بڑے عمال کی لمبی چوڑی فہرست اس میں مندرج ہے۔ ان میں حاجب' صدر محاسب' صدر نگران مال' مہتمم محکمہ زراعت' مہتمم محکمہ حرفت و صنعت وغیرہ شامل ہیں۔[۵۴]

وہ پنچایتیں جن کا ذکر میگا ستھینز نے کیا ہے کہ دارالسلطنت اور افواج کے تمام کام ان کے سپرد تھے' ان کا چانکیا کی کتاب میں کہیں پتہ نشان نہیں اور وہ ان کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ ان میں ہر ایک محکمہ صرف ایک ہی عامل کی سپردگی میں کام کرتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ پنچایتیں چندر اگپتا کی ہی خود ساختہ اور جدت طبع کا نتیجہ ہوں۔ مگر اس کے علاوہ یہ کتاب بہت سے یونانی بیان کی موئد اور مصدق ہے۔

مشاہرے اور سکے

اس میں مشاہروں کی شرح کی ایک نہایت عجیب و غریب جدول بھی پائی جاتی ہے۔ تنخواہوں کی شرح ولی عہد اور چند اور بڑے بڑے ملکی عہدے داروں کے مشاہرے 48000 سالانہ چاندی کے پنوں سے لے کر ایک مزدور کی تنخواہ 60 پنوں تک دی جاتی تھی۔[۵۵] چاندی کے پنے کا کوئی نمونہ دریافت نہیں ہوا۔ مگر گمان غالب یہ ہے کہ اس کا وزن تانبے کے ایک کرش کے برابر یعنی 146 گرین ہوتا ہوگا۔[۵۶] "چھدے ہوئے" غیر خالص چاندی کے سکے (پران یا دہرن)' جن کے متعلق معلوم ہے کہ وہ تصنیف کے زمانے میں عام طور پر مستعمل ہوتے تھے'

وزن میں 56 گرین کے معیار سے مسکوک کیے جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ چاندی کا پنہ صرف حساب وکتاب کے لیے کام آتا ہو۔ ایک چاندی کے پنہ کی قدر جس میں "چھدے ہوئے" سکے کی طرح بہت کھوٹ ملا ہوا ہوتا تھا' ایک شلنگ سے کچھ زیادہ نہیں ہو سکتی۔

مالیات

نہایت درست اصول کی تلقین یہ ہے کہ "تمام کارروائیوں کا دارومدار مالیات پر ہے اور اسی وجہ سے خزانے پر سب سے زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔[۵۷] یہ ناممکن ہے کہ میں مالی انتظامات کی ہر ایک شق کو تفصیل سے بیان کروں۔ مگر چند امور کا ذکر کیے دیتا ہوں۔

محصول اراضی اور محصول آب

موجودہ زمانے کے افسر بندوبست کی طرح مہتمم محکمہ زراعت کا یہ کام تھا کہ اراضی کی جمع بندی آب پاشی کے مختلف وسائل کے لحاظ سے کرے۔ زمین کی پیداوار کا وہ حصہ جو سلطنت کو "مالگذاری" یا شاہی لگان کے طور پر ادا کیا جاتا تھا' عموماً چوتھائی ہوا کرتا تھا اور محصول آب کے طور پر بھی اسی کے قریب قریب یعنی پانچویں حصے سے تیسرے حصے تک ان کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے ابواب بھی ان پر لگائے جاتے تھے۔ ان سب کو ادا کرنے کے بعد مصنوعی طور پر سیراب کی ہوئی زمین کے کاشتکار کے پاس بمشکل اس کی کھیت کی پیداوار کا آدھا حصہ رہ جاتا تھا۔[۵۸]

نذرانے

اس کے علاوہ خاص خاص موقعوں پر تمام رعایا براپا کا یہ فرض تصور کیا گیا تھا کہ وہ بادشاہ کی خدمت میں نذرانے گذرانیں۔ ان نذرانوں کو بادشاہ اپنی سمجھ سے جب چاہے عائد کر دیتا تھا۔ وہ تجاویز جن کے ذریعے اور وسیلے سے ایک نادار بادشاہ اپنی رعایا سے روپیہ وصول کر سکتا تھا اپنی نوعیت میں میکیاولی کی تجاویز سے کسی صورت میں کم نہیں۔ کشمیر کی تاریخ میں ایسی بہت ہی افسوس ناک مثالیں ملتی ہیں جن میں مصنف موصوف کے اصول پر عمل کیا گیا ہے۔

اعزازات کی فروخت

موجودہ زمانے کے ماہر مالیات کچھ بہت اس بات کے خلاف نہیں پائے جاتے کہ "دولتمندوں پر نہایت بھاری بھاری محصول لگا کر غریب کر دیا جائے۔ یا کوئی ایسی ترکیب کی

جائے کہ وہ ان سے ان کی جمع کیے ہوئے مال کو اگلوا لینے میں کامیاب ہوں۔"[59] اسی طرح اعزازات کے فروخت کا طریقہ بھی یورپ میں بالکل غیر معلوم نہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار اس صاف گوئی سے نہیں کرتے جتنا کہ چانکیا نے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"دولتمند اشخاص سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ اپنی دولت میں سے جتنا ہو سکے بادشاہ کو دے دیں۔ وہ لوگ جو خود بخود یا کسی رفاہ عام کی خاطر بادشاہ کی خدمت میں اپنا روپیہ پیش کریں' ان کو دربار میں کوئی نہ کوئی مرتبہ یا عہدہ دے دیا جائے۔ جیسے کہ ایک چھتریا پگڑی اور یا اسی قسم کا کوئی اور زیور جوان کے روپے کے بدلے میں دیا جائے۔"[60]

فروخت پر محصول

قلعہ دار شہروں میں جیسا کہ میگا ستھینز نے بیان کیا شاہی محاصل کا بڑا حصہ فروخت پر محصول لگانے سے وصول ہوتا تھا۔ پبلک آمدنی کی اہم مد کے جمع کرنے میں آسانی پیدا کرنے کیلئے یہ قاعدہ کلی مقرر کر دیا گیا تھا کہ چیزیں اسی جگہ جہاں وہ پیدا ہوں یا تیار کی جائیں فروخت نہ ہوں۔[61] قانون کے مطابق تمام قابل فروخت اشیاء "سوا غلہ' مویشی اور چند چیزوں کے "شہر کے دروازے کے قریب ایک بازار میں لائی جاتی تھیں اور وہاں اگر وہ فروخت ہو جائیں تو ان پر محصول وصول کیا جاتا تھا۔ محصول اسی وقت لگایا جاتا تھا کہ بیع قطعی واقع ہو جائے۔ اسکی شرحیں بہت مختلف تھیں۔ بیرونی ممالک سے مال کی درآمد پر سات قسم کا محصول لگایا جاتا تھا اور یہ بہ ہیئت مجموعی بیس فی صد ہو جاتا تھا۔ خراب ہو جانے والی اشیاء (جیسے میوے یا ترکاریوں) پر قیمت کا چھٹا حصہ یا 16.66 فی صد کے حساب سے لگایا جاتا تھا۔ اسی طرح اور قسم کی اشیاء پر محصول کی شرح 4 سے 10 فیصد تک تھی۔ نہایت بیش بہا چیزیں جیسے جواہرات پر خاص شرح لگائی جاتی تھی جس کو ماہرین فن مقرر کرتے تھے۔ تمام ان اشیاء پر جو قابل فروخت ہوں سرکاری طور پر مہر کی جاتی تھی۔[62]

اعداد و شمار

پیدائش و اموات کے اعداد و شمار محفوظ رکھنے کے متعلق یونانی بیانات کی تصدیق ان قواعد سے ہوئی ہے جن کی رو سے ناگرک (یعنی کوتوال شہر) کے لیے لازمی تھا کہ اپنے علاقے کے آیند و روند کے اعداد و شمار کو محفوظ رکھے۔ اس کا یہ فرض تھا کہ مردم شماری کا بیان بالکل درست رکھے جس میں ہر ایک شہری کی جنس' ذات' نام' خاندانی نام' پیشہ' آمدنی' خرچ اور مقبوضہ مویشیوں کی تعداد کے متعلق مفصل اطلاع مندرج ہو۔ قواعد مالیات کی خلاف ورزی کرنے کی

سزا عام طور پر جائداد کی ضبطی یا جرمانہ ہوا کرتا تھا۔ مگر دیدہ و دانستہ جھوٹے بیانات بنانے والا اسی سزا کا مستوجب ہوتا جو چوری کے لیے مقرر تھی اور یہ سزا موت تک ہو سکتی تھی۔ ۶۳

آبکاری کا محصول

آبکاری کے اجازت ناموں کا باقاعدہ اور باضابطہ انتظام تھا۔ بیرونی ممالک کی شراب پر خاص شرحوں سے محصول لگایا جاتا تھا۔ ان میں کپس یا افغانستان کی شرابیں بھی شامل تھیں۔ شرابخواری کے موجودہ مصلحین کو شاید مندرجہ قواعد و ضوابط بہت ناگوار گذریں گے:

"شرابخانوں میں متعدد کمرے ہونے چاہئیں اور وہ کرسیوں اور نشستوں سے آراستہ ہونے چاہئیں۔ شراب خانوں میں موسم کی تبدیلی کے لحاظ سے تمام آسائش کی چیزیں ہونی چاہئیں اور پھولوں کے ہار، خوشبوئیں اور عطریات ان میں ہر وقت مہیا رہنے چاہئیں۔" ۶۴

ضابطہ تعزیرات

مصنف کہتا ہے کہ سیاست مدن کی تعریف دوسرے الفاظ میں "فن سزا" کی جاسکتی ہے۔ اسی وجہ سے ضابطہ تعزیرات نہایت ہی سخت تھا۔ اس کتاب میں ان معاملات کی تفصیل سے یونانی بیانات کی ایک حد تک تصدیق ہوتی ہے۔ سزا کی سختی کی مثال کے طور پر صرف یہ بیان کر دینا کافی ہوگا کہ کسی سرکاری عامل سے اگر 8 سے لے کر 10 پنے تک کی چوری سرزد ہو تو اس کی سزا موت تھی اور غیر سرکاری آدمی کے لیے 40 سے لے کر 50 پنے تک کی چوری کی بھی یہی سزا تھی۔ ۶۵

قانون تعذیب

اقبال جرم کرانے کے لیے تعذیب کے عمل کو تسلیم کیا جاتا تھا اور اسے کھلم کھلا استعمال کرتے تھے۔ اس کے متعلق بہت سے مکروہ قواعد اس میں مذکور ہیں۔ عام اصول یہ تھا کہ "وہ لوگ جن کے متعلق یقین ہو کہ وہ مجرم ہیں ان کی تعذیب ہونی چاہیے۔" اس کی اٹھارہ قسمیں تھیں اور ان میں سات قسم کی تازیانے ہی کی سزا تھی۔ بعض حالات میں اس آفت رسیدہ شخص کو "ان میں سے کسی ایک یا سب قسم کی تعذیب کی جاسکتی تھی۔" عورتوں کی تعذیب کے متعلق یہ فرض کیا جاتا تھا کہ ان کو مردوں سے آدھی تعذیب کرنی چاہیے۔" ۶۶ اس زمانے میں بھی پولیس کے ہر ایک ہندوستانی جوان کا یہ عقیدہ ہے کہ تحقیق و تفتیش کا اصلی مقصد یہ ہے کہ مجرم سے اقبال جرم کرا لے اور اس کے خیال میں اقبال کرانے کے بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اس کی

تعذیب کرے۔

چانکیا کا قانون تعزیرات نہ صرف تعذیب اور معمولی جرائم کی سنگین سزا ہی تجویز کرتا ہے' بلکہ بہت سے جرائم کے لیے اس نے قطع اعضاء بھی تجویز کیا ہے۔

ارتھ شاستر ایک عملی کتاب ہے

اگرچہ اکثر حیرت انگیز اور دلچسپ تفاصیل ضرورتاً قلم انداز کر دی گئی ہیں، مگر امید ہے کہ مندرجہ بالا خلاصے سے ناظرین کو بخوبی ان اصولوں کا صحیح اندازہ ہو گیا ہو گا جن پر کہ سکندر اعظم کے زمانے میں شمالی ہند کی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کا نظم و نسق قائم تھا۔ اگرچہ چانکیا کی کتاب میں بہت سے قواعد ایسے ہیں جو محض قیاسات پر قائم ہیں مگر پھر بھی یہ یقینی ہے کہ اس کتاب کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اس کے قواعد و ضوابط نظم و نسق کے لیے کام میں لائے جائیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو کتاب مطالعے کے قابل ہے۔ منو کی کتاب یا دوسری دھرم شاستروں میں برہمنوں کی اعلیٰ درجے کی تعلیم مضمر ہے۔ مگر چندر اگپتا کے وزیر نے اپنی کتاب میں ان تعلیمات سے بالکل سروکار نہیں رکھا بلکہ بالکل صریح اور صاف طور پر چوتھی صدی قبل مسیح کے راجاؤں اور ان کے برہمن مشیروں کی بداخلاقیوں کا مرقع ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کوئی بڑی سلطنت ایسی قائم نہیں ہوئی تھی جو تقریباً تمام ہندوستان پر حاوی ہو جائے۔ [67]

چندر اگپتا کی کامیابی

چندر اگپتا جوانی کے عالم میں تخت پر بیٹھا اور کیونکہ اس نے صرف چوبیس برس حکومت کی اس لیے جس وقت وہ تخت و تاج سے دستبردار ہوا یا مر گیا تو اس کی عمر زیادہ سے زیادہ صرف پچاس کی ہو گی۔ [68] اپنی زندگی کے اس تھوڑے سے زمانے میں اس نے بڑے بڑے کام کیے۔ مقدونوی فوجوں کو ہندوستان سے نکالنا' سالوکس فاتح کو کامل شکست دے کے ملک سے نکال دینا' کم سے کم ایک طرف سے لے کر دوسری طرف تک تمام شمالی ہند کو زیر کرنا' ایک زبردست فوج تیار کرنا اور ایک عظیم الشان اور وسیع سلطنت کا کامل نظم و نسق' یہ تمام کارنامے ایسے ہیں جو کسی طرح بھی بے وقعت نہیں ہو سکتے۔ چندر اگپتا کی طاقت ایسی مستحکم ہو چکی تھی کہ وہ نہایت امن و امان کے ساتھ اس کے بیٹے اور پوتے تک منتقل ہو گئی اور یونانی بادشاہوں نے اس سے اتحاد و ارتباط کی خواہش کی۔ یونانیوں نے سکندر اعظم اور سالوکس کے ہندوستانی حملوں کی یاد کو پھر کبھی تازہ نہ کیا اور صرف اسی پر کفایت کی کہ اس کے بادشاہوں کے ساتھ تین پشتوں تک

دوستانہ مصلحتی اور تجارتی تعلقات قائم رکھیں۔[69]

یونانی اثرات کی عدم موجودگی

جیسا کہ بعض مصنفین کا خیال ہے' موریا سلطنت کسی صورت سے بھی سکندر اعظم کی عالیشان ناپائیدار فوجی مہم کا نتیجہ نہ تھی۔ انیس مہینے جو اس کو ہندوستان میں گذرے تمام تر تباہ کن جنگوں کی نذر ہو گئے اور اس کی موت کی وجہ سے اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ چندر اگپتا کو ضرورت نہ تھی کہ وہ سلطنت کے مفہوم کو سکندر کی مثال سے حاصل کرے۔ اس کے اور اس کے ہم وطنوں کی نظروں کے سامنے ایران کی کیانی سلطنت کا عظیم الشان کارخانہ موجود تھا اور یہی وہ سلطنت تھی جس نے ان لوگوں کے دل و دماغ پر اثر کیا تھا۔ انہوں نے اسی کے نمونے پر اپنی سلطنت کے آئین کو بنایا' جس حد تک کہ وہ خالص ہندی نہ تھے۔ چندر اگپتا کے دربار اور انتظام میں جہاں کہیں غیر ممالک کے اثر کا شائبہ (جن کا ذکر ہماری متفرق اسناد میں ہے) پایا جاتا ہے وہ یونانی نہیں بلکہ ایرانی ہیں۔ صوبہ دار کے لیے ستر پ کا ایرانی خطاب ایک بڑی مدت یعنی چوتھی صدی عیسوی کے آخر تک ہندوستان میں مروج رہا۔[70]

ہندوستان کا فوجی نظام

چندر اگپتا کے فوجی نظام میں بھی کوئی یونانی اثر نہیں پایا جاتا۔ یہ مبنی ہے اسی قدیم ہندی نمونے پر۔ اس کی عظیم الشان فوج محض ایک ترقی یافتہ صورت اس عظیم فوج کی تھی جو کسی زمانے میں مگدھ میں موجود تھی۔ ہندی بادشاہ عموماً فتح کے لیے زیادہ تر اپنے ہاتھیوں پر اعتماد کرتے تھے۔ ان سے اتر کر جنگی رتھوں اور پیادہ فوج کی کثرت پر سوار فوج نسبتاً تعداد میں کم اور بیکار ہوتی تھی۔ اس کے خلاف سکندر نے نہ ہاتھیوں سے کام لیا اور نہ رتھوں سے' بلکہ اس نے تمام انحصار نہایت ہی اعلیٰ درجے کے قواعد داں رسالے پر کیا' جن کو وہ نہایت ہنرمندی اور جلادت سے کام میں لاتا تھا۔ خاندان سائلوکس کے بادشاہ بھی ایشیائی طریقے پر کاربند ہوئے اور اسی پر قناعت کی اور ہاتھیوں پر بھروسہ کرنے لگے۔[71]

چندر اگپتا کی تخت سے دستبرداری

جین روایات بیان کرتی ہیں کہ چندر اگپتا موریا مذہب کے لحاظ سے جین تھا اور اس موقعہ پر جب بارہ سال علی الاتصال قحط پڑا تو وہ تخت و تاج سے دست بردار ہو گیا اور جین کے ایک بزرگ بھدر اباہو کے ہمراہ جنوبی ہند کی طرف چلا گیا اور سنیاسی کی حیثیت سے موجودہ ریاست میسور کے

سرادن بلگول مقام پر رہتا رہا۔ بالآخر اسی جگہ جہاں اب بھی اس کا نام یادگار ہے' فاقہ کر کے جان دے دی۔ اس کتاب کی دوسری ایڈیشن میں میں نے اس روایت کو بالکل رد کر دیا تھا اور اس کے متعلق کہا تھا کہ یہ "محض خیالی تاریخ ہے۔" مگر اب دوبارہ تمام اسناد اور ان تمام اعتراضات پر جو اس حکایت کی صداقت کے متعلق کیے جاتے ہیں غور کرنے کے بعد میرا یہ خیال ہے کہ غالباً یہ روایت ایک حد تک صحیح ہے اور درحقیقت چندر اگپتا تخت سے دستبردار ہو کر جین سنیاسی بن گیا تھا۔ تمام روایتوں کے بیان اس قسم کے بیانات کی طرح بلاشک وشبہ قابل تنقید ہوتے ہیں اور نوشتے اور تحریری سندیں واقعی ثبوت کے لیے کافی نہیں۔ لیکن پھر بھی میرا اس وقت قیاس ہے کہ یہ روایت یقیناً صحیح واقعے پر مبنی ہے۔ [۲]

298ق م' بندوُسار

جب چندر اگپتا 298ق م میں تخت سے دست بردار ہو گیا یا مر گیا تو اس کا بیٹا بندوُسار اس کا جانشین ہوا۔ مگر یونانی مصنف اس نام سے بالکل ناواقف ہیں اور چندر اگپتا کے جانشین کے ناموں کو وہ ایسے یونانی الفاظ میں ادا کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت لقب "امترگھاٹ" (یعنی دشمن کش) کا ترجمہ کرنا چاہتے ہوں۔ [۳] ہندوستان اور یونان کی طاقتوں میں وہ دوستانہ تعلقات جو چندر اگپتا اور سالوکس کے زمانے میں پیدا ہوئے اس کے بیٹے بندوُسار کے عہد میں برابر جاری رہے۔ اس کے دربار میں بجائے میگاستھینز کے ڈیماکس سفیر کے طور پر رہا۔ اس سفیر نے بھی اپنے پیشرو کی پیروی کی اور اس ملک کے حالات برابر لکھتا رہا۔ مگر بدقسمتی سے اس کے لکھے ہوئے حالات بہت ہی کم ہم تک پہنچے ہیں۔ جب خاندان سالوکس کا معمر بانی 280ق م میں قتل کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا انٹی اوکس سوٹر تخت نشین ہوا تو وہ ہندوستان کے متعلق اپنے باپ کی مصلحت پر کاربند رہا۔

انٹی اوکس سوٹر سے خط وکتابت

بندوسار اور انٹی اوکس کے درمیان خط وکتابت کی حکایت اگرچہ بذات خود بالکل فضول ہے۔ مگر اس وجہ سے قابل نقل ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے راجا اور اس کے مغربی ایشیاء کے اتحادی بادشاہ میں کس طرح بے تکلفی سے خط وکتابت ہوتی تھی۔ بندوسار سے یہ کہا گیا کہ انجیر سے زیادہ کوئی چیز شیریں نہیں ہوتی۔ چنانچہ بندوسار نے اپنے دوست کو لکھا کہ وہ اس کے لیے کچھ تھوڑی انجیر اور کشمش کی شراب روانہ کر دے' اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ وہ ایک ماہر فن معلم بھی خرید کر ساتھ کر دے۔ انٹی اوکس نے اسے خط کا یہ جواب دیا کہ وہ نہایت

خوشی سے انجیر اور کشمش کی شراب روانہ کرتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ دوسری چیز روانہ نہیں کر سکتا کیونکہ یونانیوں کے ہاں ماہر فن معلم کا فروخت کرنا قانوناً ناجائز ہے۔

ڈایونی سیئس کی سفارت

ٹولمی فلیڈلفس جس نے مصر پر 285 سے 248 ق م تک حکومت کی اس نے بھی ایک سفیر ڈایونی سیئس ہندوستان کے بادشاہ کے دربار میں روانہ کیا۔ اس نے بھی اور سفیروں کی طرح اپنے تجربوں کو قلمبند کیا۔ یہ پہلی صدی عیسوی میں موجود تھا اور پلائنی نے اس کے بیانات سے استفادہ کیا ہے۔ [4] یہ بات یقینی نہیں کہ ڈایونی سیئس نے اپنی اسناد سفارت بندوسار کے دربار میں پیش کیں یا اشوک کے دربار میں۔

فتح دکن

بندوسار کی اندرونی پالیسی کے متعلق بالکل کچھ مواد نہیں ملتا۔ (جس کی حکومت 25 یا 28 برس تک رہی) اور نہ اس کے زمانے کی کوئی عمارت یا کتبہ ابھی تک دریافت ہوا۔ گمان غالب یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے قدم بقدم چلتا رہا اور ہندوستان کی حدود کے اندر الحاق اور فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ بندوسار کے بیٹے اور جانشین راجا اشوک کی مملکت کے حدود کافی صحت کے ساتھ معلوم ہیں اور یہ یقینی ہے کہ اس کی سلطنت، جس میں نیم خودمختار زیر حمایت ریاستیں بھی شامل تھیں، تقریباً ضلع نلور °14۔ '27 شمال کی عرض بلد تک پہنچی تھی۔ [5] دریائے نربدا کے جنوب کا علاقہ اشوک کی فتوحات سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس نے صرف کلنگ کے علاقے کو جو خلیج بنگالہ کے ساحل پر واقع تھا فتح کیا تھا اور یقیناً یہ فتح ابتدائی زمانے میں ہوئی ہوگی جس کی اطلاع ہم تک نہیں پہنچی۔ خود چندر اگپتا کی چوبیس سالہ حکومت کے زمانے کے متعلق ہم کو ان واقعات سے جو اس میں واقع ہوئے پوری واقفیت ہے اور وہ ان واقعات میں بالکل مصروف معلوم ہوتا ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ گمنامی سے بادشاہت تک پہنچنے، مقدونوی افواج کو پسپا کرنے، پاٹلی پتر میں انقلاب برپا کر کے ایک شاہی خاندان کی بنیاد ڈالنے، آریانہ پر قبضہ کرنے اور اپنی سلطنت کو خلیج بنگال سے بحیرہ عرب تک وسعت دینے کے علاوہ اس کو اتنا وقت اور بھی ملا ہو کہ وہ کچھ اور کام انجام دے سکے۔

غالباً یہ فتح بندوسار کے ہاتھ پر ہوئی

دکن ... یرہ نما ہند نلور کے عرض بلد تک اس حالت میں ضرور چندر اگپتا یا بندوسار کے

ہاتھوں فتح ہوا ہوگا۔ کیونکہ اشوک کو یہ علاقہ اپنے باپ سے ترکے میں ملا تھا اور اس کی صرف اسی ایک جنگ یعنی فتح کلنگ کا تذکرہ ملتا ہے۔ اغلب ہے کہ یہ کام بندوسار کا تھا اور اس کے باپ چندراگپتا نے اپنی مشغولیت کی وجہ سے اسے فتح نہ کیا ہوگا۔[۶] لیکن چندراگپتا کی تمام زندگی کے کارنامے جواب تک معلوم ہوئے ہیں ایسے تعجب خیز ہیں اور اس کی طاقت ایسی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ یہ ممکن ہے کہ جنوب کی فتح بھی اس کی فتوحات کی فہرست میں شامل کردی جائے۔ اس نگاہ غلط انداز کے ساتھ بندوسار کی شخصیت سائے کی طرح ہماری نظر سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی ہے۔ آئندہ دو باب تمام تر راجا اشوک کی تاریخ کی نذر ہوں گے جو واقعی طور پر نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے سب سے بڑے اور نامور بادشاہوں کی صف میں جگہ پانے کا ادعا کرتا ہے۔

ضمیمہ ح

سائلوکس نیکٹر کے مفوضہ ملک آریانہ کی حدود

کتاب کے متن کا بیان کہ سائلوکس نیکٹر نے 303 ق م میں جو علاقہ چندر اگپتا موریا کو تفویض کیا اس میں در حقیقت پیروپنی سڈیئی (کابل)، آریہ (ہرات) اراکوسیہ (قندھار)، اور غالباً گدروسیہ (مکران) یا اس صوبے کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔ میری کتاب راجا اشوک [۷] ڈرائسن اور دوسرے مشہور و معروف علماء کے بیانات پر مبنی ہے۔

مسٹر بیون کی نکتہ چینی

مگر مسٹر بیون نے میرے اس بیان تک کی مخالفانہ نکتہ چینی کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "یہ بیان ثبوت کا تو کیا ذکر قرین قیاس ہونے کی حد سے بھی گرا ہوا ہے۔" [۸] اس لیے یہ ثابت کر دینا ضروری ہے کہ اس واقعے کے بہت مستحکم دلائل موجود ہیں۔ اس کے متعلق اصلی اسناد پانچ ہیں۔ سٹریبو (اس کی صرف دو عبارتیں ہیں)، اپین، پلوٹارک، جسٹن اور پلائنی اور کیونکہ متنازعہ عبارتیں نہایت مختصر ہیں اس لیے ان کو ہو بہو نقل ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے تاکہ ہر ایک شخص ان کو دیکھ کر خود نتائج اخذ کر سکے۔ موجودہ مصنفوں نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سب انہی عبارتوں پر مبنی ہے۔

سٹریبو کے قول کی تشریح

یہی وہ عبارتیں ہیں جس میں اس مضمون کی بلاواسطہ شہادت شامل ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل بدیہی ہے کہ سٹریبو کے دونوں بیان ایک ہی واقعے کے متعلق ہیں اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ مقدونیوں نے ہندیوں کو "آریانہ کا ایک بڑا حصہ دے دیا" جو سکندر کے زمانے تک ایرانیوں کے قبضے میں تھا تو وہ مختصراً دریائے سندھ کے مغرب میں ان علاقوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو

ایرانیوں کے قبضے میں تھے۔ اور جیسا کہ دوسرے بیان میں خصوصیت سے ذکر ہے ' یہی علاقہ سائلوکس نے چندر اگپتا کو دیا تھا۔ میرے خیال میں اس بیان کے متعلق بحث کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ "سٹریبو نے کہا ہے کہ آریانہ کا بری علاقہ تفویض کیا گیا۔" اور اگر اس کے دونوں بیانوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی صحت پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

دیگر اسناد

اپین ' پلوٹارک اور جسٹن کے بیانات میں خاص طور پر اس علاقہ مفوضہ کی حدود اور وسعت پر بحث نہیں ہے۔ مگر وہ اس وجہ سے قابل قدر ہیں کہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائلوکس نے واقعی دریائے سندھ کو عبور کیا ' ایک ناکام جنگ شروع کی اور آخر مجبوراً اپنے دشمن سے ایسے شرائط پر صلح کی جو دشمن کے لیے مفید مطلب اور اس کے لیے مضر تھیں۔

چار سترا پیاں

پلائنی کا یہ بیان کہ اکثر مصنف گدروسیہ ' اراکوسیہ ' آریہ ' پیروپنی سڈیئی چاروں صوبوں کو ہندوستان میں شامل کرتے ہیں ' ضرور اس بات پر مبنی ہے۔ 77ء یعنی اس کی کتاب کے سال اشاعت سے قبل کسی زمانے میں یہ چار صوبے حقیقت میں ہندوستان میں شمار ہوتے ہوں گے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ اسی خاندان موریا کے زمانے کے سوا یہ صوبے کبھی ہندوستان میں شامل رہے ہوں۔ پلائنی کا تمامتر علم میگا ستھینز اور سائلوکس ' چندر اگپتا اور سکندر کے دوسرے معاصرین کی کتابوں پر مبنی ہے اور اس کے بیانات کی تشریح کرنے کے بعد ہم کو آپ خود ہی مان لینا پڑتا ہے کہ یہی چار صوبے "آریانہ کا بڑا علاقہ" تھا جو سائلوکس نے چندر اگپتا کے حوالے کیے۔ کابل اور قندھار اکثر ہندی بادشاہوں کے قبضے میں رہے ہیں اور یہ علاقہ ہندوستان کی قدرتی سرحد ہے۔ ہرات (آریہ) بلاشک وشبہ دور ہے ' مگر وہ طاقت جس کے قبضے میں کابل اور قندھار ہو آسانی سے اس پر اپنا تصرف قائم رکھ سکتی ہے۔

گدروسیہ

گدروسیہ کی سترا پی (صوبہ) بہت مغرب کی طرف پھیلی ہوئی تھی۔ غالباً اس کے صرف مشرقی حصے پر چندر اگپتا نے قبضہ کیا تھا۔ ہالن کا سلسلہ کوہ ' جس کے پار اترنے میں سکندر کو اتنی دقت پیش آئی ' ملک کی قدرتی سرحد تھا۔ خواہ گدروسیہ پر چندر اگپتا نے براہ راست اپنا تسلط قائم کیا ہو یا نہ ' مگر میرے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں کہ سائلوکس نے تمام صوبے اس کے حوالے کر دیئے

تھے اور بہت سے مصنفوں نے اس کو مع آریہ 'اراکوسیہ' پیروپنی سڈیئی کے ہندوستان میں شامل کر دیا تھا۔ کیونکہ سائلوکس کے سامنے انٹی گونوس کو شکست دینے کا زیادہ اہم کام تھا اس لیے اس نے مجبور ہو کر ان چار سرحدی صوبوں کو جن کا تذکرہ پلائنی نے کیا ہے' چندر اگپتا کے حوالے کر کے خود اپنی تمام طاقت کو وسطی اور مغربی ایشیا میں مجتمع کیا۔

ضمیمہ خ

ارتھ شاستریا کوتلیا ساشتر

متن کتاب کی دریافت

ارتھ ساشتر کے متعلق تمام ضروری باتیں طولانی حاشیوں میں بیان کرنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب ہے کہ ایک ضمیمہ ان کے لیے خاص کر دیا جائے۔

مقولات کے ایک مجموعے کا نام' جو چندر اگپتا کے برہمن وزیر چانکیا' کوتلیا یا وشنو گپتا کی طرف منسوب ہیں' بہت دنوں سے معلوم تھا (دیبر کی ہسٹری آف انڈین لٹریچر' ٹیوبنر' صفحہ 210)۔ مگر یہ کتاب ارتھ ساشتر جس کا اکثر قدیم مصنفوں نے ذکر کیا ہے اور عبارتیں نقل کی ہیں' بالکل مفقود ہو گئی تھی۔ لیکن آخر مہاراجا میسور کے کتب خانہ علوم مشرقیہ کے فاضل ناظم مسٹر آر شام شاستری نے اس کو ضلع تنجور کے ایک پنڈت کے پاس قلمی نسخے کی صورت میں پایا اور دنیا کو اس سے روشناس کیا۔ [۹کہ] پنڈت موصوف نے نہایت مہربانی سے چند روز کے لیے اس کتاب کو مع ایک بٹاسوامی کی لکھی ہوئی شرح کے کتب خانے کے حوالے کیا۔ 1905ء میں جب مسٹر شام شاستری نے اس کے بعض انتخابات کا ترجمہ انڈین انٹی کویری میں شائع کیا تو لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی اور اسی کی وجہ سے میں نے بھی اس کتاب کی دوسری ایڈیشن میں جو 1908ء کو شائع ہوئی گراں بہاء اضافے کیے۔ اس واقعے کے بعد اس کتاب کے دو اور قلمی نسخے بھی دریافت ہوئے جن میں سے ایک تومیونخ کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا کلکتہ میں۔

مسٹر آر۔ شام شاستری کا ترجمہ کتاب

1908ء میں میری کتاب کی دوسری ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد بہت سے مشہور و معروف جرمن علماء نے چانکیا کی کتاب کا بغور مطالعہ شروع کیا اور مسٹر شاستری کو بھی اب

جرأت ہوئی کہ سرسری ترجمہ پورا کردیں۔ چنانچہ باوجود سخت مشکلوں کے انہوں نے اسے پورا کردیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متن کتاب کو بھی طبع کرادیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ان کا ترجمہ اس صورت میں شائع نہیں ہوا کہ یہ بلادقت دستیاب ہوسکے۔ مگر جیسا کہ ذیل میں مندرج ہے یہ ترجمہ کامل ضرور ہوچکا ہے۔

1۔ تمہید و انتخابات۔ انڈین انٹی کوری جلد 34۔ (1905ء) صفحہ 5' 47' 110 معہ حاشیہ جو اس دوسری ایڈیشن میں طبع نہیں ہوئے جس کا ذکر نمبر3۔4 میں آگے کیا جائے گا۔

2۔ باب از1 تا4 میسور ریویو 8۔1906ء۔ یہ سرسری ترجمے یعنی نمبر1 2 بعد کے نظرثانی شدہ ترجموں کی وجہ سے بیکار ہوگئے ہیں۔

3۔ چانکیا کی ارتھ شاستر' مترجمہ مسٹر آر۔ شام شاستری بی اے' ایم۔ آر۔ اے۔ ایس' حصہ اول' باب1' 2(1908ء)' دی جی ٹی اے پریس میسور)۔

4۔ ارتھ شاستر آف چانکیا۔ مترجمہ مسٹر آر۔ شام شاستری۔ بی اے' ایم۔ آر۔ اے۔ ایس' حصہ دوم۔ ہندو قانون' باب3' 4(میسور' صرف سرورق مطبوعہ کراؤن پریس)

5۔ ارتھ شاستر آف چانکیا۔ باب5 تا15' مترجمہ شام شاستری۔ مندرجہ ذیل ترتیب سے۔ باب5 تا7۔ انڈین انٹی کوری جلد38(1909ء) صفحہ 257' 277' 303۔ باب7 تا15۔ ایضاً جلد39(1910ء) صفحہ 19' 44' 83' 100' 131' 161۔

کتاب موریا زمانے کی ہی ہے

کتاب میں میرے حوالے تمام تر نمبر3۔4۔5 پر مبنی ہیں۔ جرمن علماء کی تحقیقات کی وجہ سے اب اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ ارتھ شاستر واقعی موریا زمانے کی ایک قدیم کتاب ہے اور غالباً بالکل صحیح طور پر چانکیا سے منسوب ہے۔ یہ فیصلہ بہرحال اس امکان کو نظرانداز نہیں کرتا' بلکہ ممکن ہے کہ زمانہ مابعد میں اس کتاب کے مضمون میں کمی بیشی ہوئی ہو۔ مگر یہ یقینی ہے کہ کتاب کا بڑا حصہ حقیقت میں موریا ہی کے زمانے کا ہے۔ میں نے اس کا ذکر پہلے ہی کردیا ہے کہ اس میں موریا خاندان کے عہد سے عین اس سے قبل زمانے کے حالات کا چربہ اتارا گیا ہے۔

یہ کتاب ایک مدت تک علماء کی توجہ کو اکثر وجوہ سے اپنی طرف مبذول رکھے گی۔ جو کام مسٹر شام شاستری نے کیا ہے وہ محض ابتدائی اور اس لحاظ سے اگرچہ قابل تعریف ہے' مگر تکمیل اور نظرثانی کی اس میں بہت ضرورت ابھی باقی ہے۔

حوالہ جات

ے۱ میک کرنڈل نے اپنی کتاب "ان ویژن آف انڈیا بائی الیگزینڈر دی گریٹ۔" دوسری ایڈیشن صفحہ 411 میں ان دونوں افسروں کے ناموں کو خلط ملط کر دیا ہے۔

ے۲ "وہ نہایت ہی ادنی درجے کے لوگوں میں پیدا ہوا۔ جب نندرس (یعنی نند) کی ہتک کرنے کی وجہ سے بادشاہ نے اس کے قتل کا حکم دیا تو اس نے وہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔" (جسٹن باب 15، فصل 4۔ میک کرنڈل صفحہ 405۔ 327) مدرا راکشس کے ناٹک نے چندراگپتا کے نیچ ذات اور نند راجا کے رشتہ دار ہونے پر بہت زور دیا ہے۔ ان معاملات میں مجھے کامل یقین ہے کہ یہ ناٹک اصل واقعات پر مبنی ہے۔

ے۳ دیکھو مسٹر بیون کی کتاب "دی ہاؤس آف سائلوکس۔"

ے۴ نیس کا یہ خیال کہ چندراگپتا نے سائلوکس کی بادشاہت کو تسلیم کر لیا تھا، سو اس حکایت کے بالکل بے بنیاد ہے کہ چندراگپتا ہمیشہ ان قربان گاہوں کی تعظیم و تکریم کیا کرتا تھا جنہیں سکندر نے بیاس کے مقام پر قائم کیا تھا۔ مگر یہ واقعات (کہ سائلوکس ہندوستان سے واپس چلا گیا اور چندراگپتا کے 9000 میں سے صرف 500 ہاتھیوں کے بدلے میں عظیم اور قابل قدر صوبے اس کو تفویض کر دیئے، اس کو اپنی بیٹی بیاہ دی اور اس کے دربار میں ایلچی روانہ کیا) ایسے ہیں جن سے ان دونوں کے تعلقات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ میگا تھینز ہندی بادشاہ کا بہت ادب کرتا معلوم ہوتا ہے اور یہ کبھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ایک باج گذار بادشاہ کے دربار میں ایلچی ہے۔ آریانہ کے مفوضہ علاقے کی وسعت کے متعلق دیکھو ضمیمہ ح۔

ے۵ جسٹن باب 15، فصل 4 اور وہ تفصیلات جو میگا تھینز نے دی ہیں۔ جسٹن کی کتاب کی عبارت چندراگپتا کے متعلق بہت اہم بیانات پر مشتمل ہے۔ یونانی اور رومی مصنفین کی اس کے بارے میں شہادتیں میک کرنڈل نے اپنی کتابوں میں اور ولسن نے مدراراکشس کے ترجمے کے دیباچے میں جمع کر دی ہیں۔ یہ ناٹک جو غالباً پانچویں صدی میں لکھا گیا، بلاشک و شبہ حقیقی روایات پر مبنی ہے اور میں نے ذرا احتیاط کے ساتھ اس سے استفادہ کیا ہے۔

۶؎ میگاستھنیز کے یہ تمام اجزاء شوان بیک نے جمع کیے ہیں اور بعد تصحیح ان کو میگاستھنیز انڈیکا کے نام سے شائع کیا ہے (جون 1846ء) اور ان کا ترجمہ میک کرنڈل نے "ان شنٹ انڈیا ایز ڈس کرائبڈ بائی میگاستھنیز اینڈ ایرین" (لنڈن - 1877ء) میں کر دیا ہے۔ ایرین (انڈیکا - 17) نے بالکل صحیح طور پر نیارکس اور میگاستھنیز کو معتبر ہونے کی حیثیت سے ہم پلہ مانا ہے۔ سٹریبو نے جو میگاستھنیز سے منقول اکثر نامعقول روایتوں کی وجہ سے اس سے ناراض ہو گیا' ناواجب طور سے اس پر کذب کا عیب لگایا ہے۔ وہ تمام باتیں جو میگاستھنیز نے جمع کی تھیں ان میں اور مصنفوں کی کتابوں سے اضافہ ہوا ہے۔ جن کی کتابوں کے اجزاء ان مصنفوں نے محفوظ رکھے ہیں جن کے لیے ہم کو میگاستھنیز کی معلومات کا ممنون ہونا چاہیے' ان مصنفوں کی فہرست کے لیے دیکھو شوان بیک کی کتاب' مذکورہ بالا ضمیمہ 1' میک کرنڈل کی کتابیں جو تعداد میں چھ ہیں۔ اس نے یونانی اور رومی مصنفوں کے تمام بیانات ہند قدیم کے باب میں جمع کر دیے ہیں۔

۷؎ دیکھو لیفٹیننٹ کرنل ویڈل کا رسالہ "ڈسکوری آف دی اگزکٹ سائٹ آف اشوکاز کلاسک کیپٹل آف پاٹلی پترا۔" (کلکتہ 1892ء دوسری ایڈیشن 1903ء) لکڑی کے شہتیروں کی فصیل کے چند اجزاء بھی پائے گئے ہیں۔ موریا خاندان کے ایک شاہی محل کے آثار کمرہار گاؤں کے مکانات اور کھیتوں کے نیچے مدفون ہیں جو پٹنہ اور بانکی پور کے درمیان کی ریل کے جنوبی جانب واقع ہے۔ ایک اور محل جس کا ذکر ہیون سانگ نے کیا ہے شہر میں ہی غالباً صدر گلی اور کلو خاں کے باغ کے نواح میں واقع تھا جہاں اشوک کا ایک مینار بھی زنانے مکان میں آ گیا ہے (پی۔ سی۔ مکرجی۔ غیر مطبوعہ رپورٹ) نگرہار کے کھنڈر بظاہر نی لی کے آثار معلوم ہوتے ہیں جسے بقول فاہیان اشوک نے بنایا تھا۔ جنرل کننگھم نے غلطی کی کہ یہ سمجھا کہ پاٹلی پتر کو زیادہ تر دریاؤں نے برباد کر دیا۔ پٹنہ شمالی عرض بلد °25 - '37 مشرقی طول بلد °85 - '10 میں واقع ہے۔ چانکیا (آرتھ شاستر۔ باب دوم فصل 3' میسور ریویو فروری 1907ء صفحہ 5 اور علیحدہ رسالہ صفحہ 58) نے نہایت مفصل قواعد دارالسلطنت کو قلم بند کرنے کے لیے لکھے ہیں۔

۸؎ کرٹیس باب 8' فصل 9۔ سٹریبو باب 15' فصل 69۔

۹؎ ایلین۔ باب 13' فصل 18۔ باب 15' فصل 15۔ یہاں برما کے اس واقعے سے اس کا مقابلہ کرو۔ "ایک دن جب میں باہر نکلا تو میں نے ایک گاڑی دیکھی جس میں چار بیل جوتے ہوئے تھے اور وہ بکنٹ جا رہے تھے۔ ان کو ایک دیہاتی لڑکی گاڑی میں کھڑی ہوئی ہانک رہی تھی جو بظاہر ایک لمبے چابک اور دونوں باگوں کو نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے سنبھالے ہوئے تھی۔" (سائمز کی کتاب "ابسی ٹو آوا۔ جلد اول صفحہ 294۔ کانسٹیبل) اس طرح ایک لڑکی اس دوڑ میں شریک ہو سکتی تھی۔ زمانہ حال کے برما میں قدیم ہند کی بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔

؁۱۰ میگا ستھینز کی فریگمنٹ نمبر 27 ـ میک کرنڈل نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "مرد و عورت کے لیے اس رسی کے پار گذرنے کی سزا موت ہوتی ہے ـ" مگر یونانی محاورے کے مطابق یہ ترجمہ صحیح نہیں ـ ملر نے اس کا ترجمہ اور ہی کیا ہے اور تقریباً صحیح ہے ـ سنسکرت ناٹکوں میں بھی عورتوں کی فوج کا ذکر ہے ـ مدرارا کشس ایکٹ سوم میں چندر اگپتا کو ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک لڑکی سنوترا اس کے ساتھ ہے ـ لڑکیوں کو ان کے ماں باپ سے خرید لیا جاتا تھا (سٹر یبو باب 15' فصل 55) اور شاہی حرم کے لیے خوبصورت جوان لڑکیاں پہلی صدیاں عیسوی میں بری گازا (بھڑوچ) کے مقام پر مغربی ساحل سے لائی جاتی تھیں ـ (پیرپلیس باب 49 اور دیکھو باب 8'9'31'32 ترجمہ لانگ مین 1912ء) چانکیا نے یہ مقرر کیا ہے کہ صبح کے وقت جب بادشاہ اٹھے تو سب سے پہلے کمانوں سے مسلح عورتیں اس کے سامنے آئیں (ارتھ شاستر باب 1' فصل 21 ترجمہ در میسور ریویو فروری 1907ء صفحہ 57' دوسری مرتبہ مطبوعہ صفحہ 49)

؁۱۱ ایسے ہی ایک نوکر کا (ساموا ہک) "ٹائی کارٹ" یا "ٹل کلے کارٹ" کے ناٹک میں ذکر آتا ہے جس کا رائڈر نے "ہارورڈ یونیورسٹی سیریز" میں ترجمہ کیا ہے' جلد 4 (1905ء)

؁۱۲ سٹر یبو ـ باب 15 فصل 69' ہیروڈوٹس باب 9 فصل 110 ـ ہیروڈوٹس نے یہ واقعہ مسٹیز کی بیوی کی وحشت ناک کہانی کے ضمن میں بیان کیا ہے کیونکہ ایران میں بادشاہ کے سر دھونے کی رسم اس کی سالگرہ کے موقع پر ادا کی جاتی تھی ـ اس لیے ہندوستان میں بھی اس رسم کو اسی موقع پر ادا کیا جاتا ہوگا ـ (دیکھو پرشین انفلوئنس آن موریا آرٹ ـ انڈین انٹی کویری 1905ء' صفحہ 201) مونڈے ہوئے سر جن کا آج کل کے ہندوؤں میں رواج ہوگیا ہے' اس زمانے میں اس کا دستور نہ تھا ـ بیان کیا گیا ہے کہ "ہندو شاذ و نادر ہی اپنے بال کٹواتے تھے اور اکثر کنگھی کیا کرتے تھے ـ ڈاڑھی کے بال وہ کبھی نہیں کاٹتے تھے لیکن باقی چہرے کے بال وہ منڈوایا کرتے تھے ـ" (کرٹیس باب 8 فصل 9)

؁۱۳ سٹر یبو باب 15 فصل 55 ـ اسی طرح برما کا بادشاہ بیدن سیشن یا بودہ پر بھی ایک سازش سے بچنے کے بعد اپنے سونے کے کمرے اور بستر کو روز بدل لیا کرتا تھا ـ (سنگر منو کی کتاب برمیز امپائر ـ جارڈائن کی ایڈیشن صفحہ 65)

؁۱۴ مدرارا کشس ـ ایکٹ دوم ـ (ولسن کا تھیٹر' باب 2 صفحہ 184) ـ

؁۱۵ ڈیوڈرس باب 2 فصل 41 ـ

؁۱۶ پلائنی باب 6 صفحہ 19' پلوٹارک الیگزینڈر باب 62 ـ

؁۱۷ ارتھ شاستر باب 7 ـ فصل 11 (انڈین انٹی کویری 1910ء صفحہ 68)

؁۱۸ ایرین ـ انڈیکا فصل 16 ـ

؁۱۹ سٹر یبو باب 15 فصل 52' ایلین باب 13 فصل 10 ـ پنجاب میں راجا پورس کی رتھوں میں "چار

گھوڑے جتے ہوئے تھے اور ان میں سے ہر ایک میں 6 آدمی سوار ہوتے تھے' جن میں سے دو کے ہاتھوں میں ڈھالیں ہوتیں' دو تیر انداز اور باقیماندہ دو رتھ ہانکنے والے۔ مگر وقت پڑنے پر جب گھمسان کا معرکہ شروع ہو جائے تو وہ بھی باگوں کو چھوڑ دشمن پر بھالے پھینکنے شروع کر دیتے تھے۔" (کرٹیس باب 8 فصل 14)

۲۰ سیول کی کتاب "اے فارگاٹن امپائر" صفحہ 147۔ اس کے علاوہ ہندی فوجوں کی عظیم تعداد کی اور مثالیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

۲۱ یہ افسر بالکل صحیح طور پر یونانی افسروں کی طرح تھے اور یہ ممکن ہے کہ چندرا گپتا نے یہ دستور یونانیوں سے ہی سیکھا ہو۔ مگر اس کے دیگر انتظامات میں یونانی اثر کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ ان یونانی افسروں کے متعلق دیکھو نیوٹن کے "اسیز آن آمدٹ اینڈ آرکیالوجی" صفحہ 3۔121 (کونسلر آفیسرس ان انڈیا اینڈ گریس انڈین انٹی کوری 1905ء صفحہ 200)

۲۲ ارتھ شاستر باب 4 فصل 2۔7

۲۳ وی۔ اے سمتھ کی کتاب "اشوکا دی بدھسٹ امپرر آف انڈیا۔" دوسری ایڈیشن' صفحہ 179۔

۲۴ فریگمنٹ نمبر 34 شوان بیک کی کتاب میں منقول از سٹریبو باب 15 فصل 1۔51 جس کا ترجمہ میک کرنڈل نے کتاب "این شنٹ انڈیا ایز ڈسکرائبڈ بائی میگا ستھینز اینڈ ایرین۔" صفحہ 78 اور بعد از نظر ثانی۔ اس کتاب این شنٹ انڈیا ایز ڈسکرائبڈ ان کلاسیکل لٹریچر صفحہ 54 جن الفاظ کا میک کرنڈل نے دونوں مرتبہ یہ غلط ترجمہ کیا ہے: "عام اشتہار کے ذریعے۔" اس کا اصل اور صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "سرکاری مہرسے۔" اس قسم کے قواعد و ضوابط بہت زمانہ نہیں گذرا کہ ہندوستان میں جاری تھے۔ فرانسیسی سیاح ٹریورنئے (پہلی ایڈیشن 1765ء) کہتا ہے کہ بنارس میں "دو بازار تھے جہاں سوتی اور ریشمی کپڑے اور دوسری قسم کا مال فروخت ہوتا تھا۔ ان مال اور اسباب کے بیچنے والوں میں سے بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہوں نے خود اس کو تیار کیا ہے اور اس طرح اجنبی لوگ خود کاریگر سے اشیاء خرید سکتے تھے۔ یہ کاریگر اپنے اسباب کو بازار میں لانے سے قبل ٹھیکے دار (یعنی فروخت پر محصول وصول کرنے کے ٹھیکے دار) کے پاس لے جاتے ہیں اور سوتی یا ریشمی کپڑے پر شاہی مہر لگائی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کریں تو یا تو ان پر جرمانہ کیا جاتا ہے یا تازیانے کی سزا دی جاتی ہے (وی بال' ترجمہ ٹریورنئے کی ٹریولز ان انڈیا صفحہ 118۔) اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ موریا خاندان کے زمانے میں بھی بنارس کا اونی کپڑا مشہور تھا۔ بہترین قسم کا کپڑا جنوب میں مدرا' کونکن کلنگ' بنارس مشرقی مکان (ودگا) و تسایا کوشامبی مہی شمتی (دریائے نربدا پر) سے آتا تھا (ارتھ شاستر باب 2' فصل 13) بندرگاہ دریائے گنگا اور سون پر واقع تھے۔ اینٹوں کے بنے ہوئے بندوں کے آثار

دریائے سون کے پرانے راستے کے قریب قریب اب بھی پائے جاتے ہیں۔

۲۵ یہ بیان کہ فاحشہ عورتوں سے جاسوسی کا کام لیا جاتا تھا سٹریبو باب 15، فصل 45 میں ہے۔

۲۶ اس کے متعلق تمام شہادت کا خلاصہ میکس ملر کی کتاب "انڈیا وٹ اٹ کین ٹیچ اس" میں ملے گا۔ (مطبوعہ 1883ء صفحہ 54)

۲۷ یہ ایرانی سزا تھی۔ چھوٹے جرائم کی سزا میں ناک یا شاید صرف بال کاٹ دیئے جاتے۔ بعض دفعہ صرف آدھا سر ہی منڈوایا جاتا تھا اور مجرم کی گردن میں ایک تختی لٹکا دی جاتی تھی اور اس طرح اس کی تشہیر کی جاتی تھی۔ (کنگسمل۔ رسالہ "اتھینیئم" 19 جولائی 1902ء میں یہ بیان اس نے چھٹی صدی کی ایک چینی کتاب "وے شو" سے نقل کیا ہے جس میں ساسانیوں کے زمانے کا ذکر ہے۔) وہ جرائم جن کے واسطے سر منڈوانا خود اختیاری سزا تھی ارتھ شاستر باب 4 فصل 9 میں مندرج ہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی چوریوں کے لیے جیسے 1/4 یا 1/2 چاندی کا پنہ (تقریباً 3 پنس یا 6 پنس) کی سزا یا تو (1) 6 پنہ کا جرمانہ، یا (2) سر کا منڈوانا، یا (3) جلاوطنی تھا۔ اگر چوری کے مال کی قیمت ایک اور دو پنوں کے درمیان ہوتی تو اس کی سزا یا تو (1) 24 پنوں کا جرمانہ ہوتی، یا (2) اینٹ سے سر کا منڈوانا اور یا (3) جلاوطنی۔ اینٹ سے سر منڈوانے کی سزا یقیناً سب سے سخت عذاب ہوگا اور ایسی چھوٹی چوری کے لیے یہ بڑی سخت سزا تھی۔ ایک چاندی کے پنہ یعنی 146 غیر خالص چاندی کے گرین کی قیمت ایک شلنگ فرض کی جاتی ہے۔

۲۸ کرٹیس باب 8 فصل 9۔

۲۹ "جو لوگ شاستروں کی تعلیم سے اچھی طرح واقف ہیں تسلیم کرتے ہیں کہ بادشاہ زمین اور سمندر دونوں کا ہوا کرتا ہے اور لوگ سوائے ان دو چیزوں کے تمام اشیاء پر اپنا حق مالکانہ استعمال کر سکتے ہیں۔" (شرح ارتھ شاستر باب 2، فصل 24)

۳۰ سٹریبو باب 10 فصل 40۔ اس عبارت میں یہ غلط بیان پایا جاتا ہے کہ کاشتکار کو پیداوار کا چوتھائی حصہ ملا کرتا تھا۔ ڈیوڈرس نے بالکل صحیح بیان کیا ہے کہ محصول زمین تمام پیداوار کا چوتھائی حصہ ہوا کرتا تھا۔

۳۱ ہم کو ارتھ شاستر سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی پر نہایت بھاری محصول لگایا جاتا تھا اور نہریں سخت قواعد و ضوابط کے تابع تھیں۔

۳۲ فریگمنٹ نمبر 34۔ سٹریبو باب 15 فصل 1۔ 50۔ گرنار (جونا گڑھ) کی قدیم عجائبات کو برگس نے "رپورٹس آرکیالوجیکل سروے ویسٹرن انڈیا" جلد دوم میں بیان کیا ہے اور اس موقعے کے متعلق مذکورہ بالا سروے بابت 99۔1898ء کی "پراگرس رپورٹ" میں مسٹر کوسنس نے بحث کی ہے۔۔ رودرا من کے کتبے کے لیے دیکھو سب سے آخر ایڈیشن ایپی گرافیا انڈیکا جلد آٹھ صفحہ 32 میں اور اس کا مختصر ترجمہ لیوڈر کی "فہرست" نمبر 965 (ایپی گرافیا انڈیکا جلد

دس، ضمیمہ صفحہ 99) یہ سنسکرت زبان میں لکھا ہوا سب سے قدیم بڑا کتبہ ہے۔ اس کے علاوہ اس سے قدیم مگر مختصر سنسکرت کتبہ جو دریافت ہوا ہے وہ متھرا کے نزدیک ائیاپور کے مقام پر ایک قربان گاہ کے ستون پر کندہ ہے اور اس کی تاریخ (یعنی 112؟) شاہی واشسک کے دوران حکومت کی ہے۔ (جے آر اے ایس 1902ء صفحہ 118) "راشٹریا" کے لفظ کا ترجمہ جو اس کتبے میں پشی گپتا کے نام کے ساتھ آتا ہے اصل میں گورنر ہے۔ تشاسف کا تذکرہ بھی ہے۔ مگر نام کی شکل سے صاف ظاہر ہے کہ وہ یقیناً کوئی ایرانی ہوگا۔ (ایمی گر۔فیا انڈیکا۔ جلد 8 صفحہ 46 حاشیہ)

کے میگا ستھینز نے پیشہ ور جماعتوں کو عجیب وغریب طور پر تقسیم کیا ہے اور اسی جماعت کے لفظ کا غلط ترجمہ "ذات" کر دیا جاتا ہے۔ اس نے ان کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے: (1) فلسفی، (2) زراعت پیشہ لوگ، (3) گوالے گڈریئے اور چرواہے، (4) اہل حرفہ اور تاجر، (5) سپاہ، (6) ناظر، (7) مشیر کار، (شوان بیک کی کتاب کا فر۔گمنٹ نمبر 32 منقول از ایرین کی کتاب انڈیکا 11-12) سٹریبو نے ان کے نام اور ہی بیان کیے ہیں۔ ان میں سے نمبر 2 د۔ہ کے نام ایرین کے ناموں سے ملتے جلتے ہیں۔ برہمنوں کی کتابیں جیساکہ سب کو بخوبی معلوم ہے تمام آدمیوں کو چار حصوں (ورن) میں تقسیم کرتی ہیں: یعنی برہمنی، چھتری یا راجیانا، ویش اور شودر۔ "ورن" کا ترجمہ ذات کرنا غلطی ہے۔

کے مگر بہرحال گدھے قدیم ہند یعنی پنجاب اور کوہستانی سرحد کے قریب کثرت سے مستعمل تھے جیسے کہ ایران میں ان کا ذکر رگ وید میں آتا ہے اور مہابھارت کی چند عبارتوں میں بھی ان کا، اونٹوں کا اور خچروں کا نام ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے کہ پنجاب میں واہیک اور مدرک کی اقوام، جن کا دارالسلطنت ساکلا (یعنی سیالکوٹ) تھا، انہیں کام میں لاتے تھے (سلوین لیوی انڈین انٹی کویری 1906ء صفحہ 17) دیکھو ارتھ شاستر باب 2 فصل 29، باب 7 فصل 12 اور باب 9 فصل 1) خچر فوجی کام کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

کے چانکیا نے ہاتھی کے مارنے والے کی سزا موت تجویز کی ہے۔ (باب 2 فصل 2) برما میں بادشاہ تمام ہاتھیوں کا مالک متصور ہوتا تھا اور خود اس کے پاس 6000 ہاتھی تھے۔ ہاتھی پر سوار ہونے یا ان کو رکھنے کا استحقاق صرف نہایت اعلیٰ طبقے اور ذی اقتدار لوگوں کو عطا کیا جاتا تھا۔ (دیکھو سائمز کی کتاب "ابی ٹو آوا" جلد دوم صفحہ 8، شائع کردہ کانسٹیبل)

کے سٹریبو باب 15 فصل 11۔ مغلیہ کوس یعنی ان ستونوں کے درمیان کا فاصلہ جو اب تک باقی ہیں، اوسطاً 4557 گز ہوا کرتا تھا (ایلیٹ۔ گلاسری۔ مضمون "کوس") فلیٹ نے "اوہ کوسیا" کے لفظ کے معنی جو اشوک کے ستونی فرمان نمبر 7 میں آتا ہے "آٹھ کوس کے فاصلے" کے بتائے ہیں نہ کہ "آدھا کوس" کے فاصلے کے لیے جیساکہ عام طور پر کہا جاتا ہے (جے۔ آر۔ اے۔ ایس

1906ء صفحہ 417، 1912ء صفحہ 238) اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ قدیم ہند میں صرف ایک ہی کوس کا فاصلہ ہوتا تھا اور یہ انگریزی ایک میل اور 240 گز کے برابر ہوتا تھا۔ مگر یہ مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہواشت یعنی آٹھ کے برابر مان لیا جائے۔ تین سٹیڈیا رومتہ الکبریٰ میں پہلی صدی عیسوی میں رائج تھے۔ یعنی فلیٹیرین فاصلہ جو تقریباً 650 انگریزی فیٹ یا تقریباً ایک فرلانگ ہوا کرتا تھا۔ اولمپک 600 فیٹ کا ہوتا تھا اور اراتو ستھینز فاصلہ تقریباً 520 فیٹ کا۔ کتاب پر یپلس کا مستعملہ سٹیڈیم یہی اراتو ستھینز والا معلوم ہوتا ہے جو تقریباً ایک انگریزی میل کا دسواں حصہ ہوتا تھا اور غالباً میگا ستھینز نے بھی یہی فاصلہ استعمال کیا ہے۔ (شاف کی کتاب "دی پیریپلس آف دی اریتھرین سی" 1912ء صفحہ 54)

۷ـــ نیارکس سب سے پہلا شخص ہے جس نے روئی کے کپڑے کے اس استعمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (سٹریبو باب 15، فصل 67) ایک صدی قبل میسور کے دکاندار اور تاجر عموماً 8 سے 12 انچ عریض اور 12 سے 18 فیٹ طویل روئی کے کپڑے کا ٹکڑا لکھنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ قدیم زمانے میں یہ ٹکڑے مسلیں اور دستاویزیں لکھنے کے کام آتے تھے۔ کنٹری زبان کو ان پر ایک ایسی چیز سے لکھتے تھے کہ جو مٹ سکتی تھی اور مٹنے کے بعد کپڑے کو پھر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ پارچے نہایت احتیاط سے طے کیے جاتے اور صندوقوں میں بند رہتے تھے۔ (ولسن۔ میکنزی کولیکشن صفحہ 346، دوسری ایڈیشن مدراس 1882ء) میگا ستھینز کا یہ بیان (سٹریبو باب 15، فصل 53) "یہ ہندوستانی فن تحریر سے بالکل نابلد تھے" غلط ہے۔ آگسٹس نے جو خط ایک ہندی راجا کے نام بھیجا تھا وہ جھلی پر لکھا ہوا تھا۔ درخت کی چھال جس کا ذکر ہوا وہ بھوج پتر تھا اور صرف شمالی ہند میں اس کا استعمال تھا۔ "درختوں کی چھال کے نرم حصے پر کاغذ کی طرح الفاظ لکھے جا سکتے ہیں۔" (کرٹیس باب 8 فصل 9) یونانی مصنفین کی کتابوں میں ہندوستان کے متعلق جو ظاہری تناقض معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف مصنف مختلف حصص ملک کا ذکر کرتے ہیں اور اس قسم کے عام بیان ہندوستان کے متعلق ہمیشہ غلط ہوا کرتے ہیں۔

۸ـــ "یہ ارتھ شاستر یا سیاست نامہ خلاصہ ہے تمام ان ارتھ شاستروں کا جو قدیم استادوں نے زمین کے محاصل اور اس کے انتظام کے متعلق بادشاہوں کی ہدایت کے لیے لکھے تھے۔" (باب 15 فصل 1، انڈین انٹی کویری 1910ء صفحہ 175) "شارحین کی شاستروں کی شرحوں میں بے شمار متضاد باتوں کو دیکھ کر وشنو گپتا نے یہ مقولے تصنیف کیے اور ان پر خود اپنی طرف سے شرحیں زیادہ کیں۔" (رسالہ مذکورہ بالا صفحہ 117)

۹ـــ ارتھ شاستر باب 4 فصل 11

۱۰ـــ ارتھ شاستر باب 4 فصل 8

۱۱ـــ باب 7 فصل 1 (انڈین انٹی کویری 1909ء صفحہ 303)

۴۲؎ باب 7 فصل 17 (انڈین انٹی کوری 1910 صفحہ 59)
۴۳؎ باب 4 فصل 2۔
۴۴؎ باب 7 فصل 3 (انڈین انٹی کوری 1909ء صفحہ 307)۔
۴۵؎ باب 7 فصل 3 (انڈین انٹی کوری 1909ء صفحہ 307)۔
۴۶؎ اس کے متعلق قواعد زیادہ تر باب 1۔ فصل 11۔ 12 میں ہیں۔
۴۷؎ باب 2 فصل 27۔
۴۸؎ باب 2 فصل 34۔
۴۹؎ باب 5 فصل 6 (انڈین انٹی کوری 1909ء صفحہ 208)۔
۵۰؎ تزک جہانگیری مترجمہ راجرس اور بیورج۔
۵۱؎ باب 1 فصل 17
۵۲؎ باب 1 فصل 19
۵۳؎ باب 1 فصل 15
۵۴؎ باب 1 فصل 12، 15
۵۵؎ ایضاً
۵۶؎ سکے کے لیے دیکھو باب 2 فصل 12، 14۔
۵۷؎ باب 2 فصل 8
۵۸؎ باب 2 فصل 24
۵۹؎ باب 4 فصل 3
۶۰؎ باب 5 فصل 2 (انڈین انٹی کوری 1909ء صفحہ 261۔
۶۱؎ باب 2 فصل 23
۶۲؎ باب 2 فصل 21۔ 22۔ بعد کے زمانے اور غالباً موریا خاندان کے زمانے میں عام طور پر یہ مہر سیندور سے لگائی جاتی تھی۔
۶۳؎ باب 2 فصل 35۔ 36
۶۴؎ باب 3 فصل 45
۶۵؎ باب 1 فصل 4
۶۶؎ باب 4 فصل 8
۶۷؎ دیکھو ضمیمہ خ
۶۸؎ جب وہ 326 یا 325 ق م میں سکندر سے ملا تو نہایت کم عمر تھا۔ (پلوٹارک کی الیگزینڈر۔ باب 62

"یہ چندر اگپتا جو ابھی بالکل ہی جوان تھا دفعتہ" ایک بڑی مملکت کا بادشاہ ہوگیا اور ہزاروں تخموں پر حکومت کرنے لگا۔" (مدر ارا کشس ایکٹ 7 ولسن کا صفحہ 249) ٹرنر اور روجے سنہا کے مہاومس کے ترجموں میں جو یہ بیان پایا جاتا ہے کہ چندر اگپتا نے چونتیس برس حکومت کی' یہ کاتب کی غلطی ہے (دیکھو رہس ڈیوڈس کی کتاب این شنٹ کائنز اینڈ میژرس آف سیلون صفحہ 41) گیگر کے ترجمے میں باب 5۔ صحیح طور پر چوبیس برس کا ذکر ہے۔ اس معاملے میں چونکہ بدھ مذہب اور برہمنوں کے اسناد متفق ہیں' اس لیے اس میں شک کی گنجائش نہ سمجھنا چاہیے۔

۶۹؎ چندر اگپتا کے سالوکس کے پاس زود اثر مردانہ قوت کی دوائیں بھیجنے کے عجیب وغریب قصے کے لیے دیکھو فیلارکس اور اپالونئس وسکولوس جو ملر کی کتاب "فرگمنٹیا۔ ہسٹاریکورم گریگورم" جلد اول صفحہ 344 میں منقول ہے۔

۷۰؎ سوراشٹر (یعنی کاٹھیاوار) مغربی ہند میں شک قوم کے سترپ کو آخر میں چندر گپت (ثانی) نے 390 بکرمی میں فتح کیا۔ دیکھو "پرشین انفلوئنس آن موریا انڈیا" (انڈین انٹی کویری 1905ء صفحہ 201) اس محب وطن ہندو نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چندر اگپتا کو نمونے کی خاطر ایران تک جانے کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اس کے لیے راماین میں دسرتھ ہی کی کہانی کافی تھی۔

۷۱؎ دیکھو بیون کی کتاب "ہاؤس آف سالوکس" جلد دوم صفحہ 289۔

۷۲؎ مسٹر لیوس رائس نے نہایت زور شور سے اس روایت کی اپنی بعض کتابوں میں تصدیق کی ہے۔ ان میں سے آخری کتاب "میسور اینڈ کرگ فرام دی انسکرپشنز" ہے۔ مطبوعہ 1909ء' صفحہ 309۔ ڈاکٹر فلیٹ اس کے برخلاف اس روایت کے غلط ہونے پر مصر ہے اور اس نے اپنے خیالات کا اظہار "انڈین انٹی کویری" جلد 21 (1892ء) صفحہ 287' ایپی گرافیکا انڈیکا جلد 3 صفحہ 171 نوٹ میں اور چند مرتبہ جے۔ آر۔ اے۔ ایس میں کیا ہے۔

۷۳؎ موریا خاندان کے متعلق سنین کے لیے دیکھو "اشوکا۔ دی بدھسٹ امپرر آف انڈیا" (کلیرنڈن پریس۔ دوسری ایڈیشن 1909ء) صفحہ 72۔73۔ بندوسار کا نام ہندوؤں کے "وشنو پران" جینوں کی "پری شسٹپردن" اور بدھ مذہب کی "مہاومس" اور "دیپاومس" میں پایا جاتا ہے۔ دوسرے پرانوں میں اس نام کے متعلق جو اختلاف ہے وہ محض کاتب کی غلطی پر مبنی ہے۔ سٹرابو کے بعض نسخوں میں "ایلی ٹروکیڈیس" بھی پایا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی نام کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اتھینوس نے جو نام لکھا ہے وہ غالباً سنسکرت لفظ کا ترجمہ کرنے کی کوشش ہے۔ ہندوستان کے بادشاہ اکثر ایک سے زیادہ ناموں سے موسوم ہوتے ہیں۔

۷۴؎ پلائی کی ہسٹری نٹ (؟) جلد چہارم صفحہ 17 (؟) پلائی کی کتاب کے متعلق خیال ہے کہ وہ 77ء

میں شائع ہوئی تھی۔

۵؎ مسٹر رائس کے خیال کے مطابق میسور میں تعلقہ شکار پور کے گاؤں بندن میں بارہویں صدی عیسوی کا ایک کتبہ پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کنتلا موریا خاندان کا صوبہ تھا۔ یہ غالباً دریائے بھیما دیداوتی کے درمیان کا علاقہ ہوگا۔ اس کے شمال میں گھاٹ تھے اور اس میں شموگا' چیتل ورگ' بلاری' دھرور' بیجاپور اور متصل احاطہ بمبئی اور سلطنت آصفیہ کے شمالی علاقے شامل ہوں گے (میسور گزیٹیئر 1897ء' جلد اول صفحہ 289)۔

۶؎ تاراناتھ (شیفیز صفحہ 89) نے مشرقی اور مغربی سمندروں کے درمیان کے علاقے کی فتح بندوسار اور چانکیا کے ساتھ منسوب کی ہے۔

۷؎ اشوکا۔ دی بدھسٹ امپرر آف انڈیا" دوسری ایڈیشن صفحہ 15۔

۸؎ مسٹر دی۔ اے سمتھ (اشوکا صفحہ 66) سٹریبو کی عبارت نقل کرتا ہے کہ سائلوکس نے آریانہ کا بڑا علاقہ اس کو تفویض کردیا۔ مگر اس کا سٹریبو نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ اراکوسیہ 'کابل اور یہاں تک کہ گدروسیہ کا علاقہ بھی ہندی راجا کے حوالے کرنے میں مسٹر سمتھ کے ثبوت کا تو کیا ذکر' قرین قیاس ہونے کی حد سے بھی زیادہ ہے۔

۹؎ اس دوران میں مسٹر شاستری کا تبادلہ بنگلور میں چمار اجیندر راسنسکرت کالج کی صدارت پر ہوگیا ہے۔

چھٹا باب

اشوک موریا

اشوک کی ولی عہدی

معتبر روایتوں کے موافق اشوک وردھن یا اشوک (جس نام سے کہ وہ عموماً مشہور ہے) نے اپنے باپ بندوسار کے عہد حکومت ہی میں اپنی ولی عہدی کا زمانہ اولاً شمال مغربی سرحدی صوبے اور بعد میں مغربی ہند کے نائب السلطنت کی حیثیت سے گذارا اور اسی زمانے میں اس نے سرکاری کاروبار اور سیاست مدن کی عملی تعلیم حاصل کی۔ بندوسار کے چند اور بیٹوں میں سے ایک بیٹا اشوک تھا اور بلاشبہ اس کے باپ نے اس کو ہونہار اور جانشینی کے لائق پاکر اپنا ولی عہد یا یُوراجہ سے منتخب کیا۔

ٹیکسلا

ٹیکسلا جو شمال مغربی صوبے کا مستقر تھا' جس میں غالباً کشمیر' پنجاب اور دریائے سندھ کے مغربی علاقے بھی شامل تھے' اس زمانے میں مشرقی دنیا کے سب سے بڑے اور عالیشان شہروں سے تھا۔ اس کے علاوہ وہ خصوصاً ہندی علوم وفنون کا مرکز ہونے کے سبب سے بھی ممتاز تھا۔ آبادی کے تمام اعلیٰ طبقوں کے بچے خواہ وہ برہمن ہوں یا شہزادے یا سوداگر ٹیکسلا میں اسی طرح جمع ہوتے تھے' جس طرح کے آج کل ایک یونیورسٹی کے شہر میں ہوتے ہیں۔ یہاں رہ کر وہ تمام ہندی علوم وفنون اور خصوصاً علم طب کی تحصیل کرتے تھے۔ اس مستقر صوبہ کے اردگرد کا علاقہ سرسبز و شاداب اور معمور تھا اور صرف ساٹھ یا ستر برس قبل ایک خودمختار ریاست کے زیرنگین تھا۔ جو اپنے ہمسایوں کے مقابلے میں کمزور ہو تو ہو مگر اتنی طاقتور ضرور تھی کہ سکندر کو متعدد بار مدد پہنچا سکے۔

ٹیکسلا کی رسوم و رواج

سکندر کے ساتھ آنے والے یونانیوں کا خیال تھا کہ ریاست پر بہت اچھی طرح حکومت ہوتی ہے۔ یہاں کی مقامی رسوم میں تعدد ازدواج، مُردوں کا کھلے میدانوں میں رکھا جانا کہ گدھ ان کو کھالیں اور ان لڑکیوں کا، جن کو حسب رواج تلاش سے شوہر نہ ملا ہو، کھلے بازاروں میں بکنا خاص طور پر بیان کرتے ہیں۔[1]

شہر کی عمدہ جائے وقوع

یہ شہر چونکہ اس شاہراہ پر واقع تھا جو وسط ایشیاء سے ہندوستان کے اندر جاتی تھی اس وجہ سے شمالی مغربی صوبے کے مستقر ہونے کے لیے خصوصیت کے ساتھ مناسب تھا۔ اس کے آثار کے قریب حسن ابدال شہر آج کل بھی ہندوستان کے فوجی اجتماع و قواعد کے لیے سب سے بہتر مقام شمار ہوتا ہے اور یہیں سے جنوب مغرب میں چند میل کے فاصلے پر راولپنڈی کا مقام ایک زبردست چھاؤنی ہے جو سکندر کے مثل شمال مغربی حملہ آور کی روک تھام کے لیے ہندوستان کے ناکے کی حفاظت کرتی ہے۔

اُجین

مغربی ہند کا دارالسلطنت اُجین بھی ایسا مشہور و معروف شہر ہے اور اسی کے مثل صوبہ دار کے مستقر کے لیے موزوں و مناسب تھا۔ یہ شہر ہندوستان کے سات متبرک شہروں میں شمار ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ اس شاہراہ پر واقع تھا جہاں سے مغربی ہند کے بارونق بندرگاہوں سے اندر کی طرف راستہ جاتا تھا۔ اس طرح اس میں دو خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ یاترا کا مشہور مقام بھی تھا اور تجارت کی منڈی بھی۔ یہ ہندی علم ہیئت کا مرکز تھا اور یہیں سے طول بلد کا شمار ہوتا تھا۔[2]

اشوک کی امن کے ساتھ تخت نشینی

لنکا کے ملک کی اس روایت کو باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جس وقت اشوک نے اپنے باپ کے مرض الموت میں مبتلا ہونے کی خبر سنی اور دارالسلطنت میں طلب ہوا وہ اس وقت اُجین میں تھا۔ مگر یہ روایت کہ اشوک کے سو بھائی تھے اور ان میں سے ننانوے کو قتل کرنے کے بعد اس نے تخت حاصل کیا، قابل اعتبار نہیں۔ یہ بیہودہ قصے معلوم ہوتا ہے کہ بھکشوؤں نے اس لیے گھڑ لیے ہیں کہ اشوک کے بودھ مت کو اختیار کرنے سے پہلے اس کے چال چلن کو نہایت کریہہ

صورت میں پیش کریں تاکہ اس کی آخری زندگی کی پرہیزگاری اور دینداری واضح تر ہو جائے۔ یقیناً اس کے عہد کے سترہویں یا اٹھارہویں [۱۳] برس اشوک کے بھائی بہن زندہ تھے اور وہ ان کے خاندانوں کی خبرگیری بڑی تندہی اور محبت سے کیا کرتا تھا۔ یہ کہیں نہیں ظاہر ہو تاکہ وہ اپنے رشتہ داروں سے کھٹکتا تھا۔ اس کا دادا چندرا گپتا' جس نے ایک غریب جلاوطن کی حیثیت سے ترقی کرکے بزور شمشیر تخت و تاج حاصل کیا تھا' قدرتی طور پر سازشوں اور دھڑے بندیوں کی آماجگاہ رہا اور اسی وجہ سے اس کو شک اور بدگمانی میں زندگی بسر کرنا پڑی تھی۔ لیکن اشوک بادشاہ کے گھر میں پیدا ہوا اور ایسی سلطنت اس کو ورثے میں ملی تھی جس کو پچاس برس کی مدت میں اس کے باپ اور دادا نے اپنے زور بازو سے مستحکم کیا تھا۔ اسی لیے یہ فرض کرلینے کی وجہ موجود ہے کہ اس کے ساتھ چندرا گپتا کی سی کوئی بدگمانی نہیں لگی ہوئی تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک اس کے فرامین سے کوئی کمزوری یا خطرہ نہیں ظاہر ہوتا اور غالباً وہ اپنے باپ کے انتخاب کے بموجب امن وامان سے اس کے تخت و تاج کا مالک ہوا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ شمالی ہند کی یہ روایت کہ جانشینی کے لیے اس میں اور اس کے بڑے بھائی سوسیم کے مابین کوئی تنازع ہوا' کسی واقعہ پر مبنی ہو۔ بظاہر لنکا کے بھکشوؤں کی حکایت کی بہ نسبت اس میں زیادہ تاریخی پہلو معلوم ہوتا ہے۔ [۱۴]

273ء یا 272ق م تخت نشینی' 269ق۔م تاج پوشی

کیونکہ اشوک نے پورے چالیس برس حکومت کی' اس لیے جب 273ق م یا اس کے قریب قریب اس نے اس سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا جس کو اس کے دادا اور باپ نے حاصل کرکے مستحکم کیا تھا تو اس وقت وہ بالکل جوان آدمی ہو گا۔ اس کے شروع کے گیارہ یا بارہ برس کے عہد حکومت کا حال بالکل معلوم نہیں۔ ظن غالب یہ ہے کہ یہ زمانہ معمولی انتظامات سلطنت میں گذرا ہو گا۔ اس کی باقاعدہ تاج پوشی 269ق م سے پہلے یعنی تخت نشینی سے چار سال بعد تک نہیں ہوئی اور تقریباً یہی ایک امر ہے جس سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ اس تخت نشینی میں مزاحمت اور تنازع ہوا ہو گا۔ اس کی تاج پوشی کی سالگرہ ہمیشہ نہایت دھوم دھام سے منائی جاتی تھی اور خصوصاً اس موقع پر قیدیوں کو معاف اور رہا کیا جاتا تھا۔ [۱۵]

261ق۔م' جنگ کلنگ

اپنی حکومت کے تیرھویں سال یا اگر تاج پوشی سے حساب لگایا جائے تو نویں برس اشوک نے اپنی تمام زندگی کی پہلی اور آخری جنگ کی تیاری کی جس کی تاریخ ہم تک پہنچی ہے' اور کلنگ کی سلطنت کو فتح اور الحاق سے اپنی سلطنت کو کامل کیا۔ کلنگ کا علاقہ خلیج بنگال کے ساحل پر

دریائے مہاندی اور گوداوری کے درمیان واقع تھا۔ یہ مہم پورے طور پر کامیاب ثابت ہوئی اور اس کے بعد سے کلنگ موریا سلطنت کا حصہ بن گیا۔ چند سال بعد کے دو خاص فرمانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئے مفتوحہ علاقے کے انتظام میں راجا کو بہت کچھ تردد کرنا پڑتا تھا کیونکہ راجا اشوک بھی اور بادشاہوں کی طرح کبھی کبھی اپنے ملازمین کے ہاتھوں تنگ آجاتا تھا۔ شاہی ہدایتیں یہ تھیں کہ مفتوحہ علاقے پر انصاف سے اس طرح حکمرانی کی جائے جس طرح باپ اپنی اولاد پر حکومت کرتا ہے۔ خصوصاً وہ اس بات پر مُصر تھا کہ نیم وحشی اقوام کے ساتھ نہایت ہمدردانہ سلوک کیا جائے۔ مگر ان ہدایتوں کو اس کے عمال بعض اوقات نظرانداز کردیتے تھے اور اس کو تنبیہہ کرنی پڑتی تھی کہ شاہی احکام کی خلاف ورزی کرنے سے نہ وہ خدا کی نظر میں اور نہ اپنے بادشاہ کے سامنے سرخرو ہوسکتے ہیں۔

جنگ کی آفات

کلنگ کی سلطنت کے پاس بہت بڑی فوج تھی' جس کا اندازہ میگاستھینز نے 60000 پیادے' 1000 سوار اور 700 ہاتھی کیا ہے۔ حملہ آوروں کی مزاحمت اور مقابلہ اس سختی سے کیا گیا کہ اس جنگ و فتح سے بے انتہاء مصائب ان لوگوں پر پڑے۔ فاتح نہایت رنج و اندوہ کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ 150000 آدمی اس میں قید ہوئے' 100000 مارے گئے اور اس تعداد سے کئی گنا زیادہ قحط' وباء اور دوسری آفات ارضی کی نذر ہوئے جو ہمیشہ افواج کے ہمرکاب ہوا کرتی ہیں۔

اشوک کا تاسف

ان تمام مصائب کا اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذرنا اور ساتھ ہی اس بات کا احساس کہ ان تمام مصائب کی وجہ صرف اسی کی ذات ہے' ان دونوں نے مل کر اشوک کے خیالات پر سخت اثر کیا اور وہ سخت پشیمان اور نہایت متاسف ہوا۔ یہی احساسات تھے جن کی بناء پر اس نے آخر میں یہ مصمم ارادہ کیا کہ اسکے بعد پھر کبھی ملک گیری کی ہوس اس کو اس بات پر آمادہ نہ کرے گی کہ وہ بنی نوع انسان پر ایسی بلائیں اور مصیبتیں نازل کرے۔ اس فتح کے چار ہی سال کے بعد وہ یہ کہتا تھا کہ "کلنگ کی فتح کے موقعے پر جتنے آدمی قتل کیے گئے یا قید ہوئے ان کی تعداد کے سویں یا ہزارویں حصے کا نقصان بھی اب مابدولت کے لیے سخت افسوس کا باعث ہوگا۔"

اشوک جنگ سے تائب ہوتا ہے

راجا نے جن اصولوں کا اپنے الفاظ میں اظہار کیا تھا انہی پر کاربند ہوا اور بقیہ زندگی ہمیشہ

جارحانہ جنگ سے درگذر کرتا رہا۔ اسی زمانے میں بدھ مذہب کی تعلیمات نے اس پر اپنا اثر کرنا شروع کیا اور جس قدر سال گذرتے گئے ان کے ساتھ اس کا شغف برابر زیادہ ہوتا گیا۔ وہ کہتا ہے کہ "سب سے بڑی فتح وہ ہے جو قانون پرہیزگاری" کے ذریعے سے حاصل کی جائے۔ وہ اپنے جانشینوں سے استدعا کرتا ہے کہ وہ اس عام خیال کو بالکل ترک کردیں کہ فوج کے ذریعے سے ملک گیری ہی بادشاہ کا اول اور آخر فرض ہے اور اگر بالفرض وہ اپنی خواہش اور تمنا کے باوجود لڑنے پر مجبور ہی ہوں تو اس حالت میں بھی وہ ان کو جتائے دیتا ہے کہ وہ نرمی اور تحمل سے کام لے سکتے ہیں' اور ان کو چاہیے کہ اصلی اور حقیقی فتح اسی کو سمجھیں جو قانون پرہیزگاری یا "فرض" سے حاصل ہو۔[6]

اشاعت اخلاق

اس زمانے کے بعد سے اشوک نے اپنی زندگی کا صرف یہ فرض قرار دے لیا تھا کہ اپنی وسیع مملکت میں اپنے غیر محدود شاہی اختیارات کو ایک اخلاقی قانون جسے وہ "قانونی فرائض" (یا دھم یا دھرم) کہتا ہے' کے سکھلانے' پھیلانے اور منوانے میں صرف کرے۔ اس قانون کو زیادہ تر اس نے بدھ مذہب کے واعظوں سے حاصل کیا تھا۔

257ء تا 256ق-م

اپنے عہد حکومت کے سترھویں یا اٹھارویں سال اس نے قطعی طور پر اس معاملے میں اپنے طرز عمل کے متعلق فیصلہ کیا اور رعایا میں اپنی حکومت کے اصول کا اعلان فرمانوں کے ذریعے سے کیا جن کو اس نے چٹانوں پر کندہ کرا دیا۔ ان میں چھوٹا سنگی فرمان نمبر1 اور چودہ سنگی فرامین شامل ہیں۔ ان میں اس نے وہ عام اصول درج کیے جن پر خداوندان نعمت کو عمل کرنا چاہیے۔

ان عجیب و غریب فرامین کے بعد ہی دوسرے فرامین شائع ہوئے جو نئے مفتوحہ علاقے کلنگ کے متعلق تھے اور جن کا ملخص پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ اس تمام سلسلے میں سب سے قدیم فرمان چھوٹا سنگی فرمان نمبر1 معلوم ہوتا ہے۔ یہ بہت مختصر ہے اور چھ مختلف صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ دوسرے طویل کتبوں کے ساتھ اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک بدھ مذہب کو اختیار کرنے کے بعد ڈھائی برس سے زیادہ تک دنیادار چیلا (اپاسک) رہا اور اس مدت میں اس نے اس معاملے میں انہماک سے کام نہیں کیا۔ مگر اپنے اعلانات کی اشاعت سے کم و بیش ایک برس قبل وہ بھکشوؤں کی جماعت (سنگھ) میں شامل ہو گیا تھا اور نہایت سرگرمی اور مستعدی سے مذہب کی اشاعت اور ترقی کی کوشش میں شرکت کرنے لگا تھا۔ وہ عجیب فرمان جو "بھابرو یا دوسرا بیراٹ

سنگی فرمان" کے نام سے مشہور ہے اور جس میں راجا نے مذہبی کتب کی سات عبارتوں کا ذکر کیا ہے اور مقتدایان مذہب اور عوام الناس کی توجہ خاص طور پر ان کی طرف مبذول کی ہے' غالباً اسی زمانے کا ہے۔[7]

تقریب 249ق-م' یاترا

249ق-م میں جب اس کو تخت پر بیٹھے ہوئے تقریباً چوبیس برس گزر گئے تھے' اشوک بدھ مذہب کی ارض مقدس کے سب سے زیادہ پاک مقامات کی زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ دارالسلطنت پاٹلی پتر سے روانہ ہو کر وہ شمال میں نیپال کی طرف شاہراہ پر روانہ ہوا جس کے اوپر پانچ بڑے بڑے ایک ہی پتھر کے تراشے ہوئے مینار اب بھی قائم ہیں'[8] اور وہ زمانہ حال کے ضلع مظفرپور اور چمپارن سے گزرتا ہوا بالآخر کوہستان ہمالیہ کے دامن تک پہنچا۔

بدھ کی جائے پیدائش

یہاں سے غالباً وہ پہاڑیوں کو قطع کیے بغیر مغرب کی طرف پھرا اور سب سے پہلے اس نے بدھ کی جائے پیدائش لمبنی باغ کی زیارت کی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں روایتوں کے مطابق مہاتما بدھ کی ماں مایا کو درد زہ شروع ہوا اور جہاں ایک درخت کے نیچے بدھ پیدا ہوا۔ اس جگہ اس کے رہبر اور مرشد اُپگپت نے راجا سے خطاب کیا کہ "اے مہاراجا یہاں وہ مقدس بزرگ پیدا ہوا تھا۔" اشوک نے وہیں ایک مینار قائم کیا اور اس پر یہ الفاظ کندہ کرا دیے جو اس وقت بھی ویسے ہی روشن ہیں جیسے کہ اس وقت تھے جب کہ وہ کندہ کیے گئے تھے۔ اور اس طرح اس نے اپنی یاترا کی یادگار قائم کی جو آج تک قائم ہے۔[9]

دوسرے مذہبی مقامات

رفتہ رفتہ اپگپت اپنے بادشاہ چیلے کو بدھ کے بچپن کے وطن کپل وستو لے گیا جو آج کل ترائی کے علاقے میں واقع ہے۔[10] اس کے بعد وہ بنارس کے پاس سارناتھ کے مقام پر گیا جہاں سب سے پہلے بدھ کو اپنے مذہب کی تبلیغ میں کامیابی ہوئی تھی۔ پھر وہ شراوستی گیا جہاں پر بدھ ایک مدت تک مقیم رہا تھا۔[11] پھر گیا کے بودھی درخت کی زیارت کی جہاں اس نے تمام گناہوں اور لذتوں کو زیر کیا تھا اور پھر وہ کوشی نگر آیا جہاں بدھ نے وفات پائی تھی۔[12] ان تمام متبرک مقامات پر بادشاہ نے بہت خیرات کی اور یادگاریں قائم کیں جن میں سے بعض ایک مدت کی فراموشی کے بعد اب دوبارہ دریافت ہوئی ہیں۔

اشوک تارک دنیا بھکشو بھی تھا اور بادشاہ بھی

اگرچہ موجودہ زمانے کے کسی شخص کو یہ ماننے میں دقت ہوگی کہ اشوک نے تارک الدنیا بھکشو ہونے کی قسم اور طرز زندگی بھی اختیار کرلی تھی اور پھر ساتھ ہی وہ ایک وسیع سلطنت پر خود مختار اور بلا شرکت غیرے بادشاہ بھی تھا۔ مگر اس امر میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں اور وہ خود اس کا اعتراف کرتا ہے۔ نو صدی بعد چینی یاتری آئی سانگ نے بیان کیا ہے کہ اشوک کا بت ایک خاص قسم کے سنیاسی لباس سے ملبوس ہے۔[13] ہمارے خیالات کے مطابق کسی بادشاہ کے لیے بغیر تخت و تاج سے دست بردار ہوئے تارک الدنیا ہو جانے میں جو نامناسبت پائی جاتی ہے اس کا آئی سانگ کو سان و گمان بھی نہ گذرا ہوگا۔ کیونکہ اسکے سامنے بالکل اسی قسم کی مثال اس کے ملک کے بادشاہ ووتی یاہیویں کی موجود تھی جو بدھ مذہب کا معتقد تھا اور دو مرتبہ اس نے 527ء اور 529ء میں بھکشوؤں کی زندگی اختیار کی۔[14] ایک اور مثال بارھویں صدی میں مغربی ہند کے ایک جین بادشاہ کی ملتی ہے جس نے "مذہب کا مرشد" ہونے کا لقب اختیار کیا اور اپنے عہد حکومت کے مختلف اوقات میں پرہیزگاری کے ساتھ سنیاس اختیار کیا۔[15] اس کے علاوہ بدھ مذہب کے بھکشو کو ہر وقت اختیار ہے کہ جب چاہے وہ اس سنیاس کو ترک کر کے پھر دنیا میں شامل ہو جائے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشوک وقتاً فوقتاً اسی طرح تھوڑی مدت کے لیے ترک دنیا کر کے سنیاسیوں میں داخل ہو جایا کرتا تھا اور اپنی اس غیر حاضری کے زمانے میں سلطنت کے نظم و نسق کے لیے خاطر خواہ انتظام کر جاتا تھا۔ اس بات کے باور کرنے کی وجوہ میں چھوٹا سنگی فرمان نمبر 1 اور بھابرو کا فرمان ایسے ہی زمانے میں نافذ ہوئے تھے جب کہ بادشاہ خود بیرات کے مقام پر گوشہ نشین تھا۔ علاوہ اس کے یہ بھی ایک زبردست بادشاہ کے لیے ممکن تھا کہ ان مشکلات کو کسی نہ کسی طریقے سے حل کرلیتا۔ اپنی زندگی کے آخری پچیس سال کے عرصے میں اشوک نے بلاشک وشبہ سلطنت اور مذہب کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ یعنی اسی طرح جس طرح یورپ میں اپنے آخر عہد میں شارلیمان نے کیا تھا۔

سات ستونی فرامین میں گذشتہ واقعات کا اعادہ

تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے تیس سال بعد 243 ق م یا اس کے قریب اشوک نے نئے فرامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جو سات ستونی کتبے کہلاتے ہیں۔ ان میں اس نے اپنی تمام گذشتہ تعلیمات کو دہرایا ہے اور آخر میں ان تمام طریقوں کو بیان کردیا ہے جو اس نے ان تعلیمات کو پھیلانے اور ان اصلاحات کو پورا کرنے کے لیے اختیار کرلیے تھے۔ انہی میں جانوروں کے ذبح

کرنے اور ان کے اعضاء کاٹنے کے متعلق قوانین ہیں کیونکہ یہ ایسے افعال تھے جن کو وہ دل سے ناپسند کرتا تھا۔

مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ان تمام اعادہ واقعات میں بیرونی مذہبی سفارتوں کا بالکل ذکر نہیں اور نہ اس میں مقتدایان بودھ مذہب کی کونسل کا ذکر ہے جو اس کے عہد حکومت کے دوران میں کسی وقت اس کے دارالسلطنت میں منعقد ہوئی اور جس کی سب سے بڑی غرض وغایت یہ تھی کہ مذہب میں جو اختلاف کا سیلاب بڑھ رہا ہے اس کو روک دیا جائے۔ یہ ممکن ہے کہ اس کونسل کا انعقاد ستونی فرامین کے نافذ کرنے کے بعد ہوا ہو۔ مگر یہ بتلانا کہ ان میں ان بیرونی سفارتوں کا کیوں ذکر نہیں پایا جاتا جن کو سنگی فرامین میں اتنی ممتاز جگہ دی گئی ہے' میری سمجھ سے باہر ہے۔

پاٹلی پتر کی کونسل

کونسل کے انعقاد کے واقعے پر روایات کی اتنی اسناد موجود ہیں کہ اس کو بلا تامل تسلیم کرلینا چاہیے۔ اگرچہ ان روایات میں جو تفاصیل درج ہیں ہرگز تاریخی نہیں سمجھی جاسکتیں۔ سارناتھ کے فرمان (مع اس کے اور اختلافات کے) میں اس نے خاص طور پر ان مذہبی اختلافات کے گناہ کبیرہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور میرا قیاس ہے کہ یہ فرمان اس کونسل ہی کی تجویزوں کا نتیجہ تھا۔ میں کونسل کے انعقاد کے متعلق لنکا کے سنین و تواریخ کو صحیح نہیں سمجھتا جو 236 بعد بدھ یعنی میرے سنین کے مطابق 251 ق م ہوتی ہے۔ میری رائے ہے کہ یہ کونسل راجا کے عہد حکومت کے آخری دس سال کے عرصے میں منعقد ہوئی تھی۔[16]

سلطنت کی وسعت

اس وسیع سلطنت کی حدود کا اندازہ تقریباً صحت کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جس پر اشوک حکمران تھا۔ شمال مغرب میں وہ کوہستان ہندوکش تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس میں ایک بڑا حصہ اس علاقے کا بھی شامل تھا جو آج کل امیر افغانستان کے ماتحت ہے اور ساتھ ہی بلوچستان اور سندھ کا تمام یا بڑا حصہ بھی اس سے ملحق تھا۔ سوات اور باجوڑ کی دور افتادہ وادیاں بھی شاہی عمال کی زیر نگرانی تھیں۔ ان کے علاوہ کشمیر اور نیپال تو یقیناً سلطنت میں باقاعدہ شامل تھے۔ کشمیر میں اشوک نے ایک دارالسلطنت تعمیر کیا اور اس کا نام سری نگر رکھا جو آج کل کے اسی نام کے شہر سے تھوڑے سے فاصلے پر واقع تھا۔[17]

اشوک نیپال میں

نیپال کی وادی میں اس نے پرانے دارالسلطنت منجوپٹن کی جگہ ایک اور شہر آباد کیا جس کا نام پاٹن 'للت پاٹن یا للت پور رکھا۔ یہ شہر اب بھی موجودہ مستقر سلطنت کھٹمنڈو کے جنوب مشرق میں ڈھائی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ للت پاٹن بعد کے زمانے میں ایک خود مختار سلطنت کا دارالسلطنت ہو گیا۔ مگر اب بھی اس پر بدھ مذہب کا وہ مخصوص رنگ چڑھا ہوا ہے جو اشوک نے اسے دیا تھا۔ اس شہر کو اس نے اپنے اس نیپالی سفر کی یادگار میں قائم کیا تھا جو اس نے 250ء یا 249 ق م میں یاترا کے دوران میں کیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی پارمتی بھی تھی۔ اس نے سنیاس کی زندگی اختیار کر لی تھی اور جب اس کا باپ کوہستان سے چلا آیا تو وہ وہیں نیپال میں اپنی زندگی کے دن بسر کرنے کے لیے رہ گئی۔ اس نے اپنے خاوند دیوپال کشتری کی یادگار میں ایک شہر دیوپٹن کے نام سے آباد کیا اور خود وہیں ایک خانقاہ میں' جس کی بنیاد خود اس نے ڈالی تھی' سنیاسیوں کی طرح رہنے لگی۔ یہ خانقاہ پسوپٹناتھ کے مقام پر بنائی گئی تھی اور اب تک اسی کے نام سے مشہور ہے۔ اشوک نے للت پاٹن کو بہت متبرک مقام سمجھا اور وہاں پانچ زبردست ستوپ قائم کیے جن میں ایک تو شہر کے عین مرکز میں تھا اور چار شہر کے باہر فصیل کے چاروں کونوں پر تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ تمام یادگاریں اب تک باقی ہیں اور اس کے بعد کے زمانے کی تمام دیگر عمارتوں سے بالکل ممیز ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی چھوٹی عمارتیں ہیں جو اشوک یا اس کی بیٹی کے نام کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں۔ [8]

مشرق کی طرف وسعت

مشرق کی طرف اشوک کی سلطنت میں دریائے گنگا کے دہانوں تک تمام بنگال کا علاقہ (ونگ) شامل تھا۔ ان ہی دہانوں میں تام رالپتی یعنی موجودہ تملوک سب سے بڑا بندرگاہ تھا۔ دریائے گوداوری کے شمال کا ساحلی حصہ جو کلنگ کے نام سے مشہور تھا' 261ق م زیر نگیں کیا گیا۔ زیادہ جنوب میں گوداوری اور کرشنا دریاؤں کے درمیان آندھر سلطنت اگرچہ خود اپنے راجا کے ماتحت تھی' کو بھی اشوک کی سلطنت کی سرحد سمجھا جاتا تھا۔

جنوب مغرب کی طرف وسعت

تامل سلطنتیں جو جزیرہ نما کے انتہاء تک اور جو چول اور پانڈیا کے نام سے مشہور تھیں یقیناً خود مختار تھیں اور یہی حالت جنوب مغربی یا ساحل مالابار کی سلطنتوں کریل پترا اور ستیا پتر کی تھی۔

[19] سلطنتوں کی جنوبی سرحد تقریباً صحت کے ساتھ دریائے پنار کے دہانے یعنی مشرقی ساحل پر ضلع نلور کے قریب سے لے کر کڈپہ میں ہوتی ہوئی اور جنوب میں چتیل درگ پر سے گذرتی ہوئی مغربی ساحل پر پہنچتی تھی۔ یہ لوا ملک کی شمالی سرحد تھی اور غالباً ستیا پتر کی سلطنت کی جگہ قائم تھی۔ [20]

وحشی اقوام

شمالی مغربی سرحد کی نیم وحشی اقوام اور ان اقوام کے متعلق جو بند ھیاچل کے ان پہاڑوں میں مقیم تھیں جو شمالی ہند کو جنوب سے جدا کرتی ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرکزی حکومت کی زیر نگرانی مگر تقریباً خود مختار تھیں۔ اس طرح اگر ہم موجودہ زمانے کے نام گنوانا چاہیں تو اشوک کی سلطنت میں ہندوکش پہاڑ کے جنوب میں افغانستان کا علاقہ' بلوچستان' سندھ' کشمیر کی وادی' نیپال' ہمالیہ کا زیریں حصہ اور تمام ہندوستان ماسوا انتہائے جنوب کے شامل تھا۔

وائسرائے

اس سلطنت کے وسطی حصوں کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ان پر خود بادشاہ کی زیر نگرانی پاٹلی پتر سے حکومت ہوتی تھی۔ دور دست صوبہ جات کے اوپر نائب السلطنت مقرر تھے۔ اس قسم کے صوبے بظاہر کم از کم چار ضرور تھے۔ شمال مغربی حصے کے حکمراں کا مستقر ٹیکسلا تھا اور اغلب یہ ہے کہ پنجاب' سندھ' دریائے سندھ کے اس طرف کا علاقہ اور کشمیر کے ممالک اس کی زیر حکومت تھے۔ مشرقی ممالک پر' جن میں کلنگ کا علاقہ بھی شامل تھا' ایک نائب السلطنت مقرر تھا جس کا مستقر ایک مقام توسلی نامی تھا۔ مگر اس کا موقعہ ابھی تک متعین نہیں ہو سکا۔ مالوا' گجرات اور کاٹھیاواڑ کے مغربی صوبے ایک تیسرے صوبے دار کے ہاتھ میں تھے اور اس کا مستقر اُجین قدیم شہر میں تھا۔ ماوراء نربدا کے جنوبی صوبے ایک چوتھے نائب السلطنت کے زیر نگیں تھے۔ [21]

تعمیرات

اشوک کو عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ اس کی تعمیرات کی عظمت و شان نے عوام کے دل و دماغ پر ایسا گہرا اثر کیا تھا کہ اس کی روایتیں اور حکایتیں گھڑلی گئی ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تین برس کی قلیل مدت میں چوراسی ہزار ستوپ تعمیر کرائے تھے۔ جب سب سے پہلا چینی یاتری فاہیان اشوک کے دارالسلطنت پاٹلی پتر میں چندر گپت بکرماجیت کے عہد حکومت یعنی پانچویں صدی عیسوی کے شروع میں پہنچا تو اس وقت اشوک کا شاہی محل موجود تھا اور اس کے

متعلق عوام کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ مافوق العادات قوتوں کے ذریعے بنایا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے: "شاہی محلات اور ایوان جو شہر کے درمیان میں اسی طرح قائم ہیں جیسے کہ قدیم زمانے میں تھے' ان طاقتوں نے بنائے تھے جو اس کے ملازم تھے۔ انہوں نے ہی پتھروں کو ایک دوسرے پر جمایا' دیواریں اور دروازے قائم کیے اور ایسا خوبصورت پچی کاری کا کام کیا جو انسانی طاقت سے باہر ہے۔"

یہ تمام عالیشان عمارات ناپید ہو گئی ہیں اور ان کے آثار اب دریائے گنگا اور سون کی تہوں کے نیچے اس قدر گہرے مدفون ہیں کہ ان کی تحصیل اب بالکل ناممکن الحصول ہے۔ ان ہی کھنڈروں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریلوے لائن' پٹنہ کا شہر اور بانکی پور کی انگریزی آبادی قائم ہے۔ مگر بہرحال برائے نام اور بے ترتیب کھدائی کے کام نے بھی اتنا ضرور ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر کر دیا ہے جس سے کہ یاتری کے پرجوش بیان کی صحت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور میں نے بچشم خود وہ نہایت اعلیٰ درجے کے منقوش پتھر کے ستون دیکھے ہیں جو بانکی پور کے مقام پر کھود کر نکالے گئے تھے۔

اشوک کے محلات کی طرح اس کی بنائی ہوئی بے شمار اور عالیشان خانقاہیں بھی کالعدم اور اس قدر برباد ہو گئی ہیں کہ ان کا پہچاننا ناممکن ہے۔

سانچی کے ستوپ

اشوک کے تمام زمانے کی عمارات میں سے جو چیز تباہی سے بچ رہی ہے اور اس حالت میں ہے کہ اس سے کسی قسم کا اندازہ لگایا جا سکے وہ مشہور و معروف ستوپ ہیں جو وسط ہند میں سانچی کے مقام پر یا اس کے قریب اُجین کے نزدیک ہی واقع ہیں جہاں اشوک اپنی شاہزادگی کے زمانے میں مغربی ہند پر حکومت کرتا تھا۔ جنگلے کے نہایت ہی عمدہ منقوش دروازے' جن کو کہ بہت مرتبہ بیان کیا جا چکا ہے اور اکثر نقشے شائع ہو چکے ہیں' یا تو خود اس شہنشاہ اعظم کے زمانے میں بنائے گئے تھے' اور یا کم از کم اس کے بہت ہی کم بعد کے زمانے کے ہیں۔

ایک پتھر کے تراشے ہوئے مینار

اشوک نے اپنے عہد حکومت کے دوران میں بے شمار ایک پتھر کے گھڑے ہوئے سنگی ستون سلطنت کے قریبی صوبوں میں نصب کرائے۔ ان میں سے بعض پر اس کے فرامین کندہ ہیں اور بعض پر نہیں۔ چند ستون ایسے ہیں جو بلندی میں پچاس فٹ ہیں اور وزن میں تقریباً 50 ٹن۔ یہ ستون نہ صرف اس کے زمانے کے قابل یادگار آثار ہیں بلکہ وہ قدیم ترین نمونے ہیں جو ہم کو

ہندی فن تعمیر کے متعلق مل سکتے ہیں۔ ان کا نقشہ ایرانی نمونے سے لیا گیا ہے۔ مگر اس میں بہت جدت سے کام لیا گیا ہے اور ساتھ ہی کاریگری بھی تکمیل کو پہنچی ہوئی ہے۔[۲۲]

غاروں کے مکانات

برابر کی پہاڑیوں میں گیا کے قریب اشوک نے نہایت ہی سخت سنگ خارا کی چٹانوں میں صاف شفاف دیواروں کے مکانات کھدوائے تھے۔ یہ مکانات اجیوک سنیاسیوں کے لیے تیار کیے گئے تھے جو نہایت ہی قدیم مذہبی فرقہ تھا اور جین اور بدھ مت دونوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ ان مکانات کو دیکھنے سے آدمی کو اس قسم کے مصری مکانات یاد آجاتے ہیں۔[۲۳]

کتبات

ان تمام چیزوں کے علاوہ اشوک کے زمانے کی سب سے زیادہ دلچسپ یادگاریں اس کے کتبے ہیں۔ یہ تعداد میں تیس سے کچھ زیادہ ہیں اور چٹانوں' بڑے بڑے پتھروں' غار کی دیواروں اور ستونوں پر کندہ ہیں۔ یہی کتبے اس کے زمانے کی تاریخ کی بہترین اور سب سے معتبر اسناد ہیں۔ اسی لیے قبل اس سے کہ میں اس کے عقائد اور حکمت عملی پر بحث کروں' ضروری ہے کہ میں ان کتبوں پر تبصرہ کروں۔ ان میں سے زیادہ اہم کتبے وہ ہیں جن سے اس کی حکومت کے نظم و نسق اور اس کے فلسفہ اخلاق کا تفصیلی پتہ چلتا ہے۔ یہ اس کی شخصیت اور عادات و خصائل پر بھی بہت کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ مختصر کتبات میں نذرانوں کی عبارتیں' یادگار کے طور پر مختصر بیانات اور دوسری باتیں ملتی ہیں۔ مگر بہرحال سب سے مختصر کتبوں کی بھی خاص اہمیت ہے۔[۲۴]

ان کتبات کی وسعت

یہ کتبے تقریباً تمام ہندوستان میں' یعنی کوہستان ہمالیہ سے لے کر میسور تک اور خلیج بنگال سے لے کر بحیرۂ عرب تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ان کی زبان

تمام کتبے مختلف قسم کی پراکرت زبان میں لکھے ہوئے ہیں' یعنی وہ مقامی زبانیں جن کا تعلق ایک طرف تو علمی سنسکرت زبان سے تھا اور دوسری لنکا کے بدھ مذہب کی پالی زبان سے۔ مگر خالصتاً یہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ اسی لیے بظاہر ان کا مقصد اور ان کی اصلی غایت یہ ہے کہ عوام اس کو پڑھیں اور سمجھ سکیں۔ ان کے وجود ہی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس

زمانے میں لکھنے پڑھنے کا علم عام تھا۔ یہ کتبے جو بالتخصیص عوام کی تعلیم کے لیے شائع کیے گئے تھے، اور یا تو شاہراہوں پر یا زیارت کے ایسے مقامات پر کندہ کروائے جاتے تھے جہاں لوگوں کی آمدورفت زیادہ ہو اور جہاں ان کی اشاعت بھی آسانی سے ہو سکے۔

الفاظ اور طرز تحریر

چودہ سنگین فرامین کے دو نسخے جو ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے قریب کے مقامات میں چٹانوں پر کندہ ہیں، اس زبان کے حروف میں لکھے ہوئے جو وہاں مقامی طور پر رائج تھے اور جن کو علماء آج کل کروشتی حروف کہتے ہیں۔ یہ حروف قدیم آرامی زبان کے حروف سے ماخوذ ہیں اور دائیں جانب سے بائیں طرف کو لکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے پنجاب کے علاقے میں چوتھی یا پانچویں صدی قبل مسیح میں ایرانی عہد حکومت کے دوران میں رواج پایا۔ ان کے علاوہ اور تمام کتبے براہمن حروف کی کسی نہ کسی شکل میں کندہ ہیں۔ یہی وہ حروف ہیں جن سے کہ موجودہ دیوناگری حروف اور مغربی اور شمالی ہندوستان کی زمانہ حال کی طرز تحریر ماخوذ ہے۔ یہ بائیں سے دائیں جانب کو لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ [25]

کتبات کی آٹھ قسمیں

یہ تمام کتبے نہایت آسانی سے آٹھ قسموں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں اور ان کو تقریباً صحیح سنین کے لحاظ سے مندرجہ ذیل ترتیب دی جاسکتی ہے:

1۔ چھوٹا سنگی فرمان۔۔ اس نمبر1 کے چھ مختلف نسخے پائے جاتے ہیں اور وہ تقریباً سب کے سب چودہ سنگین فرمانوں سے ذرا قبل ہی کے زمانے یعنی 257 ق م کے ہیں۔ نمبر2 غالباً اس سے ذرا بعد کا ہے۔

2۔ بھابھرو کا فرمان، یہ بھی تقریباً اسی سن کا ہے جس کا کہ سنگی فرمان نمبر1 ہے۔

3۔ چودہ سنگی فرامین جن کے سات نسخے ملتے ہیں اور اسکی حکومت کی تیرہویں یا چودھویں سے ان کی تاریخ شروع ہوتی ہے یعنی 257 ق م یا 256 ق م سے۔۔

4۔ کلنگ ملک کے دو فرامین، جو غالباً 256 ق م میں نافذ ہوئے اور جن کا تعلق صرف جدید مفتوحہ ملک ہی سے تھا۔

5۔ گیا کے قریب برابر کے مقام پر تین نذرانے کے غاری کتبات جو 257 اور 250 ق م میں لکھے گئے۔

6۔ ترائی کے علاقے کے دو ستونی کتبے، 249 ق م میں۔

7- سات ستونی فرمان' یہ چھ مختلف صورتوں میں پائے جاتے ہیں اور 243 اور 240 ق م میں شائع ہوئے۔

8- چھوٹے ستونی فرامین تقریباً 240 ق م میں یا اس کے بعد کندہ کرائے گئے۔

چھوٹے چٹانی فرامین

اشوک کے تمام کتبوں میں سب سے زیادہ مشکلوں کا سامنا پہلے چھوٹے سنگی فرمان کو سمجھنے اور مطلب نکالنے میں ہوتا ہے۔ مگر یہ تمام مشکلیں آہستہ آہستہ حل ہوتی جاتی ہیں اور اب کم از کم اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ اس کتبے میں تاریخ موجود نہیں۔ [۲۶] اشوک کی حکومت کے متعلق اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ فرمان نمبر 2 میں محض قانون فرائض یا دھرم کا خلاصہ دیا گیا ہے۔

بھابھرو کا فرمان

بھابھرد کے فرمان کی خاص اہمیت بدھ مذہب کے مذہبی قانون کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اس میں ان کی مذہبی کتابوں کی سات عبارتیں ایسی منقول ہیں جن کی طرف بادشاہ خاص طور پر اپنی رعایا کی توجہ دلانا چاہتا تھا۔ ان تمام عبارتوں کا اب پتہ لگا لیا گیا ہے۔ [۲۷] ممکن ہے کہ جب اشوک نے اس فرمان کی تیاری کا حکم دیا ہو تو وہ خود بیرات کے مقام پر کسی خانقاہ میں مقیم ہو۔

چودہ چٹانی فرمان

ان چودہ فرامین میں اشوک نے اپنے اصول سلطنت اور فلسفہ اخلاق کی تشریح کی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک فرمان صرف ایک ہی مضمون کے لیے مخصوص ہے۔ مختلف نسخوں میں بہت کچھ اختلاف ہے اور بعض میں سب کے سب چودہ فرامین بھی شامل ہیں۔ مگر بہرحال یہ سلسلہ مع اس کے تمام اختلافات کے دور دراز سرحدی صوبے تک ہی محدود ہے۔ جو صوبہ داروں کے زیر حکومت تھا۔ غالباً راجا کا خیال تھا کہ مرکزی صوبوں میں جو ذاتی طور پر اس کے زیر نگرانی تھے' یہ ضروری نہیں کہ اس کی تعلیمات کو پتھروں پر کندہ کرایا جائے کیونکہ ان کے علاوہ اور بھی ایسی صورتیں موجود تھیں جس سے کہ ان کی اشاعت کی جا سکتی تھی۔ مگر کچھ سال بعد اس نے اپنے قانون کو ان مرکزی صوبوں میں بھی پتھر کے ستونوں پر کندہ کرا کے بقائے دائمی بخش دی تھی۔ [۲۸]

کلنگ کے فرامین

یہ فرامین دراصل ان چودہ سنگی فرامین کے سلسلے کا ایک خاص ضمیمہ ہیں اور ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ ان اصولوں کو قائم کر دیا جائے جن کی رو سے نو مفتوحہ علاقے اور ان نیم وحشی اقوام پر حکومت کی جا سکے جو اس کی سرحد پر آباد تھے۔ ان کو بعض باقاعدہ فرامین کی جگہ قائم کیا گیا ہے (نمبر 11' 12' 13) اور ان فرامین کو کلنگ کے فرامین سے یہ سمجھ کر محذوف کر دیا گیا ہے کہ وہ مقامی حالات کے موافق نہیں۔

غار کے کتبے

ضلع گیا میں برابر کے مقام پر غار کے تینوں کتبے درحقیقت نہایت ہی مختصر نذرانے کی عبارتیں ہیں جو ان قیمتی مکانات کو اجیوک فرقے کے سنیاسی لوگوں کو دیے جانے کے وقت لکھی گئی تھیں۔ اس فرقے کے لوگ عام طور پر ننگے پھرا کرتے تھے اور ریاضت ہائے شاق کی وجہ سے مشہور تھے۔ یہ عبارتیں خاص طور پر اس وجہ سے زیادہ اہم ہیں کہ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشوک نے اکثر اعلان کیا تھا کہ وہ تمام مذاہب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ اس نے یہ کر کے بھی دکھا دیا۔ چونکہ یہ اجیوک فرقے کے لوگ قضاء وقدر کے قائل تھے اور بدھ مت کے ساتھ ان کا یا تو بالکل تعلق تھا ہی نہیں اور اگر تھا بھی تو برائے نام۔

ترائی کے ستونی کتبے

ترائی کے علاقے کے دو ستونی کتبے اگرچہ نہایت ہی مختصر ہیں البتہ بعض وجوہ سے بہت دلچسپ ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان سے اس ادبی روایت کی صحت کا ثبوت ملتا ہے کہ اشوک واقعی یاترا کے لیے بدھ مذہب کی "ارض مقدس" کے مذہبی مقامات میں خود گیا تھا۔ رمنڈئی یا پدرایا کتبے کی (جو اس وقت بالکل صحیح سالم حالت میں موجود ہے۔) یہ اہمیت ہے کہ اس سے بلا کسی شک وشبہ کے اس لمبنی باغ کے اصلی صحیح موقعے کا پتہ لگ جاتا ہے' جہاں منقول ہے کہ گوتم بدھ پیدا ہوا تھا۔ اس دریافت کی وجہ سے یا تو بہت سے مسائل بالکل حل ہو جاتے ہیں یا کم از کم ان کے حل کرنے میں ضروری مدد ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کے کتبے سے' جو نگلیو کے مقام پر اس سے کم محفوظ حالت میں ملا ہے' یہ نہایت دلچسپ بات معلوم ہوتی ہے کہ راجا اشوک صرف گوتم بدھ کو اپنا مذہبی مقتداء نہ سمجھتا تھا بلکہ اسکے مذہب میں اس کے پیشرو یعنی "سابق بدھ" بھی شامل تھے۔[29]

ستونی فرامین

سات ستونی فرامین 243 ق م میں یا اس کے قریب قریب اپنی کامل صورت میں اس وقت نافذ کیے گئے جبکہ اشوک تیس سال تک حکومت کر چکا تھا اور اپنی زندگی کے آخری دن گذار رہا تھا۔ ان فرامین کو چودہ سنگی فرامین کے ساتھ رکھ کر غور کرنا چاہیے۔ ان میں ان سنگی فرامین کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور ان کو ان ساتوں کا ایک قسم کا ضمیمہ تصور کرنا چاہیے۔ وہ اصول جن کو شروع کے فرامین میں شائع کیا تھا' اب آخری زمانے میں ان کا اعادہ کیا گیا ہے اور ان پر زور دیا گیا ہے۔ اہنسا کے متعلق قوانین کو باقاعدہ طور پر شائع کیا گیا ہے۔ اس تمام سلسلے کے آخر میں ستونی فرمان نمبر 7 ہے جو سب سے زیادہ قابل قدر ہے۔ یہ صرف ایک ہی یادگار میں محفوظ ہے اور اس میں سلسلہ وار ان تمام باتوں کا ذکر ہے جو راجا نے پرہیزگاری کو اپنی سلطنت میں رواج دینے کے لیے کیں۔ [۳۰]

چھوٹے ستونی کتبات

1905ء میں سارناتھ کے فرمان کے معلوم ہونے سے قبل ان چھوٹے ستونی کتبات کی اصلی تاریخی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ مگر اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ سانچی اور کوسمبی کے فرامین' جو ایک مدت سے دنیا کے سامنے تھے' سارناتھ کے بہتر اور محفوظ تر کتبے کے باختلاف عبارت نقل ہیں۔ اور کیونکہ ان تینوں فرامین میں مذہبی تفرقہ اندازی کے متعلق سزاؤں کا ذکر ہے اس لیے یہ فرض کر لینا قرین قیاس ہے کہ ان میں اس کونسل کے فیصلے درج ہیں جو ان ہی اختلافات و تفریقات کو مٹانے کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ بلکہ ایک فرمان محکمہ خیرات کے متعلق ہے۔ [۳۱]

کتبات اور روایات کی شہادت کا تعلق

ہمارے نزدیک وہ ملخص جو گذشتہ صفحات میں ان کتبات کا درج کر دیا ہے اس سے ناظر کتاب کو کافی اندازہ ان عجیب و غریب کتبات کے سلسلے کی اہمیت کا ہو سکتا ہے جو اشوک نے 257 اور 232 ق م کے مابین نافذ کیے تھے۔ کیونکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی بناء پر اشوک کے عظیم الشان عہد حکومت کی تاریخ صحیح طور پر لکھی جا سکتی ہے۔ مگر ان کے علاوہ ادبی روایتوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ اگر اصلی نہیں تو کم از کم اس سے کم درجے کی شہادت تو ضرور بہم پہنچاتی ہیں اور ایسی جو راجا اشوک کے عہد حکومت کے متعلق روایتوں کی شہادت کی

نسبت تشریح کے طور پر چند کلمات لکھ دینا لابدی اور ضروری ہیں۔

اشوک کے متعلق حکایات

اشوک کے متعلق بے شمار حکایتوں کے مشہور ہو جانے سے ہی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عوام کے دل ودماغ پر اس کی زبردست شخصیت نے کیا کچھ اثر کیا تھا۔ بدھ مذہب کے ممالک میں اشوک کی شہرت کا بعینہ وہی درجہ ہے جو شارلیمان کا زمانہ وسطٰی کے یورپی ممالک میں۔ اور دور از کار حکایات، جن کی وجہ سے اشوک کی تاریخ تاریکی میں گم ہو جاتی ہے، ان حکایتوں کے مقابلے میں رکھی جاسکتی ہیں جنہوں نے سکندر، آرتھر اور شارلیمان کی شخصیتوں کو بالکل گھیر لیا ہے۔ اشوک کے متعلق یہ حکایتیں بہرحال بالکل بناوٹی اور دور از کار ہی نہیں بلکہ ان میں تھوڑی بہت حقیقی تاریخی روایتیں بھی ملی جلی ہوئی ہیں۔ مگر جس طرح "مارتے ڈارتھر" اور نام نہاد "کلستھینز" کی حکایتوں پر انگلستانی ہیرو یا مقدونوی بادشاہ کی تاریخوں کا انحصار نہیں ہو سکتا، بعینہ اسی طرح ان پر اشوک کے عہد حکومت کی سنجیدہ تاریخ کی بناء نہیں قائم کی جاسکتی۔ تنقید کا یہی وہ صریح وبین اصل اصول ہے جس کو موریا خاندان کے بہت سے مورخین نے نظرانداز کر دیا ہے۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ صحیح جانب سے شروع کر کے سب سے پہلے قدیم ترین کتبات کو لیتے، غلطی سے اپنی تاریخ کا آغاز بعید ترین حکایات سے کیا۔

ان حکایات کی دو روئی

اشوک کے متعلق حکایت ہم کو دو طرف سے ملتی ہیں۔ ایک تو لنکا کی طرف سے اور دوسری شمالی ہند کی طرف سے۔ اور چونکہ لنکا کی یہ مختلف روایتیں ایسی کتابوں میں مذکور ہیں جن کو باقاعدہ کتب تاریخ ہونے کا ادعا ہے، جن میں سنین وتواریخ کا التزام بھی ہے اور وہ تقریباً 80 سال سے یورپ کے پیش نظر ہیں۔ ان تمام وجوہ کی بناء پر ان جنوبی روایات نے ایک خاص شہرت اور وقعت حاصل کرلی ہے۔ لنکا کی سب سے قدیم تاریخ دیپاومس غالباً چوتھی صدی عیسوی میں تصنیف ہوئی اور اس طرح وہ اشوک کی موت کے کم از کم چھ صدی بعد کی کتاب ہے اور اس کا ہمعصر تاریخ ہونے کا دعویٰ بالکل غلط ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہے کہ وہ بالکل بیکار ہی ہو بلکہ اکثر اوقات کام دے سکتی ہے۔

شمالی ہند کی روایات بہتر اسناد ہیں

شمالی ہند کی روایات بھی تقریباً اتنی ہی قدیم ہیں۔ مگر کیونکہ وہ مختلف ہندی، نیپالی، چینی، تبتی

کتابوں میں مذکور ہیں' اس لیے اب تک ان پر کماحقہ غور و فکر نہیں کیا گیا۔ تمام روایتی مواد کو بہت احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے اور وہ بھی صرف معتبر اور محقق اسناد کے ضمیمے کے طور پر۔ مگر تھوڑے غور کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ان روایتوں میں جو شمالی ہند یعنی اشوک کی سلطنت کے عین مرکز میں مشہور ہوں تاریخی مواد کا ملنا ان روایات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ممکن ہے' خصوصاً جیسا کہ دوسری روایتیں اس دور دراز ملک میں ترجموں کے ذریعے نہیں معلوم کس طرح اور کہاں سے پہنچیں۔ اس قیاس کی تصدیق اس وقت ہوتی ہے جبکہ ہم دونوں قسموں کی روایتوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں۔ اس وقت یہ واضح ہوتا ہے کہ ان اہم مقامات میں جہاں کہ دونوں میں اختلاف ہے' شمالی ہند کی روایات صریحاً زیادہ قابل اعتبار و اعتماد ہیں۔

ضمیمہ د

اشوک کے کتبات: ان کے متعلق کتب پر ایک نوٹ

(یہ بیان ہماری کتاب "اشوکا" دوسرا ایڈیشن صفحات 202 تا 204 پر مبنی ہے۔ مگر اس کو بالکل کامل کر دیا گیا ہے۔)

پرنسپ وغیرہ کی پرانی اور متروک کتابوں کا ان میں ذکر نہیں کیا گیا۔ 1902ء تک کے اس مضمون کے متعلق تمام کتابوں کی مفصل فہرست آر۔ آٹو۔ فرینک کی کتاب "پالی اُنڈ سنسکرت" مطبوعہ سٹراسبرگ 1902ء کے صفحہ 5-1 پر ملے گی۔ مندرجہ ذیل فہرست میں 1913ء تک کی تمام کتابیں شامل ہیں اور گمان یہ کیا گیا ہے کہ یہ فہرست تقریباً کامل ہے، کم از کم جہاں تک کہ مشہور اور ضرور کتب کا تعلق ہے۔ مگر بہر حال یہ ممکن ہے کہ چند مضامین نظرانداز ہو گئے ہوں۔

1۔ عام کتب

امیلی سینارٹ: لیس انسکرپشنز ڈی پیڈ ئی (پیرس۔ جلد اول 1881ء، جلد دوم 1886ء)۔ یہ زبردست کتاب اگرچہ ایک حد تک بعد کی تحقیقات اور دریافتوں کی وجہ سے پرانی ہو گئی ہے، مگر پھر بھی کتبات کے بغور مطالعے کے لیے بالکل لابدی ہے۔

سر آرتھر کننگھم: "انسکرپشنز آف اشوکا" (کلکتہ 1877ء)۔ اس کو صرف جغرافیائی حالات معلوم کرنے کے لیے دیکھنا چاہیے۔

پروفیسر ای۔ ہارڈی: "کونگ اشوکا" (مینز 1902ء)۔ یہ اشوک کے عہد حکومت کی ایک سادہ اور عام فہم تاریخ ہے اور اگرچہ عام طور پر محض حکایات پر ہی اکتفا کیا ہے، مگر کہیں کہیں کتبات کا بھی ذکر آ جاتا ہے۔

وی۔ اے۔ سمتھ: "اشوکا نوٹس۔ "انڈین انٹی کویری برائے 1903ء، 1905ء، 1908ء، 1909ء، 1910ء "اشوکا" ... دوسرا ایڈیشن 1909ء پروفیسر

ہلٹش۔ ان کتبات کے ترمیم شدہ ترجمے مشرح' نئی ایڈیشن آج کل (1913ء) تیار ہو رہی ہے اور امید ہے کہ اس کے شائع ہونے کے بعد سے معاملات متنازعہ فیہ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ پروفیسر ہلٹش کے لیے ان کتبات کے نئے فوٹو تیار کیے گئے ہیں۔

2۔ چھوٹے سنگی فرمان

ان کتبات پر چھوٹے ستونی فرامین کے تعلق سے بہت کچھ غور و فکر ہو چکا ہے۔ مگر ان کے متعلق اب تک کوئی آخری تصفیہ نہیں ہوا۔

جی بیوہلر: سداپور (میسور) کے متنوں کی اس نے تصحیح کی اور مع فوٹوان کا ترجمہ اپی گریفیا انڈیکا جلد سوم صفحات 142۔135 میں شائع کرایا۔ سہسرام' بیرات' روپ ناتھ کے متون کا تصحیح کی اور سہسرام اور روپ ناتھ کے کتبات کے فوٹو کے ساتھ ان کا ترجمہ انڈین انٹی کویری جلد پنجم (1877ء) صفحہ 160۔149 میں طبع کرایا۔ پھر نظر ثانی کے بعد انڈین انٹی کویری جلد 22۔ (1893ء) صفحہ 306۔209 میں چھپوایا۔ اس کے علاوہ دیکھو انڈین انٹی کویری جلد 26 (1897ء) صفحہ 334۔

لیوس رائس: سداپور کے تینوں متنوں کا فوٹو اپی گریفیا کرناٹیکا جلد 11 میں (بنگلور 1903ء)' براھمگری کے فرمان کا متن "میسور اینڈ کرگ فرام دی انسکرپشنز" میں (لندن 1909ء)۔

جے۔ ایف۔ فلیٹ: مضامین کا ایک سلسلہ 1903ء' 1904ء' 1908ء' 1909ء' 1910ء اور 1911ء کے جے۔ آر۔ اے۔ ایس میں۔

ایف۔ ڈبلیو۔ ٹامس: انڈین انٹی کویری 1908ء صفحہ 21۔ "لی دوا نباہ ڈاشوکا" (رسالہ جرنل ایشیاٹک میں (مئی۔ جون 1910ء)۔ یہ مضمون زیادہ اہم ہے۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1913ء صفحہ 477۔

پروفیسر ہلٹش: جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1910ء' صفحات 142 اور 1308' 1911ء صفحہ 1114' 1913ء صفحہ 1053۔

پروفیسر سلوین لیوی: "ومستھا 256" جے۔ ایشیاٹک میں' جنوری۔ فروری 1911ء۔

ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر: "اپی گریفک نوٹس اینڈ کوشچنز۔" انڈین انٹی کویری 1912ء' صفحہ 173۔170۔

3۔ بھابھرو کا فرمان

ایملی سینارٹ: متن اور ترجمہ بعد از تصحیح۔انڈین انٹی کویری 1891ء صفحہ 165۔
جے برگیس: فوٹو جے۔ایشیاٹک میں 1887ء۔
ٹی ڈبلیو۔ رہس ڈیوڈس: جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1898ء' صفحہ 239۔ جنرل پالی ٹیکسٹ سوسائٹی 1896ء۔
ای۔ ہارڈی: جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ صفحہ 311 و صفحہ 577۔
پروفیسر سلوین لیوی: "نوٹس سرڈاورس انسکرپشنز پیڈ سئی۔" حصہ دوم جے۔ ایشیاٹک میں مئی۔ جون 1896ء (حصہ اول میں چھوٹے سنگی فرامین پر بحث کی گئی ہے۔)
پروفیسر ڈی ایچ۔ کو سمبی: انڈین انٹی کویری' 1912ء صفحہ 37۔
پروفیسر ہلش: جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1911ء صفحہ 1113۔
اے۔ اڈ منڈس: جے۔ آر۔ اے۔ ایس' 1913ء صفحہ 385۔

4۔ چودہ سنگی فرامین

ان کی سب سے اعلیٰ درجے کی ایڈیشن بیوہلر نے ایپی گریفیا انڈیکا جلد دوم صفحہ 472۔ 447 طبع کرائی ہے اور اس میں گرنار' شاہ باز گڑھی' مانسہرا اور کالسی کے متنوں کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ شاہ باز گڑھی کے بارھویں فرمان کا فوٹو تیار کردہ بیوہلر' مطبوعہ ایپی گریفیا انڈیکا جلد اول صفحہ 11۔ اسی نے برگیس کی کتاب "امرادتی" میں دھولی اور جوگدا کے متنوں کو بعد تصحیح کے مع ترجمہ چھپوایا۔ (اے۔ ایس۔ ایس آئی 1887ء) صفحہ 25۔ 114۔ گرنار کے متن کا فوٹو مع ایک متروک اور پرانے ترجمے کے برگیس کی "کاٹھیاواڑ اینڈ کچھ" (اے۔ ایس۔ ڈبلیو۔ آئی) صفحہ 127۔ 93۔

فرامین نمبر اول 2 پر ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر نے جرنل بمبئی برانچ رائل ایشیاٹک سوسائٹی جلد 20 (1902ء) میں بحث کی ہے۔ فرمان نمبر 3 کے لیے دیکھو فلیٹ کا مضمون۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1908ء' صفحہ 822۔ 811۔ فرمان نمبر 4 پر جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1911ء صفحہ 785 میں پروفیسر ہلش نے اور انڈین انٹی کویری 1913ء صفحہ 25 میں ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر نے بحث کی ہے۔

اس تمام سلسلہ کتبات کے متعلق بہت سی باتوں پر وی۔ اے۔ سمتھ نے "اشوکا نوٹس" میں بحث کی ہے اور اس کے علاوہ آر فرینک نے بھی اس پر مفصل بحث کی ہے۔

مجلسن کے مضامین میں زیادہ قواعد صرف ونحو اور زبان کے متعلق بحث ہے۔ یہ مضامین "جرنل امیریکن اورینٹل سوسائٹی" 1911ء اور "امیریکن جرنل آف فلالوجی' 1910ء و 1911ء اور "انڈو جرمن فورشنگن" 1910ء و 1911ء میں شائع ہوئے۔ یہ تمام مضامین ایک حد تک ان چودہ سنگی فرامین کے متعلق ہی ہیں۔

5۔ کلنگ کے فرامین

ان پر سینارٹ اور گریرسن نے نظرثانی کی تصحیح کی اور ان کا ترجمہ انڈین انٹی کویری جلد 19 (1890ء) صفحہ 102 – 82 میں شائع کرایا اور بیوہلر کے پہلے ترجمے کی تصحیح کی۔ مع فوٹو برگیس کی "امراوتی" میں "اے۔ ایس۔ ایس۔ آئی 1887ء" صفحہ 131–125۔

6۔ سات ستونی فرامین

ان کا سب سے اچھا ایڈیشن بیوہلر کا ہے۔ مع ترجمہ اور چند فرامین کے فوٹو کے 'انڈین انٹی کویری جلد دوم (1894ء) صفحہ 274 – 247۔ سینارٹ کی اور اس سے قبل کی ایڈیشن اور ترجمہ انڈین انٹی کویری جلد 27 (1888ء) صفحہ 307 – 303' جلد 28 (1889ء) صفحہ 73' 105' 300۔ دہلی (یعنی توپرا) اور الہ آباد کے فرامین کا فوٹو تیار کردہ بیوہلر اور فلیٹ انڈین انٹی کویری جلد 13 (1884ء) صفحہ 306۔

من موہن چکرورتی: اینیملز ان دی انسکرپشنز آف پیڈسئی" (میمائرز آف اے۔ ایس۔ بی کلکتہ 1906ء)

ئی مجلسن کا مضمون "نوٹس آف دی پلر ایڈ کٹس آف اشوکا" (انڈو جرمن فورشنگن۔ سٹراسبرگ 1908ء) میں اس متن پر بہت قابل قدر تنقید اور تشریحات کی گئی ہیں۔

رام پروا کے ستون کے بیان کے لیے دیکھیے جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1908ء صفحہ 1085۔ بہ ہیئت مجموعی ان ستونی فرامین میں کچھ زیادہ دقت واقع نہیں ہوتی۔

7۔ چھوٹے ستونی فرامین

(1) سانچی۔ بیوہلر کا ایڈیشن اور ترجمہ ایپی گریفیا انڈیکا جلد دوم صفحہ 87' 367۔ ہلٹش جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1911ء' صفحہ 127۔

(2) ملکہ کا فرمان۔ بیوہلر کی ایڈیشن اور ترجمہ گریفیا انڈیکا جلد دوم صفحہ 87' 367۔ اس کے نظرثانی کے بعد: انڈین انٹی کویری جلد 19 (1809ء) صفحہ 125۔ سینارٹ کی بعد از نظرثانی ایڈیشن اور ترجمہ: انڈین انٹی کویری جلد 17 (1889ء) صفحہ 308۔

(3) کوسمبی: سینارٹ نے اس کو انگریزی حروف میں انڈین انٹی کویری جلد 18 (1889ء) صفحہ 309 میں چھپوایا۔ فوٹو اور انگریزی طرز تحریر از بیوہلر انڈین انٹی کویری جلد 19 (1890ء) صفحہ 126۔

(4) سارناتھ۔ دوگل: بحث مع فوٹو۔ اپی گرافیا انڈیکا' جلد 8 (6-1905ء) صفحہ 166 میں۔ سینارٹ کی کمپٹس اینڈس ڈی لا کیڈ ڈس انسکرپشنز" 1907ء صفحہ 25۔ وینس کا مضمون جرنل اینڈ پروسیڈنگس آف اے۔ ایس۔ بی۔ جلد 3 سلسلہ نو (1907ء)۔ نارمن کا مضمون رسالہ مذکورہ بالا میں' جلد 4 (1908ء)۔ بائر کا مضمون جے۔ ایشیاٹک میں جلد 10 (1907ء) صفحہ 119۔

ان تمام تشریحات کا تعلق چھوٹے سنگی فرامین کے ساتھ ہے۔ اس لیے وہ ملاحظہ ہوں۔ ستون کی شکل وصورت کے بیان کے لیے دیکھو اینوئل رپورٹ آرکیالوجیکل سروے 5-1904ء صفحہ 36 و 68۔

8۔ ترائی کے یادگار کتبات

ان دونوں کی بیوہلر نے تصحیح کی ہے اور ان کو معہ ترجمہ اور فوٹو کے اپی گرافیا انڈیکا جلد 5 صفحہ 4 میں طبع کرایا ہے۔ رمنڈئی کے کتبے کا فوٹو اور ترجمہ بعد از نظر ثانی "اشوکا" دوسرے ایڈیشن 1909ء میں ملے گا۔ دیکھو جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1897ء صفحہ 4' 1908ء صفحہ 491-471' 823 اور انڈین انٹی کویری جلد 36 (1905ء) صفحہ 1۔

9۔ اشوک اور دسرتھ کے غاروں کے نذرانے کے کتبے

ان سب کو بعد تصحیح بیوہلر نے ترجمہ کر کے مع فوٹو انڈین انٹی کویری جلد 20 (1891ء) صفحہ 361 میں شائع کیا ہے۔

حوالہ جات

لے سٹریبو، باب 15 فصل 28 و 62۔ شادی کے بازار کے متعلق شہر بابل کے دستور کا مقابلہ کرو۔ (ہیروڈوٹس باب 1۔ فصل 196) گدھوں کے کھانے کے لیے مردوں کو کھلے میدانوں میں رکھ دینے کا دستور قدیم زمانے میں اور اب بھی ایرانیوں (پارسیوں) میں پایا جاتا ہے (ہیروڈوٹس باب 1 فصل 140)۔ اب تک تبت میں اس پر عمل ہوتا ہے اور قدیم زمانے میں ویشالی کی لچھوی قوم میں بھی یہی رواج تھا۔ یہ قوم تبتی یا انہی کے ہم نسل تھی۔

ٹے دیکھو یولی اور برنل کی "گلاسری آف اینگلو انڈین ورڈس" میں مضمون "اجین" Oojyne۔

سے کتبوں کے مطابق "چودھویں" برس میں، یعنی اس کی تاجپوشی کی تاریخ شمار کر کے۔

سے "اشوکا" دوسری ایڈیشن صفحہ 223۔

ھے جدول سنین کے لیے دیکھو میری کتاب "اشوکا" دی بدھسٹ امپرر آف انڈیا۔" (کلیرنڈن پریس، دوسری ایڈیشن 1909ء) اسی میں تمام روایات کا ملخص اور تمام کتبات کا کامل ترجمہ بھی درج ہے، اگرچہ بعض مقامات پر اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ سنین میں ایک یا دو سال کا فرق ہو۔ مگر اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

لے سنگی فرمان نمبر 13

کے بھابھرو نہ کہ بھابرا صحیح ہے۔ یہ کتبہ بیرات کی پہاڑیوں میں بھابھرو کی چھاؤنی سے تقریباً 12 میل کے فاصلے پر پایا گیا تھا۔ (پروگرس رپورٹ آرکیالوجی۔ ساؤتھ ویسٹرن سرکل 11۔1909ء فقرہ 10۔

ﮈ بھکرا، لور، رادھیہ، لوریا نندن گڑھ (سامتیہ)، رام پوروہ۔

ﯗ اس کا سب سے آخری اور صحیح ترجمہ "اشوکا" دوسری ایڈیشن صفحہ 199 میں دیا گیا ہے اور ساتھ اس کا نقشہ بھی ہے۔

نلے یہ مقام غالباً ضلع بستی کے شمال میں پیرادا ہے اور سرحد پر واقع ہے (دیکھو مکرجی اور وی اے سمتھ "ایکسپلوریشنز ان دی نیپالیز ترائی" "آرکیالوجیکل سروے امپیریل سیریز جلد 26 کلکتہ

1897ء) ہیون سانگ کا کپل وستو یقیناً تلوراکوٹ اور قرب و جوار کے کھنڈروں کا مقام ہے جو پیراوا سے شمال مغرب میں دس میل کے فاصلے پر نیپال کی ترائی میں واقع ہے۔

سلہ یہ مقام دریائے راپتی کے بالائی حصے پر سیٹھ میٹھ کے مقام پر حال کے ضلع بہرائچ و گونڈہ کی سرحد پر واقع تھا۔ وہ کتبے جن کو محکمہ آثار قدیمہ نے دریافت کیا ہے ان سے اس مقام کا صحیح موقعہ معلوم ہوتا ہے۔ (اینول رپورٹ آرکیالوجیکل سوسائٹی 9۔1908ء صفحہ 137) مشکل یہ ہے کہ یہ مواقع چینی یاتریوں کے ذکر کیے ہوئے مقام کے مطابق نہیں ہیں۔

سلہ یہ مقام میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ نیپال میں پہلے سلسلہ کوہ کے اس پار واقع ہے۔ (ج۔ آر۔ اے۔ ایس جنوری نمبر' 1902ء) ہزہائنس جنرل خدگا شمشیر جنگ بہادر بھی اس بات میں مجھ سے متفق ہیں کہ کشی نگر نیپال ہی میں واقع ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ اس کا موقعہ راپتی اور گنڈک دریاؤں کے موقع پر ہے۔ ان کا موقع میرے منتخبہ موقع سے بہت مغرب میں واقع ہے۔ مگر پھر بھی اسی عرض بلد میں ہے اور اغلب یہ ہے کہ وہ درست ہے (پانیر میل اللہ آباد' 26 فروری 1904ء)۔ نروان مندر کے عقب میں ایک بڑے ستوپ کے اندر ایک تابنے کے کتبے کے دریافت ہونے سے اس قدیم قیاس کو تقویت پہنچی ہے کہ کشی نگر وہی مقام ہے جہاں ضلع گورکھ پور کے کیسیا کے قریب آثار و کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ (پرگیٹر۔ ج۔ آر۔ اے۔ ایس صفحہ 512)

مگر اس نظریہ پر بہت سے اعتراضات ہو سکتے ہیں اور اغلب یہ ہے کہ کیسیا کے مقام پر زیارت گاہ بھی جو کشی نگر کی موت کی خانقاہ کے ساتھ وابستہ معلوم ہوتی ہے' اس کو بھی "پری نروان چیتیہ" کہا جاتا تھا۔ ہیسٹنگز "انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس" میں میرا مضمون کشی نگر۔

سلہ لمکسو کا ترجمہ آئی سانگ "ریکارڈ آف بدھسٹ پر کٹیشنز" صفحہ 73۔

سلہ گائلز کی "ہسٹری آف چائینز لٹریچر" 1901ء صفحہ 133۔ انڈین انٹی کوری 1903ء صفحہ 336۔

سلہ بیوہلر۔ انڈین انٹی کوری' جلد 6 صفحہ 154۔

سلہ ہر ایک قسم کے فرامین کے سنین کے متعلق دیکھو اس باب کے آخر میں فہرست کتب۔ میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں حاشیے میں لنکا کے سنین پر بحث کروں۔ بدھ مذہب کی کونسلوں کے متعلق دیکھو میرے خیالات' ج۔ آر۔ اے۔ ایس 1901ء صفحہ 58۔142۔

سلہ شائن کا ترجمہ "راج ترنگنی" حصہ اول۔ باب 5 صفحہ 104' جلد دوم صفحہ 409' 1411 اشوک کے قدیم دارالسلطنت کی جائے وقوع کا موجودہ نام پاندرِ تھن (یعنی شہر قدیم ہے)۔ یہ موجودہ سری نگر سے' جس کو قدیم شہر کا نام دے دیا گیا ہے' تقریباً تین میل شمال کی طرف واقع ہے۔

۱۸؎ اولڈ فیلڈ کی "سکیچز فرام نیپال" جلد دوم صفحات 198' 246' 252 - انڈین انٹی کویری جلد 13 صفحہ 412 - پاٹن کے مقام کے شمالی ستوپ کو مسٹر بنڈل اپی تو ڈ کہتے ہیں (اے جرنی ان نیپال صفحہ 12) - اولڈ فیلڈ نے اس کو اپیی یا زمپی تندو اور ریزیڈنسی کے کلرک نے امپی لکھا ہے - ان میں زمپی تندو صحیح معلوم ہوتا ہے - (لیوی کی لا نیپال صفحات 1' 3' 344) عمارت اگرچہ شہر کے اندر واقع ہے' مگر فصیل شہر سے باہر ہے -

۱۹؎ سنگی فرامین نمبر2 - 13

۲۰؎ میں ڈاکٹر فلیٹ سے اس امر میں متفق نہیں ہوں (ج - آر - اے ایس 1909ء صفحہ 997 حاشیہ) کہ چھوٹا سنگی فرمان نمبر2' جس کے تین نسخے شمالی میسور میں پائے گئے ہیں' کسی بیرونی سلطنت کو مخاطب کرنے کے لیے شائع کیے گئے تھے - سنگی فرمان نمبر2 میں صاف طور پر ذکر ہے کہ ہمالیہ یا سرحدی سلطنتوں سے مراد چول' پانڈیا' کریل پتر یا ستیا پتر ہیں - پروفیسر آر - جی - بھنڈارکر (انڈین ریویو جون 1909ء) کے خیال میں ستیا پتر کی سلطنت پونا کے قریب واقع تھی کیونکہ بہت سی ذاتوں کے نام وہاں اب بھی سات پتے ہیں - مگر اس فرمان میں ستیا پتر کا ذکر تامل سلطنتوں کے ساتھ آتا ہے اور وہ جگہ جو میں نے مقرر کی ہے - نسل اور زبان کے فرق کی بناء پر کی ہے - میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ موریا سلطنت میں' جس میں وہ علاقے جو ان کے زیر نگین اور زیر سیادت تھے شامل ہیں' جنوب میں نیچے تک چلے جاتے تھے - یہاں تک کہ تامل سلطنتیں ان کے سد راہ ہوتی تھیں -

۲۱؎ چھوٹے سنگی فرمان نمبر1 کے میسوری نسخے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اشوک کے احکام کو ہسیلا نامی ایک شہر کے عمال تک پہنچاتا ہے - یہ شہر غالباً اس قدیم جگہ پر واقع تھا جہاں سے یہ کتبے برآمد ہوئے ہیں - یہ احکام سورنگری کے بادشاہ اور عمال کے ذریعے سے وہاں پہنچائے ہیں - یعنی جو احکام اشوک نے دیئے ان کو سورنگری کے راجا اور عمال نے نافذ کیا - میرا خیال یہ ہے کہ سورنگری کہیں جنوب میں واقع تھا اور یہ راجا جس کا ذکر ہوا اشوک کا دکن پر نائب تھا - ڈاکٹر فلیٹ نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ سورنگری مگدھ کی سلطنت میں سونگیر یا قدیم راج گری کا مقام ہے' اور اسی بناء پر اس نے یہ نظریہ قائم کر لیا ہے کہ اشوک وہاں گوشہ نشین تھا - (ج - آر - اے - ایس 1909ء صفحہ 981 تا 1016ء) - مگر مجھے کوئی شہادت اس امر کی نہیں ملی کہ اشوک تخت و تاج سے اپنی زندگی میں دست بردار ہو گیا تھا -

۲۲؎ دیکھو "اشوکا" دوسری ایڈیشن صفحہ 148 - 146 - اے ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون صفحہ 20' 59' 62' لوح 2 - 13' شکل 28 - 29 اور "مونولیتھک پلرس آر کالمز آف اشوکا - " زید - ڈی - ایم - جی 1911ء صفحہ 40 - 221 - ڈاکٹر جے - ایچ - مارشل کہتا ہے کہ "موریا خاندان کی تمام عمارت میں حد درجہ تکمیل اور صحت کا انداز پایا جاتا ہے اور اس تکمیل

کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس حیثیت سے یونانی عمارات سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔
(اینوئل رپورٹ۔ آرکیالوجیکل سروے 1906۔1907ء صفحہ 89)۔

۳؎ یہ اجیوک فرقہ ویشنو سے تعلق نہیں رکھتا' جیساکہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ (بھنڈارکر "اپی گریفک کوئسشنز اینڈ آنسرز" جرنل بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی) جلد 2' 1902ء۔ انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 90۔286۔ ان کے عقائد کے ملخص کے لیے دیکھو "سامن پھل" مترجمہ رہس ڈیوڈس' منقول فی ڈائلوگس آف بدھا (1899ء) صفحہ 71۔

۴؎ اگرچہ ان کتبات پر کسی کا نام نہیں۔ (انڈین انٹی کویری 1903ء صفحہ 265) مگر ان کا اشوک کی طرف منسوب کرنا بالکل درست ہے۔ اس بات کا تفصیلی ثبوت میرے مضامین "دی آتھر شپ پیادسی انسکرپشنز" اور "آئی ڈنٹٹی آف پیادسی ود اشوکا موریا وغیرہ" میں ملے گا (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1901ء' صفحہ 99'481'827'842)۔

۵؎ پروفیسر ریپسن کا خیال ہے کہ "وہ علاقہ جہاں کروشتی اور براہمی دونوں قسم کی طرز تحریر بالکل یکساں اور پہلو بہ پہلو رائج تھی' وہ تقریباً صحت کے ساتھ پنجاب کا ضلع جالندھر ہو سکتا ہے۔"
(جے۔ آر۔ اے۔ ایس' 1905ء صفحہ 810)

۶؎ چھوٹے سنگی فرمان نمبر1 کے تین مختلف نسخے میسور میں ایسے مقامات میں پائے گئے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہی واقع ہیں۔ یعنی سداپور' چتنگرا' میسوراور برہماگری۔ باقی تین بہار کے ضلع شاہ آباد میں سہسرام مقام پر' وسط ہند کے ضلع جبلپور میں روپ ناتھ مقام پر اور راجپوتانہ کے علاقے میں جودھ پور کی ریاست میں بیرات کے مقام پر پائے گئے ہیں۔ چھوٹا سنگی فرمان نمبر2 صرف میسور کے فرامین میں ہی اضافہ کیا گیا ہے۔

۷؎ بھابھرو کا فرمان ایک بڑے پتھر پر کندہ ہے جو آج کل کلکتہ میں بیرات مقام کی ایک پہاڑی کی چوٹی سے منتقل کردیا گیا ہے۔ چھوٹا سنگی فرمان نمبر1 ساتھ کی ایک پہاڑی کی چٹان پر کندہ ہے۔

۸؎ چودہ سنگی فرامین کے مواقع حسب ذیل ہیں۔ (1) یوسف زئی کے علاقے میں پشاور سے 40 میل شمال مشرق میں شاہ باز گڑھی کے مقام پر' (2) ضلع ہزارہ میں مانسہرہ۔ ان دونوں میں کروشی طرز تحریر استعمال کیا گیا ہے۔ (3) سوری (یا منصوری) کے مغرب میں 15 میل کے فاصلے پر زیریں ہمالیہ میں کالسی مقام پر' (4) بمبئی کے قریب تھانے کے ضلع میں سپارا کے مقام پر' (5) کاٹھیاواڑ کے جزیرہ نما میں جوناگڑھ کے قریب کوہ گرنار مقام پر' (6) اڑیسہ میں ضلع کٹک میں بھوانیسور کے جنوب میں دھولی کے مقام کے قریب' (7) مدراس میں ضلع گنجام کے مقام پر جوگڑا پر' آخری دونوں مقامات کلنگ کے علاقے میں شامل ہیں اور دونوں کلنگ کے فرامین کو دھولی اور جوگڑا کے فرامین کے آخر میں ضمیمے کے طور پر زیادہ کردیا گیا ہے۔

۹؎ رمنڈئی کے کھنڈر نیپالی سرحد کے چار میل اس طرف دریائے تلار کے مشرق میں تقریباً مشرق

طول بلد °85 - '11 شمالی عرض بلد °25 - '58 میں واقع ہیں - پدوایا ایک ساتھ کے گاؤں کا نام ہے - نگلیو کا ستون جو غالباً اپنی اصلی جگہ سے منتقل کیا گیا ہے رمنڈئی کے شمال میں تقریباً 13 میل کے فاصلے پر واقع ہے - رمنڈئی کتبے کی تصویر کے لیے دیکھو "اشوکا' دی بدھسٹ امپرر آف انڈیا" پلیٹ نمبر 2 -

سہ ستونی فرامین چھ ستونوں پر پائے جاتے ہیں 'یعنی دو دہلی میں جن میں سے ایک ابنالے کے قریب مقام توپراسے اور دوسرا میرٹھ سے لایا گیا تھا - ایک ستون الٰہ آباد میں ہے اور ایک فرمان لوریہ اررراج کے دونوں ستونوں پر - لوریہ نندن گڑھ اور رامپروا ترہونٹ کے ضلع چمپارن میں ہے -

سہ کوشامبی اور ملکہ کے فرامین الٰہ آباد کے ستون پر اس طرح کندہ کیے ہوئے کہ جن سے گمان گذرتا ہے کہ وہ ضرور ستونی فرمانوں کے بعد کے زمانے کے ہوں گے -

ساتواں باب

بقیہ: اشوک موریا اور اس کے جانشین

دھم یا قانون فرائض

اشوک کے تمام فرمان بیشتر اس فلسفہ اخلاق کی جسے اشوک اپنی زبان میں دھم کہتا ہے' تشریح' تعلیم اور تاکید سے پر ہیں۔ کوئی ایسا انگریزی لفظ یا فقرہ نہیں جس سے پراکرات کے لفظ دھم (سنسکرت دھرم) کا مفہوم پوری طور پر ادا کیا جاسکے۔ مگر بہرحال "قانون زہد" یا صرف "زہد" ایسے الفاظ ہیں جن سے ہم تقریباً ہندی لفظ کا مفہوم ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر "قانون فرائض" کے ترجمے کو ترجیح دی جائے تو وہ بھی مستعمل ہو سکتا ہے۔ تمام فرامین میں اس "قانون زہد" یا "فرائض" کے وجوب اور صحت کو تسلیم کر لیا ہے اور اس امر کی بالکل کوشش نہیں کی گئی کہ اس کو مذہبی یا فلسفیانہ دلائل سے ثابت کیا جائے۔ بلکہ جس طرح اس کے مذہبی مقتداء گوتم نے تمام مذہبی خیالات سے بالکل قطع نظر کر لیا ہے اسی طرح اشوک نے بھی ان کو بھلا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کا مروجہ مسئلہ تناسخ صحیح تسلیم کر لیا گیا اور اسی مسئلے پر تمام اخلاقی تعلیم کی بنیاد رکھی گئی۔

اہنسا

مماثل جین مت اور برہمن ہندو مت کے چند فرق کی طرح اشوک کے بودھ مت کا بھی خاص الخاص اصول حیوانی زندگی کی تقدیس کا نہایت سرگرم اور کامل یقین تھا۔ اس کے متعلق فرامین کا اصول یہ ہے کہ جب تک فطرت اجازت دے ادنٰی سے ادنٰی جانوروں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ہمیشہ قائم رکھیں۔ یہ اصول مبنی تھا اس اعتقاد پر کہ تمام جاندار جس میں آدمی بھوت پریت' دیوتا اور جانور سب کے سب شامل ہیں "وجود" کی ایک لامتناہی زنجیر کی کڑیاں

ہیں۔[1]

مسئلہ تناسخ اور کرم

وہ ہستی جو اس وقت آسمان میں دیوتا کی حیثیت رکھتی ہے ممکن ہے کہ مرور ایام کے دوران میں بالآخر ایک کیڑے مکوڑے کی شکل میں دنیا میں نمودار ہوا' اور بعینہ ایک کیڑے کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ بتدریج دیوتا کا درجہ حاصل کرلے۔ یہی عقیدہ ہے جو اس خیال سے مل جل کر کہ تناسخ کا دارومدار کرم پر ہے' ہندوستان کے تمام فلسفے کا اصل اصول ہے۔ کرم کی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی ہستی کی موت کے وقت اس کے زندگی بھر کے اچھے اور برے کاموں کا ایک قسم کا موازنہ یا اخلاقی نتیجہ ہے۔ اس کو بعض اوقات ایسے نظریوں سے ملا جلا دیا جاتا ہے جن کے تحت ان کا ماننے والا روح کے وجود کو تسلیم کرلیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کو وہ لوگ بھی مانتے ہیں جو سرے سے روح کے نظریے کے بالکل قائل ہی نہیں۔

مقابلتاً" انسانی زندگی سے تغافل

اس قسم کے خیالات کو ماننے والوں کے متعلق یہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ بالکل صحیح طور پر ایک کیڑے کی زندگی کو بھی اتنا ہی موجہ اور قابل احترام تصور کرتے ہوں گے جتنا انسانی زندگی کو۔ یہاں تک کہ عملی طور پر انسان کی زندگی سے جانداروں کی زندگی زیادہ قابل تقدس واحترام سمجھی جاتی تھی۔ بعض اوقات یہ بے ہودہ منظر بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ جہاں کسی جانور کو مارنے یا محض گوشت کھانے پر انسان کی جان لے لی گئی ہو۔ بودھ اور جین مت کے پابند بادشاہوں نے اپنی رعایا کو سزائے موت دینے میں تامل نہیں کیا اور خود اشوک بھی اپنے عہد حکومت کے دوران میں اس قسم کی سزا کے احکام برابر نافذ کرتا رہا۔ اس نے اپنی انسانی ہمدردی کے جذبات کو پورا کرنے کے لیے صرف اتنا کرنے پر اکتفاء کیا کہ اس کو اپنے دادا سے جو خونی تعزیرات ورثے میں ملی تھیں ان میں اتنی نرمی کردی کہ جس شخص کو سزا دی جاتی تھی اس کو تین دن کی مہلت دی جاتی کہ وہ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔[2]

اشوک کا آغاز زندگی میں طرز عمل

یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اوائل زندگی میں اشوک برہمنی مذہب کا پیرو تھا اور خاص طور پر شیو کی پرستش کیا کرتا تھا۔ اس دیوتا کی بیوی کو خونی بھینٹ میں مزہ آتا ہے اور اسی وجہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو خون بہانے میں کوئی تردد یا تامل نہیں ہوا۔ ہر دعوت کے موقعے پر شاہی باورچی

خانے کو صرف ایک دن کا گوشت بہم پہنچانے کے لیے ہزاروں جانداروں کا خون بہادیا جاتا تھا۔ مگر جب رفتہ رفتہ اس کے دل و دماغ میں بودھ مت کے خیالات سرایت کرتے گئے تو اسے روزانہ اتنے جانوروں کا ذبح ہونا ناگوار اور مکروہ معلوم ہونے لگا اور آخر کار اس نے اس کی بالکل ممانعت کردی اور زیادہ سے زیادہ صرف تین جانور یعنی دو مور اور ایک ہرن ذبح کرنے کی اجازت دی۔ لیکن 257 ق م میں اس کی بھی قطعی ممانعت کردی۔ [3]

شاہی شکار کی موقوفی

اس سے دو سال قبل 259 ق م میں اشوک نے شاہی شکار کو موقوف کردیا جو اس کے دادا چندر اگپتا کے دربار کا سب سے بڑا ذریعہ تفریح تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "گذشتہ زمانے میں بزرگ شاہان ماسلف تفریح طبع کے لیے ملک میں دورے کیا کرتے تھے جن کے دوران میں شکار اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے وہ اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔" مگر اب اشوک بادشاہ بزرگ و محترم اس قسم کی خفیف حرکتوں کو پسند نہ فرماتا تھا۔ بلکہ ان کی جگہ اس نے ایسے دورے مقرر کیے جن کے دوران میں وہ ملک و رعایا کی حالت ملاحظہ کرسکتا تھا۔ پاک نفس لوگوں سے ملاقات کرکے ان کو نذرانے دے سکتا تھا اور ان ہی کے دوران میں قانون فرائض پر بحث اور اس کی تبلیغ کرسکتا تھا۔ [4]

243 ق م کا قانون

جوں جوں وقت گذرتا گیا اسی طرح اشوک جانداروں کی زندگی کی تقدیس و تحریم کے اصول کا زیادہ سختی اور شدت سے پابند ہوتا گیا۔ اسی شدت کا نتیجہ 243 ق م میں یہ ہوا کہ نہایت ہی تاکیدی اور سخت قواعد نافذ ہوئے جن کا اطلاق بلاتمیز مذہب و عقائد اس کی تمام رعایا پر ہوا۔ اکثر قسم کے جانوروں کو ذبح کرنے کی ہر حالت میں ممانعت کردی گئی اور گوشت خوار لوگوں کے لیے جن جانوروں کو ذبح کرنے کی ضرورت پڑتی تھی، ان کے مارنے کی اگرچہ ممانعت نہیں کی گئی مگر ان پر سخت سے سخت پابندیاں لگادی گئیں۔ سال کے چھپن مخصوص دنوں میں جانوروں کے ذبح کرنے کی قطعی ممانعت کردی گئی اور اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی رعایا کی آزادی میں بہت رکاوٹیں پیدا کردیں۔ [5] اشوک کی زندگی میں ان قواعد پر بلاشک وشبہ خاص عمال رعایا سے عمل کراتے رہے اور غالباً ان میں سے اہم قواعد کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزائے موت بھی دی جاتی ہوگی جیسا کہ بعد کے زمانے میں ہرش کے عہد حکومت میں ہوا کرتا تھا۔

تعظیم و تکریم

دوسرا بڑا اصول جس کی اشوک تعلیم دینا چاہتا تھا اور جس پر وہ مصر تھا وہ والدین' بزرگوں اور استادوں کا ادب ملحوظ رکھنا تھا۔ اس کے برعکس بزرگوں کا یہ فرض تھا کہ چھوٹوں سے اپنی تعظیم کرانے کے ساتھ ساتھ ہی وہ بھی ان چھوٹوں کے ساتھ جن میں خانگی ملازم' غلام اور گھر کے تمام جانور شامل تھے' ملاطفت اور نرمی سے پیش آئیں۔[6] ان فرائض کے ساتھ لوگوں کو اس کی بھی تلقین کی جاتی تھی کہ وہی خیال جو ان کو ایک طرف تو اپنے بزرگوں سے ادب، اور دوسری طرف اپنے خوردوں سے ملاطفت سے پیش آنے پر مائل کرتا ہے' اسی کی بناء پر ان کو اس بات پر آمادہ رہنا چاہیے کہ وہ اپنے اقرباء اور رشتہ داروں' سنیاسیوں اور برہمنوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور خوش اطواری سے پیش آئیں اور اس کے ساتھ ہی ان کو ان فرقوں اور اپنے دوستوں کے ساتھ سخاوت اور فیاضی سے کام لینا چاہیے۔

راستی

لوگوں کا تیسرا فرض یہ تھا کہ وہ راستی کو اختیار کریں۔ ان تینوں بڑے بڑے اصولوں کو چھوٹے سنگی فرمان نمبر2 میں نہایت اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں:

بادشاہ کہتا ہے'

"ماں باپ کی فرماں برداری کرنی چاہیے۔ اسی طرح تمام جانوروں کی عزت کرنی چاہیے اور ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔ یہ ہیں قانون زہد کی خوبیاں جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح چیلوں کو استاد کا ادب کرنا چاہیے اور اعزاء و اقربا سے نیک سلوک کرنا چاہیے۔ قدیم طریق زہد کا یہ معیار ہے' اس پر زندگی کی طوالت کا انحصار ہے اور لوگوں کو اس پر عمل کرنا لابدی ہے۔"

مذہبی رواداری

اس نے بڑے بڑے فرائض سے اتر کر چھوٹے فرائض دوسرے کے عقائد کے ساتھ ہمدردی اور رواداری کو ایک ممتاز جگہ دی اور ایک خاص فرمان (سنگی فرمان نمبر12) اسی موضوع پر بحث اور اس کی تشریح کے لیے مخصوص ہے۔ شاہی معلم اخلاق کی رعایا کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے ہمسایوں کے مذاہب کا ذکر بری طرح کرنے سے باز رہیں اور یہ امر یاد رکھیں کہ تمام

مذاہب کی غایت اور انتہاء تزکیہ نفس اور خودداری ہے' اور اس طرح خواہ وہ جزئیات میں کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں مگر اصل اصول میں سب ایک ہیں۔

اشوک کا طرز عمل

اشوک نے تمام مذاہب و فرقہ کے لوگوں کا ادب ملحوظ رکھ کر یہ بات عیاں و ظاہر کر دی کہ وہ ان آزادانہ اصولوں پر بذات خود عمل کرنے کے لیے تیار ہے۔ غار کے کتبات میں اجیوک کو بہت بیش قیمت تحائف و نذریں دینے کا ذکر ہے۔ حالانکہ یہ ایک بالکل خود مختار سنیاسیوں کا مذہبی فرقہ تھا۔ ان ہی کتبات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے قدیم بادشاہوں کی طرح اشوک نے بھی در حقیقت عام مذہبی رواداری کی حکمت عملی اختیار کر لی تھی۔[7]

اس میں حدود

اس کی رواداری اگرچہ بالکل سچی اور حقیقی تھی 'مگر وہ دو لحاظ سے محدود تھی۔ اول تو یہ کہ ان تمام ہندی مذاہب کی جن سے اشوک کو سابقہ پڑا تعلیمات بہت کچھ ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں اور یہ سب کی سب ہندو خیالات اور احساس ہی کی مختلف صورتیں تھیں۔ ان کے درمیان کوئی ایسا فرق حائل نہ تھا جیسا مثلاً ان کے ہندو مت اور اسلام میں ہے۔ دوسرے اگرچہ شاہی مذہبی رواداری عقائد کے معاملے میں بالکل کامل تھی' لیکن ظاہر اور صریح عمل تک اس کی رسائی نہ تھی۔ ایسی بھینٹیں جن میں جانوروں کا ذبح کرنا ضروری تھا اور اس کے بغیر بعض دیوتاؤں کی پرستش کی تکمیل نہ ہو سکتی تھی' حکومت کے شروع زمانے ہی سے کم از کم دارالسلطنت میں قطعی ممنوع قرار دے دی گئی تھیں۔[8] اس کے علاوہ ستونی فرامین کے نافذ ہونے کے بعد ان پر اور پابندیاں اضافہ کر دی گئی تھیں۔ کسی مذہب کے شخص کو یہ اجازت نہ تھی کہ ان قوانین کے خلاف' جن کو حکومت نے اصولاً نافذ کیا تھا' اپنے دین کی بناء پر صدائے احتجاج بلند کر سکے۔ عوام کو اس طرح اجازت تھی کہ وہ جو جی چاہے عقیدہ اور مذہب رکھیں۔ مگر طریق عمل میں ان کو سلطنت کے احکام پر کاربند ہونا ضروری تھا۔

اصلی خیرات

اگرچہ خیرات کرنے کی بہت تاکید کی گئی تھی 'مگر ساتھ ساتھ ایک اور بڑے اصول کی تلقین بھی کی گئی تھی کہ "قانون زہد" کو خیرات میں کسی دوسرے کو بخشنے سے اور کوئی بڑی خیرات نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی اور چیز تقسیم میں "زہد" کو لوگوں میں تقسیم کرنے کے برابر ہو سکتی ہے۔"[9]

اتفاق سے یہی خیال بالکل انہی الفاظ میں کراموِیل کے سب سے پرانے خط میں پایا جاتا ہے۔ وہ سینٹ آوز مقام سے لکھتا ہے: "شفاخانوں کے بنانے سے انسان کے جسم کو راحت پہنچتی ہے۔ معبدوں کا تیار کرانا زہد و اتقاء کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ مگر وہ لوگ جو دوسروں کے لیے روحانی قوت بہم پہنچاتے ہیں اور روحانی عبادت گاہیں تعمیر کرتے ہیں وہی صحیح معنوں میں فیاض اور پرہیزگار اور عبادت گزار کہے جا سکتے ہیں۔"[۱۰]

حقیقی مذہبی رسوم

اشوک مذہبی رسوم کے بجالانے کی بہت زیادہ پروانہ کرتا تھا۔ بلکہ وہ طبعاً اس قسم کی تمام رسوم کو بنظر حقارت دیکھتا تھا۔ ان کے متعلق اس کا خیال تھا کہ "ان کا ثمرہ بے حقیقت اور اثر مشتبہ ہے۔" جس طرح حقیقی خیرات یہ تھی کہ انسان اپنے بنی نوع میں "قانون زہد" کو مشتہر کرے اور اس کی تبلیغ میں مدد دے' اسی طرح اصلی مذہبی رسوم یہ تھیں کہ وہ اس قانون پر عمل کرے کیونکہ "اس کا ثمرہ بہت ملتا ہے۔" ان ہی رسوم میں اپنے غلاموں اور نوکروں کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آنا' استادوں کی عزت کرنا' حیات کی تقدیس ملحوظ رکھنا اور برہمنوں اور تارک الدنیا اشخاص کے ساتھ ایثار بھی شامل ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور افعال "رسوم زہد" کہلاتے تھے۔[۱۱]

نیک خصائل جن کی تعلیم دی گئی ہے

مبلغ (یعنی اشوک) کو لوگوں کے ظاہری اعمال و افعال کے بجائے ان کے تزکیہ نفس کا زیادہ خیال تھا۔ وہ اپنی مذہبی جماعت یعنی اپنی وسیع سلطنت کے تمام افراد کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا تھا کہ وہ "رحم' فیاضی' حق' پرہیزگاری' شرافت اور دینداری" کے خصائل کی تحصیل میں منہمک رہیں۔ وہ یہ امید ظاہر کرتا ہے کہ ان شاہی قواعد و ضوابط کے توسط سے جو خاص اسی مقصد کے لیے نافذ کیے گئے ہیں پرہیزگاری عام طور سے پھیل جائے گی۔ لیکن اگرچہ وہ اپنی تمام شاہی قوت کو ان قواعد و ضوابط کا پابند کرنے میں صرف کر رہا تھا' مگر پھر بھی اس کا انحصار زیادہ تر ان لوگوں کے دھیان و گیان پر تھا جن میں کہ اس کی تعلیمات کی وجہ سے مذہبی جوش پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "ان دو طریقوں میں سے پرہیزگاری کے قواعد و ضوابط کچھ زیادہ کار آمد نہیں' بلکہ دھیان بیش قیمت چیز ہے۔"[۱۲]

سرکاری تبلیغ کا کام

باوجود اس کے کہ وہ ان قواعد و ضوابط کے نسبتاً ہیچ ہونے کا قائل تھا' لیکن پھر بھی راجا نے اپنے عقائد اور اصول کی تبلیغ کے لیے حکومت کے وسائل سے کام لینے میں دریغ نہ کیا اور ان کے ذریعے سے بھی اپنے عقائد کا لوگوں کو پابند کیا۔ تمام شاہی عمال کو' جن کو ہم موجودہ زمانے کی اصطلاحات کے بموجب لیفٹیننٹ گورنر' کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہہ سکتے ہیں' یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے موسمی دوروں سے فائدہ اٹھائیں اور ان کے دوران میں رعایا کی مجلسیں منعقد کر کے ان کو انسانی فرائض کی تعلیم و تلقین کریں۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے ہر سال میں چند دن مخصوص کر دیے گئے تھے اور اپنے دوسرے فرائض کے علاوہ عمال کو حکم تھا کہ وہ اس فرض کو بھی پورا کریں۔ [۱۳]

محتسب

محتسبوں کا ایک خاص محکمہ قائم کیا گیا جس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ اہنسا اور والدین کے ادب واحترام کے متعلق وہ تمام قواعد و ضوابط کی لوگوں سے پابندی کرائیں۔ ان عمال کو صریحاً حکم تھا کہ وہ ہر مذہبی فرقے اور آبادی کی ہر جماعت' یہاں تک کہ شاہی خاندان کے افراد کے چال چلن کی بھی تفتیش و تحقیق کریں۔ ان کے علاوہ اور دوسرے افسر اس کام کے لیے مقرر کیے گئے کہ وہ عورتوں کے چال چلن کی نگرانی کا نازک کام انجام دیں۔ [۱۴] عملی طور پر اس انتظام کی وجہ سے بہت کچھ جاسوسی اور ظلم و ستم ہوتا ہوگا اور اگر ہم بعد کے زمانے کے ایسے بادشاہ کے طرز عمل کو مد نظر رکھیں جس نے اسی قسم کے کام کی کوشش کی تو ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتی ہوں گی۔

ہرش کا ایسا ہی طرز عمل

ہمعصر شہادت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہرش نے (جو بظاہر اشوک کے تمام قوانین کی تقلید کے درپے تھا) اس امر میں ذرا تامل نہیں کیا کہ کسی ایسے شخص کو جس نے جانور کے ذبح کرنے یا گوشت خواری کیلئے شاہی احکام کی خلاف ورزی کرنے کی جرات کی ہو اسے سزائے موت دے۔ خواہ یہ جرم اس کی سلطنت کے کسی بھی حصے میں کیوں نہ واقع ہوا ہو۔ [۱۵]

کمارپال کا طرزِ عمل

حصہ گجرات کے بادشاہ نے جب 1159ء میں جین مت قبول کر لیا تو اس نے اہنسا کے اصول پر نہایت سختی سے عمل کرانا چاہا اور اپنے قوانین توڑنے والوں کو وحشیانہ اور جابرانہ سزائیں دیں۔ ایک بدقسمت سوداگر نے ایک جوں کو مار ڈالا۔ اس سنگین جرم کا مقدمہ انہلواڑہ کی ایک خاص عدالت میں پیش ہوا اور اس کی پاداش میں سوداگر کا تمام مال و متاع ضبط کر لیا گیا اور اس سے ایک مندر تعمیر کرا دیا گیا۔ ایک اور بدبخت کو جس نے گوشت کی ایک قاب شہر میں لا کر دارالسلطنت کی تحریم میں رخنہ ڈالا تھا قتل کر دیا گیا۔ اس خاص عدالت کا جس کو کمارپال نے قائم کیا تھا بالکل وہی مقصد اور کام تھا جو اشوک کے محکمہ کا تھا۔ اس طرح اس بعد کے زمانے کی عدالت کے کام سے ہم کو اس قدیم عدالت کی کارروائیوں کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جس کو اشوک نے قائم کیا تھا۔[6]

کشمیر میں محتسب

اس کے آگے چل کر بالکل موجودہ زمانے میں بھی اشوک کے محتسبوں کی مثال ملتی ہے۔ 1876ء میں ریاست کشمیر میں ایک پابند مذہب راجا برسرِ حکومت تھا۔ اس کے زمانے میں ہندوؤں کے شاستروں کے احکام کی خلاف ورزی کرنا سیاسی جرم تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی تحقیق و تفتیش کیلئے ایک خاص عدالت منعقد ہوتی تھی جس میں ان خاندانوں کے پانچ پنڈت شامل ہوتے تھے جن میں یہ کام نسل در نسل چلا آتا تھا۔ یہ عدالت خاص ایسے جرائم کا تصفیہ کرتی تھی۔[7]

دکن میں محتسب

انیسویں صدی کے درمیان اور غالباً اس کے بعد تک اسی قسم کے موروثی برہمن خاندیس، دکن اور کونکن کے علاقے میں ان تمام مجرموں کے جرائم کی تحقیق کرتے تھے جنھوں نے ذات کے قواعد کو توڑا ہو اور اس کے بعد ان کو کفارے کے طور پر جرمانہ، نفس کشی یا ذات باہر کرنے کی سزا دیتے تھے۔[8]

یہ قدیم اور موجودہ مثالیں اس امر کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ جب اشوک نے محتسبوں یعنی ان افسروں کو مقرر کرنے کی بدعت شروع کی "جن کو کہ اس سے قبل کبھی کسی زمانے میں مقرر نہیں کیا گیا تھا" تو اس کی یہ جدت طرازی ہندوؤں کے خیالات اور احساسات کے عین مطابق تھی۔ اسی وجہ سے آئندہ زمانے میں مختلف مذاہب کے حکمرانوں نے اس امر میں

اس کی تقلید کی۔

مہتمم محکمہ خیرات

اشوک کا زہد و اتقاء بہت سے نیک دلی اور رحم کے کاموں کی عملی صورت میں ظاہر ہوا کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذکر کرنے سے وہ خوش اور مسرور ہے۔ حقیقی خیرات کے اپنے قیاس کے باوجود وہ فیاضی کے ساتھ خیرات کیا کرتا تھا۔ بادشاہ اور اس کے خاندان کے افراد کے خیراتی عطیات کی نگرانی کا کام محتسبوں اور دوسرے عمال کے ہاتھ میں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی لوگوں کو ملا کر ایک شاہی محکمہ خیرات قائم کر لیا گیا تھا۔[19]

مسافروں کی آسائش کے سامان

مسافروں کی ضروریات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانے میں پابند مذہب ہندوستانیوں نے ان کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا ہے۔ مگر بہتر یہ ہے کہ مسافروں اور بے زبان جانوروں کے لیے' جن کو اشوک کسی حال میں فراموش نہیں کرتا تھا' جو کچھ بندوبست اور انتظام اس نے کیا تھا اس کو خود بادشاہ ہی کے الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ وہ کہتا ہے: "میں نے سڑکوں کے دو طرفہ برگد کے درخت نصب کرا دیئے ہیں تاکہ انسان اور حیوان کو چھاؤں نصیب ہو۔ میں نے آم کے درختوں کے جھنڈ نصب کرا دیئے ہیں اور ہر نصف کوس کے فاصلے پر کنویں کھدوا دیئے ہیں۔ آرام و آسائش کے لیے مکان تعمیر کیے ہیں اور ہر جگہ انسان اور حیوان کے استعمال کے لیے بے شمار سبیلیں تیار کرا دی ہیں۔"[20] اس کے علاوہ چندر اگپتا ہی کے زمانے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ستون قائم کر دیئے گئے تھے۔

بیماروں کی امداد

اشوک کو اپنے مصیبت زدہ بنی نوع اور بے زبان جانوروں کے ساتھ جو گہری ہمدردی تھی اس کا اظہار اس طرح بھی ہوا کہ اس نے بیماروں کی امداد کا بندوبست بہت وسیع پیمانے پر کیا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کے مختلف صوبجات میں انسانوں اور جانوروں کی تیمارداری کا انتظام کیا' بلکہ اس کام کو اس نے اور وسعت دی اور جنوبی ہند اور یونانی مقبوضات ایشیاء کی دوست دار سلطنتوں میں اس کا انتظام کیا۔ دواؤں میں کام آنے والی جڑی بوٹیاں جہاں پیدا نہ ہوتی تھیں وہاں ان کو حسب ضرورت یا تو بویا گیا یا دوسرے ممالک سے لائی گئیں۔[21]

سورت میں جانوروں کا شفاخانہ

احمد آباد' سورت اور مغربی ہند کے دوسرے شہروں میں جو جانوروں کے شفاء خانے آج تک موجود ہیں وہ یا تو موریا خاندان کے بادشاہ کے شفاء خانوں کی باقیات الصالحات ہیں یا ان کی تقلید ہیں۔ سورت کے شفاء خانے کا مندرجہ ذیل حال جس طرح کہ وہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں جاری تھا' غالباً پاٹلی پتر کے شفاء خانے کے بالکل مناسب ہو گا۔

> سورت کا سب سے زیادہ دلچسپ مقام بنیوں کا شفاخانہ ہے۔ مگر 1780ء سے قبل اس کا کوئی ذکر ہم کو دستیاب نہیں ہوا۔ اس وقت یہ ایک وسیع زمین پر قائم تھا اور اس کے اردگرد چار دیواری تھی۔ یہ تمام زمین مختلف حصوں میں تقسیم کی گئی تھی تاکہ جانور ان میں رہ سکیں۔ بیماری کے زمانے میں ان کی نہایت احتیاط سے نگہداشت کی جاتی تھی اور بڑھاپے کے زمانے میں جب وہ کمزور ہو جائیں تو ان کو وہاں پناہ مل سکتی تھی۔
>
> "اگر کسی جانور کا کوئی عضو ٹوٹ جاتا یا کسی اور وجہ سے وہ بیکار ہو جاتا تو اس کا مالک اسے شفاء خانے میں لاتا اور وہاں اس کے مالک کی قوم و مذہب کے بلا امتیاز اس کو رکھ لیا جاتا۔ 1772ء میں اس شفاء خانے میں گھوڑے' خچر' بیل' بھیڑ' بکری' بندر' مرغیاں' کبوتر اور بہت سے قسم کے پرندے تھے۔ ان کے علاوہ ایک ضعیف کچھوا بھی تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ 75 برس سے وہاں ہے۔ مگر سب سے زیادہ عجیب حصہ وہ تھا جہاں چوہے' چوہیاں' کھٹمل اور اسی قسم کے موذی حشرات الارض رکھے جاتے اور ان کو مناسب حال خوراک بہم پہنچائی جاتی تھی۔" ۲۲ے

ان شفاء خانوں کا انتظام عام طور پر اس اسلوب پر کیا جاتا تھا کہ ان میں جانوروں کو راحت سے زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔

بیرونی ممالک میں تبلیغ مذہب

اشوک کی وسیع سلطنت اور زیر سیادت علاقوں میں مختلف ذرائع سے حکومت کے زیر اہتمام جس تندہی سے تبلیغ مذہب کا کام جاری تھا اس سے اس کا جوش و خروش ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ خود اس کے مخصوص فلسفہ اخلاق اور بودھ مت کی تعلیمات کی برکت ان خود مختار سلطنتوں تک پہنچائی جائے جن سے کہ اس کا تعلق تھا۔ اس مقصد کو مدنظر رکھ کر اس نے بیرونی ممالک میں تبلیغ کرنے کیلئے اعلیٰ پیمانے پر اپنی زیر نگرانی انجمنیں قائم کیں۔ ان انجمنوں کا اثر اس زمانے میں بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کا ایسے اعلیٰ پیمانے پر ان مذہبی مجالس

کے قائم کرنے کا خیال بالکل اچھوتا تھا اور بہمہ وجوہ کامیاب ثابت ہوا۔ ان کو اس نے نہایت کامل طور پر اپنی خانگی مجالس تبلیغ کے ساتھ ساتھ کیا اور ان کا نتیجہ کامیابی کی صورت میں نکلا۔

اس تبلیغ کی حدود

256 ق م سے پہلے جب سنگی فرامین کو نافذ کیا گیا تو شاہی مبلغین سلطنت کے اندر جنگلی علاقوں' جنوبی ہند کی خود مختار سلطنتوں لنکا اور شام' مصر' میرین' مقدونیہ اور ایپرس کے ممالک میں بھیجے جا چکے تھے۔ ان موخر الذکر میں بالترتیب انٹی اوکس' تھیاس' ٹولمی فیلاڈلفس' میگس' انٹی گونوس' گونٹس اور سکندر حکمراں تھے۔ اس طرح اس کا تبلیغی مطمح نظر تینوں براعظموں یعنی افریقہ' یورپ اور ایشیاء پر حاوی تھا۔

زیر سیادت ریاستیں اور اقوام

اس طریقے سے وہ زیر سیادت ریاستیں اور اقوام جو بودھ مذہب کے زیر اثر آ گئیں ان میں کامبوج [۲۳] کی قوم جو یا تو تبت یا ہندوکش کے کوہستان میں رہتی تھی۔ بہت سی کوہستان ہمالیہ کی اقوام' وادی کابل اور اس کے مغربی علاقے کی قومیں' گندھارا اور یون اور بھوج' پلند' پٹینگ اقوام تھیں جو بندھیاچل اور مغربی گھاٹ کے پہاڑوں میں آباد تھیں۔ [۲۴] ان کے علاوہ دریائے کرشنا اور گوداوری کے درمیانی علاقے کی سلطنت آندھر بھی اسی زمرے میں شامل تھی۔

جنوبی ہند کی سلطنتیں

چودہ عرض بلد سے نیچے کی انتہائی جنوب کی ہندی اقوام دوری کی وجہ سے شمالی سلطنت کے ساتھ ملحق نہیں ہو سکی تھیں۔ اشوک کے زمانے میں ان کا تمام علاقہ چار سلطنتوں میں منقسم تھا۔ یعنی چول' پانڈیا' کریل پتر اور ستیا پتر۔ سلطنت چول کا مستقر غالباً اوریور تھا یا قدیم ترچنا پلی تھا۔ اور پانڈیا سلطنت کا پایہ تخت تناولی کے ضلع میں کورکئی کے مقام پر تھا۔ کریل پتر کی سلطنت میں تلوا علاقے کے جنوب کا ساحل مالابار اور وہ اندرونی اضلاع شامل تھے جن کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ چیر سلطنت سے ملحق تھے۔ چیر دراصل کریل ہی کی ایک دوسری مختلف صورت ہے۔ ستیا پتر کی سلطنت کا علاقہ غالباً وہ چھوٹی سی سرزمین تھی جس میں تولو زبان بولی جاتی ہے اور منگلور اس کا مرکزی مقام ہے۔ [۲۵] ان تمام سلطنتوں کے ساتھ اشوک کے ایسے گہرے دوستانہ تعلقات تھے کہ انہوں نے اس کو بالکل آزادی دے رکھی تھی کہ وہ نہ صرف اپنے مبلغین ان کے ملک میں بھیجے

بلکہ بعض مقامات میں خانقاہیں بھی تعمیر کرا دے۔ چنانچہ خود اس کے بھائی مہندر نے تنجور کے ضلع میں ایک خانقاہ قائم کی۔ یہ علاقہ غالباً اس زمانے میں چول سلطنت میں شامل تھا۔ اس خانقاہ کے آثار نو سو برس بعد تک پائے جاتے تھے۔[۲۶]

شہزادے بحیثیت راہب

ایک قدیم چینی مصنف نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ ہندوستان کے قوانین کے بموجب جب بادشاہ کی موت کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا بادشاہ ہو جاتا ہے اور دوسرے بیٹے خاندان سے علیحدہ ہو کر تارک الدنیا ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کو اپنے وطن میں رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔"[۲۷] دنیاوی امور سے اس جبریہ دست برداری کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ چھوٹا بھائی بالکل گمنام اور غائب ہو جاتا تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف رومن کیتھولک کلیساء کی طرح ہندی مذاہب اور خصوصاً بودھ مذہب میں چھوٹے بیٹوں کو نام اور شہرت حاصل کرنے کے بہت ذرائع حاصل تھے اور بعض اوقات یہ لوگ مذہبی کام انجام دیتے ہوئے اپنے بادشاہ رشتہ دار سے زیادہ مشہور ہو جاتے تھے۔ مذکورہ بالا قانون کی رو سے مہندر کے زرد لباس اختیار کرنے کا غالباً اصلی محرک سیاسی وجوہ تھیں اور اس نے یہ کام برضا و رغبت نہ کیا تھا۔ مگر بہرحال رہبانیت کی زندگی اختیار کرنے کے لیے خواہ کوئی بات محرک ہوئی ہو لیکن وہ آخر کار نہایت پرہیزگار بھکشو اور ایک کامیاب واعظ ثابت ہوا۔

مہندر لنکا میں

جب اشوک نے اس بات کا مصمم قصد کر لیا کہ وہ اپنے تبلیغی کام کو لنکا تک وسعت دے تو اس نے اپنے بھائی مہندر کو اس تبلیغی انجمن کی سرکردگی کیلئے منتخب کیا۔ غالباً مہندر اس سے قبل ہی جنوبی ہند میں اپنی قائم کی ہوئی خانقاہ میں مقیم تھا اور وہیں سے اٹھ کر وہ سمندر پار اپنے چار ہمراہیوں کو لے کر لنکا چلا گیا۔ ان مبلغین کی تعلیمات کو خاص کر ایسے وقت میں جبکہ اشوک جیسے زبردست بادشاہ کا اثر اس کے ساتھ تھا' لنکا کے بادشاہ تسں (دیوانمپیانس) نے مع اپنے درباریوں کے قبول کر لیا اور اسکے بعد اس نئے مذہب نے عوام الناس کے دلوں میں بہت جلد گھر کر لیا۔[۲۸] مہندر نے اپنی باقی ماندہ زندگی لنکا ہی میں بسر کر دی اور وہیں جدید قائم شدہ بودھ کے انتظام و اہتمام میں مشغول رہا۔ وہاں اب بھی اس کو ایک بزرگ مذہبی سمجھ کر اس کا ادب کیا جاتا ہے۔ اس کی خاک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مہنتلے کے مقام ابتال کے ایک زبردست ستوپ میں' جو لنکا کی ~~[illegible]~~ میں شامل ہے جن پر اسے بجا فخر ہے' مشغول استراحت ہے۔[۲۹]

لنکا کی حکایات

تاریخ "مہاوس" چھٹی صدی عیسوی کے آغاز سے لکھی جانی شروع ہوئی تھی۔ اس میں اشوک کے ان تمام تبلیغی مشنوں کا ذکر ہے جو اس نے بیرونی ممالک میں بھیجے تھے۔ مگر اس میں جنوبی ہند کے مشنوں کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ اس خاموشی کی ایک کافی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ لنکا اور ہندوستان کی تامل اقوام کے درمیان سخت دشمنی تھی جو صدیوں تک قائم رہی۔ اگر مہندر تنجور کے ضلع کی خانقاہ سے لنکا گیا ہو گا تو یہ امر بہار عظیم کے تارک الدنیا فرقے کے لیے سخت باعث نفرین و نفرت ہو گا اور ان کو ہرگز یہ گوارا نہ ہو گا کہ وہ اس بات کا خیال بھی اپنے سامنے آنے دیں کہ دینی باتوں میں وہ قابل نفرت تامل اقوام کے ایک بھکشو کے ممنون احسان ہوں۔ اس کے بجائے انہوں نے اس بات کو ترجیح دی ہو گی کہ ان کا مذہب ان کو براہ راست بودھ مذہب کی ارض مقدس سے ملا تھا۔ بہر حال اسی قسم کی کوئی نہ کوئی بات اس امر کی محرک ہوئی ہو گی جس نے کہ مہندر کے متعلق لنکا میں بالکل نت نئی حکایتیں گھڑ لیں ان کے مطابق مہندر اشوک کا غیر صحیح النسل بیٹا تھا اور اس کے بعد اس کی بہن سنگ مترا بھی لنکا میں آگئی اور اس نے وہاں کی تارک الدنیا نسوانی جماعت کے لیے وہی کچھ کیا جو اس کے بھائی نے مردوں کے متعلق انجام دیا تھا۔ یہ حکایت بہت سی خوارق عادات سے بھری ہوئی ہے اور کافی وہ ضرور مصنوعی ہو گی۔ [۲۰] غالباً یہی روایت درست ہے کہ مہندر اشوک کا چھوٹا بھائی تھا۔ چنانچہ پانچویں صدی عیسوی میں جب فاہیان ہندوستان آیا ہے تو پاٹلی پتر میں مہندر کا نام اب تک لوگوں کے ذہن میں تھا اور فاہیان کو وہاں اس کی خانقاہ بھی دکھلائی گئی۔ ساتویں صدی میں جب ہیون سانگ ہندوستان میں آیا ہے تو صرف یہی ایک حکایت عام طور پر مشہور تھی۔ یہاں تک کہ جب اس یاتری نے لنکا کے ان بھکشوؤں سے جن سے کانچی کے مقام پر اس کی ملاقات ہوئی ان کی تمام روایات کو نقل کیا تو اس نے بھی ان روایات کا ہیرو اشوک کے بھائی نہ کہ بیٹے کو بتایا۔ [۲۱]

پیگو کا مفروضہ مشن

"مہاوس" نے صریحاً اس میں بھی غلطی کی ہے کہ اشوک نے پیگو کے علاقے میں کوئی مشن روانہ کیا تھا۔ مگر کتبوں میں کسے ایسی مشن کا ذکر نہیں اور یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ اشوک کا تعلق خلیج بنگالہ کے مشرقی ممالک سے کچھ بھی ہو۔ اس کی تمام توجہ مغرب میں یونانی سلطنتوں کی طرف مبذول تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت زمانے کے بعد لنکا کے طرز کا بودھ مذہب برما اور پیگو کے علاقے میں پھیلا اور یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ برما کا بودھ مذہب دراصل مہایان قسم

کا تھا اور اشوک کے مرنے کے بہت صدیوں بعد براہ راست شمالی ہند سے وہاں پہنچا تھا۔ [۲]

یونانی سلطنتوں کی طرف تبلیغی مشن

بدقسمتی سے بدھ مذہب کے ان تبلیغی مشنوں کا حال محفوظ نہیں رہا جو ایشیاء، افریقہ اور یورپ کی یونانی سلطنتوں میں بھیجے گئے تھے اور نہ ہی ان کے مبلغوں کے نام ہی ہم کو معلوم ہیں۔ "ناستک" کے لامذہب فرقوں پر بدھ مذہب کا اثر بالکل صاف و صریح ہے۔ بلکہ بہت سے مصنفین ایسے بھی ہیں کہ جن کے خیال میں عیسوی مذہب کی بھی بہت سی باتوں میں بدھ کی تعلیمات کا اثر ملتا ہے۔ مگر یہ مضمون اب تک ایسا تاریک اور تشنہ ہے کہ اس پر اس کتاب میں بحث نہیں کی جاسکتی۔ [۳]

بودھ مذہب عالمگیر ہو گیا

مگر بہرحال یہ یقینی ہے کہ اشوک اپنی وسیع اور نہایت منتظم طریق تبلیغ کے ذریعے سے اس کام میں کامیاب ہوا کہ بودھ مذہب کی تعلیمات کو محض ایک گمنام ہندی مذہبی فرقے کی حیثیت سے نکال کر اس کو تمام دنیا میں پھیلا دے اور اسے ایک عالمگیر مذہب بنا دے۔ گوتم بدھ کی ذاتی تبلیغ کا اثر ایک نہایت چھوٹے سے علاقے تک محدود تھا۔ جس میں تقریباً چار درجے عرض بلد اور اتنے ہی طول بلد شامل تھے۔ یہ علاقہ گیا الہ آباد اور کوہستان ہمالیہ کے درمیان کا ملک تھا۔ ان ہی حدود کے اندر گوتم بودھ پیدا ہوا، زندہ رہا اور بالآخر فوت ہو گیا۔ 487 ق-م میں جب اس نے وفات پائی تو اس کا مذہب ہندومت کا محض ایک فرقہ تھا جس کا نام بھی اس محدود علاقے سے باہر کسی نے نہ سنا ہوگا۔ اس وقت اس کے زندہ رہنے کے اسباب اتنے ہی کم تھے جتنے کہ دوسرے مذہبی فرقوں کے جو اسی زمانے میں پیدا ہوئے اور اب بالکل فراموش ہو گئے ہیں۔

بودھ مذہب کے پیروؤں کا اپنی خانقاہوں کا نہایت مستحکم انتظام کر لینے کا غالباً یہ اثر تھا کہ ان کا مذہبی سلسلہ برابر قائم رہا اور اس نے دریائے گنگا کی وادی کے باشندوں کے دلوں میں ان سوا دو صدیوں کے عرصے میں گھر کر لیا جو گوتم بودھ کی موت اور اشوک کی تبدیلیٔ مذہب کے درمیان گذریں۔ جوں جوں اشوک کا عقیدہ اور یقین اس مذہب کے متعلق پختہ اور مضبوط ہوتا گیا۔ اسی طرح اس کی دستگیری بھی بڑھتی چلی گئی۔ اس کی اسی دستگیری نے بودھ مذہب کی قسمت کو پھیرا اور اسے اس قابل کر دیا کہ اس زمانے میں بھی وہ اسلام اور عیسائیت کا بلحاظ تعداد مقابلہ کرنے بلکہ ان سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اشوک کا کام

اشوک نے اس امر کی بالکل کوشش نہیں کی کہ برہمنی ہندو مت یا جین مذہب کو تباہ و برباد کردے۔ لیکن خونریز قربانیوں کی ممانعت کی۔ وہ ترجیح جو وہ ہر ایک بات میں بودھ مذہب کو دیتا تھا اور اس کے ساتھ اس کی تبلیغی کام میں سرگرمی' یہ ایسی وجوہ تھیں جنہوں نے اس کے مرجح مذہب کو ترقی دی' دوسروں کو پس پشت ڈال دیا اور لنکا اور ہندوستان کے ممالک میں اس کو سب سے بڑا اور عالمگیر مذہب بنا دیا۔ اگرچہ وہ اپنی جائے پیدائش سے تقریباً بالکل معدوم ہو گیا ہے اور دور و دراز کے مقامات پر بھی اپنا اثر قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہوا' مگر جنوبی جزیرے پر اب بھی اس کا رسوخ قائم ہے۔

لیکن پھر بھی بہت سی ناکامیابیوں' ترقی و تنزل' ارتقاء اور تخریب و فساد کے بعد بودھ مذہب اس وقت بھی اور آئندہ چند صدیوں تک بے شمار انسانی دل و دماغ کو اپنے قابو میں رکھنے میں کامیاب ہو گا۔ یہ عظیم الشان کام کلیتہً اشوک ہی کا کیا ہوا ہے اور اس وجہ سے اس کا حق ہے کہ وہ ان لوگوں کی چھوٹی سی جماعت میں جگہ پائے جنہوں نے دنیا کے مذہب کو بالکل تبدیل کر دیا ہے۔

عیسائیت سے اس کا تقابل

اشوک اور قسطنطین کا جو مقابلہ عام طور پر کیا جاتا ہے' دوسرے تاریخی مقابلوں کی طرح بالکل درست نہیں۔ جب قیصر نے عیسائیت کو حکومت کا مذہب قرار دیا اس وقت وہ رومتہ الکبریٰ کی وسیع سلطنت میں اپنی جگہ بنا چکی تھی اور قسطنطین نے مذہب تبدیل کر کے درحقیقت ایک ایسی قوت کے سامنے سر تسلیم خم کیا جس کا وہ خود مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس کا یہ فعل کسی گمنام مذہبی فرقے کی دستگیری یا مربی ہونے کی حیثیت سے نہ تھا۔ برخلاف اس کے جب اشوک نے بودھ مذہب کو مدد دینی شروع کی اور یہ بہت سے مذہبی فرقوں کی طرح امید و بیم کی نازک حالت میں تھا اور اس کی قطعی طور پر یہ کیفیت نہ تھی کہ وہ سلطنت کے کاموں میں دخیل ہو سکے' یہ خود اسی کا ذاتی عمل تھا۔ اس کو بظاہر اس کا مرشد اُپگپت اکساتا رہتا تھا جس نے بدھ کی تعلیمات کو ہندوستان کی حدود سے باہر تک پھیلا دیا۔ اور اگر واقعی اس امر کی ضرورت محسوس ہو کہ اس کے کام کا مقابلہ عیسائیت سے کیا ہی جائے تو اس کا مقابلہ پولوس رسول ؑ کی ذات کے ساتھ بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔

اُپگپت

اُپگپت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسی نے اشوک کو بودھ مذہب کی طرف مائل کیا تھا۔ یہ شخص گپت نامی ایک عطار کا بیٹا تھا اور روایت ہے کہ وہ بنارس یا متھرا میں پیدا ہوا۔ لیکن وہ غالبا موخر الذکر مقام کا رہنے والا تھا اور یہیں پر اس کی تعمیر کی ہوئی خانقاہ ساتویں صدی عیسوی تک موجود تھی۔ روایت کے مطابق سندھ کے علاقے سے بھی اس کا تعلق ظاہر ہوتا ہے جہاں اس نے اکثر تبلیغ مذہب کے لیے سفر کیے تھے۔ ۳۵

اشوک کی ہمت

اشوک نے اپنے مذہب اور سلسلہ اخلاقیات کی تبلیغ و تشہیر میں جس تندہی اور جوش و خروش سے کام کیا تھا وہ اس کی صداقت اور خوش اعتقادی کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اور موجود علماء نے جو کچھ اعتبار و اعتماد اس کے کتبوں اور احکام کے الفاظ پر کیا ہے وہ بالکل درست اور بجا معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "عوام کی بہبود اور فائدے کے لیے محنت تو مجھ کو کرنی ہی ہے۔" اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے محنت کی بھی ضرور۔ دنیا اب تک اس کی اس محنت سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اس کے الفاظ جن کو دنیا نے ایک زمانے تک بالکل فراموش کر دیا تھا اب پھر جیتے جاگتے ہمارے سامنے ہیں اور خوش اعتقادی اور صداقت کی آواز سے گونج رہے ہیں۔

اشوک کی محنت

فلپ ثانی شاہ سپین کی طرح اشوک محنت سے کبھی نہیں تھکتا تھا۔ وہ "ہر حالت میں اور ہر جگہ" عرضیوں پر غور کرنے کے لیے تیار رہتا تھا اور باوجود اس کے اس کو اپنی محنت کے نتیجے سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ غالباوہ سخت محنت کرتا تھا اور ممکن ہے کہ اگر وہ ذرا کام کم کرتا تو اپنے مقاصد میں اس کو اور زیادہ کامیابی ہوتی۔ اس کے دماغ میں فرائض کا معیار نہایت اعلیٰ تھا اور رواقی (stoic) فلسفیوں کی طرح قانون فطرت پر عمل کرنا اس کا کام تھا۔ اصل غایت یہ تھی کہ وہ کام کیے جائے خواہ اس کام میں اس کو کامیابی حاصل ہو یا ناکامیابی۔

اشوک کے خصائل

اشوک کے خصائل کا حال ہم اس کے الفاظ ہی سے کچھ اخذ کر سکتے ہیں۔ طرز تحریر خود اس کا معلوم ہوتا ہے۔ میرا تو قطعاً خیال ہے کہ ان کتبات میں اس کے خیالات کو اسی کے لفظوں میں ادا

کیا گیا ہے۔ یہ تمام ایسے طرز تحریر میں لکھے گئے ہیں جو ایسا عجیب و غریب ہے کہ وہ کسی معتمد یا وزیر کے لکھے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ ان سے ہم کو صریحاً ذاتی احساسات کا پتہ لگتا ہے۔ کسی معتمد کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ اپنے آقا کی زبان سے وہ کلمات رنج و افسوس لکھتا جو اس نے کلنگ کی فتح کے متعلق لکھے ہیں اور جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشوک نے جارحانہ جنگ کو تادم زیست بالکل ترک کر دیا اور علانیہ یہ کہہ دیا کہ "اگر کوئی شخص اس کو کچھ تکلیف بھی پہنچائے تو حضرت اقدس و اعلیٰ اس کو اس وقت تک صبر سے برداشت کریں گے جب تک کہ وہ قابل برداشت رہے۔"[6]

کتبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشوک ایک ایسا آدمی تھا جس نے یہ کوشش کی کہ تارک الدنیا سنیاسی کی پرہیزگاری اور شاہی مصلحت کو ملا کر ایک کر دے' اور اپنے خیال کے مطابق ہندوستان میں راست باز حکومت قائم کر دے۔ ایسی خدائی سلطنت کو قائم کرنا اس کا مقصد تھا جس میں خدا کا وجود ہی سرے سے نہ ہو' جس میں حکومت خود خدائی کا کام انجام دے اور لوگوں کو سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت کرتی رہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر ایک شخص کو اپنی نجات خود ہی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے اعمال کا ثمرہ اسی کو ملتا ہے۔ "جانفشانی کا ثمرہ صرف بڑے آدمیوں ہی کو نہیں ملتا کیونکہ کوئی حقیر سا شخص بھی اپنے جانفشانی اور محنت سے سعادت حاصل کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا گیا تھا کہ "چھوٹے اور بڑے سب کو جانفشانی سے کام لینا چاہیے۔"[7] حکومت کا صرف یہ کام تھا کہ وہ سیدھا راستہ اپنی رعایا کو بتلا دے۔ مگر اس کے بعد اس راستے پر چلنا خود لوگوں کا کام ہے۔

تعظیم و تکریم' رحم' راستی اور ہمدردی وہ نیک اوصاف تھے جن کی وہ تعلیم دینا چاہتا تھا اور بخلاف ان کے بے ادبی' بے رحمی' جھوٹ اور مذہبی تعصب ایسے افعال تھے جن سے کہ وہ لوگوں کو بچنے کی ہدایت کرتا تھا۔ یہ واعظ (یعنی اشوک) محض ناصح ہی نہ تھا بلکہ ایک دنیادار آدمی بھی تھا' جنگ و صلح کے ہر طرح کے کاموں کا ماہر تھا' ایک وسیع سلطنت پر نہایت لیاقت و کامرانی سے حکومت کر رہا تھا اور ان باتوں کے علاوہ وہ ایک عظیم الشان انسان اور بادشاہ تھا۔

اشوک کی بیویاں

دیگر ایشیائی بادشاہوں کی طرح اشوک بھی کثرت ازدواج کے اصول کا عامل تھا اور کم از کم اس کی دو بیویاں تھیں جن کا رتبہ ملکہ کا تھا۔ ان دونوں میں سے دوسری بیوی کاروا کی کا نام ایک مختصر سے فرمان میں محفوظ رہ گیا جس میں کہ بادشاہ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ تمام عمال کو چاہیے کہ ملکہ کے خیراتی عطیات خود اس کا ذاتی کام سمجھیں اور اس کا تمام ثواب اسی کے واسطے مخصوص ہو گا۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ تیور شاہزادے کی ماں تھی۔ یہی لڑکا غالباً اشوک کے عہد حکومت کے آخری

زمانے میں، جب کہ یہ فرمان نافذ کیا گیا، اس کا سب سے پیارا لڑکا ہو گا۔

کُنال کے متعلق حکایت

روایات کا بیان ہے کہ ایک مدت تک اس کی سب سے بڑی ملکہ اسندی مترا نامی تھی اور جب وہ مرگئی اور اشوک بھی بڈھا ہو گیا تو اس نے ایک آوارہ جوان عورت تشیار کشتا سے شادی کرلی۔ اس کے اور اس کے سوتیلے بیٹے کے متعلق حکایت بہت تخیلانہ اندازے میں بیان کی جاتی ہے۔ مگر اس قسم کی زبان زد خاص و عام روایات تاریخی حیثیت کے شمار میں نہیں آتیں۔ اس لیے اندھے کنال کی جگر سوز و درد انگیز کہانی کو نہ تو تاریخی نظر سے دیکھنا چاہیے اور نہ اس پر تنقید کرنی چاہیے۔ یہ حکایت مختلف صورتوں میں مختلف ناموں کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔

جلوک کی حکایت

جلوک نامی اشوک کا ایک دوسرا بیٹا، جس کا نام کشمیر کی روایتوں کے ضمن میں اکثر سنا جاتا ہے۔ اگرچہ بظاہر بالکل خیالی شخص معلوم ہوتا ہے مگر بہرحال اس میں کنال سے زیادہ حقیقت مضمر ہے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ کشمیر کا نہایت زبردست اور لائق بادشاہ تھا جس نے بعض دست دراز اجنبیوں کو ملک سے باہر نکال دیا اور قنوج تک کے میدان کو فتح کیا۔ وہ اپنے باپ کے برعکس بودھ مت کا مخالف تھا اور شیو کو پوجتا تھا۔ چنانچہ اس نے اور اس کی ملکہ اسان دیوئی نے اسی دیوتا کے نام پر ایسی جگہ مندر تعمیر کرائے جن کا نام اس وقت بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ مگر جلوک کی حکایت ان تمام جغرافیائی تفصیلات کے باوجود حقیقتاً محض روایت ہی ہے اور کشمیر کی اس تاریخی روایت کے اسناد اب تک دستیاب نہیں ہوئے۔ ^۸

دسرتھ

جس شہزادے کا نام تیور ملکہ کے فرمان میں مذکور ہے اس کا اس کے بعد کوئی پتہ نہیں ملتا اور ظن غالب یہ ہے کہ وہ اپنے باپ سے پہلے ہی مرگیا ہو گا۔ مگر اشوک کا پوتا دسرتھ حقیقت میں کوئی نہ کوئی شخص تھا۔ کیونکہ وہ ناگرجنی کے غاروں پر جس کو اس نے (اسی طرح جس طرح کے اس کے دادا نے کوہ برابر کے غاروں کو دیا تھا) آجیوک سنیاسیوں کے حوالے کیا۔ دسرتھ کے کتبے کی طرز تحریر اور زبان سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ اشوک کے عہد کے بہت ہی قریب تھا اور غالباً کم از کم مشرقی صوبوں میں وہ اس کا جانشین ہوا تھا۔ اگر اس امر کو واقعہ تسلیم کرلیا جائے تو دسرتھ کی تخت نشینی کا سن ۲۳۲ ق م قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا عہد حکومت نہایت ہی قلیل تھا

اور دو پرانوں میں اس کا عرصہ صرف آٹھ سال کا بتایا گیا ہے۔

سمپرتی۔بدھ مذہب کی روایات

اشوک کے ایک پوتے سمپرتی کا وجود اور اس کی جانشینی اگرچہ کتبات کے ذریعے سے ثابت نہیں ہوتی' مگر روایات کی خاصی بڑی تعداد سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ بودھ مذہب کی نثر کی حکایت کی کتاب اشوکا ودان (جو دیویا ودان کا ایک حصہ ہے) میں ایک طولانی قصہ مذکور ہے کہ بڑھاپے کے زمانے میں اشوک کے مذہبی معاملات میں انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی آمدنی اسراف میں صرف ہونے لگی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وزراء نے تنگ آکر اس کے اقتدار اور اختیارات کو بالکل سلب کر لیا اور اس کی جگہ کنال کے بیٹے سمپرتی کو تخت پر بٹھادیا۔ مگر ہم کو یہ نہیں بتایا گیا کہ اشوک کا کیا انجام ہوا۔ اس حکایت کے موافق سمپرتی کے جانشین برہسپتی' برشسین' پشتی دھرمن اور پشتی متر تھے۔ مذکور الذکر کے متعلق بھی یہ ہی کہا گیا ہے کہ موریا خاندان سے تعلق رکھتا۔[39]

جین مت کی روایات

مغربی ہند کی جین ادبی روایات بھی سمپرتی کو اشوک کا بلا فصل جانشین بیان کرتی ہیں۔ وہ اس کے جین مذہب کے مربی ہونے کی حیثیت سے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اس نے غیر آریا ممالک میں بھی جین خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ جین مذہب کے تقریباً تمام مندر اور دیگر عمارتیں جن کی ابتداء معلوم نہ ہو وہ سمپرتی کے نام تھوپ دی جاتی ہیں۔ بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ جین مت کا اشوک سمجھا جاتا ہے۔ ایک مصنف بیان کرتا ہے کہ وہ تمام ہندوستان کا بادشاہ تھا (کل بھارت مع اس کے تینوں ملکوں کے) اور پاٹلی پتر اس کا دارالسلطنت تھا۔ مگر دوسری روایات نے اس کا مستقر سلطنت اجین قرار دیا ہے۔ یہ امر صریح اور صاف ہے کہ ان تمام متضاد روایتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنا اور اس امر کا یقین کرنا کہ ان سے تھوڑا بہت تاریخی مواد حاصل ہو جائے گا بالکل ناممکن ہے۔ بدھ اور جین مذاہب کی روایتوں کی مطابقت سے اور کچھ نہیں تو یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اگر ان کو دلیل قطعی نہ مانا جائے تو بھی سمپرتی کا وجود تو ضرور ہی تھا۔ اگرچہ اس کے متعلق کوئی بات یقین کے ساتھ معلوم نہیں ممکن ہے کہ اشوک کے مرنے کے بعد ہی سلطنت اس کے دو پوتوں میں تقسیم ہو گئی اور دسرتھ نے اس کا مشرقی حصہ اور سمپرتی نے مغربی حصہ لے لیا ہو' مگر اس بات کی کوئی شہادت بھی موجود نہیں۔[40]

ختن کی حکایات

ختن کی روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سلطنت میں اور اشوک میں اکثر تعلقات قائم تھے۔ اس حکایت کی ایک روایت کے مطابق اس نے ٹیکسلا کے چند امراء کو اپنے بیٹے کنال کو اندھا کرنے میں مدد دینے کی سزا میں کوہستان ہمالیہ کے شمال میں جلاوطن کیا۔ ان جلاوطنوں نے اپنے میں سے ایک کو بادشاہ منتخب کیا اور اس نے اس وقت تک ختن میں حکومت کی جب تک کہ چین کے ایک حریف شہزادے نے اس کو شکست نہ دی۔ ایک اور روایت کے بموجب ختن کے شاہی خاندان کا اصلی مورث اعلیٰ اشوک کا بیٹا کنال ہی تھا' جس کو ٹیکسلا سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ حکایات صرف اس امر کو سمجھانے کے لیے گھڑی تھیں کہ ختن کا قدیم تمدن ہندوستان اور چین دونوں مقاموں سے ماخوذ تھا۔ یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ اشوک کا سیاسی حلقہ اثر دریائے تاریم کے میدان تک وسیع ہو۔ [۴۱]

خاندان موریا کا زوال وانحطاط

پران کی سند کے مطابق موریا خاندان کی کل مدت حکومت صرف 137 برس ہے۔ اگر اس مدت کو صحیح سمجھ لیا جائے اور اس کا شمار 322 ق م میں چندراگپتا موریا کے سن جلوس سے کیا جائے تو خاندان کا خاتمہ یقیناً 185 ق م میں ہو گیا ہو گا۔ یہ تاریخ اندازاً درست ہے۔ پران کی فہرست شاہان کے مطابق وہ چار راجا جو اشوک کے پوتوں کے بعد تخت پر بیٹھے اور جنھوں نے چند ہی سال حکومت کی' محض نام ہی نام ہیں۔ [۴۲] اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ سمپرتی اور اس کے جانشین واقعی کبھی عالم وجود میں تھے تو بھی وہ اوروں کی طرح محض خیالی لوگ ہیں۔ یقینی بات ہے تو صرف یہ کہ وہ سلطنت جس کو چندراگپتا موریا نے قائم کیا اور جس کو اس کے بیٹے اور پوتے نے سنبھالے رکھا آخری بادشاہ کی موت کے بعد بہت دنوں تک برقرار نہ رہ سکی۔ خاندان موریا کے زوال کا سبب غالباً ایک بڑی حد تک وہ انتقامی ہنگامہ تھا جس کے لیے برہمنوں نے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا ہو گا' کیونکہ خصوصی حیثیت میں اشوک کے بودھ مت کے مربی ہونے کی وجہ سے بہت کچھ خلل پڑ گیا تھا۔ خونریز قربانیوں کی ممانعت اور محتسبوں کی وقت بے وقت کے دخل در معقولات نے غالباً بہت ناراضی پیدا کی ہو گی جس کا حال ہم تک نہیں پہنچا۔ اور ہم کافی صحت کے ساتھ یہ فرض کر سکتے ہیں کہ سن رسیدہ طاقتور مہاراجا کی آنکھ بند ہونے کی دیر تھی کہ برہمنوں کا اثر حسب دستور پھر قائم ہو گیا اور انہوں نے اشوک کے نظام احتساب کی درشتی کے خلاف ایک ہنگامہ اور انقلاب پیدا کر دیا۔ [۴۳] اشوک کی وہ اولاد جن کے نام پرانوں میں محفوظ رہ گئے ہیں' غالباً صرف

مگدھ اور قرب وجوار کے صوبوں ہی پر حکمراں تھے۔ 212 ق م یا اس کے قریب ان ہی لوگوں میں سے ایک کو کلنگ کے جین حملہ آور بادشاہ کھار یویلا کے سامنے، جس نے موریا کا طوق غلامی اتار کر پھینک دیا تھا، مجبور ہونا پڑا کہ اپنے سر خم کر دے۔[۴] دریائے کرشنا اور گوداوری کے مابین کی زیر سیادت آندھر ریاست سب سے پہلے سلطنت سے جدا ہوئی اور بہت جلد ایک زبردست سلطنت بن گئی، اور جیسا کہ آئندہ بیان کیا جائے گا، آخر تمام ہندوستان پر چھا گئی۔ موریا خاندان کا آخری کمزور بادشاہ برہدرتھ تھا جسے اپنی فوج کے سپہ سالار پشتی متر نے قتل کر دیا۔

مقامی موریا راجہ

اشوک اعظم کی اولاد کے بہت سے افراد صدیوں تک مگدھ میں مقامی طور پر (بلا کسی تاریخ کے) مگدھ کے علاقے میں حکمراں رہے۔ ان میں سے صرف ایک شخص کا نام محفوظ رہ گیا ہے۔ یہ آخری بادشاہ پورن درمن تھا اور چینی یاتری ہیون سانگ کا ساتویں صدی عیسوی میں تقریباً ہمعصر[۵] تھا۔

اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے موریا خاندان، جن کا ظاہراً کسی نہ کسی طرح موریائے اعظم کے خاندان سے تعلق تھا، مغربی گھاٹ اور سمندر کے درمیان کونکن کے علاقے اور مغربی ہند میں چھٹی ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے دوران برسر حکومت تھے اور کتبات میں اکثر ان کا ذکر آتا ہے۔[۶]

خاندان موریا

جدول سنین۔ (تقریباً صحیح تاریخیں)

سن قبل مسیح	واقعات
326 یا 325	چندراگپتا نے اپنی جوانی کے زمانے میں سکندر اعظم سے ملاقات کی۔
ستمبر یا اکتوبر 225ء	سکندر ہندوستان سے واپس چلا گیا۔
	سکندر جب کرمانیہ میں تھا تو اس کو اپنے صوبے دار فلپوس کے ہندوستان میں قتل ہو جانے کی خبر ملی اور اس نے یوڈیمس اور ٹیکسلا کے راجا امبھی کو ہندوستان کے صوبوں کا حاکم مقرر کیا۔
جون 323	بابل میں سکندر کی موت۔
323--322	چندراگپتا موریا کی سرکردگی میں پنجاب کی بغاوت اور مگدھ میں نند خاندان کی بربادی۔ چندراگپتا موریا کا بحیثیت شہنشاہ ہند تخت نشین ہونا۔
321	ٹری پر دائیسوس کے مقام پر سکندر کی سلطنت کا دوبارہ تقسیم ہونا۔
315	انٹی گونس نے سائلوکس نیکٹر کو مجبور کیا کہ وہ مصر میں پناہ لے۔
312	سائلوکس نے بابل پر دوبارہ قبضہ کیا۔
اکتوبر 312	سائلوکس سن کا مقرر ہونا۔
306	سائلوکس کا خطاب شاہی اختیار کرنا۔
305 یا 304	سائلوکس کا ہندوستان پر حملہ۔
303	سائلوکس نے چندراگپتا کے ہاتھ سے شکست کھائی۔ صلح نامہ۔ اس کی رو سے سائلوکس نے آریانہ کا بڑا علاقہ ہندوستانی راجا کے حوالے کیا۔
303 تا 301	انٹی گونس کے خلاف سائلوکس کا کوچ۔
302	پاٹلی پتر میں سائلوکس کی طرف سے میگاستھنیز سفیر بن کر آیا۔
301	انٹی گونس کی فریجیا کے علاقے میں اپساس کے مقام پر شکست اور موت۔
298	بندوسار امتر گھات کا ہندوستان کے تخت پر جلوس۔
(تقریباً) 296	پاٹلی پتر میں سائلوکس کی طرف سے دیمیکوس کا سفیر بن کر آنا۔
285	ٹولمی فلیڈلفس مصر کا بادشاہ ہوا۔
280	شام کا بادشاہ سائلوکس نیکٹر مرگیا اور اس کی جگہ اسی کا بیٹا انٹی اوکس سوٹر بادشاہ ہوا۔

واقعات	سن قبل مسیح
انٹی اوکس اول کا پوتا مقدونیہ کا بادشاہ انٹی گونوس گوتس تخت پر بیٹھا۔	278 یا 277
اپیرس کا بادشاہ سکندر جو پرہس کا بیٹا اور انٹی گونوس گوتس کا حریف تھا' تخت پر بیٹھا۔	272
اشوک وردھن شہنشاہ ہند کی تخت نشینی۔	273
اشوک کی تاج پوشی۔	269
جنگ پیونک اول کا آغاز۔	264
اشوک کا کلنگ کے علاقے کو فتح کرنا۔ شام کا بادشاہ انٹی اوکس تھیاس جو انٹی اوکس سوٹر کا بیٹا تھا' تخت پر بیٹھا۔	261
اشوک نے شکار کو موقوف کیا۔ زہد کی تعلیم دینے کے لیے دورے مقرر کیے اور واعظ باہر بھیجے۔	259
ٹولمی فلیڈ لفس کا سوتیلا بھائی سیرین کا بادشاہ مگس مر گیا(؟) اپیرس کا بادشاہ سکندر فوت ہوا۔	258
اشوک کا چھوٹا سنگی فرمان نمبر1 اور سنگی فرمان نمبر4'3 نافذ ہوئے۔ اس نے ہر پانچ سال کے بعد قانون فرائض (دھرم) کی تبلیغ کے لیے دوروں کا دستور نکالا اور اجیوک سنیاسیوں کو برابر کی پہاڑیوں میں غار عطا کیے۔	257
"چودہ سنگی فرمانوں" کا سلسلہ اور کلنگ کے سرحدی فرمان کو اشوک نے شائع کیا اور اس سال قانون فرائض کے محتسب بھی مقرر ہوئے۔	256
اشوک نے دوسری مرتبہ کپل وستو کے قریب کونکن کے ستوپ کی توسیع کی۔	255
اشوک نے "کلنگ کا صوبے داری فرمان" نافذ کیا۔	254(؟)
اشوک نے ایک تیسرا غار آجیوک سنیاسیوں کو برابر کے پہاڑیوں میں عطا کیا۔	250
اشوک کا بودھ مذہب کے مقدس مقامات کی یاترا کو جانا' باغ لمبنی اور کونکن کے ستوپ کے قریب ستون قائم کرانا(؟) اس کا نیپال جانا اور وہاں للت پٹن کا شہر آباد کرنا۔ اس کی بیٹی چارومتی نے سنیاس کی زندگی اختیار کی۔	249
باختر اور پارتھیا نے اپنی اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔	248(؟)
مصر کا بادشاہ ٹولمی فلیڈ لفس فوت ہوا۔	247
شام کا بادشاہ انٹی اوکس تھیاس جو سالوکس نیکٹر کا پوتا تھا فوت ہوا۔	247 یا 246
اشوک نے ستونی فرمان نمبر6 تحریر کیا اور سنگی فرمانوں کو مستقل کر دیا۔	243
اشوک نے "سات ستونی فرمان" کا کامل سلسلہ نافذ کیا۔	242

سن قبل مسیح	واقعات
242یا239	مقدونیہ کا بادشاہ انٹی اوکس گناٹا مرگیا۔
241	پہلی جنگ پیونگ کا خاتمہ اور پر گیمم کی سلطنت کا آغاز۔
240(?) تا 232	اشوک کے "چھوٹے ستونی فرامین"۔
232	اشوک کا انتقال۔ دسرتھ اس کا جانشین ہوا۔
	ناگارجونی کے غار اجیوک سنیاسیوں کو عطا کیے۔ موریا سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔
224(?)	سنگت موریا بادشاہ بنا (بندھپالت وایوپران)
216(?)	سالسوک موریا (اندرپالت۔ وایوپران)
	(؟) اڑیسہ کے بادشاہ کھاریویلا سے اس نے شکست کھائی۔
206(?)	سوم سرمن موریا۔ (دساورمن یا دیوورمن۔ وایوپران)
199(?)	ستدھنوں میں موریا بادشاہ (ستدھنس۔ وایوپران)
191(?)	برہدرتھ موریا بادشاہ۔ (برسدسوا۔ وایوپران)
185	پشتی متر برہدرتھ کو قتل کرکے بادشاہ بنا۔ موریا سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ کے

حوالہ جات

۱؎ بدھ مت کے تین مخصوص اصولوں میں سے پہلا یہ ہے کہ وجود کے تمام اجزاء ناپائدار ہیں۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ وہ تمام مصائب و آلام کا گھر ہیں اور تیسرے ان میں انانیت کا مادہ نہیں پایا جاتا۔ (وارن: "بدھ ازم ان ٹرانسلیشنز" صفحہ 14 (مقدمہ)۔

۲؎ ستونی فرمان 4۔

۳؎ سنگی فرمان نمبر1۔ اس کے متعلق مسٹر ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر نے اپنے مضمون "اسی گریفک نوٹس اینڈ کونشنز" (جے بمبئی برانچ رائل ایشیاٹک سوسائٹی 1902ء) میں جو بحث کی ہے 'وہ قابل غور ہے۔ متوفی مسٹر ای۔ ٹامس کا خیال تھا کہ اشوک اوائل زندگی میں جین مت کا پیرو تھا۔ مگر اس کے وجوہ و دلائل کمزور ہیں۔

۴؎ چٹانی فرمان نمبر8۔ "شاہ بزرگ محترم" دیوانمپیا پیادسی" کا خاصہ اچھا ترجمہ ہے۔ یہ الفاظ اشوک کا شاہی لقب ہیں اور تحویل کے ذریعے سے ان کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "دیوتاؤں کا پیارا اور کریم النفس۔"

۵؎ ستونی فرمان نمبر5۔ اس کے ساتھ مقابلہ کرو چانکیا کے قواعد کا ارتھ شاستر باب 2 فصل 26۔ ان دونوں قواعد میں ایک بین فرق یہ ہے کہ اشوک کے فرمان میں گائے اور سینگ دار جانوروں کی حفاظت کا کوئی ذکر نہیں۔ مگر اس کے برخلاف ارتھ شاستر میں ان کے مارنے یا ذبح کرنے والے کی سزا وہی تجویز کی گئی ہے جو 50 پنہ کی چوری کرنے والے کی تھی۔ اس کے علاوہ دیکھو باب 13 فصل 5 انڈین انٹی کوری 1910ء صفحہ 164 میں۔

۶؎ غلاموں اور نوکروں کے متعلق قوانین کے لیے دیکھو "ارتھ شاستر" باب 3 فصل 14۔ 13 عام قانون یہ تھا کہ کوئی آریہ غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ مگر اس قاعدہ کلیہ میں استثنا بھی ہے۔ جب میگاستھینز نے یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں غلامی کا بالکل رواج نہیں تو شاید اس کے خیال میں بھی کوئی ایسا قانون یا قاعدہ ہو گا۔

۷؎ رواداری کا یہ خیال اب تک جاری ہے۔ بیوہلر سے راجپوتانے میں کسی نے کہا تھا کہ "راجا کو

کسی خاص فرقے کی عبادت سے تعلق نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس کو اپنی رعایا کے ہر ایک مذہبی فرقے سے دلچسپی کا اظہار کرنا چاہیے۔" (انڈین انٹی کویری جلد 6 صفحہ 183) اس اصول پر اکثر عمل کیا گیا ہے۔ ارتھ شاستر نے یہاں تک حکم دیا ہے کہ بادشاہ جب کبھی کسی نئے علاقہ کے ملک کو فتح کرے تو اس کو چاہیے کہ اپنی نئی رعایا کے اس مذہب کی پیروی کرے، جس کے ذریعے وہ اپنے قومی، مذہبی یا جماعتی تیوہاروں کو ادا کرتے ہوں۔ (باب 8 فصل 5، انڈین انٹی کویری 1910ء صفحہ 146)

۸؎ سنگی فرمان نمبر1۔

۹؎ سنگی فرمان نمبر11۔

۱۰؎ خط مورخہ 11 جنوری 1635ء، کارلائل کی ایڈیشن میں۔

۱۱؎ سنگی فرمان نمبر9۔

۱۲؎ سنگی فرمان نمبر7۔

۱۳؎ سنگی فرمان نمبر3، کلنگ کے فرامین۔

۱۴؎ سنگی فرامین نمبر5 و 7، ستونی فرمان نمبر7۔

۱۵؎ بیل کی "ریکارڈس" جلد اول صفحہ 214۔

۱۶؎ بیوہلر۔ "ایو بر ڈیس لیبن ڈیس جینا مانکس ہیم چندرا۔" مطبوعہ 1889ء صفحہ 39۔ کمار پال کے تبدیل مذہب کی تمام حکایت (صفحہ 42-29) اس حیثیت سے بہت زیادہ دلچسپ ہے کہ اس سے اشوک کے فرامین پر بہت روشنی پڑتی ہے۔

۱۷؎ بیوہلر۔ "رپورٹ آف اے ٹور" جرنل بمبئی برانچ رائل ایشیاٹک سوسائٹی (1876ء) جلد 12۔ غیر معمولی نمبر صفحہ 21۔

۱۸؎ کلکتہ ریویو (1851ء) جلد 15 صفحہ 25، منقول انڈین انٹی کویری 1903ء جلد 32 صفحہ 365۔

۱۹؎ سنگی فرامین نمبر5 و 7 ستونی فرامین نمبر7، ملکہ کا فرمان۔

۲۰؎ ستونی فرمان نمبر7۔ سنگی فرمان نمبر2۔ ڈاکٹر فلیٹ نے "ادھکو سکیا" کا ترجمہ "آٹھ کوس کے فاصلے پر کیا ہے۔" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1906ء صفحہ 417)

۲۱؎ سنگی فرمان نمبر2۔

۲۲؎ ہملٹن۔ "ڈسکرپشن آف ہندوستان" (1820ء) جلد اول صفحہ 718۔ کروک۔ "تھنگز انڈین۔" مضمون پنجراپول (مرے 1906ء) یہ بنیوں کی ذات جو اس شفاء خانے کا خرچ ادا کرتے تھے عام طور پر یا تو جین ہوتے ہیں یا وشنو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ دونوں مذاہب جانوروں کی زندگی کی حرمت میں بودھ مت سے بھی پیش پیش ہیں۔

۲۳؎ نیپالی روایت کے مطابق کامبوج دیس کے نام کا اطلاق تبت پر ہوتا ہے۔ مگر موجودہ تحقیقات

سے ثابت ہوتا ہے کہ کامبوج قوم ایک ایرانی زبان بولتی تھی اور اسی وجہ سے غالباً وہ ہندو کش کے پہاڑوں میں آباد ہوگئی۔

۴ ؎ پٹینک قوم کا حال اب تک نامعلوم ہے۔ بھوج غالباً برار میں مقیم تھے (ایلچ پور۔ دیکھو کولنز کی کتاب "دشکمارچرت" اور بمبئی گزٹیئر (1896ء) جلد اول حصہ 2 صفحہ 27)۔ پلند بندھیاچل میں نربدا کے قریب آباد تھے (کتاب مذکورہ بالا صفحہ 138)۔ مگر پلند کا لفظ مبہم طور پر استعمال ہوتا تھا اور بعض اوقات اس کا اطلاق ہمالیہ کی اقوام پر بھی ہوا کرتا تھا۔

۵ ؎ مسٹر اے۔ جی۔ سوامن کے فرقے سے ستیاپتر کی وجہ تسمیہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تامل برہمنوں کا فرقہ برہت چرن نامی (یعنی نقل مکان عظیم) دو فرقوں کھنادو اور ملگو میں منقسم ہے اور کھنادو پھر کندر مانکم، منگودی، ستیامنگلم وغیرہ جماعتوں میں منقسم ہے اور یہ تمام مغربی گھاٹ کے قصبے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ یہ نقل مکان کرنے والے فطرتی طور پر سطح مرتفع ہی میں آباد ہونگے اور موجودہ علاقے میسور اور مالابار، کوئمبٹور اور مدراس کے اضلاع میں ہیں وہ مغربی ساحل کی طرف پھیلے ہونگے۔ ("برہمن امیگریشن انٹو سدرن انڈیا" انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 231) میرا خیال یہ ہے کہ ستیاپتر جس کا ذکر اشوک نے کیا ہے در حقیقت ستیا منگلم ہی ہوگا۔ مجھے اس امر میں پروفیسر بھنڈارکر سے اتفاق نہیں کہ سلطنت ستیاپتر گھاٹ میں پونا کے قریب واقع تھی۔ یہ صریح ہے کہ یہ تامل سلطنت تھی اور میرا اندازہ یہ ہے کہ میرا بتلایا ہوا موقعہ بالکل درست ہے۔

۶ ؎ بیل، ریکارڈس جلد دوم صفحہ 231۔ ویٹرس، جلد دوم صفحہ 228۔

۷ ؎ ماٹون رلن جس کا حوالہ انڈین انٹی کویری جلد 9 صفحہ 20 پر دیا گیا ہے۔

۸ ؎ ڈان۔ ایم۔ ڈی زلوا۔ وکرمسنگھے کا خیال ہے کہ دیوانمپیاس 253 سے 313 ق م تک حکمران تھا اور اس کا جانشین اُتیا 313 ق م سے 403 ق م تک حکمراں رہا۔ (ایپی گرافیکا زیلونیا۔ جلد 1۔ صفحہ 81) قدیم لنکا کی تاریخ میں سنین محض قیاسی ہیں۔

۹ ؎ مہندر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے بھائی اور جانشین اُتیا کے آٹھویں سن جلوس میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے تبرکات میں سے آدھے تھوپارام میں محفوظ کیے گئے جہاں اس کا کریا کرم ہوا اور آدھے مہنتلے کے مقام پر جہاں وہ فوت ہوا تھا۔

۱۰ ؎ میں پہلے سنگ مترکی روایت کو بالکل غلط سمجھا کرتا تھا۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ وہ ضرور موجود تھی اور اگر مہندر اشوک کا بھائی تھا تو وہ ضرور اس کی بہن ہوگی، نہ کہ بیٹی۔ "مہاومس" کے مطابق اس کا انتقال اُتیا بادشاہ کے نویں سنہ جلوس میں ہوا۔ تھوپارام کے شمال مشرق میں ویران ستوپ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں اس کی راکھ بھی رکھی ہوئی تھی۔ (مہاومس مترجمہ گیگر اور وجے سنہا باب 20۔ سمتھ، آرکیٹکچرل ریمنیز

انورا ہاد پور صفحہ 9 لوح 3)

۱ ؎ بیل 'ریکارڈس جلد دوم صفحہ 246 - ویٹرس جلد دوم صفحہ 230 -

۲ ؎ ٹپل ''نوٹس آن انٹی کو-ٹیزان رامنادیسا - '' (انڈین انٹی کویری جلد 22 - (1893ء) صفحہ 359 اور میرا مضمون (رسالہ ایضاً 1905ء صفحہ 180)

۳ ؎ دیکھو اؤمنڈس کی کتاب ''بدھسٹ اینڈ کرسچین گاسپلز'' چوتھی ایڈیشن فلیڈلفیا -

۴ ؎ پولوس کو عیسائی لوگ رسول کہا کرتے ہیں لیکن اسلامی عقیدے کے مطابق پولوس کے نام کے ساتھ یہ لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں ہے -'' (--- تنقید ناظم صاحب مذہبی کتب درسیہ جامعہ عثمانیہ)

۵ ؎ بیل: ریکارڈس جلد 1 صفحہ 182' جلد 2 صفحات 88-273- ویٹرس: انڈکس میں اپگپت کا نام - گراؤس: متھرا' تیسری ایڈیشن صفحہ 142 - کننگھم: رپورٹ جلد 20 صفحہ 32 - لنکا کے مشہور منگی کے بیٹے تس کا اپگپت کا اصلی شخص ہونا اب لیفٹیننٹ کرنل ویڈل نے بالکل صاف کردیا ہے - (جے - اے - ایس - بی 1897ء حصہ اول صفحہ 776 - پروسیڈنگس اے - ایس بی 1899ء صفحہ 70) اس امر کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ تس کو منگی پت کے ساتھ 'جس کا ذکر سانچی تبرکات کی سندوں پر ہے 'ایک ہی سمجھا جائے (بھیلسا توپس صفحہ 115' 120)

۶ ؎ سنگی فرمان نمبر 13 -

۷ ؎ چھوٹا سنگی فرمان نمبر 1 (روپناتھ)

۸ ؎ سٹائن کا ترجمہ (راج ترنگنی' باب 1 صفحہ 152 - 108 - تبت کی ایک غتربود روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کے گیارہ لڑکے تھے - (تارناتھ صفحہ 48) -

۹ ؎ برناف: ''انٹروڈکشن -'' دوسری ایڈیشن صفحہ 384 شیفز - تارناتھ صفحہ 287 - راجپوتانہ کے علاقے کی ریاست جودھ پور میں ناڈلئی کے مقام پر جین مذہب کے ایک مندر پر 1686ء سمت بکرمی - 1622ء کا ایک کتبہ ہے اور اس میں اس روایتی بیان کو دوہرایا گیا ہے کہ اس مندر کا اصلی بانی سمپرتی تھا - (دیکھو پروگرس رپورٹ آرکیالوجیکل سروے' ویسٹرن انڈیا 10-1909ء صفحہ 41)

۱۰ ؎ جین روایات (پرشستان پرون معحہ جیکوبی) کا بھگوان لال اندرجی 'لال اندرجی اور مسٹر جیکسن نے ممبئی گز-ٹیئر جلد اول حصہ اول صفحہ 15 (1896ء) میں ملخص تیار کردیا ہے - پرانوں میں اشوک کے جانشینوں کی فہرست بالکل غتربود اور متناقض ہے -

۱۱ ؎ یہ حکایتیں مفصل طور پر ہیون سانگ کی ''لائف'' اور ''ٹریولز'' راک ہل ''کی لائف آف بدھا'' اور سرت چندر داس کے مضامین متعلقہ تاریخ تبت میں پائی جائیں گی - ان کو شائن نے انتصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان پر تنقید کی ہے (''این شنٹ ختن'' صفحہ 166-156) -

ان کے نام مختلف ہیں۔ ان میں سے ایک سالسوک نامی کا وجود علم ہیئت کی کتاب "گارگی سمیتا" سے ثابت ہوتا ہے جس میں مشہور عبارت میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ دیکھو ضمیمہ۔

دیکھو ایچ۔ پی شاستری کے خیالات "جرنل اینڈ پروسیڈ نگس آف اے۔ ایس۔ بی 1910 صفحہ 259۔ "ٹائے کارٹ" کے ناٹک میں اجین کے راجا پالک کا اس سے مقابلہ کرتے ہیں۔

ادیاگری کا کتبہ (لیوڈرس۔ اپی گرافیکا انڈیکا جلد 10 ضمیمہ، صفحہ 160)

بیل: ریکارڈس۔ جلد دوم صفحہ 118 و 174۔ ویٹرس، جلد دوم صفحہ 115۔

فلیٹ "ڈائناسٹیز آف دی کناریز ڈسٹرکٹس" ایڈیشن دوسری، ممبئی گزیٹیر، جلد اول حصہ دوم (1896ء) صفحہ 4۔282۔

اشوک کے جانشینوں کے نام "وشنو پران" سے لیے گئے ہیں ان میں متیش کو ان وجوہ کی بناء پر جن کا ذکر متن کتاب میں کر دیا ہے، نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ اور نام جین مت کی کتابوں اور مذہب کی "اشوکاودان" میں مذکور ہیں۔ جو سنین جدول میں مذکور ہیں وہ یہ فرض کر کے دیئے گئے ہیں اشوک نے چالیس یا اکتالیس برس حکومت کی تھی۔ مگر اس کی مدت حکومت وایو پران کے مطابق چھتیس برس اور مہاومس کے مطابق 37 برس تھی۔ یہ دونوں اس کے زمانہ تاجپوشی سے اس کی حکومت شمار کرتے ہیں۔ پران اس بات میں پھر متفق ہیں کہ موریا خاندان صرف 137 برس تک برسر حکومت رہا۔ مگر وایو پران میں ان سب کی مدت حکومت صرف 133 برس بیان کی ہے اور یہ چار برس کا درمیانی عرصہ اشوک کے تخت نشینی اور جانشینی کے درمیان کا زمانہ جمع کر دینے سے پورا ہو جاتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھو پرگیٹر کی کتاب "ڈائناسٹیز آف دی کالی ایج۔ "قرات میں بے شمار اختلافات ہیں۔

آٹھواں باب

خاندان ہائے سُنگ۔ کنواور اندھر

185 ق م تا (تقریباً) 225ء

سُنگ خاندان

تقریباً 185 ق۔م پشی مترسنگ کا غصبِ سلطنت

سپہ سالار پشی مترنے اپنے آقا برہدرتھ موریا کو قتل کر کے خالی تخت کو غصب کر لیا اور موریا خاندان کی سلطنت پر، جو اب مختصر رہ گئی تھی، اپنا تسلط جمالیا۔[1] اس طرح اس نے ایک خاندان کی بنیاد ڈالی جو تاریخ میں سنگ خاندان کے نام سے مشہور ہے۔[2]

سنگ خاندان کی سلطنت کی حدود

غالباً قدیم زمانے کی طرح پشی متر کی حکومت کے دوران میں بھی پاٹلی پترہی دارالسلطنت کے تمام مرکزی اور قریب کے صوبوں نے اس غاصب کی اطاعت قبول کرلی۔ یہ سلطنت شاید جنوب میں دریائے نربدا[3] تک پھیلی ہوئی تھی اور یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ اس میں دریائے گنگا کی وادی کے علاقے شامل تھے جو آج کل بہار، ترہت اور صوبجات متحدہ آگرہ واودھ کے علاقے ہیں۔ یہ امر قرین قیاس نہیں کہ پشی متریا موریا خاندان کے آخری تاجدار پنجاب کے علاقے پر قابض اور حکمراں ہوں۔ ولسن کا یہ خیال کہ پشی متر کی فتوحات دریائے سندھ تک پہنچ گئی تھیں، ایک غلط فہمی پر مبنی تھا۔[3]

تقریباً 3-155 ق م، منندر کا حملہ اور اس کی شکست

اپنے عہد حکومت کے اواخر میں اس غاصب کو ایک مہیب خطرے کا اندیشہ ہوا۔ منندر باختر کے بادشاہ یوکرٹائڈیز کا عزیز اور کابل و پنجاب کا حکمراں تھا۔ اس نے سکندر کی مہمات کا مقابلہ و ہمسری کرنے کی دل میں ٹھانی اور اس ارادے سے اندرون ہند میں ایک زبردست فوج لے کر داخل ہوا۔ اس نے دریائے سندھ کے مثلثی دہانے سراشٹر (کاٹھیاوار) جزیرہ نما اور مغربی ساحل کے چند علاقوں پر قبضہ کیا، دریائے جمنا کے کنارے متھرا کے شہر پر قابض ہو گیا، راجپوتانہ میں مدھیامکا (چتوڑ کے قریب موجودہ ناگری) کا محاصرہ کیا، جنوبی اودھ میں ساکیتم کی ناکہ بندی کی اور بالآخر خود دارالسلطنت پاٹلی پتر پر حملہ کرنے کی دھمکی دی۔

ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد اس حملے کی روک تھام کی گئی اور آخر کار یونانی بادشاہ مجبوراً اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ مگر ممکن ہے کہ مغربی ہند میں اس نے اپنی فتوحات پر چند سال تک قبضہ رکھا ہو۔[5]

ہندوستان اور یورپ

اس طرح خشکی کے راستے سے یورپی جنرل کی دوسری اور آخری کوشش ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے ناکامیاب ثابت ہوئی۔ اس کے بعد مغربی براعظم کے تمام حملہ آور جہازوں میں سوار ہو کر یہاں آئے، اس بھروسے پر کہ سمندر ان کے قابو میں ہے، اور انہوں نے اس کو اپنا مرکز قرار دیا۔ 153 ق م یا اس کے قریب قریب زمانہ میں منندر کی شکست کے بعد سے لے کر 1502ء میں واسکوڈے گاما کی کالی کٹ پر گولہ باری کرنے تک ہندوستان یورپین اقوام کے حملے کے خوف سے بالکل آزاد تھا اور اس وقت تک جب تک کہ موجودہ حکمران قوم سمندر پر قابو رکھنے میں کامیاب رہے گی قدیم حملہ آوروں کے قدم بہ قدم جتنے حملے خشکی کی طرف سے کیے جائیں گے مستقل طور پر کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ودربھ سے اگنی متر کی جنگ

منندر کی جنگ کے دوران میں جنوب کے دور دراز صوبوں پر جو دریائے نربدا تک پھیلے ہوئے تھے ولی عہد اگنی متر بطور نائب السلطنت کے حکومت کر رہا تھا۔ اس کا مستقر سلطنت ودسا موجودہ بھیلسا کے مقام پر تھا جو مہاراجا سندھیا کے علاقے میں دریائے بیتوا کے کنارے پر واقع ہے۔ اگنی متر کا نوجوان بیٹا بسومترا اپنے دادا کے حکم کے مطابق میدان جنگ میں برسرکار تھا۔ پشی

متر نے جو اس وقت غالباً بہت عمر رسیدہ ہو گیا تھا ارادہ کیا کہ خود کو تمام شمالی ہند کا بادشاہ ہونے کا حقدار ثابت کرے اور اس امر کا اعلان کر دے۔ اس کا دعویٰ اس کی فتح کی وجہ سے اور پختہ ہو گیا جو اس کے بیٹے اگنی متر نے ایک مقامی جنگ میں اپنے جنوبی ہمسائے ودربھ (یعنی برار) کے راجا پر پائی جس نے مجبور ہو کر اپنی آدھی سلطنت ایک حریف عزیز کے حوالے کر دی اور دونوں حصوں کے درمیان دریائے وردا (ورد) حد فاصل قرار پایا۔

پشی متر نے اشومیدھ کی قدیم اور فراموش شدہ رسم از سر نو نہایت طمطراق اور شان و شوکت کے ساتھ زندہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ یہ رسم ادا کرنے کا حق قدیم روایات کے مطابق صرف ان بادشاہوں کو ہوتا تھا جنہوں نے تمام ملک کو مطیع و زیر نگیں کر لیا ہو اور اس سے قبل یہ ضروری ہے کہ اپنے حریفوں کے سامنے یہ دعویٰ کیا جائے اور اس دعوے میں وہ کامیاب ہو۔

اشومیدھ

یہ دعویٰ اس طرح ہوتا تھا:

> "ایک خاص رنگ کا گھوڑا بعض رسوم ادا کر کے اس کام کے لیے مخصوص کر دیا جاتا تھا اور اس کے بعد اس کو ایک سال کے واسطے کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ خود بادشاہ یا اس کا نائب ایک فوج لیے اس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے اور جب یہ گھوڑا کسی بیگانی سلطنت میں داخل ہوتا تو وہاں کے راجا کے لیے یہ ضروری تھا کہ جنگ کے لیے تیار ہو جائے یا اطاعت قبول کرے۔ اگر گھوڑے کا مطلق العنان کرنے والا ان تمام بادشاہوں سے اطاعت قبول کرانے میں کامیاب ہو جاتا جس کی سلطنتوں میں سے گھوڑے کا گذر ہوا ہو تو وہ تمام مفتوحہ علاقوں کے بادشاہوں کو ساتھ لے کر بڑی شان و شوکت سے واپس آتا۔ لیکن بالفرض اگر وہ ناکامیاب ہوتا تو لوگوں کی نظروں سے گر جاتا اور اس کے دعوے کی تضحیک ہوتی۔ اس کے کامیاب واپس آنے کے بعد ایک عظیم الشان جشن منعقد ہوتا اور گھوڑے کی قربانی کی جاتی تھی۔"[6]

یونن

کم از کم برائے نام ہی سہی، اس مخصوص گھوڑے کی محافظ فوج کی سرداری پشی متر نے اپنے نوجوان پوتے بسومتر کو دی تھی۔ اس کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے یونوں یا مغربی غیر ملکیوں کی ایک جماعت سے مقابلہ کیا اور ان کو شکست دی۔ ان لوگوں نے دریائے سندھو[7] کے

کنارے پر، جو آج کل بندیل کھنڈ اور راجپوتانہ کے درمیان حد فاصل ہے، اس کی فوج کا مقابلہ کیا۔ ممکن ہے کہ یہ مقابلہ کرنے والے متندر کی اس فوج کا ایک حصہ ہوں جس نے راجپوتانے کے علاقے میں مدھیامکا کا محاصرہ کیا تھا۔

قربانی

یوں اور دوسرے تمام حریفوں کا بتدریج خاتمہ کرنے کے بعد پشی متر کو اس بات کا حق حاصل ہو گیا کہ وہ شمالی ہند میں مہاراجا دھیراجا ہونے کا دعویٰ کرے۔ چنانچہ اس نے فوراً اس امر کا اعلان کرنے کے لیے اپنے دارالسلطنت میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ قربانی چڑھائی۔ ناٹک لکھنے والے نے اس زمانے کی خصوصیات کو نہایت اچھی طرح محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ اس کا بیان ہے کہ جن الفاظ میں فاتح بادشاہ نے اپنے بیٹے اور ولی عہد کو اس قربانی میں شامل ہونے کے لیے مدعو کیا تھا وہ یہ ہیں۔

> خدا کرے کہ تم بخیر و خوبی ہو! قربانی کے احاطے میں سے سپہ سالار پشی متر اپنے بیٹے اگنی متر کی طرف، جو ودسا کے علاقے میں مقیم ہے، نہایت پیار سے اس کو گلے لگا کر یہ پیغام بھیجتا ہے کہ تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے جو باضابطہ طور پر راجاسویا[۸] کی تقریب بجا لانے کے بعد بلا کسی مزاحمت و لگام کے ایک گھوڑے کو چھوڑ دیا تھا، جس کو ایک سال بعد واپس آنا تھا اور بسومتر کو اس کا محافظ مقرر کیا تھا اور اس کے ساتھ ایک سو راجپوتوں کا ایک دستہ تھا۔ یہ گھوڑا دائیں ہاتھ (یا جنوب) کی طرف گیا اور دریائے سندھو کے کنارے پر یونوں کے سواروں کی ایک جماعت نے اس کا دعویٰ کیا تھا۔ اس پر دونوں فوجوں میں خونریز جنگ ہوئی اور زبردست تیرانداز بسومتر نے دشمنوں کو شکست دے کر میرے نادر گھوڑے کو ان سے چھڑایا جس کو وہ لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ اب کیونکہ میرا پوتا میرا گھوڑا بعینہ اسی طرح واپس لے آیا ہے جس طرح انسمت سگر کا گھوڑا لایا تھا، میں اس کی قربانی کرنا چاہتا ہوں اور اس لیے تم کو مدعو کرتا ہوں کہ اپنے دل سے غصہ دور کرو اور میری بہوؤں کو ساتھ لے کر فوراً چلے آؤ اور اس قربانی میں شریک ہو۔[۹]

پتنجلی

اس رسم کی ادائیگی میں غالباً مشہور و معروف جوتشی پتنجلی بھی شامل تھا۔ کیونکہ اس نے اس واقعے کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی کے زمانے کا ہے۔

برہمنی ردعمل کی شروعات

حیوانی زندگی کی مبالغہ آمیز تقدیس نے' جو بدھ مذہب کا مایہ ناز اور اشوک کے قوانین کے ایک بڑے حصے کا اصل اصول تھا' وہ تمام خونی قربانیاں بھی بند کر دی تھیں جو برہمنی مذہب کی عبادات کی تکمیل کے لیے اشد ضروری تھیں اور جن کے متعلق دیندار اشخاص کا خیال تھا کہ وہ بہت مفید اور ثواب کے کام ہیں۔ پشی متر کی قابل یادگار قربانی درحقیقت برہمنی مذہب کے اثر کی طرف پلٹنے کے رجحان کا پہلا زینہ تھی جو اس کے پانچ صدی بعد سمدگپت اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں پورے زور و شور کے ساتھ مکمل ہوا۔

پشی متر کو ایک مذہبی ایذاء رساں خیال کیا جاتا ہے

اگر بدھ مذہب کے مصنفین کی نیم وہمی روایات قابل اعتبار خیال کی جا سکیں تو پشی متر نے ہندو روایات کے بتدریج اور امن کے ساتھ احیاء پر ہی قناعت نہیں کی' بلکہ بدھ مذہب والوں کو حتی الوسع وحشیانہ انداز سے تکلیف بھی پہنچائی۔ ان کی خانقاہوں کو جلا کر خاکستر کر دیا اور مگدھ سے لے کر پنجاب کے مقام جالندھر تک ان کے راہبوں کو قتل کیا۔ بہت سے راہب جو کسی نہ کسی طرح اس کی تلوار سے بچ گئے دوسرے بادشاہوں کے ملکوں میں چلے گئے۔ ممکن ہے کہ اس حکایت میں مبالغے سے کام لیا گیا ہو۔ مگر اس کو بالکل رد کر دینا یقیناً احتیاط کے خلاف ہو گا۔ [12]

ہندوستان میں مذہبی ایذاء رسانی

اگرچہ اس کی شہادت موجود ہے کہ پشی متر نے بدھ مذہب کو ستایا تھا' تاہم بدھ مذہب کے ہندوستان میں سے بتدریج معدوم ہونے کے وجوہ اس ایذاء رسانی کے علاوہ اور بھی تھے۔ البتہ یہ بھی بالکل درست ہے کہ وقتاً فوقتاً متعصب بادشاہوں نے اپنے تعصب کا اظہار سخت ظلم و ستم کے افعال سے ضرور کیا اور جین یا بدھ مت والوں کو ان کے مذہب کی وجہ سے سخت سے سخت ایذائیں پہنچائیں۔ اس قسم کے امور کی بہت سی صحیح شہادتیں خود اس کتاب میں ملیں گی۔ ان کے علاوہ اور مثالیں بھی موجود ہیں جو اس کتاب کے ضمن میں نہ آ سکیں۔ لیکن بہرحال اگر ہم یہ بات خیال میں رکھیں کہ بدھ اور جین مت کے بہت سے محرمات پر اگر کوئی بادشاہ سختی سے عمل کرانا چاہے' جیسا کہ غالباً اشوک نے کیا تھا' تو وہ سخت تکلیف دہ ہو جاتی تھیں۔ اس صورت میں اگر بعض بادشاہوں نے اپنے قہر و غضب کا اظہار کیا ہو تو کچھ بعید از قیاس نہیں۔ بلکہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایسی ایذاء رسانی شاذونادر واقع ہوتی تھی اور بالعموم ان تمام مختلف مذاہب کے پیرو

پہلو بہ پہلو آرام اور چین سے زندگی بسر کرتے تھے اور سرکاری عطیات میں ان سب کو برابر کا حصہ دار سمجھا جاتا تھا۔ [11]

تقریباً 149 ق م' سنگ کے خاندان کے موخر افراد

جب ایک طول و طویل اور پر از واقعات حکومت اور منندر کی پسپائی کے تقریباً پانچ سال بعد پشی متر مر گیا تو اس کے بعد ولی عہد اگنی متر اس کا جانشین ہوا جو اپنے باپ کے زمانے میں بھی جنوبی صوبوں پر حکمران رہا تھا۔ اس نے محض چند سال حکومت کی۔ اس کا جانشین بسو جیشتا (جیشٹھ ؟) ہوا جو غالباً اسی کا بھائی تھا۔ سات سال بعد اس کا جانشین بسو متر ہوا جو غالباً اگنی متر کا وہی بیٹا تھا جس نے اس قربانی کے گھوڑے کی حفاظت کا کام اپنے دادا کی زندگی میں انجام دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان چاروں حکومتوں کا زمانہ بہت قلیل تھا اور صرف سترہ سال رہا۔ ان تمام حکومتوں کی اس قدر تقلیل مدت ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ زمانہ فتنہ و فساد اور شاہی محل کے انقلابات اور سازشوں کا تھا۔ اس نتیجے کا قرین قیاس ہونا ایک واقعے سے ثابت ہوتا ہے جو اس زمانے کی روایات میں محفوظ رہ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگنی متر کا ایک دوسرا بیٹا سمتر ناٹک کا بہت شوقین تھا۔ ایک موقع پر جب اس کے منظور نظر تماشہ گر اس کے گرد جمگھٹ لگائے کھڑے تھے تو ایک شخص متر دیو نے "اس کا سر تلوار کے وار سے اسی طرح الگ کر لیا جس طرح کنول کو اس کی ڈالی سے الگ کر لیتے ہیں۔" [12] نویں بادشاہ بھاگوت کی حکومت کا عرصہ بتیس برس بیان کیا جاتا ہے۔ مگر ہم کو اس کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں۔ دسویں بادشاہ دیو بھوتی یا دیو بھومی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک نہایت بد چلن شخص تھا اور اسی قسم کی ایک ناجائز سازش کے اثناء میں قتل کیا گیا۔ اس طرح ایک سو بارہ برس حکومت کرنے کے بعد یہ خاندان ننگ و بے شرمی کی حالت میں ختم ہو گیا۔ [13]

کنو یا کنواین خاندان

تقریباً 73 ق م' بسو دیو کنو

شرابی اور بد چلن دیو بھوتی کی جس انقلاب نے جان اور سلطنت لی وہ اس کے ایک برہمن وزیر بسو دیو کا تیار کیا ہوا تھا۔ اس کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے برائے نام آقا کی زندگی کے زمانے میں بھی اس نے سلطنت پر اپنا پورا تسلط جما لیا تھا۔ [14] سمتر کا قاتل متر دیو بھی غالباً اسی

زبردست اور طاقتور خاندان کا ایک فرد تھا جو تاریخ میں کنویا کنواین خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ پرانوں اور بان کی یہ متفقہ شہادت کہ سنگ خاندان دسواں اور آخری بادشاہ دیو بھوتی ہی تھا جس کو مار کر بسودیو کنو خاندان کے پہلے راجا نے سلطنت حاصل کی' پروفیسر بھنڈارکر کے اس نظریے کو رد کر دیتی ہے کہ کنو خاندان سنگ خاندان کا ہمعصر تھا۔ [۵]

تقریباً 28-63 ق م' آخری کنو خاندان کے آخری بادشاہ

بسودیو لے اس تخت پر جس کو خود اس کے جرم نے اب خالی کر دیا تھا قبضہ کر لیا اور اس کے بعد اس کی اولاد میں سے تین شخص اس کے جانشین ہوئے۔ اس خاندان کے چاروں بادشاہوں کی حکومت کا زمانہ صرف پینتالیس سال ہوا۔ [۶] سنگ خاندان کی طرح ان کے بھی شمار مدت حکومت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پیشرو خاندان کی طرح اس خاندان کے بادشاہوں کی حکومت کے زمانے میں بھی فتنہ و فساد بالعموم پھیلا رہا اور جانشینی کا فیصلہ اکثر جنگ و جدل سے ہوتا تھا۔ ان کنو راجاؤں کی حکومتوں کے واقعات بالکل معلوم نہیں۔ اس خاندان کا سب سے آخری راجا 27 ق م یا 28 ق م میں اندھریا سات داہن خاندان کے ایک بادشاہ کے ہاتھ سے مارا گیا جس کی سلطنت اس زمانے میں بہت وسیع تھی اور تمام دکن میں ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ اب تک کوئی سکہ یا یادگاری عمارت ایسی دریافت نہیں ہوئی جس سے اندھر خاندان کے راجاؤں کا تعلق قدیم شاہنشاہی دارالسلطنت پاٹلی پتر سے معلوم ہو سکے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک مدت تک مگدھ کی بادشاہی پر بھی ان کا قابو رہا ہو۔ اس خاندان کے قدیم ترین سکے جو اب تک دریافت ہوئے ہیں سب کے سب شمالی انداز کے ہیں اور ان پر ''سات'' کا نام ہے جو غالباً پرانوں کی فہرست کا چھٹا بادشاہ سات کرنی تھا اور 150 ق م میں برسر حکومت تھا۔ شروع سے لے کر آخر تک اندھر خاندان کے سکے شمالی ہند کی ٹکسال سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اور اس امر کی توضیح کے لیے یہی فرض کیا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً ایک مدت تک مگدھ ایک صوبے کی حیثیت سے اس خاندان کے زیر تصرف رہا تھا۔ مگر اس خیال کی تائید کے لیے بہت کم شہادت موجود ہے۔ [۷]

پُرانوں میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اندھر خاندان کنو خاندان کے بعد قائم ہوا اور اسی وجہ سے وہ کنو خاندان کے آخری بادشاہ کے قاتل سمک یا سپرک کو اندھر خاندان کا پہلا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن امر واقعی یہ ہے کہ خود مختار اندھر خاندان ضرور 240 یا 230 ق م میں استقلال سے قائم ہوا ہوگا' یعنی یہ واقعہ 28 ق م میں کنو خاندان کی مغلوبیت سے بہت قبل کا ہے۔ جس اندھر راجا نے سسرمن کو قتل کیا ممکن نہیں ہے کہ سمک ہو۔ یہ بھی تیقن کے ساتھ کہنا ممکن ہے

کہ وہ مگدھ خاندان کا کون سا راجا تھا کیونکہ اس خاندن کے بہت سے راجاؤں کی تاریخ جلوس صحیح طور پر معلوم نہیں اور آج کل صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کنو کے آخری راجا سسرمن کا قاتل بظاہر اندھر خاندان کے گیارھویں ' بارھویں یا تیرھویں راجاؤں میں سے ایک نہ ایک ہوگا۔ 28 ق م کنو خاندن کے خاتمے کی تقریباً صحیح تاریخ تسلیم کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اس تاریخ کے تعین کا تعلق اندھر کے راجاؤں کے جلوس سے نہیں بلکہ سنگ اور کنو خاندان کے علی الترتیب ایک سو بارہ اور پینتالیس برس کے عہد حکومت سے ہے اور یہ مدت قابل اعتبار معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ 28 ق م کی تاریخ ایسی ہے کہ وہ بظاہر تین مذکورہ اندھر راجاؤں میں سے کسی ایک کے عہد حکومت کی حدوں میں واقع ہے۔ [18]

اندھر خاندان

اندھر کا قدیم ترین ذکر

کنو خاندان کی تباہی کے بعد اندھر راجاؤں کی تاریخ لکھنی شروع کرنے سے پہلے ہم کو بعید عہد ماضی کی طرف ایک نگاہ ڈالنی اور ان منازل کا حال معلوم کرنا چاہیے جن سے گذر کر آخر کار اندھر سلطنت تمام ہندوستان کی زبردست ترین حکومت ہوگئی۔

300 ق م

چندر اگپتا موریا اور میگا ستھینز کے زمانے میں اندھر قوم جو دراوڑی نسل سے تھی اور جس کی اولاد میں تلنگی بولنے والے لوگ اب تک موجود ہیں' دریائے گوداوری اور کرشنا کے مثلثی دہانوں پر مشرقی ہندوستان کے حصوں پر قابض تھی۔ اس وقت ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کی فوجی قوت محض پر اسی قوم کے بادشاہ یعنی چندر اگپتا ہی کی فوجی طاقت سے کم تھی۔ اندھر سلطنت میں دیگر بے شمار قصبات کے علاوہ تیس قلعہ بند شہر تھے اور ان کی فوج میں 100000 پیادے' 2000 سوار' اور 1000 ہاتھی شامل تھے۔ [19] خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا دارالسلطنت سری کاکلم کے مقام پر تھا جو دریائے کرشنا کے زیریں حصے میں واقع تھا۔ [20]

جس قوم کا اس طرح پر ذکر کیا گیا ہے وہ یقیناً خود مختار ہوگی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم نہیں کہ چندر اگپتا یا بندوسار کے عہد حکومت کے کس زمانے میں اندھروں کو موریا خاندان کی ناقابل مقاومت افواج کے سامنے اطاعت کرنی پڑی تھی اور انہوں نے موریا خاندان کے بادشاہوں کو

اپنا حاکم اعلیٰ قبول کر لیا تھا۔

256ق م' اندھرا اشوک کے باج گزار ہیں

اس کے بعد جب ان کا ذکر اشوک کے فرامین (256ق م) میں آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی سلطنت کی سرحدی اقوام میں شامل تھے۔ اور باوجود اس کے کہ ایک بڑی حد تک وہ اپنے اندرونی معاملات میں اپنے راجا کے زیر حکومت تھے مگر پھر بھی ان کو اشوک کے احکام اور فرامین کا ماننا ضروری تھا۔[21] مگر اشوک کی موت گویا اس کی وسیع سلطنت کے تتر بتر ہو جانے کا پیش خیمہ تھی۔ اگرچہ حضوری صوبہ جات میں اس کے کمزور جانشین' جو پاٹلی پتر کے تخت پر متمکن تھے' حکمراں رہے۔ لیکن دور دراز کے ممالک نے' جن میں کلنگ کا علاقہ بھی جس کو کہ اس قدر مصیبت اور تکلیف کے بعد فتح کیا گیا تھا شامل تھا' بہت جلد شہنشاہی حکومت کا جُوا اپنی گردن سے اتار کر پھینک دیا۔

تقریباً 240 یا 230ق-م' راجگان سُمک و کرشنا

اندھر قوم نے بھی اس زبردست بادشاہ یعنی اشوک کی موت سے جو موقع ہاتھ آیا اس سے فائدہ اٹھانے میں سُستی نہ کی اور اس کی حکومت کے خاتمے کے بہت جلد بعد یا غالباً اس کے ختم ہونے سے پیشتر ہی انہوں نے ایک علیحدہ حکومت اپنے بادشاہ سُمک کی ماتحتی میں قائم کر لی۔ اس نئے خاندان نے اپنی سلطنت کو اس قدر سرعت اور تیزی سے وسعت دی کہ دوسرے راجا کرشنا کے زمانے ہی میں ناسک کا شہر جو مغربی گھاٹ پر گوداوری کے منبع کے قریب واقع تھا اندھر سلطنت میں شامل ہو گیا اور اس طرح یہ سلطنت ہندوستان کے آر پار پھیل گئی۔

تقریباً 218ق-م کھاریویلا

اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس خاندان کے تیسرے بادشاہ سری ساتکرنی جو "مغرب کا مالک" بیان کیا جاتا ہے' کا مقابلہ مشرق میں کلنگ کے راجا کھاریویلا سے ہوا کیونکہ یہ سلطنت بھی اشوک کی موت کے بعد خود مختار ہو گئی تھی۔[22]

تقریباً 28 یا 27ق-م' کنو خاندان کا خاتمہ

اس کے بعد اندھر خاندان کا اس وقت تک کوئی ذکر نہیں آتا جب تک کہ اندھروں کے ایک راجا نے (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) کنو خاندان کے آخری تاجدار کو قتل کیا اور اس کے ملک کا'

اور جو اب تک اس خاندان کے اقتدار کو تسلیم کرتا تھا' اپنی سلطنت کے ساتھ الحاق کیا۔ اندھر کے تمام راجاؤں کا دعویٰ ہے کہ وہ سات واہن کے خاندان سے ہیں اور ان میں سے اکثر کا لقب یا نام سات کرنی تھا۔ اسی وجہ سے بادشاہ کا اصلی نام لینے کے بجائے یہ لوگ ان ہی دو القاب میں سے کسی ایک کے حوالے سے ذکر کیے کرتے ہیں۔ اس طرح بعض دفعہ یہ معلوم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ کس بادشاہ کا مذکور ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے سسرمن کنو کے قاتل کا اصلی نام معلوم نہیں۔

راجاہال اور پراکرت علم وادب

ان میں سے سترھویں راجاہال کا نام علم وادب کی تاریخ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مہاراشٹر کی قدیم زبان میں لکھی ہوئی عاشقانہ غزلیات کا ایک مجموعہ موسومہ بہ سپت سٹک یعنی "سات صدیاں" کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا مصنف ہال تھا' اور علمی روایات کے مطابق وہ سال واہن جو سات واہن ہی کی ایک اور شکل ہے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر پروفیسر سر آر۔ جی۔ بھنڈارکر نے یہ تجویز کیا ہے کہ یا تو غالباً ہال اس کا خود مصنف تھا یا کسی اور مصنف نے اس کے نام اپنی کتاب کو معنون کیا تھا۔[۲۳] اس کے علاوہ اور دوسری روایات بھی پراکرت میں لکھے ہوئے علم ادب کو اندھر راجاؤں کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ بظاہر ان کے زمانے اور ان کی قلمرو میں سنسکرت عام فہم ادبیات میں عموماً مستعمل نہ تھی۔

اندھروں اور دیگر ممالک کے درمیان جنگ

راجا گوتمی پتر سری سات کرنی (23) اور راجا واشتی پتر سری پلمائی (نمبر24) کے دور حکومت میں اندھروں کی ان غیر ملکی قبائل کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی جو مغربی ہند میں آباد ہو گئے اور وہاں سلطنتیں پیدا کرلی تھیں اور بظاہر پہلے ہندی پارتھی اور بعد میں کشان بادشاہوں کے زیر فرمان تھے۔ اسی قسم کی کشمکش کے واقعات' جو دیسی راجاؤں اور غیر ملکی سرداروں کے درمیان ہوئے' تاریخ ہند قدیم میں اکثر پائے جاتے ہیں۔

سترپ بھومک کشہرات

ان علاقوں میں بیرونی آباد کاروں کی تاریخ' جو آج کل زیادہ تر احاطہ بمبئی میں شامل ہیں' بالکل پراگندہ اور مجمل ہے۔ لیکن پھر بھی سکوں اور کتبوں کے مطالعہ سے اس پر بہت کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔ مغربی ہند میں قدیم ترین بادشاہ جس کا نام محفوظ رہ گیا سترپ بھومک کشہرات تھا جس

نے پارتھی نمونے کے سکے مضروب کرائے اور قیاس ہے کہ وہ کسی نہ کسی ہندی پارتھی بادشاہ غالباً گانڈوفریس کا ماتحت تھا۔ اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن قیاسی طور پر اس کا پہلی صدی عیسوی کے درمیان میں ہونا فرض کیا جاسکتا ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس سے ذرا قبل ہوا ہو اور اس کے پیشرو بھی ہوں۔ کشہرات قوم کا تعلق سک قوم سے تھا اور اغلب یہ ہے کہ وہ موجودہ سیستان کے علاقے سے نقل مکان کر کے یہاں وارد ہوئے ہوں۔

سترپ اعظم نہپان کشہرات

کشہرات قوم کا دوسرا سردار جس کا نام معلوم ہے وہ نہپان تھا۔ یہ ممکن ہے کہ بھومک کے بعد ہی اس کا جانشین ہوا ہو۔ قیاساً اس کا زمانہ 60ء اور 90ء کے درمیان تھا۔ اس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایرانی نسل سے تھا۔ بھومک کی طرح اول اول اس کا درجہ محض سترپ کا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے سترپ اعظم (مہا کشترپ) کا لقب اختیار کر لیا اور اس کے علاوہ وہ ہندی لقب "راجہ" سے بھی موسوم تھا۔ اس کی سلطنت میں ایک بڑا رقبہ شامل تھا۔ وہ جنوبی راجپوتانے سے لے کر مغربی گھاٹ کے اضلاع ناسک اور پونا تک پھیلی ہوئی تھی اور جزیرہ نمائے سراشتر (یعنی کاٹھیاواڑ) کا علاقہ بھی اس سے ملحق تھا۔ سترپ یا سترپ اعظم کے خطابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی شمالی طاقت کا ماتحت تھا، جو کشان ہی کی سلطنت ہو سکتی ہے۔

گوتمی پتر سات کرنی کے ہاتھوں کشہرات قوم کی بیخ کنی

اندھر راجا نمبر23 گوتمی پتر سری سات کرنی، جس کے متعلق فرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ 109ء میں تخت پر بیٹھا، 124ء میں کشہرات کے خاندان کی بیخ کنی کرنے اور اس کے علاقے کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے اپنی اس فتح کا اعلان اس طرح کیا کہ مفتوح راجاؤں نے سالہا سال قبل جتنے سکے جاری کیے تھے ان سب کو واپس جمع کیا اور ان پر نہایت بھدے پن سے اپنی مہر لگادی۔ اس نے اپنے آپ کو بے ذات پات بیرونی اقوام جیسے سک، پہلو وغیرہ کے مذہب کے مقابلے میں ہندی مذاہب کا حامی ظاہر کیا۔۔۔ وہ مذاہب جن میں برہمنوں کا مذہب اور بدھ مت شامل تھے۔ وہ اس بات پر فخر کرتا تھا کہ اس نے ذات کے قواعد وضوابط کی پابندی کو نئے سرے سے جاری کر دیا ہے۔ اس طرح اس نے "سات واہن خاندان کی شوکت پھر قائم کی۔"[20] اور اب اس کی یہ حیثیت تھی کہ وہ اپنے ہندی رجحان قلب کو برہمنوں اور بدھ مذہب والوں کو عطیات دے کر تسکین دے لے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ باوجود اس کے اندھر راجا کا مذہب صریحاً برہمنی تھا۔ لیکن ان کے محفوظ عطیات کی فہرست میں بڑی تعداد وہ ہے جو بدھ

مت والوں کو دیئے گئے تھے۔

ردردامن اول کی پلمائی پر فتح

135ء کے قریب گوتمی پتر سری سات کرنی کی موت کے بعد اس کا بیٹا راجا واشتی پتر سری پُلمائی اس کا جانشین ہوا اور اس نے تقریباً تیس سال حکومت کی۔ ردردامن اول اجین کے سک قوم کے ستر پ اعظم کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ مگر یہ تعلق ستر پ اعظم کے لیے اپنے داماد پر حملہ کرنے میں سد راہ نہیں ہوا۔ اس نے دو دفعہ اندھر راجا کو شکست دی اور اس کے علاقے کا ایک بڑا حصہ لے لیا جو گوتمی پتر سات کرنی نے کشہرات قوم سے چھینا تھا۔ بہرحال اس تعلق کا نتیجہ اتنا ضرور ہوا کہ فاتح نے ایسا بد ترین سلوک، جو وہ ایک اجنبی کے ساتھ کر سکتا تھا، اس مفتوح کے ساتھ روا نہ رکھا۔ ردردامن اول کی ان فتوحات کا خاتمہ یقیناً 150ء سے قبل ہو گیا ہو گا کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس نے ایک کتبہ کندہ کرایا جس میں ان تمام علاقوں کی فہرست شامل تھی جو مغربی ہندوستان میں اس کے زیر نگیں تھے۔

ردردامن اور چشتن کی زندگیاں

ردردامن ایک پڑھا لکھا لائق فائق آدمی تھا اور اس نے اپنے خاندان کو اتنا بڑھایا کہ وہ مغربی ہند میں سب سے بڑی طاقت ہو گیا۔ وہ زبردست ستر پ چشتن کا پوتا تھا، جس کے چاندی اور تانبے کے سکے، جن پر برہمی، کروشتی اور یونانی زبان میں عبارتیں لکھی ہوئی ہیں اور جو گجرات میں پائے جاتے ہیں، چشتن کے عہد حکومت کے واقعات سے منضبط نہیں۔ مگر اس کی تقریباً صحیح تاریخ کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ معلوم ہے کہ اس کا پوتا 130ء اور 150ء کے درمیان برسر حکومت تھا۔ اس وجہ سے چشتن کا زمانہ غالباً 80ء اور 110ء کے بین بین ہے۔ ان تاریخوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چشتن کشان خاندان کی ماتحتی ہی میں ستر پ اعظم کا کام انجام دیتا ہو گا۔ یعنی میرے نظام سنین کے مطابق یہ کنشک کا زمانہ تھا۔[1] سراشترا اور مالوا کے سک قوم کے ستر پ اور علیٰ ہذا القیاس نہپان کشہرات فطرتی طور پر اپنے آقاؤں یعنی کشان خاندان کے بادشاہوں کی پیروی میں سک سنہ کا استعمال کرتے تھے جو اسی زمانے میں نیا نیا قائم کیا گیا تھا۔ ایسے سکوں اور کتبوں کی کثرت کی وجہ سے جن پر سنہ و سال ثبت ہے اس خاندان کی تاریخوں یا سنین کے متعلق کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں جس کا بانی چشتن تھا۔ ان کی تاریخ کا تذکرہ ہم خاندان گپت کے ضمن میں کریں گے۔

یجن سری

تقریباً 163ء میں داشتی پتر پلمائی کی وفات کے بعد اگر اندھر خاندان میں سے کوئی بڑا نامور راجا ہوا تو وہ گوتمی پتر یجن سری تھا جس نے تقریباً 173ء سے 212ء تک حکومت کی۔ اس کے نہایت ہی شاذ چاندی کے سکے' جن میں اس نے ستریوں کے سکوں کی نقل اتارنے کی کوشش کی ہے' یہ صریحاً ثابت کرتے ہیں کہ مغربی ستریوں کے ساتھ اس کے تعلقات نئے سرے سے قائم ہو گئے تھے اور غالباً ایسی فتوحات بھی عمل میں آئی تھیں جن کا حال ہم تک نہیں پہنچا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یجن سری نے اس جنگ کو از سر نو شروع کیا جس میں پلمائی ثانی کو شکست ہو چکی تھی اور اس نے وہ چند صوبے جو اس کے پیشرو نے کھو دیئے تھے پھر واپس لے لیے تھے۔ اس واقعے کے بعد یہ چاندی کے سکے مسکوک کیے گئے ہوں گے تاکہ مفتوحہ علاقے میں رائج ہو سکیں' جیسے کہ اسی قسم کے سکے چندر گپت بکرماجیت نے سک ستریوں کی بیخ کنی کے بعد مضروب کرائے تھے۔ بے شمار اور مختلف النوع مگر بھدے کانسی اور سیسے کے یجن سری کے مضروب کردہ سکے (جو مشرقی صوبہ جات میں رائج تھے) کتبات کی اس شہادت کی تصدیق کرتے ہیں جن سے کہ اس کے عرصہ حکومت کی طوالت کا حال معلوم ہوتا ہے۔[۲۵] بعض سکے جن پر جہاز کی تصویر بنی ہوئی ہے غالباً اسی کے دور حکومت کے ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یجن سری کی طاقت محض خشکی ہی تک محدود نہ تھی۔

آخری تین بادشاہ

مشرقی صوبوں میں بظاہر اس کے جانشینوں' وجیا (وجے)' چندر سری' پلمائی چہارم' کے محض نام ہی نام باقی رہ گئے ہیں۔ پلمائی چہارم ہی وہ تاجدار ہے جس پر اندھر بادشاہوں کے طولانی خاندان کا تقریباً 225ء میں خاتمہ ہو گیا۔ لیکن بہرحال چندر سری کے وجود کی تصدیق ان چند دریافت شدہ سیسے کے سکوں سے ہوتی ہے جن پر اس کا نام موجود ہے۔[۲۶] تحقیقات سے غالباً اس کے پیشرو اور جانشین کے سکے بھی ضرور بعد میں دریافت ہو جائیں گے۔

اس خاندان کا عرصہ حکومت

پرانوں کی اس امر میں شہادت کہ یہ خاندان 456 یا 460 سال یا بہ ہیئت مجموعی ساڑھے چار صدی قائم رہا' بظاہر بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ راجاؤں کی تعداد 30 بھی بظاہر بالکل درست بیان کی گئی ہے۔ ان بادشاہوں کی مندرجہ ذیل فہرست سمجھ کر بنائی گئی ہے کہ

پرانوں کے بہترین نسخوں میں تعداد بالکل صحیح طور پر تمیں دی گئی ہے اور اسی وجہ سے اس میں نمبر 24 کا ذکر نہیں کیونکہ اس کا نام وایو پران کے صرف ایک ہی نسخے میں ملتا ہے۔[47]

اندھروں کا آخری بادشاہ

موجودہ صورت میں ہمیں ان اسباب کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں جو آخر میں اس خاندان کے زوال وانحطاط کے باعث ہوئے جو اتنی غیر معمولی طور پر مدت ہائے دراز تک اپنے ہاتھ میں طاقت مجتمع رکھنے میں کامیاب ہوا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یجن سری آخری بادشاہ تھا جو مشرقی اور مغربی دونوں صوبوں پر اپنی نگرانی اور حکومت قائم رکھنے میں کامیاب ہوا۔ ان کے بعد سات واہن کے خاندان کے چند افراد نے دکن کے مختلف حصوں میں چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم کرلیں تھی۔ اتفاقاً اندھروں کی تباہی اور شمالی ہند میں کشان خاندان کے آخری بادشاہ بسودیو کی موت کی تاریخ اور ایران میں ساسانیوں کے عروج کا سنہ (226ء) تقریباً بالکل ایک ہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان واقعات کا اس طرح منطبق ہونا محض اتفاقی نہ ہو۔ لیکن تیسری صدی عیسوی میں تاریخ ہند پر نہایت سخت تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور زمانے کے تقریباً ہر ایک واقعے پر فراموشی کا ایسا نقاب پڑا ہے کہ اس کے پیچھے کچھ دکھلائی دینا بالکل ناممکن ہے۔ مبہم تخیلات جن کی کوئی مصدقہ واقعات حد بندی نہ کرسکیں، بالکل بیکار ہیں اور اسی وجہ سے ہم کو بھی اسی پر قناعت کرنا چاہیے کہ اندھر خاندان تاریکی میں غائب ہو جائے۔ پرانوں میں نہایت ہی تتر بتر اور بے ترتیب فہرست ان بے شمار مقامی خاندانوں کی ملتی ہے جو اندھر کے جانشین بنے۔ ان میں یَون اور سک خاندان بھی ہیں جو صریحاً غیر ملکی ہیں۔ مگر ان فہرستوں کو اس طرح ترتیب دینا ناممکن ہے کہ وہ قابل فہم ہو جائیں۔

ضمیمہ د

مننڈر کا حملہ اور پتنجلی کا سن

اسناد

مننڈر کے حملے کے متعلق مفصلہ ذیل اسناد ہیں۔ سٹریبو: سب اسناد میں سے صرف اسی نے یونانی بادشاہوں کا نام لکھا ہے۔ (باب 11، حصہ 11، فصل 1۔ باب 15، حصہ 2، فصل 3) پتنجلی جو ہمعصر ہندو نجومی تھا، سنسکرت میں علم ہیئت کی کتاب موسومہ بہ "گارگی سمہتا" جس کی تصنیف کی تاریخ غیر متعین ہے۔ اور تاراناتھ تبت کے بدھ مت کا مورخ۔

سٹریبو

سٹریبو کا راوی اپولوڈورس ارٹی میا کا باشندہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ مننڈر نے دریائے ہائی پے فس (بیاس) کو جو سکندر کے حملے کی حد تھا عبور کیا اور اسامس تک بڑھتا چلا گیا۔ (اسامس معلوم نہیں کس مقام سے مراد ہے) اور آخرکار دریائے سندھ کے مثلثی دہانے سیرونیس (سراشٹر یا کاٹھیاواڑ) اور مغربی ساحل کے علاقے موسومہ سگرڈس کو زیر نگین کیا۔ اس بیان کی مزید تائید پریپلس کے مصنف کے بیان سے ہوتی ہے جس نے غالباً پہلی صدی عیسوی کے اختتام پر یہ دیکھا تھا کہ اپالوڈوٹس اور مننڈر کے یونانی سکے بیری گیزا (بھڑوچ) کے بندرگاہ میں عام طور پر رائج تھے۔ اس عجیب و غریب بیان سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ مننڈر کو دریائے گنگا کی وادی سے فوراً مجبوراً نکل جانا پڑا تھا لیکن پھر بھی اس کی حکومت عرصہ دراز تک مغربی ساحل کے علاقوں پر قائم رہی ہوگی۔

مدھیا مکا

ساکیتم اور مدھیا مکا کے یون قوم جس سے غالباً متدر ہی سے مطلب ہے' کے محصور ہونے کا حوالہ مشہور نجوی پتنجلی نے ایسے الفاظ میں دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً مصنف کی زندگی میں ہوا ہوگا۔ اس امر کے ثبوت کے لیے مدھیا مکا بالکل صحیح لفظ ہے اور وہ کسی شہر کا واقعی نام ہے۔ ہم پروفیسر کیلمارن کے ممنون احسان ہیں۔(انڈین انٹی کویری جلد 7۔ صفحہ 266) اس کے علاوہ مدھیا مکا کا نگری یا تمبوتی نگری (جو راجپوتانے میں چتوڑ کے شمال میں گیارہ میل کے فاصلے پر واقعہ ہے) ہونا بھی ان سکوں سے ثابت ہے جو وہاں کے علاوہ اور کسی مقام پر شاذونادر ہی پائے جاتے ہیں اور جن پر "جھمکیا سیکن پرس" مضروب ہے (کننگھم۔ رپورٹس جلد 6' صفحہ 201۔ جلد 14' صفحہ 146۔ پلیٹ 31) یہ مقام ہندوستان کے قدیم ترین مقامات میں سے ہے۔

ساکیتم

ساکیتم (یا ساکیت) غالباً جنوبی اودھ میں کوئی شہر تھا۔ مگر اس کا اجودھیا سے کوئی تعلق نہیں' جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے۔ اس نام کی بہت سے جگہیں معلوم ہوتی ہیں۔ (ویبر۔ انڈین انٹی کویری۔ جلد 2 صفحہ 208) اسی طرح فاہیان کے شہر شاچے کو ہیون سانگ کے وشاکھا اور ساکیتم کو ایک ہی قرار دینا (جیسا کہ کننگھم نے کیا ہے) غلط ہے' (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1898ء صفحہ 522۔ 1900ء صفحہ 3) موجودہ صورت میں ساکیتم کی اصل جائے وقوع کا پتہ لگانا ناممکن ہے۔

پتنجلی کا سن

پتنجلی کے ان الفاظ کو جن میں وہ پشی متر کے اشومیدھ کی قربانی کا ذکر کرتا ہے اگر اور ان ہی مضامین کی عبارتوں کے ساتھ پڑھا جائے تو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہ مشہور نجوی اس بادشاہ اور یونانی حملہ آور کا جو غالباً متدر تھا' ہمعصر ہوگا۔ پتنجلی کے سنہ حیات کے متعلق ایک عرصے تک ویبر اور گولڈ سٹکر اور پروفیسر بھنڈارکر میں طویل بحث ہوتی رہی اور انجام کار ویبر کو اپنے حریفوں کے دلائل ماننے پڑے (ہسٹری آف انڈین لٹریچر۔ دوسری ایڈیشن' ٹیوبز 1882ء صفحہ 224 نوٹ) اور اب اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں کہ پتنجلی کی تاریخ یہ ہیئت مجموعی 140۔ 150ق م کے بین بین ہے۔ اس موضوع پر حسب ذیل کتب ذکر کی جاسکتی

ہیں۔ گولڈ سٹکر: پانی‘ ہز پلیس ان سنسکرت لٹریچر‘ صفحہ 238-228۔ انڈین انٹی کویری‘ جلد اول صفحہ 302-299‘ جلد دوم صفحہ 210,94,69,57-362,238,206۔ جلد 15 صفحہ 84‘ جلد 16 صفحہ 172,156۔

گارگی سمہتا کے متعلق میکس ملر کا خیال ہے کہ وہ دوسری یا تیسری صدی عیسوی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا اس معاملہ کے متعلق بیان حسب ذیل ہے۔

گارگی سمہتا

"پاٹلی پتر کے راجاؤں کے ذکر کے بعد (جن میں اس نے اشوک کے چوتھے جانشین سالسوک (تقریباً 200 ق م) کا نام بھی لکھا ہے) مصنف کہتا ہے کہ جب مشہور یونانی سکیت (اودھ) پنچال قوم کے علاقے (جس سے غالباً دریائے گنگا اور جمنا کا دوآبہ مراد ہے) اور متھرا کو فتح کرنے کے بعد کسمد ھواج یعنی پاٹلی پتر کے شاہی محل تک پہنچیں گے اور جبکہ تمام صوبوں میں بدامنی پھیلی ہوگی۔" (مکس ملر "انڈیا وٹ اٹ کین ٹیچ اس" صفحہ 298 مطبوعہ 1883ء۔ اور کننگھم نیو سمیٹک کرانیکل 1890ء صفحہ 224) ۲۸

تارناتھ

تارناتھ کی شہادت (1608ء۔ اس کا انحصار قدیم اسناد پر ہے) کا ترجمہ شیفنر نے نہایت صحت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ دویاودان (برنوف: انٹروڈکشن۔ طبع دوم صفحہ 384) سے اس امر میں متفق ہے کہ پشی متر کافردں کا حلیف تھا اور اس نے خود بھی خانقاہوں کو جلایا اور راہبوں کو قتل کیا تھا۔

یہی مورخ لکھتا ہے کہ اس کے پانچ سال بعد پشی متر شمال میں مرگیا۔

اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ پشی متر 149 ق م میں 36 سال حکومت کرنے کے بعد (جیسا کہ پرانوں میں مذکور ہے) مرا تو متندر کے حملے کی تاریخ 153-152 ق م کے بین بین ہوتی ہے اور یہ تاریخ سکوں کی شہادت کے بالکل مطابق ہے۔ متندر کے سکے پنجاب اور اس کے آگے مشرق وجنوب میں بہت عام ہیں۔ اس کے چالیس سکے 1877ء میں جمنا کے جنوب میں ہلمر پور کے ضلع میں پائے گئے اور مصنف کے پاس (جو اس وقت وہاں مقیم تھا) لائے گئے تھے۔ ان کا یوکرے ٹائڈیز‘ اپالوڈولس‘ سوٹر اور انٹی میکس نکیفورس کے سکوں سے تعلق بتایا گیا ہے۔ وہ اچھی حالت میں پائے گئے تھے (انڈین انٹی کویری‘ 1904ء صفحہ 217)۔

ضمیمہ ر

خاندان اندھرو خاندان ہائے متعلقہ

اندھر خاندان اور دیگر خاندانہائے متعلقہ کے کتبوں اور سکوں پر پروفیسر ریپسن نے کیٹلاگ آف دی کائنز آف دی اندھر ڈائناسٹیز' برٹش میوزیم' 1908ء میں مفصل بحث کی ہے۔ لیکن کتبات کو نمبروار لیوڈرس کی کتاب "اے سٹ آف برہمی انسکرپشنز فرام دی ارلیسٹ ٹائمز تو اباؤٹ 400ء' جو ایپی گرافیا انڈیکا جلد دہم 1910ء کے ضمیمے کے طور پر چھاپی گئی ہے نہایت اچھی طرح جمع کر دیا ہے۔ مسٹر ایف۔ اے پرگیٹر کی کتاب "دی پران ٹیکسٹ آف دی ڈائناسٹیز آف دی کالی ایج" (آکسفورڈ 1913ء) میں پرانوں کی تمام مستند فہرستوں کو جمع کر دیا ہے اور ساتھ ہی مکمل اختلافات قرات بھی دیئے ہیں۔ مسٹر بیزجی کا مضمون موسومہ "دی سیتھین پیریڈ آف انڈین ہسٹری" (انڈین انٹی کویری 1908ء) میں نہپان وغیرہ کی تاریخ کے متعلق چند قابل اشارات پائے جاتے ہیں اور ان سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ ریورنڈ ایچ۔ آر۔ سکاٹ کا مضمون "ناسک ہورڈ آف نہپانز اینڈ سات کرنیز کائنز" مع چار لوحوں کے۔

ان کے علاوہ میں نے ڈی۔ گوپالا ایر کے مضمون "دی سکا اینڈ سموت ایرا" (جرنل آف دی ساوتھ انڈین ایسوسی ایشن۔ اپریل 1911ء جلد اول صفحہ 49۔425) کا بھی مطالعہ کیا ہے۔

مندرجہ بالا تمام اسناد کو مد نظر رکھتے ہوئے اب میں بجائے اس کے کہ ان باتوں کو حاشیوں میں بیان کرتا اس ضمیمے میں وہ اسباب بیان کرتا ہوں جن کی بناء پر میں نے تاریخ کو اس طرح لکھا ہے جس طرح کے وہ اس طبع کتاب میں پائی جاتی ہے۔

حوالہ جات کتبوں کے جن میں اندھر بادشاہوں کا ذکر ہے' جن کے نام پر ان کی فہرست میں پائے جاتے ہیں' ان کو سلسلہ وار لکھا گیا ہے۔

نمبر1۔ لیوڈرس: 1113۔ نمبر2: 346' 1144' 1149۔ نمبر23: 1123' 1124, 1125۔ نمبر 24: 1100' 1106' 1122' 1123' 1124' 1148۔ نمبر25: 1279۔ نمبر27: 987' 1024' 1142'

1340 – نمبر 29: 1341 – مشکوک: 1112' 1120' 1202' 1203' 1204 – ان کے علاوہ سکے موجود ہیں جو چند مشکوک حالات کے علاوہ اندھر خاندان کے مندرجہ ذیل ناموں سے منسوب ہو سکتے ہیں – نمبر 6,21,22,23,24,25,27,29 –

کشہرات کتبات حسب ذیل ہیں – 1109' 1125' 1131' 1132' 1133' 1134' 1135' 1174 – بھومک اور نہپان کے سکے موجود ہیں – گوتمی پتر (اندھر بادشاہ نمبر 23) نے اپنے چند سکے نہپان کے سکوں پر ہی مضروب کرائے تھے –

اندھر بادشاہوں کی فہرست پرگیٹر (صفحہ 43 – 38 اور 71) سے لی گئی ہے – پر ان ان کے سب سے پہلے بادشاہ کا نام سِسک (مت) یا سندھک (وا – بڈ) یا شپرک (وس) بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اندھر راجا (سندھک یا کوئی اور) اپنی قوم یعنی سسرمن کی ملازمین کو ساتھ لے کر کنواین اور اس پر (سسرمن) پر حملہ کرے گا اور سنگ کی بچی کھچی طاقت کو ختم کر کے اس زمین پر قبضہ کر لے گا – " یہ بادشاہ سمک تھا جس کا ذکر ناناگھاٹ کے کتبے میں پایا جاتا ہے (کتبہ نمبر 1113) جو تقریباً 200 ق م کی طرز تحریر میں لکھا ہوا ہے –

کرشنا (بادشاہ نمبر 2) صریح طور پر ناناگھاٹ کے کتبہ نمبر 1144 کا کتبہ ہے اور بادشاہ نمبر 3 سات کرنی یا ملا کرنی یقیناً وہی بادشاہ ہے جس کا ذکر کھاریویلا کے کتبے نمبر 346 اور ناناگھاٹ کے کتبات نمبر 1144 میں ہے –

کیونکہ اس خاندان کے پہلے اٹھارہ بادشاہوں کے متعلق ہماری معلومات بالکل برائے نام ہیں' اس وجہ سے ان کے نام اور عہد حکومت ہی لکھ دینا کافی ہے – یہ نام پرگیٹر کی فہرست سے لیے گئے ہیں – (1) قلمی نسخے کا سسک وغیرہ اور کتبے کا سمک 23 سال – (2) کرشنا – اس کا بھائی دس سال – (3) سات کرنی یا ملا کرنی جو نمبر (2) کا بھائی تھا دس سال – (4) پورنت سنگ اٹھارہ سال – (5) سکند تھمی اٹھارہ سال – (6) سات کرنی 56 سال – (7) لمبودر 18 سال – (8) آپی لک 12 سال – (9) میگھسواتی 18 سال – (10) سواتی 18 سال – (11) سکندر سواتی 7 سال – (12) مگندر سواتی کرن 3 سال – (13) کنتل سواتی کرن 8 سال – (14) سواتی کرن 1 سال – (15) پلووامی (اول) 36 سال – (16) ارشت کرنی 25 سال – (17) ہال 5 سال – (18) منتلک 5 سال –

گوتمی پتر بادشاہ نمبر 23 کے متعلق کسی قسم کا شبہ نہیں کہ وہ ضروری سری سات کرنی ہو گوتم پتر یا راجا گوتم پتر سات کرنی ہی ہے جس کا کتبات میں ذکر ہے اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کم از کم چوبیس برس حکومت کی تھی اور وہی نمبر 24 پلووامی (ثانی) کا باپ تھا – یہ نمبر 24 کا بادشاہ بظاہر مختلف کتبات کا راجا واشتی پتر سری پلمائی یا سری پلمائی وا' یا نونرسوامی وا' یا سری پلمائی' یا راجا واسوامی سری پلمائی یا (راجہ) وا سری سات کرنی معلوم ہوتا ہے –

ان تین بادشاہوں کے اصلی نام دریافت کرنے کے متعلق تکلیف ہوتی ہے جنھوں نے "تیر و کمان" کے سکے مضروب کرائے۔ یہ سکے خیال ہے کہ مغربی گھاٹ کی مرہٹہ ریاست کلہا پورہی میں پائے جاتے ہیں۔ ان کتبوں پر سنسکرت کی عبارتیں حسب ذیل ہیں۔

1۔ راجاواشتی پتر ولوایاکرُ (اول)۔ اسی کو بعض دفعہ اس طرح مضروب کیا گیا ہے۔

2۔ راجاماتھری پتر سولکر۔ اس کو بعض دفعہ اس طرح مضروب کیا گیا ہے۔

3۔ راجاگوتمی پتر ولوا یا کرُ (ثانی)۔ ان کے اس طرح دوبارہ مضروب ہونے سے ان بادشاہوں کے سلسلے میں کسی قسم کا شک باقی نہیں رہتا۔ لیکن ایک خیال کے مطابق وہ محض مقامی گورنر اور نائب السلطنت تھے۔ ایک دوسرا خیال یہ ہے (جس کو میں نے بھی اپنی پرانی تصانیف میں صحیح تسلیم کر لیا تھا) کہ یہ درحقیقت بڑے خاندان کے اراکین تھے۔ اگر یہ دوسرا خیال درست ہے اور میرا اب یہ خیال ہے کہ وہ ضرور درست ہے تو ولوایاکر ثانی ضرور نمبر23 کا بادشاہ ہوگا جس کو پرانوں نے گوتمی پتر لکھا ہے۔ ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ عجیب وغریب لفظ ولوایاکر جو غالبا تلنگی یا کنٹری کا لفظ ہے' بادشاہ کا اصلی نام تھا یا محض اس کا لقب تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نام تھا۔ مگر میں یہاں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث نہیں کر سکتا اور اس کتاب میں ان تمام معاملات کو بلا تصفیہ چھوڑے دیتا ہوں۔

پلمائی اول بادشاہ نمبر34 کا لقب یا نام کنٹری کتبہ نمبر11 لیوڈرس نمبر994 میں سات کرنی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سترپ اعظم رودرامن اول کی بیٹی سے شادی کی اور اس رودرامن نے اس کو دو مرتبہ 125ء کے بعد اور 150ء سے پہلے شکست دی۔ پرانوں کے بیان کے مطابق پلمائی گوتمی پتر کا بیٹا تھا۔ مجھ کو یہ بات بالکل صاف ظاہر معلوم ہوتی ہے کہ یہی پلمائی اول تھا جس کو رودرامن اول نے دو مرتبہ شکست دی تھی۔ اگر اس خیال کو درست مان لیا جائے تو نظام سنین کا اس طرح کھوج مل جاتا ہے کہ اس سے اس خاندان کی تمام تاریخوں کا پتہ اگلے اور پچھلے کی طرف نہایت آسانی سے قرین قیاس صحت کے ساتھ لگ سکتا ہے۔

بادشاہ نمبر27 کا یگن سری کے ساتھ (جس کے بے شمار سکے اور کتبے ملتے ہیں۔) تعلق ہونا بالکل صریح اور یقینی ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ بالعموم یہ غلطی کیا کرتے ہیں کہ "مغربی ستریوں" کے دو جدا جدا خاندانوں کو ملا دیتے ہیں۔ یعنی ایک تو کشہرات کا خاندان مہاراشٹر میں اور دوسرا چشتن کا خاندان جو پہلے پہل مالوا کے علاقے اجین میں آباد ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں خاندان مغربی علاقے ہی کے تھے مگر کبھی دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں اور ایک

دوسرے سے ان کا کسی طرح کا تعلق نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی نام نہ دیا جائے۔ نہپان کشہرات کا دارالسلطنت غالباً مغربی گھاٹ میں ناسک کے مقام پر تھا اور اس کے برخلاف چشتن کا پہلا مستقر یقیناً اجین تھا۔ چشتن کے پوتے نے پلمائی اول اندھر سے ان علاقوں کا بہت بڑا حصہ واپس لے لیا جو پلمائی کے باپ نے چند سال قبل کشہرات سے چھین لیے تھے۔ یہ ماننا ضروری نہیں کہ گوتمی پتر اول ذاتی طور پر نہپان سے لڑا تھا۔ جگل تھمی کے ذخیرے کے مطالعہ سے، جس میں کم وبیش 1300 سکے نہپان کے موجود ہیں، یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سکے بہت مختلف برسوں کے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ان سب پر نہپان کا نام ہی پایا جاتا ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ گوتمی پتر کے اس کے خاندان یا قوم کو برباد کرنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ نہپان کے سکوں کے تیرو رعد کی تصاویر سے ان کا تعلق پارتھی اور شمالی سترپ ہگان اور ہگاماش سے معلوم ہوتا ہے۔ [۲۹] اس کے برخاف چشتن اور اس کے جانشینوں کے سکے ان سے بالکل مختلف ہیں۔

یونانی جغرافیہ داں ٹولی 161ء کے بعد مرا اور چالیس سال تک وہ سکندریہ میں مقیم رہا۔ اس نے اجین کونسٹنیز کا دارالسلطنت بتلایا ہے جس کو غالباً بالکل صحیح طور پر چشتن قرار دیا گیا ہے۔ اس جغرافیہ کے لکھے جانے کی تاریخ معلوم نہیں۔ لیکن اگر وہ کتاب 130ء میں لکھی گئی تھی تو کونسٹنیز کے متعلق ٹولی کی اطلاع کچھ زیادہ پرانی نہ تھی۔ [۳۰]

خاندان اندھر اور دو ممیز بیرونی خاندانوں کے تعلقات کے متعلق میں نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت اختصار سے منسلکہ فہرست میں کیا ہے اور میرے نزدیک تمام واقعات معلومہ کا تطابق ایک دوسرے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ اس امر میں تمام علماء متفق ہیں کہ چشتن کے خاندان کے سترپوں کے تمام سکوں اور کتبوں پر سک سنہ کی تاریخ ہے اور خود مجھے اس بات میں شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ کشہرات کے کتبوں اور سکوں پر بھی یہی سنہ مرقوم ہے۔

(الف) آخری زمانے کے شاہان اندھر وخاندان ہائے متعلقہ

شاہان اندھر۔ پران کی فہرست۔ پرکیٹرا عرصہ حکومت	تخت نشینی کی اندازاً تاریخ	کتبات۔ لیوڈرس کی فہرست ایپی گریفیا انڈیکا جلد 10 ضمیمہ	سکے	کشہرات ستر پ مہاراشٹر کے	سنہ تخت نشینی اندازاً	اجین کے سترپ و سترپ اعظم	سنہ تخت نشینی اندازاً	کیفیت
19- پریکسین 2V	59ء		واسشتی پترولوپاکر (اول) کے "تیروکمان" کے سکے ان تینوں بادشاہوں میں سے ایک کے ہو سکتے ہیں۔ (دیکھو ریپسن ص 56) ماتھری پتر سولکڑ کے "تیروکمان" کے سکے ممکن ہے کہ اس بادشاہ کے ہوں (دیکھو ریپسن صفحہ 7) دیکھو نمبر 25۔ مہپان کے دوبارہ مضروبہ سکے۔ عبارت "راجہ گوتمی پتر ساتکرنی" (ریپسن صفحہ 68-71-89) گوتمی پترولویا کردوم کے تیروکمان کے ہیں۔	ستر پ بھومک (صرف سکے' نہ تو کوئی کتبات ہیں اور سنین معلوم ہوئے ہیں۔)	70ء یا اس سے قبل	چشتن (یعنی گھموتک کا بیٹا) پہلے سترپ' بعد میں سترپ اعظم' اس نے راجہ کا ہندی خطاب بھی اختیار کیا تھا۔		"ٹولمی" "ٹاسٹینز" چشتن
20- سندرساتکرنی 1/	80ء	-------------------					80ء	
21- چکورساتکرنی 1/2	81ء				58ء			
22- سوسواتی 28	81ء	نمبر 1279۔ امراوتی۔ راجہ سری سوتک سدن ست۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ شاہ نمبر 25 یا 26 سے متعلق ہیں۔		بھومک کا رشتہ مہپان سے معلوم نہیں۔ سترپ مہپان مہپان کی بیٹی دکھترا۔ منکوحہ رشھدت یا اشودت عامل ناسک وغیرہ۔ ممکن ہے کہ مہپان 120ء میں فوت ہوا ہو۔ اس کے خاندان کو اندھر راجہ نمبر 23 نے اپنے اٹھارویں جلوس یعنی 126ء میں برباد کیا۔				
23- گوتمی پتر 21	109ء	نمبر 1123-1125-1126 ناسک اس کے چوبیسویں سال کے کتبے۔			90ء	جیادامن چشتن کا بیٹا صرف سترپ جیادامن کا بیٹا ردر دامن (اول) سترپ اعظم (تاریخ ہائے معلومہ 130 و 150ء۔ دو مرتبہ تقریباً 124ء میں (اندھر راجہ نمبر 24 کو شکست دی)	110ء	اندھر بادشاہ نمبر 23 غالباً ٹولمی کے بیلیکورس کے۔ مہپان کے سکوں پر قابل فہم یونانی عبارتیں ملتی ہیں۔ (تقریباً 100ء)۔

شاہان اندھر۔ پران کی فہرست۔ پرکیٹرا عرصہ حکومت	تخت نشینی کی اندازا تاریخ	کتبات۔ لیوڈرس کی فہرست ایپی گریفیا انڈیکا جلد 10 ضمیمہ	سکے	کشہرات ستر پ مہاراشٹر کے	سنہ تخت نشینی اندازا	اجین کے سک ستر پ و ستر پ اعظم	سنہ تخت نشینی اندازا	کیفیت
24 - 2 پلوما (دی) (دوم) نمبر 23 کا بیٹا 28	135ء	نمبر 994 کنہیری نمبر 1122-1124 ناسک 1100-1106 کالے اور غالباً نمبر 1248۔ امراوتی "راجہ واسشتی پتر سری پلمائی" بعض اوقات "سری" سے قبل "سوامی" کا لفظ ایزاد کیا گیا ہے۔ نمبر 994 میں "واسری سات کرنی۔"	"راجہ واسشتی پتر سری پلمائی" کے مشرقی سکے (ریپسن صفحہ 30)	کشہرات خاندان کے کتبات پر 41ء سے 46ء (سک) تک کی تاریخیں ہیں۔ 119-124ء۔				
24/1 صرف وایوپران میں سات کرنی 29	-	--------------------	--------------------			روروامن لول کا بیٹا۔ وامجد سری۔ ستر پ وستر پ اعظم۔ تاریخیں معلوم نہیں	155ء	
25- سوسری پلما (دی سوم) 7	163ء	دیکھو شاہان نمبر 22 و 26۔	غالباً "راجہ واسشتی پتر واسری سات کرنی" کے مشرقی سکے مگر دیکھو شاہان نمبر 22و26۔					
26- سوسکند سات کرنی۔ 3?	170ء	نمبر 1186 مقام نیواسی جس میں "سات یا سوسکند ناگ سری" بادشاہ کا ذکر ہے۔ دیکھو شاہان نمبر 22و25۔	دیکھو مذکورہ بالا شاہان نمبر 22 و 25۔					

شاہان اندھرا۔ پران کی فہرست۔ پرگیٹرا عرصہ حکومت	تخت نشینی کی اندازاً تاریخ	کتبات۔ لیوڈرس کی فہرست ایپی گریفیا انڈیکا جلد 10 ضمیمہ	سکے	کشتہرات ستر پ مہاراشٹر کے	سنہ تخت نشینی اندازاً	اجین کے سک ستر پ و ستر پ اعظم	سنہ تخت نشینی اندازاً	کیفیت
27- سو سکند سات کرنی 3?	173ء	نمبر 1024-987 بمقام کنہیری و نمبر 1146 بمقام ناسک "راجہ گوتمی پتر سوامی سری یگین سرت سات کرنی" ضلع کرشنا کے مقام چینن کے کتبے میں جائے "سوامی" کے اریک ہے (سال 27)	مختلف النوع ہیں۔ حسب ذیل عبارت اس کا کچھ حصہ: "راجہ گوتمی پتر سری یگین سات کرنی" (رپسن صفحہ 45-34)۔			داماجد سری کا بیٹا جیودامن ستر پ اعظم	178ء	ان ستر پ اور ستر پ اعظم کی جانشینی کے متعلق بعض غیر متیقن باتیں نظر انداز کر دی گئی ہیں۔
28- وجیا 6	202ء	----------------	----------------			رودر دامن اول کا بیٹا رودر سنہہ اول ستر پ و ستر پ اعظم۔	180ء	
29- چندر سری (چندر) سات کرنی 10	208ء	نمبر 1341۔ بمقام کودوس (گوداوری کا ضلع) "راجہ واسشتی پتر سوامی سری چند (چدر) سات۔"	بظاہر "راجہ واسشتی پتر سری چدر۔ سات۔" یا محض "سری چند سات" کے مشرقی سکے۔ (رپسن صفحہ 30و33)			رودر سنہہ اول کا بیٹا رودر سین اول ستر پ و ستر پ اعظم	199ء	

شاہان اندھر۔ پران کی فہرست۔ پرگیٹر صفحہ 35-43 و صفحہ 71-	تخت نشینی کی اندازاً تاریخ	کتبات۔ لیوڈرس کی فہرست ایپی گریفیا انڈیکا جلد 10 ضمیمہ	سکے	کشتہرات سترپ مہاراشٹر کے	سنہ تخت نشینی اندازاً	اجین کے سک سترپ و سترپ اعظم	سنہ تخت نشینی اندازاً	کیفیت
30- پلوماوی (چہارم) 7	218	غالباً کوئی نہیں۔	؟ بالکل نہیں۔ مگر چند پلماوی سکوں کی نسبت ابھی شبہہ ہے۔			رودر سنہہ اول کا ایک اور بیٹا۔ سنگھ دامن۔ سترپ اعظم	222ء	
						وام سین (یہ بھی رودر سنہہ اول کا ہی بیٹا ہے) سترپ اعظم۔	223ء	
خاندان کا خاتمہ "یہ تیس اندھر بادشاہ 460 برس تک زمین پر راج کریں گے۔" (وایو پران صفحہ 411)	225		دوسرے سکے بھی موجود ہیں مگر ان کے متعلق یقین نہیں کہ ان کو اس فہرست کے کن بادشاہوں سے منسوب کرنا چاہیے۔					

حوالہ جات

لہ پشی متر کے غصب کا جو حال پرانوں میں ملتا ہے اس کی تصدیق ساتویں صدی عیسوی کے شاعربان کے بیان سے ہوتی ہے، جس نے غالباً وہ کاغذات دیکھتے تھے جو اب گم ہو گئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے: "اور تمام فوج کا اس نے اس بہانے سے جائزہ لیا کہ وہ بادشاہ کے سامنے ان کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کمینے سپہ سالار پشی متر نے انہی سے اپنے آقا برہدرتھ کو شکست دی جو اپنی تاجپوشی کی قسم کو پورا کرنے میں کمزور تھا۔" اس ترجمے میں کاول اور تامس دونوں کے ترجموں (ہرش چرت' ترجمہ صفحہ 193) بیوہر (انڈین انٹی کویری جلد دوم صفحہ 363) اور جیسوال کے ترجموں کو ملا دیا گیا ہے۔ پرانوں کا بہترین نسخہ (پرگیٹر صفحہ 31 و 70) صرف یہ کہتا ہے کہ "پشی متر سپہ سالار برہدرتھ کو فنا کرے گا اور سلطنت پر 36 سال حکمراں رہے گا۔"

لہ سنگ کے خاندانی نام کی تصدیق پرانوں' بان (صفحہ 193) اور بھرہت کے کتبے سے ہوگی جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔ "سنگ راجاؤں کا عہد حکومت۔" (آرکیالوجیکل سروے ویسٹرن انڈیا۔ جلد 5 صفحہ 73۔ انڈین انٹی کویری جلد 14 صفحہ 138 مع فوٹو)

سلہ "ملکہ (یعنی پشی متر کے بیٹے اگنی متر کی بیوی) کا ایک بھائی نیچ ذات سے ہے۔ اس کا نام ویرسین ہے۔ اس کو بادشاہ نے سرحد کے ایک قطعہ کا دریائے منداکنی کے کنارے پر حاکم مقرر کر دیا ہے۔" (دیباچہ مالوک اگنی متر)۔ مسٹر ٹانی (ترجمہ صفحہ 6) نے لکھا ہے کہ "منداکنی سے یہاں غالباً نربدا (یا نیربدا) مراد ہے۔ بمبئی کے ایک قلمی نسخے میں پراکرات کا لفظ نربدا ہی لکھا ہوا ہے۔" مگر مسٹر پر ٹیگر کو صرف دو ہی دریاؤں کا حال معلوم ہے جن کا نام منداکنی تھا۔ ایک بندیل کھنڈ کے ضلع باندا میں واقع ہے اور دوسرا گوداوری کے جنوبی معاون دریا کا نام ہے۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1894ء صفحہ 260)

سکہ ولسن۔ "تھیٹر آف دی ہندوز" جلد دوم صفحہ 353۔ کننگھم کرانیکل 1870ء صفحہ 277۔

ھ دیکھو ضمیمہ۔ اس باب کا آخر میں منندر کا حملہ اور پتنجلی کا سن۔

لہ ڈاؤسن۔ "کلاسیکل ڈکشنری" مضمون اشومیدھ۔ دیکھو ڈاکٹر برنیٹ کی انٹی کوٹیز آف

انڈیا (1913ء)، صفحہ 171-169۔

7؎ اس سے دریائے سندھ مراد نہیں ہے۔

8؎ راجسویا وہ رسم تھی جو بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت ادا کی جاتی تھی۔ تمام رسم کی ادائیگی میں بارہ مہینے خرچ ہو جاتے تھے۔ اس کو آر۔ ایل۔ مترا نے نہایت تفصیل سے جے۔ ایس۔ بی (حصہ اول جلد 45 (1876ء) صفحہ 98-386) میں بیان کیا ہے۔ دیکھو ڈاکٹر برنیٹ کی کتاب انٹی کو-ئیٹیز آف انڈیا (1913ء) صفحہ 167۔

9؎ "مالوا کا اگنی متر" حصہ 5، مترجمہ ثانی صفحہ 78۔ ناٹک کے نقشے کا ملخص ولسن (انڈین تھیٹر جلد اول صفحہ 53-348) اور سلوین لیوی (تھیٹر انڈین صفحہ 70-166) نے دیا ہے۔ اس کو بعد تصحیح ٹلبرگ نے شائع کرایا ہے (بون 1840ء) اور ٹانی نے اس کا انگریزی میں (کلکتہ 1875ء) اور ویبر نے جرمن میں (برلن 1856ء) ترجمہ کیا ہے۔ دو مرتبہ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوا ہے۔ اول مرتبہ فوکے اور دوبارہ وکٹر ہنری کے قلم سے (پیرس 1877ء، 1889ء)۔ اس میں تاریخی روایت بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مصنف کالیداس غالباً گپت خاندان کے زمانے میں پانچویں صدی میں گذرا ہے۔ سگر کے لیے دیکھو ڈاؤسن کی کلاسیکل ڈکشنری۔

10؎ تاراناتھ، شیفز کا ترجمہ صفحہ 81۔ دیویاوران۔ بورناف کا دیباچہ دوسری ایڈیشن صفحہ 384۔ تاراناتھ نے لکھا ہے کہ پشی مترا ایک برہمن تھا اور کسی بادشاہ کے پروہت کی خدمت انجام دیا کرتا تھا۔

11؎ بدھ مذہب کے ہندوستان میں ایذاء رسانی کی اصلیت سے رہس ڈیوڈس نے انکار کیا ہے (جرنل پالی ٹیکسٹ سوسائٹی صفحہ 92-87) مگر ہوجن، سیول اور ویٹرس اس پر مُصر ہیں۔ (ایضاً صفحہ 110-107) سسانک کی مثال جس کو کہ اس کے تقریباً ہمعصر ہیون سانگ نے بیان کیا (بیل۔ ریکارڈس جلد اول صفحہ 212 جلد دوم صفحہ 42، 91، 118، 121) بالکل صحیح ثابت ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ مہرکل کا قصہ بھی ایسا ہی ہے۔ قدیم زمانے میں تبت اور ختن کا ہندوستان سے بہت تعلق تھا۔ تبت کی تاریخ نے بدھ مذہب کی ایذاء رسانی میں ایک بادشاہ لنگ ورم کا ذکر کیا ہے۔ (راکہل۔ لائف آف بدھا صفحہ 226، 243) اسی قسم کا ایک واقعہ ختن کی تاریخوں میں بھی ملتا ہے۔ (ایضاً صفحہ 5-243، سرت چندرداس۔ جے۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول 1886 صفحہ 200) جنوبی ہند میں جین مذہب کی ایک نہایت سخت ایذاء رسانی ساتویں صدی عیسوی میں واقع ہوئی۔ (ایلیٹ۔ کائنز آف سدرن انڈیا صفحہ 122۔ باب 16 حصہ 2) اجے دیوتا "جو گجرات کا ایک شیوا راجا تھا (6-1174ء) نے اپنی حکومت کا آغاز جین کو نہایت بے رحمی سے ایذاء رسانی سے کیا اور ان کے پیشوا کو تعزیر کر کے مروا ڈالا۔" (آرکیالوجیکل سروے ویسٹرن انڈیا جلد 9۔ صفحہ 16) اس کے علاوہ اور بہت سے مستند مثالیں اس قسم کی مل

سکتی ہیں۔

۲۔ بان۔ ہرش چرت' باب 6 کاول اور ٹامس کا ترجمہ' صفحہ 192۔

۳۔ "مترا" کے مختلف اقسام کے سکے جو اودھ' روہیل کھنڈ' گورکھپور وغیرہ میں پائے گئے ہیں بسا اوقات سنگ خاندان کے متصور کر لیے جاتے ہیں۔ مگر وہ اس خاندان کی اسناد کے طور پر کام میں نہیں لائے جا سکتے۔ ان میں سے صرف ایک نام اگنی متر ہی پرانوں کی فہرست کے مطابق ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھو کارلائل اور رپورٹ کارنگ کا مضمون جے۔ اے۔ ایس۔ بی 1880ء حصہ اول' صفحہ 27'21'90'87 مع لوح۔ کننگھم۔ کائنز آف این شنٹ انڈیا' صفحہ 69'74'79'93۔ کیٹلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم جلد اول صفحہ 184۔ پُرانوں کے بیان کے مطابق سنگ خاندان کی سب سے زیادہ معتبر تاریخ حسب ذیل ہے۔ "پشی متر بادشاہ کا سپہ سالار اپنے آقا برہدرتھ کو قتل کرے گا اور چھتیس برس تک سلطنت پر حکومت کرے گا۔ اس کا بیٹا اگنی متر آٹھ برس تک بادشاہ رہے گا۔ بسوجیشتا کی حکومت کا عرصہ سات سال ہوگا۔ اس کا بیٹا بسومتر دس سال حکومت کرے گا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اندھرک دو سال تک حکمراں رہے گا۔ اس کے بعد پلندک تین سال حکومت کرے گا۔ اس کا بیٹا گھوش تین سال بادشاہ رہے گا۔ بھروجر متر نو برس تک حکومت کرے گا۔ بھاگوت بتیس برس تک حکومت کرے گا اور اس کا بیٹا دیو بھوتی دس برس تک۔ سنگ خاندان کے یہ دس بادشاہ ایک سو بارہ برس تک اس زمین پر حکمراں رہیں گے اور ان کے بعد سرزمین کی حکومت کنو کے خاندان میں آجائے گی۔ (پرگیٹر۔ "ڈائناسٹیز آف دی کالی ایج" صفحہ 30' 70۔ اس کے حاشیے میں اختلاف قرات کے حوالے موجود ہیں) مختلف حکومتوں کے عرصے کا مجموعہ ایک سو بارہ برس کے برابر نہیں ہوتا۔

۴۔ "اپنے عشق و محبت کے جوش میں یہ زناکار اور عیاش سنگ راجا اپنے وزیر بسودیو کے اشارے سے دیو بھوتی کی لونڈی کی ایک لڑکی کے ہاتھ سے جو اس کی ملکہ کے لباس میں ملبوس تھی مارا گیا (بان۔ ہرش چرت باب 6' کاول ٹامس کا ترجمہ صفحہ 193)۔ "وزیر بسودیو اپنی قوت و زور سے عیاش راجا دیو بھوتی کو اس کی کم سنی کی وجہ سے مار کر سنگ خاندان کے عہد میں بادشاہ ہو جائے گا۔" (پرگیٹر۔ صفحہ 71)

۵۔ "ارلی ہسٹری آف دکن" دوسری ایڈیشن بمبئی گزیٹیر جلد اول حصہ دوم صفحہ 163۔ میں نے اس نظریے کو اپنے مضمون "آندھرا ڈائناسٹیز" (زیڈ۔ ڈی۔ ایم۔ جی 1902 صفحہ 658) میں قبول کر لیا تھا۔ مگر اب خود اس کو رد کرتا ہوں۔

۶۔ پُران کی عبارت حسب ذیل ہے۔ "وہ (یعنے بسودیو) کنوایانہ نو سال تک بادشاہ رہے گا۔ اس کا بیٹا بھومی متر چودہ سال حکومت کرے گا اور اس کا بیٹا نارائن بارہ سال تک اور اس کا بیٹا

سسر من دس سال- یہ راجا سنگ بھرتیا کے نام سے مشہور ہیں- یہ چار کنوا برہمن پینتالیس برس تک زمین سے فائدہ اٹھائیں گے- ہمسایہ بادشاہوں پر ان کی حکومت ہوگی اور وہ نیک ہوں گے ان کے بعد اندھر خاندان زمین کا مالک ہو گا-" (پرگیٹر صفحہ 71- اختلاف قرات حاشیوں میں دیئے گئے ہیں) ان حکومتوں کی تفصیلی مدت بھی میزان یعنی 45 کے مطابق ہے-

۱۷ے دیکھو مصنف کا مضمون- "اندھر کالینج" (زیڈ- ڈی- ایم- جی 1903ء صفحہ 647- 605) ایک قدیم تامل زبان کی نظم "چلپا تھی کارم" میں چیرا خادان کے ایک راجا کا مگدھ کے بادشاہ ست کرن کے ہاں ملاقات کے لیے جانا بیان کیا گیا ہے- (وی- کے- پلے: تاملز اٹیتن پیرس ہنڈرڈ ایئرس ایگو صفحہ 6)-

۱۸ے موریا خاندان کا خاتمہ تقریباً 185 ق م اس میں سے منہا کرو: 112+45=157 یعنی 185- 157= 28 ق م-

۱۹ے پلائنی- مقالہ 6- ابواب 21، 22، 23 یہ بیان غالباً ان خبروں پر مبنی ہے جسے میگا ستھینز نے بہم پہنچایا تھا- اس عبارت پر مصنف کے مضمون "اندھرا ہسٹری اینڈ کالینج" زیڈ- ڈی- ایم- جی 1902ء- 1903ء میں مفصل موجود ہے اور وہ ناظرین جو اندھر خاندان کی تاریخ کے ماخذوں کی تفصیلات معلوم کرنے کے خواہاں ہیں، ان کو چاہیے کہ اسی مضمون کا مطالعہ کریں-

۲۰ے برگیس: "دی سٹوپاز آف امراوتی اینڈ جگیاپیٹھ" (آرکیالوجیکل سروے آف سدرن انڈیا صفحہ 3)- اس میں ولسن کے "مکنزی مینوسکرپٹس" جلد اول دیباچہ صفحہ 117 اور کیمپبیل کی "تیلگو گرامر" دیباچہ صفحہ 2 کا حوالہ دیا ہے- قدیم دارالسلطنت (شمال عرض بلد 20^{0}- 28' مشرق طول بلد 75^{0}- 55' کی جائے وقوع دریا برد ہو گئی ہے- (دیکھو ری: پروسیڈنگس گورنمنٹ آف مدراس- پبلک نمبر 423- مورخہ 18 جون 1892ء)

۲۱ے "اور یہاں بھی بادشاہ کی سلطنت میں یون اور کمبوج اقوام میں بھرج اور پٹینکس اور اندھرا در پلند اقوام میں ہر جگہ لوگ اس قانون فرائض کی پابندی کرتے ہیں جس کا اعلان خود بادشاہ کی طرف سے ہوا ہے-" (سنگی فرمان نمبر 12)

۲۲ے کلنگ کے جین راجا کھار یویلا کا کتبہ جو ادیاگیری یا ہاتھی گمپا کے مقام پر پایا گیا ہے بہت کچھ معرض بحث میں رہا ہے- اور ماہرین آثار قدیم غلطی سے یہ سمجھتے تھے کہ اس پر موریا خاندان کے سنہ کی 165 کی تاریخ کندہ ہے- سب سے آخری اور سب سے زیادہ مستند بیان جو اس خراب شدہ کتبے کا ہے وہ پروفیسر لیوڈرس کا ایک سرسری ترجمہ ہے جو اس نے "اپی گریفیا انڈیکا" جلد 10 ضمیمہ صفحہ 160 میں دیا ہے- اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کھار یویلا ملقب بہ "مہا میگھ واہن" کلنگ کے چیت خاندان کا تیسرا راجا تھا اور چوبیس برس کی عمر میں وہ مہاراجا مقرر ہو[illegible] اس سے قبل نو برس تک ولی عہد (یووا راجہ) رہا- اپنی حکومت کے دوسرے

سال اس نے مغرب کی طرف ایک فوج بھیج کر سات کرنی کا مقابلہ کیا۔ پانچویں سال اس نے ایک ایسے بند کی مرمت کی جو نند راجا کے زمانے میں ایک سو تین سال کے عرصے سے بالکل بے کار پڑا ہوا تھا' راجگری یعنی مگدھ کے راجا کو ستایا' بارہویں سال اس نے اپنے ہاتھیوں کو دریائے گنگا میں پانی پلایا اور مگدھ کے راجا کو مجبور کیا کہ وہ اس کے قدموں پر سر تسلیم خم کرے اور تیرہویں سال اس نے چند ستون قائم کیے۔

راجا نند کے نام کے حوالے سے اس کا سنہ تقریباً صحت کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے۔ میرے نظام سنین کے مطابق نند خاندان کے آخری راجا کی آخری تاریخ 322 ق م ہے۔ اس میں سے اگر ایک سو تین برس منہا کر دیے جائیں تو کھار یویلا کے پانچویں سن جلوس کا سال 219 ق م ہوتا ہے۔ اور 223 اس کی تخت نشینی کا سال' یعنی اشوک کی وفات کے پورے نو برس بعد۔ جس اندھر راجا کا ذکر کیا گیا ہے وہ سری سات کرنی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا جو پران کی فہرست میں تیسرے نمبر پر ہے۔ اس کی ایک شبیہہ ناناگھاٹ کے مقام پر کندہ ہے اگرچہ مٹی ہوئی ہے۔ ناناگھاٹ ایک درہ ہے جس میں سے کونکن کے علاقے سے ضلع پونا کے قریب قدیم شہر جُنار کو راستہ جاتا ہے۔ (آرکیالوجیکل سروے آف ویسٹرن انڈیا جلد 5 صفحہ 50)

سات کرنی اول اور کھار یویلا کے ہم عصر ہونے سے یہ بات بالکل صریح طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اندھر خاندان کنو خاندان کے آخری بادشاہ کی موت کے بعد فوراً شروع نہیں ہو سکتا۔ سات کرنی اول کا جو سنہ بتایا جاتا ہے وہ ناناگھاٹ کے کتبے کے بالکل مطابق ہے' اور اس میں اندھر راجاؤں میں سے پہلے اور دوسرے راجا یعنی سمک اور کرشنا کے متعلق بھی ایسی ہی معلومات پائی جاتی ہیں۔ (لیوڈرس۔ ایضاً نمبر 1113۔ 1114۔ 1144) مگدھ کا وہ بادشاہ جس کو کھار یویلا نے شکست دی موریا خاندان کے آخری تاجداروں میں سے تھا۔ اور غالباً اس کا نام سالی سُوک تھا (تقریباً 223 تا 211 ق م) اور یہ واقعہ 212 ق م یا اس کے قریب کا ہے۔

۲۳ "ارلی ہسٹری آف دی دکن" دوسرے ایڈیشن بمبئی گزٹیئر (1896ء) جلد اول حصہ دوم صفحہ 171۔

۲۴ بیوہلر نے بہت مدت قبل ہی چشتن اور ہندی سیتھی بادشاہوں کے درمیانی تعلقات کو سمجھ لیا تھا۔ دیکھو انڈین انٹی کویری 1913ء صفحہ 189 پر اس کے ایک پرانے مضمون متعلق ہندی کتبات وغیرہ کا ترجمہ۔ گرنار کے کتبے میں جھیل کے بند کے ٹوٹنے کا 150ء میں ذکر ہے۔ مگر یہ واقعے کے چند سال بعد کندہ کیا گیا ہوگا۔ (ایضاً صفحہ 190)

۲۵ پروفیسر بھنڈارکر کا یہ خیال کہ اندھر خاندان کی دو شاخیں تھیں' ایک مغربی اور ایک مشرقی' قابل تسلیم نہیں۔ شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکثر بادشاہوں کے ہاتھ میں مغربی اور مشرقی

۷۶؎ "کیٹلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم" جلد اول صفحہ 209۔ ریپسن: کیٹلاگ آف کائنز آف دی اندھرا ڈائناسٹیز (1908ء) صفحہ 33-30 پروفیسر ریپسن کے خیال میں یہ سکہ اور زیادہ پرانا ہے۔

۷۷؎ فہرست کے لیے دیکھو ضمیمہ ر۔

۷۸؎ ڈاکٹر فلیٹ (جے۔ آر۔ اے۔ 1912ء صفحہ 792) لکھتا ہے کہ یہ عبارت گارگی سمہتا کے ایک باب یوگ پران سے لی گئی ہے اور اس نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ 'جیسا کہ کرن کا مدت ہوئی خیال تھا' وہ 50 ق م جیسی قدیم ہرگز نہیں ہو سکتی۔ یہ عالم و فاضل نقاد میکس ملر کے خیالات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور پھر مجھ پر الزام رکھتا ہے کہ میں نے اس کتاب کو استعمال کیا جو اس کے خیال میں "بہت زمانے بعد" کی ہے اور "بالکل بے کار ہے۔" مگر اس نے میکس ملر کے اس خیال کی تردید میں کوئی دلیل پیش نہیں کی کہ یہ کتاب تیسری صدی عیسوی کی ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یوگ پران میں بھی اور پرانوں کی طرح بہت سی ایسی باتیں ہیں جو یا بالکل مہمل ہیں یا غلط ہیں اور متن کتاب میں بھی غالباً خرابی ہے' مثلاً کسم پور کو غلطی سے کسم دھواج لکھ دیا ہے۔ مگر ایسی غلطیوں سے تمام کتاب خراب قرار نہیں دی جا سکتی۔ اس میں سالسوک کا نام بالکل صحیح لکھا ہے جس نے وایو پران کے قدیم نسخے کے بموجب 13 سال حکومت کی۔ مجھے کم از کم کوئی وجہ اس امر کے انکار کی معلوم نہیں ہوتی کہ یوگ پران تیسری صدی عیسوی کی کتاب ہے۔ بہر حال موجودہ نسخے کی تاریخ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو' یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ مصنف نے مشہور یونانیوں کے متعلق روایت اپنے دل سے گھڑ لی ہو۔ یوں پیشوا کا نام متن کتاب کے خراب ہو جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضائع ہو گیا ہے۔ منندر کے سنہ کے متعلق میں نے بجائے گارڈنر' جس پر فلیٹ کو بھروسہ نہیں' کے کننگھم کی پیروی کی ہے۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اس امر کے باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں یوگ پران کی عبارت کا تعلق دراصل منندر سے ہے اور اسی طرح نظام سنین بھی درست ہے۔ مگر مسٹر بھنڈارکر کا یہ خیال ہے کہ یہ حملہ آور ڈیمیٹرئس بھی ہو سکتا ہے' میرے نزدیک قابل تسلیم نہیں۔

۷۹؎ "کیٹلاگ آف کائنز ان دی انڈین میوزیم" جلد اول صفحہ 195۔ اس کتاب میں ہگان اور ہگان ماش کی سنین کچھ زیادہ قدیم دیے ہیں۔

۸۰؎ بیلیکورس جس کو بطلیموس نے ہپوکورا پر حکمران بتلایا ہے' غالباً اندھر راجا نمبر 23 تھا جس نے کشہرات کی سلطنت کو 126ء میں فتح کیا۔ ممکن ہے کہ ہپوکورا سے مراد "ناسک" ہو۔

نواں باب

ہندی یونانی، اور ہندی پارتھی خاندان

250ق م تا60ء

کوہ ہندوکش سلطنت موریا کی سرحد تھی

اندرون ملک کے خاندانوں کی تاریخ سے تھوڑی دیر کے لیے ہم کو قطع نظر کر کے ان مختلف بیرونی خاندانوں کا معائنہ کرنا چاہیے جو ان ہندی علاقوں میں موریا خاندان کے زوال کے وقت (جبکہ شمال مغربی سرحد بیرونی حملوں کے لیے بالکل کھل گئی) قائم اور مستحکم ہوگئے جن کو کہ کسی زمانے میں سکندر نے فتح کیا تھا۔ سکندر اعظم کے دلیرانہ اور تباہ کن حملے کا اثر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں وہ نہیں ہوا تھا جس کی کہ اس سے توقع تھی۔ وہ ہندی صوبے جو اس نے فتح کیے تھے اور جن کو سائلوکس اپنے قابو میں نہ رکھ سکا بالآخر چندر اگپتا کہ پنجہ آہنی میں آگئے اور وہ ورا ثتاً اس کے بیٹے اور پوتے کے ہاتھ میں منتقل ہوگئے۔ مجھے اس امر میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ دریائے سندھ کے مغربی علاقے، جو سائلوکس نے اپنے ہندی حریف کے حوالے کیے تھے، موخرالذکر کے جانشینوں کے ہی ہاتھ میں رہے اور کوہستان ہندوکش راجا اشوک کی حکومت کے خاتمے تک موریا سلطنت کی سرحد بنا رہا۔

اشوک کی موت کے نتائج

لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اشوک کی موت کے بعد اس سلطنت میں اتحاد اور یگانگی باقی نہیں رہی اور جونہی اس کی زبردست شخصیت کا اثر اٹھ گیا سلطنت کے دور افتادہ صوبوں نے اطاعت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا اور خود مختار سلطنتیں قائم کر لیں، جن میں سے کہ بعض کی تاریخ باب

گزشتہ میں بیان کی جا چکی ہیں۔ جب اندرون ملک کوئی زبردست دیسی طاقت ایسی نہ رہی جو شمال مغربی سرحد کی نگہبانی کر سکتی تو باختر اور پارتھیا کے یونانی بادشاہوں نے اس کی طرف لالچ کی نگاہوں سے دیکھا۔ اُن کے علاوہ جنگجو سرحدی قبائل کی بھی آتش حرص و آز مشتعل ہو گئی اور متواتر حملہ آوروں نے اسے کھنگال ڈالا۔ جہاں تک کہ ہم کو نامکمل مواد جو ہمارے پاس ہے اجازت دے گا' اس باب میں یہ کوشش کی جائے گی کہ پنجاب اور ماورائے سندھ کے صوبوں کی تاریخ کے وہ موٹے موٹے واقعات مختصراً بیان کر دیئے جائیں جو وہاں پر اشوک کی حکومت کے اختتام سے لے کر ہندی سیتھی یا کشان طاقت کے قائم ہونے تک ہوئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سنین واقعات سب کے سب غیر یقینی ہیں۔

261ق م' انٹی اوکس تھیوس

وہ وسیع اور فراخ ایشیائی سلطنت جس کو سائلوکس نیکیٹر نے اپنی طباعی سے پیدا کیا اور استحکام دیا' 262ق م یا 261ق م میں اس کے پوتے انٹی اوکس کے ہاتھ میں آئی جو ایک بدمست اور بدمعاش بادشاہ تھا اور جس کو اس کی زندگی کے دوران ہی میں اس کے خصائل کے خلاف تھیوس یعنی "خدا" کا لقب دیا گیا تھا اور اس کی رعایا اس کی پرستش بھی کرتی تھی[1]۔ یہ نکما اور بیکار بادشاہ پندرہ یا سولہ برس تک تخت پر متمکن رہا۔ لیکن اس کی حکومت کے آخری حصے میں اس کی سلطنت کو دو بڑے سخت نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ ایک تو ڈیوڈوٹس کی سرکردگی میں باختر کی بغاوت اور دوسرے اشکان کی ماتحتی میں پارتھی قوم کی سرکشی۔

باختر

باختر کے صوبے کا نقصان نہایت سخت تھا۔ یہ صوبہ وہ زرخیز اور شاداب علاقہ ہے جس کو دریائے سیحون (آمو دریا) پہاڑوں سے نکلنے کے بعد سیراب کرتا ہے اور جس میں قدیم ترین زمانے سے ہمیشہ مہذب اقوام آباد رہی تھیں۔ اس علاقے کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس میں ایک ہزار شہر آباد تھے۔[2] اور شہنشاہان کیانی کے زمانے میں اس کو ایک اتنا بڑا صوبہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ صرف شہزادوں کی مخصوص جاگیر میں تھا۔ جب سکندر نے ایرانی سلطنت کو پاش پاش کر دیا اور شہنشاہی تخت پر خود متمکن ہوا تو اس نے بھی باختر کے باشندوں کے لیے تمام مخصوص مراعات جاری رکھیں اور ان لوگوں نے بھی بہت جلد یونانی تہذیب کے اثرات کو قبول کر لیا۔ اس کی موت کے دو سال بعد 321ق م میں اس کی سلطنت کے آخری دفعہ حصے بخرے ہوئے تو باختر کا علاقہ سائلوکس نیکیٹر کے حصے میں آیا اور اس کے بیٹے اور پوتے کی حکومتوں کے زمانے میں بہت قیمتی

اور بیش بہاء علاقہ سلطنت شمار ہوتا رہا۔

پارتھی قوم

پارتھی قوم ایک وحشی اور جفاکش شہسواروں کی قوم تھی جن کے اوضاع واطوار زیادہ تر موجودہ ترکمانوں سے ملتے جلتے تھے۔ یہ لوگ ایرانی ریگستانوں کے اُس طرف بحیرۂ خضر کے جنوب مشرق کے مقابلتاً" بے آب وگیاہ علاقوں میں آباد تھے۔ ان کا وطن مع کورسموئی' سگڈوئی اور اردی (خوارزم۔ سمرقند اور ہرات) کے علاقوں کے دارا کے سولہویں صوبے یاستراپی میں شامل تھا' اور تمام مذکورہ اقوام کے لوگ' جو باختر کے لوگوں کی طرح مسلح ہوتے تھے' اردشیر کی فوج کو کمک بہم پہنچایا کرتے تھے۔ [۳] سکندر اور سالوکس کے خاندان کے پہلے افراد کے زمانے میں پارتھیا اور ہرکینیا کے علاقوں کو ایک صوبے میں جمع کر دیا گیا۔ باختر والوں کے برخلاف پارتھی قوم نے یونانی تہذیب وتمدن کو اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اگرچہ اپنے ایرانی اور مقدونوی آقاؤں کے فرماں بردار اور اطاعت پذیر تھے' لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی عادات وخصائل کو نہ بدلا۔ ہمیشہ ان کی حیثیت سوار گلہ بانوں کی سی رہی اور وہ تیروکمان کے استعمال اور گھوڑے کو قابو میں رکھنے میں پورے طور پر مشاق تھے۔ [۴]

تقریباً 250ق م' باختر اور پارتھیا کی بغاوت کا سنہ

یہ دونوں قومیں اپنے طبائع اور تاریخ کے لحاظ سے ایک دوسری سے ایک حد تک متغائر تھیں۔ یعنی باختر ایک آباد اور معمور ملک تھا اور اس میں ایک ہزار شہر تھے۔ اس کے برخلاف پارتھیا کے لوگ اب تک خانہ بدوش تھے اور ہزاروں کی تعداد میں آوارہ پھرتے تھے۔ وہ تقریباً ایک ہی وقت میں تیسری صدی قبل مسیح کے وسط میں جو کہ نیسن اور سالوکس کے خاندان کے طوق غلامی اتار پھینکنے اور خودمختاری حاصل کرنے پر آمادہ ہوئیں۔ ان بغاوتوں کی اصلی اور صحیح تاریخ تو نہیں معلوم ہو سکتی مگر بظاہر باختر کی بغاوت ان دونوں میں پہلے واقع ہوئی۔ اور اس امر کے باور کرنے کی بھی وجوہ موجود ہیں کہ پارتھیا کی بغاوت سالہا سال تک جاری رہی اور 246ق م میں انٹی اوکس تھیوس کی موت کے کہیں بعد جاکر ختم ہوئی' اگرچہ پارتھیا کی خودمختاری کا اعلان معلوم ہوتا ہے کہ 248ق م میں ہو گیا تھا۔ [۵]

ڈیوڈوٹس اول

باختر کی بغاوت معمولی ایشیائی قسم کی بغاوت تھی۔ اس کی سرکردگی ڈیوڈوٹس حاکم صوبہ نے

کی جس نے موقع تاک کر اپنے بادشاہ اور آقا سے انحراف کیا اور خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ اس کے برعکس پارتھیا کی بغاوت قومی تھی۔ اس کا سرغنہ ایک شخص اشکان نامی تھا جس کے آباواجداد کے متعلق شک ہے۔ مگر اس کی بہادری اور دلاوری کی بابت کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ یہ شخص تاخت و تاراج کا عادی تھا۔ اشکان نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور اس طرح اشکانی خاندان کی بنیاد ڈالی جو تقریباً پانچ صدی تک برابر قائم رہا (248 ق م سے 226 عیسوی) باختر اور پارتھیا کے باغیوں کو کامیابی میں اس وجہ سے اور زیادہ سہولت ہوئی کہ انٹی اوکس تھیوس کی موت کے بعد سائلوکس کی تخت کے متعلق مختلف دعویداروں میں تنازعہ ہوا اور لڑائی ٹھن گئی۔

تقریباً 245 ق م' ڈیوڈوٹس ثانی

باختری بادشاہوں کے اس خاندان کی مدت جس کا بانی ڈیوڈوٹس تھا بمقابلہ اشکانی خاندان کے مختصر اور پُر از فتنہ وفساد تھی۔ خود ڈیوڈوٹس اپنے جدید تاج کو چند ہی روز زیب سر کر سکا۔ وہ بہت تھوڑے دن زندہ رہا اور چند سال بعد ہی (245 ق م) اس کا بیٹا ڈیوڈوٹس ثانی اس کا جانشین ہوا جس نے پارتھیا کے بادشاہ کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا۔[6]

تقریباً 230 ق م' یوتھی ڈیمس اور انٹی اوکس اعظم:

ڈیوڈوٹس کے بعد (تقریباً 230 ق م) یوتھی ڈیمس بادشاہ ہوا جو میگنیشیا کے علاقے کا رہنے والا تھا اور بادی النظر میں بالکل مختلف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی بغاوت کے ذریعے سے سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس بادشاہ کو شام کے انٹی اوکس اعظم (223-187 ق م) سے ایک طول وطویل جنگ کرنی پڑی۔

تقریباً 208 ق م

یہ جنگ جو آخر جا کر (تقریباً 208 ق م) ایک معاہدے پر ختم ہوئی جس کی رو سے باختر کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا گیا۔

تقریباً 206 ق م

اس کے تھوڑی ہی مدت بعد (206 ق م) انٹی اوکس نے کوہستان ہندوکش کو عبور کیا اور ایک ہندی راجا سبھاگ سین کو جو دریائے کابل کی وادی میں حکمراں تھا مجبور کیا کہ وہ حملہ آور کو بہت سے ہاتھی اور بڑا خزانہ نذر میں دے سائزیکس کے انڈر اسٹنیز کو وہاں سے اس

تاوان جنگ کے وصول کرنے کے لیے چھوڑ کر انٹی اوکس اعظم بذات خود فوج لے کر اراکوسیہ اور ڈرنگینیا سے کرمانیہ چلا گیا۔[7]

تقریباً 190 ق م' دیمیتریئس ہندیوں کا بادشاہ

یوتھی ڈمس کے بیٹے اور انٹی اوکس کے داماد دیمیتریئس نے جس سے کہ انٹی اوکس نے باختر کی خود مختاری تسلیم کرنے کے بعد اپنی بیٹی بیاہ دی تھی' اپنے خسر کے کارناموں کی اور بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ نقل اتاری اور شمالی ہند کے ایک بڑے حصے کو فتح کر لیا جس میں غالباً کابل' پنجاب اور سندھ کے علاقے شامل تھے۔[8] (تقریباً 190 ق م)۔

تقریباً 175 ق م' یوکرے ٹائیڈز

دیمیتریئس کی دور دراز کی ہندی جنگوں نے اس کا اثر باختر پر کم کر دیا' جس سے ایک شخص یوکرے ٹائیڈز کو بغاوت کا موقعہ ملا اور وہ 175 ق م میں باختر کا مالک بن بیٹھا۔ مگر وہ فوراً ہی اطراف کی سلطنتوں اور اقوام کے ساتھ جنگ میں مبتلا ہو گیا' جس کو اس نے نہایت تندہی مگر مختلف مصائب کے ساتھ جاری رکھا۔ دیمیتریئس نے اگرچہ باختر کھو دیا تھا' مگر مشرقی صوبوں پر اس کا قبضہ ایک مدت تک قائم رہا اور وہ "شاہ ہندیاں" کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن سخت اور تند کشمکش کے بعد بالا خر میدان یوکرے ٹائیڈز کے ہاتھ رہا۔ وہ ایسا حریف تھا جس کو شکست دینا مشکل امر تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "اس نے ہندوستان کو اپنے زیر نگین کر لیا تھا۔" بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ پانچ مہینے تک صرف تین سو آدمیوں کے ساتھ ایک قلعے میں محصور رہا۔ مگر پھر بھی اس نے دیمیتریئس کے ساٹھ ہزار آدمیوں کو شکست دے دی۔[9]

تقریباً 156 ق م

لیکن یہ کامیابی جو اس قدر جان کاہی سے حاصل کی گئی تھی پائیدار نہ تھی۔ جب یوکرے ٹائیڈز اپنے بیٹے غالباً اپالوڈوٹس کے ساتھ' جس کو اس نے اپنا مالک حکومت کر لیا تھا' ہندوستان سے اپنے وطن کو واپس جا رہا تھا تو اس ناخلف بیٹے نے نہایت بے رحمی سے اپنے باپ کو قتل کرا دیا اور اس جرم پر فخر کیا' باپ کے خون میں سے اپنی رتھ کو چلایا اور اس کی لاش کو دفن بھی نہ ہونے دیا۔[10]

ہیلیو کلیز وغیرہ

یوکرے ٹائیڈز کی موت نے اس سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے، جس کے حصول کے لیے اس نے اس قدر جدوجہد کی تھی۔ اس کا ایک اور بیٹا ہیلیو کلیز نامی جس نے "عادل" کا لقب غالباً اپنے باپ کا قصاص لینے کی وجہ سے اختیار کیا، چند روز باختر کے متزلزل تخت پر بیٹھا۔ سٹریٹو اول، جس کا تعلق بھی بظاہر یوکرے ٹائیڈز کے خاندان سے سالہاسال تک رہا، پنجاب کے ایک علاقے پر قابض رہا اور وہ غالباً اپالوڈوٹس کا جانشین تھا۔ اگتھو کلیز اور پنٹیلیون، جن کے سکے مخصوص طور پر ہندی طرز کے ہیں، اس سے قبل گزرے تھے اور یوتھی ڈیمس اور دیمیتریئس کے ہمعصر تھے۔ سکوں کی عبارت کے شاہی ناموں کی کثرت سے (جن کی تعداد کم و بیش سو ہے) یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یوکرے ٹائیڈز کی موت سے پہلے اور اس کے بعد ہندوستان کا سرحدی صوبہ چھوٹے چھوٹے یونانی رجواڑوں میں منقسم تھا جو زیادہ تر یا تو یوتھی ڈیمس اور دیمیتریئس کے یا ان کے حریف یوکرے ٹائیڈز کے کفو تھے۔ ان رجواڑوں میں سے بعض کو جن میں انٹی ال کڈس شامل تھا، یوکرے ٹائیڈز نے اپنے زیر نگین کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو ایک زبردست سرحدی سلطنت قائم کر لیتا۔ مگر عین فتح و نصرت کے موقع پر اس کی موت نے فتنہ و فساد میں اور زیادتی کر دی۔ اب یہ بالکل ناممکن ہے کہ علاقوں اور سنین کے لحاظ سے ان ہندی یونانی سرحدی سرداروں کا جو یوکرے ٹائیڈز کے ہمعصر یا اس کے بعد ہوئے کوئی نظام یا جدول تیار کیا جا سکے۔ ان کے نام سوائے دو کے، سب کے سب سکوں ہی کے ذریعے سے معلوم ہوئے ہیں اور اس باب کے آخر میں ایک فہرست بنا کے درج کر دیئے گئے ہیں۔

تقریباً 155 ق م، منندر کا ہندوستان پر حملہ

ان بے نام و نشان یونانی سرداروں کی فہرست میں سب سے زیادہ نمایاں نام منندر کا ہے۔ اس کا تعلق یوکرے ٹائیڈز سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کا دارالسلطنت کابل تھا۔ یہیں سے تقریباً 155 ق م میں وہ ہندوستان پر اس دلیرانہ حملے کے ارادے سے نکلا جس کا ذکر باب گزشتہ میں کیا جا چکا ہے۔ دو برس بعد وہ واپس آنے پر مجبور ہوا اور اپنی طاقت کو ان خطرات کے مقابلے کے لیے صرف کر دیا جو خود اس کے وطن میں اس کو گھیرے ہوئے تھے اور جن کی وجہ اس کے اپنے ہمسائیوں سے تنازعات تھے۔

منندر کی شہرت

منندر ایک نہایت عادل حکمراں مشہور تھا۔ جب وہ مرا تو اس کا جنازہ نہایت دھوم دھام سے اٹھایا گیا۔ اس کے متعلق فرض کیا جاتا ہے کہ وہ بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ ایک مشہور و معروف مکالمے سے' جس کا نام "سوالات ملندا" ہے اور بدھ مذہب کی مشہور کتابوں میں سے ہے' اس کا نام ابد تک روشن ہو گیا ہے۔[11]

باختر کا آخری یونانی بادشاہ

یوکرے ٹائیڈز کا بیٹا ہیلیو کلیز جس نے باختر کے علاقے پر اپنے باپ کے متروکے کی حیثیت سے قبضہ کر لیا تھا' آخری یونانی الاصل بادشاہ تھا جس نے کوہستان ہندوکش کے شمال میں حکومت کی۔ عین اس وقت جب کہ یونانی بادشاہ اور سردار آپس میں ان گمنام لڑائیوں میں مشغول تھے' جن کی تاریخ بھی نامعلوم ہے' ایک زبردست طوفان کا مواد وسط ایشیاء میں جمع ہو رہا تھا جس نے بالآخر ان کو بالکل معدوم کر دیا۔

یُوچی قوم کا سک قوم کو نکال باہر کرنا

یُوچی ایک خانہ بدوش قوم کا نام ہے جس کی نقل و حرکت کا ذکر آئندہ باب میں زیادہ تفصیل سے آئے گا۔ وہ 170 ق م میں شمال مغربی چین سے نکالے گئے اور ان کو مجبوراً مغرب کی طرف صحرا کے شمال میں نقل مکان کرنا پڑا۔[12] تھوڑی مدت بعد 160 ق م میں ان کی مڈبھیڑ ایک اور خانہ بدوش قبیلے سے ہوئی جس کا نام سک یا سے تھا اور (جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے) دریائے جیحون (آمو دریا) کے شمالی علاقوں میں آباد تھا۔

باختر پر خانہ بدوش قبیلوں کا حملہ

سک قوم مع اپنے ہم نسل قبائل کے جنوب کی طرف ہٹنے پر مجبور ہوئی اور بالآخر شمال کی طرف سے غالباً ایک سے زیادہ راستوں سے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ ان خانہ بدوش قبائل کے حملے کا سیلاب مغرب میں بھی پھیلا اور 140 و 120 ق م کے درمیانی عرصے میں پارتھیا اور باختر پر ایک دم ٹوٹ پڑا۔ پارتھی بادشاہ فراتیز ثانی جو متھرا ڈیٹس کا جانشین تھا ان خانہ بدوشوں سے لڑتا ہوا 127 ق م میں مارا گیا اور اس کے چار سال بعد یہی حشر ارتابانس اول کا ہوا جو اس کے بعد تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے بعد یونانی سلطنت جو غالباً اس سے قبل ہی پارتھی یا ایرانی طاقت کے عروج

پکڑنے کی وجہ سے بہت کچھ کمزور ہو چکی تھی' اب بالکل معدوم ہو گئی۔ آخری یونانی باختری بادشاہ ہیلیو کلیز تھا اور اس کے بعد ہندوکش کے شمالی علاقے سے یونانی سلطنت ہمیشہ کے لیے کالعدم ہو گئی۔

سک قوم کا سیستان وغیرہ پر قبضہ

دریائے ہلمند (ارمینڈس) کی وادی پر' جس کو آج کل سیستان کہتے ہیں اور سکستینے یعنی "ملک سک" کے نام سے مشہور تھا' بہت عرصہ قبل ہی سک قوم نے قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح کے نقل مکان کرنے والوں کی لہر ہی اس صوبے تک پہنچی ہو۔ [۱۳]

اس وحشی قوم کی شاخ نے جو دروں کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئی پنجاب میں ٹیکسلا کے مقام پر اور دریائے جمنا کے کنارے متھرا میں اپنی بستیاں بسائیں اور یہیں غیر ملکی بادشاہ کے سترپ کے لقب سے ایک صدی سے زیادہ عرصے تک ظاہرا طور پر پارتھی طاقت کے ماتحت حکمراں رہی۔

اس وقت کے کچھ بعد اسی قبیلے کا ایک حصہ پہلی صدی عیسوی کے درمیان میں جنوب کی طرف بڑھا اور سراشٹر یا کاٹھیاواڑ کے جزیرہ نما پر قابض ہو گیا۔ یہاں اس نے ایک سک خاندان کی بنیاد ڈالی جو تقریباً 390ء تک قائم رہا اور آخر کار چندر گپت ثانی بکرماجیت نے اسے برباد کیا۔

ٹیکسلا اور متھرا کے سترپ

سٹریٹو اول سوٹر کابل اور پنجاب کا ایک یونانی بادشاہ تھا اور ایک حد تک ہیلیو کلیز کا ہمعصر بھی تھا۔ اس کا پوتا سٹریٹو ثانی فلوپیٹر اس کا جانشین ہوا جس کو بظاہر ٹیکسلا کے مقام پر چند غیر ملکی سترپوں نے' جو ممکن ہے کہ سک ہوں یا نہ ہوں' بے دخل کر دیا۔ متھرا کے سترپوں کا ٹیکسلا کے سترپوں سے نہایت قریبی تعلق تھا اور دونوں تھے بھی ایک دوسرے کے ہمعصر یعنی 50 ق م یا اس کے لگ بھگ۔ [۱۴] ان کے نام ایرانی معلوم ہوتے ہیں۔

پارتھیا سے تعلقات

سک اور قبائل متعلقہ کی نقل و حرکت بہت بڑی حد تک ایران کے اشکانی خاندان کی ترقی و عروج کے ساتھ وابستہ ہے۔ متھراڈیٹس اول (تقریباً 136-171 ق م) ایک نہایت لائق بادشاہ تھا اور کچھ عرصے تک یوکریے ٹائیڈز کا ہمعصر بھی تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو یہاں تک وسیع کر لیا کہ

اس کی طاقت کا اثر دریائے سندھ اور غالباً اس کے مشرقی کنارے تک محسوس کیا گیا۔ اور روبیئس کے اس صاف و صریح بیان کے متعلق کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی کہ دیمیتریئس کے جنرل کی شکست اور بابل پر قبضہ کرنے کے بعد متھرا ڈیٹس اول نے دریائے سندھ اور دریائے بیاس کے درمیان کی تمام اقوام کے علاقوں کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کر لیا۔ متھرا اور ٹیکسلا کے سردار اگر اپنے آپ کو ایرانی یا پارتھی بادشاہ کے زیر فرمان تصور نہ کرتے تو وہ ہرگز ہرگز ستر پ کا خالص ایرانی خطاب اختیار نہ کرتے۔ اس کے علاوہ اس وقت پارتھی سلطنت اور ہندی سرحد کے قریبی تعلقات کا پتہ اس بات سے ملتا ہے کہ اب اسی زمانے میں پارتھی نسل کے بادشاہوں کا ایک طولانی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ [۱۵]

میوس

بظاہر ان ہندی پارتھی بادشاہوں میں سے سب سے پہلا میوس تھا' جو غالباً 120 ق م میں پنجاب کا مالک بنا اور شہنشاہ اعظم کا لقب اختیار کیا جو اس سے قبل سب سے پہلے متھرا ڈیٹس اول یا ثانی نے اختیار کیا تھا۔ اس کے سکے بہت کچھ ان بادشاہوں کے سکوں کے مشابہ ہیں۔ یہ سکے اس پارتھی سرحدی سردار کے سکوں سے بھی ملتے جلتے ہیں جو اپنے آپ کو ارسیکز تھیوس کہتا ہے۔ بادشاہ موگ جس کا ماتحت ٹیکسلا کا ستر پ تھا بالعموم ایک شخص کے ساتھ ملایا جاتا ہے جس کا نام سکوں میں مضاف الیہ کی صورت میں لکھا ہوا ہے۔ [۱۶]

ہندی پارتھی بادشاہ

ہندی پارتھی خاندانوں کی تاریخ کا تعلق کیونکہ سلطنت پارتھیا کی حکومت اعلیٰ سے ہے۔ ہم ہندی پارتھی بادشاہوں کے تمام دنیا کے ساتھ تعلقات کو تبھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جب کہ پارتھیا کی تاریخ کا علم ہم کو اس سے زیادہ ہو جتنا کہ اس وقت ہے یا کبھی ہو سکتا ہے۔ ہندی پارتھی تاریخ کے لکھنے اور مرتب کرنے کے لیے مواد' جس میں زیادہ سکوں ہی کے حوالے سے نتائج نکالے گئے ہیں' ہمارے پاس اس قدر کم ہے کہ ناقابل تردید واقعات کا ایسا سلسلہ قائم کر کے قلمبند کرنا ناممکن ہے اور اسی لیے تمام تحقیقات کے نتائج ایک بڑی حد تک محض خیالی اور قیاسی ہوں گے۔ ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مذکورہ ذیل سطور میں میں نے اپنے خیال کے مطابق تمام واقعات کو خواہ وہ یقینی ہوں یا قیاسی' جیسا کہ اس مسئلے کی ایک خاص تحقیقات کے بعد میں سمجھا' قلمبند کر دیا ہے اور ناظر کتاب کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو سنین بیان ہوں گے ان سب کے سب میں تصحیح کی گنجائش ہے۔

دو خاندان

یہ مسئلہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ تاریک ہو گیا کہ مصنفین نے اس صریح اور بین بات کو اپنے دھیان میں نہیں رکھا کہ چند ماتحت ستریوں کے علاوہ ہندی پارتھی بادشاہوں کے دو بڑے خاندان تھے۔ ان میں سے ایک اراکوسیہ اور سیستان میں حکمران تھا اور دوسرا مغربی پنجاب یا ٹیکسلا کی سلطنت پر حکومت کرتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا' میوس غالباً 120ق م میں موخر الذکر صوبے کا بادشاہ ہوا جس کو متھر اڈیٹس اول نے 138ق م کے قریب پارتھیا کی سلطنت سے ملحق کر لیا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ نو مفتوحہ صوبے کا انتظام صرف چند ہی سال تک اصطخر کی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رہا۔ خانہ بدوش اقوام کے ساتھ جنگ جس میں 130ق م اور 120ق م کے بین بین فرائیس ثانی اور ارتابانس نے اپنی جانیں کھوئیں۔ اس وجہ سے مرکزی حکومت کا آہنی پنجہ ہندوستانی سرحد کے صوبے کی طرح دور افتادہ علاقوں پر ڈھیلا پڑ گیا ہو گا۔ اور یہ بہت اغلب ہے کہ میوس نے جو ممکن ہے کہ سک قوم کا ہو اس اتفاقیہ موقع سے فائدہ اٹھایا اور پنجاب پر قابض ہو گیا ہو جہاں وہ اگر حقیقی طور نہیں تو کم از کم عملی طور پر خود مختار تھا۔

دونونیس وغیرہ اراکوسیہ میں

اسی وقت یا اس کے چند سال بعد دونونیس نام کا ایک پارتھی' غالباً اصطخر کے ایرانی شہنشاہ کی ماتحتی میں' اراکوسیہ اور سیستان کا بادشاہ ہو گیا۔ ان علاقوں پر وہ اور اس کے جانشین ایک تھوڑے عرصے تک (یعنی تقریباً پچیس برس تک) حکمران رہے۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ ازلیس تھا جو اپنے باپ اور دونونیس کے بھائی سپل رسیس کا نائب السلطنت یا شریک حکومت تھا۔

ازلیس اول ازلیلیس اور ازلیس ثانی

پارتھی طاقت جس کو خانہ بدوش اقوام کے حملوں سے بہت کچھ نقصان پہنچا تھا آخر کار متھر اڈیٹس (ثانی) اعظم (تقریباً تخت نشینی 123ق م) کے زمانے میں پھر سنبھلی اور اس کی پرانی طاقت عود کر آئی۔ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طاقتور بادشاہ نے ان صوبوں کا انتظام جن پر دونونیس اور اس کا خاندان حکمراں تھا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے علاوہ پنجاب کے اور بھی زیادہ دور دست صوبے پر بھی اپنا شہنشاہی حق پھر نئے سرے سے قائم کیا۔ اب ازلیس جو سیستان اور اراکوسیہ کا نائب السلطنت تھا تبدیل کر دیا گیا جہاں وہ تقریباً 90ق م میں میوس کا جانشین ہوا اور اس صوبے پر متھر اڈیٹس کے ماتحت بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ پنجاب

کے تخت پر ازیس کا جانشین پہلے اس کا بیٹا ازیلیسیس اور اس کے بعد اس کا پوتا ازیس ثانی ہوا۔ یہ یقینی ہے کہ ازیس اول ایک طاقتور بادشاہ تھا اور ایک بڑی مدت تک حکمراں رہا جس کا زمانہ غالبًا پچاس سال کا تھا۔ یہ معلوم ہے کہ سنہ عیسوی کے شروع کے وقت ہندوستان کا کوئی قطعہ پارتھی سلطنت میں شامل نہ تھا اور یہ امر کچھ بعید از قیاس نہیں کہ ازیس اول نے طولانی حکومت کے دوران میں اپنے آپ کو بالکل خود مختار بنالیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ازیلیسیس اور ازیس ثانی نے بھی بہت عرصے تک حکومت کی تھی۔ موخرالذکر کے عہد حکومت میں سترپ اسپ ورم اور سترپ زیونیسیس پنجاب پر حکومت کرنے میں اپنے آقا اور بادشاہ کو مدد دیتے تھے۔

گنڈوفریس کی حکومت

تقریباً 20ء میں ازیس ثانی کا جانشین گنڈوفریس ہوا، جس نے معلوم ہوتا ہے کہ اراکوسیہ کا اور سندھ کا ایک بڑا علاقہ فتح کرلیا تھا اور پارتھی نگرانی سے بالکل آزاد ہو کر ایک بڑی وسیع سلطنت کا مالک بن گیا تھا۔ 60ء میں جب وہ مرگیا تو اس کی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ مغربی پنجاب کا علاقہ تو اس کے بھائی کے بیٹے ابدگسیس کو ملا اور اراکوسیہ اور سندھ آرتھگنیس کے پاس منتقل ہوگئے۔ پہلی صدی عیسوی کے درمیان میں پنجاب پر کشان بادشاہ ہمایادما (کڈ فائسس ثانی) نے قبضہ کرلیا اور اغلب یہ ہے کہ اراکوسیہ اور سندھ کا بھی وہی حشر ہوا جو پنجاب کا ہوا تھا۔ [12]

پارتھی سردار سندھ کے تکون میں

مگر ممکن ہے کہ چھوٹی چھوٹی پارتھی ریاستیں مزید کچھ عرصے تک دریائے سندھ کے مثلثی قطعے میں قائم رہی ہوں۔ "پری پلس آف دی اریتھرائن سی" کے مصنف کا، جس نے اپنی کتاب غالبًا پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی تھی، بیان ہے کہ دریائے سندھ کے زیریں حصے کی وادی جس کو وہ سیتھیا کہتا ہے، پارتھی سرداروں کے زیر نگین تھی جو متواتر خاندانی جنگوں میں مبتلا رہتے تھے۔ اس زمانے میں دریائے سندھ کے سات دہانے تھے جن میں سے صرف درمیانی دہانہ جہاز رانی کے قابل تھا۔ تجارتی بندرگاہ جس کا نام سیاح نے بربریکان لکھا ہے اسی دریا پر واقع تھا۔ دارالسلطنت منگر اندرون ملک میں واقع تھا۔ سندھ کے علاقے کے دریاؤں میں ان اٹھارہ صدیوں کے عرصے میں اس قدر تغیرو تبدل واقع ہوگیا ہے کہ ان شہروں کے اصل موقع محل کا پتہ

گنڈوفریس اور سینٹ ٹامس

ہندی پارتھی بادشاہ گنڈوفریس میں ایک خصوصیت بھی ہے' کیونکہ نہایت قدیم عیسائی روایات کے مطابق اس کا نام پارتھیوں کے رسول (؟) سینٹ ٹامس کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس عقیدے کا آغاز کہ پارتھی قوم کو دعوت حق دینے اور تبلیغ مذہب کا کام بالخصوص سینٹ ٹامس کے سپرد کیا گیا تھا' اوریجن کے نام سے ہوتا ہے جو تیسری صدی عیسوی کے درمیان میں مرا۔ "اعمال ٹامس" جو تقریباً اوریجن کے ہمعصر ہے اور اس کے بعد کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے پارتھیوں کے ولی کو ہندیوں سے تعلق تھا۔ لیکن قدیم زمانے میں "ہند" اور "ہندی" کے الفاظ ایسے مبہم طور پر استعمال ہوتے تھے کہ یہ تضاد کچھ بہت بڑا نہیں معلوم ہوتا۔ صریحاً روایت کی قدیم تر شکل زیادہ قابل قبول ہے اور اس امر میں شک کرنے کی ظاہراً کوئی وجہ نہیں کہ اوریجن کے بیان کے مطابق ٹامس کے حصے میں دعوت حق کے لیے پارتھیا کا علاقہ آیا تھا۔

روایت

وہ روایت جس میں سینٹ ٹامس اور گنڈوفریس کا ایک دوسرے سے تعلق ظاہر کیا گیا ہے پہلے پہل "اعمال سینٹ ٹامس" کے شامی زبان کے نسخے میں' جو اسی وقت مرتب کیا گیا جب کہ اوریجن کی کتابوں کی تہذیب کا ہونا پایا جاتا ہے اس طولانی حکایت کا ملخص حسب ذیل ہے۔

"جب (حضرت عیسیٰؑ کے) بارہ حواریوں نے قرعہ اندازی کے ذریعے سے تمام دنیا کو آپس میں تقسیم کیا تو ہندوستان کا ملک جودس معروف بہ ٹامس کے حصے میں آیا۔ مگر اس نے یہ سفر اختیار کرنے کی رضامندی نہ ظاہر کی۔ اسی زمانے میں ایک ہندی سوداگر ہبان نامی جنوبی ملک میں پہنچا۔ اس کو ہندوستان کے بادشاہ گنڈفر نے یہ کام سپرد کیا تھا کہ وہ ایک ہوشیار اور کاریگر صناع کو اپنے ساتھ لے آئے تاکہ وہ بادشاہ کے لائق محل تیار کر سکے۔ مشرقی سفر سے حواری مذکور کی برداشتہ خاطری دور کرنے کے لیے حضرت عیسیٰؑ بذات خود خواب میں سوداگر کو نظر آئے۔ حواری کو بیس چاندی کے سکوں کے بدلے سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا اور سینٹ ٹامس کو حکم دیا کہ وہ گنڈفر کا کام کرے اور اس کا محل تعمیر کردے۔

"اپنے مولا (حضرت عیسیٰؑ) کے حکم کے مطابق سینٹ ٹامس ہبان سوداگر کے ہمراہ دوسرے دن کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا اور سفر کے دوران میں اپنے ساتھی کو یقین دلایا کہ وہ فن تعمیر اور لکڑی اور پتھر کے ہر قسم کے کام سے پوری طرح واقف ہے۔ باد موافق نے ان کی کشتی کو جلد ہی منزل مقصود تک پہنچایا۔ وہ سندروک کے بندرگاہ میں خشکی میں اترے اور یہاں بادشاہ کی بیٹی کی

شادی کی دعوت میں شریک ہوئے۔ اس دعوت میں انہوں نے اتنا بڑا کام کیا کہ دولہا اور دلہن دونوں نے دین حق (عیسائیت) قبول کر لیا۔ یہاں سے یہ ولی اور سوداگر اپنے بحری سفر پر روانہ ہو گئے اور آخر کار ہندوستان کے بادشاہ گنڈ فر کے دربار میں پہنچے۔ ٹامس نے بادشاہ سے وعدہ کیا کہ وہ چھ مہینے کے عرصے میں اس کا محل تیار کر دے گا۔ لیکن جو رقم اس کام کی انجام دہی کے لیے اس کو دی گئی وہ سب کی سب اس نے خیرات کرنے میں صرف کر دی۔ جب اس سے اس کا حساب مانگا گیا تو اس نے کہا کہ میں بہشت میں تمہارے لیے ایک محل تیار کر رہا ہوں جو آدمی کے ہاتھ سے تعمیر نہیں ہوتا۔ اس کے بعد اس نے اس قدر جوش و خروش کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ کی کہ بادشاہ' اس کا بھائی گڈ اور عوام جوق جوق دین حق (عیسائیت) میں داخل ہوئے۔ مقدس (؟) ولی سے بہت سی خوارق عادات اور کرامات بھی ظہور میں آئیں۔

سینٹ ٹامس کی شہادت

"تھوڑی مدت کے بعد شاہ مزدئی کا سپہ سالار سفور آیا اور ولی سے اس امر کا مدعی ہوا کہ وہ اس کے ساتھ جا کر اس کی بیٹی اور بیوی کو صحت بخشے۔ سینٹ ٹامس نے اس کی دعوت قبول کی اور ایک گاڑی میں سوار ہو کر سفور کے ہمراہ مزدئی کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنے نو آموزوں کی جماعت کو اس نے گنڈ فر کی سلطنت میں اسقف زنتھی پاس کے زیر حفاظت چھوڑا۔ جب مزدئی کی ملکہ ترتیہ اور ایک اور شریف خاتون مگدونیہ نے سینٹ ٹامس کا مذہب اختیار کیا تو بادشاہ سخت غضبناک ہوا' اور اُس کے حکم سے سینٹ ٹامس کو چار سپاہیوں نے شہر سے باہر ایک پہاڑی پر لے جا کر برچھیوں سے قتل کر ڈالا۔ حواری کو قدیم بادشاہوں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ مگر اس کے شاگرد چوری چھپے اس کی لاش کو نکال کر مغرب کی طرف لے گئے۔" [۹۱]

اس روایت کی تنقید

ساتویں صدی عیسوی کے بعد کے مصنفین ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس شہر کا نام بھی بتلا سکتے ہیں جہاں سینٹ ٹامس شہید ہوا۔ وہ اس کا نام کلمیتنا کلمیٹا کلمینا یا کلمینا بتلاتے ہیں اور اس شہر کا اصلی موقع معلوم کرنے کے لیے بہت کچھ بے سود جدوجہد کی گئی ہے۔ لیکن پرانی روایات میں اس شہر کا نام مذکور نہیں اور کلمینا کا شہر محض خیالی چیز ہے جس کا نقشے پر ظاہر کرنا ناممکن ہے۔ بعینہ یہی حال ان کوششوں کا ہے جو اس بندرگاہ کا موقع معلوم کرنے کے متعلق کی گئی ہیں جس کا نام مختلف طور پر سندروک' اندراپولس وغیرہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تمام حکایت محض فرضی مصنوعی قصہ ہے اور اس کا جغرافیہ بھی قصے کی طرح خیالی ہے۔ ہندوستان کے مورخ کے لیے اس حکایت میں صرف

اتنی دلچسپی ہے کہ ایک حقیقی ہندی بادشاہ گنڈوفریس نے اپنی موت کے بعد بھی اپنی شہرت قائم رکھی اور یہ کہ اس کا تعلق رسول کے تبلیغی مشن کے ساتھ جوڑ اگیا جو ہندوستانیوں اور اس طرح بقول اوریجن کے پارتھیوں کی طرف روانہ کیا گیا کیونکہ یہ یقینی امر ہے کہ گنڈوفریس ایک پارتھی بادشاہ تھا اور عام طور پر وہ دنیا میں اتنا معروف نہ تھا کہ عیسائی تبلیغی مشن کے تعلق کے بغیر اس کا نام اس روایت میں لیا جاتا۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ کسی نہ کسی عیسائی مشن نے ضرور ہندی پارتھی بادشاہوں کے ہاں شمال مغربی سرحد پر تبلیغ کا کام انجام دیا ہوگا۔ وہ مشن خواہ سینٹ ٹامس کی سرکردگی میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ اس نظام سنین کی بناء پر جو سکوں اور کتبوں کے ذریعے سے گنڈوفریس کی حکومت کے متعلق اخذ کیا گیا ہے' یہ کہا جاسکتا ہے کہ گنڈوفریس اور سینٹ ٹامس کے ناموں میں روایات جو تعلق کو ظاہر کرتی ہیں اس میں کچھ تضاد نہیں پایا جاتا۔ [20] اس کے برخلاف یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ان علاقوں میں جو گنڈوفریس کے زیر حکومت تھے عیسائیت کا نام ونشان بعد کے زمانے میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ اور اگر واقعی اس روایت میں کسی قسم کی راستی ہے کہ ٹامس کو سینٹ ٹامس کے مقام پر مدراس کے قریب شہید ہوا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ یہ واقعہ مزدئی کی سلطنت میں پیش آسکے۔ [21] بہت کچھ غور و فکر کے بعد اب میرا خیال ہے کہ گنڈوفریس اور مزدئی کی مملکت میں سینٹ ٹامس کی ذاتی تبلیغ کی روایت کو قبول نہ کرنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی جب تک کہ عیسائی مشن جس کا تعلق روایت نے ٹامس کے نام سے کر دیا ہے' ہندی پارتھی سرحد کی طرف نہ بھیجی گئی ہو اس وقت تک یہ خیال کرنا ناممکن ہے کہ گنڈوفریس جیسے گمنام بادشاہ کا نام اس روایت میں آگیا ہوگا۔ اگر کوئی شخص یہ ماننا چاہے کہ سینٹ ٹامس بذات خود ہندی پارتھی سلطنت میں آیا تھا تو اس کے اس یقین کو بے وجہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ جیسا کہ بشپ مڈلی کاٹ نے لکھا ہے یہ ممکن ہے کہ وہ پہلے گنڈوفریس کے پاس گیا ہو اور بعد میں وہاں سے جنوبی ہند ہی میں چلا گیا ہو۔

جنوبی ہند کی طرف سینٹ ٹامس کا مفروضہ مشن

اس رسول کا جنوبی ہند کی طرف تبلیغی مشن اور مدارس کے قریب میلاپور کے مقام پر اس کی درگاہ جس کی پرتگیز "سین ٹوم" کے نام سے بہت عزت کرتے تھے' کے ذکر کا بھی سب سے بہتر موقع اور محل یہی ہے۔ مغربی یا ساحل مالابار کے "سینٹ ٹامس کے عیسائیوں" کی روایات کے بموجب یہ رسول 52ء میں سکوترا سے آیا' اسی ساحل پر کرینکانور (پری پلس اور پلائنی کا مزرس) کے مقام پر اترا اور اس صوبے میں سات مرکزی مقامات کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد وہ معبر یا ساحل کارومنڈل پر چلا گیا اور یہیں میلاپور کے مقام پر اس کو شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد

کے مذہبی تعصبات اور اذیتوں نے کارومنڈل کے ساحل سے عیسائیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ بشپ میڈلی کاٹ نے ایک نہایت عالمانہ رسالے میں یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام روایت تاریخی ہے۔ مگر میرے خیال میں اس کی یہ کوشش بالکل بے سود رہی ہے۔ "اعمال سینٹ ٹامس" کی روایت کی طرح میلاپور کے مشہد کی حکایت بھی محض مصنوعی اور فرضی قصہ ہے اور مالابار کے عیسائیوں نے "اعمال" کی روایت کو اپنے ملک پر منطبق کرنے میں کسر نہیں کی۔ لیکن خواہ مزدئی کی سلطنت یا میلاپور کے قریب رسول کے مفروضہ مشہد کو تاریخی شہادت کے قرین قیاس سمجھ کر رد کر دیا جائے، لیکن اتنا ضرور قابل تسلیم ہے کہ اس زمانے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے، رسول کا جنوبی ہند میں بذات خود آنا بالکل ممکن ہے۔ علاوہ بریں اس کا سکوترا کی جانب سے جہاں بلاشک وشبہ قدیم زمانے سے عیسائیوں کی ایک آبادی موجود تھی، آنا بھی کچھ بعید از قیاس نہیں۔ اس کے ذاتی طور پر آنے کے واقعے کو نہ تو ثابت ہی کیا جا سکتا ہے نہ وہ رد ہو سکتا ہے۔ مجھے اب اس امر کا اطمینان ہو گیا ہے کہ جنوبی ہند کی عیسائیت بہت قدیم ہے۔ خواہ اس کو سینٹ ٹامس نے خود قائم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اور یہ کہ بہت زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس کا قیام تیسری صدی عیسوی میں ہوا ہو گا۔ مسٹر ملینے کا یہ کہنا کہ جنوبی ہند میں عیسائیت کا قیام ان واعظوں کے ذریعے سے ہوا جو پانچویں یا چھٹی صدی میں دریائے دجلہ کے کنارے سے آئے، بہت کچھ بے وجہ ہے۔

بعد کے ہندی یونانی بادشاہ

خانہ بدوش اور پارتھی حملوں کے شروع ہونے کے دو صدی بعد تک ہندوستان کی سرحد کا شمالی حصہ، جس میں غالباً وادی کابل و سوات اور پشاور کے شمال اور شمال مغرب کے قرب و جوار کے چند اضلاع اور مشرقی پنجاب شامل تھے، مقامی یونانی بادشاہوں کے زیر حکومت رہا۔ جو خواہ خود مختار ہوں یا پارتھی طاقت کے زیر نگین چاندی اور کانسی کے سکے ڈھالنے کے مجاز ضرور تھے۔

تقریباً 20ء، ہرمیئس اور کڈفائسس اول:

ان ہندی یونانی بادشاہوں میں سے آخری بادشاہ ہرمیئس تھا جس کو یوچی یا کشان سردار کڈفائسس اول نے 20ء میں مغلوب کیا۔ اسی وقت اس باہمت بادشاہ نے کابل کو فتح کر کے اسے یوچی سلطنت کے ساتھ ملحق کیا۔ [۲۲] اول اول اس یوچی بادشاہ نے اپنے اور یونانی بادشاہ دونوں کے نام مضروب کرائے۔ مزید اسی طرح کہ ان سکوں کی پشت پر ہرمیئس کی تصویر اور یونانی عبارت

کندہ کرائی۔ تھوڑی مدت بعد اگرچہ اس نے تصویر بدستور سابق قائم رکھی۔ مگر عبارت میں اس کی جگہ اپنا نام اور خطاب لکھنا شروع کیا۔ آگے چل کر اس نے ہرمیئس کی تصویر کو بھی نکال ڈالا اور اس کی جگہ اگسٹس کی بڑھاپے کی تصویر کو منقوش کرایا اور اس طرح اس قیصر کی بڑھتی شہرت کے آگے سر جھکا دیا جس نے بغیر کسی قسم کی جنگ و جدل کے محض رومی نام کی تخویف کے برتے پر 20 ق م میں پارتھیوں کو مجبور کیا کہ وہ جھنڈا جو انہوں نے تینتیس برس قبل رومیوں سے چھینا تھا واپس کر دیں۔ [۲۳]

کڈ فائسس اول کے عہد حکومت کے غالباً اس سے بھی بعد کے وہ سکے ہیں جن میں شاہی تصویر کو بالکل ہی اڑا دیا گیا ہے اور ان میں ایک طرف تو ہندی بیل اور دوسری طرف باختری اونٹ کی شکل منقوش ہے۔ یہ ایسے نشان ہیں جو ایک خانہ بدوش قوم کے ہندوستان کی فتح کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔ [۲۴]

سکّوں کی شہادت کے معنیٰ اور مقصد

اس طرح سکوں کی شہادت سے اس زمانے کی سیاسی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح بتدریج یونانی بادشاہ وسط ایشیاء کے جنگلی خانہ بدوش قبائل کے ہاتھ سے برباد اور تباہ ہوئے۔

ہندوستان اور یونان کا تعلق

ایک یوروپین مورخ کے لیے جس کا دل و دماغ ان بے شمار احسانات کے احساس سے پُر ہو جو یونانی علوم و فنون نے موجودہ تہذیب پر کیے ہیں' یہ ناممکن ہے کہ اس موقع پر ہندوستان میں یونانی بادشاہوں کو دفن کرتے ہوئے یہ خیال اس کے دل میں نہ آئے کہ آخر ہندی اور یونانی باہمی تعلقات کا نتیجہ کیا ہوا۔ کیا ہندوستان کی نظر میں سکندر اعظم کا درجہ محض ایک سواروں کے رسالے کے افسر کا سا تھا جس کے حملے کے سامنے ان کی بڑی سے بڑی فوجیں تنکے کی طرح ہوا میں اڑ جاتی تھیں یا وہ اس کو دیدہ دانستہ یا محض بے معلوم طور پر مغربی تہذیب کا پیشرو اور بہترین قواعد و ضوابط کا رواج دینے والا تصور کیا کرتے ہیں؟ کیا پنجاب کے یونانی الاصل بادشاہوں کی سالہائے دراز کی حکومت وحشی قبائل کے سامنے بالکل نیست و نابود ہو گئی اور سوائے سکوں کے اس نے ملک میں اپنا کوئی اثر باقی نہیں چھوڑا یا اس نے ہندی ضابطہ و قانون پر یونانی حکومت کا اثر ڈالا اور ان کو تھوڑا بہت بدل دیا۔

نیس کی رائے

اس قسم کے سوالات کا جواب نہایت مختلف اور متفرق صورتوں میں دیا گیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کے مصنفین کا رجحان اس طرف رہا ہے کہ وہ سکندر اعظم کے حملے کے یونانی اثرات اور خود ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد کے ہندی یونانی اثرات اور خود ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد کے ہندی یونانی بادشاہوں کے کارناموں کو مبالغے اور افراط کی حد تک پہنچا دیں۔ ان سب مصنفین میں پیش پیش نیس ہے۔ اس کو اس امر کا پورا یقین ہے کہ زمانہ بعد کی ہندی ترقیوں کا انحصار بلاواسطہ سکندر کے قوانین و ضوابط پر ہے اور یہ کہ چندر اگپتا نے سائلوکس نیکیٹر کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ یہ خیالات تاریخی شہادتوں کے اس قدر اور اس درجہ منافی ہیں کہ ان کی تردید کی بھی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر بعض مشہور و معروف انگریز مصنفین ایک حد تک ان اقوال و آراء پر ایمان لے آئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ وہ لوگ فطرتی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح یورپ اور ایشیاء کا بڑا حصہ یونانی خیالات کے زیر اثر آ گیا تھا اسی طرح ہندوستان بھی یقیناً اس سے متاثر ہوا ہو گا۔

سکندر کا ہندوستان پر برائے نام اثر

اسی لیے یہ نہایت مفید کام ہے کہ ہندوستان پر سکندر کے حملے سے لے کر کشان یا ہندی سیتھی قوم کو پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں فتح کرنے تک جو تمام چار صدی کا عرصہ بنتا ہے' بلا تعصب و رو و رعایت یہ غور کیا جائے کہ یونانی اثر کی وسعت ہندوستان میں کہاں تک تھی۔

اس کتاب کے مصنف کی یہ رائے کہ سکندر کی ہندوستانی فوج کشی کے زمانے میں ہندوستان یونان کے زیر اثر نہیں آیا تھا۔ اس سے قبل باب متعلقہ میں مراجعت سکندر بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کے سامنے ان چار سو برس کے یونانی اثرات کے مسئلے پر نئے سرے سے غور کر لیا جائے۔ اس مسئلے کے متعلق صحیح اندازہ لگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سنین کو مدنظر رکھا جائے۔ سکندر ہندوستان میں صرف انیس مہینے ٹھہرا اور اس کے منصوبے اور ارادے کیسے ہی بلند کیوں نہ ہوں یہ بات صریحاً ناممکن ہے کہ اس مختصر سے زمانے میں جس میں اس کو ہمہ تن جنگ و جدل میں مشغول رہنا پڑا' وہ یونانی قوانین کو مستقل طور پر قائم و مستحکم کر سکتا یا ہندی سیاست اور معاشرت پر کوئی معتدبہ اثر ڈال سکتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے ان میں سے کوئی بھی کام نہیں کیا اور اس کی موت کے دو سال بعد ہی سوائے دریائے سندھ کے میدان کی یوڈیمس کے زیر کمان چند چھوٹی فوجوں کے سوا مقدونوی سلطنت کے تمام نشانات مٹ گئے تھے۔

316ق م کے بعد ان کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ ہندوستان پر سکندر کے حملے کا اگر کوئی مستقیم اثر موجود ہے تو وہ ان سکوں میں ہے جو کوہستان نمک کے راجا سو بھوتی (سوفیٹیز) نے یونانی سکون کی نقل میں مضروب کرائے۔۔ یہ وہ راجا تھا جس کو سکندر نے اوائل فوج کشی میں زیر کیا تھا۔

سائلوکس نیکیٹر کی ناکامی

سکندر کی موت کے بیس سال بعد سائلوکس نیکیٹر نے دریائے سندھ کے مشرق میں مقدونوی فتوحات کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ناکامیاب ہوا اور بہ جبر و اکراہ نہ صرف اس کو ان تمام صوبوں سے دست بردار ہونا پڑا جن پر سکندر نے وقتی طور پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ دریائے سندھ کے مغرب میں آریانہ کے صوبے کا ایک بڑا حصہ بھی اسے چندر اگپتا موریا کے حوالے کر دینا پڑا۔ ہندی انتظام مملکت اور معاشرت جس کو سائلوکس کے سفیر میگا ستھینز نے اس سے بیان کیا ہے ہندی الاصل ہے۔ اس میں ایرانی اثر کا شائبہ کہیں کہیں ضرور پایا جاتا ہے، مگر یونانی اثر کا کہیں نام و نشان نہیں۔ [45] یہ خیال کہ ہندوستان کی آئندہ ترقیوں کا انحصار کسی نہ کسی طرح سکندر کے قوانین پر تھا واقعات کے بالکل منافی ہے۔

موریا سلطنت

سکندر کی موت کے اسی یا نوے برس بعد تک شاہان موریا کی زبردست طاقت نے ہندوستان کو ہندیوں کے لیے مخصوص اور تمام بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ کر دیا۔ ان بادشاہوں نے اپنے ہمسایہ یونانی بادشاہوں کے ساتھ بالکل برابری کا سلوک کیا۔ دراصل دیکھا جائے تو اشوک انٹی اوکس اور بطلیموس تک بدھ مذہب کی تعلیمات پھیلانے کا زیادہ دلدادہ تھا، بہ نسبت اس کے کہ وہ ان لوگوں سے یونانی خیالات اخذ کرنا چاہتا ہو۔ اگرچہ یہ یقیناً صحیح ہے کہ ہندوستان کی نقاشی اور مصوری نے موریا خاندان کے زمانے میں سکندری یونانی خیالات کو پیش نظر رکھا، لیکن بہرحال یونانی خیالات نے ہندی تہذیب و تمدن پر برائے نام ہی اثر کیا تھا اور ہندی قوانین میں وہ کسی قسم کا زبردست تغیر و تبدل کرنے میں بالکل ناکام رہا تھا۔

انٹی اوکس اعظم کا حملہ

سائلوکس کے ناکام واپس جانے کے بعد تقریباً سو سال تک کسی یونانی بادشاہ نے ہندوستان کی طرف رخ نہیں کیا۔ اس کے بعد انٹی اوکس اعظم (206ق م) موجودہ افغانستان کے کوہستانی علاقے میں ~~سے گندھارا~~ براستہ قندھار و سیستان وطن واپس گیا۔ اس کوچ کے دوران اس نے

ایک مقامی راجا سے بہت سا خزانہ اور ہاتھی بطور تاوان جنگ وصول کیے۔ یہ مختصر سی فوج کشی ہندی قوانین پر کچھ زیادہ اثر نہ ڈال سکتی تھی۔ زیادہ قرین قیاس تو یہ ہے کہ دریائے سندھ کے مشرقی ہندی بادشاہوں کو اس واقعے کی اطلاع بھی نہ ہوئی ہوگی۔

بعد کے یونانی حملے

اس کے بعد کے دیمیتریئس' یوکرے ٹائیڈز اور متندر کے حملے' جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آدھی صدی (145 — 190 ق م) کے دوران واقع ہوئے' بہت کچھ اندرون ملک تک پہنچے۔ مگر وہ بھی محض ناپائیدار اور بے ثبات تھے اور اس لیے انہوں نے ہندوستان کی قدیم اور مستحکم تہذیب و تمدن پر اپنا کوئی اثر نہ چھوڑا ہوگا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ہندی ہیئت داں نے یونانیوں کو "بد چلن بہادریوں" لکھا ہے۔ ہندوستانیوں کے دلوں پر سکندر اور متندر کے حملوں نے صرف یہ اثر کیا کہ وہ ان کو زبردست فوجی افسر سمجھنے لگے۔ مگر انہوں نے ان کو کبھی کسی نئی تہذیب کا علم بردار تصور نہیں کیا اور ممکن ہے کہ ان دونوں کو محض ملیچھ سمجھتے ہوں' جن سے کہ وہ خائف ہوں' مگر ان سے کچھ حاصل نہ کرنا چاہتے ہوں۔

مشرقی براعظم نے مغربی سرزمین سے تحصیل علم کرنے میں کبھی بہت زیادہ آمادگی ظاہر نہیں کی' اور اگر ہندیوں نے جیسا کہ ناٹک اور سنگ تراشی کے معاملات میں ہوا مغربی استادوں سے کچھ حاصل بھی کیا تو اس کو ہندی شکل میں اس طرح ڈھال کر اس کا بھیس بدل دیا کہ بڑے بڑے نقاد اور عالم ان ہندی نقالوں کی اختراع کے قائل ہو گئے۔[۲۶]

پنجاب پر یونانیوں کا قبضہ

پنجاب یا اس کا بڑا حصہ معہ گردونواح کے علاقے کے کم و بیش دو سو برس تک یونانیوں کے قبضے میں رہا: یعنی دیمیتریئس (تقریباً 190 ق م) سے لے کر کشانی قوم کے ہاتھوں ہرمیاس کے شکست پانے (تقریباً 20ء) تک اور اس وجہ سے ان ہی علاقوں میں ہم کو یونانی اثر اور علامات کا زیادہ متوقع ہونا چاہیے۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ یہاں بھی یونانی آثار بہت ہی کم اور نامعلوم ہیں' سکوں کے سواجن پر ایک طرف یونانی زبان کی عبارت ہوتی تھی اور صریحاً یونانی نمونے پر تیار ہوتے تھے۔ اگرچہ دیمیتریئس اور یوکرے ٹائیڈز کے زمانے سے ان پر دونوں زبانوں کی عبارات کندہ ہونے لگی تھیں اور کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جس سے کہ بیرونی سالہائے دراز کی حکمرانی کے اثرات کا پتہ لگتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ سکوں سے یہ امر بالکل صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ایک حد تک ان اجنبی بادشاہوں کے درباروں میں یونانی زبان مستعمل تھی۔ مگر بعد

میں سکوں پر دیسی زبان کی عبارت لکھے جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام الناس اس سے بالکل نابلد تھے۔ اس زبان کا اب تک کوئی کتبہ دریافت نہیں ہوا اور ہندی کتبات میں اب تک صرف تین یونانیوں کے نام پائے گئے ہیں۔[27]

یونانی تعمیرات کی عدم موجودگی

اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ یونانی فن تعمیر نے کبھی ہندوستان میں رواج پایا تھا۔ ٹیکسلا کے مقام پر ایک مندر پایا گیا ہے جس میں آئیون کے ستون لگے ہوئے ہیں، جس کو ازیس اول کے وقت یعنی تقریباً 80ق م کا بتایا جاتا ہے، مگر عمارت کا نقشہ یونانی نہیں۔ اور یہ ستون جو بالکل دوسرے ملک کے نمونے کے ہیں محض سجاوٹ کی غرض سے لگائے گئے ہیں۔[28] ہندی یونانی سنگ تراشی کا قدیم ترین نمونہ بھی اسی یعنی ازیس اول کے زمانے کا ہے۔[29] اور سکندر کا تو کیا ذکر ہے کہ سنگ تراشی کا کوئی ایسا نمونہ بھی نہیں ملتا جو دیمیتریئس، یوکرے ٹائیڈز یا منندر کے وقت کا کہا جا سکے۔ گندھر یعنی پشاور کے گردونواح کے علاقے کی سنگ تراشی کے نمونے بہت بعد کے زمانے کے ہیں اور یونانی رومی الاصل ہیں۔

خاتمہ

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ سکندر، انٹی اوکس اعظم دیمیتریئس، یوکرے ٹائیڈز اور منندر کے حملے (خواہ حملہ آوروں کے منصوبے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔) درحقیقت محض یورشیں تھیں اور انہوں نے اپنا کوئی پائیدار اثر نہیں چھوڑا۔ پنجاب اور دوسرے نواحی علاقوں پر طویل مدت تک یونانی حکومت نے بھی ملک میں اس تہذیب کے پھیلانے میں کچھ مدد نہ دی۔ یونان کے سیاسی قوانین اور فن تعمیر کو ہندوستان میں رد کر دیا گیا۔ اگرچہ نقاشی میں کچھ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور پڑا۔ یونانی زبان سے دربار کے لوگ عام طور پر ذرا واقف ہوں گے۔ یونان کے علم و ادب سے بھی دیسی حکام تھوڑے واقف ہوں گے کیونکہ سلطنت کے کاموں کے لیے ان کو یہ زبان سیکھنی پڑی تھی۔ مگر بہر حال یہ زبان عام نہ تھی اور یونانی مصنفین نے جو اثر ہندی علم پر کیا اس کا اثر زمانے کے آخر ہی میں جا کر واضح ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے اور زیادہ اہم یونانی رومی اثر پر آئندہ باب میں بحث کی جائے گی۔[30]

ضمیمہ ز

باختری اور ہندی یونانی بادشاہوں اور بیگمات کی فہرست بلحاظ حروف تہجی [۱۳۱]

سلسلہ نشان	نام	یونانی لقب یا خطاب	کیفیت
1	اگتھوکلیا	تھیوٹروپوس	غالباً سٹریٹو اول کی ماں اور اس کی نابالغیت کے زمانے میں اس کی نائب تھی۔
2	اگتھوکلیز	دیکئوس	غالباً پنٹلون نشان 28 کا جانشین تھا اور یوتھی ڈیمس اول دیمیتریئس کا ہمعصر تھا۔
3	امنٹس	نیکیٹر	ہرمیاس سے ذرا پہلے تھا۔
4	انٹی الکیڈس	نیکیفورس	یوکریٹائڈیز کا اوائل میں ہمعصر تھا تقریباً 170 ق م۔ بظاہر ٹیکسلا کا بادشاہ تھا۔

سلسلہ نشان	نام	یونانی لقب یا خطاب	کیفیت
5	انٹی میکس اول	تھیوس	غالباً کابل میں ڈیوڈرس ثانی (نمبر 13) جانشین تھا۔
6	انٹی میکس ثانی	نیکیفورس	یوکرے ٹائڈیز (نمبر 17) کے بعد یا غالباً اس کا ہمعصر تھا۔
7	اپالوڈوٹس	سوٹر۔ میگس۔	غالباً یوکرے ٹائڈیز کا بیٹا تھا۔ اور تمام ہندی سرحد کا بادشاہ تھا۔
8	اپالوفینس	فیلوپیٹر ہے	مشرقی پنجاب میں سٹریٹو اول یا ثانی کا ہمعصر تھا۔
9	آرکیبائس	ڈیکئوس۔ نیکیفورس	غالباً اس کا تعلق ہیلیو کلیز سے تھا۔
10	آرٹی میڈراس	انی کیٹاس	مندر کے بعد تھا۔
11	دیمیتریئس	انی کیٹاس	یوتھی ڈیمس اول (نمبر 18) کا بیٹا تھا۔
12	ڈیوڈوٹس اول		سکے دریافت نہیں ہوئے۔ غالباً 250-245 ق م۔
13	ڈیوڈوٹس ثانی	سوٹر	نمبر 12 کا بیٹا تھا۔
14	ڈیوڈیلس	سوٹر	بظاہر اس کا تعلق یوکرے ٹائڈیز سے تھا۔
15	ڈایونی سیئس	سوٹر	اپالوڈوٹس کے بعد تھا۔
16	اپینڈر	نیکیفورس	یوکرے ٹائڈیز (نمبر 17) سے غالباً بعد تھا۔
17	یوکرے ٹائڈیز	میگس	متھرڈیٹس اول کا ہمعصر تھا۔ 175-156 ق م۔

سلسلہ نشان	نام	یونانی لقب یا خطاب	کیفیت
18	یوتھی ڈیمس اول	-	ڈیوڈورس ثانی (نمبر 13) کے بعد تھا تقریباً 230-200 ق م۔
19	یوتھی ڈیمس ثانی	-	غالباً (نمبر 11) کا بیٹا تھا۔
20	ہیلیو کلیز ؑ	ڈیکئوس	نمبر 11 کا بیٹا اور آخری باختری تاجدار۔
21	ہرمیاس	سوٹر	کابل کا آخری ہندی یونانی تاجدار تقریباً 10ء سے 20ء۔
22	ہپاسٹریٹاس	سوٹر۔ میگس	غالباً اپالوڈوٹس کا جانشین ہوا۔
23	کیلیاپ	-	ہرمیاس کی ملکہ
24	لوڈ کے	-	یوکرے ٹائڈیز کی ماں تھی۔
25	لیساس	انیکیٹاس	انٹی الکیڈیس (نمبر 14) کا پیشرو تھا۔
26	مندر	سوٹر۔ڈیلئوس	یوکرے ٹائڈیز کے بعد تھا۔ تقریباً 155 ق م میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ مگر کارڈنر کا خیال ہے کہ وہ 110 ق م میں گزرا تھا۔
27	نیکئس	سوٹر	یوکرے ٹائڈیز کے بعد۔ اس کے سکے صرف ضلع جہلم میں پائے جاتے ہیں (پنجاب گزیٹیر مضمون جہلم)
28	پنٹیلون		یوتھی ڈیمس اول یا دیمتریئس کا ہمعصر تھا۔ غالباً اگتھو کلیز (نمبر 2) کا پیشرو تھا۔ 190 ق م۔

کیفیت	یونانی لقب یا خطاب	نام	سلسلہ نشان
ہپوسٹریٹاس کا ہمعصر تھا۔ (جے اے ایس بی 1898ء حصہ اول۔ صفحہ (131)۔	ویکٹوس۔ سوٹر	پیوکلئوس	29
غالباً انٹی آکس ثانی (نمبر 6) کا جانشین تھا۔	انی کیٹاس	فلاکیسناس	30
165 ق م۔ یوکرے ٹائڈیز (نمبر 17) کا ہمعصر۔ اور غالباً سیستان کا بادشاہ تھا۔	ایپی فینز	پلیٹو	31
نیومسیٹک کرانل 1896 صفحہ 269 پروفیسر ریپسن کو اس عجیب و غریب سکے کی اصلیت میں شبہ ہے۔	ایپی فیز' سوٹر	(?) پولکساس	32
ہیلوکلیز کا ہمعصر تھا۔ مدت مدید تک حکومت کی۔	سوٹر' ایپی فیز' ڈیلئوس	سٹریٹو اول	33
نمبر 33 کا پوتا تھا۔	سوٹر	سٹریٹو دوم	34
جے۔ اے۔ ایس۔ بی 1898ء حصہ اول صفحہ 130۔	یوارگیز	ٹیلی فوس	35
جے۔ اے۔ ایس۔ بی 1897 حصہ اول صفحہ 1۔ بساس سے اس کا تعلق تھا۔	ڈیکئوس	تھیوفس	36
بظاہر اپالو ڈوٹس سے بعد تھا۔ اور ڈایونی سیئس کا تقریباً ہمعصر تھا۔ اور غالباً مشرقی پنجاب میں حکمراں تھا۔	سوٹر' ڈیکئوس	زئیلس	37

ضمیمہ س

جدول شاہان ہمعصر

تقریباً 280ق م یا تقریباً 60ء

(ملک شام اور خاندان موریا کے سوا تمام سنین غیر متیقن ہیں)

ق۔م	شام	باختر	پارتھیا (ایران)	شمال مغربی ہندی سرحد، پنجاب کابل	اندرون ہند	کیفیت
280	انٹی آکس سوٹر (تخت نشینی)					
262 یا 261	انٹی آکس تھیوس					
تقریبا 250	————	ڈیوڈوٹس اول (تخت نشین)		موریا خاندان	خاندان موریا	
248 "	————	————	اشکان اول تخت نشین			
246 "	سائلوکس کلی نی کس (انٹی آکس ہیراکلیس اس کا حریف)					
245 "	————	ڈیوڈوٹس ثانی تخت نشین				اشوک کی موت

ق۔م	شام	باختر	پارتھیا (ایران)	شمال مغربی ہندی سرحد، پنجاب، کابل	اندرون ہند	کیفیت
231-32	——	——	——	——	——	باختر کی خود مختاری تسلیم کی گئی
تقریباً 230	——	یوتھی ڈیمس تخت نشین	——	——		
223	انٹی آکس ثالث (اعظم)	——	——	——	خاندان موریا	
208 "	——	——	——	——		——
206 "	——	——	——	——		
205 "				ڈیمیٹریس، انٹی میکس، پنٹیلون، یوتھی ڈیمس ثانی اگتھوکلیز		
190 "	——	——	——	——		
187	سائلوکس فیلوپیٹر					
184	——	——	——	——	پشی متر تخت نشین	
175 "	——	یوکرے ٹائڈیز تخت نشین				
174 "	——	——	متھراڈیٹس اول تخت نشین			
165	——	پلیٹو (یوکرے ٹائڈیز کا حریف)	——			
156	——	ہیلیو کلیز		مندر اپالوڈوٹس		مندر کا ہندوستان پر حملہ
155 "	——	——	——	——	——	

ق-م	شام	باختر	پارتھیا (ایران)	شمال مغربی ہندی سرحد' پنجاب' کابل	اندرون ہند	کیفیت
تقریبا 148	ــــــ	ــــــ	ــــــ	ــــــ	اگنی متر تخت نشین	
تقریبا 120 -138	ــــــ	باختری خاندان کا خاتمہ	ــــــ	مختلف یونانی شہزادے	ــــــ	باختر وغیرہ پر سک قوم کا حملہ
136 "	ــــــ	ــــــ	فراڈٹیس ثانی			
124 "	ــــــ	ــــــ	متھراڈیٹس تخت نشین			
120 "	ــــــ	ــــــ	ــــــ	سٹریٹو اول' یوناس تخت نشین' سٹریٹو ثانی' (مغربی پنجاب)		
115 "	ــــــ	ــــــ	ــــــ	دونوئیس (تخت نشین) مختلف یونانی شہزادے		
90 "	ــــــ	ــــــ	ــــــ	ازلیس اول (تخت نشین)	بسودیو تخت نشین	
72 "	ــــــ	ــــــ	ــــــ	(اراکوسیہ)		
50 "	ــــــ	ــــــ	ــــــ	ٹیکسلا اور متھرا کے سترپ		
10 '	ــــــ	ــــــ	ــــــ	ہرمیاس (تخت نشین)		
20 "	ــــــ	ــــــ	ــــــ	ہرمیاس کو کشان قوم نے شکست دی۔		
21 "	ــــــ	ــــــ	ــــــ	گنڈوفریس تخت پر بیٹھا	ــــــ	سینٹ تامس
60 "	ــــــ	ــــــ	ــــــ	گنڈوفریس کی موت		

ضمیمہ ش

سینٹ ٹامس کے عیسائی

کتابیں جن کے حوالے دیئے گئے

میں اس ضمیمے میں اس کا بیان اور ثبوت دوں گا جس کا ذکر متن کتاب میں ہوا ہے اور کتاب کے طبع دوم کا بیان اس سے مختلف ہے۔ سینٹ ٹامس کے متعلق تمام روایات اور جنوبی ہند میں "سینٹ ٹامس کے عیسائیوں" کی اصلیت کے مسائل پر پوری اور مفصل بحث کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اس کی بابت مندرجہ ذیل کتب معہ مصنفین بیان کردی جاتی ہیں۔

1۔ جی۔ ٹی۔ میکنزی: "ہسٹری آف کرسچینٹی ان ٹرانکور" طبع سوم۔ منقول فی دی ٹرانکور سٹیٹ مینوئل 1906ء جلد 2 صفحہ 219۔114۔

2۔ جی۔ ملنے ری: دی سیرین چرچ ان انڈیا (بلیک وڈ 1892ء)

3۔ بشپ اے۔ ای۔ میڈلی کاٹ: انڈیا اینڈ دی اپاسٹل ٹامس" (نٹ 1905ء)

4۔ ڈبلیو۔ جے۔ رچرڈس: دی انڈین کرسچینٹی اور سینٹ ٹامس" (بمروز 1908ء)

سات گرجے

رچرڈس (صفحہ 77) نے سینٹ ٹامس کے قائم کردہ سات گرجوں کے حسب ذیل نام گنوائے ہیں۔

(1) کوٹ کالیلی' (2) گولنگم' (3) نرنم' (4) چیل' (5) کر کینی' (6) کولن اور (7) پلور۔ میکنزی نے بھی یہی فہرست دی ہے' صرف ہجوں میں اختلاف ہے۔ مگر اس نے بجائے کر کینی کے ملینکر لکھا ہے۔ ری (صفحہ 361) نے حسب ذیل فہرست دی ہے:

(1) کرنیگنور' (2) گولن' (3) پلور' (4) پردر' (5) جنوبی پلپورم یا کولنگم' (6) نیرنم اور

(7) نلکل جسے چیل یا شیل بھی کہا جاتا ہے۔ رچرڈس خود ہی درج ذیل بیان کے لیے ذمہ دار ہے۔

"سینٹ ٹامس کے سات گرجاؤں میں سے ایک گرجا ٹراونکور کی مشرقی پہاڑیوں میں چیل کے مقام پر قائم کیا گیا تھا۔ مگر وحشی جانوروں کی تکلیف دہی کی وجہ سے مدت ہوئی کہ اس کو ترک کر دیا گیا۔ آثار اب تک باقی ہیں اور آثار قدیمہ کے ماہرین کی محنت اس پر رائیگاں نہ جائے گی۔" (صفحہ 91)

میں ان فہرستوں کے اختلاف کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتا اور نہ چیل (یا نلکل' یا شیل) کے مفروضہ گرجا کے کھنڈروں کے متعلق کچھ کہہ سکتا ہوں۔

جن واقعات سے روایت کی تائید ہوتی ہے

یہ یقین کیا جاتا ہے کہ سینٹ ٹامس نے دو خاندانوں کے افراد کو مذہبی مقتداء بنایا تھا۔ ان میں سے ایک تو شنکر پوری کے مقام پر تھا جو آخر میں تباہ اور بالکل ناپید ہو گیا اور دوسرا پکلو نٹم کے مقام پر جو انیسویں تک زندہ رہا اور جس نے پرتگیزوں کے زمانے میں آرچ ڈکن اور ہالینڈ والوں کے زمانے میں کلیسا کے لیے اسقف مہیا کیے (میکنزی صفحہ 137۔ رچرڈس صفحہ 76) مسٹر دی نگم آیا لکھتے ہیں:

"اس روایت میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کہ سینٹ ٹامس ساحل مالابار پر آیا تھا اس نے نمبدری کے چند خاندانوں کو عیسائی کیا جن میں سے چند کو اس نے مذہبی مقتداء بھی مقرر کیا' جیسے کہ شنکر پوری اور پکلو متم [5] کے خاندان کیونکہ عوام کے دلوں میں اس روایت کی جگہ کر لینے کی تصدیق میں رسول ٹامس ہندوستان میں آیا اور اونچی ذات کے لوگوں میں تبلیغ بھی کی تھی۔ اس سے اور زیادہ تصدیق ہوتی ہے کہ خاص کر کنم کولم کے شامی عیسائیوں کی عورتیں بعینہٖ ویسا ہی لباس استعمال کرتی ہیں جیسا کہ نمبدری عورتیں' اور راستہ چلنے میں عوام کی نظروں سے بچنے کے لیے ایک بڑی چھتری بھی استعمال کرتی ہیں۔ اور سوائے چند مستثنیات کے' اور وہ بھی بالکل موجودہ زمانے میں' وہ مخصوص شریفوں کے خاندان ہی میں شادی بیاہ کرتی ہیں۔ اس جماعت کی یہ رسوم ساحل کی پرانی روایات کی تصدیق میں بہت مدد دیتی ہیں: (مینوئل جلد دوم صفحہ 122)

شہادت

اس کے بعد مسٹر آیا نے ابنیز کی حکایت پر بحث کی ہے جو "اعمال" میں پائی جاتی ہے۔ مگر اس کو ملائی زبان کے قلمی مسودے سے رچرڈس (صفحہ 76) نے یہ تصریح بیان کیا ہے۔

سینٹ ٹامس کی شہادت خواہ وہ کسی مقام پر واقع ہوئی ہو مشتبہ اور مشکوک ہے۔ ہیر کلیون ایک قدیم مصنف' جس کا قول کلیمنٹ (200ء) نے نقل کیا ہے' لکھتا ہے کہ ٹامس شہید ہوا ہی نہیں۔ (میڈلی کاٹ صفحہ 120) یہ ظاہر ہے کہ رومن کیتھولک فرقے کے لوگ ہیر کلیون کے اس قول پر شبہ و شکوک قائم کرتے ہیں۔ مگر اگر کوئی شخص اس پر اعتبار کرنا چاہے تو اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی۔

سکوترا میں عیسائیت

جزیرہ سکوترا میں اس عیسائیت کے وجود کی شہادت' جو ایران سے وہاں پہنچی تھی' کاسمی انڈکو پلسٹیز کے قول سے ملتی ہے جس نے اپنی کتاب 535ء میں لکھی تھی۔ اس کے تقریباً ایک ہزار سال بعد (1546ء) سینٹ فرانسس زیویئر نے اس جزیرے میں نام نہاد عیسائی جماعتیں دیکھی تھیں جن کا دعویٰ تھا کہ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جو سینٹ ٹامس کے ہاتھ پر عیسائی ہوئے تھے۔ یہ خیال کہ تھیوفلس بیلیفے جس کو 354ء میں قسطنطین نے بھیجا تھا سکوترا بھی گیا تھا' غلط معلوم ہوتا ہے۔ (میڈلی کاٹ صفحہ 136' 138' 201–196) میرے نزدیک بشپ میڈلی کاٹ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ تھیوفلس ہی ساحل مالابار پر آیا تھا اور اسی نے اس علاقے میں عیسائیت کی بنیاد رکھی تھی۔

لنکا کی ایک روایت

ہندوستان اور لنکا کی تاریخی روایات کو جب ایک ساتھ پڑھا جائے تو ان سے تیسری صدی عیسوی میں ساحل مالابار پر عیسائیت کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔ لنکا کی تاریخ مہاومس (باب 36) سے جو اوائل چھٹی صدی میں لکھی گئی' معلوم ہوتا ہے کہ گوتھا کابیا یا میگھ ورنابھیا کے عہد حکومت میں (جو گیگر کے بیان کے مطابق 15–302ء تک رہا۔) تامل قوم کے ایک بد دین عالم نے مناظرے میں بدھ مذہب کے علماء کو مغلوب کیا اور اس بادشاہ کا منظور نظر ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اسے شہزادے کا اتالیق مقرر کر لیا۔ مہاومس نے اس فاتح مناظر راہب کا نام سنگھ مترلکھا ہے:
"جو جنتر منتر اور بھوت پریت کے علوم سے خوب واقف تھا۔" مسٹر کے۔ جی ٹیشرا ایر نے اس قول کے یہ معنی لیے ہیں کہ یہ مناظر ایک ہندو اور اصل میں شیو مذہب کا مشہور ولی مانک یا مانی واسگر تھا۔[6] اس شخص کی تامل زبان کی لکھی ہوئی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ولی نے اپنی عمر کے آخری حصے میں بادشاہ کا مذہب تبدیل کر دیا تھا۔ یہ بادشاہ غالباً گوتھا کابھیا تھا اور یہ ممکن ہے کہ مہاومس کے مصنف نے شیو مذہب کے ہندو مانک واسگر کو سنگھ متر ایک بد دین بدھ راہب

ظاہر کیا ہو۔

مانک واسگر ساحل مالابار میں

اس حکایت کے اس حصے کے متعلق کہ آیا لنکا کے بادشاہ نے مذہب تبدیل کیا تھا یا نہیں یا اس بادشاہ کا نام گوتھا کا بھیا تھا یا نہیں، خواہ ہمارا کچھ ہی خیال کیوں نہ ہو، مگر مجھ کو اس بات کے مان لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ مانک واسگر واقعی ساحل مالابار پر آیا تھا اور وہاں اس نے دو عیسائی خاندانوں کو ہندو بنا لیا تھا۔ ان خاندانوں کی اولاد جو منگر امکر کے نام سے موسوم ہے اب تک وہ حقوق نہیں رکھتی جو دیگر ذات پات کے پابند ہندوؤں کے ہیں۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی مذہب 270ء میں ہوئی اور اگر اس سنہ میں کچھ بھی واقعیت اور حقیقت ہے تو ساحل مالابار کے عیسائی یقیناً اس سے بہت قبل زمانے کے ہوں گے۔ تامل علم وادب کی تاریخ کے تمام دلائل سے جہاں تک میں نتیجہ نکال سکتا ہوں وہ یہی ہے کہ مانک واسگر تیسری صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ بعض مورخین اسے دوسری صدی عیسوی کے اوائل کا بھی بتلاتے ہیں۔[1] اور اگر وہ واقعی اس قدر قدیم ہے تو ساحل مالابار کے عیسائیوں کے ساتھ اس کے تعلقات سے معلوم ہوتا ہے کہ سینٹ ٹامس یقیناً وہاں آیا تھا۔

حوالہ جات

ا انٹی اوکس سوٹر جولائی 262 یا جولائی 261 ق م میں 64 برس کی عمر میں مرا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا انٹی اوکس تھیوس چوبیس برس کی عمر میں اپنے بھائی سائلوکس کو قتل کرنے کے بعد تخت پر بیٹھا (بیون: "ہاؤس آف سائلوکس" جلد اول صفحہ 168' 171۔ اس میں پوسی بئس جلد اول ن 249 کا حوالہ دیا ہے۔) اس کتبے سے جو دُور دُور کرکے مقام پر پایا گیا ہے ثابت ہوتا ہے کہ انٹی اوکس اپنی زندگی کے زمانے ہی میں پوجا جاتا تھا اور اس کے علاوہ اس کی ملکہ لوڈکے کی عبادت کے لیے عورتیں بھی مقرر کی گئی تھیں۔

ع "یوکرے ٹائی ڈیز کے ہزار شہر تھے جن میں کہ اس کی حکومت قائم تھی۔" (سٹریبو باب 15 حصہ 2-3) "باختر آریانہ کا زیور ہے۔" (ایضاً باب 11 حصہ 11-1)

سے ہیروڈوٹس جلد 3 صفحہ 93' 117' جلد 7 صفحہ 67-64۔

ے پارتھیا کے مفصل بیان کے لیے دیکھو کینن رالنسن کی کتاب۔ "سکستھ اورینٹل مورنارکی" یا اس کی مقبول عام کتاب "دی سٹوری آف پارتھیا" "سٹوری آف دی نیشنز کے سلسلے میں۔

ھ اس واقعے کے متعلق سب سے بڑی سند جسٹن باب 41 فصل 4 ہے۔ مگر جن کونسلوں کے ناموں پر تعین سن کا انحصار تھا' ان کے نام اس نے ٹھیک نہیں لکھے۔ اس نے باختر کے باغی سردار کا نام تھیوڈوٹس لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ "وہ اسی زمانے میں باغی ہوا۔" دونوں واقعات کے سنین کے متعلق تمام شہادتوں کو کننگھم' رالنسن' بیون اور دوسرے مصنفین نے بغور دیکھا ہے اور جس نتیجے پر وہ پہنچے ہیں وہ متن میں دے دیا گیا ہے۔ 248 ق م کی تاریخ کے متعلق پروفیسر ٹیرین ڈی لکوپرے کا خیال ہے کہ اس سے اشکانی سنہ کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ مسٹر بیون سے اس امر میں بالکل متفق ہے کہ پارتھی بغاوت چند سال تک جاری رہی۔ مسٹر بیون کا خیال ہے کہ جسٹن نے پارتھی بغاوت کی تاریخ 250 سے 249 ق م تک ظاہر کی ہے۔ ("ہاؤس آف سائلوکس" جلد اول صفحہ 286) سرایچ۔ ہاورتھ 248 سے 247 ق م کی تاریخ کو مرجح سمجھتا ہے۔ (نیومسمیٹک کرانیکل 1905ء صفحہ 222)

۵۶ اشکان نے ہرکینیا کے علاقے کو زیر کیا اور اس طرح دونوں قوموں پر اقتدار قائم کرنے کے بعد باختری بادشاہوں سائلوکس اور تھیوڈوٹس کی موت کی وجہ سے یہ خوف جاتا رہا۔ اس نے اس کے بیٹے تھیوڈوٹس سے صلح اور اتحاد قائم کر لیا۔ اس کی تھوڑی مدت بعد اس نے سائلوکس کو جو بغاوت کی سزا دینے وہاں آیا تھا شکست دی۔ جس دن یہ فتح حاصل ہوئی اس دن سے آج تک پارتھی ایک تہوار مناتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس دن سے ان کی خود مختاری کی بنیاد پڑی۔ (جسٹن باب 41 فصل 4)۔ یہ صاف اور صریح شہادت ایسی ہے کہ جس سے ماہرین سکہ جات کے تمام شکوک بابت دو ڈیوڈوٹس ہونے کے غائب ہو جاتے ہیں۔ تمام دریافت شدہ سکے ڈیوڈوٹس ثانی کے معلوم ہوتے ہیں اور اغلب یہ ہے کہ اس کے باپ نے کوئی سکے مضروب نہیں کرائے تھے۔ سرایچ۔ ہاورتھ' جس کو جسٹن کی شہادت کا اعتبار نہیں' ماننے سے انکار کرتا ہے کہ اشکان سائلوکس کے خاندان کے نائب السلطنت نے انڈراگورس کو قتل کیا تھا (نیو مسمیٹک کرانیکل 1905ء صفحہ 217' 222)

۵۷ پولی بیئس: باب 11 فصل 34 ہندی بادشاہ کا نام مورخ نے سوفاگ سین دیا ہے جس سے غالباً مراد سنسکرت کا سوبھاگ سین ہے۔

۵۸ "وہ یونانی جنہوں نے باختر کی بغاوت میں حصہ لیا' اس کی زرخیزی اور ملک کے موقع کی خوبی کی وجہ سے اس قدر طاقتور ہو گئے کہ اپالوڈورس کے بیان کے مطابق "وہ آریانہ اور ہندوستان کے بادشاہ ہو گئے۔" ان کے سرداروں اور خاص کر منتدر نے (اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس نے واقعی دریائے بیاس کو عبور کیا اور اسامس تک پہنچ گیا تھا) سکندر سے کہیں زیادہ اقوام کو زیر نگین کیا۔ یہ فتوحات کچھ تو منتدر نے حاصل کیں اور کچھ یوتھی ڈمس کے بیٹے دیمیتریئس شاہ باختر نے حاصل کیں۔ انہوں نے نہ صرف پٹلین پر ہی قبضہ کیا بلکہ سراسٹس اور سگرڈس کی سلطنتوں کو بھی (جن میں تمام باقی ماندہ ساحل کا علاقہ شامل تھا) زیر تصرف کیا۔ مختصر یہ ہے کہ اپالوڈورس کہتا ہے کہ "باختر تمام آریانہ کے علاقے کا زیور ہے۔ انہوں نے اپنی سلطنت سرس اور فری نوئی تک پھیلائی تھی۔" (سٹریبو۔ باب 11' حصہ 11' فصل 1' مترجمہ فاکنر) اس کے آخری فقرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سلطنت بطلیموس کے جغرافئے کے ان پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھی جن کا پتہ اب تک نہیں لگا۔ (سٹین: "این شنٹ ختن" صفحہ 54۔ اس کے بیان مرقومہ "سینڈ برینڈ روئنز آف ختن" صفحہ 72 کی تردید ہو گئی ہے۔

۵۹ جسٹن باب 41 فصل 3۔

۶۰ جسٹن باب 41 فصل 6۔ تمام ماہرین فن سکہ اس امر میں متفق ہیں کہ ہیلو کلیزیو کرے ٹائیڈز کا بیٹا تھا۔ کننگھم (نیو مسمیٹک کرانیکل 1869ء صفحہ 3 - 24) نے اس امر کے قابل یقین وجوہ

یوکرے ٹائیڈز کے کپس کے سکے بعض اوقات اپالوڈوٹس کے سکوں پر مضروب پائے جاتے ہیں۔(ریپسن۔جے۔آر۔اے۔ایس 1905ء صفحہ 784)

۱۱ اس کے جنازے کی رسوم کو پلوٹارک نے بیان کیا ہے (ریپبلک۔جر۔پریٹیا۔اس کے متن کو "نیو مسمیٹک کرانیکل" 1869ء صفحہ 229 میں نقل کیا گیا ہے)۔"سوالات ملندا" کا ترجمہ ایس۔بی۔ای۔جلد 35-36 میں رہس ڈیوڈس نے کیا ہے۔ملندا کے متندر ہونے کے متعلق جس میں ویڈل کو شک تھا' دیکھو نوٹس آن "ہیلن ازم ان بکٹیریا اینڈ انڈیا۔" (جرنل ہیلن اسٹک سوسائٹی 1902ء صفحہ 272) اور سرت چندر را داس کا مضمون "جرنل بدھسٹ ٹیکسٹ اینڈ ریسرچ سوسائٹی' جلد 7' 1914ء صفحہ 6-1۔ملندر انام کشمندر کی کتاب اودان کلپلت میں اور تبتی زبان کی کتابوں میں آتا ہے۔

۱۲ چینی علماء عام طور پر 165 ق م کا سن دیتے ہیں۔فرینک نے یوچی کی شکست کا سن تقریباً 170 ق م لکھا ہے۔سک قوم کے جنوب کی طرف نقل مکان کرنے کی تاریخ اس کے خیال کے مطابق 174 اور 160 ق م کے بین بین ہے۔مگر بہر حال 160 ق م قریب تر ہے۔

۱۳ سرہنری میک سیمین کے خیال کے مطابق "سیتھی (یا سک) قوم 275 ق م کے قریب نکالی گئی تھی (جیاگرافیکل جرنل 1906ء صفحہ 209)۔

۱۴ ٹیکسلا کا سب سے پہلا سترپ جس کا نام معلوم ہے لیک تھا۔اس کا بیٹا پتک تھا۔78 ق م میں لیک براہ موگ بادشاہ کا ماتحت تھا' جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سکون کا میوس یا مائس ہے۔72 ق م میں متھرا کا سترپ سوداس سترپ راجول کا بیٹا تھا۔جس کے آخری عہد حکومت کے سکوں میں سٹریٹو ثانی کی نقل اتاری گئی ہے۔وہ سن یا سنین جن سے ان تاریخوں کا تعلق ہے اب تک معلوم نہیں ہو سکے۔راجول ان سترپ ہگا اور رہگاماش (بھائی) کا جانشین تھا جنہوں نے دیسی راجاؤں گوستر' رام دت وغیرہ کو بے دخل کیا تھا جن کے سکے پائے جاتے ہیں۔دونوں سٹریٹو کے سکوں کی تصریح' جن کا عرصہ کم وبیش 70 سال کا ہے' ریپسن نے کی ہے۔ڈاکٹر ووگل نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ راجول اور اس کا بیٹا ممکن ہے کہ ہوشکا کے ماتحت ہوں جو میرے نظام سنین کے مطابق 33ء میں تخت پر بیٹھا تھا۔(آرکیالوجیکل سروے پروگرس رپورٹ 1910-1909ء ناردرن سرکل صفحہ 9) اگر یہ خیال صحیح ہے تو 72 سک سن 150ء کے مطابق ہوگا۔مگر اس میں قباحتیں ہیں۔

۱۵ متھرا ڈیٹس اول کی حکومت کی صحیح مدت معلوم نہیں۔جسٹن (باب 41 فصل 6) بیان کرتا ہے کہ "عین اسی زمانے میں جب متھرا ڈیٹس پارتھیا میں بادشاہ ہوا یوکرے ٹائیڈ زباختر کا بادشاہ بنا۔اور یہ دونوں کے دونوں بڑے آدمی تھے۔" اور روسیئس کی عبارت ہے---یہ واقعہ غالبا 138 ق م ہے جبکہ متھرا ڈیٹس کا عہد حکومت ختم ہونے والا تھا۔

۱۶ۓ فان سیلٹ ۔ "تیخ نوتگر" صفحہ 140 ۔ فان گشمڈ میوس یا تامیئس کے نام کا مقابلہ متا کیز سے ہوا کرتا ہے جو گا گمیلا یا اربیلا کے مقام پر دارا کے سک سوار تیراندازوں کا سردار تھا۔ (ایرین ۔ انا باسس باب 3 فصل 8) جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1903ء صفحہ 46 اور زیڈ۔ ڈی۔ ایم۔ جی 1906ء صفحہ 72۔49 میں اس کے متعلق سنین پر بحث کی گئی ہے ۔ ہندی پارتھی سکوں کے لیے دیکھو۔ "کیٹلاگ آف کائنزان دی انڈین میوزیم ۔" جلد اول صفحہ 62۔35۔

۱۷ۓ فلاسٹریٹس کے بیان کے مطابق اپالونیئس پارتھیا کے بادشاہ برڈنیس یا ورڈنیس سے دو مرتبہ ملا جس نے تقریباً 47۔39ء تک حکومت کی اور جو بابل میں مقیم تھا۔ پروفیسر پری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس خیال میں بالکل حق پر ہے کہ اپالونیئس کی ہندوستانی سیاحت کی تاریخ 42۔43ء کے بین بین ہے ۔ اس زمانے میں فلاسٹریٹس کا بیان ہے کہ مغربی پنجاب ایک بادشاہ فروٹیس کے ماتحت تھا جو بظاہر پارتھی قوم کا شخص معلوم ہوتا ہے ۔ دریائے سندھ کے مشرقی جانب کا سترپ ٹیکسلا کے فروٹیس کا ماتحت اور بر ڈنیس سے بالکل خود مختار تھا۔ (اپالونیئس ۔ باب 1 فصل 28' باب 2 فصل 17' باب 3 فصل 27 ۔ فروٹیس کے لیے دیکھو باب 2 فصل 31۔26) اگرچہ ہندی سیاحت کی اور تمام تفصیلات خیالی مصنوعی ہیں' لیکن فلاسٹریٹس نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس کے زمانہ تحریر میں ٹیکسلا کا بادشاہ پارتھیا کے حکمراں سے بالکل خود مختار تھا۔

۱۸ۓ پری پلس فصل 38 ۔ یہ کتاب غلطی سے آرین کے نام منسوب کی جاتی تھی ۔ اس کا ترجمہ مع حاشیہ میک کرنڈل نے کیا ہے (انڈین انٹی کویری جلد 8 ۔ 1879ء صفحہ 151۔108) اور شراف نے 1913ء میں بھی اس کا ترجمہ کیا ہے ۔ ریناڈ نے کتاب کے آخری دفعہ موجودہ صورت اختیار کرنے کی تاریخ 247 یا 246ء بتائی ہے ۔ مگر یہ ناممکن ہے ۔ میک کرنڈل نے اسے 89۔80ء کے بین بین کا قرار دیا ہے اور شراف (صفحہ 15) نے 60ء ۔ مگر اس کے بعد میرے نام ایک خط میں وہ 80ء کو مرجع خیال کرتا ہے اور اس سنہ کو تقریباً صحیح مان لینا چاہیے ۔ دریائے "سندھ" سے مراد جیسا کہ ریورٹی نے بیان کیا ہے' سندھ کے علاقے کا دریائے مہران ہی ہے ۔

۱۹ۓ سوکریٹس (پندرھویں صدی) اور دوسرے مصنفین بیان کرتے ہیں کہ ان تبرکات کو الجزیرہ کے علاقے میں روحہ (اڈیسہ) کے مقام پر مدفون کیا گیا ہے اور وہاں ایک عالیشان گرجا اس کی یادگار میں تعمیر کیا گیا۔ متن کتاب کی حکایت اور ابتدائی عیسائی مصنفین کے حوالے بلا کسی تنقید و تصدیق کے مسٹر ڈبلیو۔ آر۔ فلپس مضمون ۔ "دی کونکشن آف سینٹ ٹامس دی اپاسٹل ود انڈیا" (انڈین انٹی کویری جلد 32' 1903ء صفحہ 15 اور صفحہ 160۔145) لے لیے گئے ہیں ۔ بشپ میڈلی کاٹ کی کتاب: "انڈیا اینڈ دی اپاسٹل ٹامس" (1905ء) میں بہت کچھ مذہبی مواد ملتا ہے ۔

۲۰ سکوں اور کتبوں میں اس بادشاہ کا نام مختلف صورتوں سے مذکور ہے: گنڈوفریس، گڈوفرا اور گڈوفرنا وغیرہ۔ اس کتبے پر جو تخت بھائی کے مقام پر پشاور کے شمال مشرق میں پایا گیا۔ ایک نامعلوم سنہ (103) کے حساب سے گڈوفرا کے 26 ویں سال کی تاریخ مذکور ہے۔ اس کی سلطنت کے آثار قدیمہ کی شہادت پر فان سیلٹ پرسی گارڈنر (بی۔ایم۔کیٹلاگ آف کائنز آف گریک اینڈ سیتھک کنگس آف انڈیا)، سنیارٹ (تولس ڈاسی گریفیا انڈین)، وی اے سمتھ (دی کشان پیریڈ آف انڈین ہسٹری، جے۔آر۔اے۔ایس 1903ء صفحہ 40) اور دیگر مصنفین نے بالتفصیل بحث کی ہے۔ مسٹر آر۔ڈی۔بیزجی کا خیال ہے سنہ 103 سے مراد سک سن ہے اور یہ اس طرح 181ء کے برابر ہے۔ انہوں نے زیادہ تر کتبے کی کروشتی طرز تحریر اور کم و بیش کشان خاندان کی تاریخ کی بناء پر اپنی اس رائے کا انحصار کیا ہے (انڈین انٹی کویری 1908ء صفحہ 47، 62) لیکن پارتھیا کی تاریخ اس قدر نامکمل حالت میں ہے کہ اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی اور کروشتی طرز تحریر کی ابھی اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور خود مجھ کو گنڈوفریس کے اس قدر بعد کی تاریخ پر پورا اطمینان نہیں۔

۲۱ فادر جوزف وہلمان۔ایس۔جے نے ایک نہایت ہی فاضلانہ رسالہ اس کے متعلق لکھا ہے اور اس میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ گنڈوفریس کی حکایت کو تاریخی طور پر ثابت کیا جائے۔ میں نے یہ کتاب نہایت غور سے پڑھی ہے مگر وہ مجھے قائل نہ کر سکا۔ میں نے ہیگ کی کتاب نہیں پڑھی۔ پروفیسر کارب ان دونوں کتابوں پر تنقید کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ سینٹ ٹامس کے متعلق ہر ایک قسم کی حکایت ناقابل قبول ہے اور جنوبی ہند کی عیسائیت غالباً ایران سے وہاں آئی تھی کیونکہ اس ملک میں عیسائیوں کو 341 و 411 کے درمیان اذیت اور تکلیف پہنچائی گئی تھی اور اس وجہ سے وہ لوگ وہاں نقل مکان کر آئے تھے۔

۲۲ نظام شین کا ایک تقریباً صحیح خاکہ اس باب کے اخیر میں ضمیمہ س میں جدول معاصرین میں ملے گا۔ اس جدول میں صرف زیادہ نام درج کیے گئے ہیں۔

۲۳ سکوں کی پلیٹ شکل 4۔

۲۴ بارہویں صدی عیسوی میں بھی باختر کا دو کوہانوں والا اونٹ بالائی سندھ میں پایا اور پالا جاتا تھا۔ (الادریسی۔ منقول از ریورٹی۔جے۔اے۔ایس۔بی۔ جلد 61 حصہ اول 1892ء صفحہ 224)

۲۵ چندراگپتا کے مقرر کردہ وہ افسر جن کے فرائض "اجنبیوں کی خاطر و تواضع اور دیکھ بھال تھی" (سٹریبو باب 15 فصل 1 صفحہ 2۔5) بالکل یونانی افسر پراکسنوئی کے مانند ہیں اور یہ ممکن ہے، اگرچہ اب تک اس کا ثبوت نہیں ملا کہ وہ یونان کی ہی دیکھا دیکھی مقرر ہوئے ہوں (نیوٹن۔ "ایسیز آن آرٹ اینڈ آرکیالوجی۔" صفحہ 121۔ انڈین انٹی کویری 1905ء صفحہ 200)

۲۶ مصنف کتاب بھی اسی خیال پر قائم ہے کہ ویبر اور ونڈش سنسکرت ناٹک پر یونانی اثرات

دکھلانے میں بالکل حق بجانب ہیں۔ دیکھو ویبر: "ہسٹری آف انڈین لٹریچر" (ٹریوبنر صفحہ 217) سلوین کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ (تھنگز انڈین صفحہ 366-343) اور بہت سے علماء اس سے متفق ہیں۔ سنسکرت ناٹک کی اصلیت بالکل ہی مختلف مسئلہ ہے۔ دیکھو --- زیڈ۔ ڈی۔ ایم۔ جی 1910ء صفحہ 535' 536۔

۱۷ دیکھو جرنل انڈین آرٹ جنوری 1900ء صفحہ 89۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1903ء صفحہ 94۔ تھیوڈور کے اس کتبے کے لیے جو سوارنت کی وادی میں پایا گیا ہے' اس کے علاوہ دیگر یونانی نام ایک تو ہیلیوڈورس ہے جو بیسنگر کے کتبے میں ملا (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 1053' 1087' 1093) اور دوسرا آگے سلوس جو پشاور کے مقام پر کنشک کے صندوقچے پر کندہ پایا گیا (ایضاً صفحہ 1058)

۱۸ کننگھم۔ آرکیالوجیکل رپورٹ' جلد دوم صفحہ 129' جلد 5 صفحہ 72' 69' 190 پلیٹ 17' 18۔ بنیاد کے "بڑے تانبے کے سکے" یقیناً ازیس اول کے زمانے کے ہیں (وی۔ اے سمتھ کا مضمون: "گریکو رومن انفلوئنس آن دی سولیزیشن آف اینشنٹ انڈیا" جے۔ اے۔ ایس۔ بی 1889ء جلد 58 حصہ 1 صفحہ 116-115) مسٹر گراؤس نے تراشے ہوئے پتھر کا ایک ٹکڑا متھرا کے مقام پر پایا تھا۔ "جس میں آیونی ستون پر ایک محراب قائم کی گئی تھی۔" (متھرا۔ تیسری ایڈیشن صفحہ 171) کننگھم نے جلال آباد کے آہن پوش کے ستوپ کے رومی آیونی ستون کا ٹکڑا شائع کیا تھا (پروسیڈنگس۔ اے۔ ایس۔ بی 1879ء صفحہ 209)

۱۹ وہ بت جو پلس اتھینی کی شکل میں تراشا ہوا ہے۔ (جے۔ اے۔ ایس۔ بی مضمون مذکورہ بالا صفحہ 121 پلیٹ 7)۔

۲۰ جو رائے کتاب میں ظاہر کی گئی ہے وہ بالعموم اس رائے کے مطابق ہے جو مسٹر ٹرن نے اپنے مضمون "نوٹس آف ہیلنزم ان باکتریا اینڈ انڈیا" میں ظاہر کی ہے (جرنل ہیلنک سٹڈیز 1902ء صفحہ 293-268)۔

۲۱ یہ فہرست فان سیلٹ کی فہرستوں پر مبنی ہے۔ مگر ان کو مکمل کر لیا گیا ہے۔ بہت سے مذکورہ بالا بادشاہوں کی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت اس قدر مبہم ہے کہ فہرست کو حروف تہجی کے لحاظ ہی سے مرتب کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

۲۲ کننگھم (نیومسمیٹک کرانیکل 1870ء صفحہ 81) گارڈنر (بی۔ ایم۔ کیٹلاگ' صفحہ 34) اے۔ سوٹرا اور اے۔ فیلو پیٹر کو جدا جدا قرار دیتا ہے اور ریپسن تقریباً اس خیال سے متفق ہے۔

۲۳ گارڈنر (بی۔ ایم۔ کیٹلاگ' صفحہ 19) ہیلیو کلیز معلوم ہوتا ہے کہ یوکرے ٹائیڈز کے باپ اور بیٹے دونوں کا نام تھا۔

۲۴ پلوٹ کے دلائل کے مطابق ... نکالا گیا ہے کہ ان ... 147 مطابق 165 ق م

مراد ہے۔ دیکھو سائکس "ٹین تھاوزنڈ مائلز ان پرشیا" صفحہ 363۔

۵؎ رچرڈس نے اس نام کے ہجے "پلکو نمنم" لکھے ہیں۔ آیا نے "پلکو متم" مگر مکنزی (کتاب مذکورہ صفحہ 137) نے اسے پلو متم لکھا ہے۔ غالباً مقدم الذکر صحیح ہے۔

۶؎ "تاملین انٹی کویری" جلد اول نمبر4' صفحہ 54۔ مصنف نے مہاوس کے قول کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا۔ تامل قوم کی روایت اس رسالے کے صفحہ 66 میں مذکور ہے۔

دسواں باب

کشان یا ہندی سیتھی خاندان

تقریباً 20ء تا 225ء

یُوچی قوم کا نقل مکان

وسط ایشیا کے میدانوں کی خانہ بدوش اقوام کے نقل مکان کا مختصر ذکر گذشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ مگر اس نقل وطن نے ہندوستان کی سیاسیات پر ایسا گہرا اثر ڈالا ہے کہ اس کا مفصل ذکر نہ صرف مناسب بلکہ لابدی ہے۔

دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں ترکی خانہ بدوشوں کی ایک جماعت، جنھیں چینی ہیونگ نو کہتے ہیں نے اپنی ایک ہم نسل ہمسایہ اور حریف قوم کی کو شکست دی۔ اکثر علماء نے اس واقعے کی تاریخ 165 ق۔م قرار دی ہے۔ مگر ڈاکٹر فلیٹ کا خیال ہے کہ یہ جنگ 160 – 174 ق م کے بین بین واقع ہوئی۔ اس شکست سے یوچی قوم کو مجبوراً شمال مغربی چین کے صوبہ کن سُہ کو خیرباد کہنا پڑا اور انھوں نے مغرب کی طرف نئی چراگاہوں کی تلاش میں نقل مکان کیا۔ اس متحرک قوم نے تیراندازوں کی ایک فوج تیار کر لی جس کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ سے دو لاکھ تک کیا جاتا ہے۔ مگر یہ سب کی سب جماعت تعداد میں پچاس لاکھ اور ایک کروڑ کے بین بین ہوگی جس میں ہر عمر کے مرد اور عورتیں شامل تھیں۔

وُوسُن کی شکست

یہ قوم مغرب کی سمت ایسی چراگاہوں اور مرغزاروں کی تلاش میں چلی جہاں ان کے کثیر التعداد مرد و زن اور چوپایوں کو آذوقہ اور خوراک مل سکے۔ وہ کیوچا (شمالی عرض بلد 41^0 – ‘38

مشرقی طول بلد 83° - 25' کے پاس سے گذرتے ہوئے تکلمکان (یعنی قدیم صحرائے گوبی) کے صحرا کے شمال میں پہنچے۔ یہاں ان کی مڈبھیڑ ایک اور چھوٹی سی قوم سے ہوئی جس کا نام وُوسُن تھا اور جو دریائے ایلی دوسن اور اس کے دو جنوبی معاون تیکے اور سنگیز کے میدان میں آباد تھی۔[1] وُوسُن کی تعداد اگرچہ محض دس ہزار تیراندازوں پر مشتمل تھی، مگر انہوں نے اپنے ملک کی بربادی اور تباہی گوارا نہ کی، بلکہ اس کی حفاظت کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر یوچی کی تعداد کی کثرت سے حملہ آوروں کو فتح ہو گئی اور یہ لوگ وُوسُن کے سردار کو قتل کر کے مغرب کی طرف جھیل ایسک کل جس کو ہیون سانگ نے جھیل تسنگ لکھا ہے، کے پار اور زیادہ فراخ چراگاہوں کی تلاش میں بڑھتے چلے گئے۔ ان جلاوطنوں کی ایک تھوڑی سی تعداد جنوب کی جانب ہو رہی اور تبت کے ملک کی سرحد پر بس گئی۔ یہ لوگ آخر میں "قلیل یوچی" کے نام سے مشہور ہو گئے اور ان کا بڑا حصہ جو مغرب کی طرف بڑھتا چلا گیا "کثیر یوچی" کہلایا۔

سک قوم کی شکست

اس کے بعد دوسرا دشمن جس سے یوچی کو سابقہ پڑا وہ سک یا سے قوم تھی جس میں بلاشک وشبہ ایک سے زیادہ جرگے شامل تھے۔ کیونکہ جیسا کہ ہیروڈوٹس نے لکھا ہے، ایرانی تمام سیتھی خانہ بدوش جرگوں کو سکائی کہا کرتے تھے۔ یہ سک قوم وُوسُن کے مغرب اور دریائے جیحوں (سیر دریا) کے شمال میں رہتی تھی۔ اس نے بھی وُوسُن کی طرح اپنے ملک وعلاقے کی حفاظت اور حمایت پر کمر باندھی۔ مگر ان کا حال وُوسُن سے بھی برا ہوا کیونکہ ان کو مجبوراً اپنی چراگاہیں یُوچی قوم کے لیے چھوڑ دینا پڑیں اور یہ لوگ اس میں بس گئے۔ اب سک قوم مجبوراً اس بات پر آمادہ ہوئی کہ نئی سرزمین تلاش کرے۔ اور جیسا کہ گذشتہ باب میں بیان کیا گیا ہے، یہی لوگ انجام کار شمالی دروں سے نکل کر ہندوستان میں داخل ہوئے۔[2]

تقریباً 140 ق م، یوچی کی شکست

پندرہ یا سولہ برس تک یوچی قوم اپنے مفتوحہ علاقے میں بالکل بے فکر بیٹھی رہی۔ مگر اسی اثنا میں ان کے قدیم دشمن ہیونگ نو قوم نے وُوسُن قوم کے سردار کے شیرخوار بچے کو اپنی زیرِ عاطفت لے لیا تھا اور اب وہ ان کی زیرِ نگرانی جوان ہو گیا تھا۔ اس نوجوان شہزادے نے ہیونگ نو کی مدد سے یوچی پر حملہ کیا اور اپنے باپ کی موت کا بدلہ اس طرح لیا کہ ان کو اس اراضی سے نکال باہر کیا جس کو یوچی نے سک قوم سے چھینا تھا۔ اس طرح اب یہ لوگ جب دوبارہ نقل مکان پر مجبور ہوئے تو دریائے سیحون کی وادی میں چلے گئے اور یہاں کے باامن اور صلح کن

باشندوں کو، جنہیں چینی "تاہیا" کہتے تھے، زیر نگین کیا۔ اغلب یہ ہے کہ فوراً باختر کے تمام علاقے پر یوچی کی دھاک بیٹھ گئی اور ان کا سیاسی حلقہ اثر دریائے سیحون کے جنوب تک پھیلا۔ مگر بہر حال جرگے کا صدر مقام بہت دنوں تک دریا کے شمال ہی کی جانب رہا اور اسی سمت کی چراگاہیں اس نووارد قوم کے لیے کافی ہو گئیں۔

یوچی قوم مدنی ہو گئی

اندازاً ایک یا دو پشتیں گذرنے کے زمانے ہی میں یوچی قوم نے اپنی خانہ بدوشی کی تمام عادات و خصائل فراموش کر دیں اور ایک ملکی آبادکار قوم بن گئی۔ اس کے ساتھ دریائے سیحون کے جنوب کا تمام باختری علاقہ اور اس کے شمال میں سغدانہ کا علاقہ شامل تھا۔ یہ لوگ پانچ ریاستوں میں منقسم تھے۔

10 ق م

بہ ہیئت مجموعی یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام معاشرتی اور سیاسی ارتقاء 10 ق م میں بالکل مکمل ہو گیا تھا۔

یوچی کی سلطنت کا اتحاد

اس کے بعد ایک صدی تک یوچی قوم کی سلطنت کی تاریخ کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ لیکن اس قوم کی پانچ ریاستوں میں، جو ہندوکش کے شمال میں واقع تھیں، منقسم ہو جانے کے کم و بیش سو برس بعد جرگے کے کشان حصے کا سردار (جو یورپ میں کڈفائسس اول کے نام سے مشہور ہے) اس کام میں کامیاب ہوا کہ اپنے ہم قوم دیگر سرداروں کو اپنا زیر نگین کر لے اور خود تمام یوچی قوم کا سردار اور بادشاہ ہو جائے۔ اس کی تخت نشینی کی تاریخ اندازاً صحت کے ساتھ 15ء مقرر کی جا سکتی ہے اور اس میں غلطی کا زیادہ احتمال بھی نہیں۔ [1]

یوچی ہندوکش کو عبور کرتے ہیں

وہی آبادی کی زیادتی اور آذوقے کی کمی کا دباؤ جس نے اس سے قبل بھی یوچی قوم کو چین کی سرحد سے لے کر ہندوکش تک کے دور دراز اور دشوار گذار سفر پر آمادہ کیا تھا، اسی نے اب اسے اس امر پر مجبور کیا کہ وہ اس سدراہ کو بھی عبور کرے۔ اور اسی نے کڈفائسس اول کی ہمت افزائی کی کہ وہ ان پہاڑوں کے جنوبی صوبجات کو زیر کرنے کا مشکل اور دشوار کام اپنے ہاتھ

میں لے۔

کڈفائسس اول کی سلطنت

اس نے کی پن (کشمیر؟ کافرستان؟) اور کابل کے علاقے پر قبضہ کیا۔ [4] اپنی طولانی مدت حکومت میں اس نے اپنی طاقت کو باختر میں مستحکم کیا اور پھر پارتھیوں پر حملہ آور ہوا۔ اس طرح اس کی حکومت ایران سے لے کر دریائے سندھ اور غالباً جہلم تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں سغدانہ جو آج کل خان بخارا کے ماتحت ہے اور غالباً وہ تمام علاقے شامل تھے جن پر آج کل سلطنت افغانستان متصرف ہے۔ افغانی کوہستان کے جنگجو اور جفاکش پہاڑی باشندوں کو پوری طور پر فتح کرنے میں بہت سے سال صرف ہوئے ہوں گے اور اس واقعے کو کسی خاص سنہ کے ساتھ متعلق نہیں کیا جاسکتا۔ مگر 20ء کو کابل کی فتح کی تاریخ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ہندی یونانی اور ہندی پارتھی دول کا خاتمہ

یوچی قوم کے آگے بڑھنے سے دریائے سندھ کے مغرب کی ہندی یونانی اور ہندی پارتھی ریاستوں کے سرداروں کا خاتمہ لابدی تھا۔ گذشتہ باب میں اس امر کا ثبوت دیا جاچکا ہے کہ کس طرح کابل کے آخری یونانی بادشاہ میوس کو بتدریج مغلوب کرنے کا اظہار نہایت صراحت سے سکوں کے ذریعے ہوتا ہے۔

پنجاب اور وادی سندھ میں ہندی پارتھی سلطنت کا خاتمہ غالباً کنشک کی قسمت میں لکھا تھا۔

تقریباً 45ء، کڈفائسس دوم

اسی برس کی عمر میں کڈفائسس اول کے فاتحانہ عہد حکومت کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ 45ء کے قریب اس کا بیٹا تخت نشین ہوا جس کو آسانی کے لیے کڈفائسس دوم کا خطاب [5] دیا گیا ہے۔ یہ بادشاہ بھی اپنے باپ کے مانند باہمت اور اولوالعزم تھا اور اس نے بھی اپنی تمام طاقت یوچی کی سلطنت کو وسیع کرنے میں صرف کر دی۔

یہ باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ اس نے پنجاب اور دریائے گنگا کی وادی کے ایک بڑے حصے کو غالباً بنارس تک فتح کر لیا۔ دریائے سندھ کی وادی میں زیریں سندھ کا علاقہ بظاہر بدستور سابق پارتھی سرداروں کے ہاتھ ہی میں رہا۔ ہندوستان کے مفتوحہ صوبہ جات پر فوجی نائب السلطنت کے ذریعے نظم و نسق کیا جاتا تھا اور غالباً انہوں نے ہی وہ سکے مضروب و مروج

کرائے تھے جن کو ماہرین سکہ جات "گمنام بادشاہ" کے سکے کہتے ہیں اور تمام شمالی ہند میں وادی کابل سے لے کر وادی گنگا کے شہر غازی پور اور بنارس تک ایک طرف اور کچھ اور کاٹھیاواڑ تک دوسری طرف بکثرت پائے جاتے ہیں۔[6]

چین کے ساتھ تعلقات

115 — 125ق م میں چنگ کین کی سفارت یوچی قوم کے پاس اس وقت آئی جب کہ وہ دریائے سیحون کے شمال میں سغدانہ کے علاقے میں مقیم تھے۔ اس سفارت نے اس وحشی قوم کے تعلقات سلطنت وسطیٰ (چین) سے قائم کر دیئے اور سوا سو سال تک شہنشاہ چین نے سیتھی دول کے ساتھ اپنے تعلقات جاری رکھے۔ 87ء میں یہ سفارتی تعلقات ختم ہو گئے اور جب 23ء میں پہلے سیتھی خاندان کا خاتمہ ہوا تو مغربی ممالک میں چین کی سلطنت کا اثر و رسوخ بالکل برائے نام رہ گیا تھا۔ اس کے پچاس سال بعد چینیوں کی الوالعزمی پھر بروئے کار آئی اور 73ء سے لے کر 102ء تک کے تیس سالہ عرصے میں جنرل پن چو اپنی فوج ظفر موج کو لیے ہوئے آگے بڑھا چلا گیا' یہاں تک کہ چینی سلطنت کی سرحد رومی سرحد سے مل گئی۔[7] اس طرح اس جنرل نے مغرب کی طرف چینی قوم کی حکومت کو انتہائی وسعت کو پہنچا دیا۔ 73ء میں ختن کے بادشاہ نے چین کی اطاعت قبول کی اور اس کے بعد دوسرے بادشاہ بھی' جن میں کاشغر کا بادشاہ بھی شامل تھا' چینیوں کے مطیع ہو گئے۔ اس طرح اب مغرب کی طرف کا راستہ صحرا میں سے ہو کر چینی فتوحات اور تجارت کے لیے بالکل کھل گیا۔ بعینہٖ اسی طرح 94ء میں کچا اور کرشہر کی فتح نے ان کا شمال کا راستہ صاف کر دیا۔

تقریباً 90ء' چین کے ساتھ جنگ

فاتح چینیوں کے بتدریج آگے بڑھتے چلے آنے سے کشان خاندان کے بادشاہ کو تردد پیدا ہوا۔ یہ بادشاہ غالباً کڈفائسس دوم کا جانشین کنشک تھا جو اپنے آپ کو چینی شہنشاہ کا ہم پلہ اور ہمسر سمجھتا تھا اور اس نے اس کا باج گذار ہو کر رہنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ 90ء میں کھلم کھلا اور دلیری کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ کرنے کے لیے ایک چینی شہزادی کے ساتھ شادی کا پیام دیا۔ جنرل پن چو نے محض اس پیغام ہی کو اپنے آقا کی ذلت و بے عزتی متصور کیا اور اس کے ایلچی کو گرفتار کر کے اس کے پاس واپس بھیج دیا۔ کنشک اس بدسلوکی کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے ستر ہزار سواروں کی ایک فوج اپنے نائب السلطنت سی کی زیر کمان تیار کی اور اس کو چینیوں پر حملہ کرنے کے لیے سلسلہ کوہستان تسنگ لنگ یا تاریخ و مباش پامیر کے پار روانہ کر دیا۔ سی کی فوج غالباً درہ تاشکرغان

کے راستے سے روانہ ہوئی جو چودہ ہزار فٹ بلند ہے[8] اور پہاڑوں کو عبور کرنے کی دشواری کی وجہ سے اس کی حالت اس قدر ابتر ہو گئی کہ جونہی کاشغر یا یارقند کے میدانوں میں اتری وہ بڑی آسانی سے پن چو کے آہنی پنجے میں آ گئی اور اسے شکست فاش ہوئی۔ کنشک کو اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ چینی سلطنت کو خراج ادا کرے۔ اس زمانے کی چینی تاریخوں میں ایسی چند سفارتوں کا ذکر ہے جو اس زمانے خراج لے کر چین میں آئی تھیں۔[9]

تقریباً 60ء' شمال مغربی ہندوستان کی فتح

میں نے ان امور کو بیان کرنے میں' جو غالباً کنشک سے منسوب ہونے چاہئیں' کڈفائسس دوم کی حکومت کے حالات کو پس پشت ڈال دیا ہے جو بظاہر شمالی ہند کے ان علاقوں کی فتح میں مصروف رہا جس کا آغاز اس کے پیشرو کے زمانے میں ہو چکا تھا۔

رومی اثر

یوچی کی فتوحات نے رومی سلطنت اور ہندوستان کے مابین بری تجارت کا راستہ کھول دیا۔ کڈفائسس نے صرف تانبے اور کانسی کے سکے مضروب کرائے تھے۔ اس نے کابل کی فتح کے بعد اپنے سکے یا تو آگسٹس کے آخری سنین کے سکوں یا ویسے ہی ٹائبیرئس کے سکوں کی نقل میں ڈھلوائے تھے (38ء-14ء)۔ جب شروع زمانے کے قیاصرہ کے مضروبہ سونے کے رومی سکے مشرقی براعظم میں ریشم' مصالح' جواہرات اور رنگوں کی قیمت میں بکثرت آنے لگے تو کڈفائسس دوم کو سونے کے سکوں کی قدر معلوم ہوئی اور اس نے اس کے بعد رومی سکہ اوری کی نقل میں بکثرت سکے مضروب کرائے جو وزن میں بالکل اصل کے مطابق تھے۔ اسی طرح دھات کے خالص ہونے میں بھی ان میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ جنوبی ہند نے بھی اسی زمانے میں رومی سلطنت کے ساتھ بحری تجارت کا سلسلہ زور و شور سے جاری رکھا مگر یہاں کے مقامی بادشاہوں نے قیصری اوری سکہ کی نقل اتارنے کی کوشش نہ کی کیونکہ ان کی درآمد بکثرت ہوتی تھی۔ اور جس طرح کہ آج کل دنیا کے بہت سے حصوں میں انگریزی پاؤنڈ بطور سکہ استعمال ہوتا ہے اسی طرح اس زمانے میں رومی سکہ مستعمل تھا۔[10]

کڈفائسس دوم کا عرصہ حکومت

کڈفائسس دوم کی فاتحانہ حکومت کا زمانہ غالباً بہت دراز تھا۔ اس کے متعلق یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ ~~92~~ (78-55ء) تک حکمراں رہا۔[11]

تقریباً 78ء کنشک کی تخت نشینی

کڈ فائس دوم کے بعد کنشک تخت پر بیٹھا۔ تمام کشان بادشاہوں میں سے یہی ایک بادشاہ ہے جو اپنے پیچھے ایک ایسا نام چھوڑ گیا' جس کو ملکی روایات نے فراموش نہ ہونے دیا اور جو ہندوستان کی حد سے باہر بھی نامور اور مشہور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ یورپ میں سوائے ان چند علماء کے جو غیر مانوس تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں عام طور پر بالکل گمنام ہے۔ مگر تبت' چین اور منگولیا کی روایات میں اس کا نام اب تک زندہ ہے اور بدھ مذہب کے پیروؤں کے لیے وہ تقریباً اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اشوک کا نام۔ مگر باوجود اس شہرت عام کے اس کی تاریخ کا مواد بہت قلیل ہے۔ زیادہ تعجب یہ ہے کہ اس کا سنہ اب تک مشکوک ہے۔ بدقسمتی سے چین کے مورخین کی کتابوں میں سے کسی میں کوئی ایسی عبارت دریافت نہیں ہوئی جس سے کہ چین کی سلطنت کا کوئی واقعہ کنشک سے مطابقت کر سکے۔ جہاں تک کہ اب تک معلوم ہوا ہے تمام چینی کتابیں جن میں کنشک کا ذکر ہے' وہ محض بدھ مذہب کی دینی کتب ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان سے تاریخی واقعات کو اخذ کیا جا سکے۔ تبت اور منگولیا کی کتابوں کی طرح وہ دراصل یا تو ہندی روایات کا ترجمہ یا ان کا ایک قسم کا عکس ہیں۔ اس امر کے ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ ان میں کس قدر اختلافات و خیالات کیسے پریشان کن ہیں۔ مگر کنشک اور اس کے جانشینوں کا ذکر کتبوں کی ایک بہت بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے۔ ان کتبوں میں سے بیس سے زیادہ میں سنہ و تاریخ موجود ہے اور امید ہے کہ ان تمام کتبات کے ذخیرے سے تمام شکوک مٹ جائیں گے اور کشان خاندان کا سلسلہ سنین بھی اس طرح قائم ہو جائے گا کہ اس میں شک و شبہ یا بحث کی گنجائش نہ رہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ان کتبوں میں تاریخیں اس طرح لکھی ہیں کہ ان کے مختلف معنی لیے جا سکتے ہیں۔ اور اب بھی بعض نامور علماء ایسے موجود ہیں جو کنشک کی تخت نشینی کا سن 58ء قرار دیتے ہیں۔[12]

اس کی تاریخ

مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں کہ محض سکوں کی ہی شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کنشک سنہ عیسوی کے شروع ہونے کے بہت بعد ہوا ہے۔ اس کا زمانہ کڈ فائس اول و دوم کے بعد کا ہے اور یہ کہ اس پر رومتہ الکبری کا اثر پڑا تھا۔ یہ سکوں کی شہادت ایسی چیز ہے جس کو بہت سے تاریخ کے علماء نے بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ بہت سی قسم کی شہادتیں جن کو اگر جمع کر دیا جائے تو وہ بہت قابل قدر ہو جائیں گی' یہ بات ثابت کرتی ہے کہ کنشک پہلی صدی عیسوی کے

بالکل آخر میں تخت پر بیٹھا اور گمان غالب یہ ہے کہ وہ کڈ فائسس دوم کے بعد 78ء میں تخت نشین ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ کنشک یوچی قوم کے حصہ کشان سے تعلق رکھتا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ دونوں کڈ فائسس کا تعلق اس سے تھا اور یہ باور کرنے کیلئے بھی کافی وجوہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا بیٹا نہ تھا' بلکہ اس کے باپ کا نام وجھشپ یا وجھشپ تھا۔ کڈ فائسس دوم اور کنشک کے سکوں پر جو اکثر ایک ہی جگہ پائے جاتے ہیں' ایک ہی قسم کے نشان ہیں اور الٹی طرف اور دیگر بہت سی مشابہتوں کے علاوہ وزن اور دھات کے خالص ہونے میں بالکل یکساں ہیں۔ [۱۳] ان باتوں سے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ زمانے کے لحاظ سے یہ دونوں بادشاہ ایک دوسرے کے بہت ہی قریب یا حقیقت میں ایک دوسرے کے جانشین ہوں گے۔ یہ یقینی ہے کہ کڈ فائسس دوم (ین۔کو۔چنگ) نہ صرف کڈ فائسس اول (کیو۔ٹسیو۔کئو) کا جانشین بلکہ اس کا بیٹا بھی تھا۔ یہ کڈ فائسس دوم ایک طولانی حکومت کے بعد اسی برس کی عمر میں فوت ہوا۔ اس لیے اگر کنشک کا تعلق کڈ فائسس دوم سے تھا تو وہ یقیناً اس کا جانشین ہی ہوا ہو گا۔ اور جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ کنشک' واشک' ہوشک' یا سودیو تمام بادشاہوں کا گروہ کا گروہ کڈ فائسس اول سے قبل ہوا تھا تو دو موخر الذکر بادشاہوں کے سکے یکجا ملنے چاہئیں مگر وہ نہیں ملتے۔ اسی طرح کڈ فائسس دوم نے "تین چو (ہندوستان) کو فتح کیا اور پھر اس پر یوچی قوم کی طرف سے حکومت کرنے کے لیے فوجی افسر مقرر کیے۔" اس امر واقعی میں کسی کو بھی مجال اعتراض نہیں۔ کنشک' واشک اور ہوشک دریائے جمنا کے مقام متھرا اور کشمیر اور پنجاب کے تمام درمیانی علاقوں پر پورے استحکام کے ساتھ قابض تھے اور اب یہ معلوم نہیں ہوتا (جیسا کہ چینی مورخین نے لکھا ہے) کہ کڈ فائسس دوم کے "فتح ہند" سے قبل انہوں نے اپنی یہ حیثیت پہلے سے کس طرح قائم کرلی تھی۔ آثار قدیمہ کے دل اکتانے والے دلائل کی تفصیلات سے اب قطع نظر کرکے یہاں صرف یہی کہہ دینا کافی ہو گا کہ بہت سے وجوہ اس امر کے بیان کیے جاسکتے ہیں کہ ماہرین علوم ہندیہ کی ایک بڑی جماعت اس بات پر متفق اور حق بہ جانب ہے کہ کنشک بادشاہوں کا گروہ کڈ فائسس بادشاہوں کے بعد کا ہے۔ ان تمام باتوں کے متعلق ہمارا علم اس قدر محدود ہے کہ خواہ کوئی نظریہ بھی اختیار کیوں نہ کیا جائے مشکلات رہ ہی جاتی ہیں۔ لیکن بہرحال بادشاہوں کے ناموں کا نظام بظاہر دوسری قوموں کی تاریخ اور عام فنون لطیفہ' ادبیات اور مذہبی تحریکات کے ارتقاء کے بالکل مطابق نظر آتا ہے۔ [۱۴]

78ء: اس کی سلطنت کی وسعت

اس طرح اب یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ کنشک تقریباً 78ء میں کڈ فائسس دوم کا جانشین ہوا جس کا غالباً وہ قرابت دار بھی تھا۔ اس کے زمانے کی روایتیں یا آثار اور کتبات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی سلطنت تمام شمال مغربی ہندوستان پر ایک طرف جنوب میں سلسلہ کوہستان بندھیاچل تک اور دوسری طرف پامیر کی سطح مرتفع کے دور افتادہ دروں تک پھیلی ہوئی تھی۔

ہیون سانگ جس نے اس تاریخ یا روایات کو قلمبند کیا ہے جو اس نے کپس میں سنی تھی' صاف طور پر لکھتا ہے کہ "جب کنشک گندھر کے علاقے میں حکمراں تھا تو اس کی طاقت گرد و نواح کی ریاستوں پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کا اثر دور افتادہ علاقوں پر بھی چھایا ہوتا تھا۔" وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ایک وسیع علاقے جو تسنگ لنگ کے پہاڑوں کے مشرق تک پھیلا ہوا تھا حکومت کرتا تھا۔ یعنی "وہ جنوبی علاقہ جو مشرق کی طرف پامیر کی حد ہے اور اس کو دریائے تاریم کے علاقے سے جدا کرتا ہے۔"[15] ہندوستان خاص میں اس کے سکے کڈ فائسس دوم کے سکوں کی معیت میں کابل سے لے کر دریائے گنگا کے کنارے پر غازی پور کے شہر تک برابر پائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی تعداد میں ان کی کثرت اور اختلافات کی وجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عہد حکومت خاصا طویل و مدید تھا۔ سندھ کا بالائی علاقہ اس کی سلطنت میں شامل تھا۔[16] مگر فاتح کی حیثیت سے جو شہرت اس کو حاصل ہوگئی ہے' اس سے یہ اغلب ہے کہ اس کی فتوحات کا سلسلہ دریائے سندھ کے دہانوں تک بڑھا ہوا تھا۔ اور اگر اس کے وقت میں وہ لوگ موجود تھے تو اس نے ان پارتھی بادشاہوں کا بھی بالکل صفایا کر دیا جو اس علاقے میں پہلی صدی عیسوی تک حکمراں تھے' مگر اس کے بعد ان کا نام سننے میں نہیں آتا۔

اس کے تعلقات رومتہ الکبریٰ سے

وہ ہندی سفارت جس نے 99ء میں ٹراجن کے روما میں واپس آنے کے بعد اس کی خدمت میں مبارکباد عرض کی غالباً اس کو کنشک نے ہی اپنی فتوحات کو مشتہر کرنے کے لیے روانہ کیا ہوگا۔[17]

116ء میں دریائے دجلہ و فرات کے درمیان علاقہ الجزیرہ پر عارضی طور پر ٹراجن کے قبضہ سے رومتہ الکبریٰ کی سرحد اور یوچی سلطنت کی مغربی حد میں صرف 600 میل کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اور اگرچہ دریائے فرات کے مشرقی صوبے کو اس کی فتح کے دوسرے ہی سال ہڈرین نے واگذاشت کر دیا تھا مگر اس میں شک نہیں ہے کہ اس زمانے میں شمالی اور مغربی ہندوستان کے

بادشاہ اس مغربی سلطنت کی عظمت اور شہرت سے بخوبی واقف تھے۔[18]

کشمیر کی فتح

یہ غالباً کنشک کا ہی کام تھا کہ اس نے کشمیر کی دور افتادہ وادی کو زیر نگین اور اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کیا۔ یہ یقینی ہے کہ اس نے اس خوشگوار ملک کو اپنے اور تمام مقبوضات میں ہمیشہ مرجح سمجھا۔ یہاں اس نے بہت سی عمارات تعمیر کرائیں اور ایک شہر بسایا جو اگرچہ اب محض ایک گاؤں ہی رہ گیا ہے مگر کنشک کا نام اب تک اس میں باقی ہے۔[19]

پاٹلی پتر پر حملہ

روایت کا بیان یہ ہے کہ کنشک اندرون ملک میں بہت دور تک چلا گیا تھا اور اس نے اس بادشاہ پر حملہ کیا تھا جو پاٹلی پتر کے قدیم دار السلطنت میں حکمراں تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اس شہر سے بدھ مذہب کے ایک ولی اشوگھوش نامی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس حکایت کے تمام پہلوؤں اور اختلافات کا مقابلہ کرنے کے بعد صرف اتنی بات صحیح مان لینے کے وجوہ ملتے ہیں کہ کنشک اور اشوگھوش ہمعصر تھے۔[20] اس کتاب میں اختیار کیا گیا نظام سنین اگر صحیح ہے تو ہندی سیتھی یا کشان خاندان کی سلطنت کنشک کے عہد حکومت میں مہاراشٹر کے کشہرات ستر پ نہپان اور اجین کے ستر پ چشتن کی معرفت (جو غالباً سک قوم کا تھا) تمام مغربی ہندوستان پر پھیل گئی تھی۔ جیسا کہ ان کے خطابات سے ظاہر ہے یہ دونوں سردار یقیناً کسی اعلیٰ تر بادشاہ کے زیر نگرانی ہوں گے اور یہ بادشاہ یا حکمران سوائے کنشک اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس کا دار السلطنت

کنشک کا دار السلطنت پرشپور (موجودہ پشاور) تھا۔ یہی وہ شہر تھا اور اب بھی ہے جو افغانستان کے دروں کے ہندوستان کی شاہ راہ کی حفاظت کرتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں جب کنشک بدھ مت کا پرجوش حامی اور پیرو ہو گیا تھا تو اس نے اسی مقام پر تبرکات کا ایک زبردست مینار مٹھ تیار کیا تھا جس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے عجائبات میں شمار کیے جانے کے لائق تھا۔ بنیاد کے اوپر تیرہ منزلوں کا ایک مینار قائم کیا گیا تھا جو بلندی میں 400 فیٹ تھا اور جس پر لوہے کا ایک زبردست کلس تھا۔ جب ایک چینی جاتری سنگ ین چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں اس جگہ آیا تھا تو یہ مینار تین دفعہ جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور ہر دفعہ کوئی نہ کوئی زاہد وعابد بادشاہ پھر ~~اسے~~ قائم کر دیتا تھا۔ ایک خانقاہ جو اسی کے قریب واقع تھی،[21] نویں صدی

عیسوی تک بدھ مذہب کی تعلیم کا ایک بارونق مرکز تھا۔ اسی آخری زمانے میں بدھ مذہب کا ایک زبردست عالم ویر دیو بھی وہاں آیا تھا جو آخر کار مگدھ کے بادشاہ دیوپال کے زمانے میں 892–844ء[22] نالند کی خانقاہ کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

اس مشہور و معروف عمارت کی آخری بربادی بلاشک و شبہ محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے حملوں سے ہوئی۔ بدھ مذہب کے مقدس مقامات میں بتوں کی افراط و کثرت کے نظارے سے مسلمان بت شکنی کے واسطے دیوانہ وار بڑھتے تھے اور ان کا جوش بالاخر تباہی اور بربادی کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔

پارتھی جنگ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کنشک کی اولوالعزمی ہندوستان کی سرحد کے اندر محدود نہ تھی۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے پارتھیوں کے مقابلے میں ایک کامیاب جنگ کی تھی جس میں اس نے اس قوم کے بادشاہ پر حملہ کیا۔ جس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ "سخت احمق اور تیز مزاج تھا۔[23]" یہ پارتھی بادشاہ ممکن ہے کہ خسرو یا ان رقیب شہزادوں میں سے کوئی اور ہو جو پارتھی تخت و تاج کے 130ء–108ء کے درمیان دعویدار تھے۔[24]

کاشغر' یارقند اور ختن کی فتح

کنشک کی سب سے زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز فوجی مہم کاشغر' یارقند اور ختن کی فتح تھی۔ یہ چینی ترکستان کے نہایت وسیع صوبے ہیں جو تبت کے شمال اور پامیر کے مشرق میں واقع ہیں اور آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی چین کے باج گذار تھے۔[25] جب 90ء میں اس نے اس دشوار مہم کو سر کرنے کی کوشش کی تھی تو جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس کو اس میں سخت ناکامیاب اور رسوا ہونا پڑا تھا اور مجبوراً اس نے چین کو خراج ادا کرنا منظور کر لیا تھا۔ لیکن تھوڑی مدت کے بعد جب پن چو کا انتقال ہو گیا اور اس نے بھی ہندوستان اور کشمیر کے پرامن مقبوضات کو مستحکم کر لیا تو وہ اب گذشتہ مرتبہ کی بہ نسبت زیادہ تیار تھا کہ ناعذ مباش پامیر کے دشوار گزار پہاڑوں کو ایک زبردست فوج کی ہمراہی میں قطع کرے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جو ہندوستان کا کوئی موجودہ حکمران انجام دینے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ کنشک دوسری مہم میں کامیاب ہوا اور نہ صرف خراج کی ادائی کے فرض سے اپنی گلو خلاصی کر لی بلکہ ایک ایسی ریاست سے یرغمالی بھی حاصل کیے جو سلطنت چین کی باج گذار تھی۔ ایک صاحب تاریخ کا یہ بیان کہ ان یرغمالیوں میں چین کے ہن خاندان کے شہنشاہ کا بیٹا بھی شامل تھا' اس قابل نہیں معلوم ہوتا کہ

اس پر یقین یا اعتبار کیا جائے۔ وہ علاقہ جس کے حکمراں کے خاندان سے یہ یرغمالی حاصل کیے گئے تھے' کاشغر سے کچھ بہت دور واقع نہ تھا۔

یرغمالی

ان یرغمالوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا جو ان کے مرتبے اور شہزادگی کے شایاں شان تھا۔ ان کی بہت کچھ خاطر و مدارات کی گئی اور تینوں موسموں میں ان کے لائق مختلف بدھ خانقاہوں میں ان کو رہنے کی جگہ دی گئی۔ گرمی کے موسم میں جب کہ ہندوستان کے میدان دوزخ کا نمونہ ہو جاتے تھے' تو وہ ہنایان کی ایک خانقاہ شا۔ لو۔ کا میں ٹھنڈی ہوائیں کھاتے تھے۔ اس نام کے معنی غالباً خانقاہ کاشغر ہیں۔ یہ کپس یعنی کابل کے اس طرف موجودہ کافرستان میں واقع تھی اور خاص کر ان کے لیے اس کی تعمیر کی گئی تھی۔ موسم بہار و خزاں کے دوران میں جس میں برسات کا موسم بھی شامل تھا یہ لوگ گندھار غالباً خاص دارالسلطنت ہی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ موسم سرما میں ان کا قیام مشرقی پنجاب کے کسی نامعلوم مقام پر ہوتا تھا۔ جس کا نام اسی وجہ سے چین پر بھکتی پڑ گیا تھا۔ ان کی نسبت یہ مشہور تھا کہ انہوں نے چین بھکتی کے سکونت کے دنوں میں ناشپاتی اور شفتالو کو سب سے پہلے ملک میں رواج دیا' ورنہ اس سے قبل یہ دونوں پھل اس نواح میں بالکل ناپید تھے۔ ان میں سے ایک نے وطن جانے سے پہلے سونے اور جواہرات کا ایک بڑا ذخیرہ کپس کی خانقاہ کو بطور عطیہ دے دیا' اور وطن واپسی کے بعد بھی ہر ایک نے اس نیک سلوک کو یاد رکھا جو خانقاہ میں ان کے ساتھ کیا گیا تھا اور ہمیشہ وہاں سے خانقاہ کے پجاریوں کے نام رقوم بھیجتے رہے۔ احسان مند اور ممنون بھکشوؤں نے بھی اپنی دیواروں پر اپنے ان مہمانوں کی تصویریں کھینچیں جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ شکل و شباہت اور لباس میں بہت کچھ چینیوں کے مانند تھے۔ جب 630ء کے موسم باراں میں ہیون سانگ کپس کی خانقاہ میں مقیم تھا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کے رہنے والوں کے دلوں میں ان کے محسنوں کی یاد اب تک تازہ ہے اور وہ ان کی مغفرت کے لیے اب تک دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ 34-633ء میں وہ چودہ ماہ تک چین بھکتی کی اس خانقاہ میں مقیم ہوا جس میں پہلے وہ یرغمالی رہا کرتے تھے۔

خزانے کی حفاظت

ہیون سانگ کے سوانح نویس نے ایک عجیب و غریب حکایت اس خزانے کے متعلق بیان کی ہے جو ایک یرغمالی نے کپس کے مقام کی شا۔ لو۔ کا خانقاہ کے لیے جمع کرایا تھا۔ اس کی نسبت یہ مشہور تھا کہ [illegible] یا کو یریا جھمبل کے بت کے قدموں میں خانقاہ میں بدھ کے کمرے کے مشرقی

دروازے کے جنوبی طرف مدفون کر دیا گیا تھا۔ ایک بے دین راجا نے جب اس خزانے پر جبراً قبضہ کرنا چاہا تو اس محافظ دیوتا کی طرف سے ایسی نشانیاں ظاہر ہوئیں جن سے وہ ڈر گیا اور اپنا قصد ترک کر دیا۔ اور جب وہاں کے بھکشوؤں نے دینے والے کے ارادے کے مطابق اس خزانے کو خانقاہ کی ترمیم و مرمت میں صرف کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے بھی ایسی ہی نشانیاں دیوتا کی خفگی اور ناراضگی کی دیکھیں۔

اس وقت جب کہ ہیون سانگ اس خانقاہ میں ٹھہرا ہوا تھا تو وہاں کے بھکشوؤں نے اس سے التجا کی کہ وہ دیوتا سے اس امر کی اجازت حاصل کر دے کہ اس خزانے کو وہ گنبد کی مرمت میں (جس کی سخت ضرورت تھی) صرف کر دے۔ یاتری نے ان کی درخواست منظور کی۔ خوشبوئیں روشن کیں اور باضابطہ طور پر دیوتا کو اس بات کا یقین دلایا کہ خزانے میں سے کسی قسم کی فضول خرچی یا غبن نہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد مزدوروں نے اس جگہ کو کھودنا شروع کیا اور اس مرتبہ کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہوئی جس سے دیوتا کی ناخوشی ظاہر ہوتی۔ آخر کار 7 یا 8 فیٹ کی گہرائی پر تانبے کا ایک زبردست برتن دکھلائی دیا جس میں منوں سونا اور ایک بڑی تعداد موتیوں کی تھی۔ گنبد کی مرمت کے بعد جتنا روپیہ باقی بچا وہ غالباً مدت ہوئی ہیون سانگ سے کم پرہیزگار کھودنے والوں نے نکال لیا ہوگا۔[۲۶]

اشوک کی حکایات کا عکس

کنشک کی تبدیلی مذہب اور اس کے بعد بدھ مت کے لیے اس کے جوش کی جو حکایات بیان کی جاتی ہیں وہ اشوک کی حکایات سے اس قدر مشابہ ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے کہ ان میں کتنی سچائی ہے کہاں تک وہ واقعات پر مبنی ہیں اور کہاں تک وہ محض روایات کا پرتو ہیں۔ اشوک کی طرح اس یو۔ چی بادشاہ نے اپنی تزک کی عبارتیں نہیں چھوڑیں اور اسی وجہ سے جب ایک دینی کتاب سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تبدیلی مذہب کی وجہ بھی اشوک کی طرح خونریزی سے نفرت تھی تو ہمیں کوئی ایسا بیان نہیں ملتا جس سے کہ قول کی تصدیق و تنقیح ہو سکے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ بیان محض اس حکایت کا ایک قسم کا پرتو ہے جو اشوک نے اپنے متعلق بیان کی تھی۔

کنشک کی تبدیلی مذہب

جس طرح کہ مذہبی کتب کے مصنفین نے اشوک کی تبدیلی مذہب اور شاکیہ منی کے دین کو اختیار کرنے کے تاثرات کو فروغ دینے کے لیے اشوک کے کفر والحاد کے زمانے کی بے رحمی اور خونریزی کے ذکر میں افراط و تفریط کی ہے' اسی طرح کنشک کی نسبت بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس

کو بری یا بھلی کسی بات کا عقیدہ نہ تھا اور اوائل زندگی میں وہ بدھ مذہب کو پوچ اور لچر سمجھتا تھا۔ [۲۷] اس کے عقیدے کی تبدیلیوں کی سب سے اچھی سند اس کے کثیر التعداد اور مختلف سکوں سے ملتی ہے جو اکثر قدیم سکوں کی طرح نہ صرف اس بادشاہ کے مذہب پر روشنی ڈالتے ہیں جس نے کہ وہ سکے مضروب کیے بلکہ ان قوموں کے مذاہب پر بھی جو اس کے زیر نگین تھیں۔ اس کے سب سے بہتر اور غالباً سب سے قدیم سکوں پر یونانی زبان اور طرز تحریر میں عبارتیں ہیں اور ان پر سورج اور چاند کی مورتیں بنی ہوئی ہیں جن پر ان کے یونانی نام ہیلیوس اور سیلینے [۲۸] کندہ ہیں۔ بعد کے سکوں میں یونانی طرز تحریر تو باقی ہے مگر زبان یونانی نہیں بلکہ قدیم فارسی ہے' اور ساتھ ہی وہ دیوتا جن کی مورتیں ان پر ہیں ان میں یونانی' ایرانی اور ہندی ہر قسم کے دیوتا ملتے ہیں۔ [۲۹] وہ نادر سکے جن پر بدھ شاکیہ منی کی مورت اور یونانی زبان میں اس کا نام منقوش ہے' بالعموم یہ قیاس ہے کہ اس کی حکومت کے آخری زمانے کے ہوں گے' لیکن ان کی ساخت میں کمال صناعی نمایاں ہے اور یہ ممکن ہے کہ وہ قیاسی زمانے سے وہ پہلے کے ہوں۔ [۳۰] اگرچہ کنشک کی تبدیلی مذہب کی صحیح تاریخ کا یقین ناممکن ہے مگر اغلب یہ ہے کہ یہ واقعہ اس کے تخت نشین ہونے کے چند سال بعد ہی ظہور میں آیا ہو گا۔

بدھ بطور ایک دیوتا کے

بدھ کا مختلف النوع اور بے میل دیوتاؤں کے گروہ میں نمودار ہونا اشوک کے نزدیک ایک عجیب و غریب خیال ہو گا۔ بلکہ ایسی بات اس کے سان و گمان میں بھی کبھی نہ آئی ہو گی۔ مگر کنشک کو یہ بات بالکل معمولی معلوم ہوتی تھی۔ اصل یہ ہے کہ اس کے زمانے کا نیا مذہب جو مہایان کے نام سے مشہور تھا ایک بڑی حد تک بیرونی اثرات سے متاثر تھا اور اس کے ارتقاء میں ہندی' زردشتی' عیسائی' ناستک اور یونانی عناصر کا عمل ہوا تھا۔ اس عمل کو سکندر کی فتوحات ہند میں موریا سلطنت کے قیام اور سب سے بڑھ چڑھ کر شروع کے قیاصرہ کے زمانے میں رومتہ الکبریٰ کے اتحاد سے بہت مدد ملی تھی۔ اس نوخاستہ بدھ مذہب میں گوتم بدھ اگرچہ نظری طور پر نہیں لیکن عملاً ایک دیوتا بن گیا تھا اور اس کے ماتحت بودھستو کم طاقتور قوتیں تھیں جو گنہگار لوگوں اور اس کے درمیان بیچ بچاؤ کا کام دیتی تھیں۔ اسی قسم کا بدھ ان اقوام کے دیوتاؤں میں شامل ہو گیا تھا جو کنشک کی وسیع سلطنت میں اس کے زیر فرمان تھیں۔ اور غالباً بعد کے زمانے کے راجا ہرش کی طرح جو شیو اور بدھ دونوں کا مطیع اور پیرو تھا کنشک بھی اپنے نام نہاد کی تبدیلی مذہب کے بعد پرانے اور نئے دیوتا دونوں کی پرستش کرتا تھا۔

گندھارکی سنگ تراشی

گندھار کے مشہور و معروف سنگ تراشی کے نمونے جو ضلع پشاور اور گردونواح کے علاقے میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور جس کے بہت سے اچھے نمونے کنشک اور اس کے جانشینوں کے زمانے کے ملتے ہیں' اس نئے اور تغیر شدہ بدھ مذہب کی صورت کو بہت اچھی طرح ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک مذہب تھا جس میں بہت سے دیوتا شامل تھے۔ [1] کورنتھ کے سے ستونوں کے اوپر کے آراستہ و پیراستہ حصے اور دیگر خصوصیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گندھار کی سنگ تراشی یونانی رومی عام صنعت کی محض ایک شاخ تھی۔ لائق نقادفن اب اس امر میں عام طور پر متفق ہیں کہ فن کی اس شاخ کے آخری ارتقاء کا زمانہ دوسری صدی عیسوی کے اوائل میں تھا۔ [2]

بدھ مذہب کی مجلس

بدھ مت کی مذہبی تاریخ میں کنشک کی حکومت اس خصوصیت سے اور مشہور ہے کہ اس نے ایک مذہبی مجلس منعقد کی تھی جس کا نظام بالکل اسی اسلوب پر تھا جیسا کہ اشوک کی مجلس کا۔ کنشک کی کونسل کا ذکر لنکا کی تاریخوں میں بالکل نہیں پایا جاتا اور ظن غالب یہ ہے کہ ان کو کبھی اس کے متعلق کوئی اطلاع ہی نہیں ملی۔ اسی وجہ سے اس کی نسبت تمام معلومات کا انحصار شمالی ہند کی ان روایات پر ہے جو چینی' تبتی اور منگولی مصنفین نے محفوظ رکھی ہیں۔ قدیم مجالس کی طرح اس مجلس کے حالات میں بھی سخت اختلاف ہے اور تمام تفصیلات صریحاً افسانہ آمیز و قیاسی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کنشک نے ایک راہب کے زیر ہدایت جو ہر روز اس کو پڑھانے محل میں جایا کرتا تھا فرصت کے اوقات میں بدھ مذہب کی مقدس کتب کا مطالعہ کیا۔ بادشاہ کو مختلف فرقوں یا مذاہب کی متضاد تعلیمات سے بہت پریشانی ہوئی اور اس نے اپنے استاد مقدس پارشو کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ بہتر یہ ہے کہ مذہب کے صحیح عقائد و بیانات کو حاصل کیا جائے۔ پارشو نے اس رائے سے بالکل اتفاق ظاہر کیا اور فوراً دینی علماء کی ایک عام مجلس منعقد کرنے کے لیے انتظامات کیے گئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام علماء جو مدعو کیے گئے تھے محض ایک ہی فرقے یعنی ہنایان ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلا سوال جس کا تصفیہ کرنا ضروری تھا وہ یہ تھا کہ مجلس کا انعقاد کہاں ہو۔ بادشاہ نے گندھار کے علاقے کو تجویز کیا۔ مگر وہاں یہ اعتراض ہوا کہ اس کی آب و ہوا زیادہ گرم تر ہے' پھر کسی نے تجویز کیا کہ مگدھ علاقے میں راج گڑھی کے مقام پر جہاں پہلی مجلس بھی منعقد ہوئی اس کا بھی انعقاد کیا جائے۔ بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ کشمیر کے خوشگوار علاقے میں وہاں کے دارالسلطنت کے قریب کندلون کے مقام پر مجلس کا انعقاد ہو۔ بسومتر اس کا صدر اور مشہور و معروف مصنف

اشوگھوش، جس کو مذکورہ بالا حکایت کے بموجب پاٹلی پتر سے قید کر کے لائے تھے، اس کا نائب صدر مقرر ہوا۔ ارا کین نے جو تعداد میں 500 تھے، بڑی تندہی سے قدیم ترین مذہبی علوم کی کتابوں سے لے کر کتب حاضرہ تک کی چھان بین کی تھی اور شریعت کے تینوں حصوں پر بڑی ضخیم تفسیریں لکھیں۔ جو کتابیں اس طرح تیار کی گئیں ان میں مہاو بھاشا بھی شامل تھی جو آج کل بھی چینی زبان میں موجود ہے اور بدھ مذہب کے فلسفہ کا مجموعہ بیان کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر تککسو کا جو ان باتوں میں بہت بڑی سند ہیں، خیال ہے کہ جب تک وہ کتاب علماء زمانہ کے ہاتھ میں نہ آجائے اس وقت تک کشمیر کی مجلس یا اس کے کاموں پر رائے زنی بالکل بے کار ہے۔ جب اس مجلس کا تمام کام ختم ہو گیا تو ان کی مرتب کی ہوئی تفاسیر کو تانبے کی چادروں پر کندہ کرایا اور انہیں ایک خاص ستوپ میں محفوظ کر دیا جو اسی غرض سے کنشک نے تعمیر کرایا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ قیمتی خزانہ سری نگر کے پاس کسی ٹیلے کے نیچے دبا ہوا اب بھی موجود ہو اور کسی موقع پر مل جائے۔ مجلس کے خاتمے کے بعد کنشک نے کشمیر کی آمدنی کو اشوک کی طرح مذہب کے لیے مخصوص کر دینے کا دوبارہ ارادہ کیا اور خود درہ بارہ مولا میں سے ہو کر اپنے دارالسلطنت واپس چلا گیا۔[۳۲] میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ مجلس 100ء کے قریب منعقد ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اس مجلس کو کوئی سیاسی اہمیت نہ دینی چاہیے۔

کنشک کی موت کے متعلق حکایت

ان حکایات میں جن کو ایم۔ سلوین لیوی نے شائع کیا ہے، ایک عجیب و غریب حکایت کنشک کی موت کے متعلق شامل ہے جو ممکن ہے کہ اصلی واقعات پر مبنی ہو۔ اس سے تاریخ کے نئے سرے سے لکھے جانے پر جس کی تائید مسٹر آر۔ ڈی۔ بینرجی نے کی ہے، بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اسی کو میں نے بھی تمام معلومہ واقعات کے سمجھنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ حکایت مفصلہ ذیل ہے:

> اس بادشاہ کا ایک وزیر ماتھر نامی بڑا صاحب فراست تھا۔ اس نے کنشک سے کہا کہ "حضور اگر آپ اپنے خادم کی بات سنیں اور مانیں تو تمام دنیا حضور کی حلقہ بگوش ہو جائے گی سب کے سب آپ کے مطیع و فرماں بردار ہو جائیں گے، ہشت اقالیم آپ کے سایہ عاطفت میں پناہ گزیں ہو جائیں گے۔ جو کچھ آپ کے خادم نے عرض کیا ہے اس پر غور فرمائیے۔ مگر اسے ظاہر نہ کیجئے۔" بادشاہ نے جواب دیا کہ "بہت بہتر، جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی کیا جائے گا۔" تب وزیر نے تمام لائق و فرزانہ جرنیلوں کو جمع کیا اور چار پہلوؤں کی ایک فوج مرتب کی۔ جس طرف بادشاہ اپنے عنان پھیرتا لوگ اس کے سامنے اس طرح سربسجود ہو جاتے جس طرح کہ گھاس طوفان برق و باد کے سامنے۔ تین

اقالیم کے باشندے اطاعت کے لیے حاضر ہوئے اور بادشاہ کنشک کے رہوار کے سموں کے نیچے جو چیز آتی یا تو ٹوٹ جاتی یا مڑ جاتی۔ بادشاہ نے کہا "میں نے تین جہت کو تو زیر نگین کر لیا ہے اور ان کے تمام آدمی میرے سایہ عاطفت میں آگئے ہیں۔ صرف شمال کی جانب نے اب تک اطاعت نہیں کی۔ اگر میں اس کو بھی مطیع کر لوں تو اس کے بعد کسی کے برخلاف ایسے موقع کی تلاش میں نہ رہوں گا کہ اس میں دست اندازی کروں۔ مگر اب تک اس میں کامیاب ہونے کا کوئی اچھا ذریعہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" یہ الفاظ سن کر بادشاہ کی رعایا نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا: "بادشاہ حریص، سفاک اور بے عقل ہے۔ اس کی متواتر جنگوں اور فتوحات نے اس کی رعایا کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ قناعت اس میں نام کو نہیں، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ جہات اربعہ پر حکمرانی کرے۔ دور دراز مقامات پر افواج متعین ہیں اور ہمارے اعزا و اقربا ہم سے دور پڑے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم کو آپس میں اتفاق کر کے اس کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد ہم خوش و خرم رہیں گے۔" چنانچہ اس کی بیماری کی حالت میں انہوں نے اسے ایک رضائی اڑھا دی، اس کے اوپر ایک شخص بیٹھ گیا اور اس طرح بادشاہ نے وہیں جان دے دی۔ [۳۴]

معلوم ہوتا ہے کہ کنشک نے پینتالیس برس حکومت کی تھی اور یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ 123ء میں ہوا تھا۔

واشک

کنشک کے جانشینوں کے متعلق معلومات بہت محدود ہیں۔ کتبات سے ثابت ہوتا ہے کہ 24ء، 28ء میں واشک، 32ء و 60ء میں ہوشک متھرا کے مقام پر برسر حکومت تھا۔ مگر 41ء میں اس مقام پر کنشک بھی حکمراں تھا۔ اس ظاہری تضاد کو باہم ربط دینے کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ فرض کر لیا جائے کہ واشک اور ہوشک دونوں کنشک کے بیٹے تھے اور اس زمانے میں جب کہ ان کا باپ کوہستان کے اس پار جنگ و جدل میں مشغول تھا وہ یکے بعد دیگرے شمالی ہند میں اس کے نائب السلطنت تھے۔ واشک کا کوئی سکہ دریافت نہیں ہوا اور غالباً وہ اپنے باپ کی موت سے قبل ہی وفات پا چکا تھا، اس لیے اس کے بعد اس کا دوسرا بیٹا [۳۵] ہوشک تمام سلطنت کا مالک ہوا تھا۔ ہوشک کے کثیر التعداد سکے ممکن ہے کہ اس کے تخت شاہی پر بیٹھنے کے بعد ہی مضروب ہوئے ہوں۔ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ واشک کو سکے مضروب کرانے کی اجازت نہ تھی کیونکہ اگر اس کے کچھ سکے مضروب ہوتے تو یہ ناممکن ہے کہ اس کے بعض نمونے اب تک

دریافت نہ ہو گئے ہوتے۔

ہوشک

یہ یقینی امر ہے کہ ہوشک کی سلطنت میں کابل،[6] کشمیر اور متھرا شامل تھے۔ موخر الذکر شہر میں ایک عالیشان بدھ خانقاہ کا نام اسی کے نام پر رکھا گیا تھا،[7] کیونکہ اپنے باپ کی طرح وہ بھی بدھ مذہب کا بڑا زبردست حامی و مددگار تھا۔ اپنے مشہور تر پیشرو سے وہ اس بات میں بھی مشابہت رکھتا تھا کہ اسے بھی اس کی طرح یونانی، ہندی اور ایرانی دیوتاؤں کا یکساں شوق تھا۔ ہوشک کے سکوں کی مورتوں میں ہرکلیس، سراپس (سراپو) سکندر مع اپنے بیٹے وساکھ، آگ کا دیوتا فیرو اور بہت سی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ مگر بدھ کی مورت اور نام دونوں میں ندارد ہیں۔ اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ہندی سیتھی بادشاہ بدھ مذہب میں بہت کچھ راسخ الاعتقاد نہ تھے اور غالباً یہ سمجھنا صداقت سے بہت دور نہ ہو گا کہ شاہی انعام و اکرام مذہب کے علاوہ ان کی زبردست اور طاقتور خانقاہوں کو دیے جاتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی دور اندیش بادشاہ اس زمانے میں اتنی مجال نہ رکھتا تھا کہ ان طاقتور اور بااثر خانقاہوں کو نظر انداز کر دے، جن کی شاخیں سلطنت کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی تھیں۔

ہشکپور

ہوشک نے کشمیر میں ایک شہر ہشکپور (ہوشک پور؟) بسایا۔ یہ عین درہ بارہ مولا کے، جو اس زمانے میں اس وادی کا "مغربی دروازہ" کہلاتا تھا، پار واقع ہونے سے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا اور صدیوں تک مشہور و معروف رہا۔ 631ء میں جب ہیون سانگ کشمیر گیا تو چند روز تک ہشکپور کی خانقاہ والوں نے اس کی مہمان نوازی کا پورا پورا حق ادا کیا اور وہاں سے اس کو اس طرح باعزت و احترام دارالسلطنت پہنچایا گیا کہ پانچ ہزار بھکشو اس کے ہمرکاب تھے۔ ہشکپور کے موقع پر آج کل ایک چھوٹا سا گاؤں اشکور نامی آباد ہے جہاں ایک قدیم ستوپ کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔[8]

ہوشک کا عرصہ حکومت

اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ ہوشک کا عرصہ حکومت زیادہ تھا۔ مگر اس کے عہد کے تمام سیاسی واقعات بالکل فراموش ہو گئے ہیں۔ اس کے کثیر التعداد سکے کنشک کے سکوں سے بھی زیادہ مختلف قسم کے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس زمانے

کے فن سنگتراشی کی طرح ان میں بھی یونانی خیالات کا اثر برابر پایا جاتا ہے۔ چند سونے کے سکوں پر بادشاہ کی نہایت عمدہ اور خاص تصویریں بھی ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مستقل مزاج مگر بھدے نقشے کا آدمی تھا' جس کی بڑی بڑی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور تکاسی لمبی ناک [۹ سکہ] تھی۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں کشان کی سلطنت میں کسی قسم کا رخنہ یا کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ اس کی حکومت کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ 140ء میں یا اس کے قریب ہی ختم ہوئی۔

بسودیو اول کی حکومت؟ 140ء سے 173ء تک

ہوشک کے بعد بسودیو اس کا جانشین ہوا۔ اس بادشاہ کے خالص ہندی نام سے جو وشنو کا مترادف ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کس قدر جلد یہ اجنبی حملہ آور اپنے گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوئے تھے۔ اس کے سکے بھی اسی بات کی شہادت دیتے ہیں۔ چنانچہ تقریباً ان سب کی پشت پر شیودیوتا کی تصویر مع اس کے بیل نندی کند' ترسول اور ہندی بتوں کی دیگر علامات کے پائی جاتی ہیں۔ بسودیو کے کتبات سے جو اکثر متھرا ہی میں ملتے ہیں' 98-74ء کے بین بین ہیں' یعنی اس سنہ کے جو خاندان کشان کے زمانے میں مروج تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکومت کا عرصہ کم و بیش پچیس برس کا تھا۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس کا خاتمہ 100ء میں ہوا تھا جو اس نظام سنین کے مطابق ہے جو دفع الوقتی کیلئے اختیار کر لیا گیا ہے' 178ء کے برابر بنتا ہے۔

کشان سلطنت کا انحطاط و زوال

یہ بالکل ظاہر ہے کہ بسودیو اول کی طولانی مدت حکومت کے اواخر میں سلطنت کشان میں ضرور زوال آنا شروع ہو گیا ہو گا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خاتمے کے قریب یا فوراً اس کے بعد ہی کنشک کی سلطنت بھی ایشیاء کی دوسری سلطنتوں کے قانون زوال و انحطاط سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور مختصر سے زمانے کے اتحاد و اتفاق کے بعد اس کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ بسودیو کے مرنے کے ایک زمانے کے بعد تک اس کے نام ہی کے سکے مضروب ہوتے رہے۔ آخر کار ان میں بادشاہ کو ایرانی لباس پہنے ہوئے ظاہر کیا گیا اور یہ صریحاً معلوم ہوتا ہے کہ ان میں شاہپور اول ساسانی کی جس نے ایران پر 269-238ء تک حکومت کی تھی' تصویر کی نقل اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ [۱۰]

وباء

یہ امر قرین قیاس ہے کہ ہندی سیتھی سلطنت کے زوال میں اس عالمگیر وباء کی وجہ سے اور زیادتی ہوگئی جو 167ء میں بابل کے علاقے سے شروع ہوئی اور کئی سال تک رومی اور پارتھی سلطنتوں کو اس نے برباد کیے رکھا۔ روما کے شہر اٹلی اور صوبجات کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد اور تقریباً تمام کی تمام فوج اس وباء کی نذر ہوئی۔ نیو بھر نے رائے ظاہر کی تھی کہ "قدیم دنیا اس وباء کے اثرات سے جو مارکس آریلیئس کے زمانے میں پڑی پھر کبھی پنپی نہیں۔" اور یہ ممکن نہیں کہ ہندوستان اس سے محفوظ رہا ہو۔ انتہی

ہندوستان پر ساسانی اثر

سکوں کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران کا اثر پھر ہندوستان میں اندرون ملک پر پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ لیکن جن ذرائع و وسائل سے یہ اثر یہاں تک پہنچا ان کے متعلق کوئی بات یقینی طور پر معلوم نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ 277ء اور 294ء کے دوران میں بہرام (ورہران) دوم نے سیتان پر فوج کشی کی تھی۔ مگر تیسری صدی عیسوی میں ساسانیوں کے ہندوستان پر کسی حملے کا کوئی ذکر نہیں ملتا کیونکہ اس زمانے میں تمام تاریخی ماخذ کے معمولی منابع بالکل خشک ہوگئے تھے۔ کوئی ایسا کتبہ اب تک دریافت نہیں ہوا جس کو یقینی طور پر اس زمانے کا کہا جاسکے اور سکے بھی جو مقامی سرداروں اور بادشاہوں نے مضروب کرائے تھے' تاریخی حالات پر روشنی نہیں ڈالتے۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ ہندوستان کے دو زبردست اور عالیشان خاندان یعنی کشان شمال میں اور اندھر دکن کے سطح مرتفع میں ایران کے اشکانی خاندان کے ساتھ (جس کی جگہ ساسانی قائم ہوگئے) ایک ہی وقت میں (226ء) برباد و تباہ ہوئے۔ یہ بات دیکھتے ہوئے اس خیال کو اپنے دل سے دور کرنا بالکل ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے ان تینوں واقعات کا ایک دوسرے سے تعلق تھا اور شمالی ہند کے خاندان کشان کے سکوں پر جو ایرانی اثر پایا جاتا ہے اس کی وجہ کوئی نہ کوئی ایسا ایرانی حملہ ہوگا جس کی خبر ہم تک نہیں پہنچی۔ مگر اس خیال کی تائید کے لیے کوئی ثبوت بلاواسطہ نہیں ملتا اور اگر یہ حملہ ہوا بھی تو وہ ان قزاق و لٹیری اقوام کی طرف سے غالباً سیتان سے ہوا ہوگا جو ایران کے زیر اثر تھیں اور باقاعدہ حملہ سلطنت ایران نے ہندوستان پر نہ کیا ہوگا۔

بیرونی حملہ

بہرحال یہ بات عیاں ہے کہ شاہان کشان میں سے بسودیو آخری بادشاہ تھا جو ہندوستان میں

وسیع علاقوں پر حکمراں تھا۔ اس کی وفات کے بعد شمالی ہند میں کسی اعلیٰ حکومت کے وجود کا کوئی پتہ یا نشان نہیں ملتا۔ غالباً جس طرح ایشیائی سلطنتوں کی بربادی کے وقت بالعموم ہوا کرتا ہے بے شمار چھوٹے چھوٹے رجواڑے خود مختار ہو گئے اور بہت سی چند روزہ ریاستیں قائم ہوئیں۔ لیکن تیسری صدی عیسوی کی تاریخ کے لیے مواد اس درجے ناپید ہے کہ یہ بتانا ہی ناممکن ہے کہ یہ ریاستیں کیسی تھیں اور تعداد میں کتنی تھیں۔ بظاہر یہ تمام زمانہ پر از فتنہ و فساد تھا جس میں شمال مغرب سے بیرونی حملوں کی یاد باقی ہے اور جس کا اظہار پرانوں کے پریشان بیانات متعلقہ آبھیر' گردبھل' سک' یون باہلیک اور دوسرے اجنبی خاندان کے ناموں سے ہوتا ہے جو خاندان اندھر کے جانشین ہوئے۔ مذکورہ بالا تمام خاندان صریحاً بڑی حد تک ایک دوسرے کے ہمعصر تھے' نہ یہ کہ وہ ایک دوسرے کے بعد برسر حکومت ہوئے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی سلطنت اعلیٰ کے دعویٰ کا مستحق نہ تھا۔ اس پرفتن زمانے کے حالات' جو پرانوں میں پائے جاتے ہیں' کی ترتیب و تہذیب بظاہر بالکل امکان سے باہر ہے اور ایسے ناموں کی طولانی فہرست نقل کرنا تحصیل حاصل ہے جن کی اصلی شکل و صورت بھی یقینی نہیں ہے۔

کابل و پنجاب کے شاہان کشان

سکوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کشان نے پنجاب و کابل پر ایک عرصے تک اپنا سکہ جمائے رکھا تھا۔ یہ امر یقینی ہے کہ کابل کے شاہان کشان پانچویں صدی عیسوی تک جبکہ سفید ہنوں نے بالا خران کو مغلوب کیا' خاصے طاقتور تھے۔ چوتھی صدی کے اوائل میں ان کے ایک بادشاہ نے اپنی بیٹی ساسانی شاہ ایران ہرمزدوم کو بیاہی تھی اور 360ء میں جب شاہپور دوم نے آمدہ کے مقام کا محاصرہ کیا تو رومی محصور فوج پر اس کو ہندی ہاتھیوں اور سلطنت کشان کی فوج کی بدولت جو اس کے بڈھے بادشاہ گرمبیٹس کے زیر کمان تھی' نصیب ہوئی۔ یہ گرمبینس وہ تھا جسے فوج میں سب سے زیادہ عزت کی جگہ دی گئی تھی اور مدد کے لیے سیتان کے سک موجود تھے۔ [۴۲]

ماتحت سردار

اس بات کا تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ تیسری صدی عیسوی کے دوران جو بیرونی سردار پنجاب میں حکمراں تھے اور جنہوں نے تھوڑی بہت تحریف کے ساتھ بسودیواول کے سکے مضروب کرائے تھے کہاں تک کشان سے تعلق رکھتے تھے اور کہاں تک دیگر ایشیائی اقوام سے۔ اس قسم کے تمام سکوں کی عبارتوں میں جو ذرا تبدیل شدہ یونانی طرز تحریر میں لکھی ہوئی ہیں کنشک یا وسو (دیو) کشان۔ [۴۳] شہنشاہ کا نام تو محفوظ ہے مگر ہندی حروف میں جو نام لکھا ہوا ہے وہ چینی الفاظ کی

طرح ایک ہی حرکت کا لفظ ہے مثلاً بھ - ک - وی وغیرہ - گمان غالب ہے کہ یہ وسط ایشیاء کی مختلف اقوام کے سرداروں کے نام ہیں جنہوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور کشان یا کابل کے شاہی فرمانرواؤں کو اپنا حاکم اعلیٰ قبول کیا۔ ایک سکہ جس کا ایک رخ کشان کے سکوں سے ذرا تبدیل شدہ ہے اور جس پر ہندوستان کے براہمی حروف میں پاسن - نُ - شلد کے نام پائے جاتے ہیں۔ اس کی دوسری جانب آگ کی قربان گاہ کی ایسی تصویر ہے جو قدیم ترین ساسانی بادشاہوں کے سکوں پر پائی جاتی ہے۔ اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح تیسری صدی عیسوی میں پنجاب کا براہ راست تعلق ایران سے قائم ہو گیا تھا۔ [۱۲۵] یہ بھی یقینی ہے کہ آخری زمانے کے کشان بادشاہوں کے سکے صریحاً ساسانی سکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی ایک اور بڑی وجہ ان نظریات کو رد کر دینے کی ہے جو کنشک اور اس کے جانشینوں کو اس زمانے سے بہت قبل کا بتاتی ہیں۔

اندورن ہند کی تاریخ کی عدم موجودگی

تیسری اور چوتھی صدی کے اوائل میں پنجاب کے علاوہ شمالی ہند کے شاہی خاندانوں کے متعلق کچھ حال یقینی اور قابل اعتماد نہیں ملتا۔ یہ معلوم ہے کہ پانچویں صدی تک پاٹلی پتر کا شاہی دارالسلطنت ایک اہم مقام رہا' لیکن اس امر کے متعلق کوئی شہادت نہیں ملتی کہ تیسری صدی عیسوی میں وہاں کون اور کیسا خاندان برسر حکومت تھا۔ 302ء میں گپت سمت کے بانی نے ایک لکھوی شاہزادی سے اپنی شادی کر لینے کو جو اہمیت دی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی میں پاٹلی پتر پر ویشالی کی غیر آریہ قوم لکھوی حکمران تھی جو تبتیوں سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اس زمانے کی سب سے زیادہ قابل فہم فہرست شاہان مغربی ہند کے سک ستریوں ہی کی دستیاب ہو سکتی ہے جن کی تاریخ کا ذکر خاندان گپت کے بیان کے ضمن میں آئندہ باب میں آئے گا۔ 220ء یا 230ء کے قریب کشان اور اندھر خاندانوں کے نیست و نابود ہونے اور خاندان گپت کے قیام و استحکام کے درمیان میں جتنا زمانہ گذرا ہے وہ تاریخ ہند کا سب سے زیادہ تاریک زمانہ ہے۔

خاندان کشان کا اندازاً جدول سنین ۴۵؎

سن	واقعات
174 ق م	ہیونگ۔نو۔ کے سردار موداک کی موت۔
تقریباً 165	یو۔چی قوم کے بڑے جرگے کا ہیونگ۔نو کے ہاتھوں کنا۔سو سے بدر ہونا۔
163 "	وُوسُن قوم کا سردار نن۔تیو۔می یوچی قوم کے ہاتھ سے قتل ہوا۔
160	ہیونگ۔نو کے سردار کی۔یک کی موت۔
160–150 "	یوچی کا سک کی سرزمین پر قبضہ۔سک کا نقل مکان کرنا۔
150–140 "	قوم سک کا ہندوستان پر حملہ۔
140 "	نن۔تیو۔می کے بیٹے وُوسُن کے نوجوان سردار کیون۔مو کے ہاتھوں یو۔چی کا سک علاقے سے بدر ہونا۔
138 "	دریائے سیحون کے شمال اور جنوب میں یو۔چی قوم کا تا۔ہیا کے علاقے کو زیر کرنا اور ان کا شہری زندگی اختیار کرلینا۔
تقریباً 135 ق م	چینی شہنشاہ وُوتی کا چنگ۔کیان کو یو۔چی کی پاس سفیر بنا کر روانہ کرنا۔
125 "	دریائے سیحون کے شمال میں چنگ۔کیان کا یو۔چی کے مستقر میں پہنچنا۔
122 "	چنگ۔کیان کی چین کی طرف واپسی۔
114 "	چنگ۔کیان کی موت
100 "	دریائے سیحون کے جنوبی علاقوں میں قوم یو۔چی کے آبادیوں کی وسعت، علاقہ تا۔ہیا کے دارالسلطنت لن۔شیو کی جو دریا کے جنوب میں واقع تھا فتح۔ یہ شہر غالباً بلخ تھا۔
95	یو۔چی قوم کی پانچ [illegible] میں تقسیم [illegible] تھے۔

سن قبل مسیح	واقعات
58 "	سمت بکرمی یا مالوی۔
26 "	قیصر آگسٹس کے پاس ہندی سفارت کا جانا۔
2 "	ایک یو- چی بادشاہ نے ایک چینی افسر کو بدھ مذہب کی مذہبی کتب کی اطلاع دی (دیکھو فرنیک: "ٹرکو فولکر" صفحہ 92 حاشیہ)۔
سن عیسوی 8	مغرب اور چین میں عارضی پر سلسلہ آمد و رفت میں انقطاع کا واقع ہونا۔
14	رومی قیصر آگسٹس کی موت۔ اور ٹائبیرئس کی تخت نشینی۔
تقریباً 15	کڈ فائسس اول کشان (کیو- ٹسیو- کیو- کوز کلڈ فیس وغیرہ) کی تخت نشینی۔
15–30 "	کڈ فائسس اول کے زیر عنان یو چی کی پانچوں ریاستوں کا اجتماع و استحکام۔ اس کاکو- فو (کابل)- کی-پن (؟کشمیر یا کپس)- اور پوتا (؟باختریا اغلباً اراکوسیہ) کو فتح کرنا۔ کابل وغیرہ کا یونانی بادشاہ ہرمیناس اس کا ہمعصر تھا۔
23	چین کے پہلے ہُن خاندان کا خاتمہ۔
38	رومی قصر کیئس (کلی گلا) تخت نشین ہوا۔
41	کلاڈائس رومیوں کا قیصر تخت نشین ہوا۔
تقریباً 45	کڈ فائسس اول اسی برس کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کا بیٹا کڈ فائسس دوم کشان (ین-کو-چنگ-دیما کڈفائسس وغیرہ) اس کا جانشین ہوا۔ اس کا ماتحت "گمنام بادشاہ" (سوٹر میگس) اس کا ہمعصر تھا۔
45–70 "	ہندی' پارتھی طاقت کی بربادی' اور کڈ فائسس ثانی کا رفتہ رفتہ تمام شمالی ہندوستان کو فتح کرنا۔
54	رومی قیصر نیرو تخت نشین ہوا۔
64 "	چینی شہنشاہ مِنگ-تی نے بدھ مذہب کی کتابیں منگوائیں۔
68' 69	گلبا- آتو- وٹیلئس رومی قیاصرہ تھے۔
70	قیصرو یسپسن تخت نشین ہوا (22-دسمبر 69ء)۔
73–102	ختن وغیرہ میں چینی سپہ سالار پن-چو کا فاتحانہ کوچ۔
77	پلائنی کی "نیچرل ہسٹری" کا سنہ اشاعت۔
78	سالواہن یا-ساکا سک سمت کی ابتداء۔ کڈفائسس دوم کی موت۔ کنشک کشان کی تخت نشینی۔
79	رومی قیصر ٹیٹس کی تخت نشینی۔
81	رومی قیصر ڈومیشان کی تخت نشینی

سن قبل مسیح	واقعات
تقریباً 90	پن-چو کے سے مقابلے میں کنشک کی شکست۔
94	پن-چو-کے زیر کمان چینیوں کا کچا اور گر شہر کو فتح کرنا۔
96	رومی قیصر نروا تخت نشین ہوا۔
98	رومی قیصر ٹراجن کی تخت نشینی۔
99	ٹراجن کا روما میں واپس آنا۔
تقریباً 100	ٹراجن کے دربار میں ہندی سفارت کا آنا۔ بدھ مذہب کی مجلس کا انعقاد۔
103 "	چینی ترکستان میں کنشک کی فتوحات ۱۰۶ء
105	عرب میں بطراے کے مقام پر حبشی سلطنت کی رومیوں کے ہاتھوں بربادی۔ پلمیرا کا عروج۔
116	ٹراجن کا الجزیرے کے علاقے کو فتح کرنا۔
117	رومی قیصر ہیڈریان کی تخت نشینی۔ الجزیرہ کی واگزاشت۔
تقریباً 123	کنشک کی موت، ہوشک کشان تمام سلطنت کے مالک کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔
123–6	ہیڈریان کا ایتھنز میں مقام۔
131–36	یہودیوں کے ساتھ ہڈرین کی جنگ۔
138	رومی قیصر، انٹونینس پئس تخت نشین ہوا۔
تقریباً 140	باسودیو اول کشان تخت نشین ہوا۔
150	مغربی سترپ رودرادامن کا جوناگڑھ کے مقام کا کتبہ۔
161	رومی قیصر۔ مارکس آریلئس انٹونینس کی تخت نشینی۔
162–5	وُدلو گیسس پارتھی بادشاہ کی رومیوں کے مقابلے میں شکست۔
175	مارکس آریلئس کی مشرقی فوجی مہم۔
178	باسودیو اول کشان کی موت۔
178–236 "	آخری زمانے کشان بادشاہ۔ کنشک دوم وغیرہ۔
180	رومی قیصر کموڈس تخت نشین ہوا۔
192 و 193	پرٹنکس اور جیولئس قیاصرۂ روم۔
193	قیصر روم سپٹمس سیورس تخت نشین ہوا۔
تقریباً 200	پلمیرا کو رومی نو آبادی قرار دیا گیا۔
211	[illegible] قیصر تخت نشین ہوا۔

سن قبل مسیح	واقعات
216	کراکلا کی پارتھی فوجی مہم۔
217	رومی قیصر میکرینس کی تخت نشینی۔
218	رومی قیصر ایلا گیبلس کی تخت نشینی۔
222	رومی قیصر الکزنڈر سیورس کی تخت نشینی۔
226	اردشیر کا ایران میں سلطنت ساسان کی بنیاد رکھنا۔ ہندوستان میں کشان کی طاقت کا انحطاط اور اندھر خاندان کا خاتمہ تقریباً اسی زمانے کے لگ بھگ ہوا۔
260	شاہپور اول کے ہاتھوں رومی قیصر ویلرین کی شکست۔
273	یوریلئن کا پلمیرا کو تسخیر کرنا۔
284–305	ڈایو کلیشان رومی قیصر تھا۔
360	کشان کی مدد سے شاہ پور دوم نے آمدہ کا محاصرہ کامیابی سے کیا۔

حوالہ جات

[1] یو چی چپٹی ناک کی منگولی اقوام سے نہ تھے' بلکہ یہ دراز قد' گلابی رنگ اور دراز بینی لوگ تھے اور اوضاع و اطوار میں ہیونگ لوجن سے بہت مشابہ تھے۔ (کنگسمل: ج۔ آر۔ اے۔ ایس 1882ء صفحہ 7 رسالہ۔ "انٹرکورس آف چائنا ود ایسٹرن ترکستان")۔ کنشک' ہوشک اور کڈفائسس ثانی کے سکوں پر اچھی خاصی تصویریں موجود ہیں۔

[2] دارا گشتاسپ کے زمانے میں (500ق م) سکائی اور کپس دونوں کو ملا کر پندرہواں صوبہ بنتا تھا۔ اور کیخسرو کی فوج میں وہ باختری لوگوں کے رسالے کے ساتھ شامل تھے اور دارا اور اٹا کے بیٹے گشتاسپ کے زیر کمان تھے (ہیروڈوٹس باب 3 فصل 93' باب 7 فصل 64) اب کیونکہ ڈوئن کی اصلی جائے قیام کا پتہ چل گیا ہے اور اس کے معلوم ہو جانے سے یو چی کے نقل مکان کا تمام راستہ بالکل بین ہو گیا ہے' اس لیے سک قوم کی جائے قیام جو کتاب میں بیان کی گئی ہے غالباً درست ہے۔ سٹریبو نے صاف لکھا ہے کہ سک اور اقوام متعلقہ دریائے جیحون (سیردریا) کے گردونواح سے آئی تھیں۔ کینن راکنسن کی یہ رائے کہ دارا کے زمانے میں وہ کاشغر اور یارقند کے علاقوں میں بسے ہوئے تھے' اب بالکل قابل قبول نہیں (ترجمہ ہیروڈوٹس جلد 2 صفحہ 403' جلد 5 صفحہ 170)۔ سک قوم کے نقل مکان پر میرے مضمون "دی سکاز ان ناردرن انڈیا (زید۔ ڈی۔ ایم۔ جی 1907ء صفحہ 421۔ 403) اور ڈاکٹر ایف۔ ڈبلیو ٹامس کے مضمون سکستان (ج۔ آر۔ اے۔ ایس 1906ء صفحہ 216۔ 181 اور صفحہ 4۔ 420) میں مفصل بحث ہے۔ ٹامس اس امر پر یقین کرنے کی وجوہ بیان کرتا ہے کہ سک قوم شروع ہی سے سیستان میں آباد ہوئی تھی' اور اس کا یہ بھی خیال ہے کہ دوسری صدی ق م میں سیستان میں آکران کا آباد ہونا خلاف قیاس ہے۔ اس کتاب کی دوسری ایڈیشن میں میرا خیال تھا کہ یہ نقل مکان واقع ہوا ہے۔ مگر میں اب ڈاکٹر ٹامس سے متفق ہوں۔

[3] بہت سی کتابیں کشان حکومت کے اتحاد کو بہت بعد کا واقعہ قرار دیتی ہیں اور اس کی وجہ ماٹون لن کی چینی انسائی کلوپیڈیا کے مذکورہ تاریخی واقعات کے ملخص ترجمے کا غلط سمجھنا ہے۔ ان

اصلی کتب کی عبارتیں جن کو اس کتاب کے لکھنے والے نے اپنی کتاب میں جمع کیا تھا' کا ترجمہ شائع ہو جانے سے تمام واقعات صاف ہو گئے ہیں۔ اگرچہ صحیح تاریخیں اب بھی معلوم نہیں ہوئیں اور اگر آخر میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ بھی جائے کہ کنشک اور اس کے جانشینوں کے کتبات کی تاریخیں کسی خاص سنہ سے متعلق ہیں تو بھی اس نظام سنین پر زیادہ اثر نہ پڑے گا جو اس کتاب میں اختیار کیا گیا ہے۔ وہ بادشاہ جس کا نام متن کتاب میں کڈ فائسس اول لکھا ہے' وہی ہے جس کو چینی کیوٹسیو کیو کہتے ہیں اور جسے مختلف سکوں میں کوز کلڈ فیز' کوزول کڈ فیز لکھا ہے۔ ان ناموں یا لقبوں کے صحیح معنے نامعلوم ہیں۔ اس کے متعلق مکمل حوالے میرا مضمون "دی کشان اینڈ سیتھین پیریڈ آف انڈین ہسٹری" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1903ء صفحہ 64-1) دیکھیں۔ میں نے خود اس نظریے کو اب رد کر دیا ہے جس پر میں نے مذکورہ بالا مضمون میں زور دیا تھا کہ کشان لوکک سنہ کو استعمال کرتے تھے۔ کروشتی طرز تحریر میں اس قوم کا نام "کشن" لکھا ہے۔ مگر ساسانی اور چینی شہادات اس امر کی ملتی ہیں کہ یہ نام کشان تھا۔ مثلاً ہرمزد ثانی (9-302ء) کے سکوں پر "رباکشان" کے الفاظ۔ اسی وجہ سے میں نے بجائے عام "کشن" کے کننگھم اور ڈورن کے تتبع میں کشان لکھا ہے۔ سنین کے متعلق میں نے آر۔ ڈی بینرجی کے خیالات کی پیروی کی ہے۔

۴ چینی کتابیں جیسا کہ ایم سلوین لیوی نے اب ثابت کر دیا ہے' کی پن اور کوفو میں فرق ظاہر کرتی ہیں۔ کی پن یا کاپن کے نام کے اطلاق میں فرق آتا رہا ہے۔ ساتویں صدی میں تنگ خاندان کے زمانے میں عام طور پر' اگرچہ بالکل بلا استثناء نہیں' اس سے مطلب کپسا یعنی شمال مشرقی افغانستان ہوا کرتا تھا۔ ہن اور دی خاندانوں کے زمانے میں اس سے عموماً کشمیر مراد لی جاتی تھی۔ کتاب میں جس زمانے کا ذکر ہے وہ کیونکہ (23ء) آخری ہن خاندان کا زمانہ ہے' اس لیے کی پن کو کشمیر سمجھا جا سکتا ہے (سلوین لیوی' جے۔ اے جلد 7 سلسلہ 9' صفحہ 121' جلد 10 صفحہ 31-526) اس کے متعلق دیکھو ویٹرس کے عالمانہ خیالات (آن یون چانگ جلد اول صفحہ 259)' وہ لکھتا ہے کہ "بہت سی چینی کتابوں میں کاپن کا نام ایک مبہم جغرافیائی اصطلاح ہے۔ اس کی وسعت میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور دراصل وہ کسی خاص ملک یا علاقے کا نام نہیں۔ مختلف کتابوں میں اس کا اطلاق کپس' نگر' گندھار' ادیانہ اور کشمیر پر ہوتا ہے۔" سر ایم۔ اے۔ سٹین نے کاپن کے ہجے چی پن لکھے ہیں۔ تمام چینی ناموں کو مختلف مصنف مختلف صورتوں میں لکھتے ہیں۔ اس طرح تاریخیں بھی تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ دی جاتی ہیں۔

۵ یہی وہ بادشاہ ہے جس کو چینی ین۔ کو۔ چنگ کہتے ہیں اور جسے سکوں میں وما کڈف لسس وغیرہ لکھا ہے۔

۶؎ کیونکہ کڈ فائسس دوم کے زمانے کے کوئی کتبے نہیں ملتے' اس لیے اس کی ہندی سلطنت کی وسعت جانچنے کا سب سے بہتر طریقہ اس کی سکوں کی تقسیم ہے۔ جب پری پلس 80ء میں لکھی گئی تو اس وقت تک پارتھی سردار دریائے سندھ کے مثلثی دہانے میں حکمراں تھے۔ اس امر کا ثبوت کہ "گمنام بادشاہ" کڈ فائسس دوم کا ہمعصر تھا" کننگھم نے تفصیل سے دیا ہے (نیو سمیٹک کرانیکل 1892ء صفحہ 71)۔ اس کے سکے عام طور پر تانبے یا کانسی کے ہیں۔ مگر چند ایسے بھی ہیں جو نہایت خراب چاندی سے مضروب ہیں۔ کڈ فائسس دوم اور "گمنام بادشاہ" دونوں سوٹر میگس کا لقب استعمال کرتے ہیں۔ مگر مقدم الذکر اپنے آپ کو "بے سی لیئس بے سی لیئون" یعنی "شہنشاہ" اور موخر الذکر خود کو "بے سی لیئس بے سی لیون" یعنی "شاہ حکمراں" کہتا ہے۔ اسی سے یہ معلوم ہوا ہے کہ غالباً وہ اس کا ماتحت تھا (دیکھو کیٹلاگ آف کائنز ان دی انڈین میوزیم جلد اول)۔

۷؎ پروفیسر ڈگلاس کا بیان ہے کہ "جنرل پن۔ چو کے زیر کمان ایک فوج ختن پر حملہ آور ہوئی بلکہ اپنے ملک سے جھنڈے کو بحیرۂ خضر کے ساحل تک پہنچا دیا۔" (چائنا۔ سٹوری آف دی نیشنز سیریز صفحہ 18)

۸؎ تاشکر غان کے حال کے لیے جو اس کوہستان کے سری کول کے حصے میں واقعہ ہے' دیکھو۔ سٹین۔ پری لی می نری رپورٹ آف ایکسپلوریشن ان چائنیز ترکستان صفحہ 13۔11 سینڈ بریڈ روئنز آف ختن' باب 5۔ این شنٹ ختن صفحہ 54 نوٹ 17۔

۹؎ "شہنشاہ ہوا (ہیو۔ ہو۔ ٹی۔ یا ہو۔ تی) کے دور (105۔89ء) میں وہ (یعنی ہندی) اکثر چین کو اپنے ایلچی بھیجتے تھے اور کچھ نہ کچھ نذرانہ بطور خراج کے پیش کرتے تھے۔ لیکن بعد میں مغربی علاقے کے لوگوں نے (چینی شہنشاہ کے برخلاف) بغاوت کی اور تمام سلسلہ نامہ و پیام قطع کر دیا۔ یہ حالت پنسی کے عرصے کے دوسرے سال (159ء) شہنشاہ کوان (ہون۔ تی) (167۔147ء) تک رہی۔" (اینلز آف لیٹر ہن ڈائناسٹی' ترجمہ پروفیسر لیگ منقول فی۔) "انڈیا' وٹ کین اٹ ٹیچ اس۔"

۱۰؎ کشان کے سکوں کے اوزان کے لیے دیکھو کننگھم (کائنز میڈ۔ انڈیا صفحہ 16) اس کے متعلق جو آراء فان سیلٹ نے دی ہیں کہ کڈ فائسس اول اور آگسٹس کے چہروں کی مشابہت محض ایک اتفاقی امر ہے اور یہ کہ اس امر کے باور کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ کشان سکوں کے اوزان کا کوئی کسی قسم کا تعلق قیصر کے اوری سے ہو سکتا ہے' اس زبردست ماہر فن سکہ جات کی عجیب وغریب دیوانگی یا خبط ہی قرار دی جا سکتی ہیں۔ کڈ فائسس دوم کے ایک دریافت شدہ چاندی کے سکے کا وزن ساڑھے چھپن گرین ہے' اور جیسا کہ کننگھم نے کہا ہے یہ وزن عین چاندی کے [illegible] دینار کے برابر ہے۔ ہندوستان میں رومی سکے بکثرت پائے جانے کے حال کے متعلق دیکھو

تھرسٹن۔ "کائن کیٹلاگ نمبر 2 آف مدراس میوزیم" (جے آر۔ اے۔ ایس 1904ء صفحہ 591) پلائنی کی شہادت (ہسٹری نیچرل باب 12 فصل 8) رومی سونے کے سکوں کے ہندی' عربی' چینی عیش و عشرت کی چیزوں کے تبادلے میں مشہور و معروف ہے۔

سلہ اس کے عرصہ حکومت کی مدت و درازی کا کوئی بین ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ مگر اس کی فتوحات کی وسعت اور اس کے سکوں کی کثرت و افراط سے یہ بالکل یقینی معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ طولانی ضرور ہو گا۔ کننگھم نے اس کو چالیس برس کا زمانہ مانا ہے۔ کنشک کی حکومت کی تاریخ کا جو حال میں نے لکھا ہے وہ زیادہ تر انڈین میوزیم کے مسٹر آر ڈی۔ بینرجی کے اس اچھوتے اور قابل قدر مضمون پر مبنی ہے: "دی سیتھین پیریڈ آف انڈین ہسٹری۔" (انڈین انٹی کوری 1908ء صفحہ 75-25) انہوں نے جو وجہ کنشک' ہوشک اور واشک کی تاریخوں کے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کی بتلائی' میرے نزدیک وہ بالکل تسلی بخش ہے۔ اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ 41ء کا کنشک جس کا ذکر آرا کے کتبے میں ہے' وہی ہے جس کا بیان اس سے قبل کے کتبوں میں 3ء و 11ء میں کیا گیا ہے۔ پروفیسر لیوڈرس کا یہ خیال کہ آرا کے کتبے کا کنشک ثانی ممکن ہے کہ 3' و 11ء کے کنشک کا پوتا ہو' میرے نزدیک قابل ثبوت نہیں۔ میرے خیال میں لیوڈرس کا خیال صحیح ہے کہ کیسر اس کا جو لقب کنشک کو آرا کے کتبے میں دیا گیا وہ در اصل قیصر ہے۔ مگر کتبے کا یہ لفظ اب تک ایسا صاف نہیں ہوا کہ اس پر زور دیا جا سکے۔ کنشک کا نام کاشک لکھا جاتا ہے۔ اگرچہ مجھ کو اس امر پر پورا وثوق نہیں کہ 78ء کے سک سنہ کو کنشک نے قائم کیا تھا' یا اس کا قیام بالکل اس کی تخت نشینی کے سال ہی واقع ہوا۔ مگر اب میرا خیال یہ ہے کہ بہت اغلب ہے کہ سک سنہ کنشک کی تخت نشینی یا تاجپوشی ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس بادشاہ کو 57ء تک پیچھے ہٹا دینا جس پر ڈاکٹر فلیٹ نے اتنا زور دیا ہے' میرے نزدیک بالکل بے وجہ اور بے سبب ہے۔ اس بات کی بحث دیکھو۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1913ء۔ مجھے اس میں بھی شک نہیں کہ دونوں کڈ فائسس بادشاہ کنشک سے پہلے گذرے ہیں اور اب مجھ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوتی ہے کہ ٹیکسلا کے کھودے جانے سے جو نئی شہادت دستیاب ہوئی ہے اس نے میری رائے کو مستحکم کر دیا ہے۔

سلہ فلیٹ 58ء پر تلا ہوا ہے اور دونوں بھنڈارکر اور بھی زیادہ آخر کا زمانہ یعنی 278 بتلاتے ہیں۔ مگر ان کا نظریہ صریحاً ناقابل قبول ہے۔ اصل نزاع علماء کی ان دو جماعتوں کے مابین ہے جو کنشک کے تخت کا سن 58ء یا 78ء قرار دیتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کشان خاندان نے سک سنہ کے سوا اور کوئی سنہ استعمال کیا ہو۔ مگر اس کا احتمال نہیں اور اگر کوئی ایسا سنہ استعمال ہوا بھی تو وہ 78ء کے بعد نہ کہ پہلے شروع ہوا ہو گا۔ ڈاکٹر مارشل سی۔ آئی۔ ای ناظم محکمہ آثار قدیمہ ٹیکسلا کے آثار کے کھودنے کی تہوں سے اس بات کا پورا یقین ہو گیا ہے کہ کنشک دوسری نہ

کہ پہلی صدی عیسوی میں برسر حکومت تھا اور یہ کہ ڈاکٹر فلیٹ کے قول کو قبول کرنا ناممکن ہے۔ تمام ایسے کتبوں کی فہرست' جن میں تاریخیں موجود ہیں' کشان خاندان کے زمانے کے متعلق مصنف کے مذکورہ بالا مضمون میں ملے گی۔ کنشک کے تیسرے سال کے کتبے کے لیے' جو بنارس کے قریب سارناتھ کے مقام پر پایا گیا ہے' دیکھو اپی گریفیا انڈیکا جلد 8 صفحہ 173۔ اس کے علاوہ وہ اس فہرست میں اور بھی بہت کچھ اضافہ کرتا ہے۔

ﷺ کڈ فائس دوم اور کنشک کے سکوں کو ایک جگہ سے برآمد کرنے کی مثالیں مفصلہ ذیل ہیں:
(1) ضلع گورکھپور میں گوپال پور ستوپ: کڈ فائس دوم' کنشک' ہوشک اور قدیم بادشاہ آیومتر کے سکے (پروسیڈنگس۔ اے۔ ایس۔ بی۔ 1906ء صفحہ 100)۔ (2) بنارس میں 163 سکوں کا مجموعہ جن میں 12 تو کڈ فائس دوم کے ہیں اور باقی (جن میں سے 40 اب تک پڑھے نہیں جاسکے) کنشک اور ہوشک کے ہیں۔ (ٹامس پرنسپ۔ اسیز جلد اول صفحہ 227 حاشیہ)۔ (3) مین کے جمع کیے ہوئے بغرام کے سکے جو کابل سے پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ (کتاب مذکورہ بالا صفحہ 51۔ 344) اس کے علاوہ دیکھو آریانہ انٹی کوا۔ ڈاکٹر مارشل کو جو بے شار سکے ٹیکسلا میں ملے ہیں' ان سے خاندانوں کی وہی ترتیب جو اس کتاب میں دی گئی ہے بالکل یقینی ہو جاتی ہے۔

ﷺ ڈاکٹر فلیٹ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1903ء۔ 1905ء۔ 1906ء۔ 1913ء کے متعدد مضامین) برلن کے ڈاکٹر او۔ فرینک اور جیمز کینڈی کی یہ رائے ہے کہ کنشک' واشک' ہوشک اور بسودیو شاہان کڈ فائس سے پہلے گذرے ہیں اور یہ کہ 58ء کا سمت بکرماجیت یا تو کنشک کی تخت نشینی سے شروع ہوا تھا یا کم از کم دونوں واقعات ایک ہی ساتھ کے ہیں۔ میں نے مذکورہ بالا علماء کی تمام کتب شائع شدہ کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ مجھ کو اب بھی ان سے بدستور سابق اختلاف ہے۔ اور میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ شاہان کڈ فائس کنشک سے (جو تقریباً 78ء میں تخت پر بیٹھا تھا) پہلے گذرے ہیں۔ ڈاکٹر فلیٹ نے (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1907ء صفحہ 1048) یہ بالکل ظاہر کردیا ہے کہ وہ ڈاکٹر فرینک کی رائے اور اس امر کو بہت اہمیت دیتا ہے کہ کنشک بدھ کی موت کے چار سو سال بعد گذرا ہے۔ اس کے آگے وہ یہ دلائل پیش کرتا ہے کہ اس کے نظریے سے کتبات کی تاریخوں کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ اور ہوشک کے سکوں پر اس کے نام میں "و" حرف کے نہ ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ پہلے گذر چکا تھا۔ پچھلی دونوں دلیلوں پر یہاں بحث نہیں کی جاسکتی۔ مگر میں ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ ایک اور روایت کے مطابق کنشک بدھ کی موت کے سات سو سال بعد گذرا تھا۔ (انڈین انٹی کوری جلد 32' 1903ء صفحہ 382) اور اس قسم کی کوئی روایت دوسری روایت پر مرجح ہو سکتی ہے۔ مگر در اصل یہ تمام روایتیں بالکل بے اصل ہیں۔ مختلف

روایات کنشک کا نزوان کے 150' 300' 500 برس بعد ہونا بتلاتی ہیں۔ ڈاکٹر فرینک نے اس بات پر زور دیا ہے کہ چینی مورخین برخلاف بدھ مذہب کے مصنفین کے کنشک کا نام تک بالکل نہیں لیتے۔ مگر اس نے خود ہی اس اعتراض کا جواب یہ لکھ کر دے دیا ہے کہ "124ء سے وہ منبع ہی سوکھ گیا تھا جس سے کہ مورخ ترکستان کے متعلق اپنے تمام اخبار نقل کرتا۔" (صفحہ 71' دیکھو 80) ایک اور دلیل جس پر کہ اس کو بہت اعتماد معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ مشہور و معروف حکایت کے مطابق 2 ق م میں ایک یوچی بادشاہ نے بدھ مذہب کی چند کتب ایک چینی عامل (افسر) کو دی تھیں۔ اس حکایت سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ یہ بادشاہ کنشک ہی ہونا چاہیے۔ میں قضیئے کے مقدمے کو مانتا ہوں کہ 2 ق م میں یوچی کا کوئی بادشاہ بدھ مذہب سے واقف اور تھوڑا بہت اس سے متاثر بھی تھا۔ مگر مجھے اس نتیجے کے ماننے سے انکار ہے جو فرینک اور رایم۔ سلوین لیوی نکالتے ہیں۔ اس حکایت سے ایک اور نتیجہ بھی نہایت آسانی سے نکالا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر فرینک (صفحہ 96) نے کنشک کے اثر اور قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا' اور غلطی کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زبردست عالم نے دیدہ و دانستہ ہندوستان کے آثار قدیمہ کی شہادت کو پس پشت ڈال دیا ہے (صفحہ 100)۔ مگر مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تاریخی مسئلہ اس وقت تک تسلی بخش طور پر حل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کے متعلق تمام شہادتوں پر بغور نظر نہ ڈالی جائے۔ اور ایسے تمام دلائل جو بعض خاص واقعات کو نظر انداز کر دیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کی طرف التفات کیا جائے اور یا ان کو فیصلہ کن مان لیا جائے۔

۱۵ شین: "این شنٹ ختن" صفحہ 27۔

۱۶ سوبھار بہاول پور کے قریب کے کتبے پر جس کو ہارنل نے بعد تصحیح انڈین انٹی کویری جلد 10 صفحہ 324 میں طبع کرایا' مہاراجا تراجا دیو پتر کنشک کی حکومت کے گیارہویں سال کی تاریخ ہے جو مطابق ہے مقدونوی ماہ ڈیسئوس کی 28 تاریخ کے۔ یہ جنتری کسی سال یا سمت کے ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے جس طرح کہ 297 ق م کے پونٹک سال کے ظاہر کرنے کے لیے کی گئی تھی (نیومسمیٹک کرانیکل 1905ء صفحہ 118)۔ اسی طرح جہانگیر ایرانی شمسی ماہ کے ناموں کو ہجری کے قمری ماہ کے ساتھ استعمال کیا کرتا تھا۔

۱۷ "اور جب ٹراجن روما میں واپس آگیا تو بیرونی بادشاہوں کے درباروں میں بڑی بڑی سفارتیں اس کے پاس آئیں اور ایک سفیر خاص کر ہندوستان سے آیا--- وہ (ٹراجن) جب سمندر (دریائے دجلہ کے دہانے) تک پہنچا تو اس نے ایک جہاز کو ہندوستان کی طرف جاتے دیکھا۔ (ڈیون کیسئس: ہسٹری آف روم۔ باب 9 فصل 58۔ باب 67 فصل 28' منقول فی میک کرنڈل این شنٹ انڈیا 1901ء صفحہ 213)۔

۸ھ وہ صوبے جن کو ہڈرین نے چھوڑ دیا تھا آرمینیہ' الجزیرہ اور اسیریا کے علاقے تھے۔ (میریویل "ہسٹری آف دی رومن" باب 66)

۹ھ سٹین: راج ترنگنی مترجم باب اول 168 - 172 تک کنشکپور کی جگہ اب ایک گاؤں کانسپور آباد ہے جو °74 - '28 مشرقی طول بلد' °34 - '14 شمالی عرض بلد پر دریائے بہت اور اس شاہراہ کے درمیان واقع ہے جو بارامولا سے سرینگر کو جاتی ہے۔ کشمیر کی تاریخ کی عبارت حسب ذیل ہے۔ "اس کے بعد اس ملک میں تین بادشاہ گذرے جن کے نام ہشک' جشک اور کنشک تھا۔ انہوں نے اپنے ناموں سے تین شہر الگ الگ بسائے۔ جشک وہ شاہ دانشمند جس نے جشکپور بسایا تھا' اسی نے جے سوامی پور کو بھی آباد کیا تھا۔ یہ بادشاہ جو نہایت عابد و زاہد تھے اگرچہ نسلاً "ترشک کی قوم سے تھے مگر انہوں نے شکلیز اور دوسرے مقام مثل مٹھ چیت وغیرہ تعمیر کرائے۔" (اسٹین ترجمہ راج ترنگنی باب 1 - 171 - 168) آگے چل کر کلہن لکھتا ہے کہ ان زبردست بادشاہوں کے زمانے میں تمام کشمیر کا علاقہ بہ ہیئت مجموعی بدھ مت والوں کے قبضے میں تھا۔ ان کی تاریخ وہ نروان کے 150 برس بعد بتلاتا ہے۔ مگر بظاہر یہ بالکل خلاف عقل ہے۔ جشک کے نام سے ایک اور نام جوشک بھی نکل سکتا ہے۔ اس بادشاہ کے وجود کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ اس کا آباد کیا ہوا شہراب تک موجود ہے' اور سرینگر کے شمال میں زکور کے نام سے ایک آباد قصبہ ہے۔ بسودیو سے اس کو ایک کرنے کی کوئی کافی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ وہ کشمیر میں محض ایک نائب السلطنت کی حیثیت سے ہی ہو۔ کنشک اور ہوشک کے سکے اس ملک میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ترشک کے لفظ کا اطلاق اکثر مسلمانوں پر کیا جاتا تھا اور میرے نزدیک اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ کوئی "ایسا شخص جو دروں کے پار سے ہندوستان آیا ہو۔" اس اصطلاح کا مطلب ہرگز یہ نہ لینا چاہیے کہ کنشک وغیرہ کا تعلق ترک اور یاان کی ہم جنس کسی خانہ بدوش قوم سے تھا۔

۱۰ھ چینی ترجمہ جو 472ء میں ایک گم شدہ سنسکرت کتاب سری دھرم پٹک سمپرادیا ندان (؟) سے کیا گیا منقول از لیوی: "نوٹس سرلیس انڈو سیتھیز" صفحہ 36۔ ملک تبت کی ایک روایت کے مطابق کنشک نے اشوگھوش کو دوستانہ طور پر اپنے دربار میں مدعو کیا' مگر کیونکہ وہ اضمحلال اور معمری کی وجہ سے اس دعوت کو قبول نہ کر سکا اس وجہ سے اس نے اپنے چیلے جنان لیس کو اپنی جگہ بھیج دیا (ترجمہ سمپاہی چیوجنگ۔ جرنل بدھسٹ ٹیکسٹ سوسائٹی 1893ء حصہ تین' صفحہ 13) اس سے ایک ذرا مختلف روایت شیفر نے اپنی کتاب تارناتھ (باب 12) میں اور ایک روایت ویٹرس (جلد 2 صفحہ 104) نے دی ہے' جو کہتا ہے کہ اس ولی اللہ کو کا-نی-ٹا (کنشک) بادشاہ کے حوالے بطور تاوان جنگ کے کر دیا گیا تھا۔ چینیوں کے کا-نی-ٹا کے نام استعمال کرنے کی توجیہ ... ی کنشکپور (یا کانسپور) کے مقامی برہمنوں کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ان کے

خیال میں شہر کے بانی کا نام کنشتھ راجا تھا (اشٹین ۔ ترجمہ راج ترنگنی باب 1 فصل 5 صفحہ 168 حاشیہ) یہ کا۔ نی۔ ٹا راجا بھکشوؤں کے ساتھ نہایت مہربانی اور عزت سے پیش آتا تھا اور اشوگھوش نے کشمیر میں سکونت اختیار کرنے کے بعد اپنا کام برابر جاری رکھا۔ ویٹرس لکھتا ہے کہ "بدھ مذہب کا یہ زبردست عالم بظاہر دوسری صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ وہ شاعر' موسیقی داں' عالم' مذہبی مناظر' ایک جوشیلا بھکشو' مذہب کا نہایت پکا اور اس کے تمام قواعد وضوابط کا پابند تھا۔" اشوگھوش پارشو کا چیلا تھا جس نے کنشک کی منعقدہ مجلس میں سب سے زیادہ شرکت کی تھی۔ (ویٹرس جلد اول صفحہ 209) ایم۔ فوشر کا بھی براہ راست یہی خیال ہے کہ اشوگھوش دوسری صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ اگر یہ رائے درست اور قابل ثبوت ہے اور اگر اشوگھوش ایک حد تک کنشک کا ہمعصر بھی تھا تو پھر کنشک کا 58 ق م میں تخت پر بیٹھنا ناممکن ہے۔

۲۱ پشاور کے گردونواح گندھار کے علاقے کے جغرافیائی حالات کے لیے دیکھو ایم۔ فوشر کا قابل قدر اور نایاب رسالہ: "نوٹس سرلا جیوگریفی اینسین ڈگندھارا۔" (ہنوئی 1902ء) تارناتھ نے (شیفنر باب 13 صفحہ 62) قریب ہی کے ایک اور شہر پشکلاوتی کا ذکر کیا ہے جو کنشک کے بیٹے کا جائے قیام تھا۔ تبرکات کے مینار کا سب سے زیادہ تفصیلی بیان سنگدین کا ہے (بیل۔ ریکارڈس جلد 1۔ صفحہ 103 اور چونیز کی کتاب دوسری ایڈیشن۔ ہنوئی 1903ء) اس کا ذکر فاہیان (باب 12) اور ہیون سانگ باب 2۔ بیل جلد اول۔ صفحہ 99 ویٹرس جلد اول صفحہ 204) نے بھی کیا ہے۔ 1030ء میں البیرونی تک نے کنک چیتیا کا ذکر کیا ہے۔ (زخاؤ ترجمہ جلد دوم صفحہ 11) خانقاہ کا ذکر ہیون سانگ نے کیا ہے۔ (بیل جلد 1 صفحہ 103) اس مقام کے محل وقوع کو ایم۔ فوشر نے دریافت کیا تھا۔ فوشر کی بتلائی ہوئی جگہ کو محکمہ آثار قدیمہ نے نہایت کامیابی سے کھودا اور اس میں سب سے زیادہ قابل قدر معلومات و تبرکات کا ڈبا' ایک تصویر اور کنشک کا ایک کتبہ ہے۔ کنشک کے میر عمارات کا یونانی نام اگے سیلوس تھا۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1908ء صفحہ 1109) اینوئل رپورٹ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا 9۔1908ء صفحہ 60۔30۔ ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون صفحہ 8۔356' پلیٹ 75)۔

۲۲ گھوسراؤ کا کتبہ معہ ترجمہ کیلہارن' انڈین انٹی کوری جلد 11 (1888ء) صفحہ 12۔307۔

۲۳ لیوی۔ کتاب مذکورہ بالا صفحہ 40۔

۲۴ جی۔ رالنسن۔ پارتھیا 1893ء صفحہ 306۔

۲۵ یارقند موجودہ تلفظ ہے۔ عموماً مسلمان اس نام کو یارقند لکھتے چلے آئے ہیں۔ (اشٹین

۲۶؎ متن کتاب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے وجوہ مفصل طور پر طبع دوم کے ضمیمہ ایل میں لکھ دیئے مگر یہاں ان کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ اس موقع پر صرف چند امور پر توجہ مبذول کرانی ہی کافی ہوگی۔ وہ علاقہ جس سے کہ یرغمالی آئے تھے، چین کی وہ باج گذار ریاست تھی جس کو دریائے سیتا یا یارقند اور نام نہاد چکشو یعنی دریائے سیحون سیراب کرتا ہے۔ چکشو کا نام معلوم ہوتا ہے کہ مشہور ہیئت داں بھاسکر آچاریہ سے لیا گیا ہے (کولبرک۔ سدھانت سرومنی وغیرہ۔ اور ولسن کی سنسکرت ڈکشنری لفظ مرو، منقول نی ایلیٹ کی ہسٹری آف انڈیا جلد اول صفحہ 50) مگر پروفیسر پھاٹک نے ثابت کیا ہے (انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 226) کہ سیحون کا سنسکرت نام وکشو ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ چکشو کاتب کی غلطی ہے کیونکہ زمانہ وسطیٰ میں چ اور و میں غلطی ہو جانی ممکن تھی۔

کپس کے علاقے میں ان یرغمالیوں کی خانقاہ ہنایان مذہب کی تھی اور اسی وجہ سے اس کا تعلق کاشغر کے ہنایانی ملک سے تھا نہ کہ یارقند کے مہایانی علاقے سے۔ یہ ممکن ہے کہ کاشغر میں ہنایانی مذہب کی تبلیغ اشوک کے زمانے میں ہوئی ہو۔

بیل کے ترجمے کے مطابق یہ خزانہ "چند سوکٹی سونے اور کچھ موتیوں پر مشتمل تھا۔" کٹی ایک چینی وزن ہے جو کہا جاتا ہے کہ ڈیڑھ پونڈ کے برابر ہوتا ہے۔ یرغمالیوں کی حکایت کے حوالے حسب ذیل ہیں:

ہیون سانگ (یون چانگ) ریکارڈس۔ ویٹرس جلد اول صفحہ 124 اور بیل جلد 1 صفحہ 57۔ کپس کے لیے کتاب مذکورہ ویٹرس جلد 1 صفحہ 292 اور بیل جلد 1 صفحہ 173۔ چین بھکتی کے لیے لائف ہیون سانگ صفحہ 54۔ کپس کے لیے اس حکایت پر او۔ فرینک نے بیٹر تیج میں بحث کی ہے۔ دریائے سیتا کے معلوم کرنے کے لیے دیکھو اشٹین: این شنٹ ختن (1907ء) صفحہ 27، 35، 42۔ چین بھکتی کے بیجے ویٹرس نے قائم کیے ہیں۔ یہ شہر جالندھر کے جنوب مغرب میں واقع تھا اور اسے فیروزپور کے ضلع میں تلاش کرنا چاہیے۔

۲۷؎ بیل ریکارڈس۔ جلد اول، صفحہ 99۔

۲۸؎ سکوں پر اسے سیلینیے لکھا ہے۔

۲۹؎ سکوں کے متعلق خاص کتب کے علاوہ دیکھو اشٹین کا قابل قدر مضمون (اورینٹل اینڈ بیلونیئن ریکارڈ اگست 1887ء۔ اس سال میں نٹ نے اسے دوبارہ شائع کرایا اور چند اضافات کے ساتھ پھر انڈین انٹی کویری جلد 17 (1888ء) صفحہ 89 طبع ہوا) ایم۔ اورل اشٹین کے نظریات پر علم اللسان کی رو سے کرسٹ نے سیگر کی اجازت سے مخالف تنقید کی (دائنا اورینٹل جرنل جلد دوم (1888ء) صفحہ 244-237) جہاں تک میں علمی باتوں کو سمجھ سکتا ہوں نقاد راستی پر معلوم ہوتے ہیں۔ جب میری کتاب دوسری مرتبہ طبع ہوئی ہے تو مجھ کو کرسٹ کے مضمون کا علم

نہ تھا۔

۳۰ھ فان سیلٹ 'فینغ فولکر' صفحہ 195۔

۳۱ھ پرانے مصنفین نے اس بات کو پوری طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر اب اسے پروفیسر گرنوڈل اور ایم۔ فوشر نے بالکل ثابت کردیا ہے۔ اسی سنگ تراشی میں بدھی ستو کی بے شمار مورتیں شامل ہیں۔ اس مضمون پر سب سے بڑی سند ایم۔ فوشر کا عالمانہ رسالہ "آرٹ گریکو بدھیک ڈوگندھارا" ہے جس کی پہلی جلد (صفحات 693) 1905ء۔ میں طبع ہوئی۔ دوسری جلد اب تک شائع نہیں ہوئی۔ دیکھو اس کے علاوہ "اے ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون" باب 4۔

۳۲ھ محکمہ آثار قدیمہ کے کارکنوں کی رائے ہے کہ یہ اس سے بہت قبل کی تاریخ میں ہوچکا تھا۔

۳۳ھ اس مسئلے کی بڑی سند ہیون سانگ کی ہے (ویٹرس جلد اول صفحہ 278۔ 270' بیل جلد اول صفحہ 117۔ 151 تککسو کی تنقید ویٹرس کی کتاب پر جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1905ء صفحہ 414)۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ مجلس کشمیر میں بسومتر کی زیر صدارت کنشک شاہ گندھار کے حکم سے جو پرس کی زیر ہدایت تھا منعقد ہوئی تھی۔ پرمارتھ (569۔ 499) نے بسوبندھ کی سوانح عمری میں (دیکھو اس کتاب کا ضمیمہ ص) اس مجلس کا ایک بالکل جداگانہ بیان دیا ہے کہ وہ کشمیر کے علاقے میں نروان کے بعد پانچویں صدی میں منعقد ہوئی۔ اس نے کنشک کا نام نہیں لکھا اور اس کے انعقاد کو کاتیاینی پتر کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اس کے قول کے مطابق اشوگھوش کو سرسوتی کے صوبے کے مقام ساکیت سے مدعو کیا گیا تھا تاکہ وہ اپنے علم سے ان تفاسیر کے ملخص کرنے میں کام لے جو اس مجلس نے تیار کی تھیں (تککسو۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1905ء صفحہ 52)

بسومتر کی کتاب مہاو بھاشا شاستر جو کنشک کے زمانے کی خیال کی جاتی ہے' جنان پرستھان شاستر کی جو شراوستی ودوان کے فرقے کی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے' ایک ضخیم تفسیر ہے۔ (تککسو۔ آئی۔ سنگ۔ بدھسٹ پریکٹشز صفحہ 21)

تبتی کہ۔ گیورنے لکھا ہے کہ مجلس کا کام یہ تھا کہ وہ بدھ مذہب کو تیسری مرتبہ جمع کردے (کاسا کروسی۔ "ایشیاٹک ریسرچز" جلد 20۔ منقول فی ایسٹرن' مونکزم صفحہ 188) ڈبلیو (شیفنر صفحہ 298) لکھتا ہے کہ "یوسٹن" کتاب کنشک کی کونسل کو نہیں مانتی اور یہ "لن گیور" نے مجلس کا انعقاد 400 سال بعد بتلایا ہے۔ ان کی صدارت وتسی پترنے کی تھی اور اسی کے فرقے سے اس مجلس کا تعلق بھی تھا۔ چینی بیان ہے کہ مجلس کا انعقاد کندھار (؟ گندھار) کے مقام پر ہوا تھا۔

تارناتھ نے لکھا ہے کہ بعض مصنفین بیان کرتے ہیں کہ مجلس کشمیر میں خانقاہ کندلون میں

جمع ہوئی تھی۔ دوسرے لکھتے ہیں کہ وہ جالندھر کے مقام پر منعقد ہوئی تھی۔ وہ خود کہتا ہے کہ اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ موخرالذکر مقام زیادہ قرین قیاس ہے۔ مگر اب آج کل جو شہادت دستیاب ہوتی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مجلس کشمیر میں ہی منعقد ہوئی تھی۔ ہیون سانگ جب اپنے جالندھر جانے کا ذکر کرتا ہے (بیل۔ جلد اول صفحہ 175۔ ویٹرس جلد اول صفحہ 296) تو مجلس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ اس بات نے کہ بعض کتابوں میں کنشک کو جالندھر کا بادشاہ لکھا ہے' اس عقیدے کو زیادہ عام کر دیا ہو کہ مجلس کا انعقاد اسی مقام پر ہوا تھا۔ تارناتھ کے قول کے مطابق اس مجلس نے ان اٹھارہ متنازعہ مسائل کا فیصلہ کیا تھا جو پکے دین دار اور ناجی سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ تین پٹک یا تو سب سے پہلی دفعہ ضبط تحریر میں لائے گئے یا یہ کہ اگر پہلے تحریر میں آ چکے تھے تو ان کو اغلاط سے پاک کیا گیا۔ اس سے قبل مہایان کی ہمہ قسم کی کتب عرصہ پہلے وجود میں آ چکی تھیں۔ (شیفنر صفحہ 58)

اس سے قبل کی مجالس کی حکایت کی تنقید کے لیے دیکھو مصنف کا مضمون۔ "دی آئی ڈینٹٹی آف پیادسی وداشوک موریا۔ اینڈسم کنکٹڈ پرابلمز" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس اکتوبر 1901ء) کشمیر کے مقامی ناموں میں کندل کے معنوں کے لیے دیکھو اسٹین کا ترجمہ راج ترنگنی باب 5 فصل 5' صفحہ 106۔

۳۴ھ سری۔ دھرم۔ پٹک وغیرہ۔ انڈین انٹی کویری 1903ء صفحہ 388۔

۳۵ھ ہوشک کا نام مختلف طور پر مثلاً ہشک اور ہویشک لکھا جاتا ہے۔

۳۶ھ 51ء کا ایک کتبہ جو پیتل کے برتن پر لکھا ہوا میسن نے خوات کے ستوپ سے وردک کے ضلع میں کابل کے جنوب مغرب سے تیس میل کے فاصلے پر پایا تھا۔ پرگیٹر کی تصحیح اور ترجمہ کی وجہ سے تمام پرانے ترجمے بیکار ہو گئے ہیں۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1912ء صفحہ 3۔ 1060' اپی گرافیا انڈیکا جلد 11 صفحہ 219۔ 202)

۳۷ھ کننگھم آرکیالوجیکل رپورٹ جلد اول صفحہ 238۔

۳۸ھ اسٹین۔ راج ترنگنی۔ ترجمہ باب 1 فصل 5 صفحہ 168۔ جلد دوم صفحہ 438۔ بیل' لائف آف ہیون سانگ صفحہ 68۔

۳۹ھ گارڈنر۔ برٹش میوزیم کیٹلاگ آف گریک اینڈ انڈو سیتھین کنگس۔ لوح 27۔ 9۔ ولوح 28۔ 9 وی۔ اے سمتھ کیٹلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم جلد اول لوح 12۔

۴۰ھ فان سیلٹ۔ نیتج فولگر' صفحہ 63 کیٹلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم جلد۔ 1۔ صفحہ 92۔ 63 مسٹر آر۔ ڈی بنرجی کا خیال ہے باسو دیو اول کے جانشین کنشک دوم (کنیشکو) باسو دیو دوم' باسو (دیو) سوم تھے۔ اس رائے کو انہوں نے سکوں کی شہادت سے حاصل کیا ہے۔ "نوٹس آن دی انڈو سیتھین کانیج۔" جرنل اینڈ پروسیڈنگس آف اے۔ ایس۔ بی۔ 1908ء صفحہ 81)

۴۱؎ یوٹروپئس باب 12 میریویل (ہسٹری آف دی رومنز انڈر دی امپائر صفحہ 332 '358 باب 68) میں اسناد کا حوالہ دیا ہے اور اس مصیبت کے بین اور روشن حالات قلمبند کیے ہیں۔

۴۲؎ کننگھم نیومسمیٹک کرانیکل 1893ء صفحہ 177۔169۔ اس کا یہ اندازہ صحیح ہے کہ امیئس مارسی لیئس کی بیان کردہ چیونتی قوم دراصل کشان ہی ہیں۔

گبن' باب 19 نے آمدہ کے محاصرے کا سن 360 دیا ہے۔ آمدہ دریائے دجلہ پر واقع تھا۔ جہاں آج کل دیار بکر ہے۔ دوسری اسناد 358ء یا 359ء کو ترجیح دیتی ہیں۔

۴۳؎ سکوں پر بالعموم وسو نام ہے نہ کہ واسو۔

۴۴؎ ایم ڈرون: (ریویو مسمیٹک 1898ء صفحہ 140) کا بیان ہے کہ اس قربان گاہ کی صورت وہی ہے جو سب سے پہلے ساسانی بادشاہ اردشیر (225ء یا 226ء سے 241ء تک) اور اس کے چند جانشینوں کے سکوں پر پائی جاتی ہے۔ دیکھو "وی۔ اے۔ سمتھ کی کیٹلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم" جلد اول (1906ء) صفحہ 89۔88 اور بیزی کی تصویرات: "نوٹس آن انڈو سیتھین کائنیج" (جرنل اینڈ پروسیڈنگس اے۔ ایس۔ بی 1908ء صفحہ 90)

۴۵؎ مقابلہ کرو ضمیمہ ر سے۔

۴۶؎ ڈاکٹر فرینک کے خیال کے مطابق 152ء میں ختن چین کے ہاتھ سے نکلا۔ چینی تاریخوں میں کنشک کا نام کہیں نہیں آتا۔

ڈاکٹر فرینک کو اس امر میں شبہ ہے کہ موجودہ خیال کے مطابق۔ ہیو۔ ٹا (یو۔ ٹا یا یوک۔ تھو) اور باختر ایک ہی چیز ہیں۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اصل نام "سرزمین یکتھین تھا' جو اس کے خیالات کے مطابق اراکوسیہ کے شمال میں واقع ہے۔

گیارہواں باب

سلطنت خاندان گپت اور مغربی سترپ چندر گپت اول سے کمار گپت اول تک

320ء تا 455ء

خاندان گپت کی ابتداء

چوتھی صدی عیسوی میں پھر ایک بار روشنی کی کرن دکھائی دیتی ہے۔ تاریکی اور نسیان کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور ہندوستان قدیم کی تاریخ میں اتحاد و دلچسپی کا رنگ پھر آ جاتا ہے۔

308ء

308ء یا اس کے قریب پاٹلی پتر یا اس کے گردونواح کے مقامی راجا نے، جو مشہور[1] چندر گپت کا ہم نام تھا، قدیم لکھوی قبیلے کی ایک شہزادی کمار دیوی سے شادی کی۔ یہ قبیلہ بدھ مذہب کی قدیم تاریخ میں مشہور و معروف تھا۔ اجات شترو کے عہد حکومت اور کمار دیوی کی شادی کے درمیان میں جو آٹھ صدیوں کی طولانی مدت گذری ہے اس میں لکھوی قوم کی تاریخ کا ایک بڑا زبردست حصہ برباد ہو گیا ہے۔ اگرچہ ان کے متعلق یہ معلوم ہے کہ انہوں نے نیپال میں ایک شاہی خاندان قائم کیا تھا، جو ایسے سنہ کو استعمال کرتا ہے جس کی نسبت قیاس ہے کہ اس کی ابتداء 111ء میں ہوئی۔[2] اب اس کی شادی کی وجہ سے وہ دفعۃً پھر سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ شادی بڑے اہم سیاسی واقعات کی پیش خیمہ ہوئی کیونکہ اس کی وجہ سے ایک ایسے خاندان کی بنیاد پڑی جو خاندان موریا کی عظمت و شان کا ہمسر بننے والا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کمار دیوی اپنے

شوہر کی مدد کے لیے ایک زبردست اثر اور رسوخ اپنے ہمراہ لائی تھی اور اسی اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں ہی میں مگدھ اور تمام گردونواح کے علاقے میں اس کو حکومت اعلیٰ حاصل ہو گئی گمان غالب یہ ہے کہ اس مشہور و معروف شادی کے وقت لکھوی قبیلہ قدیم شاہی دار السلطنت پر متصرف تھا اور چندر گپت اپنی شادی کی وجہ سے اس طاقت و دولت کا وارث و مالک ہو گیا جو اس کی بیوی کے اعزاء کے ہاتھ میں تھی۔ ازمنہ قدیم میں ویشالی کا لکھوی قبیلہ پاٹلی پتر کے بادشاہوں کا حریف تھا اور غالباً پشی متر کے بعد کے پرفتن زمانے میں اس کو اس بات کا موقعہ مل گیا کہ پرانا کینہ نکالے۔ چنانچہ اس نے اس شہر پر قبضہ کر لیا جو صدیوں قبل اسی قبیلے کے سرزنش اور گوشمالی ہی کے لیے تعمیر و قلعہ بند کیا گیا تھا۔

320ء: قبیلہ لکھوی سے اتحاد' چندر گپت اول کی تخت نشینی

یہ بات یقینی ہے کہ لکھوی قبیلے میں شادی کرنے سے چندر گپت کی حیثیت اپنے باپ [1] اور دادا کی طرح محض ایک مقامی سردار کی نہ رہی۔ بلکہ ایک بارگی اس کو وہ مرتبہ حاصل ہو گیا کہ اس نے "راجا مہاراجگاں" کا خطاب اختیار کرنے میں (جو بالعموم زبردست ترین بادشاہوں کا لقب ہوا کرتا تھا۔) پس و پیش نہ کیا۔ اس نے اپنے سکے اپنی بیوی اور قبیلہ لکھوی کے مشترک ناموں سے مضروب کرائے۔ اس کے بیٹے اور جانشین نے بھی اس عادت کو جاری رکھا اور بڑے فخر سے اپنے آپ کو لکھوی شہزادی کا بیٹا لکھتا رہا۔ چندر گپت نے' جس کو اس کے ہمنام پوتے سے ممیز کرنے کے لیے اول لکھا جاتا ہے' اپنی سلطنت کو دریائے گنگا کے میدان میں گنگا اور جمنا کے مقام اتصال تک وسعت دی۔ اسی جگہ آج کل الٰہ آباد آباد ہے۔ وہ اپنے مختصر سے زمانہ حکومت میں ترہٹ' جنوبی بہار اودھ اور دیگر گردونواح کے سرسبز اور معمور علاقوں پر حکمراں تھا۔ ساتھ ہی اس کو اس قدر سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ دوسرے ایشیائی بادشاہوں کی طرح وہ بھی اپنی تخت نشینی یا تاج پوشی سے ایک سنہ کا آغاز کرے۔ کیونکہ اسی موقع پر اس کی اس قدیم روایت کے مطابق جو پاٹلی پتر سے وابستہ تھی اعلیٰ ترین بادشاہ ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سمت گپت کا' جو صدیوں تک ملک میں مستعمل رہی' پہلا سال 26 فروری 320ء سے لے کر 13 مارچ 321ء تک ہے اور ان تاریخوں میں پہلی تاریخ کو چندر گپت اول کی تاج پوشی کی تاریخ متصور کیا جا سکتا ہے۔ [2]

330ء یا 335ء: سمدر گپت کی تخت نشینی

اپنی موت سے پہلے' جو تخت نشینی سے غالباً دس یا پندرہ برس بعد واقع ہوئی' چندر گپت نے

اپنے بیٹے سمدرگپت کو جو لکھوی کی شاہزادی کے بطن سے تھا اپنا ولی عہد مقرر کیا۔[5] باپ نے وجوہ سے اس بیٹے کو دوسروں پر ترجیح دی تھی ان کا حق اس نوجوان بادشاہ نے پورا پورا ادا کیا اور صلح و جنگ دونوں صورتوں میں اس قدر ہنرمندی اور لیاقت کا مظاہرہ کیا جس سے کہ وہ اس امر کا مستحق ہے کہ اسے تمام ہندی بادشاہوں کی صف اول میں جگہ دی جائے۔

اس کی جنگجو اولوالعزمی

اپنی تخت نشینی کے وقت ہی سے سمدرگپت نے ایک اولوالعزم اور جنگجو بادشاہ کی طرح کام کرنا شروع کیا اور اس بات کا مصمم ارادہ کرلیا کہ اپنی ہمسایہ ریاستوں کے علاقوں کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلے۔ فوجی مہمات میں پیش دستی یا سبقت کو ایشیاء میں عامتہ الناس کی رائے نے کبھی برا نہیں سمجھا۔ بلکہ وہ بادشاہ جو عزت و شرف حاصل کرنے کا خواستگار ہو اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اپنی آبائی سلطنت ہی پر قانع ہو رہے۔ اس لیے سمدرگپت کو بھی اس اصول پر عمل کرنے میں کسی قسم کا تامل نہ تھا کہ بادشاہ کا سب سے اہم کام ملک گیری ہے۔ تخت نشینی کے بعد فوراً ہی اس نے جنگ شروع کردی جو اس کی غیر معمولی طویل حکومت کے ایک بڑے حصے تک جاری رہی۔[6]

اس کے زمانے کے کتبات

جب سمدرگپت کا جنگ و جدل کا زمانہ ختم ہوگیا تو اس نے ایک شاعر کو نوکر رکھا جو سنسکرت زبان کے عروض و قافیے میں بالکل ماہر تھا' اور اس سے اپنے کارناموں کے حالات میں قصیدہ لکھوایا۔ بعد میں قصیدے کو ان پتھر کے ستونوں میں سے ایک پر کندہ کرادیا جس پر چھ صدی قبل اشوک نے اپنے فرامین منقوش کرائے تھے۔[7] سمدرگپت ایک دیندار اور ہندو اور برہمنوں کی تعلیمات سے کماحقہ آگاہ تھا۔ وہ ایک اولوالعزم سپاہی تھا جو جنگی طرز معیشت کو پسند کرتا تھا۔ اگرچہ زمانہ شباب میں اپنے باپ کے کہنے سے اس نے بدھ مذہب کے عالم بسوبندھو کی تعلیمات میں کچھ دلچسپی لی تھی' لیکن پھر بھی اس نے اس امر میں ذرا بھی تامل نہ کیا کہ اپنے جنگی اور خون ریزی کے کارناموں کو اس قدسی نفس راجا کے فرامین کے ساتھ کندہ کرادے جس کے خیال میں "سب سے بڑی فتح" پرہیزگاری کی فتح تھی۔

سمدرگپت نے اپنے کارناموں کی یاد تازہ رکھنے کے لیے جو تردد و تکلیفیں برداشت کیں وہ بیکار نہ گئیں۔ جو نظم اس کے ملک الشعراء نے اس زمانے میں لکھی تھی وہ اب تک تقریباً مکمل حالت میں موجود ہے اور مورخین کے لیے وہ اس دوران حکومت کے تفصیل وار حالات فراہم

کرتی ہے جو غالباً تمام ہندوستانی کتبات میں سب سے زیادہ بہتر ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے اس کتبے پر تاریخ نہیں ہے لیکن اسے تقریباً صحت کے ساتھ 360ء یا اس کے ذرا بعد کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اپنی موجودہ شکل میں محض ایک تاریخی ماخذ ہونے کے علاوہ وہ سنسکرت علوم کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے جس کا ایک حصہ نظم میں ہے اور کچھ نثر میں اور اس کے علاوہ اس کا سنہ یقینی طور پر معلوم ہے۔ ایسے بڑے بڑے کتبات کی' جن پر تاریخ موجود ہو' علمی حیثیت سے قدر کی طرف بیوہلر نے چند سال قبل توجہ دلائی تھی۔ مگر اب ان علماء نے' جو عموماً کتب خانوں ہی کی تحقیقات پر اکتفا کرتے ہیں' پوری توجہ نہیں کی۔[8] بہر حال فی الحال ہر شین کی اس فصیح و بلیغ نظم کے بیان سے ہمارا تعلق تاریخی ہے اور علوم سنسکرت کے ارتقاء سے ہم کو بحث نہیں۔ ہم کو یہ بات مخصوص علماء کے لیے چھوڑ دینی چاہیے کہ وہ غور کریں کہ اس کا درجہ زبان اور علم و ادب کے ارتقاء میں کیا ہے۔

اس کی مختلف فوج کشیاں

اس قصیدے کا مصنف اپنے آقا کی تمام فوجی مہموں کو جغرافیائی لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم کرتا ہے: یعنی جنوب کے گیارہ بادشاہوں کے خلاف۔ آریاورت یا گنگا کے میدان کے اور بے نام و نشان بادشاہوں کے علاوہ ایسے بادشاہوں کے خلاف جن کے نام اس نے لکھے ہیں۔ جنگلات کی وحشی اقوام کے سرداروں کے خلاف اور سرحد کی سلطنتوں اور جمہوری فرماں رواؤں کی مخالفت میں۔ اس کے علاوہ وہ ایسے بیرونی دول سے بھی سمدرگپت کے تعلقات بیان کرتا ہے جو اس قدر دور تھے کہ وہاں تک اس کی قوت کی رسائی نہ تھی۔ اگرچہ فی الحال ان تمام بادشاہوں اور ملکوں کا پتہ لگانا جن کے نام شاعر نے لکھے ہیں' ناممکن ہے اور اس کے علاوہ اور بہت سی تفصیلی باتیں ہیں جو آئندہ تحقیقات یا دریافتوں ہی سے واضح ہو سکتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اتنی کچھ باتیں معلوم ہیں جن سے مورخ خاندان گپت کے سب سے بڑے اور اولوالعزم شہنشاہ کی وسعت سلطنت اور حدود فتح و نصرت کا اندازہ صحیح طور پر لگا سکے۔ کیونکہ اس نظم میں بجائے تاریخی اصول کے علمی اصول کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس لیے اس حکومت کے واقعات کو بقید سنین بیان کرنا ناممکن ہے۔

شمالی ہند کی تسخیر

مگر ہم کو یہ یقین کر لینا چاہیے کہ "ہندوستان کے نپولین" نے سب سے پہلے اپنی توجہ ان ریاستوں کی طرف مبذول کی ہوگی جو اس کے قریب تر تھیں۔ اور یہ کہ جنوب کے زیادہ پر خطر

سفر اور مہمات اختیار کرنے سے پہلے اس نے دریائے گنگا کے اس میدان کو زیر کر لیا ہو گا جو آج کل "ہندوستان" کے نام سے مشہور ہے۔ شمالی راجاؤں کے ساتھ اس کا سلوک بہت کچھ درشتی آمیز تھا' کیونکہ یہ بتلایا جاتا ہے کہ ان کو "زبردستی بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالا گیا۔" اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ ان کے علاقوں کو فاتح نے اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کر لیا تھا۔ اس نظم کے نوذکورہ ناموں میں سے صرف ایک یعنی گنپت ناگ کے نام ایسا ہے جو بالکل تیقن کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے۔ اس راجا کا دارالسلطنت مشہور شہر پدماوتی یا نرور تھا جو مہاراجا سندھیا کے علاقے میں اب تک موجود ہے۔

قبل اس سے کہ سمدرگپت نے جنوبی ریاستوں کی طرف حملہ کرنے کے لیے توجہ کی ہو' شمالی فتوحات کا بہت بڑا حصہ ختم اور وہ علاقہ اس کی سلطنت کے ساتھ ملحق ہو چکا ہو گا۔ اور جنوبی حملے کا کام ایسا تھا کہ جس میں اعلیٰ ترین قابلیت نظم و ترتیب کی ضرورت تھی۔

جنوبی کوسل اور جنگلی اقوام کی فتح

حملہ آور اپنے دارالسلطنت سے براہ راست چھوٹا ناگپور ہوتا ہوا جنوب کی طرف روانہ ہوا اور دریائے مہاندی کی وادی میں جنوبی کوسل کے علاقے پر حملہ آور ہوا اور وہاں کے راجا مہندر کو شکست دی۔[9] آگے بڑھ کر اس نے ان جنگلی علاقوں کے تمام سرداروں کو زیر کیا۔ جو اب تک بدستور سابق اپنی وحشی حالت میں ہیں اور جن میں آج کل اڑیسہ کی باج گذار ریاستیں اور صوبہ متوسط (مدھیہ دیش) کے علاقے شامل ہیں۔ ان سرداروں میں سب سے بڑا سردار اسم بامسمی تھا۔ یہ ویاگھر راجا (یعنی "شیر شاہ") اور کسی پہلو سے تاریخ میں مشہور نہیں۔ مہم کو اس منزل پر پہنچ جانے کے بعد سب سے بڑی دقت رسد اور بار برداری کی پیش آئی ہو گی' کیونکہ غیر مسلح وحشی اقوام نے ایک باقاعدہ مرتب فوج کا بہت زیادہ فوجی مقابلہ نہ کیا ہو گا۔

انتہائے جنوب کی فتوحات

مشرقی ساحل سے ہوتا ہوا سمدرگپت جنوب کی طرف اور آگے بڑھا اور اس سردار کو مطیع کیا جو کلنگ کے قدیم دارالسلطنت پشٹپور پر (جو آج کل گوداوری کے ضلع میں پتھاپورم کے نام سے مشہور ہے) قابض تھا۔ اس کے علاوہ اس نے گنجم کی مہندر گری کٹور کے کوہستانی قلعوں کو بھی مسخر کیا۔ پھر منتراجا جس کا علاقہ جھیل[10] کلاری کے کناروں پر واقع تھا' ونگی کا راجا جو کرشنا اور گوداوری کے درمیانی علاقے پر حکمراں اور غالباً پلوا خاندان کا تھا اور وشنو گوپا کانچی یا کانجی ورم کا راجا یقیناً پلوا خاندان کا تھا' اس کے مطیع ہو گئے۔ پھر وہ مغرب کی طرف متوجہ ہوا۔ ا، ریا لک کے

راجا اگر سین کو مسخر کیا۔ یہ شہر غالباً نلور کے ضلع میں واقع تھا۔[11]

واپسی براہ خاندیش

وہ دکن کے مغربی حصص میں سے ہوتا ہوا وطن واپس آگیا اور راستے میں موجودہ مہاراشٹر یعنی دیوراشٹر اور ایرندپھل یعنی خاندیش کو فتح کیا۔[12]

اس حیرت انگیز مہم جس کے دوران فوج کو ملک کے مختلف حصوں میں سے ہزارہا میل کا چکر لگانا پڑا' کم از کم دو برس صرف ہوئے ہوں گے۔

350ء

اور فرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ 350ء میں ختم ہوئی۔

بیش بہا مال غنیمت' ملک کافور سے اس کا مقابلہ

مگر جنوبی ریاستوں کو مستقل طور پر سلطنت کے ساتھ ملحق کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی' کیونکہ فاتح حملہ آور اس بات کا معترف ہے کہ اس نے صرف وقتی اطاعت پر ہی اکتفا کیا اور اس کے بعد اپنی فوجوں کو ہٹا لیا۔ مگر بلاشک وشبہ اس نے جنوب کے خزانوں کا ضرور صفایا کر دیا اور اس مسلمان سپہ سالار کی طرح جس نے ایک ہزار سال بعد اس کے کارناموں کا اعادہ کیا' مال غنیمت سے لدا پھندا واپس آیا ہو گا۔ دہلی کے سلطان علاءالدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے 1309–1311ء کی فوجی مہم کے دوران سمدرگپت کے کارناموں کو مات کر دیا اور اپنے اس ہندو پیشرو سے زیادہ انتہائے جنوب تک چلا گیا۔ اپریل 1311ء میں ملک کافور نے مدرا پر قبضہ کیا اور اس کو اپنا فوجی مرکز قرار دے کر رامیسورم یا پل آدم تک پہنچا' جہاں اس نے وہ مسجد تعمیر کی جو سولھویں صدی تک (جب فرشتہ نے اپنی تاریخ لکھی) موجود تھی۔[13]

سرحد کی باج گذار ریاستیں

شاہی دربار کے شاعر نے ان سرحدی حکومتوں اور جمہوریتوں کا ذکر کیا ہے جو مہاراجا کے زیر نگین ہو گئی تھیں۔ اس کے ناموں کے گنوانے سے مورخین اس بادشاہ کی حدود سلطنت کا تعین صحت کے ساتھ کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی چوتھی صدی میں ہندوستان کی سیاسی تقسیم کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

[illegible] اعظم کی مشرقی جانب باج گذار ریاستیں جس [illegible] تھیں سمٹ [illegible] گنگا اور

برہم پتر کا مثلثی علاقہ جس میں وہ جگہ بھی شامل تھی جہاں آج کل کلکتہ شامل ہے' کامروپ یا آسام' اور دواک جس میں غالباً دریائے گنگا کے شمال میں بوگرا' دیناج پور اور راج شاہی کے اضلاع شامل تھے جو سمتٹ اور کامروپ کے درمیان میں واقع ہیں۔ زیادہ مغرب کی طرف نیپال کی کوہستانی سلطنت آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی شاہی حکومت کے ماتحت اندرونی طور پر خودمختار تھی اور شاہی عمال کا حلقہ اثر صرف دامن کوہ تک جاتا تھا۔ سلطنت کرتری پور میں مغربی ہمالیہ کی زیریں پہاڑیاں تھیں جن میں غالباً کماؤن' الموڑا' گڑھوال اور کانگڑے کے علاقے شامل تھے۔ [13]

قبیلوں کی جمہوری سلطنتیں

پنجاب' مشرقی راجپوتانہ اور مالوا کے علاقے بڑی حد تک ایسے قبیلوں کے ہاتھ میں تھے جن میں جمہوری اصول پر حکومت قائم تھی۔ دریائے ستلج کے دونوں کناروں پر قبیلہ یودھیا متصرف تھا اور پنجاب کے وسط میں مادرک قوم آباد تھی۔ ناظرین کتاب کو یاد ہوگا کہ سکندر اعظم کے زمانے میں بھی یہ علاقہ ایسے ہی خودمختار قبائل کے ہاتھ میں تھا جن کو اس زمانے میں ملوئی کتھوئی وغیرہ کہتے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ شمال مغرب میں دریائے جمنا سلطنت گپت کی حد فاصل تھا۔ مشرقی راجپوتانہ اور مالوا میں آرجنیان' مالوا اور ابھیرا اقوام آباد تھیں۔ اس جانب دریائے چنبل کو سلطنت کی حد قرار دیا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر حد اور زیادہ مشرقی جانب ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کی طرف پھیلتی تھی جن کے نام مذکور نہیں' اور غالباً بھوپال کے علاقے میں سے ہوتی ہوئی دریائے نربدا تک جا پہنچتی تھی۔ یہی دریا سلطنت گپت کی جنوبی حد فاصل تھا۔

سلطنت کی حدود

اس طرح چوتھی صدی کے وسط میں جس ملک پر سمدرگپت بلا شرکت غیرے حکمراں تھا اس میں شمالی ہند کے سب سے زیادہ معمور اور سرسبز و زرخیز علاقے شامل تھے۔ یہ مشرق میں دریائے ہگلی سے لے کر مغرب میں دریائے جمنا اور چنبل تک پھیلا ہوا تھا اور شمال میں کوہستان ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں دریائے نربدا تک وسیع تھا۔

اس وسیع حدود کے باہر بھی آسام اور دریائے گنگا کے مثلثی قطعہ کی ریاستوں اور کوہستان ہمالیہ کی جنوبی سلطنتوں کے علاوہ راجپوتانہ اور مالوہ کی آزاد اقوام بھی شاہی سلطنت کے ساتھ متحد اور اس کے ماتحت تھیں۔ علاوہ بریں جنوب کی سلطنتوں کو بھی شاہی افواج قاہرہ نے پامال کر ڈالا تھا اور وہاں کو بجبر سمدرگپت کی طاقت و عظمت کا اعتراف کرنا پڑا تھا۔

بیرونی دول سے تعلقات

ایسی سلطنت جس کا ذکر اوپر ہوا چھ صدی قبل اشوک کی سلطنت کے زمانے کے بعد ہندوستان میں کبھی قائم نہ ہوئی تھی۔ اس کی وسعت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہ کچھ بعید از قیاس نہیں کہ بیرونی درباروں میں بھی سمدرگپت کو عزت و توقیر حاصل ہوگئی تھی۔ اس لیے اس میں کچھ تعجب نہیں کہ اس کے سیاسی تعلقات کابل اور گندھار کے کشان بادشاہوں' اسی قوم کے ان بزرگ تر حکمرانوں سے جو دریائے سیحون کے علاقے پر قابض تھے اور لنکا کے دیگر دور دست جزیروں کے راجاؤں کے ساتھ تھے۔

لنکا سے سفارتوں کا آنا

360ء کے قریب لنکا کے راجا اور سمدرگپت کے درمیان اتفاقیہ طور پر سلسلہ خط وکتابت قائم ہوگیا تھا۔ لنکا کے بدھ مذہب کے راجا میگھون (یا میگھورن) نے جس کا ستائیس سالہ عہد حکومت 379-352ء کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے' دو بھکشوؤں کو جن میں سے ایک اس کا بھائی بیان کیا جاتا ہے روانہ کیا تھا کہ وہ "تخت الماس" کو سلام اور اس خانقاہ کی زیارت کر آئیں جس کو راجا اشوک نے بدھ گیا کے مقام پر مقدس درخت کے مشرق میں تعمیر کرایا تھا۔ غالباً مذہبی عداوت و تنفر کی وجہ سے ان اجنبیوں کی مطلق خاطر و مدارات نہ کی گئی اور انہوں نے اپنے جزیرے میں واپس آکر بادشاہ سے شکایت کی کہ تمام ہندوستان میں کوئی جگہ ان کو ایسی میسر نہ آئی جہاں وہ آرام اور خوشی سے زندہ رہ سکتے۔ راجا میگھورن نے ان کی اس شکایت کو سنا اور آئندہ علاج کی یہ تدبیر سوچی کہ ایک خانقاہ تعمیر کی جائے جہاں اس کے ہم وطن مقدس مقامات کی یاترا کے زمانے میں عیش و آرام سے بسر کرسکیں۔ چنانچہ اس نے سمدرگپت کے دربار میں ایک سفارت روانہ کی اور تحفے کے طور پر ایک کثیر تعداد ان جواہرات کی ان کے ساتھ کردی جن کے لیے لنکا ہمیشہ سے مشہور رہا ہے' اور ہندوستان کے ملک میں خانقاہ تعمیر کرنے کی اجازت چاہی۔ سمدرگپت اس دور دست سلطنت کی سفارت کے آنے سے پھولا نہ سمایا۔ ان تحائف کو اس نے خراج متصور کیا اور خوشی سے تعمیر خانقاہ کی اجازت دے دی۔ سفیر واپس چلا گیا' اور بہت کچھ سوچ بچار کے بعد راجا نے مقدس درخت کے قریب ہی اپنی خانقاہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس کا یہ مقصد جو ایک تانبے کی چادر پر کندہ کیا گیا تھا' پورا ہوا اور اس نے درخت کے شمال میں ایک عالیشان خانقاہ کی بناء ڈالی -- یہ عمارت تین منزل بلند تھی۔ اس میں چھ بڑے بڑے کمرے اور تین برج تھے اور تمام عمارت ایک مضبوط فصیل [illegible] تھی جو تیس یا چالیس فٹ اونچی تھی۔ اس میں تمام

نقش و نگار نہایت چمکتے ہوئے رنگ سے عمدہ فن نقاشی کے نمونے پر بنائے گئے تھے اور بدھ کا بت جو سونے اور چاندی کا ڈھلا ہوا تھا جواہرات سے مرصع تھا۔ ساتھ کے چھوٹے چھوٹے ستوپ بھی، جن میں خود بدھ کے تبرکات مدفون تھے، بڑی عمارت کی شان کی مناسبت سے بنائے گئے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب ہیون سانگ نے اسے دیکھا ہے تو اس عالیشان عمارت میں مہایان کے فرقہ ستھور کے ایک ہزار بھکشو مقیم تھے اور لنکا سے آنے والے یاتریوں کی مہمانداری بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی۔ اس جگہ پر اب ایک بڑا وسیع ٹیلا موجود ہے۔[15]

اشومیدھ

غالباً جنوب کی فوجی مہم سے واپس آنے کے بعد ہی سمدر گپت نے اپنی بے شمار فتوحات کی تشہیر اور اپنی حکومت کی عظمت اور برتری کے اعلان کا ارادہ کیا اور اشومیدھ کی قدیم رسم کو، جو ایک مدت سے معرض التواء میں پڑی تھی اور جس کو شمال ہند میں پشی متر کے زمانے سے کسی نے ادا نہ کیا تھا، دوبارہ زندہ کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ یہ رسم نہایت دھوم دھام اور طمطراق کے ساتھ ادا کی گئی اور برہمنوں کو خوب کھلے ہاتھوں دان وپن دیا گیا، جس میں کہا جاتا ہے کہ لاکھوں سکے اور سونے کی اشرفیاں تھیں۔ ان طلائی تمغوں کے نمونے بھی کہیں کہیں پائے گئے ہیں جن میں اس گھوڑے کی شبیہہ اور مناسب عبارت کندہ ہے۔ اسی واقعے کی ایک اور یادگار غالباً وہ بری طرح تراشا ہوا پتھر کا گھوڑا ہے جو شمالی اودھ میں دستیاب ہوا تھا اور آج کل لکھنؤ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ اس پر ایک کتبے کے مٹے ہوئے نشانات بھی پائے جاتے ہیں جس میں غالباً سمدر گپت کی طرف اشارہ ہے۔[16]

سمدر گپت کے ذاتی اوصاف

اگرچہ شاہی دربار کے شاعروں کے قصیدے اور ستائشیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ ان کو بلا تامل حرف بہ حرف صحیح مان لیا جائے، لیکن صریحاً معلوم ہوتا ہے کہ سمدر گپت ایک غیر معمولی قابلیت اور اوصاف کا بادشاہ تھا۔ ملک الشعراء کی اس تعریف کی تصدیق کہ بادشاہ فن موسیقی میں پورا مشاق تھا اتفاقاً ان نادر الوجود سونے کے سکوں سے ہوتی ہے جس میں بادشاہ ایک اونچے تکیہ کی کوچ پر تکیہ لگائے بیٹھا ہے اور ہندی ستار بجا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاعری بھی اس تیز طبع بادشاہ کے اوصاف میں سے بیان کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شاعروں کا بادشاہ تھا، اور خود اس نے بہت سی ایسی نظمیں لکھیں جو مخصوص شعراء کے لیے بھی باعث فخر و مباہات ہوتیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بادشاہ علماء کی مجلس میں بیٹھنے کا مشتاق اور اپنی عقل و فہم کو

موسیقی اور شاعری کے لطیف فنون کے علاوہ مذہبی کتب کے مطالعے میں بھی صرف کرتا تھا۔ زمانہ شباب میں اس نے بدھ مذہب کے مشہور و معروف عالم کو اپنا مقرب و ندیم بنایا۔ سمدر گپت کی جو تصویر اس کے درباری شاعر نے کھینچی ہے اس سے ناظرین کو اکبر کی وہ شبیہہ یاد آجاتی ہے جس کا چربہ اس کے درباری ابوالفضل کے قلم سے کھنچا ہے۔

مذکورہ بالا اوصاف سمدر گپت میں خواہ کتنی ہی حد تک کیوں نہ پائے جاتے ہوں مگر اس میں کلام نہیں کہ اس کے قویٰ معمولی انسانوں کے سے نہ تھے' بلکہ فی الواقع وہ ایک ایسا طباع اور بڑا ذہین آدمی تھا جو بخوبی "ہندی نپولین" ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

اس کی تاریخ کی دریافت

لیکن سب سے بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس عظیم الشان بادشاہ کے نام سے بھی (جو سپاہی' شاعر اور مقرر تھا۔) جس نے تقریباً تمام ہندوستان کو فتح کر لیا تھا اور جس کے اتحاد اور تعلقات کے سلسلے دریائے سیحون سے لے کر لنکا تک پھیلے ہوئے تھے' ہندوستان کے مورخ اس کتاب کے طبع ہونے سے بالکل نابلد تھے۔ گذشتہ اسی سال کے عرصے میں کتبات اور سکہ جات کے دقیق اور بغور مطالعے سے اس کی شہرت بتدریج پھر قائم ہوئی ہے۔ اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اس کی یادگار زمانہ حکومت کے عہد کا مسلسل حال لکھ سکیں۔ یہ امر اس بات کی بین اور روشن شہادت ہے کہ آثار قدیمہ کی تحقیقات اور اس کے ٹکڑوں کو منضبط کرنے سے کیا کچھ کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے' کیونکہ یہی آثار قدیمہ ہیں جن سے قدیم ہند کی تاریخ کا صحیح نقشہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

تقریباً 375ء

سمدر گپت کی موت کا صحیح سنہ معلوم نہیں مگر یقینی ہے کہ وہ بہت بڑھاپے تک زندہ رہا اور کم و بیش نصف صدی تک نہایت کامرانی اور شادکامی سے حکومت کرتا رہا۔ اپنے مرنے سے قبل اس نے اس بات کی پوری جدوجہد کی کہ امن و آشتی کے ساتھ اس کے جانشین کا فیصلہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی اور اولاد میں بحالہ اپنی ملکہ دت دیوی کے بیٹے کو ولی عہد مقرر کیا جسے وہ بجا طور سے ایک عالیشان سلطنت پر حکومت کرنے کا اہل سمجھتا تھا۔

چندر گپت دوم وغیرہ

جس بیٹے کا اس طرح انتخاب ہوا وہ غالباً اپنے باپ کے عین حیات میں یُووراجا (ولی عہد) رہ

چکا تھا اور سلطنت کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس نے ہندوؤں کے دستور کے مطابق اپنے دادا چندر گپت کا نام اختیار کیا اور اسی وجہ سے وہ چندر گپت دوم کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بکرماجیت (شمس الملک) کا خطاب اختیار کیا۔ اور وہی بادشاہ ہے جو اس نام کے ان تمام بادشاہوں میں، جن کے قصے شمالی ہند میں زبان زد خلائق ہیں، سب سے زیادہ شہرت کا مستحق ہے۔ اس کی تخت نشینی کی اصلی تاریخ مذکور نہیں۔ لیکن یہ سن 375ء سے بہت بعید ہرگز نہیں ہو سکتا اور جب تک کوئی ایسا سکہ یا کتبہ دریافت نہ ہو جائے جس سے کہ اس امر کا تصفیہ قطعاً ہو سکے اسی تاریخ کو صحیح مان لینا چاہیے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جانشینی بہ امن وقوع میں آئی اور اس میں کسی قسم کا جھگڑا فساد نہیں ہوا اور نئے بادشاہ کو جو اس وقت خاصی پکی عمر کا ہو گا فوراً اس بات کا موقعہ حاصل ہو گیا کہ اپنے فاتح باپ سے جو وسیع سلطنت اس کو ترکے میں ملی تھی اس میں اور زیادہ اضافہ کرے۔ اس نے سمدر گپت کی طرح جنوب کی طرف توجہ نہیں کی، بلکہ جنوب مغرب کی طرف سلطنت کو وسیع کرنے کو ترجیح دی۔ [۸]

مالوا، گجرات اور کاٹھیاواڑ کی فتح

چندر گپت بکرماجیت کا سب سے بڑا فوجی کارنامہ مالوا اور گجرات کے صوبوں میں سے ہوتے ہوئے بحیرہ عرب تک پہنچنا اور سراشٹریا کاٹھیاواڑ کے جزیرے کی تسخیر ہے جس پر صدیوں سے بیرونی قوم سک کا خاندان حکمراں تھا، جو یورپ کے علماء میں مغربی ستریوں کے نام سے مشہور ہے۔ [۹] ان تمام فوجی مہمات میں، جن سے کہ چند دور کے صوبے سلطنت کے ساتھ ملحق ہوئے، یقیناً چند سال صرف ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ اس بات کا ہم کو علم ہے کہ وہ 401ء۔ 388ء کے درمیان عمل میں آئی تھیں، اور اس طرح 395ء ان فتوحات کی تکمیل کا سنہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ذریعے سے وہ علاقہ جس پر ملوا اور دیگر اقوام متصرف تھیں اور جو سمدر گپت کے ہاتھ سے محفوظ رہ گیا تھا سلطنت کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔ سراشٹر اور مالوا کی فتح سے نہ صرف زیادہ متمول اور زرخیز علاقے چندر گپت کے ہاتھ آئے، بلکہ اب مغربی ساحل کے تمام بندرگاہوں تک کا راستہ اس کے لیے کھل گیا، اور اس طرح مصر کے ذریعے سے جو تجارت یورپ سے ہوتی تھی اس سے اس کو براہ راست تعلق ہو گیا۔ اس کے دربار اور رعایا کو یورپی خیالات سے بھی، جو اس مال و اسباب کے ساتھ تمام دنیا میں پھیل رہے تھے، متاثر ہونے کا موقع ملا۔ سلطنت گپت کے زمانے میں ہندی علم و ادب، فنون لطیفہ اور علم و فن پر جو بیرونی اثر ہوا اس کا ذکر مجملاً آئندہ آئے گا۔

مغربی ستر پ

یہ نام نہاد "مغربی ستر پ" دو بالکل ممیز خاندانوں میں منقسم تھے اور یہ دونوں الگ الگ جداگانہ علاقوں پر حکمراں تھے۔ مہاراشٹر کے کشہرات ستر پوں کا دارالسلطنت مغربی گھاٹ میں غالباً ناسک کے مقام پر تھا۔ یہ پہلی صدی عیسوی کے دوران میں اس علاقے پر متصرف ہو گئے تھے اور خاندان اندھر کے ایک راجا گوتمی پتر نے تقریباً 126ء میں انہیں تباہ و برباد کیا تھا۔ دوسری طرف مغربی ستر پی پہلی صدی عیسوی کے آخر میں مالوا کے علاقے میں اجین کے مقام پر سک قوم کے ایک فرد چشتن نے قائم کی تھی۔ اس کے پوتے رودر دامن اول نے اسے بہت وسعت دی' اور آخر 150ء۔126ء کے درمیان کسی سال میں گوتمی پتر کے بیٹے پلماوی دوم کو شکست دے کر اس علاقے کا تمام یا بہت بڑا حصہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا جو گوتمی پتر نے چند سال قبل ہی کشہرات ستر پوں سے چھینا تھا۔ اس طرح رودر دامن کی سلطنت نہ صرف سراشٹر' بلکہ تمام مالوا' کچھ' سندھ' کونکن اور دیگر اضلاع یعنی تمام مغربی ہند پر پھیل گئی۔ چشتن اور اس کے جانشینوں کا صدر مقام اجین تھا۔ یہ ہندوستان کا ایک قدیم ترین شہر مغربی بندرگاہوں اور اندرون ملک کے درمیان تجارت کی منڈی' علم و فضل اور قدیم تہذیب کا مرکز ہونے کی حیثیت سے مشہور اور اس وجہ سے قابل ذکر تھا کہ ہندوستان میں یہیں سے طول بلد کا شمار ہوتا تھا۔ یہ جگہ آج کل کے زمانے میں بھی خاصہ بڑا شہر ہے۔ اب تک اس کا قدیم نام ہی زبانوں پر جاری ہے اور قدیم عظمت کے آثار وہاں موجود ہیں۔ کسی زمانے میں اسے مہاراجا سندھیا کا صدر مقام ہونے کی بھی عزت حاصل رہی ہے۔

آخری ستر پ کی بربادی

سمدر گپت کو اگرچہ مغرب کے علاقے کی فتح نصیب نہ ہوئی تھی' مگر ایک اور رودر دامن کے بیٹے ستر پ اور سین کے پاس سے ایک سفارت آئی تھی جو یقیناً بادشاہ کے تمام ہندوستان کے فتح کر لینے سے بہت متاثر ہوا ہو گا۔ چندر گپت دوم جب تخت پر بیٹھا تو اس عظیم الشان سلطنت اور خزانے کی وجہ سے جو اس کو ورثے میں ملا تھا اس قدر طاقتور تھا کہ اس نے فوراً اپنے اس مغربی حریف کو نیست نابود کرنے اور اس کے قیمتی علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا عزم کر لیا۔ اولوالعزم اور جنگجو بادشاہ کو اپنے کسی متمول ہمسایہ کے ساتھ جنگ چھیڑنے کے واسطے بہانہ تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ اختلاف قوم و مذہب و اوضاع و اطوار ہی صرف ایسے اسباب تھے جن کی بناء پر چندر گپت نے مغرب کے ان پلید بیرونی حکمرانوں کو نیست و

نابود کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چندر گپت بکرماجیت اگرچہ بدھ اور جین مذہبوں سے رواداری کا برتاؤ کرتا تھا، مگر وہ خود ایک راسخ الاعتقاد ہندو اور بالخصوص وشنو کا پجاری تھا۔ اسی وجہ سے ممکن ہے کہ ان بیرونی سرداروں کو جو ذات پات کے تمام تفضیوں سے بالکل بے نیاز تھے "بیخ و بن سے اکھاڑ دینے" میں اسے ایک خاص لطف اور راحت اور اطمینان قلب حاصل ہوا ہو۔ لیکن اس کام میں اس کے مقاصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، اس نے بہر حال ستیا سنہا کے بیٹے ردر سنہا ستر پ پر حملہ کیا، اس کو تخت سے اتار کر قتل کیا اور اس کی سلطنت پر متصرف ہو گیا۔ ایک اور شرمناک روایت کے مطابق "سک قوم کا بادشاہ اپنے دشمن کے شہر میں ایک دوسرے مرد کی بیوی سے رسم و راہ پیدا کرتے ہوئے خود چندر گپت کے ہاتھ سے مارا گیا جو اس کی معشوقہ کا بھیس بدلے ہوئے تھا۔" [۲۰] لیکن بادی النظر میں یہ حکایت تاریخی پہلو سے بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ 388ء میں سب سے آخری مرتبہ ان ستر پوں کا ذکر ملتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس کے بعد جلد ہی ان کا علاقہ سلطنت گپت کے ساتھ لاحق کر لیا گیا ہو گا۔

چندر گپت بکرماجیت کے عادات و خصائل

بعد کے زمانے کے خاندان مغلیہ کی طرح سوائے بانی خاندان کے تمام گپت راجاؤں کا زمانہ حکومت بہت طویل تھا۔ چندر گپت بکرماجیت نے کم و بیش چالیس برس حکومت کی اور 403ء تک زندہ رہا۔ اس کے ذاتی اوصاف سے ہم تقریباً بالکل بے خبر ہیں۔ مگر اس کی زندگی کے واقعات معلومہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک زبردست اور قوی بادشاہ تھا اور ہر پہلو سے ایک وسیع سلطنت پر حکومت کرنے اور اس کو وسعت دینے کا مستحق تھا۔ وہ ایسے پر شکوہ خطابات کا خصوصاً دلدادہ تھا جن سے اس کے فوجی کارنامے ظاہر ہوں۔ اور قدیم ایرانی طریقے کے مطابق وہ سکوں پر اپنی تصویر اس طرح بنواتا تھا کہ وہ شیر سے مقابلہ کر رہا ہے اور اس پر غالب ہے۔

اس کا دار السلطنت

اس قسم کی علامات پائی جاتی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ سرکاری طور پر پاٹلی پتر اب بھی سلطنت کا دار السلطنت سمجھا جاتا تھا، لیکن سمدر گپت کی وسیع فتوحات کے بعد شاہان گپت نے وہاں کی سکونت عموماً ترک کر دی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ شاہان موریا نے اسی شہر میں بیٹھ کر شاہان گپت کی سلطنت سے کہیں زیادہ وسیع سلطنت پر حکمرانی کی تھی۔ مگر اصل یہ ہے کہ ان کے زمانے میں بھی اس کے زیادہ مشرق میں واقع ہونے سے دقتیں ضرور واقع ہوئی ہوں گی اور دار السلطنت کو زیادہ مرکز میں قائم کرنا بہت مفید معلوم ہوتا تھا۔ اجودھیا جو رام چندر کا وطن

ہونے کی وجہ سے مشہور تھا اور جس کے کھنڈروں سے مغربی اودھ میں موجودہ فیض آباد شہر بنایا گیا تھا' اپنے موقع کے سبب بہت اچھا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ سمدرگپت اور اس کے بیٹے کے زمانے سے یہی شہر ان کی حکومت کا صدر مقام تھا۔ غالباً موخرالذکر نے وہاں تانبے کے سکوں کی ٹکسال بھی قائم کردی تھی۔ اس بات کے باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ پانچویں صدی عیسوی میں پاٹلی پتر کے بجائے اجودھیا ہی خاندان گپت کی سلطنت کا صدر مقام تھا۔

کوسامبی

اشوک کا وہ ستون جس پر سمدرگپت نے اپنی تاریخ کندہ کرائی تھی اس کی نسبت خیال ہے کہ وہ پہلے کوسامبی کے مشہور و معروف شہر میں نصب کیا گیا تھا جو اجین اور شمالی ہند کی درمیانی شاہراہ پر واقع تھا اور بلاشک وشبہ بعض اوقات ضرور شاہی صدر مقام رہا ہو گا۔[61] اصل یہ ہے کہ ایک ایشیائی خودمختار بادشاہ کا دارالسلطنت وہی مقام ہوا کرتا ہے جہاں وہ مقیم ہو

پاٹلی پتر

پاٹلی پتر کو اگرچہ سمدرگپت اور چندرگپت جیسے جنگجو بادشاہوں نے ایک بڑی حد تک اپنی حالت پر چھوڑ دیا تھا' مگر پھر بھی موخرالذکر کی حکومت کے دوران وہ ایک عالیشان اور معمور شہر تھا' اور چھٹی صدی عیسوی میں سفید ہنوں کے حملے تک وہ برباد نہیں ہوا تھا۔ جب چینی یاتری ہیون سانگ 604ء میں اس کے قریب مقیم ہوا تو اس نے دیکھا قدیم شہر کے موقعے پر بے انتہاء کھنڈر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "یہ شہر ایک مدت سے جنگل ہو گیا ہے۔" سوائے دریائے گنگا کے کنارے ایک چھوٹے سے قلعہ بند شہر کے جس میں 1000 آدمیوں کی آبادی ہے۔ جب ہرش 647-612ء کے درمیان شمالی ہند پر حکمراں تھا تو اس نے بھی اس قدیم شہنشاہی شہر کو دوبارہ تعمیر کرنے کی کوشش نہ کی اور دریائے گنگا اور جمنا کے درمیان شہر قنوج کو اپنا صدر مقام بنانے کے لیے ترجیح دی۔ بہار اور بنگال کے خاندان پال کے دوسرے اور غالباً سب سے زیادہ طاقتور راجا دھرم پال نے بظاہر کوشش کی کہ پاٹلی پتر کی شان و شوکت پھر عود کر آئے کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ 811ء میں اپنی حکومت کے بتیسویں سال وہ وہیں مقیم تھا۔ اس قدیم شہر کے اس ذکر کے بعد 1541ء تک اس کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ اس زمانے میں بہار کا جو شہر شاہی حکومت کا مرکز تھا ایک معمولی درجے کا شہر رہ گیا تھا۔ "شیر شاہ نے اس کی جائے وقوع کی خوبیوں کو دیکھ کر وہاں پچاس لاکھ کے خرچ سے ایک قلعہ تعمیر کروایا۔" "اس وقت سے بہار آہستہ آہستہ برباد ہو تا گیا اور پٹنہ اس صوبے کا سب سے بڑا شہر ہو گیا۔ شیر شاہ کے اس عمل سے جو سرسبزی اس کو حاصل ہو گئی وہ

اب تک برابر قائم ہے۔

1912ء میں پٹنہ پھر صوبہ بہار واڑیسہ کے صدر مقام کی حیثیت سے دارالسلطنت ہو گیا۔ بانکی پور کا سول سٹیشن جو پٹنہ کے شہر میں ہے قدیم پاٹلی پتر کے موقعہ پر آباد ہے۔ [۲۲]

407ء تا 411ء: فاہیان

خوش قسمتی سے قدیم ترین چینی یاتری فاہیان کی کتاب سے ہم کو چندر گپت بکرماجیت کے عہد حکومت میں ملک کے نظم و نسق کی ہمعصر شہادت ملی ہے' جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب فراست اجنبی پانچویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندوستان کو کس نظر سے دیکھتا تھا۔ یہ درست ہے کہ یاتری بدھ مذہب کی کتب' حکایات اور معجزات کی تلاش و تفتیش میں اس قدر منہمک تھا کہ اس کو دنیا ومافیہا سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ چنانچہ اس نے اس زبردست بادشاہ کا نام تک نہیں لکھا جس کی سلطنت میں اس نے تحصیل علم کے لیے متواتر چھ برس گذارے تھے لیکن پھر بھی وہ جستہ جستہ معمولی معاشرتی حالات لکھ جاتا ہے۔ ایک سے زیادہ عبارتوں میں اس نے ایسی تفاصیل بیان کی ہیں جو اگرچہ بیسویں صدی کے لوگوں کی تسلی کے لیے کافی نہیں مگر اس بات کے لیے کافی ہیں کہ اس زمانے میں ملک کی حالت کا اندازہ کیا جا سکے' اور بہ ہیئت مجموعی یہ تصویر خاصی درخشاں اور خوشگوار ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بکرماجیت اتنا قابل تھا کہ وہ ایسی باضابطہ حکومت قائم کر دیتا جس کے زیر عاطفت اس کی رعایا عیش و آرام سے زندگی بسر کر سکے اور معمول سے زیادہ متمول ہو جائے۔

پاٹلی پتر کی شان و شوکت

جب ہمارا سیاح پہلی مرتبہ پاٹلی پتر گیا ہے تو اشوک کے محل کو دیکھنے سے جو اس وقت تک بالکل سالم موجود تھا اس کے دل پر گہرا اثر پڑا۔ یہ محل سنگی تھا اس قدر ہنرمندی اور کاری گری سے تعمیر کیا گیا تھا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا تھا گویا وہ انسانی ہاتھ کا کام نہیں۔ اس کی نسبت مشہور تھا کہ اسے ان جنوں نے تعمیر کیا ہے جو مہاراجا کے تابع تھے۔ ایک عالیشان ستوپ کے قریب جس کو اشوک ہی سے منسوب کیا جاتا تھا دو خانقاہیں تھیں جن میں سے ایک میں مہایان اور دوسری میں ہنایان فرقے کے لوگ مقیم تھے۔ ان دو خانقاہوں میں چھ یا سات سو بھکشو مقیم تھے اور یہ لوگ علم و فضل کے لحاظ سے اس قدر مشہور تھے کہ طلبہ اور شائقین علم دور دور سے ان کے ہر درس میں شامل ہونے کے لیے آیا کرتے تھے۔ یہاں فاہیان نے سنسکرت کے مطالعے میں تین برس صرف کیے اور یہیں اس کو خانقاہوں کے قواعد و ضوابط کے متعلق چند ایسی کتابیں

دستیاب ہوئیں جن کے حاصل کرنے سے وہ اس سے قبل بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ اس نے نہایت جوش کے ساتھ بتوں کے ایک جلوس کا ذکر کیا ہے جو بیس سجی سجائی گاڑیوں میں رکھ کر ہر سال دوسرے مہینے کی آٹھویں تاریخ کو گویوں، رقاصوں اور مطربوں کے ہمراہ تمام شہر میں گشت لگایا کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس قسم کے جلوس بالکل عام تھے۔ [۲۳]

مفت علاج کے شفا خانے

دریائے گنگا کے تمام میدان میں مگدھ کے شہر سب سے زیادہ بڑے تھے۔ اس میدان کو فاہیان "وسط ہند" یا "سلطنت وسطیٰ" کہتا ہے۔ یہاں کے لوگ مالدار اور خوشحال تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے نیکی کرنے میں ایک سے ایک بڑھا ہوا اور بڑھنا چاہتا ہے۔ بے شمار خیرات خانے تھے۔ شاہراہ پر مسافروں کی آسائش و آرام کے لیے مکانات بنے ہوئے تھے اور خود دارالسلطنت میں ایک شفا خانہ تھا جہاں مفت علاج ہوتا تھا۔ اس کا خرچ کا شہر کے نیک اور تعلیم یافتہ باشندے ادا کرتے تھے۔ فاہیان کہتا ہے:

> تمام غریب اور بے کس ہر قسم کی بیماریوں میں مبتلا لوگ یہیں آتے ہیں۔ ان کی یہاں تیمارداری کی جاتی ہے اور ایک طبیب ان کا علاج کرتا ہے۔ ان کی ضروریات کے مطابق ان کو دوا اور خوراک بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اس طرح ان کو ہر طرح آرام دیا جاتا ہے اور جب وہ چنگے ہو جاتے ہیں تو وہاں سے رخصت کر دیئے جاتے ہیں۔ [۲۴]

اس میں شک ہے کہ اس زمانے میں دنیا بھر میں کوئی ایسا باضابطہ شفا خانہ موجود تھا۔ اس کے وجود سے ان باشندگان شہر کے خصائل و عادات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو اس کی مدد کرتے تھے۔ اور اشوک اعظم کی طباعی کی بھی داد دینی پڑتی ہے جس کی تعلیمات اس کی موت کے صدیوں بعد تک اس طرح بار آور ہوتی رہیں۔ [۲۵]

بدھ مذہب

دریائے سندھ سے لے کر دریائے جمنا کے کنارے متھرا تک 500 میل سفر کے دوران فاہیان یکے بعد دیگرے بے شمار بدھ خانقاہوں میں سے گذرا جہاں ہزاروں بھکشو اپنی زندگی کے دن گذار رہے تھے۔ متھرا کے قرب و جوار میں اس کو بیس ایسی خانقاہیں ملیں جہاں تین ہزار آدمی آباد تھے، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مذہب اس نواح میں خوب پھل پھول رہا تھا۔ [۲۶]

مالوا کی خوشحالی

متھرا کے جنوب یعنی مالوا کے علاقے نے خاص کر سیاح سے خراج تحسین و آفرین حاصل کیا ہے۔ چنانچہ اس کے دل پر اس علاقے کی قدرتی خوبیوں' باشندوں کے مزاج و خصائل اور حکومت کے اعتدال کا یکساں خوشگوار اثر پڑا۔ یہاں کی آب و ہوا اسے خاص کر بہت خوشگوار معلوم ہوتی تھی کیونکہ وہ معتدل اور برف و ژالہ باری کے طوفانوں سے (جن کا وہ اپنے وطن اور عرصہ سفر میں عادی تھا) بالکل پاک تھی۔ عام رعایا ایک ایسی حکومت کے زیر سایہ جو اسے تنگ نہ کرتی تھی شاداں و فرحاں زندگی بسر کرتی تھی۔ اپنے چینی قوانین کو مد نظر رکھتے ہوئے فاہیان ہندوستانیوں کو مبارک باد دیتا ہے کہ "انہیں اپنے گھربار کو سرکاری طور پر منضبط کرنے یا کسی حاکم و قوانین کی پابندی کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔" ان کو پروانہ راہداری کے حصول کی بھی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی تھی۔ یا جیساکہ یاتری نے نہایت سادگی سے لکھا ہے "ان میں سے جو چاہے چلا جائے اور جو چاہے مقیم ہو جائے۔" چینی قوانین کے مقابلے میں ضابطہ تعزیرات بہت معتدل معلوم ہوتا تھا۔ بہت سے جرائم کی سزا صرف جرمانے سے دی جاتی تھی جو جرم کے لحاظ سے کم و بیش ہو سکتا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ سزائے موت تقریباً بالکل ناپید تھی۔ وہ لوگ جو متواتر بغاوت کے مرتکب ہوتے تھے (اس میں غالباً لوٹ مار اور ڈکیتی بھی شامل ہے) ان کا داہنا ہاتھ قطع کیا جاتا تھا۔ مگر یہ سزا بھی شاذ تھی اور ساتھ ہی اقبال جرم کے لیے تشدد کا دستور نہ تھا۔ محاصل عموماً شاہی اراضی سے وصول ہوتے تھے اور کیونکہ تمام عمال شاہی کو مقررہ تنخواہیں ملتی تھیں' اس لیے ان کو رعایا کے ستانے اور تنگ کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملتا تھا۔

بدھ مذہب کا طریق زندگی

علی العموم بدھ مذہب کا طریق زندگی مروج تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "تمام ملک میں کوئی شخص نہ کسی جاندار کو مارتا ہے نہ شراب پیتا ہے اور نہ لہسن اور پیاز کھاتا ہے۔[۲۷] وہ مرغ اور سور بھی نہیں پالتے۔ مویشیوں کی خرید و فروخت بالکل بند ہے اور بازاروں میں قصاب اور شراب کی دوکانیں بالکل معدوم ہیں۔" چنڈال یا اچھوت ذاتیں جذامیوں کی طرح بالکل الگ تھلگ رہتی تھیں اور جب کبھی وہ شہر کے اندر داخل ہوں تو ان کے لیے ضروری تھا کہ لکڑی کے ٹکڑے کو بجاتے جائیں تاکہ لوگ ان کے آنے سے مطلع ہو جائیں۔[۲۸] یہی وہ اقوام تھیں "جو قانون فرائض" (دھرم) کی پابند نہ تھیں اور صرف ان میں شکاری قصاب اور مچھیرے پائے جاتے تھے۔ کوڑیاں عام طور پر سکے کی جگہ استعمال ہوتی تھیں۔"[۲۹] بدھ مذہب کی خانقاہوں کو گرانقدر

شاہی عطیات حاصل تھے اور بھکشو کو بھیک دینے میں بھی کسی قسم کا بخل نہ کیا جاتا تھا' بلکہ جہاں کہیں اور جب کبھی وہ چاہیں مکانات 'بستر' چٹائیاں' خوراک اور کپڑے ان کو میسر آ سکتے تھے۔

حکومت کی خوبی

چین کے قدیم سیاح کی جمع اور بیان کردہ تمام تفصیلات سے اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ چندر گپت بکرماجیت کی سلطنت پر نہایت خوبی سے حکومت ہوتی تھی۔ حکومت رعایا کے کاموں میں ہر ممکن حد تک کم دخل دیتی تھی اور ان کو اپنے حال میں دولت مند بننے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ یہ دیندار یاتری تین سال تک پاٹلی پترا اور دو سال تامر لپتی (تملوک) کے بندرگاہ میں بغیر کسی رکاوٹ کے تحصیل علم کے لیے مقیم رہا اور یہ ظاہر ہے کہ راستے بالکل محفوظ تھے۔ فاہیان کو کبھی اس بات کا موقع نہیں ملا کہ وہ لیٹروں کے ہاتھ میں پڑ جانے کی شکایت کرے' حالانکہ ساتویں صدی میں ہیون سانگ کو دو مرتبہ اس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ ایشیائی طرز حکومت کے لحاظ سے بکرماجیت کی حکومت سے بہتر حکومت کبھی ہندوستان میں قائم نہیں ہوئی۔ حکومت اپنی طاقت سے زیادہ کام کرنے کی کوشش نہ کرتی تھی۔ بلکہ لوگوں کو آزادی دی گئی تھی اور اسی وجہ سے وہ ہر دلعزیز تھی۔ ارذل خلائق کے سوا بدھ مذہب کی رحیمانہ تعلیمات نے ہر جماعت پر یکساں اثر ڈالا تھا۔ دوسری جانب کیونکہ خود بادشاہ مذہبا" برہمنی ہندو تھا اس لیے مذہبی تعصب و ایذا دہی کی وہ رو جو جین یا بدھ حکومت کی وجہ سے شروع ہو جاتی دبی رہی اور مذہبی آزادی عام ہو گئی۔ ایک عابد و زاہد دیندار مخص فاہیان ہر ایک چیز کو بدھ مذہب کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ برہمنی سلطنت قائم ہو جانے سے ہندو مت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہو گا جتنا کہ فاہیان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے' اور ساتھ ہی قربانیوں کی بھی ضرور اجازت ہو گی۔ اصل یہ ہے کہ فاہیان کی سیاحت سے بہت قبل بدھ مذہب کے خلاف برہمنی ردعمل کی ابتداء ہو چکی تھی اور ہندی بدھ مت پہلے ہی سے بہت کچھ زوال پذیر ہو چکا تھا' اگرچہ یاتری پر اس کے انحطاط کی ظاہری نشانیاں بالکل مخفی رہیں۔

بعض اضلاع

اگرچہ چندر گپت بکرماجیت کی زیر عنان تمام سلطنت کی عام خوشحالی اور امن و امان کا بین ثبوت فاہیان کے روشن بیان اور اس کے سالہا سال تک بلا دقت ہر جانب سفر کرنے سے ملتا ہے' مگر بعض اضلاع ایسے بھی تھے کہ جن میں یہ امن و امان اور عام خوشحالی مفقود تھی اور جو دولت و آبادی کے لحاظ سے بہت کچھ گھٹ گئے تھے۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ گیا کا شہر ویران اور تباہ پڑا ہوا

تھا۔ اس کے جنوب میں چھ میل کے فاصلے پر بدھ گیا کے مقدس مقامات کے گرد گھنا جنگل ہو گیا تھا اور دامن کوہ کے قریب ایک وسیع علاقہ' جو پانچویں صدی قبل مسیح میں آباد و معمور تھا' اب کہیں کہیں اس میں بستیاں پائی جاتی تھیں۔ دریائے راپتی کے بالائی کنارے شراوستی کے عالیشان شہر میں اب صرف دو سو خاندان رہ گئے تھے۔ کپل وستو اور کشی نگر کے مقدس مقامات اب تباہ و خستہ حال تھے۔ ان میں اب چند بھکشو اور ان کے ملازمین رہ گئے تھے جو باوجود بربادی کے ان مقدس مقامات میں سکونت پذیر تھے اور بھولے بھٹکے یاتری کی دان سے بمشکل اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ اس انحطاط اور بربادی کے اسباب معلوم نہیں۔ [۴۱]

413ء کمار گپت کی تخت نشینی

بکرماجیت کا ایک بیٹا' جو اس کی ملکہ دھروادیوی کے بطن سے تھا' 413ء میں عالم شباب میں تخت پر بیٹھا اور چالیس سال حکمران رہا۔ تاریخ میں اس کے پڑپوتے سے اسے ممیز کرنے کے لیے کمار گپت اول کہا جاتا ہے۔ اس بادشاہ کے زمانہ حکومت کے واقعات بالتفصیل معلوم نہیں۔ لیکن بے شمار ہمعصر کتبات اور سکوں کی تقسیم کو دیکھتے ہوئے اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ اس کے غیر معمولی طور پر طویل مدت حکومت کے دوران سلطنت کی حدود میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ [۴۲] بلکہ اس کے برعکس اغلب یہ ہے کہ اس نے اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کیا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی اپنے دادا کی طرح اپنی مہاراجگی کا اعلان کرنے کے لیے اشومیدھ کی رسم ادا کی تھی۔ اور یہ بات ممکن نہیں معلوم ہوتی کہ اس نے یہ کام بغیر کامیاب جنگوں کے محض لاف زنی ہی کی غرض سے کیا ہو' مگر موجودہ مواد سے مخصوص اور مبین واقعات کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ اس کی حکومت کے آخری حصے یعنی پانچویں صدی کے وسط میں اس کی سلطنت کو ہنوں کے جرگوں کے حملوں سے ایک سخت دھچکا پہنچا تھا۔ یہ لوگ شمال مغربی دروں سے ایک بارگی ملک پر ٹوٹ پڑے تھے اور تمام شمالی ہند پر طوفان محشر انگیز کی طرح پھیل گئے تھے۔ ہنوں کے حملے اور اس کے ساتھ سلطنت گپت کی بربادی پر بحث کرنے سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں کی ہندوستانی زبان' علم و ادب' علوم و فنون اور مذہب کے ارتقاء پر شاہان گپت کے اثر اور ان کی حکومت کی خصوصیات پر مختصراً ایک نظر ڈال جائیں۔ [۴۳]

حوالہ جات

۱؎ خاندان موریا اور خاندان کے ناموں میں تفریق کرنے کے لیے موریا کے بادشاہ چندر اگپتا اور گپت راجاؤں کو چندر گپت لکھا گیا ہے۔

۲؎ ایم۔ سلوین لیوی: لی نیپال جلد اول، صفحہ 14، جلد دوم صفحہ 153۔

۳؎ چندر گپت کے باپ کا نام گھٹوتکچ اور دادا کا نام گپت تھا۔ گھٹوتکچ کی ایک مہر بسارہ (ویشالی) کے مقام سے برآمد ہوئی ہے۔ (آرکیالوجیکل سروے اینوئل رپورٹ 4-1903ء صفحہ 107 لوح 41-14) بدھ مذہب کی حکایات و تاریخ سے اس قسم کی ایک اور مثال ملتی ہے، جہاں گپت کا لفظ نام کے طور پر استعمال ہوا تھا یعنی گپت عطار کا بیٹا۔ اُپگپت۔

۴؎ اس خاندان کی جدول سنین کے لیے دیکھو مصنف کا مضمون "ریوائزڈ کرونالوجی آف دی ارلی امپریل گپتا ڈائناسٹی" (انڈین انٹی کویری 1902ء صفحہ 257) یہ جدول اس سلسلے کو ذرا تبدیل کر دیتی ہے جو اس کے سکوں کی کتاب میں مذکور ہے۔ مگر پھر اس میں تھوڑی بہت صحت کی ضرورت ہے۔ سمت گپت (س۔گ) کی تاریخوں کو تقریباً صحت کے ساتھ سنہ عیسوی میں 319 جمع کر دینے سے حاصل کیا جا سکتا ہے مثلاً 82 س گ 401ء کے برابر ہے۔ 1888ء میں جتنے کتبات خاندان گپت کے دریافت ہو چکے تھے اس کے لیے دیکھو ڈاکٹر فلیٹ کی "گپتا انسکرپشنز" (کارپس انسکرپشن انڈیکا جلد سوم)۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سب سے بڑی دریافتیں حسب ذیل ہیں: (1) کمار گپت کی مہر بھتری کے مقام پر (محمود ی۔ اے۔ سمتھ اینڈ ہارنل۔ جے۔ اے۔ ایس۔ بی جلد 58 حصہ اول 1889ء) (2) گھٹوتکچ اور چندر گپت دوم کی ملکہ کی مہریں بمقام بسارہ (آرکیالوجیکل سروے اینوئل رپورٹ 4-1903ء صفحہ 122-101 لوح 42-40)۔ (3) کمار گپت اول کا کتبہ بمقام بھروی۔ (5) مورخہ 117 س گ۔ (آرکیالوجیکل سروے پروگرس رپورٹ آف نارتھ سرکل 8-1907ء صفحہ 39۔ مطبوعہ جے۔ اے۔ ایس۔ بی۔ جلد 5 سلسلہ نو 1909ء صفحہ 457)۔ (4) اس بادشاہ کا کتبہ بمقام دھانائیدہ مورخہ 113 س گ۔ یہ قدیم ترین تانبے کے پترے پر

کندہ عطیہ کا کتبہ ہے (جے۔ اے۔ ایس۔ بی۔ رسالہ مذکورہ 459)۔ (5) ایک نہایت قابل قدر گپت واکاتک عطیہ جس کو ایک حد تک مسٹر پھاٹک نے انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 214 میں بیان کیا ہے۔ اور بہت سے کتبے' جن پر سمت گپت کی تاریخیں کندہ ہیں مگر بادشاہ کا نام ندارد ہے' دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں کم از کم دو برہما کے ہیں۔ (دیکھو آرکیالوجیکل سروے رپورٹ برما 1894ء صفحہ 15۔ 20)

ف۵ فلیٹ۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 342۔ چند نادر سکے جو کچ یا کاچ نے مضروب کرائے تھے بعض حالات میں سمدر گپت کے سکوں سے بہت مشابہ ہیں۔ بعض مورخین کاچ یا کچ اور سمدر گپت کو ایک ہی شخص تصور کرتے ہیں۔ مگر بہترین رائے یہ ہے کہ کاچ اس بادشاہ کا حریف بھائی تھا۔ اگرچہ وہ حکمران بھی تھا اور اس کا عرصہ حکومت بہت مختصر تھا اور کسی حالت میں چند ماہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں کہ اس نے چند سونے کے سکے مضروب کرائے تھے اور عملی طور پر سمدر گپت کو اپنے باپ کا اصلی اور حقیقی جانشین متصور کرنا چاہیے۔ الٰہ آباد کے کتبے میں اس کے انتخاب کا نہایت بین طور پر ذکر کیا گیا ہے: "یہ ہے (تمہارے سامنے) ایک شریف آدمی۔" ان الفاظ کو لکھ کر باپ نے اسے گلے سے لگایا۔ اور ایسی خوشی ظاہر کی جس سے محبت ٹپکتی تھی۔ اس نے اس کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور محبت اس پر غالب ہوگئی۔ درباری بھی خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ مگر ہمسر اعزا و اقربا مغموم اور ناشاد تھے۔ اس طرح اس نے اس سے کہا کہ "تمام دنیا کی حفاظت کا کام انجام دے۔" (بیوہلر مترجمہ فی انڈین انٹی کویری 1913ء صفحہ 176)

ف۶ ان واقعات کے اسناد اور تفصیلات پر مصنف کے مندرجہ ذیل مضمون میں پوری پوری بحث کی گئی ہے: "دی کان کونسٹس آف سمدرا گپتا۔" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1897ء صفحہ 1859۔ اس کی تحقیقات سے اس میں چند تصحیحات ضروری ہوگئی ہیں۔

ف۷ یہ کتبہ بعد از موت کا نہیں (بیوہلر۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1898ء صفحہ 386) یہ ستون آج کل الٰہ آباد کے قلعے میں موجود ہے' مگر یہ اس کی اصلی جگہ نہیں ہے۔

ف۸ بیوہلر کا اہم مضمون: "دی انڈین انسکرپشنز اینڈ دی انٹی کوئٹی آف انڈین آرٹی فیشل پوئٹری" جو 1889ء کے قریب ایک جرمن رسالے میں شائع ہوا تھا۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ پروفیسر گھاٹے نے انڈین انٹی کویری 1913ء میں کیا ہے۔

ف۹ شمالی کوشل کا علاقہ دریائے گھاگھرا کے شمال میں اودھ کی سرزمین ہے۔

ف۱۰ "کورالک" کے صحیح معنوں کے لیے دیکھو کیلہارن کا بیان۔ ایپی گرافیا انڈیکا جلد 4 صفحہ 3۔ کٹورمنڈ رگری سے جنوب مشرق میں بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس عبارت کے صحیح معنے کیلہارن بعد فلیٹ نے 1858ء میں متعین کیے تھے۔ پشٹپور کے لیے دیکھو' فلیٹ: انڈین

انٹی کوری جلد 30 (1901ء) صفحہ 26۔

ساله ایپی گریفیا انڈیکا جلد 8 صفحہ 161۔

۱۲ه فلیٹ: جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ 1898ء صفحہ 369۔

۱۳ه مدرا کی تسخیر کے لیے دیکھو۔ ایلیٹ "ہسٹری" جلد 3 صفحہ 91۔ مسجد کی مرمت مجاہد شاہ بہمنی نے 1376ء میں کی تھی۔ مسٹر سیول نے اس کے متعلق جو شبہات ظاہر کیے ہیں (اے فارگاٹن امپائر صفحہ 42) وہ قابل غور ہیں۔ بظاہر اسے مدرا کی فتح کا حال یاد نہ رہا تھا۔

۱۴ه ڈاکٹر فلیٹ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے کہ اس سلطنت کا نام ضلع جالندھر کے کرتارپور میں اب بھی باقی رہ گیا ہو۔ بریگیڈ سرجن سی۔ ایف۔ اولڈہم نے بھی کماؤں، گڑھوال اور روہیلکھنڈ کے کتوریا راجاؤں کا حوالہ دیا ہے۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ 1898ء صفحہ 198)۔

۱۵ه میگھورن اور سمدرگپت کی ہمعصریت پر، جس کو سب سے پہلے ایم۔ سلوین لیوی نے ایک چینی کتاب سے دریافت کیا تھا، مصنف نے خاندان گپت کے جدول سنین کے اس مضمون میں بحث کی ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ دیکھو مصنف کا۔ "انسکرپشنز آف مہانامن ایٹ بدھ گیا۔" (انڈین انٹی کوری 1902ء صفحہ 192) مگر میگھورن اس زمانے کے کہیں بعد حکمراں ہوا جس کا کہ ان مضامین کے لکھتے ہوئے میرا خیال تھا، یعنی 379-352ء (ترجمہ مہاومس 1912ء صفحہ 39)۔ ممکن ہے کہ اس کا اصلی زمانہ اس سے ذرا بعد کا ہوا۔

۱۶ه کیونکہ یہ کتبہ پراکرت میں ہے اس وجہ سے ذرا مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ خاندان گپت کے باقی تمام کتبے سنسکرت زبان میں ہیں (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1893ء صفحہ 98 مع لوح) کیونکہ یہ گھوڑا ایک مدت تک لکھنؤ کے عجائب خانے کے باہر کھلی ہوا میں رکھا رہا اس لیے کتبہ بالکل مٹ گیا ہے۔ مگر اب اس مورت کو اندر رکھ دیا گیا ہے۔ جب یہ کتاب پہلی مرتبہ طبع ہوئی ہے تو وہ کتبہ صاف پڑھا جاتا تھا۔

۱۷ه ایران اور بھتری کے کتبات۔

۱۸ه اس کتاب کی گذشتہ ایڈیشنوں میں میں نے فرض کر لیا تھا کہ دہلی کی لوہے کی لاٹھ کے کتبے کے مذکورہ چندر راجا کو چندرگپت دوم بکرماجیت ہی سمجھنا چاہیے، اور اس طرح اس کو پنجاب اور بنگال میں فتوحات کا مستحق قرار دینا چاہیے۔ جیسا کہ میں نے اپنے مضمون (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1897ء صفحہ 1) میں ثابت کیا ہے۔ لیکن مہامہوپادھیا پرشاد شاستری کا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ یہ راجا چندر در اصل راجپوتانہ کے مقام پشکرن کا راجا چندر ورمن تھا جو چوتھی صدی میں گذرا ہے۔ پشکرن ایک مشہور شہر تھا اور ٹاڈ کے زمانے میں بھی "مارواڑ کی سب سے زیادہ دولت مند اور طاقتور باج گذار ریاستوں میں شمار ہوتا تھا۔ (انڈین انٹی کوری

1913ء صفحہ 219-217۔ ٹاڈ کی "راجستھان" (طبع دوم 1873ء) جلد اول صفحہ 605)

۱۹ مغربی ستریوں کی تفصیلی تاریخ کے لیے دیکھو ریپسن، بھگون لال اندراجی اور بدلف کے مضامین جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1890ء صفحہ 639، 1899ء صفحہ 357۔

۲۰ ہرش چرت مترجمہ کاول و ٹامس صفحہ 194۔

۲۱ کوشامبی کے موقع کے مباحثے کے لیے دیکھو مصنف کے مضامین "کوشامبی اینڈ شراوستی" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1898ء صفحہ 503) اور "شراوستی" رسالہ ایضاً 1900ء صفحہ 1۔

۲۲ ویٹرس "آن یون چانگس ٹریولز ان انڈیا" جلد دوم صفحہ 87۔ دھرم پال کا کھالپور کا عطیہ، انڈین انٹی کویری جلد 4، صفحہ 252۔ تاریخ داؤدی، منقول فی ایلیٹ کی ہسٹری، جلد 4 صفحہ 455۔

۲۳ ٹریولز، باب 27 (ہر ایک ترجمے میں)

۲۴ سفرنامہ۔ مترجمہ گائلز۔

۲۵ سرایچ، برڈٹ (انسائی کلوپیڈیا بریٹانیکا، طبع یازدہم۔ مضمون ہاسپٹل) کا بیان ہے کہ عیسائیت کے زمانے میں قسطنطین کی حکومت سے پہلے (337-306ء) بیماروں کی رکھوالی کے لیے کوئی بندوبست نہ ہوا تھا۔ چوتھی صدی کے آخر میں باسل نے جذامیوں کے لیے ایک شفا خانہ قسطنطنیہ میں قائم کیا تھا۔ جسٹینین کے ایک قانون (562-527ء) کی رو سے شفاخانوں کو کلیسا کا جزو تصور کیا گیا تھا۔ پیرس کا شفا خانہ میسن ڈیو۔ یا ہوٹل دیو بعض دفعہ یورپ کا قدیم ترین شفا خانہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا سنہ قیام ساتویں صدی عیسوی ہے۔ (فلارنس نائٹ انگیل چیمبرس انسائی کلوپیڈیا 1904ء)۔

۲۶ "ٹریولز" باب 16 "مندروں" اور "مذہبی مقتداؤں" سے مراد غالباً بدھ مت کے مندر وغیرہ ہے۔ اس باب کے تراجم میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ یہاں لیگ اور گائلز کے ترجموں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۲۷ لہسن اور پیاز کو بہت سی ذاتیں پلید سمجھتی ہیں۔ پیاز کے متعلق خیال ہے کہ جب اس کو کاٹا جاتا ہے تو وہ گوشت کے مشابہ ہو جاتی ہے۔ لہسن شروع میں غالباً ایک بدعت سمجھ کر حرام کیا گیا تھا۔ کشمیر کا ایک قدیم بادشاہ گوپادت لہسن کھانے والے برہمنوں کو سزا دیا کرتا تھا (ترجمہ راجا ترنگنی باب 1 صفحہ 342 مترجمہ اسٹین)

۲۸ "فصیل کے باہر اچھوت رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چھونا موت سے بدتر ہے۔" (گوورد۔ فوک سانگس آف سدرن انڈیا) صفحہ 58۔

۲۹ اس سے یہ مطلب نہ لینا چاہیے کہ سکہ بالکل موجود ہی نہ تھا۔ چندر گپت بکرماجیت نے سونے کے سکے کثرت اور چاندی اور تانبے یا کانسی کے قلیل تعداد میں مضروب کرائے تھے۔ اس

کے "تیرانداز" وضع کے سونے کے سکوں کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عام تھے۔

نمبر ۳۰ "ٹریولز" باب 36۔ تملوک بنگال میں مدناپور کے ضلع میں آج کل سمندر سے ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

نمبر ۳۱ ٹریولز باب 20، 22، 24، 31۔

نمبر ۳۲ کمار گپت کے عہد سلطنت کا ایک تاریخی واقعہ ایسا ہے جس کا ذکر میں سن کے مطابق کر سکتا ہوں۔ 498ء میں چین میں ایک راجا یو۔ ای (محبوب قمر= چندر پیارا؟) کے پاس سے ایک سفارت آئی تھی جو کا۔ پی۔ لی کی سلطنت پر حکمراں تھا جس کا اب تک پتہ نہیں لگا۔ ویٹرس۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1898ء صفحہ 540)

نمبر ۳۳ دیکھو ڈاکٹر بھنڈارکر کا عالمانہ مضمون:۔ "اے پیپ انٹو دی ارلی ہسٹری آف انڈیا فرام دی فاؤنڈیشن آف موریا ڈائناسٹی ٹو دی ڈاؤن فال آف دی امپیریل گپتا ڈائناسٹی۔" (322ق-م سے تقریباً 500ء تک) جو جے۔ بمبئی۔ آر۔ اے۔ ایس سے دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ کشان خاندان کے متعلق ناقبول نظام سنین کے باوجود یہ مضمون ہند قدیم کی اب تک لکھی گئی بہترین تاریخ ہے۔

بارہواں باب

سلطنت گپت اور گورے ہن

455ء تا 606ء

شمالی ہند' کشمیر' افغانستان اور سوات کے ممالک میں 200ق م سے 200ء تک بدھ مذہب کے عام طور پر مروج ہونے کا ثبوت اس زمانے کے بے شمار بدھ مذہب کے آثار اور کتبات سے ملتا ہے جو تقریباً تمام کے تمام صرف جین یا بدھ مذہب ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جین مذہب نے (جو بدھ مت سے بہت کچھ مشابہت رکھتا ہے) کبھی عوام کے دلوں میں گھر نہیں کیا' اگرچہ متھرا اور دیگر مقامات میں اس کو نہایت عقیدت سے ماننے والے لوگ موجود تھے۔

مگر ہندو مت معدوم نہ ہوا تھا

مگر ہندوؤں کا قدیم اور رائج طریق عبادت جو برہمنوں کے ہاتھ اور ان قربانیوں کے ذریعے سے ہوتی تھی جس سے بدھ اور جین مذہب والے خاص طور پر متنفر تھے ملک سے کسی زمانے میں مفقود و معدوم نہ ہوا تھا اور ہر زمانے میں اس کو عوام الناس اور حکومت کی جانب سے مدد پہنچتی رہتی تھی۔ کشان فاتح کڈ فائسس دوم کو اس کے مفتوحوں نے اس قدر مغلوب کر لیا کہ اس نے اپنی رعایا کے عقائد کے مطابق شو کی پرستش کو اس جوش و خروش سے اختیار کیا کہ اس ہندی دیوتا کی تصویر اس نے اپنے سکوں پر منقوش کرائی اور خود اس کا پرستار ہونے پر فخر کیا۔ اس قسم کی اور بعض باتیں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جس زمانے میں بدھ مذہب بلاشک و شبہ ہندوستان کا عام مذہب تھا' تب بھی ہندوؤں کے دیوتاؤں کو لوگوں نے بالکل فراموش نہ کیا تھا بلکہ ان کی پرستش بدستور جاری تھی۔

بیرونی بادشاہوں کا مذہب

بعض صورتوں میں بدھ مت کا مہایان فرقہ برہمنی مذہب کے مقابلے میں بے ذات بیرونی بادشاہوں کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتا تھا۔ اور یہ بات کچھ زیادہ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ ان میں برہمنوں کے مذہب کے خلاف بدھ مذہب کو ترجیح دینے کا رحجان پایا جاتا ہو۔ لیکن واقعات سے یہ بات بین طور پر ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے بالخصوص بدھ مذہب کو دوسرے مذہبوں پر مرجح سمجھا ہو۔ بدھ مذہب کے چند ممیز سکے وہ ہیں جو کنشک نے مضروب کرائے تھے کیونکہ اس نے کم از کم اپنی آخری عمر میں اس مذہب کے پیشواؤں کی خاص غور و پرداخت کی اور یہی حال اس کے جانشین ہوشک کا تھا۔ لیکن اس سے اگلے بادشاہ بسو دیو اول نے پھر نئے سرے سے کڈ فائسس دوم کی طرح شِو کی پرستش اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح سراشٹر کے آخری زمانے کے سک سترپ بھی بجائے بدھ مت کے برہمنوں کے عقائد کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتے ہیں۔ اور کم از کم یہ تو یقینی ہے کہ انہوں نے بجائے مقامی زبانوں کے برہمنوں کی زبان سنسکرت کی زیادہ سرپرستی کی۔

مہایان اور ہندومت میں تعلق

بدھ مذہب کے فرقے مہایان کا ارتقاء' جو آخر میں کنشک کے وقت یعنی دوسری صدی کے شروع سے عام طور پر جاری اور ساری ہوگیا' اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ برہمنی مذہب دوبارہ زندہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ بدھ مت کا نیا فرقہ ایک بڑی حد تک ہندومت کے مشابہ تھا اور ان دونوں کا تعلق اس قدر گہرا تھا کہ ایک ماہر علم کو بھی بسا اوقات یہ فیصلہ کرنے میں دقت پیش آتی ہے کہ کسی خاص مورت کا تعلق کس فرقے سے ہو سکتا ہے۔

سنسکرت کا احیاء

برہمنی ہندومت دراصل پنڈتوں کا مذہب تھا جن کی مقدس زبان سنسکرت تھی۔ یہ زبان پنجاب کی قدیم مقامی زبان کی ایک نہایت مصنوعی اور بدلی ہوئی صورت تھی۔ اور جس طرح بتدریج پنڈتوں کا راعی اور رعایا پر مذہبی اور معاشرتی معاملات میں اثر زیادہ ہوتا گیا اسی طرح اس مخصوص زبان کے شیوع کی حدود بھی وسیع ہوتی گئیں' یہاں تک کہ بالآخر تمام سرکاری کاغذات میں اس نے مقامی زبانوں کی جگہ لے لی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں اشوک نے اپنے فرامین کو عوام الناس کی ایسی زبان میں شائع کیا تھا جس کو وہ بخوبی سمجھ سکتے تھے۔ لیکن دوسری صدی عیسوی

کے درمیان سترپ ردر دامن کو اس بات کا احساس تھا کہ صرف سنسکرت زبان ہی میں اس کے کارناموں کا اعلان واشتہار بہترین طریقے سے ہو سکتا ہے۔ مگران صفحات میں اس مضمون پر بحث کرنا بالکل ناممکن ہے اور صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ برہمنی مذہب کے ساتھ برہمنوں کی مقدس زبان سنسکرت کا شیوع اور توسیع بھی پہلو بہ پہلو جاری تھی۔[1]

خاندان گپت کے زمانے میں ہندوؤں کا ردعمل

بہرحال اس بات کے خواہ کچھ ہی اسباب کیوں نہ ہوں مگر یہ امر واقعی ہے کہ عوام کے دلوں میں برہمنی مذہب کی وقعت اور اس کے ساتھ ہی ساتھ زبان سنسکرت کا احیاء دونوں دوسری صدی عیسوی میں ظاہر و بین ہو چکے تھے۔ تیسری صدی میں گجرات اور سراشتر کے سترپوں نے اس کی مدد کی' اور چوتھی اور پانچویں صدیوں میں شاہان گپت نے اسے معراج پر پہنچا دیا۔ یہ بادشاہ اگرچہ بدھ اور جین مذہبوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرتے تھے اور کم از کم ان میں سے تین[2] ذاتی طور پر مقدم الذکر میں خاص دلچسپی لیتے تھے' لیکن اس میں شک نہیں کہ بادشاہ ہونے کی حیثیت سے وہ راسخ الاعتقاد ہندو تھے اور بالعموم ان کے مشیر کار برہمن تھے جو سنسکرت کے ماہر اور فاضل ہوتے تھے۔ دوسری صدی کے آخر اور اس ردعمل کے شروع زمانے ہی میں پشتی متر کے اشومیدھ کی رسم کے ادا کرنے میں بدھ مت کی مخالفت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ چوتھی صدی میں سمدرگپت نے اس قدیم رسم کو اور بھی زیادہ شان و شوکت کے ساتھ ادا کیا اور پانچویں صدی میں اس کے پوتے نے اس کا اعادہ کیا۔ بہرحال اور زیادہ تفصیل میں پڑے بغیر اس تمام معاملے کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ سکوں' کتبوں اور عمارتوں کی مجموعی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ خاندان گپت کے زمانے میں برہمنی ہندو مت کا احیاء ہو رہا تھا اور وہ بتدریج بدھ مذہب کی جگہ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عوام کی علمی زبانوں کے مقابلے میں (جن کی سرپرستی شاہان اندھرنے کی تھی) اب "قدیم" سنسکرت کا بول بالا تھا اور حکومت اس کی سرپرست ہو گئی تھی۔

بکرماجیت اور کالی داس

اغلب یہ ہے کہ اجین کے راجا بکرم کے متعلق' جس کی نسبت فرض کیا گیا ہے کہ اس نے بکرمی سمت جو 58 ق م سے شروع ہوتا ہے قائم کیا تھا' جو حکایات زبان زد خلائق ہیں ان میں چندر گپت دوم بکرماجیت کے کارناموں کا ایک مخلوط رنگ پایا جاتا ہے کیونکہ یہ یقینی ہے کہ اس نے چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں اجین کو فتح کیا تھا۔ روایت کے مطابق راجا بکرم کے دربار میں سنسکرت علم و ادب کے نورتن حاضر تھے اور ان نورتنوں میں سب سے زیادہ درخشاں کالی داس تھا

جس کے سنسکرت زبان کے خدائے سخن ہونے میں تمام نقادان فن متفق ہیں۔ میرے خیال میں یہ بات اب بالکل پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ کالی داس پانچویں صدی عیسوی میں گذرا ہے اور اغلب یہ ہے کہ اس کی تصانیف کا زمانہ طولانی تھا اور وہ غالباً تیس برس تک ان میں مصروف رہا۔ اگرچہ اس عظیم شاعر کے سنین زندگی کا تعین ناممکن ہے، مگر غالباً ایسا لگتا ہے کہ اس نے یا تو چندر گپت دوم کے عہد حکومت کے آخری حصے یا کمار گپت اول کے شروع زمانے میں تصنیف شروع کی تھی۔ اس طرح اجین کے راجا بکرم اور کالی داس کا روایتی تعلق نظائر عقلی سے بھی ثابت ہو جاتا ہے۔[1]

گپت عہد میں علمی سرگرمی

خاندان گپت کا زمانہ جو اپنی انتہائے وسعت میں 650ء–300ء تک اور خاص کر چوتھی اور پانچویں صدی کا زمانہ ہے، بہت سے علوم و فنون کے صیغوں میں خاص ہیجان اور علمی تلاطم کا زمانہ تھا۔ اس کا مقابلہ تاریخ انگلستان میں ایلزبتھ اور سٹورات کے زمانے سے کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح اس زمانے میں ہندوستان میں کالی داس کی شہرت کے سامنے تمام مصنفین کی شہرت ماند پڑ گئی تھی اسی طرح انگلستان میں شیکسپیئر کے مقابلے میں سب لکھنے والے ہیچ ہو گئے تھے۔ لیکن بعینہ جس طرح کہ اگر شیکسپیئر ایلزبتھ کے زمانے میں اپنے ڈرامے نہ لکھتا تو بھی اس کے لٹریچر میں کمی واقع نہ ہوتی، اسی طرح اگر کالی داس کی کتابیں باقی نہ رہتیں تو بھی اور لوگوں کی کتابیں اس قدر موجود تھیں کہ ان سے اس زمانے کو احیائے علم و فن سے ممیّز کر سکتے ہیں۔

علم و ادب

مشہور ناٹک "مٹی کی چھوٹی گاڑی" کو، جو ہندوستان کے سب سے زیادہ دلچسپ ناٹکوں میں سے ہے، پانچویں یا چھٹی عیسوی کا خیال کیا جاتا ہے۔ ایک اور مشہور و معروف ناٹک "مدرارا کشس" جس میں چندرا گپتا موریا کی غصب سلطنت کا حال مندرج ہے، غالباً مقدم الذکر جتنا ہی قدیم ہے۔ پروفیسر ہلبر نڈنٹ کے خیال میں وہ چندر گپت دوم کے وقت کی تصنیف ہے (تقریباً 400ء)۔

موجودہ اٹھارہ پُرانوں میں سب سے زیادہ قدیم وایو پُران صریحاً اپنی موجودہ شکل میں چوتھی صدی کے نصف اول میں آیا۔ اسی طرح منو کا دھرم شاستر بھی گپت زمانے کے شروع میں عالم وجود میں آیا۔ مگر بہرحال مزید تفصیل اور اس طرح سنسکرت علم و ادب کے مورخ کے فرائض میں دخل دیے بغیر یہاں پروفیسر آر۔ جی بھنڈار کر کا خیال ظاہر کر دینا کافی ہے کہ اس زمانے میں

"علم وادب میں ایک خاص ہیجان واقع ہوا" جس کا اثر نظم' دھرم شاستر اور دیگر شعبہ ہائے فنون پر پڑا۔

فن

ریاضی اور علم ہیئت کے فنون میں زمانہ گپت میں آریا بھٹ (پیدائش 476ء) اور وراہمیر (وفات 587ء) جیسے مشاہیر پیدا ہوئے۔ مسٹر کے جو اس معاملے میں مستند مانا جاتا ہے کہتا ہے کہ "وہ زمانہ جب کہ علم ریاضی نے ہندوستان میں ترقی کی 400ء سے 650ء تک کا ہے۔ اس کے بعد اس میں زوال آگیا۔

فنون لطیفہ فن تعمیر

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سمدر گپت خود علم موسیقی کا شائق اور اس کا حامی اور مددگار تھا۔ دوسرے فنون پر بھی شاہان گپت نے اپنی عنایتیں مبذول کیں اور ان کی سرپرستی میں وہ خوب پھلے پھولے۔ مگر زمانہ گپت کی تمام یادگاروں اور عمارتوں کے مٹ جانے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ان کی سلطنت کے تقریباً تمام حصے کو مسلمان فاتحین کی افواج نے روند ڈالا اور اس پر مستقل طور پر قابض ہو گئے' اور یہ لوگ ہندوؤں کی عمارتوں کو شاذ و نادر ہی کبھی باقی چھوڑتے تھے۔ مگر گذشتہ سنین کی تحقیقات نے ایسی شہادتیں بہم پہنچا دی ہیں جن سے معلوم ہوتا کہ بدھ اور برہمنی مذاہب کی بے شمار عمارات، پانچویں اور چھٹی صدی میں تعمیر ہوئی تھیں۔ چند بڑی بڑی عمارتوں کے نمونے آج کل بھی چھوٹی چھوٹی جگہوں میں ایسے مقامات پر پائے جاتے ہیں جہاں تک مسلم افواج کا قدم نہیں پہنچ سکا' اور اس زمانے کے چھوٹے چھوٹے مندر تو بہت ہی پائے جاتے ہیں۔ بہرنوع اتنا مواد موجود ہے کہ جس سے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ فن تعمیر معراج ترقی پر پہنچ چکا تھا اور کامیابی کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا تھا۔

سنگتراشی' مصوری اور نقاشی

فن سنگتراشی جو ہندوستان میں فن تعمیر کے پہلو بہ پہلو ترقی کرتا تھا اس قدر تکمیل کو پہنچ گیا تھا جس کا اندازہ چند سال قبل پورے طور پر نہیں کیا جاتا تھا۔ اور اس کے بہترین نمونے اس قابل ہیں کہ ان کو ہندی سنگتراشوں کی اعلیٰ ترین کوششوں کا نتیجہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ مصوری کے جو نمونے اجنتا کی استرکاری اور اس کے ہم جنس مقام لنکا کے سیگریا (497-479ء) میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن بھی اس قدر یا اس سے بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ جاری تھا۔ شاہان

گپت کے بعض سونے کے سکے ہی تمام ہندی سکوں میں اس قابل ہیں کہ انہیں فن لطیفہ کا نمونہ قرار دیا جا سکے۔

گپت عہد میں اس چہل پہل کے اسباب

مذکورہ بالا بیان سے یہ تو بالکل اظہر من الشمس ہے کہ خاندان گپت کے لائق اور طولانی حکومت کے بادشاہوں کا زمانہ ہندوستان میں غیر معمولی علمی چہل پہل کا زمانہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خود شاہی سرپرستی سے اس میں بہت کچھ ترقی ہوئی تھی۔ مگر ایسے نتائج پیدا کرنے کے لیے صرف یہی ایک سبب کافی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اور اسباب بھی ضرور ہونا چاہئیں۔ تجربے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مختلف اقسام کے تمدنوں کا تصادم و اتصال باہمی علوم و فنون لطیفہ کی ترقی و تحریک کا بڑا باعث ہوا کرتا ہے۔ میرے نزدیک گپت عہد میں اس تمام علمی رونق اور کارناموں کی بڑی وجہ ان ہی بیرونی تمدنوں کا اتصال تھا جو مشرق اور مغرب دونوں طرف سے ہندوستان میں واقع ہوا۔ چین کے ساتھ متواتر سلسلہ رسل و رسائل قائم رہنے کی پوری پوری شہادت موجود ہے اور اگرچہ رومتہ الکبریٰ کے ساتھ اس قسم کے تعلقات کی شہادت ایسی صریح نہیں، لیکن پھر بھی تعلقات کے قیام میں کلام نہیں ہو سکتا۔ چوتھی صدی کے آخر میں چندر گپت ثانی بکرماجیت کی فتح مالوا اور سراشٹر نے شمالی ہند اور مغربی ممالک کے درمیان وسائل آمد و رفت قائم کر دیئے تھے اور اس طرح یورپی خیالات کے ہندوستان میں آنے کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ آریہ بھٹ پر سکندریہ کے علوم ہیئت کا اثر بالکل نمایاں ہے اور اسی طرح شاہان گپت کے رومی سکوں کی نقل بھی بالکل ظاہر ہے۔ فنون لطیفہ اور علم و ادب میں بیرونی اثرات کا ثبوت ذرا مشکل کام ہے۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ اس اثر کی واقعیت ثابت ہو سکتی ہے۔ مثلاً دیوگڑھ میں "وشنو خفتہ" کے بت اور سٹاک ہالم میں انڈی میان کے یونانی رومی سنگتراشی کے نمونوں میں جو تعلق ہے اس سے انکار کرنا ذرا مشکل ہے۔ بہرحال اس مقام پر اس مضمون سے مفصل بحث کرنا بالکل ناممکن ہے۔ مگر ذیل کے نوٹ میں جو حوالے دیئے گئے ہیں وہ ایسے طالب علم کے لیے کافی ہیں جو اس قسم کے تمام دلائل کی طلب و جستجو میں ہو جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ گپت عہد کے علوم و فنون کی ترقی کا باعث ہندی اور رومی نمونوں کا اتصال و تعلق تھا۔ بعض نقادان فن کا خیال ہے کہ اجنتا کی نقاشی میں چینی خیالات کا اثر پایا جاتا ہے اور ممکن ہے کہ ان کا خیال درست ہو۔ [1]

مذہب

سب سے پہلے چینی سیاح فاہیان، جو پانچویں صدی کے اوائل میں ہندوستان آیا تھا، اس

کے بعد یاتری ہیون سانگ (جس نے ساتویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کا سفر کیا) کے بیانوں کا مقابلہ کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خاندان گپت کے زمانے میں بدھ مذہب کو بہت کچھ زوال ہو گیا تھا۔ لیکن اس زمانے کے رہنے والوں کو ابھی تک اس زوال و انحطاط کا اندازہ نہ ہوا تھا کیونکہ ان لوگوں کے سامنے زبردست خانقاہوں کا سلسلہ تھا اور ایسے بھکشوان کے پیش نظر تھے جن کا بے انتہا اثر تھا اور جو عالیشان خانقاہوں میں سکونت رکھتے تھے۔ زمانہ گپت کی جن عظیم الشان بودھ خانقاہوں کا انکشاف ہوا ہے اس نے تمام ماہرین آثار قدیمہ کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ شاہان گپت اگرچہ مذہباً برہمنی ہندو اور بالخصوص وشنو کے پجاری تھے لیکن قدیم ہندوستان کی روایات کے بموجب ہندی مذاہب کی ہر صورت کو عزت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چندر گپت اول نے جو سانکھیہ کے فلسفے کا پیرو تھا آخر زندگی میں بدھ مت کے عالم بسو بندھو کے دلائل و براہین پر کان دھرا اور اپنے بیٹے اور ولی عہد سمدر گپت کو اس کے سپرد کیا۔ اس کے بعد کے زمانے میں نر گپت بالادت کو جس نے مذہبی دارالسلطنت نالندا کے مقام پر خوبصورت عمارتیں تعمیر کرائیں، ہیون سانگ ایک جوشیلا بدھ مت کا ماننے والا تصور کرتا ہے۔[5]

جنگ پشتی متر

خاندان گپت کے انتہائے عروج کا زمانہ صرف سوا صدی (455-330ء) کا تھا جس میں تین بادشاہ حکمراں رہے۔ کمار گپت اول کی موت سے، جو بالکل صحت کے ساتھ اوائل 455ء میں متعین کی جا سکتی ہے، سلطنت کے زوال و انحطاط کی ابتداء ہو گئی۔ اس کی حکومت کے دوران ہی میں 450ء کے قریب اس کی سلطنت کو ایک دولت مند اور قوی قوم پشتی متر کے ساتھ جو اور کسی طرح تاریخ[6] میں مشہور نہیں، جنگ کی سخت مصیبت میں مبتلا ہونا پڑا۔ شاہی افواج کو شکست ہوئی اور اس فوجی صدمے اور مزاحمت کا اثر اتنا زیادہ ہوا کہ اس سے شاہی خاندان کی بقاء اور استحکام معرض خطر میں آ گیا۔ لیکن سکند گپت یوو راجا کی ہمت اور قابلیت نے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو روکا اور دشمن کو شکست دے کر اپنے خاندان کی حیثیت پھر اسی طرح قائم کر دی۔ ایک ہمعصر کے بیان میں جو ذرا سی تفصیل ملتی ہے اس سے اس جنگ کی سختی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی جب ولی عہد سلطنت اپنے خاندان کے مصائب کو معدوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو ایک مرتبہ تمام رات اس کو زمین پہ سو کر گزارنی پڑی تھی۔

ہنوں کی شکست

455ء کے موسم بہار میں جب سکند گپت تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس کو مصائب کے ایک

خاصے طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پشتی متر کی قوم کا خطرہ تو اب زائل ہو چکا تھا، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اور زیادہ زبردست مصیبت کا سامنا ہوا۔ یہ وحشی ہنوں کی یورش تھی۔ یہ قوم وسط ایشیاء کے جنگلوں سے اٹھی اور شمال مغربی دروں میں سے ہوتی طوفان بلاخیز کی طرح ہندوستان میں داخل ہوئی اور ملک کے آباد شہروں اور سرسبز و شاداب میدانوں کو تباہ کر ڈالا۔ مگر سکند گپت نے جو غالباً کار آزمودہ تھا مناسب ہمت و جرأت سے کام لیا اور ان وحشیوں کو ایسی سخت شکست دی کہ ایک مدت کے لیے ہندوستان بالکل مامون اور مصئون ہو گیا۔ اس کی ماں اب تک زندہ تھی اور فتح کی خبر دینے کی لیے "کرشنا کی طرح جو اپنے دشمنوں کو قتل کر کے اپنی ماں دیوکی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا" اپنی ماں کے پاس گیا۔ اس طرح اپنی ماں کی خدمت سے فارغ ہو کر اس نے اپنے باپ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے ایک منارۂ فتح تعمیر کرنے کا ارادہ کیا جس کے سرے پر وشنو دیوتا کا بت تھا اور جس پر وحشی حملہ آوروں کے پنجے سے دیوتاؤں کے فضل و کرم سے ملک کی رہائی کا حال کندہ تھا۔[7]

مغربی صوبے

یہ بات ظاہر کہ ہنوں پر یہ زبردست فتح اس حکومت کے شروع ہی میں حاصل ہوئی ہوگی۔ کیونکہ ایک اور کتبے سے (جو 458ء میں کندہ کیا گیا) معلوم ہوتا ہے کہ سکند گپت نے وحشیوں کو شکست دی تھی اور سراشٹر (کاٹھیاواڑ) کے انتہائی مغربی صوبے پر وہ بلا شرکت غیرے حکمراں تھا۔ مغربی صوبوں پر بادشاہ نے پران دت نامی ایک نائب السلطنت مقرر کیا تھا جس میں شاہی ملک الشعراء کے قول کے مطابق تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ اور اس نے جوناگڑھ کے صدر مقام کی حکومت اپنے بیٹے کے سپرد کی جس نے وہاں قیام کے زمانے میں کوہ گرنار کے دامن کی جھیل کے قدیم بند کو نئے سرے سے باندھا جو سکند گپت کی تخت نشینی کے سال پھر ٹوٹ گیا تھا۔ یہ رفاہ عام کا کام دوسرے سال جا کر ختم ہوا اور وہیں پر وشنو کا ایک مندر بھی تعمیر کیا گیا۔[8]

مشرقی صوبے

اس کے تین سال بعد ضلع گورکھ پور کے مشرق میں پٹنہ سے نوے میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں ایک جین معلی نے پتھر کا ستون بادشاہ کے نام پر یادگار بنایا۔ اس واقعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سکند گپت کے آغاز حکومت میں مشرقی اور مغربی دونوں صوبے اس کی سلطنت میں شامل تھے۔[9]

صوبہ جات متوسط

اس کے پانچ سال بعد 465ء میں دریائے گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقہ یعنی موجودہ ضلع بلند شہر میں سورج کے ایک مندر سے (جو سکند گپت کے زمانے میں ایک دیندار برہمن نے تعمیر کیا اور اسی کے نام سے نامزد کیا تھا) ظاہر ہوتا ہے کہ وسطی صوبوں میں بھی مستقل حکومت قائم کی تھی۔ [1] اسی وجہ سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل قرین قیاس ہے کہ شروع زمانہ حکومت ہی میں وحشی حملہ آوروں پر فتح حاصل کی گئی ہوگی اور یہ فتح ایسی فیصلہ کن تھی کہ ایک مدت تک اس کی وجہ سے سلطنت کے مختلف حصوں میں امن وامان پھیلا رہا۔

تقریباً 470۔465ء' ہنوں کا نیا حملہ

لیکن 465ء کے قریب ان خانہ بدوش اقوام کا ایک از سر نو طوفان سرحد کی طرف سے در آیا اور گندھارا یا شمالی مغربی پنجاب پر قابض ہو گیا جہاں ایک "بے رحم اور کینہ توز" سردار نے کشان کے تخت و تاج کو غصب کیا اور حد درجے کی وحشیانہ حرکتیں کیں۔ [1] اس کے تھوڑے زمانے کے بعد ہی 470ء میں ہن اندرون ملک کی طرف بڑھے اور دوبارہ سکند گپت کی سلطنت کے عین قلب میں آکر اس پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن اب وہ گذشتہ مرتبہ کی طرح ان کا مقابلہ نہ کر سکا اور بالآخر اس کو ان بیرونی اقوام کے متواتر حملوں کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دینا پڑا۔ اغلب یہ ہے کہ ان حملہ آوروں کو برابر وطن سے امداد پہنچتی رہتی تھی اور وہ سب کے سب ہندوستان کی لوٹ کے شائق تھے۔

سکے میں کھوٹ کا ملایا جانا

سکند گپت کے زمانے کی مالی مشکلات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے آخری زمانے میں دفعتاً" سکہ کھوٹا ہو گیا۔ اس کے شروع کے زمانے کے چاندی اور سونے کے سکے اس کے پیشرؤوں کے سکوں کے وزن سے بالکل مطابق ہیں' لیکن آخر میں ان کا وزن ہندو معیار سورن کے برابر کرنے کے لیے بڑھا دیا گیا ہے مگر ان میں بجائے 100 رتی خالص سونے کے صرف 73 رتی باقی رہ گیا۔ [1] سکہ کے اس طرح یک بیک کھوٹا ہو جانے سے' جس کے پہلو بہ پہلو وہ بناوٹ میں خراب اور بھدا ہو تا گیا تھا' صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہنوں کی جنگ کی وجہ سے جو بار پڑا وہ خزانہ نہ اٹھا سکا۔

تقریباً 480ء پر گپت کی تخت نشینی

سکند گپت نے بھی اور بہت سے ہندوستانی راجاؤں کی طرح بکرماجیت کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ اس کی وفات غالباً 480ء کے قریب قریب واقع ہوئی ہوگی۔ اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا تو خاتمہ ہوگیا مگر خاندان شاہی باقی رہ گیا اور مشرقی صوبوں میں کئی نسلوں تک برقرار رہا۔ سکند گپت نے کوئی ایسی اولاد نرینہ نہ چھوڑی تھی کہ وہ اس مصیبت کے زمانے میں سلطنت کی حفاظت کر سکتی۔ اسی وجہ سے مگدھ اور قرب وجوار کے صوبوں پر اس کا بھائی کمار گپت اول کا بیٹا پر گپت، جو ملکہ انند کے بطن سے تھا، اس کا جانشین ہوا۔

سکے کی اصلاح

اس راجا کا عہد حکومت بظاہر نہایت کم تھا اور اس کے زمانے کا اگر کوئی واقعہ یادگار ہے تو وہ اصلاح سکے کی دلیرانہ کوشش ہے۔ وہ نادر الوجود سکے جن کی پشت پر سادت کا لقب منقوش ہے اسی پر گپت کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ وزن میں ہندو "سورن" کے برابر ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک میں 121 گرین خالص سونا ہے۔ اس طرح قیمت میں وہ آگسٹس کے "اوری" کے برابر اور کشان اور پرانے گپت سکوں کی قدر سے زیادہ ہیں۔ [13]

تقریباً 485ء سے 535ء تک۔ نرسمھ گپت

تقریباً 485ء میں پر گپت کا جانشین نرسمھ گپت بالادت ہوا جس نے اپنے بدھ مذہب سے دلچسپی کا بین ثبوت مگدھ کے علاقے میں بمقام نالند (جو بدھ مذہب کی تعلیمات کا شمالی ہند میں مرکز تھا) ایک خشتی مندر کی تعمیر سے دیا جو ہیون سانگ کے قول کے مطابق 300 فیٹ بلند تھا اور اپنی خوشنمائی اور سونے جواہرات کے استعمال کی وجہ سے اپنی آپ ہی نظیر تھا۔ [14] بالادت نے جو باہمت اور کامیاب طریقہ ہنوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کا اختیار کیا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

تقریباً 535ء کمار گپت دوم

نرسمھ گپت بالادت کے بعد اس کا بیٹا کمار گپت دوم تخت پر بیٹھا اور اسی کے زمانے کی وہ کھوٹی چاندی کی خوبصورت مہر ہے جو ضلع غازی پور میں بھتری کے مقام پر پائی گئی ہے۔ [15] اس کی موت بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں ہوئی۔ مگر اس کی حکومت کے

واقعات کا حال مفقود ہے۔ بس یہی معلوم ہو سکا ہے کہ کمار گپت دوم کی موت سے شاہی خاندان گپت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے باپ اور دادا کی طرح اس کی حکومت اس کے اجداد کی قدیم وسیع سلطنت کے صرف مشرقی صوبوں پر مشتمل تھی۔

مگدھ کے "بعد کے گپت۔" موکھری

یہ شاہی خاندان کا سلسلہ بالآخر ایک خاندان میں منتقل ہو جاتا ہے جس میں گیارہ راجا گپت کے نام کے ہیں' اور جو بظاہر ایک بڑی حد تک مگدھ کے علاقے ہی میں مقامی راجاؤں کی حیثیت سے حکمراں تھے۔ ان ہی راجاؤں کو ماہرین آثار قدیمہ کی اصطلاح میں "مگدھ کے بعد کے گپت" کہتے ہیں۔ یہ راجا اس صوبے میں بھی بلا شرکت غیرے حکمراں نہ تھے بلکہ ایک خاندان' جس کے راجاؤں کے نام ورمن پر ختم ہوتے ہیں اور جو موکھری نامی ایک قوم سے تھے' ان کے شریک سلطنت و حکومت تھے۔ مگر ان دونوں خاندانوں میں علاقے کی تقسیم کے اسلوب کا پتہ لگانا بالکل ناممکن ہے۔ آپس میں ان کے تعلقات بعض مرتبہ دوستانہ رہتے تھے اور بعض اوقات ان میں دشمنی ہو جاتی تھی۔ مگر ان کے متعلق جتنی تفاصیل معلوم ہیں وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ [1]

چین کی بدھ مذہب کی سفارت

سلطنت مگدھ کے سیاسی انحطاط و زوال سے اس علاقے کے بودھی کی مذہبی تعلیمات کے مرکز اور مستقر ہونے کی حیثیت میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ آیا۔ یہ تعلیمات یہاں نالند اور دیگر مقامات پر پال راجاؤں کے زیر سرپرستی مسلمانوں کی فتوحات تک برابر جاری رہیں۔ مگر بارہویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کے حملے سے یہاں کی خانقاہیں اور ان کے بھرپور کتب خانے سب کے سب آگ کی نذر ہو گئے۔ بہترین مثال اس ادب و تعظیم کی جو آخری خاندان گپت کے زمانے میں بھی گوتم بدھ کے بیرونی پیرو اپنی مقدس زمین کی کرتے تھے' اس واقعے سے مل سکتی ہے کہ 539ء میں اودتی یا ہیویں' جو لینگ خاندان کا سب سے پہلا شہنشاہ چین اور بدھ مت کا پرجوش پیرو تھا' نے ایک سفارت مگدھ کی طرف سے اس غرض سے روانہ کی کہ مہایان فرقے کی کتابوں کو تلاش کر کے حاصل کیا جائے اور ایک ایسے عالم کی خدمات مستعار لی جائیں جو ان کتابوں کا ترجمہ کر سکے۔ مقامی راجا نے جو غالباً جیوت گپت اول یا کمار گپت تھا بخوشی اپنے شہنشاہ دوست کی خواہشات کو پورا کیا اور مشہور عالم پرمارتھ کو سفارت کے سپرد کر دیا۔ یہ سفارت معلوم ہوتا ہے کہ کئی سال تک ہندوستان میں مقیم رہی تھی۔ اس کے بعد پرمارتھ چین گیا اور اپنے ساتھ قلمی نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ لیتا گیا جن میں سے اکثر کا اس نے ترجمہ بھی کیا۔ وہ کانٹن کے قریب 546ء

میں پہنچا- 548ء میں اس کو شہنشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اور 569ء میں 70 برس کی عمر میں چین ہی کے ملک میں مر گیا- اسی شہنشاہ کے عہد حکومت (549–502ء) میں جنوبی ہند کے ایک راجا کا بیٹا بودھی دھرم جو ہندوستان کا اٹھائیسواں اور چین کا پہلا گرو خیال کیا جاتا ہے' چین میں 520ء میں پہنچا اور تھوڑی مدت کاٹن میں رہنے کے بعد آخر لوینگ کے مقام پر آباد ہو گیا- اس کے خوارق عادات کو چینی مصور بہت کھینچتے رہتے ہیں- کلے

آدت سین اور جیوت گپت دوم

"آخری خاندان گپت" کا سب سے زیادہ مشہور بادشاہ آدت سین تھا جو 647ء میں اپنے حاکم اعلیٰ ہرش کی موت کے بعد خود مختار ہو گیا اور اپنی حکومت کی شان کے ثابت کرنے کے لیے اشومیدھ کی رسم بھی ادا کرنے کی کوشش کی- اس خاندان کا سب سے آخری بادشاہ جس کا نام معلوم ہے وہ جیوت گپت دوم تھا جو آٹھویں صدی کے شروع میں بر سر حکومت تھا- اسی صدی کے آخر میں یا نویں صدی کے شروع میں مگدھ بنگال کے پال راجاؤں کے ماتحت ہو گیا- اس خاندان پر بعد کے کسی باب میں بات ہو گی-

484ء سے 510ء تک: بدھ گپت اور بھانو گپت

مالوا کے مغربی صوبے میں بدھ گپت اور بھانو گپت دو راجاؤں کے نام ملتے ہیں جو 484ء سے 510ء تک بر سر حکومت تھے اور بظاہر اس علاقے میں سکند گپت کے جانشین تھے- مگر بہر صورت ان میں سے موخر الذکر راجا خود مختار نہ تھا بلکہ ہن سرداروں کا باج گذار تھا-

خاندان ولبھی

پانچویں صدی کے آخر میں میترک قوم کے (جو غالباً ایک بیرونی قوم تھی) بھٹارک نامی ایک سردار نے جزیرہ نمائے سراشٹر کے مشرق میں ولبھی کے مقام پر قبضہ کیا اور ایک خاندان کی بناء ڈالی جو 770ء تک قائم رہا اور اس کے بعد خیال ہے کہ سندھ سے عرب حملہ آوروں نے اس کو برباد کیا- شروع میں ولبھی کے راجا خود مختار نہیں معلوم ہوتے اور اغلب یہ ہے کہ وہ ہنوں کے باج گذار تھے- مگر ہنوں کی سلطنت کی بربادی کے بعد ولبھی کے راجا خود مختار ہو گئے اور انہوں نے مغربی ہند اور خاص کر سراشٹر کے جزیرہ نما میں خاصی طاقت حاصل کر لی- ساتویں صدی عیسوی میں جب ہیون سانگ وہاں گیا تو ولبھی کا شہر بڑا متمول تھا' اور بدھ مذہب کی مذہبی تاریخ میں اس وجہ سے مشہور تھا کہ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں اس مذہب کے مشہور علماء ستمتی اور

ستھرمتی رہ چکے تھے۔ ہیون سانگ کے ایک اور نوجوان ہمعصر آئی سنگ کا بیان ہے کہ اس کے وقت میں جنوبی بہار کا مقام نالندا اور ولبھی دو ایسے شہر تھے جن کا مقابلہ چین کے تعلیمی مراکز سے بخوبی کیا جا سکتا تھا۔ یہاں پر دور دراز مقامات سے جوق در جوق طلبہ آتے تھے اور دو یا تین برس تک مذہب بدھ کے فلسفے کے درس میں شامل ہوتے تھے۔ اس بیان کے بعد ہیون سانگ کا وہ بیان بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے کہ مو۔لا۔پو یعنی مغربی مالوا اور مگدھ ہندوستان میں وہ دو علاقے تھے جہاں علم کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ کیونکہ ولبھی اور مو۔لا۔پو سیاسی طور پر ایک ہی تھے اور ان دونوں پر تمام شمالی ہند کے راجا ہرش کا داماد دھروبھت حکمراں تھا۔ ولبھی کی بربادی کے بعد مغربی ہند کے صدر کے مقام کی جگہ انہلواڑہ (نہروالہ۔یا پٹن) نے لے لی۔ پندرہویں صدی تک اس کی یہ عزت برقرار رہی اور اس کے بعد احمد آباد کو یہ حیثیت حاصل ہو گئی۔ [۱۸] شاید ناظرین کتاب کو مذکورہ بالا بیان سے اس امر کا کافی طور پر اندازہ ہو سکے گا کہ کس طرح خاندان گپت کی وسیع سلطنت متفرق خاندانوں میں منقسم ہو گئی تھی۔

ہن نقل مکانی کی دوڑ دین

مگر یہ ضروری ہے کہ قوم ہن کا ذکر، جنہوں نے اس سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے اور تھوڑی مدت تک اس کے بڑے حصے پر قابض بھی رہے، زیادہ وضاحت سے کیا جائے۔ وہ خانہ بدوش اقوام جو ہن کے نام سے مشہور ہیں جب دوسرے ملکوں میں اپنے افراد کے لیے تلاش معاش دنغذا میں ایشیائی جنگلوں سے مغرب کی طرف روانہ ہوئیں تو وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں۔ ایک حصہ تو دریائے سیحون کی طرف بڑھا اور دوسرا دریائے والگا کی سمت روانہ ہوا۔

ہن یورپ میں اٹلا

موخرالذکر 375ء میں یورپ کے براعظم میں داخل ہوئے اور قوم گاتھ کو دریائے ڈینیوب کے جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ اس طرح وہ اس جنگ گاتھ کی بالواسطہ ابتداء ہوئی جس میں آخرکار 378ء میں قیصر ویلنز نے جان دی۔ دریائے والگا اور ڈینیوب کے درمیانی ممالک میں قوم ہن بسرعت تمام پھیل گئی۔ مگر متواتر اور کہنہ خلاف وشقاق اور کسی بڑے زبردست پیشوا کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ لوگ اس فوقیت سے جو ان کو حاصل تھی اس وقت تک کچھ فائدہ نہ اٹھا سکے جب تک کہ اٹلا ان میں نمودار نہ ہوا۔ اس نے چند سال کے لیے اس وحشی اور جنگلی قوم کو مجتمع کر کے ایک ایسی طاقت بنا دیا کہ "وہ ریونا اور قسطنطنیہ کے دونوں درباروں کو یکساں طور پر ڈرا اور دھمکا سکتا تھا۔" [۱۹]

تقریباً 470ء

453ء میں اس کی موت نے اس بند کو بالآخر توڑ دیا جس نے اس وحشی جرگے کے پشتارے کو مجتمع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس واقعے کے بیس سال کے عرصے کے اندر ہی اندر یورپ کی ہن سلطنت کا شمالی ایشیاء کی ایک نئی وحشی قوم کے سیلاب نے خاتمہ کر دیا۔

455-84ء، وادی سیحون کے گورے ہن

مگر ایشیاء میں ہنوں کی سلطنت زیادہ عرصے تک قائم رہی۔ اس جرگے کا وہ حصہ جو دریائے سیحون کی وادی میں مقیم ہو گیا اور غالباً دوسرے حصے سے نسلاً بھی مختلف تھا، افتالوی یا گورے ہنوں کے نام سے مشہور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس نے ایرانی مدافعت و مقاومت کو اس وقت بالکل شکست دے دی جب 484ء میں شاہ فیروزان کے مقابلے میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ ان ہی گورے ہنوں کے جرگوں نے کابل کی کشان سلطنت پر بھی حملہ کیا اور اسی راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ 455ء میں سکند گپت نے جس حملے کا سدباب کیا تھا وہ غالباً مقابلتاً کسی کمزور فوج نے شروع زمانے میں کیا ہو گا جو اپنے قدم اندرون ملک میں نہ جما سکی۔ [20]

500ء، ترمان

اس کے دس سال بعد ہی یہ خانہ بدوش لوگ ایک بڑی تعداد میں حملہ آور ہوئے اور گندھارا یا پشاور کی سلطنت کو پسپا کیا۔ اس علاقے کو مرکز قرار دے کر (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) وہ دریائے گنگا کے میدان کی طرف بڑھے اور سلطنت گپت کا خاتمہ کر دیا۔ 484ء میں ایرانی مقاومت کی ہزیمت سے ان جرگوں کو مشرق کی طرف نقل و حرکت کرنے میں بہت کچھ سہولت ہوئی ہو گی اور اسی وجہ سے ان کو کثرت سے ہندوستان میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ اس ہندی حملے میں جو غالباً چند سال تک متواتر جاری رہا ان کا سردار ایک شخص ترمان نامی تھا۔ اس کے متعلق یہ یقین ہے کہ وہ 500ء سے قبل ہی وسط ہند میں مالوہ کا بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ اس نے "راجا مہاراجگان" کا ہندی لقب بھی اختیار کیا۔ اور یہ بھی یقینی ہے کہ بھان گپت اور ولبھی کا راجا اور دیگر بہت سے مقامی بادشاہ اس کے باج گذار ہو گئے ہوں گے۔ [21]

تقریباً 510ء، مہر کل کی تخت نشینی

تقریباً 510ء میں جب ترمان مر گیا تو جس ہندی علاقے پر وہ قابض ہو گیا تھا اس کو وہ اس قدر

مستحکم کر چکا تھا کہ وہ اس کے بیٹے مہر کل کے ہاتھ میں چلا جائے۔ ہندوستان میں مہر کل کا دارالسلطنت ساکل' پنجاب کا موجودہ شہر سیالکوٹ تھا۔ [۲۲]

ایشیاء میں ہنوں کی سلطنت کی حدود

اس زمانے میں ہندوستان ہنوں کی سلطنت کا محض ایک صوبہ تھا۔ اس جرگے کا صدر مقام ہرات کے قریب باذغیس کے علاقے میں بامیان کے مقام پر تھا اور دوسرا صدر مقام بلخ کا قدیم شہر تھا۔ [۲۳] وہ ہن بادشاہ جس کے پاس بامیان یا ہرات کے مقام پر 519ء میں چینی سفیر سانگ ین آیا تھا' وہ ایک زبردست بادشاہ تھا اور چالیس ممالک سے خراج وصول کیا کرتا تھا جو مغرب میں ایران کی سرحد سے لے کر مشرق میں ختن یعنی سرحد چین تک پھیلے ہوئے تھے۔ 520ء میں گندھار کے جس مقامی ہن بادشاہ کے دربار میں سانگ ین حاضر ہوا تھا وہ ضروری ہے کہ مہر کل ہی ہو۔ اس وقت وہ کشمیر (کی۔پن) کے بادشاہ کے ساتھ تیس برس سے برسرپیکار تھا۔ [۲۴]

گلاس

تقریباً اسی تاریخ کے متعلق عیسائی راہب کاسمس انڈکو پلیسٹیزنا (جس نے 574ء میں ایک عجیب و غریب کتاب تصنیف کی تھی) نے ایک گورے ہن بادشاہ کا ذکر کیا ہے جس کو وہ گلاس کا نام دیتا ہے۔ اس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ تھا اور وہاں سے نہایت ظلم و ستم کے ساتھ خراج وصول کیا کرتا تھا' اور وہ وصولیابی کے لیے دو ہزار جنگی ہاتھی اور بہت سی فوج بھیجا کرتا تھا۔ یہ بادشاہ یقیناً مہر کل ہی تھا۔ [۲۵]

مہر کل کے مظالم

تمام ہندی روایات مہر کل کو سفاک ظالم بتلانے میں متفق ہیں۔ وہ دراصل "ہندوستان کا اٹلا" تھا اور اس کے مزاج میں ہنوں کی سفاکی اور بے رحمی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی۔ [۲۶] ہندوستان کے مصنفین نے کیونکہ ان وحشی حملہ آوروں کا جنہوں نے ربع صدی تک ان کے ملک کو بے رحمی سے تاخت و تاراج کیا کوئی مفصل حال نہیں چھوڑا' اس لیے لامحالہ ہم کو یورپ کے مصنفین کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے تاکہ اس بربادی اور خوف کا اندازہ ہو سکے جو مدنی اقوام کو ان وحشیوں کے آنے سے سہنا پڑتا تھا۔

ہنوں کی کیفیت

ان کے متعلق اصلی بیانات کا ملخص گبن نے خوب کیا ہے۔

"ہنوں کی کثرت تعداد' قوت' سرعت نقل و حرکت اور سفاکانہ بے رحمی کو متحیر و پریشان گاتھ محسوس کرتے تھے' اس سے ڈرتے اور مبالغہ آمیز باتوں کے ساتھ ان کو بیان کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے کھیت اور گاؤں ان کی نظروں کے سامنے جلا کر خاکستر کر دیے جاتے تھے اور ان کو مقتولوں اور کشتوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ ان حقیقی ہیبتوں کے پہلو بہ پہلو وہ نفرت بھی تھی جو ان لوگوں کے دلوں میں ہنوں کی تیز آواز' نامہذب حرکات و سکنات اور ان کی عجیب و غریب بد صورتی سے پیدا ہوتی تھیں۔۔۔ دیگر انسانی اقوام کی نسبت وہ لوگ وسیع شانوں' چپٹی ناکوں اور سر کے اندر گھسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے ممیز تھے۔ لیکن ان کے لیے ڈاڑھی گویا نہ تھی بلکہ نہ ہوتی تھی۔ اس لیے جوانی میں نہ تو ان کی شکل بارعب ہوتی اور نہ بڑھاپے میں وہ معزز اور قابل احترام معلوم ہوتے تھے۔" [1]

قوم گاتھ کی طرح ہندوستانیوں کو بھی جنگوں کی وجہ سے ہر قسم کے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ مزید بر آں یہاں کے لوگوں کو جو بدرجہ غائت نفاست پسند اور ذات پات کے قواعد کے پابند تھے' ان وحشیوں کی قابل نفرت عادات و خصائل اس وجہ سے اور بھی زیادہ کریہہ معلوم ہوتی تھیں کہ ان کے نزدیک کوئی چیز پاک یا متبرک نہ تھی۔

تقریباً 528ء' مہر کل کی شکست

آخر کار مہر کل کا ظلم و ستم اس قدر ناقابل برداشت ہو گیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی راجاؤں نے مگدھ کے راجا بالادت (یعنی نرسمہ گپت) اور وسط ہند کے ایک راجا یسودھرمن کی سرکردگی میں اس بیرونی غاصب کے مقابلے کے لیے ایک اتحاد قائم کیا۔ تقریباً 528ء میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور مہر کل کو شکست دے کر انھوں نے اپنے ملک کو اس کے ظلم و ستم سے پاک کر دیا۔ مہر کل جنگ میں گرفتار ہوا اور یقینی ہے کہ اگر بالادت کی اعلیٰ ہمت اور دریا دلی بروئے کار نہ آجاتی تو وہ قتل کر دیا جاتا۔ مگر بالادت نے اسے چھوڑ دیا اور بہت اعزاز کے ساتھ شمال کی طرف اس کے وطن روانہ کر دیا۔

مہرکل کشمیر میں

اس اثناء میں مہرکل کے چھوٹے بھائی نے خاندان کے سرغنہ کی مصائب و مشکلات سے فائدہ اٹھاکر ساکل کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا تھا اور اسے واگذاشت کرنے سے انکار کیا۔ کچھ تھوڑی مدت روپوش رہنے کے بعد مہرکل نے کشمیر میں پناہ لی۔ یہاں کا بادشاہ اس سے بہت خاطر و مدارات سے پیش آیا اور ایک مختصر سے علاقے کا اسے حاکم بنا دیا۔ چند سال تک تو اس جلاوطن بادشاہ نے اپنی حالت پر قناعت کی لیکن اس کے بعد موقع پا کر اس نے بغاوت کی اور اپنے محسن کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس کام میں پوری کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس نے گندھار کی ہمسایہ سلطنت پر حملہ کیا۔ یہاں کے بادشاہ (جو غالباً خود بھی ہن قوم سے تھا) پر اچانک دغابازی سے حملہ کیا گیا اور اسے قتل کر ڈالا گیا۔ اس کے بعد شاہی خاندان کا صفایا کیا اور ہزارہا آدمی دریائے سندھ کے کناروں پر ذبح کیے گئے۔ اس وحشی حملہ آور نے جو بالخصوص تباہی و بربادی کے دیوتا شیو کا پرستار تھا بدھ کے مرنج و مرنجان مذہب کے ساتھ خاص خصومت اور دشمنی کا اظہار کیا اور نہایت بے دردی کے ساتھ ستوپوں اور خانقاہوں کو برباد کر کے ان کے خزانوں کو لوٹ لیا۔

مہرکل کی موت

مگر وہ غصب کردہ خزانوں سے حظ اٹھانے کے لیے زیادہ زندہ نہ رہا اور سال ختم ہونے سے پہلے مر گیا۔ "اس کی موت کے وقت اولے اور بجلی کے طوفان آئے۔ دنیا تیرہ و تاریک ہو گئی۔ زمین میں زلزلہ پیدا ہوا اور سخت طوفان برپا ہو گیا اور مقدس ولیوں نے رحم کھا کر کہا کہ "بے شمار جانوں کے مارنے اور بدھ کی شریعت کو مغلوب کرنے کی وجہ سے وہ دوزخ کے اسفل ترین درجے میں ڈال دیا گیا ہے' جہاں وہ بے شمار زمانے تک ان ہی انقلابات میں پڑا رہے گا۔" اس طرح اس غاصب کو اپنی بدکاریوں کا ثمرہ اگر اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں ضرور مل گیا۔ اس کی تاریخ موت صحیح طور پر معلوم نہیں' مگر یہ یقینی ہے کہ یہ واقعہ 540ء کے لگ بھگ ہیون سانگ کی سیاحت سے ٹھیک ایک صدی قبل واقع ہوا ہو گا۔ اس کی موت کے متعلق بدشگونی اور نحوست کی حکایات و روایات کی تیز رفتاری سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی سفاکی اور بے رحمی نے لوگوں کے دلوں پر کیا اثر کیا تھا۔ اس کا اور زیادہ بین ثبوت کشمیر کی اس روایت سے ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کو غاروں میں لڑھکانے سے اسے ایک خاص لطف آتا تھا۔[۲۸]

یسودھرمن

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ وسط ہند کے ایک راجا یسودھرمن نامی نے ایک مفروضہ اتحاد میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو ملک کو مہرکل کے ظلم و ستم سے رہائی دینے کے لیے تھا۔ اس کا پتہ صرف تین کتبوں میں ملتا ہے۔ ہیون سانگ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا اور ہنوں پر فتح پانے کا خاص ذریعہ مگدھ کے راجا بالادت کو قرار دیا ہے۔ [29] مگر یسودھرمن خود ہی اس تمام عزت و احترام پر متصرف ہو بیٹھا اور فتح و نصرت کی یادگار میں دو مینار نصب کرائے جن پر نہایت مبالغہ آمیز الفاظ میں اپنی بیرونی حملہ آوروں پر فتح پانے کا ذکر کیا۔ ان ہی کتبوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے ان علاقوں پر اپنی حکومت قائم کی جن کو ہن اور شاہان گپت اپنے زیر تصرف نہ لاسکے تھے۔ ان ہی کے مطابق وہ برہم پتر سے لے کر مغربی سمندر تک اور کوہستان ہمالیہ سے لے کر کوہستان مہندر تک تمام شمالی ہند کا مالک تھا۔ موخرالذکر سے مراد غالباً کوہستان (گھاٹ) ٹراونکور کی انتہائے جنوب کی چوٹی (مہندر گری) ہے۔ لیکن اس تمام فخر و مباہات کے غیر معین اور عربی الفاظ اور ہیون سانگ کی خاموشی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یسودھرمن نے اپنے کارناموں کے اظہار میں بہت کچھ افراط و تفریط سے کام لیا تھا اور اس کے ملک الشعراء نے اس کی تعریف میں وہ باتیں بھی بیان کردیں جن کا وہ مستحق نہ تھا۔ اس کے آباء و اجداد اور جانشینوں کے متعلق قطعی کچھ معلوم نہیں۔ اس کا نام بالکل علیحدہ اور بلا کسی تعلق دنیاوی کے باقی رہ گیا ہے۔ اس وجہ سے یہ خیال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکومت کا زمانہ بہت قلیل تھا اور اس کی اہمیت اس سے کہیں کم تھی جس کا دعویٰ اس نے اپنے فصیح و بلیغ کتبوں میں کیا ہے۔ [30]

تقریباً 565ء ایشیاء میں ہن سلطنت کا خاتمہ

دریائے سیحون کی وادی میں ہنوں کی سلطنت ہندوستان میں مہرکل کی وفات کے بعد بہت دنوں تک باقی نہیں رہی۔ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں ترکی قبائل کے نمودار ہو جانے سے تمام صورت حالات تبدیل ہوگئی۔ ان ترکی قبائل نے جون نام کے ایک حریف جرگے کو شکست دے کر ایران کے بادشاہ خسرو نوشیروان کے ساتھ جو اس شاہ فیروز کا پوتا تھا جس نے 484ء میں گورے ہنوں کے مقابلے میں لڑتے ہوئے جان دی تھی) اتحاد قائم کیا اور ان دونوں اتحادیوں نے مل کر 563ء اور 567ء کے بین بین گورے ہنوں کا قلع قمع کردیا۔ تھوڑی مدت کے لیے ایرانی بلخ کے شہر اور ہنوں کے علاقے کے بعض حصص پر قابض رہے۔ مگر ساسانیوں کے بتدریج کمزور ہو جانے کی وجہ سے ترکوں کو اس بات کا موقع مل گیا کہ جنوب کی طرف کپس تک اپنی

حکومت کو وسیع کر لیں اور ان ممالک پر متصرف ہو جائیں جو ہنوں کی سلطنت میں شامل تھے۔[41]

ہنوں کے لفظ کا اطلاق اور مطلب

بعد کے سنسکرت علم و ادب میں ہون (ہن) کے لفظ کا اطلاق شمال و مغرب سے آئے ہوئے کسی غیر ملکی شخص پر ایک مبہم اور غیر معین طریقے سے ہوتا ہے۔ یعنی اسی طرح جس طرح قدیم زمانے میں یون یا آج کل ہندوستان میں ولائتی کا لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ نام نہاد "شاہی" راجپوت قبیلوں میں چھتیس میں سے ایک کا نام دراصل ہُون ہی تھا۔[42] اطلاق کے اس ابہام سے ہون کی ان اقوام کے متعلق شبہ پیدا ہوتا ہے جن کے ساتھ چھٹی صدی عیسوی کے آخر اور ساتویں صدی کے شروع میں تھانیسر کا راجا ہرش اور اس کا باپ متواتر برسرپیکار رہتے تھے۔ مگر یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ مہرکل کی وفات کے پچاس سال کے عرصے کے اندر ہی اندر لفظ ہون کا اصل مفہوم بالکل فراموش ہو گیا ہو اور اسی بناء پر راجا ہرش کے حریفوں کو اصلی ہون کی دور افتادہ نو آبادیاں ہی تصور کرنا چاہیے جو سرحدی پہاڑیوں میں آکر آباد ہو گئی تھیں۔

قوم گرجر

کتابوں اور کتبوں میں ہنوں کا ذکر اکثر ایک اور قوم گرجر کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے، جس کا نام آج کل بھی گوجر کی صورت میں باقی رہ گیا ہے جو شمال مغربی ہندوستان میں بہت پھیلی ہوئی ہے۔ قدیم گرجر معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی آبادکار تھے اور ان کا بہت قریبی تعلق اور ممکن ہے کہ خون کا رشتہ بھی ہنوں کے ساتھ تھا۔ انہوں نے راجپوتانے میں ایک بڑی سلطنت قائم کر لی جس کا صدر مقام کوہ آبو کے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلے پر بھلمال یا سریمال تھا۔ رفتہ رفتہ بھلمال کے گرجر پرتہار راجاؤں نے قنوج کو فتح کر لیا اور (جیسا کہ چودھویں باب میں ذکر آئے گا) تمام ہند کے مہاراجادھیراجا بن گئے۔ بھڑوچ کی چھوٹی گرجر سلطنت اسی بھلمال کے خاندان کی ایک شاخ تھی۔

راجپوت قبائل کی ابتداء

اس مقام پر میں ایک ایسے امر کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جو ایک عرصہ دراز سے مشکوک تھا مگر اب شہادتوں کی موجودگی سے بالکل صحیح معلوم ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ راجپوتانے اور دریائے گنگا کے میدانوں میں جو غیر ملکی اقوام نقل مکان کر کے داخل ہوئیں، ان کا یہاں کے باشندوں کے ساتھ لڑتے لڑتے بالکل خاتمہ نہیں ہو گیا تھا۔ یقیناً ایک تعداد کثیر

مرکھپ گئی تھی۔ مگر ایک تعداد باقی بھی رہ گئی تھی۔ یہ باقی ماندہ لوگ یہاں کے باشندوں کے ساتھ مل گئے اور آج کل ان کی اولاد آبادی کا ایک بڑا جزو ہے۔ اپنے پیش روسک اور یوچی کی طرح یہ غیر ملکی اقوام بھی ہندومت کی عجیب و غریب طاقت کا شکار ہوئیں اور بڑی تیزی سے انہوں نے ہندوؤں کی تہذیب اختیار کرلی۔ وہ قبائل یا خاندان جنہوں نے چھوٹے چھوٹے علاقوں کو قبضے میں کرلیا تھا بخوشی ہندوؤں کی ذات کشتری (چھتری) یا راجپوتوں میں شامل کرلیے گئے۔ اور اس میں کسی قسم کا شک نہیں کہ شمالی ہند کے پرہار اور دوسرے راجپوت قبائل دراصل ان وحشی اقوام ہی کی تبدیل شدہ صورت ہیں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں۔ ان ہی لوگوں میں ادنیٰ درجے کے افراد گرجر اور دیگر اقوام بن گئیں جو عزت وسبقت کے لحاظ سے راجپوتوں سے کم درجے کی شمار ہوتی ہیں۔ جنوب کی طرف بھی بعینہ اسی طرح ہندوستان کے اصلی باشندوں کے قبائل و اقوام نے بھی ہندو تہذیب قبول کرلی اور بتدریج یہ گونڈ 'بھر' کھروار وغیرہ اقوام چندیل ' راٹھور 'گھروار اور دیگر مشہور و معروف راجپوت اقوام بن گئیں جن کے لیے فوراً ایسے شجرہ نسب گھڑ لیے گئے جو چاند یا سورج تک پہنچتے ہوں۔ میں اس تمام ارتقاء کے طریقے پر معہ امثلہ زمانہ وسطیٰ میں شمالی ہند کی تاریخ لکھتے ہوئے زیادہ تفصیل سے بحث کروں گا۔

بیرونی حملے سے ہندوستان کی خلاصی

دریائے جیحون کی وادی میں افتالوی سلطنت کے استیصال سے ہندوستان میں وحشیوں کے آنے کا یا تو بالکل سدباب ہوگیا یا کم از کم اس میں بہت کمی ضرور واقع ہوگئی۔ اور جہاں تک پتا چلتا ہے مہرکل کی شکست کے بعد تقریباً پانچ صدی تک ہندوستان بیرونی حملوں سے بالکل آزاد رہا۔ [۳۲] ذیل کے ابواب میں یہ بتلایا جائے گا کہ بیرونی حملوں سے اس طرح بے خوف ہو جانے کے طویل زمانے کو ہندوستانیوں نے کس طرح استعمال کیا یا کس طرح وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے قاصر رہے۔

چھٹی صدی کے نصف آخر کی تاریخ تقریباً بالکل مفقود ہے

چھٹی صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کا تاریخی حال بہت ہی کم معلوم ہوتا ہے۔ یہ یقینی ہے کہ اس زمانے میں کوئی حکومت اعلیٰ موجود نہ تھی اور گنگا کے میدان کی تمام سلطنتیں ہن اور اقوام متعلقہ کی تاخت و تاراج سے سخت درجہ تباہ و برباد ہوگئی تھیں۔ مگر بعض مقامی خاندانوں کے راجاؤں کے [illegible]

مو-لا-پو

اس پر آشوب زمانے میں ہندوستان جن مختلف ریاستوں میں منقسم تھا ان میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کیونکہ جو مختصر سا اشارہ ہیون سانگ نے اس کے متعلق کیا ہے اس سے بہت بحث اور تھوڑی غلط فہمی واقع ہوتی ہے۔ سیاح 641ء یا 642ء کے اوائل میں بھڑوچ سے روانہ ہوا اور شمال مغربی سمت میں بڑی دور تک چلا گیا۔ مگر اس مسافت کا عرصہ غالباً چینی متن کتاب میں مبالغہ سے بیان ہوا ہے۔ وہ ایک ملک میں داخل ہوا جو مو-لا-پو کہلاتا تھا۔ یہ نام علم الاصوات کے اصول کے مطابق مالوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا گمنام صدر مقام جنوب مشرق میں ایک زبردست دریا یا ایک اور قرات کے مطابق مہی کے کنارے پر واقع تھا۔ مگر اب تک اس کا موقعہ معلوم نہیں ہو سکا۔ اگر اس "زبردست دریا" سے مراد دریائے سابرمتی لی جائے تو یہ شہر احمد آباد کے موقعے یا اس کے قریب واقع ہو گا۔ اگرچہ سیاح کے سفرنامے کے تمام بیانوں کی تطبیق بالکل ناممکن ہے اور اس کے علاوہ بعض تفاصیل اب بھی متنازع فیہ ہیں' لیکن بہرحال یہ بالکل صحیح ہے۔ مو-لا-پو کے ملک یا سلطنت میں دریائے مہی کا علاقہ سابرمتی کی مشرقی سرزمین اور جنوبی راجپوتانہ کا غالباً رتلام تک کا علاقہ شامل تھا۔ مو-لا-پو کی سلطنت شمال میں گرجر کی سلطنت بھلمال' شمال مغرب میں آنند پور (ورنگر) کی باج گذار ریاست جو سابرمتی کے مغرب میں واقع تھی اور مشرق میں اس ریاست (اونتی۔ یا مشرقی مالوا) سے محدود تھی جس کا صدر مقام اجین تھا۔ آنند پور کے علاوہ دو اور ملک کی تا (یا کی-چا) اور سو-لا-چا (یا سو-لا-تھا) بھی مو-لا-پو کے ماتحت تھے۔ موخرالذکر ملک یقیناً سورتھ (سراشتر) یا جنوبی کاٹھیاواڑ تھا۔ مگر مقدم الذکر کی اصلیت اب تک متنازع فیہ ہے اور مستند علماء کا خیال ہے کہ اس سے مراد کیر (کھید۔ کھیتک) ہے۔ مگر دوسرے کہتے ہیں کہ اس سے مطلب کچھ کا علاقہ ہے۔

دھرو بھٹ

مشرقی کاٹھیاواڑ میں ولبھی (ولا) کا علاقہ جو مو-لا-پو اور سراشتر کے درمیان واقع تھا' خود اپنے بادشاہ کے زیر حکومت خود مختار تھا۔ اس بادشاہ کا نام دھرو بھٹ (جس کو کتبوں میں دھرو سین بالادت لکھا ہے) تھا اور وہ شمالی ہند کے مہاراجا دھیراجا ہرش (سیلادت) کا داماد تھا۔ ہیون سانگ کے وہاں آنے سے چند سال قبل ہرش نے دھرو بھٹ کو شکست دی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ازدواجی تعلق صلح کے وقت دونوں میں قرار پایا تھا۔ 643ء میں جب ہرش قنوج اور پریاگ (الہ آباد) میں وہ عظیم الشان مجالس منعقد کر رہا تھا جن میں ہیون سانگ بھی شریک تھا تو ولبھی کا یہ

راجا دیگر باج گذار راجاؤں کے زمرے میں اپنے خسر کے دربار میں حاضر تھا۔ سیاح مو۔لا۔پو اور اس کی تین باج گذار ریاستوں یعنی آنند پور' سراشٹر اور (؟) کچھ کے نظم و نسق سلطنت کے متعلق بالکل خاموش ہے اور اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان ریاستوں پر براہ راست ہرش کی طرف سے حکومت ہوتی تھی اور اس کا باپ چھٹی صدی کے آخر میں مالوا (غالباً مو۔لا۔پو) کے بادشاہ سے جنگ بھی کر چکا تھا۔ یہ امر کہ مو۔لا۔پو اور اس کی باج گذار ریاست سراشٹر کے درمیانی علاقہ ولبھی کے حکمرانوں کو بادشاہ کیوں کہا گیا ہے اس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ہرش (سیلادت) نے اپنے داماد کو قصداً نہ صرف ولبھی بلکہ مو۔لا۔پو اور ریاست ہائے متعلقہ پر نیم خود مختار رہنے دیا ہو گا۔

مو۔لا۔پو کا راجا سیلادت

مقامی حالات و بیانات کے مطالعے سے ہیون سانگ کی توجہ دھروبھت کے چچا سیلادت کی طرف مبذول ہوئی۔ وہ اس سے ساٹھ سال قبل مو۔لا۔پو کا راجا تھا۔ یہ بادشاہ غیر معمولی عقل و دانش اور علم و فضل کے لحاظ سے مشہور اور بدھ مذہب کا نہایت جوشیلا پیرو تھا۔ جانداروں کی جانوں کی حفاظت میں وہ اس قدر مبالغہ کرتا تھا کہ احتیاط کے طور پر ہاتھیوں اور گھوڑوں کے پینے کے پانی کو بھی چھنوا لیتا تھا کہ مبادا پانی میں رہنے والے کیڑوں کو گزند نہ پہنچے۔ اپنے محل کے ساتھ ہی اس نے ایک بدھ مذہب کا مندر بھی تعمیر کرایا تھا جو صناعی اور زیب و زینت کی وجہ سے قابل دید تھا اور وہاں ساتوں بدھوں کی مورتیں موجود تھیں۔ اس کا دستور تھا کہ ہر سال وہ ایک زبردست مجلس منعقد کیا کرتا اور اس میں بھکشوؤں کو نہایت فیاضی سے انعام و اکرام تقسیم کرتا۔ ہیون سانگ کے وہاں آنے تک یہ مذہبی رسم چند نسلوں سے برابر جاری تھی۔

مو۔لا۔پو کا راجا سیلادت' دھرماوت

ایم۔ سلوین لیوی کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیندار راجا در اصل ولبھی کے خاندان کا بدھ مذہب کا بادشاہ سیلادت اول تھا (جس کا لقب دھرماوت یعنی شمس الدین تھا) جس نے 595ء سے 610ء یا 615ء تک حکومت کی ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ سنین ہیون سانگ کے بیان سے ربط نہیں کھاتے لیکن یہ یقینی ہے کہ ولبھی کا راجا دھروبھت سیلادت' دھرماوت کا بھتیجا تھا۔ اس کے علاوہ ہیون سانگ کا بھی بیان یہ ہے کہ وہ مو۔لا۔پو کے ایک سابق بادشاہ دیندار سیلادت کا بھتیجا تھا۔ ان تمام وجوہ کو پیش رکھتے ہوئے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سیلادت دھرماوت اپنی ولبھی کی موروثی سلطنت کے علاوہ مو۔لا۔پو کی سلطنت پر بھی فاتحانہ حیثیت سے حکمراں تھا۔[۲۴] ان

دونوں علاقوں کو آخر میں ہرش نے فتح کرلیا اور یہ بھی اس کے ماتحت ہو گئے۔

مو-لا-پو اُجین سے مختلف ہے

مذکورہ بالا حکایت کی غلط فہمی کی وجہ سے مسٹر بیل اور چند دوسرے مصنفین نے غلطی سے یہ خیال کرلیا تھا کہ مو-لا-پو یعنی مغربی مالوا در حقیقت سلطنت اجین یعنی اونتی یا مشرقی مالوا ہی ہے۔ اسی بناء پر مسٹر بیل نے مو-لا-پو کے راجا سیلادت کو "سیلادت راجا اجین" لکھ دیا تھا اور یہ بالکل فراموش کر دیا کہ ہیون سانگ نے اجین کے علاقہ کا ذکر بالکل علیحدہ کیا ہے۔ یہ علاقہ اس کے زمانے میں مو-لا-پو کے علاقے کے برابر تھا اور ایک برہمن راجا اس پر حکمراں تھا۔ ولبھی اور مو-لا-پو کا سابق راجا سیلادت کشتریہ سمجھا جاتا تھا اور کوئی وجہ یہ فرض کرنے کی معلوم نہیں ہوتی کہ اس کا کوئی تعلق اجین سے تھا۔

قنوج کے راجا ہرش (سیلادت) کو اس کا دوست ہیون سانگ ویش ذات کا بتلاتا ہے' اگرچہ اس کا درجہ کشتریہ ہی کا تھا۔ غلطی سے مو-لا-پو اور اجین کی سلطنت کو آپس میں خلط ملط کر دینے سے ہرش کے زمانے کی تاریخ کے باب میں بہت کچھ ابتری اور خرابی واقع ہوتی ہے اور اس کتاب کی طبع اول میں جو خیالات ظاہر کیے گئے تھے ان کی وجہ اس غلطی کا ازالہ ہی تھا۔ مگر وہ خیالات بذات خود چند وجوہ سے غلط تھے اور اب ان کو تازہ انکشافات کی بناء پر درست کر دیا گیا ہے۔ ۳۵

خاندان گپت کی جدول سنین

سن عیسوی	واقعہ	کیفیت
تقریباً 308	چندر گپت کی لکھوی شہزادی سے شادی۔	
320	چندر گپت اول خود مختارانہ تخت نشین ہوا۔	سمت گپت کا قائم ہونا اس کا پہلا سال 26 فروری 320ء سے شروع ہوتا ہے۔
تقریباً 330	سمدر گپت تخت نشین ہوا۔	
" 330-6	شمالی ہند کی فوجی مہمات۔	
" 347-50	جنوبی ہند کی فوجی مہم۔	
" 351	اشومیدھ۔	
" 360	لنکا کے راجا میگھورن کی طرف سے سفارت۔	
" 375	چندر گپت ثانی کی تخت نشینی۔	
" 395	مغربی ہند کی فتح۔	
" 401	اُدیاگری کا کتبہ۔	82 س۔گ
405-411	سلطنت گپت میں فاہیان کی سیاحت۔	" " 86-92
407	گڑھوال کا کتبہ۔	" " 88
409	مغربی وضع کے چاندی کے سکے۔	" " 90

سن عیسوی	واقعہ	کیفیت
412	سانچی کا کتبہ۔	93 س۔گ
413	کمار گپت کی تخت نشینی۔	94 " "
415	بلسر کا کتبہ۔	96 " "
417	گڑھوال کا کتبہ۔	98 " "
432	متھرا اور شمالی بنگال میں نٹور کے کتبے۔	113 " "
436	مندسور۔	117 " "
"	بھردی کا کتبہ۔	
440	نقرئی سکے۔	121 " "
443	" "	124 " "
447	" "	128 " "
448	نقرئی سکے اور منکوار کا کتبہ۔	129 " "
449	نقرئی سکے۔	130 " "
تقریباً 450	جنگ پشی متر۔	131 " "
454	نقرئی سکے۔	135 " "
455	نقرئی سکے۔	136 " "
455	سکندر گپت کی تخت نشینی، پہلی جنگ ہُن۔	136 " "
456	گرنار کی جھیل کا بند دوبارہ تعمیر ہوا۔	137 " "
457	مندر اس مقام پر تعمیر کیا گیا۔	138 " "
460	کھاؤن کا کتبہ (گورکھپور)	141 " "
463	نقرئی سکے۔	144 " "
464	نقرئی سکے۔	145 " "

سن عیسوی	واقعہ	کیفیت
465	اندور کا کتبہ (ضلع بلند شہر)	146 س۔ گ
467	نقرئی سکے۔	" " 148
تقریباً 80-470	دوسری جنگ ہن۔	" " 161-151
473	مندسور کا کتبہ۔	530 سن مالوی جاری تھا
477	پالی زبان کا کتبہ (ایپی گریفیا انڈیکا جلد دوم صفحہ 363)۔	158 س۔ گ
تقریباً 480	پرگپت کی تخت نشینی (؟ پر کا سادت)۔	
" 485	نرسمھ گپت بالادت کی تخت نشینی۔	
" 510-490	ترمان۔	
" 770-490	خاندان ولبھی۔	
" 540-510	مہرکل۔	
520	سنگ۔ ین گندھار کے گورے ہن بادشاہ کے دربار میں آیا۔	اس کی شکست تقریباً 528ء۔
تقریباً 528	بالادت اور یسودھرمن نے مہرکل کو شکست دی۔	
" 530	کمار گپت دوم تخت نشین ہوا۔	
" 720-535	مگدھ کا "آخری خاندان گپت"۔	
" 615-595	مو۔ لا۔ پو اور ولبھی کا راجا سیلادت۔	

ضمیمہ ص

بسو بندھو اور خاندان گپت

فہرست اسناد

مشہور بدھ عالم بسو بندھو کی تاریخ اور ان شاہان گپت کا نام جن سے اس کے قریبی تعلقات قائم تھے، ایسے مسائل ہیں جن کی بحث میں ضخیم رسالہ جمع ہو گیا ہے اور جن کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے۔

ایم۔ نیول پیری کے دلائل

میرے نزدیک ایم۔ پیری کے دلائل اس امر کے ثبوت میں کہ بسو بندھو چوتھی صدی عیسوی میں گذرا ہے اور اسی صدی کے نصف آخر کے شروع میں مرا ہے، ایسے کڑے ہیں کہ ان کی تردید کرنا مشکل ہے۔[1] چنانچہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کی زندگی (تقریباً 280ء سے 360ء) کا بڑا حصہ چندر گپت اول اور سمدر گپت کے عرصہ حکومت میں گذرا تھا کیونکہ یہ دونوں بادشاہ 320ء سے 370ء یا اس سے ذرا بعد ہوئے ہیں۔ ایم پیری کی طویل تقریر (جو بے شمار چینی کتابوں پر مبنی ہے) کی تلخیص حسب ذیل صورت میں پیش کی جا سکتی ہے۔

تقریباً تمام کی تمام چینی شہادتیں اس امر میں متفق ہیں کہ بسو بندھو اور اس کا بڑا بھائی اسنگ بدھ کی موت کے 900 برس بعد گذرے ہیں۔[2] "نو سو برس بعد" وغیرہ تمام فقروں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "اس کے بعد نویں صدی میں" نہ کہ "دسویں صدی میں" جیساتککسو نے فرض کر لیا ہے۔ چینی ادبی روایات بھی ہری ورمن اور بسو بندھو کو 900ء سنین کے بعد کا بتلاتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ دونوں مصنف ہمعصر خیال کیے جاتے ہوں گے۔

ہری ورمن کی کتاب کا ترجمہ کمار جیو (383ء تا 412ء، چین میں) نے کیا تھا اور اس وجہ سے

وہ 400ء سے پہلے ہی کا ہو گا۔ اس بناء پر بسو بندھو کی صدی میں گذرا ہو گا۔ اس کمار جیو نے 404ء و 405ء میں دو کتابوں (ست شاستر اور بودھی چتویاون شاستر) کا ترجمہ کیا تھا جو بسو بندھو کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں' اگرچہ بعض مصنفین اس کے نام کا اختصار کر کے صرف بسو ہی لکھتے ہیں۔ مگر اس میں کسی قسم کا کلام نہیں کہ ان کا مطلب بسو بندھو ہی سے ہوتا ہے۔ اور تککسو کی طرح اس بات میں بھی شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ دونوں کتابیں اسی کی لکھی ہوئی ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس سے قبل ایک بسو بندھو اور بھی گذرا تھا۔ مگر یہ فرض کرنے کی کوئی موقر وجہ موجود نہیں۔ کمار جیو جس نے بسو بندھو کی ایک سوانح عمری بھی لکھی ہے جو اب معدوم ہو گئی ہے' نے 380ء سے قبل ست شاستر پڑھی تھی۔ [۸]

بسو بندھو کے بڑے بھائی اسنگ کی کتاب یوگا چاریا بھوی شاستر کے ایک حصے کا ترجمہ 414ء اور 421ء کے درمیان کیا تھا۔ یہ ایک بڑی کتاب ہے اور مصنف نے پختہ عمر کے بعد ہی اسے لکھا ہو گا۔ [۹]

ہر ایک شخص مانتا ہے کہ بودھی روچی نے بسو بندھو کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا۔ (وجر چھید کا پراجن۔ پارمتا سوتر۔ مترجمہ 508ء یا 509ء) اس مترجم کو 1100ء کا تصور کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ بسو بندھو سے تقریباً دو صدی بعد کا تھا۔

بسو بندھو کے جانشینوں کے متعلق ایم۔ پیری کا خیال ہے کہ گوتمی چھٹی صدی کے شروع میں سترمتی اسی صدی کے آخر میں گذرا ہے۔ دگناگ ہی ایک ایسا مشہور بدھ مذہب کا مصنف ہے جس کو پانچویں کا کہا جا سکتا ہے۔ [۱۰] چینی مصنفین "900ء" اور "1100ء" میں بہت سے مشہور مصنفین کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے درمیان میں کسی کا نام نہیں لیتے۔ اس خلط علمی کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ شاہان گپت کے زمانے میں ہندومت کا دوبارہ احیاء شروع ہو گیا تھا۔

مذکورہ بالا بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے لامحالہ یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ بسو بندھو (جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسی برس کا ہو کر مرا تھا) چوتھی صدی عیسوی ہی میں گذرا تھا اور اسی صدی کے نصف آخر کے شروع میں مرا تھا۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں' میں ان دلائل کو ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں دیکھتا۔

چندر گپت اول کی تاریخ

اب ہمیں اس شہادت کو جانچنا چاہیے جس سے بسو بندھو اور شاہان گپت کا تعلق ظاہر کیا جاتا ہے۔ ان شاہان گپت میں جس نے سب سے پہلے شاہی کا رتبہ حاصل کیا چندر گپت اول تھا۔ اس نے 320ء سے 330ء تک یا ممکن ہے کہ اس سے ذرا بعد تک حکومت کی ہے۔

تارناتھ کا بیان

بسو بندھو اور شاہان گپت کے تعلق کے بارے میں زیادہ مکمل بیانات دینے سے پہلے میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ تارناتھ کے بیان کے مطابق وہ زیادہ مگدھ میں رہا' اپنے بھائی اسنگ کے مرنے کے تقریباً پچیس برس بعد تک زندہ رہا اور تبت کے بادشاہ لہا۔ تھوری گنجنگنسن کا ہمعصر خیال کیا جاتا تھا۔ یہ بادشاہ وسیلیف کے خیال کے مطابق مشہور و معروف بادشاہ سرنگ۔ بستن۔ سکمبو سے پانچ نسلیں پہلے گزرا تھا۔ (شیفنر صفحہ 123'126'318) سرت چندر داس کا بیان ہے کہ لہا تھوری "561ء میں پوری ایک صدی اسکے کامیابی سے حکومت کرنے کے بعد ایک سو بیس برس کی عمر میں مرا تھا۔" (ج۔ اے۔ ایس۔ بی۔ حصہ اول 1881ء صفحہ 217) یہ شہادت ایم۔ بیری کے ثبوت کے خلاف ہے مگر مجھے کچھ زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتی۔ سرنگ۔ تسن۔ گمبو (اس کا نام اکثر ایسا ہی لکھا جاتا ہے) "سب سے پہلا تبت کا بادشاہ تھا جس کے حالات معلوم ہیں۔ وہ 630ء میں تخت پر بیٹھا تھا۔ (دیکھو ڈی ملوئی: بودپول او تبت صفحہ 139 اور 164)

وسیلیف

وسیلیف نے بسو بندھو اور بکرماجیت کے تعلقات کی تمام کہانی تقریباً ویسی ہی بیان کی جیسی کہ پرمارتھ نے کی ہے۔ لیکن بکرماجیت کے بیٹے اور جانشین کا نام پرادت نہ کہ بالادت لکھا ہے۔

شاہان گپت کے ساتھ تعلقات کی تین شہادتیں

اب میں ان تین کتابوں کو جانچنا شروع کرتا ہوں جن میں بسو بندھو کے شاہان گپت کے ساتھ تعلقات کی شہادت ملتی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں: (1) وامن (تقریباً 800ء)۔ (2) پرمارتھ جس نے اپنی کتابیں 546ء اور 569ء کے درمیان لکھیں۔ (3) ہیون سانگ (یون چانگ) جس نے اس تمام معاملے کی یادداشت غالباً 631ء میں بسو بندھو کی جائے پیدائش یعنی پشاور کے مقام پر لی تھی اور جس نے یقیناً اپنی کتاب 648ء سے پہلے ختم کی تھی (وٹرس جلد اول صفحہ 12)۔

شعر جس کو وامن نے نقل کیا ہے

مشہور منطقی وامن نے جس مصرعہ شعر کو نقل کیا اور جسے سب سے پہلے پروفیسر پھاٹک نے دنیا کے سامنے پیش کیا وہ بظاہر کسی بڑی قدیم کتاب سے نقل کیا گیا ہے جو غالباً بالا گپت کے خاندان کے بادشاہ کی [illegible] اور شاید اسی خاندان کے شجرہ نسب کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس عبارت پر

انڈین انٹی کویری کے رسائل میں مکمل و مفصل بحث ہے۔ مختلف متنازع فیہ مسائل میں پڑے بغیر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں بسو بندھو کی قرات کو قبول کرتا ہوں اور اس بات میں بھی متفق ہوں کہ چندر پرکاش (پربھاؤ) ایک نام یا لقب ہے اور وہ محض تعریفی لفظ نہیں ہے جس کے معنے "چاند کی طرح چمکدار" ہوں۔ اس کی تشریح میں "ساچیویا" کے لفظ سے یہ مراد معلوم ہوتی ہے کہ بسو بندھو اس نوجوان راجا کا وزیر ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مطلب محض یہ ہو کہ وہ بادشاہ کا ایک مصاحب و ندیم تھا۔

پروفیسر پھاٹک کے متن شعر کا صحیح شدہ ترجمہ حسب ذیل ہے: "چندر گپت کا یہی نوجوان بیٹا چندر پرکاش جو علماء کا مربی اور اپنے تمام کاموں میں کامیاب ہے بادشاہ ہوا۔" شارح لکھتا ہے کہ "علماء کا مربی" "اشارے" کی ایک مثال ہے اور یہاں اس سے مراد بسو بندھو کی وزارت ہے۔

میرے نزدیک یہ فرض کرلینا بالکل قرین قیاس ہے کہ شارح کی مراد یہاں بدھ مذہب کے مشہور عالم بسو بندھو سے ہی ہے اور "اشارے" کو اس طرح سمجھانے کے لیے اس کے پاس موقر وجوہ ضرور موجود ہوں گے۔ لیکن اس شعر میں جس کا وامن نے حوالہ دیا ہے بسو بندھو کے متعلق کچھ نہیں کیا گیا، بلکہ یہ صرف ایک عام اور معلوم شدہ واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ چندر گپت کا نوجوان بیٹا چندر پرکاش علماء کا مربی اور سرپرست تھا اور تشریح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان بادشاہ اور بسو بندھو کی دوستی اس قدر مشہور ہو گئی تھی کہ اسے "اشارے" کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔

اگر شارح کی تشریح کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا یہ بیان ایم۔ پیری کے نظام سنین کے بالکل مطابق ہوتا ہے اور اس حساب سے مذکورہ چندر گپت یقیناً چندر گپت اول ہی ہو گا جو 330-320ء یا اس کے ذرا بعد تک حکمراں تھا۔ اس کا بیٹا سمدر گپت ایک لائق اور فرزانہ بادشاہ تھا، علم موسیقی اور شعر گوئی میں کمال دسترس رکھتا تھا اور یقیناً علماء کا مربی اور سرپرست تھا۔ ہرشین، جس نے ایک فصیح و بلیغ سنسکرت نظم میں بادشاہ کی تعریف و مدح کی تھی، اسی جماعت کا ایک فرد تھا۔[۲] اور یہ باور کرنے میں ذرا بھی دقت نہ ہونی چاہیے کہ سمدر گپت کا نام شہزادگی کے زمانے میں چندر پرکاش تھا۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ خاندان گپت کے بادشاہ ایسے بہت سے نام استعمال کرتے تھے۔ رہا سمدر گپت کا ایک بدھ مذہب کے عالم کو اپنے دربار میں ملازم رکھنے کا حال تو وہ اس کے خاندان کے اور بادشاہوں کی طرح سمدر گپت سے بھی ہو سکتا تھا۔ بلا کسی استثنا کے شاہان گپت اپنے کتبوں اور سکوں سے برہمنی ہندو مت کے پیرو معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس بات نے ان کو کبھی ذاتی طور پر بدھ مذہب میں دلچسپی لینے سے نہ روکا ہو گا۔ ساتویں صدی عیسوی میں ہرش کا اس قسم کا حال تمام تاریخ دانوں کو معلوم ہے۔ اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ وامن کا

مذکورہ شعر مع شارح کی تشریح و تصریح کے ایم۔ پیری کے بسو بندھو متین کے خیالات کے موافق اور ایک بڑی حد تک اس کا موید ہے۔

پرمارتھ کی سوانح بسو بندھو

اب ہم کو پرمارتھ کی شہادت پر غور کرنا چاہیے' جس نے 546ء اور 569ء کے درمیان بسو بندھو کی سوانح عمری لکھی تھی۔ یہ کتاب چینی زبان میں محفوظ رہ گئی ہے اور اس کا ملخص ڈاکٹر تککسو نے جے۔ آر۔ اے۔ ایس (1905ء) میں پیش کیا ہے۔

پرمارتھ کہتا ہے کہ اجودھیا کے راجا بکرماجیت' جو پہلے سانکھیہ کے فلسفے کا دلدادہ تھا' کو بسو بندھو نے بدھ مذہب میں حصہ لینے پر آمادہ کیا۔ اسی نے اس پر بھی آمادہ کیا کہ وہ اپنی ملکہ اور یوورا جا کو اس کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجے۔ جب اس کا بیٹا بالادت بادشاہ ہوا تو اس نے بسو بندھو کو اجودھیا بلایا اور اس کی سرپرستی کی۔ اسی شہر میں بسو بندھو 80 برس کی عمر پاکر فوت ہوا۔ ایک برہمن نحوی بسورات' جس کا مناظرہ بسو بندھو سے ہوا تھا' بالادت کی بہن کا شوہر تھا۔ [۳۴]

اس کتاب کے طبع دوم میں میں نے یہ فرض کیا تھا کہ پرمارتھ کے "بکرماجیت" سے مراد سکند گپت ہے اور اس کے بیٹے بالادت کو محض بالادت تصور کرنا چاہیے جس کے سکے موجود ہیں اور جو پرگپت کا بیٹا تھا۔ غالباً پرگپت سکند گپت کا بھائی تھا اور اس لیے پرمارتھ کے لفظ "بیٹا" سے مراد "بھائی کا بیٹا" لینا چاہیے۔ یہ عام طور سے معلوم ہی ہے کہ ہندوؤں کے ہاں اپنے اور اپنے بھائی کے بیٹوں میں کسی قسم کی تفریق و تمیز نہیں ہوتی۔

لیکن جیسا کہ ایم پیری نے تقریباً ثابت کیا ہے' اگر یہ صحیح ہے کہ بسو بندھو چوتھی صدی عیسوی میں گذرا اور اسی صدی میں مرا ہے تو دامن کے "چندر گپت" کی طرح پرمارتھ کے "بکرماجیت" سے بھی مراد چندر گپت اول ہی ہوگی (330-320ء)' اگرچہ اس بات کی کوئی صریح شہادت موجود نہیں کہ چندر گپت نے کبھی بکرماجیت کا لقب اختیار کیا تھا۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہے کہ اس نے یہ لقب کیوں نہ استعمال کیا ہوگا۔ کیونکہ چندر گپت دوم اور سکند گپت دونوں اسی سے ملقب تھے۔ مسٹر ٹامس نے چھتری کے طلائی سکے جن پر بکرماجیت کا لقب منقوش ہے' چندر گپت اول کی طرف منسوب کیے ہیں اور اس نسبت کو ثابت بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سکے چندر گپت دوم کے تھے۔ بہرحال کسی شاہ گپت کے نام کے ساتھ بکرماجیت کا لقب ہونے سے تعجب نہ ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ چندر گپت اول اجودھیا پر قابض تھا یا وہ وہاں اور

پاٹلی پتر دونوں مقامات پر رہا کرتا تھا۔ اس کے نادر الوجود سکے موجودہ صوبے اور گردو پیش کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ [۴] اگر پرمارتھ کے اجودھیا کے راجا بکرماجیت سے مراد چندر گپت اول ہی لی جائے تو بالادت ورمن کے چندر پرکاش (پربھاؤ) کی طرح سمدر گپت کا ایک اور لقب ہوگا' اور اگرچہ کسی کتبے یا سکے میں اب تک یہ لقب نہیں پایا گیا لیکن اس کا ہونا بالکل ممکن ہے۔ آخری بادشاہوں میں سے ایک نے 'جو غالباً سکند گپت کا بھائی پر گپت تھا' پرکاش دت کا لقب واقعی استعمال کیا تھا۔

اس کے بعد ہمیں بسوبندھو کے ان حالات کی طرف توجہ کرنی چاہیے جس کا ذکر ہیون سانگ نے کیا ہے اور جن کو اس نے بسوبندھو کی جائے پیدائش پشاور (پرشپور) کے حال میں نقل کیا ہے۔ پرشپور کے مقام پر سیاح غالباً 630ء میں پہنچا تھا اور چین میں اس کی کتاب 648ء میں شائع ہوئی تھی۔

جس روایت کا ذکر اس نے کیا ہے وہ دراصل اسی روایت کی ایک اور صورت ہے جو پرمارتھ کی "سوانح عمری بسوبندھو" میں مذکور ہے۔ ہیون سانگ کے قول کے مطابق بسوبندھو "بدھ کی موت کے 1000 سال کے اندر گذرا تھا" نہ کہ "900" برس کے اندر۔ وہ بکرماجیت کو شراوستی کا راجا کہتا ہے نہ کہ اجودھیا کا اور اس نے تمام ہندوستان پر تصرف حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ اس نے اپنی سلطنت کو کھو دیا اور اس کا ایک گمنام جانشین ہوا جو علماء کا سرپرست تھا۔ (ویٹرس جلد اول صفحہ 4۔211) [۵]

ایک اور جگہ (ویٹرس جلد اول صفحہ 288) ہیون سانگ نے مگدھ کے ایک راجا بالادت کا ذکر کیا ہے جو بدھ مذہب کا پرجوش پیرو تھا اور جس نے مہر کل کو شکست دی تھی۔ یہ راجا سکوں کا نر بالادت معلوم ہوتا ہے جو پانچویں صدی کے آخر اور چھٹی کے ربع اول میں گذرا ہے۔ ہیون سانگ نالند کے مقام پر ایک خانقاہ کا بھی ذکر کرتا ہے جس کو اسی بالادت کے بیٹے اور جانشین نے وجر کے مقام پر بنایا تھا۔ نالند کے مقام پر بالادت "چیتیا" کا ذکر آئی سنگ نے بھی کیا ہے (ویٹرس جلد دوم صفحہ 171)۔ وجر نام کا کوئی بادشاہ تاریخ میں مذکور نہیں۔

سیاح کا یہ قول کہ یہ گپت راجا شراوستی میں حکمراں تھا' پرمارتھ کے اس بیان کے بالکل مطابق ہے کہ وہ اجودھیا میں حکومت کرتا تھا۔ کیونکہ اغلب یہ ہے کہ چندر گپت اول سے لے کر سکند گپت تک تمام راجا دونوں مقامات پر قابض تھے۔ مگر یہ باور کرنے کے کوئی وجوہ نہیں معلوم ہوتے کہ دونوں چندر گپت میں سے کسی نے اپنی سلطنت کو بھی کبھی کھو دیا تھا۔ سکند گپت کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ ایسا ہوا تھا۔ مگر یہ قول اس کے دو عالیشان پیشرؤں پر ہرگز صادق نہیں آتا۔ اس راجا کا بیان "جو علماء کی عزت افزائی کرتا تھا" چندر گپت کے اس بیٹے کے

لیے بالکل موزوں ہے جس کے متعلق وامن نے وہ شعر نقل کیا ہے' اور خاص کر سمدر گپت کے بالکل مناسب حال ہے۔

ہیون سانگ (یون چانگ)

ہیون سانگ کی حکایت کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ پرمارتھ کی بہتر اور قدیم تر حکایت ہی کا ایک پرتو ہے اور اس کو کوئی خاص اور علیحدہ اہمیت نہ دینی چاہیے۔ سکوں کا بالادت' جس نے مہرکل کو شکست دی اور نالند میں عمارتیں تعمیر کرائیں' بسو بندھو کے مربی سے بالکل ممیز اور مختلف تھا۔

خلاصہ

اگر ایم۔ پیری یہ کہنے میں حق بجانب ہے (اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوا ہے) کہ بسو بندھو چوتھی صدی عیسوی میں گذرا اور مرا ہے تو خاندان گپت کا وہ بادشاہ جس نے اس کی سرپرستی کی ہوگی وہ ضرور چندر گپت اول کا بیٹا اور جانشین لائق و فرزانہ سمدر گپت ہو گا۔ اور ممکن ہے کہ چندر گپت اول بکرماجیت کے لقب سے ملقب ہو' اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اس لقب کو چندر گپت اول نے اختیار نہ کیا ہو تو بھی خاندان گپت کو اکثر راجاؤں کا یہ لقب اسے بھی دے دیا گیا ہو۔ اس امر میں تو کسی قسم کا شک ہے ہی نہیں کہ سمدر گپت اپنے باپ کی طرح اجودھیا اور شراوستی دونوں کا مالک تھا۔ اگر بسو بندھو اور خاندان گپت کے کسی راجا کے تعلقات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اپنی جوانی کے زمانے میں سمدر گپت کے نام چندر پرکاش (پربھاؤ) اور بالادت یا پراوت ہوں گے۔ ایسا مان لینے میں کسی قسم کی دقت بھی نہیں۔

اس لیے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ سمدر گپت ہی نے مشہور و معرف بدھ مذہب کے عالم و گرو بسو بندھو کو اپنے دربار میں بلایا تھا' خواہ وہ وزیر کی حیثیت سے ہو یا مصاحب کی۔ اور یہ کام اس کے باپ چندر گپت اول کی مرضی اور خوشی سے ہوا تھا۔ نیز یہ کہ اگرچہ سمدر گپت کا مذہب برہمنی ہندو مت تھا لیکن اس نے جوانی کے زمانے میں بدھ مذہب کی تعلیم میں دلچسپی لی تھی۔

حوالہ جات

لہ جو ناظرین اس مسئلے کا اور زیادہ تفصیل سے مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں وہ ملاحظہ کریں پروفیسر آٹو فرینک کی کتاب: "پالی انڈ سنسکرت ان اہرم ہسٹوریشن انڈ جیوگرافیشن فرہالٹنس آف گرنڈو ڑانسکرفٹن انڈمیزن۔" مطبوعہ سٹربرگ 1903ء۔

لہ جن تین کا اوپر ذکر ہوا وہ حسب ذیل ہیں: چندرگپت اول اور سمدرگپت جو واسوبندھو کے سرپرست تھے' اور نرگپت بالادت جس نے نالند میں عمارات تعمیر کرائیں اور جس کو ہیون سانگ مذہب کا راسخ الاعتقاد ماننے والا سمجھتا ہے۔

سے چند سال سے کالیداس کے سنین زندگی پر بہت کچھ بحث مباحثہ ہوتا رہا ہے اور نومبر 1911ء تک کے تمام بیانات کا ملخص بی لیبنج نے اپنے مضمون "ڈیس ڈیٹم ڈس کالی داسا" سٹربرگ' جلد 31' 1912ء صفحہ 203–198) میں پیش کردیا ہے۔ اس سے قبل کے زیادہ اہم حوالے حسب ذیل ہیں: میک ڈونل "ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" (1900ء) صفحہ 324۔ اس میں کالی داس کو پانچویں صدی کے شروع کا بتلایا گیا ہے۔ مسٹر کیتھ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 439–433) بھی کالی داس کو چندرگپت دوم ہی کے زمانے کا بتلاتا ہے۔ لیکن "رگھو ومس" ایکٹ چہارم میں ہنوں کا ذکر ہونے کی وجہ سے اس کتاب کا اتنے قبل زمانے کا ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 739–731 اور انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 265۔ ڈاکٹر ہارنل کا نظریہ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 112) جس کے مطابق وہ چھٹی صدی عیسوی کے نصف اول میں گذرا ہے کسی نے قبول نہیں کی اور میرے نزدیک اس کے دلائل و براہین بھی غلط ہیں۔ یہ بات کچھ زیادہ بعید از قیاس نہیں کہ کالیداس کی پرانی تصانیف مثلاً "تسمہار" (اگر وہ اس کی تصنیف ہو) اور "میگھدوت" 413ء سے پہلے ہی یعنی چندرگپت دوم کے زمانے ہی میں لکھی گئی ہوں۔ لیکن خیال ہے کہ کمارگپت اول کا زمانہ (455–412ء) وہ تھا جس میں شاعر کی بعد کی کتابیں تصنیف اور شائع ہوئیں اور یہ ممکن بلکہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تمام زندگی اسی کے زمانے میں گذری تھی' اور یہ بھی ممکن

ہے کہ وہ سکند گپت کی تخت نشینی کے بعد تک برابر تصنیف و تالیف میں مشغول رہا ہو۔ لیکن بہرحال اس میں مجھے کسی قسم کا شک نہیں معلوم ہوتا کہ کالی داس پانچویں صدی ہی میں اس زمانے میں گذرا ہے' جبکہ خاندان گپت کی قوت واقتدار انتہائے عروج پر پہنچا ہوا تھا۔

۴؎ ناٹک "مٹی کی چھوٹی گاڑی" (مرچ چھکٹکا) کی تاریخ تصنیف معلوم نہیں۔ پروفیسر لیوی کا خیال ہے کہ یہ کالیداس کے بعد کا ہے (انڈین تھیٹر صفحہ 208) مگر میں دوسرے مصنفین سے متفق ہوں اور اس کو اس سے قبل کا سمجھتا ہوں۔ دیکھو اس کا ترجمہ مترجم رائڈر (ہارورڈ اورینٹل سیریز)۔ "مدرارا کشس" کے متعلق ہیز' مصحح و مترجم صفحہ 39 (کولمبیا یونیورسٹی۔ پریس نیویارک 1912ء) ثانی کا مضمون جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1910ء صفحہ 910۔ 1909ء صفحہ 147۔ پُرانوں کی قدامت کے متعلق دیکھو مفصل بحث پرگیٹر کی کتاب "دی ڈائنا سٹیز آف دی کالی ایج" اور اس کتاب کا ضمیمہ۔

ہندی اور یونانی علوم ریاضیات کے آپس کے تعلقات کی نسبت مسٹر کے کے خیالات کے لیے دیکھو جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1910ء صفحہ 759 اور جرنل اینڈ پروسیڈنگس آف۔ اے۔ ایس۔ بی 1911ء صفحہ 813۔

فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے تمام مسائل کے متعلق دیکھو مصنف کی کتاب "اے ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون"' اور وہ تمام حوالے جو اس کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

ہندوستان اور چین کے مابین رسل و رسائل کے حوالہ جات کووف نے اپنی کتاب "کرانالوجی آف انڈیا" 1899ء میں جمع کر دیا ہے۔ کا۔ پی۔ لی کے راجا نے 428ء میں ایک سفارت چین کو روانہ کی تھی (ویٹرس۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1898ء صفحہ 540) تمام سفارتوں کی تعداد جن میں سے غالباً بعض کے اغراض محض تجارتی تھے 515۔502ء تک چھ ہے۔ ان کے علاوہ یاتری اور داعیان مذہب کے سفیر وغیرہ تھے۔

رومتہ الکبریٰ کے ساتھ رسل و رسائل کے لیے دیکھو پریلو کتاب "انڈین امبسیز روم" کوٹرچ 1873ء۔

شاہان گپت کے سکوں پر رومی اثر کے متعلق میرے مضمون "کائنیج آف دی ارلی آر امپریل گپتا ڈائناسٹیز" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1889ء) میں مفصل بحث ہے۔ اور دیکھو سیول کا مضمون "رومن کائنز فاؤنڈ ان انڈیا" رسالہ مذکورہ 1904ء صفحہ 637۔591۔ سارناتھ کیسیا وغیرہ میں چند سال قبل جو بدھ مذہب کی خانقاہیں زمانہ گپت کی دریافت ہوئی ہیں وہ آرکیالوجیکل سروے کی سالانہ رودادوں میں شائع ہوتی رہی ہیں (3۔1902ء)

۵؎ دیکھو ضمیمہ ص۔

۶؎ فلیٹ ۔۔۔ میں (انڈین انٹی کویری جلد 28 صفحہ 228) یہ نربدا کے علاقے میں رہتی تھی۔ مگر

اغلب یہ ہے کہ وہ شمال میں سکونت پذیر تھی۔ پُران پٹی متراور پنو متر کا "متفرق" خاندانوں کے ضمن میں ذکر کرتے ہیں جو بظاہر بیرونی لوگ تھے۔ اور ان کے نام خاندان گپت کے ذکر سے پہلے شمار کرائے گئے ہیں (پرگیٹر "ڈائناسٹیز آف دی کالی ایج" صفحہ 63)۔

۷ے بنارس کے مشرق میں ضلع غازی پور کے بھتری کے مقام پر یہ مینار اب تک موجود ہے' اگرچہ بت اب مفقود ہو چکا ہے۔ کننگھم "آرکیالوجیکل رپورٹ" جلد اول لوح 39) اس مینار کے کتبے کو جس پر وہ واقعات درج ہیں (جن کا ذکر متن کتاب میں ہوا) فلیٹ نے بعد تصحیح و ترجمہ شائع کیا ہے۔ (گپتا انسکرپشنز۔ نمبر 13) دیکھو۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1907ء صفحہ 976۔

۸ے فلیٹ کی گپتا انسکرپشنز۔ نمبر 14۔

۹ے ایضاً نمبر 15۔ کھاؤن کا کتبہ۔

۱۰ے ایضاً نمبر 16۔

۱۱ے سنگ ین۔ چینی یاتری 520ء بیل کی ریکارڈس جلد اول صفحہ 100۔ لیکن "میلہ" کا نام جو بیل نے اس سردار کو دیا ہے اور جس کی نقل کننگھم وغیرہ کرتے چلے آئے ہیں' محض فرضی ہے اور ایک ترکی خطاب "تگین" کے غلط معنوں پر مبنی ہے۔ (دیکھو چونیز کی کتاب: "لیس ٹرکس آکسی ڈنٹو صفحہ 225 حاشیہ)

۱۲ے کشان کے سکوں کی طرح گپت خاندان کے پرانے سکے بھی وزن میں اور ایک حد تک بناوٹ میں رومی سکہ "اوری" ہیں۔ مگر بعد کے سکے ہندو "سورن" کے مثل ہیں اور وزن میں کم و بیش 146 گرین ہیں اور بناوٹ میں بھی خراب اور بھدے ہیں۔

۱۳ے بھتری کی مہر کے کتبے کی شہادت (جے۔ اے۔ ایس۔ بی جلد 58 حصہ اول صفحہ 105۔ 84) اور دوسرے کتبوں وغیرہ میں جو ظاہری تضاد پایا جاتا ہے اس کی مطابقت کی بہترین صورت وہی ہے جو متن کتاب میں اختیار کی گئی ہے۔ سونے کے سکوں کے معیار کے متعلق دیکھو کننگھم: کائنز آف میڈیول انڈیا صفحہ 16۔

۱۴ے چونیز ریلیجکس امنٹس صفحہ 94۔ ویٹرس جلد دوم صفحہ 170۔ بیل جلد دوم صفحہ 173۔ نالند آج کل وہاں ایک بڑکا درخت ہونے کی وجہ سے بڑگاؤں کے نام سے مشہور ہے۔ شمالی ہند میں ایسے نام بہت عام ہیں۔ (بلاک۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 404)

۱۵ے جے۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 58 (1889ء لوح 6)

۱۶ے ان خاندانوں کے حالات کے لیے دیکھو فلیٹ کی کتاب گپتا انسکرپشنز اور بھتری کی مہر پر ڈاکٹر ہارنل کے خیالات۔ موکھری قوم کے سکوں کے متعلق دیکھو برن کا مضمون۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1906ء صفحہ 43۔

۱۷ بشل: چائنیز آرٹ' جلد اول صفحہ 24۔

۱۸ بھاؤ نگر کے شمال مغرب میں اٹھارہ یا بیس میل کے فاصلے ولا کے مقام پر ولبھی کے آثار عموماً زیر زمین مدفون ہیں۔ اس کی تاریخ برگیس نے آرکیالوجیکل سروے آف ویسٹرن انڈیا: جلد دوم (1876ء) صفحہ 86۔80 میں اور بھگوان داس اندراجی اور جیکسن نے بمبئی گزیٹیئر (1866ء) جلد اول حصہ اول صفحہ 106۔78 میں دی ہے۔ اس خاندان کی سب سے آخری اور مکمل فہرست کیلھارن کی "سپلیمنٹ ٹورسٹ آف ناردرن انسکرپشنز" ضمیمہ بی صفحہ 11 پر ہے (اپی گرافیا انڈیکا جلد 8 اپریل 1905ء)۔ ولبھی کی بربادی کی اندازاً تاریخ کے لیے دیکھو برگیس: آرکیالوجیکل سروے جلد ششم صفحہ 3' جلد نہم صفحہ 4۔ لیکن بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کو سندھ کے گوجروں نے تباہ کیا تھا (جے۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 4 (1886ء) صفحہ 181)۔ بروڈیہ (جین ازم صفحہ 65) کا خیال ہے کہ یہ تباہی 524ء میں واقع ہوئی۔

۱۹ گبن۔ باب 35۔

۲۰ ہارنل (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 128) کو سکند گپت کے عہد حکومت کے شروع میں ہنوں کے حملے کی حقیقت سے انکار ہے۔ وہ بھتری کے کتبے کی تاریخ 468ء بتلاتا ہے۔ مگر جو وجوہ اوپر بیان ہو چکے ہیں ان کی بناء پر میرا خیال ہے کہ یہ کتبہ ضرور شروع حکومت میں ہی لکھا گیا ہو گا۔ اس میں ہنوں اور پشتی متر قوم دونوں کی شکست کا ذکر ہے۔

۲۱ تین کتبے جن میں ترمان کا نام ہے' معلوم ہو چکے ہیں: (1) صوبہ جات متوسط کے ضلع ساگر کے ایران مقام پر جس پر اس کے پہلے سن کے جلوس کی تاریخ ہے۔ (فلیٹ 'گپتا انسکرپشنز نمبر 36)۔ (2) کوہستان نمک میں کرا کے مقام پر جس کی تاریخ ضائع ہو گئی ہے۔ (اپی گرافیا انڈیکا جلد اول صفحہ 238)۔ (3) وسط ہند میں گوالیار کے مقام پر۔ اس پر ترمان کے بیٹے مہرکل کے پندرہویں سال کی تاریخ ہے۔ ترمان کے چاندی کے سکوں پر جو سراشٹر کے ستریوں اور شاہان گپت کی نقل میں بنائے گئے ہیں 52 کی تاریخ ہے جو بظاہر کسی خاص سن سال سے (جو غالباً 448ء کو شروع ہوتا تھا) متعلق ہے۔ (جے۔ اے۔ ایس۔ بی جلد 63 حصہ اول 1894ء صفحہ 195)

۲۲ مہرکل کا نام سنسکرت طرز تحریر میں مہرکل کے نام سے بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے سکے پنجاب میں چنیوٹ اور شاہ کوٹ کے مقام پر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ترمان اور مہرکل کے سکوں پر جے۔ اے۔ ایس۔ بی 1894ء حصہ اول میں مفصل بحث ہے۔

۲۳ چونیز "ژکو آکسی ڈنو" صفحہ 224۔226۔ گرگان جس کو اکثر افتالوی دارالسلطنت سمجھا جاتا ہے' فی الحقیقت ایران کا ایک سرحدی شہر تھا (چونیز کتاب ایضاً 223۔235 حاشیہ)۔

۴؎ بیل ' ریکارڈس جلد اول صفحہ 91 - 100 - جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے ' لی - لہ کا نام محض قیاسی ہے - سانگ ین کے زمانے میں کی پن سے مراد کشمیر تھی - ساتویں صدی میں کی پن سے مراد بالعموم (اگرچہ ہمیشہ نہیں) کپس یا شمال مغربی افغانستان لی جاتی تھی (چونیز: سانگ ین صفحہ 37 - 39)

۵؎ مترجمہ میک کرنڈل (ہکلیوٹ سوسائٹی 1897ء) صفحہ 597 -

۶؎ ہیون سانگ - راج ترنگنی - تارناتھ کے ترشک راجا (شیفنر صفحہ 94) سے غالباً مہرکل ہی مراد ہوگی -

۷؎ گبن باب 26 -

۸؎ ہیون سانگ ' بیل ریکارڈس جلد اول صفحہ 172 - 165 - ویٹرس جلد اول صفحہ 228 - یہ سمجھانا آسان نہیں کہ سیاح نے کیوں یہ فرض کر لیا (صفحہ 168) کہ مہرکل اس سے "چند صدیاں" قبل گذرا تھا - اس کے چینی الفاظ سے اور کوئی معنی نہیں لیے جا سکتے - (بیل انڈین انٹی کویری جلد 15 صفحہ 354) ویٹرس کا خیال ہے کہ جس مہرکل کا ذکر ہیون سانگ نے کیا ہے وہ بہت پہلے زمانے کا مہرکل تھا - ڈاکٹر فلیٹ کا خیال ہے کہ ممکن ہے متن کتاب میں غلطی واقع ہو گئی ہو - ہیون سانگ کی سیاحت کا زمانہ 629ء سے 645ء تک ہے - کشمیر کی روایات کے لیے دیکھو اسٹین کا ترجمہ راج ترنگنی باب 1 صفحہ 325 - 289 -

۹؎ میں اس امر کو مسلم الثبوت ماننے میں اپنے کو بالکل حق بجانب سمجھتا ہوں (مخالف بیان کے لیے دیکھو ہارنل کا مضمون جے - آر - اے - ایس 1909ء صفحہ 91) ہیون سانگ اور کتبات کے بیانوں میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے - ان کو آپس میں ربط دینے کا وہی بہتر ذریعہ ہے جو متن کتاب میں استعمال کیا گیا ہے - اغلب یہ ہے کہ بالادت شاہی خاندان گپت کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو یسودھرمن کا حاکم اعلیٰ سمجھتا تھا اور یسودھرمن اپنی طرف سے اپنے آپ کو خودمختار تصور کرتا تھا - مذکورہ ذیل بیان جو ایک نقاد فن کے قلم سے ہے قابل غور معلوم ہوتا ہے:

"کلن جو چولکیا خاندان کا باج گذار تھا ضرور بھیم دیو کی مدد کو گیا ہوگا اور اس کا بھائی کرتی پال بھی اس کے ہمراہ ہوگا ' جیسا کہ باج گذار رجواڑے اکثر کیا کرتے ہیں - اور اس فتح کو بالا تمام اپنے نام سے منسوب کر لیتے جو ان کے حاکم اعلیٰ نے حاصل کی تھی اور جس کے حصول میں انہوں نے اس کی مدد کی تھی - اسی طرح کلن اور کرتی پال نے یہ ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے کاسہرد کے مقام پر ترشکوں کو شکست دی تھی - (ڈی - آر بھنڈارکر ' انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 72)

۱۰؎ فلیٹ کی گپتا انسکرپشنز نمبر 33 ' 34 ' 35 -

لـــہ چونیز۔ کتاب مذکورہ بالا صفحہ 9-222۔

لـــہ بیوہلر "امپی گر یفیا انڈیکا" جلد 1۔ صفحہ 225۔ سلوین لیوی "نوٹس چائیز سرن انڈ" نمبر 3۔ 1600ء میں جنوبی ہند کا ایک برہمن شاعر پرتگیزوں کو ہنوں کہتا ہے۔ اور ان کو "نہایت قابل نفریں' بے رحم' برہمنوں سے لاپرواہ اور ذات سے نا آشنا ظاہر کرتا ہے۔"

لـــہ مہر کل کی شکست تقریباً 528ء۔ پنجاب پر محمود کا مستقل قبضہ 1023ء۔ آٹھویں صدی میں عربوں کی فتح سندھ کا اثر اندرون ملک پر بالکل نہیں پڑا اور اگر ساتویں' آٹھویں' نویں اور دسویں صدیوں میں وحشی اقوام نے کبھی یورش کی تھی تو اس کا حال بالکل نہیں ملتا۔

لـــہ ڈاکٹر ہارنل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم ترسیلا دت دراصل ہنوں کا فاتح یسودھرمن تھا۔ مگر میرے نزدیک اس کو یہ ثابت کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 122)

لـــہ حاشئے کی حدود میں محدود رہ کر مو-لا-پو کے نظریے پر مکمل بحث کرنا ناممکن ہے۔ اس کے متعلق حوالے حسب ذیل ہیں۔ ہیون سانگ (بیل جلد 2 صفحہ 270-260 ویٹرس جلد 2 صفحہ 248-242) کننگھم "این شنٹ جیاگریفی" صفحہ 494-489 اسٹین ترجمہ راج ترنگنی جلد اول صفحہ 66 میکس میولر۔ انڈیا دٹ اٹ کین ٹیچ اس؟ 288 ہارنل۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1903ء صفحہ 553) وی۔ اے۔ سمتھ (زیڈ۔ ڈی۔ ایم۔ جی 1904ء صفحہ 796-787) برن (جے۔ آر۔ ایس 1905ء صفحہ 837) گریرسن (جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ 1905ء صفحہ 96) برگیس (ایضاً) صفحہ 220 انڈین انٹی کویری 1905ء صفحہ 195) سلوین لیوی (جرنل ڈیس سیونٹس۔ اکتوبر 1905ء صفحہ 8-544) متن کتاب جو اس کتاب کی طبع اول سے بالکل مختلف ہے ان تمام مندرجہ بالا حوالوں پر مبنی ہے۔ بعض خاص باتیں قابل غور ہیں: مو-لا-پو میں بھلمال (بھلمال' بھتمال' بھلمال اور سریمال) جو دراصل پی۔ لو۔ مو۔ لو ہے شامل نہ تھا۔ یہ راجپوتانہ کی کیو۔ جے۔ لو۔ (گرجر) سلطنت کا صدر مقام تھا اور اس میں اجین بھی جو ایک بالکل علیحدہ سلطنت (اونتی) کا مستقر ہے' شامل نہ تھا۔ ہیون سانگ کی کتاب کے تینوں متن میں دریا کا نام یا اسم عرفی ہو۔ ہا۔ مہا لکھا ہے۔ صرف ایک متن ث جس کی پیروی لیوی نے کی ہے مو۔ ہی۔ مہی لکھتا ہے (ویٹرس)۔ مگر گردوپیش کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ دریا دراصل سابرمتی تھا نہ کہ مہی۔ آنند پور کا ورنگر ہونا اب بالکل ثابت ہے۔ کی۔ تایا کی۔ چا بخوبی کھیت (کھیتک۔ کھید) جو موجودہ ضلع کھیرا ہے کی آواز پیدا کرتا ہے۔ لیکن سینٹ مارٹن' جولین اور ویٹرس اس کو کچھ لکھتے ہیں اور میرے نزدیک بھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سو۔لا۔چا (یا) سو۔لا۔ تھا کا سورتھ یا سراشٹر یعنی مغربی کاٹھیاواڑ ہونا بھی بالکل صریح ہے۔ ا~~یہ بات~~ کہ اس میں یوہ۔ شن۔ تو یا یوشن۔ تو کے پہاڑ کا ذکر ہے جو دراصل اجنتا

ہے۔ گرنا ردھرو بھرت ہرش کا داماد تھا نہ کہ بیٹا (ویٹرس جلد 2 صفحہ 247)۔

۶؎ پروفیسر میکڈانل نے یہ خیال مدت ہوئی ظاہر کیا تھا اور اس کی وجہ یہ بتلائی تھی کہ بسوبندھو کی کتب کا ترجمہ چینی زبان میں 404ء میں ہوا تھا (ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر 1909ء صفحہ 325)۔ مسٹر ایس۔۔ سی ودیا بھوشن بھی اپنی تحقیقات کی بنیاد تبت کی کتابوں پر رکھتے ہوئے یہی ثابت کرتے ہیں کہ بسوبندھو چوتھی صدی عیسوی میں ہی گذرا ہے، اور وہ اس کو تبت کے بادشاہ لہا۔ عو۔ تھوری کا ہم عصر بتلاتے ہیں جس کے متعلق فرض کیا جاتا ہے کہ وہ 371ء میں مرا ہے۔ (جرنل اینڈ پروسیڈنگس آر۔ ایس۔ بی 1905ء صفحہ 228)

۷؎ ان میں سب سے بڑا مستثنیٰ ہیون سانگ ہے جو بسوبندھو کو "1000 میں بتلاتا ہے۔" ویٹرس نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہمارا سیاح یہاں دو بھائیوں (بسوبندھو۔ اور اسنگ) کا ذکر کرتا ہے جو گندھار کے رہنے والے تھے اور بدھ کی موت کے ہزار برس بعد گذرے ہیں (یعنی چینی حساب سے سن عیسوی کی تیسری صدی میں)۔" (ویٹرس، جلد اول صفحہ 357) یہ حساب تقریباً درست ہے کیونکہ بسوبندھو تقریباً 280ء میں پیدا ہوا تھا اور اس کا بھائی اس سے ذرا قبل۔

۸؎ تککسو کو اس امر سے قطعی انکار ہے کہ کمار جیو نے بسوبندھو کی کوئی سوانح عمری بھی لکھی تھی (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1905ء صفحہ 39)۔

۹؎ اگر یہ واقعہ صحیح طور پر بیان کیا گیا ہے تو ثبوت کے لیے یہی ایک کافی ہے۔ تککسو نے اسنگ کی تین کتابوں کے نام گنوائے ہیں: (1) سپت دس بھوی سوتر۔ (2) مہایان سوتر اُپدیس۔ (3) مہایان سمپر گرہ شاستر (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1905ء صفحہ 35)۔

۱۰؎ تبتی روایات کے بموجب دناگ بسوبندھو کا شاگرد تھا (جرنل اینڈ پروسیڈنگس۔ اے۔ ایس۔ بی 1905ء صفحہ 227)۔

۱۱؎ مجھ کو یقین نہیں کہ "پوری ایک صدی" حکومت کی ہو۔ بعض مصنفوں نے (جیسا کہ اوپر آچکا ہے۔) بیان کیا ہے کہ لہا تھوری 371ء میں مرگیا۔ یہ سنہ وسوبندھو کی صحیح تاریخ سے مطابق ہے۔

۱۲؎ اغلب یہ ہے کہ کاچ یا کچ جس نے چند سونے کے سکے بھی مضروب کرائے تھے، سمدرگپت کا بھائی باپ کی وصیت کے مطابق سمدرگپت کے بادشاہ ہونے سے قبل (الہ آباد کے کتبے کی ساتویں سطر) چند ماہ تک حکمراں رہا تھا۔ (وی۔ اے۔ سمتھ "ابزرویشنز آن دی گپت کا تنیج" جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1893ء صفحہ 95) کاچ کی وقتی حکومت تصور کر بھی لی جائے تو بھی اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ ایک دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو سمدرگپت ہی سمجھا جائے۔ ہرشین کی نظم کے لیے دیکھو: فلیٹ کی کتاب گپتا انسکرپشنز۔ (نمبر1)۔

۳ہ یہاں اس پر غور کرنا چاہیے کہ ایک برہمن کی شادی ایک ایسے خاندان کی شہزادی سے ہوئی تھی جو چھتری ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔

۴ہ چھتری کے نقش کے طلائی سکوں کی نسبت کے متعلق وی۔اے۔ سمتھ نے اپنے مضمون "دی کائنیج آف دی گپتا ڈائناسٹی" (ج۔آر۔اے۔ ایس 1889ء صفحہ 92) میں بحث کی ہے۔ خاندان گپت کے لقبوں کے متعلق دیکھو "ابزرویشنز" وغیرہ (رسالہ مذکورہ بالا صفحہ 126)۔ چندر گپت ثانی نے "بکرماجیت" اور بکرم دونوں لقب (سونے' چاندی اور تانبے کے سکوں پر) اور سکند گپت نے (صرف چاندی کے سکوں پر) استعمال کئے تھے۔ کمار گپت اول نے مہندرادت اور مہندر کے القاب کو پسند کیا' کمار گپت دوم اور سکند گپت نے کرمادت کو' سکند گپت نے پرمادت کو' پرگپت نے پرکاش دت کو اور نرگپت نے بالادت کو پسند کیا۔ مشرقی بنگال میں فرید پور کے ایک پرانے گپت کے کتبے میں مہاراجا آدھی دھرمادت کا ذکر ہے۔ اور اس کو سکند گپت خاص لقب "اپرتیرتھ" بھی دیا گیا ہے۔ (ہارنل۔ انڈین انٹی کویری جلد 21 صفحہ 698 (1892ء)۔ دھرمادت کے لقب سے بدھ مت کی بو آتی ہے۔ کیا واقعی جیسا کہ ہارنل نے لکھا ہے یہ سمدرگپت کا ایک دوسرا نام تھا؟ بہرحال یہ لقب بسوبندھو کے مربی کے بالکل مناسب حال ہے۔ مگر اب (انڈین انٹی کویری 1910ء صفحہ 208) خود ڈاکٹر ہارنل ہی اس کو چھٹی صدی کا بتلاتا ہے۔ چندر گپت اول کے "راجا و رانی" کے تقریباً 18 سکوں میں سے چار کو اودھ کا بتلایا جاتا ہے اور اغلب یہ ہے کہ ان میں سے بعض اور بھی اجودھیا میں ملے تھے۔

۵ہ ویٹرس نے اس کا ترجمہ "مشاہیر" کیا ہے اور بیل نے "جس نے ان لوگوں کی سرپرستی کی جو علم و فضل کے لیے مشہور تھے۔" اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہرت جس کے ذریعے سے بادشاہ کی سرپرستی حاصل کی جاسکتی تھی علمی شہرت ہی تھی۔

تیرھواں باب

حکومتِ ہرش

606ء تا 647ء

ساتویں صدی میں تاریخ کے ماخذ

چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر کی تاریخ لکھتے ہوئے تاریخی مواد کی عدم موجودگی سے جو تکلیف مورخ کو پیش آتی ہے وہ ساتویں صدی عیسوی کے شروع ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس زمانے کے لیے معمولی کتبوں اور سکوں کے ماخذوں کے علاوہ اس کو خوش قسمتی سے ادبی کتابیں بھی ملتی ہیں جن سے ہندوستان کے سیاسی حالات پر بالعموم اور ہرش کی حکومت کے متعلق (جو شمالی ہند میں چالیس سال سے زیادہ بادشاہ رہا۔) بالخصوص کثیر اور معتبر حالات بہم پہنچتے ہیں۔ ان میں سے پہلی تو وہ قابل قدر سیاحت نامہ ہے جو چینی سیاح ہیون سانگ نے لکھا تھا جس نے 630-644ء کے درمیان ہندوستان کے تقریباً ہر ایک حصے میں سیاحت کی تھی۔ اس سیاح نے ہر ایک صوبے کے متعلق کم و بیش مفصل بیانات دیئے ہیں۔ اس سفرنامے کی حکایت کے ساتھ اس سوانح عمری کو ضمناً استعمال کیا جا سکتا ہے جو ہیون سانگ کے دوست ہیوئی۔لی نے لکھی تھی اور جس میں بہت حالات ملتے ہیں۔ دوسری کتاب جس کا اوپر ذکر ہوا وہ مشہور تاریخی نظم ہرش چرت ہے۔ اس کا مصنف ایک برہمن شاعر بان ہے جو ہرش کے دربار میں موجود اور اس کا مصاحب و ندیم تھا۔ اس کے علاوہ چین کی سرکاری تاریخوں میں بعض اہم اور دلچسپ تفاصیل ملتی ہیں۔ جب ان تمام ماخذوں کو استعمال کر لیا جائے تو حکومت ہرش کے واقعات کے متعلق ہماری معلومات اس سے کہیں زیادہ صحیح ہو جاتی ہیں جتنی کہ چندر اگپتا موریا اور اشوک کے سوا اور کسی قدیم ہندی بادشاہ کے متعلق ہو سکتی ہیں۔

تھانیسر کا راجا پربھاکر وردھن

بہت قدیم زمانے میں تھانیسر (ستھانویسور) کے اردگرد کے علاقے کو "مقدس زمین" شمار کیا جاتا ہے اور وہ "سرزمین کورو" کے نام سے معروف اور روایتی مشاہیر کا میدان جنگ ہونے کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ چھٹی صدی کے آخری حصے میں یہاں کے راجا پربھاکر وردھن نے اپنے ہمسایہ بادشاہوں کے مقابل (جن میں اقوام مالوا' شمال مغربی پنجاب کی ہن نو آبادیوں اور گوجروں کی سلطنت جو غالباً راجپوتانہ اور ممکن ہے کہ پنجاب میں اس علاقے میں واقع تھی جس کو اب اضلاع گجرات و گوجرانوالہ کہا جاتا ہے) لڑ بھڑ کر بہت کچھ طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس امر نے کہ اس کی ماں خاندان گپت سے تھی شاید اولوالعزمی کو اور تحریک دی اور اس کو اپنے منصوبوں کی کامیابی میں مدد دی۔[1]

ہنوں کے ساتھ اس کی جنگ

604ء میں اس چست و چالاک و باہمت راجا نے اپنے بڑے بیٹے راجیا وردھن کو جس کا ابھی عنفوان شباب کا ہی زمانہ تھا ایک زبردست فوج دے کر شمال مغربی سرحد کی طرف ہنوں پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس کے بہت وقفے کے بعد اس کا چھوٹا اور عزیز تر بیٹا ہرش' جس کی عمر اس وقت مشکل سے پندرہ برس کی تھی' ایک سوارہ فوج سمیت اس کے پیچھے بھیجا گیا۔ بڑا شہزادہ تو دشمن کی فکر میں پہاڑیوں میں داخل ہو گیا مگر دوسرا وہیں پہاڑیوں کے دامن میں سیر و شکار میں (جو وہاں بکثرت ملتا تھا) مشغول ہو گیا۔

605ء: راجیا وردھن کی تخت نشینی

ہرش اسی طرح سیر و شکار میں مشغول تھا کہ اس کو دارالسلطنت سے یہ اطلاع ملی کہ اس کا باپ بخار میں مبتلا اور نازک حالت میں ہے۔۔ یہ سن کر وہ فوراً تیزی کے ساتھ واپس روانہ ہو گیا اور دارالسلطنت میں آ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کے باپ کی حالت بالکل مایوسی کی ہے۔ بیماری نے بالاخر جلد ہی سے اس کا کام تمام کر دیا اور قبل اس سے کہ بڑا بیٹا جو اپنی فوجی مہم میں کامیاب رہا تھا وراثت کا دعویٰ کرنے کے لیے وہاں پہنچے' سب کام ختم ہو چکا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں ایک فریق چھوٹے بیٹے کو تخت نشین کرنے کا طرفدار تھا مگر راجیا وردھن کے وقت پر پہنچ جانے سے ان تمام سازشوں کا یک لخت خاتمہ ہو گیا اور وہ اپنے باپ کے تخت کا مالک ہوا۔ ابھی اس کو تخت نشین ہوئے کچھ بھی وقت نہ گذرا تھا کہ ایک ایسی خبر ملی جس سے کہ اس نے

مجبوراً پھر جنگ کا آغاز کیا۔

مالوا سے جنگ

ایک ہرکارہ یہ مصیبت افزاء اور جانکاہ خبر لایا کہ ان شہزادوں کی بہن راجیا سری کے شوہر راجا گرہو رمن موکھری کو مالوا[1] کے راجا نے قتل کر دیا ہے اور شہزادی کو نہایت بد سلوکی کے ساتھ قنوج میں "معمولی مجرم کی بیوی کی حیثیت سے پاؤں میں بیڑیاں پہنا کر قید کر دیا۔" راجیا وردھن نے اپنی بہن کے مصائب کا بدلہ لینے کے کا ارادہ کیا اور فوراً ایک لاکھ سواروں کی فوج لے کے سرپٹ کوچ کیا اور اپنی غیر حاضری میں جنگی ہاتھی اور وزنی اسلحہ سے مسلح فوج کو اپنے بھائی کی سرکردگی میں چھوڑ گیا۔ معمولی جدوجہد کے بعد مالوا کے راجا کو شکست ہوئی۔ مگر فتح کی تمام خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب یہ معلوم ہوا کہ فاتح راجا کو مفتوح کے حلیف و مددگار[2] وسط بنگال کے ششانک نے دغابازی سے مشورے کے لیے بلا کر اس وقت قتل کر دیا ہے جبکہ وہ اپنے آپ کو بالکل مصئون و مامون سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ ہرش کو یہ معلوم ہوا کہ اس کی بہن قید سے نکل بھاگی ہے اور کوہستان بندھیاچل کے جنگلوں میں کہیں پناہ گزین ہوئی ہے۔ لیکن مقام پناہ کے متعلق کچھ پتا نہ لگا۔

606ء: ہرش کی تخت نشینی

مقتول راجا اس قدر نوجوان مارا گیا تھا کہ اس کی کوئی اولاد بھی نہ ہوئی تھی جو حکومت کا بار اٹھانے کے قابل ہو۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ امراء و اراکین سلطنت بھی پہلے ہرش کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ کرنے سے تامل کرتے تھے۔ مگر اس وقفے میں جب ملک فتنہ و فساد کے مصائب میں پھنسنا شروع ہوا تو آخر مشیر کاران سلطنت کو جانشینی کے متعلق کچھ نہ کچھ فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ بھنڈی کی رائے سے 'جو اس سے عمر میں ذرا بڑا اس کا برادر اور عمزاد تھا اور جس نے اس کے ساتھ تعلیم پائی تھی' انہوں نے انجام کار ہرش کو بادشاہت کی ذمہ داریاں اپنے سر لینے کے لیے دعوت دینے کا ارادہ کیا۔ بعض وجوہ کی بناء پر جن کا اظہار اس تمام حکایت میں نہیں پایا جاتا' ہرش نے اس امر کے قبول کرنے میں پس و پیش کیا۔ کہا جاتا ہے کہ دعوت قبول کرنے سے قبل اس نے بدھ مذہب کے ایک اکاس بانی سے مشورہ کیا۔ اس اکاس بانی سے اثبات میں جواب ملنے کے بعد بھی جبکہ اس کی یہ کشیدگی خاطر' خواہ وہ حقیقی ہو یا محض بناوٹی' بالکل جاتی رہی تھی اس نے پہلے پہل شاہی خطاب اختیار کرنے کے مصائب سے بچنے کی کوشش کی اور اپنا لقب محض راج پتر (شہزادہ) سیلادت مقرر کیا۔

ہرش کا سمت

ان عجیب و غریب تفاصیل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہرش کی تخت نشینی کے بارے میں کوئی خاص بات مانع تھی اور اسی نے اس کو بجائے اس کے کہ وہ وراثت کے طور پر تخت و سلطنت کا دعویٰ کرے محض اراکین و عمائد سلطنت کے انتخاب اور نامزدگی ہی پر اکتفا اور اعتماد کیا۔ "فنگ چہ" نامی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "اپنی بیوہ بہن کی معیت میں سلطنت کا کاروبار انجام دیتا تھا۔" اس عبارت سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ وہ شروع میں خود کو اپنی بہن یا ممکن ہے کہ اپنے کسی شیر خوار بھتیجے کا مختار عام و مدار الہام تصور کرتا تھا۔[۴] یہ باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ 612ء سے قبل جبکہ وہ پانچ یا ساڑھے پانچ یا چھ برس حکومت کر چکا تھا' اس نے بادشاہت کا دعویٰ کھلم کھلا نہیں کیا اور اسی سال رسمی طور پر اس کی تاجپوشی کی رسم ادا ہوئی۔ وہ سنہ جو اس کے نام سے مشہور ہوا اور جس کا پہلا سال 7-606ء تک ہے' اکتوبر 606ء سے اس وقت شروع ہوتا ہے جبکہ وہ پہلے پہلے بادشاہ ہوا۔[۵]

نوجوان ہرش کی اطاعت قبول کرنے میں تامل کے لیے اراکین سلطنت تھانیسر کے پاس خواہ کچھ ہی اسباب کیوں نہ ہوں' لیکن اس کی لیاقت نے بھنڈی کے مشورے کی پوری پوری تصدیق کر دی اور اس نوجوان راجا نے اپنے آپ کو بہت جلد حکومت و سلطنت کا اہل ثابت کر دیا۔

راجیا سری کا حصول

تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی اس کے پہلے فرائض بین طور پر یہ تھے کہ اپنے بھائی کے قاتل سے بدلہ لے اور اپنی بیوہ بہن کو تلاش کرے۔ دوسرا کام زیادہ اہم اور ضروری تھا۔ اس لیے اگرچہ ایسا کرنے سے قاتل بچ بھی جائے لیکن اس کو پورا کرنا واجب تھا اور اس طرح جلدی کرنے میں حق اسی کی جانب تھا' کیونکہ راجیا سری مخلصی پانے سے بالکل ناامید ہو کر مع اپنے ہمراہیوں کے زندہ جل مرنے ہی والی تھی جب اس کا بھائی مقامی باشندوں کے بعض سرداروں کی مدد سے کوہستان بندھیاچل میں اس کی جائے پناہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوا۔ ششانک کے خلاف جنگ کی تفصیل معلوم نہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچ کر نلوہ نکل گیا کیونکہ 619ء تک وہ برابر حکمراں تھا' اگرچہ اس کے بعد اس کی سلطنت ہرش کے ماتحت ہو گئی تھی۔[۶]

ہرش کی فتوحات کی تجویز

اپنی بہن ~~سلطنہ~~ کے بعد' جو ایک لائق اور بدھ مذہب کے سمتیا فرقے کے عقائد سے

پوری واقف تھی' راجانے اپنی تمام قابلیت اور ہمت ایک باقاعدہ فتوحات کی تجویز پر صرف کرنی شروع کی اور تمام ہندوستان کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دینے کا ارادہ کیا۔ اس وقت اس کے پاس 5000 ہاتھی' 20000 سوار' 50000 پیادے تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے رتھوں کو' جو قدیم ہندی روایات کے مطابق ہندوستان کی فوج کا ایک حصہ شمار ہوتی تھیں' بیکار سمجھ کے بالکل ترک کر دیا تھا۔ مگر بہرحال وہ ملک کے دوسرے حصوں میں اب تک مستعمل تھیں۔[7]

پینتیس سالہ جنگ

اس سریع الحرکت' چالاک اور قوی فوج کو رکاب میں لے کر ہرش نے تمام شمالی ہند کو روند ڈالا اور چینی سیاح کے خوبصورت الفاظ میں "وہ مشرق سے مغرب تک ان کو مطیع کرتا چلا گیا جو اس سے پہلے مطیع نہ تھے۔ اور اس عرصے میں سپاہیوں نے اپنے خود سر سے نہ اتارے اور ہاتھیوں کی جھولیں ان کے بدن سے علیحدہ نہ ہوئیں۔" ساڑھے پانچ سال کی جنگ کے بعد تمام شمال مغربی علاقے اور غالباً بنگال کا ایک بڑا حصہ مفتوح ہو گیا۔ اب اس کے فوجی ذرائع اس قدر وسیع ہو گئے کہ وہ میدان جنگ میں 6000 جنگی ہاتھی اور 100000 سوار لا سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے پینتیس برس تک نہایت کامیابی سے حکومت کی اور اس طویل عرصے میں اپنی تمام توجہ ان وسیع علاقوں کے نظم و نسق پر صرف کی۔[8] اس کی آخری جنگ 643ء میں گنجام میں' جو خلیج بنگالہ کے ساحل پر واقع ہے' بہادر اور جنگجو باشندوں سے ہوئی۔

پلکیسن دوم چالوکیہ کے ہاتھوں شکست

طویل فاتحانہ زندگی میں صرف ایک دفعہ اس کو ناکامیابی کا منہ دیکھا پڑا۔ خاندان چالوکیہ کے سب سے بڑا راجا پلکیسن دوم نے جس کے کارناموں کا ذکر ایک آئندہ باب میں آئے گا۔ فتوحات کی وسعت کے لحاظ سے ہرش پر سبقت لے جانے اور اس کے ہم سر ہونے کا دعویٰ کیا' اور جس طرح ہرش نے شمالی ہند میں خود کو ادھیراجہ بنا لیا تھا اسی طرح جنوب میں پلکیسن نے یہی کیا تھا۔ مگر شمالی ہند کے بادشاہ جیسے زبردست حریف کی مقاومت کی تاب کہاں لا سکتا تھا اور اس کو برباد کرنے کی کوشش میں بذات خود حملہ کرنے کے لیے "پانچوں ہند کی افواج اور ملک کے بہترین سالاروں کی معیت میں" روانہ ہوا۔ مگر یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ دکن کے راجا نے دریائے نربدا کے دروں کی ناکہ بندی اس طرح کی کہ ہرش کو ناکام و نامراد واپس جانا پڑا اور اس دریا کو اس نے سرحد تسلیم کیا۔ یہ مہم غالباً 620ء میں واقع ہوئی۔[9]

ولبھی سے جنگ

ولبھی کی جنگ، جس میں دھرو سین (دھرو بھٹ) دوم کو شکست فاش ہوئی اور اسے بھڑوچ کے راجا کے علاقے میں پناہ لینی پڑی۔ (جو غالباً خاندان چالوکیہ کے راجا پر اعتماد کرتا تھا) غالباً 633ء کے بعد اور 641 یا 642ء میں ہیون سانگ کے مغربی ہند میں جانے سے قبل واقع ہوئی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، دھرو بھٹ کو مجبوراً صلح کی درخواست کرنی اور فاتح کی بیٹی سے شادی کر کے باج گذار راجا کی حیثیت اختیار کرنی پڑی۔ غالباً اسی مہم میں آنند پور، کی چھ یا (؟) کچھ، سورت یا جنوبی کاٹھیا واڑ کی فتح بھی عمل میں آئی۔ یہ 641ء میں مو-لا-پو یا مغربی مالوا کے زیر سیادت تصور کی جاتی تھیں جو اس سے قبل ولبھی کا ماتحت تھا۔[10]

سلطنت ہرش کی حدود اور وسعت

حکومت کے آخری دنوں میں ہرش کی سلطنت تمام میدان دریائے گنگا (معہ نیپال[11] کے) علاوہ مالوا، گجرات اور سراشٹر کے کوہستان ہمالیہ سے لے کر دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ اس سارے علاقے پر بلا شرکت غیرے حکمراں تھا۔ مگر نظم و نسق کی تمام تفصیلی باتیں مقامی راجاؤں کے ہاتھ میں حسب سابق باقی تھیں۔ مشرق میں آسام (کامروپ) کے دور دست علاقے کا راجا بھی اپنے حاکم کا حکم بدل و جان بجا لانے کے لیے تیار تھا، اور ہرش کا داماد یعنی انتہائے مغرب میں ولبھی راجا اس کے دربار میں حاضر تھا۔

ہرش کے دورے

اس وسیع سلطنت کو قابو میں رکھنے کے لیے ہرش بجائے تنخواہ دار اور لائق افسروں کے خود ذاتی نگرانی پر، جو وہ ان تھک کوششوں سے کیا کرتا تھا، زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ برسات کے موسم کے علاوہ جب کہ تمام جاہ و حشم کی معیت میں سفر کرنا ناممکن اور بدھ مذہب کے قواعد کے خلاف تھا، وہ ہر وقت سفر کرتا، بدکاروں کو سزا اور نیکوں کو انعام و اکرام سے مالا مال کرتا رہتا تھا۔ اس وقت ایسے وسیع اور آرام دہ خیمے جیسے کہ شاہان مغلیہ استعمال کرتے تھے یا اب بھی انگریزی افسروں کے زیر استعمال رہتے ہیں، ایجاد نہ ہوئے تھے اور ہرش کو محض ایک "سفری محل" ہی پر جو درختوں کی شاخوں اور سرکنڈوں سے بنایا جاتا تھا اکتفاء اور قناعت کرنی پڑتی تھی۔ یہ محل ہر منزل پر تعمیر ہوتا تھا اور بادشاہ کے وہاں سے چلے جانے کے بعد جلا ڈالا جاتا تھا۔[12] وہ نہایت شان و شوکت سے سفر کیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ علاوہ اور لوگوں کے سینکڑوں طبل نواز ہوا کرتے تھے جو

اس کے ہر قدم پر سونے کے طبل بجاتے تھے۔ سلطنت میں کسی اور راجا کو اجازت نہ تھی کہ وہ اس قسم کے طبل رکھے۔[۳۱]

ملکی انتظام

کم وبیش دو صدی قبل اپنے پیشرو فاہیان کی طرح ہیون سانگ کو بھی ملکی انتظام پسند آیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ رحم دلی کے اصول پر مبنی ہے۔ محاصل کا سب سے بڑا ذریعہ شاہی املاک کا لگان کم از کم بادی النظر میں پیداوار کے چھٹے حصے کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ عمال کو تنخواہ کے عوض معافیاں دے گئی تھیں۔ رفاہ عام کے منصوبوں پر کام کرنے والوں کو مزدوری دی جاتی تھی۔ محاصل ہلکے تھے۔ جو رقم رعایا سے ذاتی طور پر لی جاتی تھی وہ بھی مقدار میں قلیل ہوتی تھی اور مختلف مذہبی کاموں کے لیے خیرات کا انتظام وسیع پیمانے پر تھا۔

پولیس اور جرائم

شدید جرائم بالکل شاذ ونادر واقع ہوتے۔ مگر بظاہر شاہراہیں ایسی محفوظ و مصئون نہ تھیں جیسی فاہیان کے زمانے میں' کیونکہ ہیون سانگ کو متعدد دفعہ چوروں کا سامنا کرنا پڑا اور اکثر اس کو لوٹ لیا گیا۔ اب جرائم کی سزا معمولی قید تھی۔ مگر یہ قید تبت کی دمغ پر بے رحمانہ ہوتی تھی۔ ہیون سانگ کہتا ہے کہ قیدیوں کو "اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ خواہ وہ مریں یا زندہ رہیں' اور ان کو جاندار تصور نہیں کیا جاتا۔" تمام سزائیں زمانہ گپت سے زیادہ خونی تھیں۔ بعض سخت جرائم اور یہاں تک کہ والدین کی نافرمانی کرنے کی سزا میں ناک' کان' ہاتھ یا پاؤں قطع کر دیئے جاتے تھے۔ مگر بعض اوقات اس سزا کو جلاوطنی سے بدل بھی دیا جاتا تھا۔ معمولی جرائم کی سزا جرمانہ تھی۔ سچائی کو جانچنے کے لیے پانی' آگ' وزن' یا زہر خوارنی کی آزمائشوں پر بہت کچھ یقین کیا جاتا تھا اور ان کو چینی سیاح پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا اور بیان کرتا ہے۔

سرکاری ریکارڈ

ہر ایک صوبے میں خاص افسر تھے جو اس کے تمام واقعات کی یادداشتوں کو قلمبند کیا کرتے تھے اور ان کا فرض تھا کہ "اچھے اور برے' مصائب اور عمدہ ہر قسم کے واقعات کو قلمبند کرتے رہیں۔" بلاشک وشبہ اسی قسم کے ریکارڈز کو کتبہ نویس اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ مگر ہمارے پاس ان کا کوئی نمونہ نہیں پہنچا۔

تعلیم اور علم و ادب

بظاہر تعلیم عام طور پر اور بالخصوص برہمنوں اور بدھ مذہب کے بھکشوؤں میں مروج تھی اور حکومت بھی علم کی قدر افزائی کرتی تھی۔ راجا ہرش نہ صرف علم و فضل کا حامی اور سرپرست بلکہ ایک مشہور و معروف خوش نویس اور مصنف تھا۔ قواعد صرف و نحو کی ایک کتاب کے علاوہ سنسکرت کے تین موجودہ ناٹک اور منظومات کی کئی تالیفات اس کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اور یہ مان لینے میں بھی کسی قسم کا تامل نہ ہونا چاہیے کہ ان کتابوں کے لکھنے میں ضرور کچھ نہ کچھ اس کا حصہ تھا' کیونکہ ہند قدیم میں مصنف بادشاہوں کے نام بہت ملے ہیں۔ ان میں سے ایک ناٹک "ناگانند"' جس میں بدھ مذہب کی ایک روایت مذکور ہے' ہندوستان کے بہترین ناٹکوں میں شمار ہوتا ہے۔ دوسرے ناٹک "رتناولی" (مالا) اور "پریدرسکا" (مہربان بی بی) اگرچہ ایسے تازہ نہیں ہیں جیسے وہ جن کا پہلے مذکور ہوا' لیکن الفاظ اور خیالات کی سادگی کی وجہ سے قابل تعریف خیال کیے جاتے ہیں۔ [۴۴]

بان

راجا ہرش کے دربار میں علم کا سب سے بڑا جوہر بان تھا جو ذات کا برہمن اور ایک تاریخی افسانے کا مصنف تھا' جس میں اس نے اپنے مربی کے کارناموں کا ذکر تعریفی الفاظ میں کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مضمون کے لحاظ سے خشک ہے' لیکن بہت کچھ لیاقت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ طرز تحریر میں اس کتاب میں بان نے بدترین طریقہ استعمال کیا ہے۔ مگر باوجود اس کے اس میں بہت سی قابل تعریف اور روشن عبارتیں بھی ملتی ہیں۔ وہ مصنف جو سپہ سالار سکند گپت کے متعلق یہ کہے کہ "اس کی ناک اتنی لمبی ہے جتنا بادشاہ کا شجرۂ نسب" اس کے متعلق خود قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے تشبیہات و استعارے کیسے ہوں گے۔ لیکن بہرحال وہ اس سے بہتر بھی لکھ سکتا تھا' اور بادشاہ کی حالت نزع کا نقشہ اتارتے وقت اپنی پوری طاقت کا اظہار کرتا ہے: "ناچاری اور بیکسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ درد سے تڑپ نے اس میں حکومت قائم کر لی تھی۔ تباہی اور بربادی نے اسے زیر نگین کر لیا تھا اور سستی اور اضمحلال نے اس میں گھر بنا لیا تھا۔۔۔ وہ موت کی سرحد پر پہنچ چکا تھا۔ آخری سانس کے کنارے پر آ گیا تھا۔ "کار بزرگ" موت کی دہلیز تک پہنچ گیا تھا۔ لمبی نیند سونے والا تھا۔ موت کے ہونٹوں پر جم گیا تھا۔ بولنے بات کرنے سے ناچار' دماغ بیکار' جسم کی تعذیب میں گرفتار تھا۔" اس قسم کی عبارتیں اگرچہ ذوق کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کی نہ ہوں لیکن مصنف کے زور قلم پر گواہی دیتی ہیں۔ [۴۵]

ہرش کے آخری دن

صرف ایک فوجی مہم سے اشوک کی سفاکی کو تسلی ہو گئی تھی۔ مگر ہرش کے لیے، قبل اس سے کہ وہ آخری دفعہ اپنی تلوار ہاتھ سے رکھے، سینتیس برس کی جنگ وجدل ضروری تھی۔ ان میں سے شروع کے چھ برس متواتر میدان جنگ میں ہی گذرے اور باقی میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جنگیں جاری رہیں۔ اس کی آخری جنگ 643ء میں گنجام (کونگوڈ) کے مقام پر ہوئی۔ اس واقعے کے بعد اس فاتح بادشاہ نے اپنے اسلحہ جدا کیے اور اپنے باقی ماندہ دنوں کو امن وامان اور خدا پرستی اور زہد میں گزارنے کی کوشش کی۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اشوک کی تقلید کی کوشش کی تھی اور اسی وجہ اس کے آخری زمانے کے تمام حالات بادی النظر میں محض اشوک ہی کے حالات کا ایک چربہ معلوم ہوتے ہیں۔

ہرش کی ریاضت وعبادت

اس زمانے میں راجا نے بدھ مذہب کی صلح کل تعلیمات پر شدت سے عمل کرنا شروع کیا۔ اول اول اس کا تعلق ہنایان فرقے سے تھا۔ مگر بعد میں اس نے مہایان کے عقائد اختیار کر لیے وہ زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا' اور انسانی زندگی کی بغیر پروا کیے بدھ مذہب کے عقیدہ اہنسا پر عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ "مذہبی نیکی کے بیج بونے میں وہ اس قدر منہمک ہو گیا تھا کہ سونا اور کھانا تک فراموش کر دیا تھا اور تمام ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانور کے ذبح کی ممانعت کی اور اس کے مرتکب کو سزائے موت دینے کا اعلان کیا۔"

مذہب اور مفاد عامہ کے کام

اس نے تمام سلطنت میں اشوک کے نمونے کے رفاہ عامہ کے لیے ایسی عمارتیں تعمیر کرائیں جن سے مسافروں' غریبوں اور بیماروں کو نفع پہنچ سکے۔ شہروں اور دیہاتوں میں دھرم شالے بنائے گئے جہاں کھانے پینے کا انتظام اور طبیب مقرر کیے گئے جن کو حکم تھا کہ صاحب حاجت کو بغیر بخل کیے دوائیں بہم پہنچائیں۔ اس کے علاوہ ہرش نے اشوک کی اس معاملے میں بھی پیروی کی کہ اس نے بہت سی خانقاہیں بدھ اور ہندو مت کے لوگوں کے لیے تعمیر کرائی گئیں۔ اور دریائے گنگا کے کنارے پر ایک ہزار ستوپ بنائے گئے جن میں ہر ایک 100 فٹ بلند تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب عمارتیں بڑی حد تک لکڑی سے تعمیر کی گئی تھی کیونکہ ان کا نشان اب کہیں نہیں ملتا۔ مگر محض ستوپوں کی تعمیر کو' خواہ وہ کیسے ہی کمزور ہوں' باعث ثواب سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ ہرش اور

ہیون سانگ کے زمانے میں بدھ مذہب کا ہندوستان میں ظاہر طور پر زوال ہو رہا تھا' مگر بھکشوؤں کی تعداد اب بھی بے شمار تھی اور خانقاہوں میں (جن کا نام یاتری نے لکھا ہے) کم و بیش دو لاکھ بھکشو مقیم تھے[15] اس کثیر تعداد میں راجا کو ہمیشہ فیاضی اور بخشش کا کافی موقع ملتا رہتا تھا۔

مذہب کی حالت

ساتویں صدی عیسوی کے دوران ہندوستان کے مذہبی عقائد اور عبادات کی جو تصویر ہمعصر مورخین نے کھینچی ہے وہ عجیب و غریب اور دلچسپ تفصیلوں سے پُر ہے۔ ہرش کے شاہی خاندان کے افراد مذہب کے معاملے میں اپنے ذاتی رجحان پر کھلم کھلا عمل کرتے تھے۔ اس کے جد اعلیٰ پشپابھوتی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی شیو کا پرستار اور باقی اور تمام دیوتاؤں سے متنفر تھا۔ اسی طرح ہرش کا باپ بھی سورج کی پرستش کیا کرتا تھا اور ہر روز "سرخ کنول کے پھولوں کا ایک گلدستہ خالص لعل کے گلدان میں رکھ اپنے دل کے اسی رنگ کے خون کے ساتھ" اس کی بھینٹ چڑھایا کرتا تھا۔ ہرش کا بڑا بھائی اور بہن پکے اور راسخ الاعتقاد بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ ہرش نے خاندان کے تینوں دیوتاؤں شیو' سورج اور بدھ[16] کے مابین اپنی عبادت و ریاضت تقسیم کر دی تھی اور تینوں کی عبادت کے لیے بیش بہاء عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ مگر زندگی کے آخری دنوں میں بدھ مذہب ہی کے عقائد نے اس کے دل میں سب سے زیادہ گھر کر لیا تھا۔ چینی "عالم قوانین" کی فصاحت و بلاغت کا اس پر یہ اثر ہوا کہ اس نے سمتیا فرقے کے پرانے ہنایان کے عقائد کو ترک کر کے مہایان عقائد اختیار کر لیے۔

شاہی انتخاب مذہب

شاہی خاندان کے انتخاب مذہب کا یہ طریقہ دراصل اس زمانے کے عام مذہبی خیالات کا پرتو اور نتیجہ تھا۔ اگرچہ دریائے گنگا کے میدان میں بدھ مذہب کی وہ حیثیت اب نہیں رہی تھی جو اس سے قبل کسی زمانے میں تھی' لیکن یہ اب بھی باوقعت لوگوں کے دلوں میں موثر تھا۔ جین مت شمالی ہند میں کبھی عام طور پر مروج نہ ہوا تھا اور اگرچہ بعض مقامات بالخصوص ویشالی اور مشرقی بنگال میں اس کا زور و شور اب تک قائم تھا' مگر اس کی ایسی حیثیت نہ تھی کہ وہ بدھ مت یا پرانوں کے ہندو مت کا حریف ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ پُران مت' جو ہندوؤں کے مذہب ہی کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے' اب بالکل بالاستقلال قائم ہو چکی تھی اور سب سے قدیم پُران اس وقت مقدس اور قدیم کتب تسلیم کی جاتی تھیں۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی آبادی کا بڑا حصہ پرانوں کے دیوتاؤں ہی کی پرستش کرتا تھا اور ہر مرد و عورت کو اختیار تھا کہ شیو' سورج اور وشنو

وغیرہ میں سے جس کو وہ ذاتی خیالات کی بناء پر مرجح سمجھے اختیار کرلے۔ عموماً مختلف مذاہب کے پیرو پہلو بہ پہلو امن واماں سے زندگی بسر کرتے تھے' اور اس میں بھی شک وشبہ نہیں کہ بادشاہ کی طرح اور بہت سے لوگ بھی خدا کے فضل وکرم کے حصول کو یقینی سمجھ کے عوام کے دیوتاؤں کے سامنے درجہ بدرجہ سر جھکاتے تھے۔

ششانک کی مذہبی ایذاءرسانی

اگرچہ مذہبی رواداری اور صلح وہم آہنگی عام طور پر پھیلی ہوئی تھی مگر اس قاعدہ کلیہ میں کبھی کبھی رخنہ بھی پڑتا تھا۔ وسط بنگال کا راجا ششانک (جس کا ذکر اس سے قبل بھی ہرش کے بھائی کو دغابازی سے قتل کرنے کے ضمن میں آچکا ہے اور جو غالباً خاندان گپت کا ایک رکن تھا۔) شیو دیوتا کا پرستار تھا۔ اس کو بدھ مذہب سے سخت نفرت تھی اور وہ ہمیشہ اسے بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے پر تلا رہتا تھا۔ بودھ گیا کے مقام سے اس نے اس مقدس بودھی درخت کو اکھاڑ کر جلا دیا جس پر روایات کے مطابق راجا اشوک نے بے انتہاء عبادت کی تھی۔ پاٹلی پتر کے مقام پر اس نے اس پتھر کو ریزہ ریزہ کردیا جس پر بدھ کے قدم کے نشان بنے ہوئے تھے' خانقاہوں کو تباہ کرڈالا اور بھکشوؤں کو دربدر کردیا۔ ان حرکات کا اثر نیپال کی پہاڑیوں کے دامن تک پہنچا۔ یہ واقعات ایسے ہیں کہ ہیون سانگ کی شہادت سے' جو ان کے تیس یا چالیس برس بعد یہاں آیا تھا' ان کے ثبوت کو اور زیادہ تقویت ہوتی ہے اور غالباً وہ 600ء میں واقع ہوئے تھے۔ قلیل مدت کے بعد مگدھ کے مقامی راجا پورن ورمن نے' جو اشوک کا آخری جانشین کہا جاتا ہے' بودھی درخت کو نئے سرے سے نصب کرادیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو اسی وجہ سے اس چیز سے خاص محبت بھی ہوگی جس کی تعظیم اس کا عظیم الشان جد اعلیٰ کیا کرتا تھا۔

مذہبی تبغض

ان تفصیلات سے' جن کا ذکر ہیون سانگ اور اس کے سوانح نویس نے کیا ہے' ثابت ہوتا ہے کہ بعض اوقات بدھ مذہب کے دو زبردست فرقوں میں سخت مذہبی بغض وعناد پھیل جاتا تھا اور اس کے علاوہ پرانے ہندوؤں کے دلوں میں بدھ مذہب کو مورد عنایات شاہی دیکھ کر آتش بغض وحسد سلگنے لگتی تھی۔ اس لیے یہ بالکل صریح ہے کہ ہند قدیم میں مذہبی رواداری کے متعلق تمام عام خیالات کو ذرا سوچ سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔ حکومت کی طرف ایذاءرسانی اور عوام کا جوش وخروش اگرچہ اکثر نہیں تو کم از کم بعض اوقات بروئے کار آجاتا تھا اور مذہبی وجوہ سے بغض عناد کا عام چرچا ہوجاتا تھا۔

مناظرے

خود ہرش بھی بعض اوقات کامل مذہبی رواداری اور مساوات کے توڑنے کا مرتکب ہوتا تھا۔ اکبر اور ہندوستان کے دیگر بادشاہوں کی طرح اس کو بھی حریف اور مدمقابل علماء کے مناظرے سننے کا شوق تھا۔ چینی سیاح کے آنے کے بعد اس نے برضاورغبت وہ تمام دلائل وبراہین سنے جو سیاح نے مہایان فرقے کی عظمت وترجیح کے متعلق بیان کیے۔ ان عقائد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے قبل بالکل ناآشنا تھا۔ قدیم ہندی سوسائٹی میں عورتوں کے پردے کی ان پابندیوں سے 'جس کا رواج مسلمانوں میں پایا جاتا ہے' آزادی کی ایک دلچسپ مثال اس واقعے سے ملتی ہے کہ بادشاہ کی بیوہ بہن سیاح کے وعظ ودرس کو سننے کے لیے بادشاہ کے پہلو میں بیٹھتی تھی اور ان کے سننے سے جو خوشی اس کو ہوتی وہ اس کا اظہار نہایت صاف لفظوں میں کیا کرتی تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا' ایک چینی کتاب کا تو یہ بیان ہے کہ ہرش اپنی بہن کی معیت وشرکت سے سلطنت کا نظم ونسق انجام دیتا تھا۔[18]

ہرش کا اعلان

مگر ہرش نے اس بات کا مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اس کے مہمان عزیز کو مناظرے میں شکست نہ ہونے پائے۔ جب چینی سیاح کے عقائد کے مناظرے کے لیے حریف علماء کو دعوت دی گئی تو مناظرے کے قواعد وضوابط بہت کچھ انصاف پر مبنی نہ تھے۔ جب ہرش کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے حریف علمائے مذہب کے ہاتھوں ہیون سانگ کی جان جوکھوں میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے تو اس نے ایک اعلان شائع کیا جس کے آخر میں اطلاعاً تحریر تھا:

> "اگر کوئی شخص "ماہر قوانین" کو ہاتھ لگائے گا یا اس کو ایذاء پہنچائے گا تو اس کو فوراً سزائے موت دی جائے گی۔ جو کوئی اس کے برخلاف کچھ کہے گا اس کی زبان کاٹ ڈالی جائے گی۔ مگر وہ تمام لوگ جو اس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں' وہ میری امان میں ہیں اور ان کو اس اعلان سے کسی طرح خوف زدہ نہ ہونا چاہیے۔"

اس کے بعد سیاح کا سوانح نگار سادہ لوحی سے لکھتا ہے:

> "اس وقت سے باطل پرست لوگ الگ اور بالکل غائب ہو گئے۔ اس طرح جب اٹھارہ دن گذر گئے تو کوئی بھی ایسا باقی نہ رہا کہ مناظرے کے لیے رضامند ہوتا۔"[19]

قنوج کی مجلس

راجا ہرش ہیون سانگ سے بنگال کے علاقے میں سفر کے موقع پر سب سے پہلے ملا اور اس کے مکالمات سے اس درجے متاثر ہوا کہ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنے "دارالسلطنت قنوج میں ایک خاص مجلس سیاح کی تعلیمات کے اعلان و اشاعت کی خاطر منعقد کرے گا۔" ہرش ایک بڑی تعداد کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہرش دریائے گنگا کے جنوبی کنارے پر روانہ ہوا۔ اور مقابل کے کنارے پر اس کا حلیف کامروپ کا راجا کمار اس سے ذرا تھوڑی تعداد کو ہمراہ لیے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ چلتے ہرش کمار اور تمام خدم و حشم نوے دن کے سفر کے بعد قنوج پہنچے اور وہاں فروری یا مارچ 643ء میں اقامت پذیر ہوئے۔ [54] ہرش کا استقبال کامروپ کے راجا کمار جو اس کے ساتھ ہی ساتھ آیا تھا' مغربی ہند کے ولبھی کے راجا (جو ہرش کا رشتہ دار تھا) اور اٹھارہ دوسرے باج گذار راجاؤں نے کیا۔ اس کے علاوہ چار ہزار بھکشو جن میں ایک ہزار کے قریب بہار کی نالند خانقاہ سے آئے' تین ہزار جین اور رہندو اس کی پیشوائی کے لیے آئے۔

رسوم

توجہ کے قابل خاص چیز ایک زبردست خانقاہ تھی جو اس مصرف کے لیے دریائے گنگا کے کنارے پر تعمیر کی گئی تھی۔ یہاں بدھ کا ایک طلائی بت' جو بلندی میں راجا کے قد کے برابر تھا' ایک سو فیٹ بلند برج میں رکھا ہوا تھا۔ اسی قسم کا مگر نسبتاً بہت چھوٹا تین فیٹ بلند بت ہر روز بڑے طمطراق سے گشت کے لیے اس طرح نکالا جاتا تھا کہ بیس راجا اور تین ہاتھیوں کی ایک قطار اس کے جلو میں ہوتی تھی۔ شامیانے کو خود ہرش اپنے ہاتھ سے شکر دیوتا کے لباس میں ملبوس اٹھاتا تھا' اور اس کا حلیف کامروپ کا راجا کمار (جو تمام حاضرین راجاؤں سے مرتبے میں سب سے بڑا تھا) برہما کا لباس پہنے ایک سفید چنور سے اس کی مکھیاں جھلتا تھا۔ راستے میں چلتے چلتے راجا ہر طرف "سہ رتن" یعنی بدھ' مذہب اور جماعت کے نام پر موتی' طلائی پھول اور دیگر قیمتی اشیاء نچھاور کرتا جاتا تھا۔ آخر میں ایک خاص قربان گاہ کے سامنے اپنے ہاتھ سے اس بت کو دھوتا اور کندھے پر اٹھا کر مغربی برج کی طرف لے جاتا۔ وہاں پہنچنے پر ہزار ہا ریشمی خلعتیں مرصع بہ جواہر اس پر سے خیرات اتارتا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک عام مناظرہ منعقد کیا جاتا جو ایسا ہی یکطرفہ ہوتا جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔

ہرش کے قتل کی کوشش

یہ تمام رسوم بہت دنوں تک جاری رہیں اور آخر چوکنا اور ہوشیار کرنے والے واقعات پر جا کر ختم ہوئیں۔ دفع الوقتی کے لیے جو خانقاہ بصرف زر کثیر بنائی گئی دفعتہ" اس میں آگ لگ گئی اور اس کا بڑا حصہ برباد ہو گیا۔ لیکن جب خود راجا نے اس کے فرو کرنے میں مدد دینی شروع کی تو آگ جلدی بجھ گئی اور دیندار لوگوں نے اس کو اس کا معجزہ قرار دیا۔

ہرش بہت سے شہزادوں اور راجاؤں کو ساتھ لے کر اس تمام نظارے کو دیکھنے کے لیے ستوپ کی چھت پر چڑھا اور وہاں سے نیچے اتر ہی رہا تھا جب اچانک ایک مخبوط الحواس شخص خنجر ہاتھ میں لیے اس پر جھپٹا اور اس کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ قاتل کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ جب بادشاہ نے بذات خود اس پر جرح شروع کی تو اس نے اقبال کیا کہ اسے بعض ایسے مرتدین نے شہ دے کر اس جرم کے ارتکاب پر آمادہ کیا تھا جو بدھ مذہب والوں کے مورد عنایات شاہی ہونے پر حسد کرتے تھے۔ اس پر پانچ سو مشہور برہمنوں کو قید کر لیا گیا' اور جب ان سے "جکڑ بند کر کے" سوال و جواب کیے گئے تو انہوں نے اقبال کیا کہ اپنے حسد کی آگ بجھانے کے لیے انہوں نے خانقاہ کو آگ لگائی تھی' اور اس وقت جو افراتفری مچے اس سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ اقبال جرم بلاشک وشبہ تعذیب کے ذریعے سے حاصل کیا گیا تھا اور غالباً بالکل غلط تھا۔ مگر خواہ غلط ہو خواہ صحیح اس کو تسلیم کر لیا گیا اور اس کی بناء پر سازش کے تمام سرغنوں کو سزائے موت دی گئی اور کم وبیش 500 برہمنوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔

643ء: پریاگ کے مقام پر خیرات

قنوج میں کل کام ختم ہو جانے کے بعد ہرش نے چینی سیاح کو اپنے ساتھ دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم پر پریاگ (الہ آباد) کے مقام پر چلنے کے لیے دعوت دی تاکہ وہ وہاں کی موثر اور پرشکوہ رسم کا بھی معائنہ کر سکے۔ اگرچہ سیاح وطن کی طرف واپس روانہ ہونے کا خواہش مند تھا' لیکن پھر بھی وہ اس دعوت سے انکار نہ کر سکا اور اپنے بادشاہ میزبان کے ساتھ مقام اجتماع پر چلا گیا۔

ہرش نے اس کو بتلایا کہ گذشتہ تیس برس سے اپنے آباواجداد کی رسم کے مطابق اس کا یہ معمول رہا ہے کہ ہر پانچویں برس ان دونوں دریاؤں کے مقام اتصال پر ریتی میں ایک زبردست مجلس منعقد کیا کرتا تھا اور وہاں تمام جمع شدہ خزائن وذخائر کو محتاجوں' غریبوں اور ہر مذہب کے علماء میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ موجودہ موقعہ (643ء) اس سلسلے میں چھٹا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دستور اس وقت تک شروع ہوا تھا جب تک کہ ہرش نے شمالی ہند کو زیرنگین نہیں کر لیا

روئداد عمل

اس مجلس میں تمام باج گذار راجا حاضر تھے اور عوام کی ایک بڑی تعداد' جو تخمیناً 5 لاکھ بیان کی جاتی ہے اور جس میں غریب' یتیم اور محتاج ان برہمنوں اور سنیاسیوں کے علاوہ شامل تھے جن کو خاص اسی مقصد کے لیے شمالی ہند کے اطراف سے بلایا گیا تھا۔ مجلس کا کام پچھتر روز تک جاری رہا اور غالباً اپریل کے آخر میں جا کر ختم ہوا۔ کارروائی کا آغاز ایک شان دار جلوس کے ساتھ کیا گیا جس میں تمام راجا مع اپنے خدم و حشم کے شامل تھے۔ مذہبی رسوم میں اس زمانے کے عقائد و خیالات کا ایک عجیب و غریب پرتو پایا جاتا تھا۔ پہلے دن بدھ کی مورت ایک ریتی میں ایک مسقف عمارت میں رکھی گئی اور بیش بہاء کپڑے اور دوسری قیمتی چیزیں تقسیم کی گئیں۔ دوسرے اور تیسرے دن علی الترتیب سورج اور شیو کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ مگر ان کی خیرات بدھ کی خیرات کی مقدار سے نصف تھی۔ چوتھا دن بدھ مذہب کے دس ہزار مخصوص بھکشوؤں کو خیرات اور تحائف دینے میں صرف کیا گیا۔ ان میں سے ہر ایک نے سو اشرفیاں' ایک موتی اور سوتی لباس' اور ان کے علاوہ بہت عمدہ غذائیں' شربت' پھول اور عطریات تحفے میں پائے۔ اس کے بعد کے بیس دنوں میں بے شمار برہمنوں کو شاہی عطیات سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ آئے جن کو چینی مصنف ملحدین کہتا ہے۔ یہ جین اور دوسرے مختلف فرقوں کے پیرو تھے اور دس دن تک ان میں خیرات تقسیم ہوئی۔ اتنا ہی زمانہ ان فقیروں میں خیرات کرنے میں لگا جو دور دراز مقامات سے آئے تھے۔ ایک مہینہ غریبوں' محتاجوں اور یتیموں کو امداد پہنچانے اور خیرات تقسیم کرنے میں صرف ہوا۔

خیرات کی مقدار

"اس تمام عرصے میں پانچ سال کی جمع پونجی سب کی سب صرف ہو گئی اور سوائے گھوڑوں' ہاتھیوں اور فوجی اسلحہ اور ساز و سامان کے' کچھ باقی نہ رہا' جن کی ضرورت امن و امان کے قائم رکھنے اور سلطنت کی حفاظت کی وجہ سے پڑتی تھی۔ ان کے علاوہ بادشاہ نے نہایت کشادہ دلی سے بلا رد و قدح اپنے جواہرات اور مال و اسباب' کپڑے' گلوبند' بالے' کنگن' مالے' گلے میں پہننے کے زیوارت اور سر پر لگانے کے جواہرات سب کچھ دے ڈالے۔ جب سب کچھ دیا جا چکا تو اس نے اپنی بہن (راجیا سری) سے ایک پرانا لباس مانگ کر پہنا اور "وہ عالم کے بدھوں کی" پرستش کی اور خوش ہوا کہ اس کا خزانہ نیک کاموں میں خرچ ہوا۔"

ہیون سانگ کی رخصت

اس کے بعد یہ عجیب و غریب مجلس ختم ہو گئی جو بادی النظر میں بہت کچھ اس بھیڑ بھڑ کے کے میلے کے مشابہ ہو گی جو آج کل بھی اس مقام پر لگتا ہے۔ ہیون سانگ کو دس دن اور روکنے کے بعد واپس جانے کی اجازت دی گئی۔ راجا اور کمار راجا نے کثیر مقدار میں سونا اس کے سامنے پیش کیا مگر اس نے کمار راجا کی دی ہوئی ایک پوستین کی ٹوپی کے سوا اور کچھ قبول نہ کیا۔ اگرچہ سیاح نے اپنے ذاتی منافعے کے لیے روپیہ لینے سے سراسر انکار کیا' لیکن چین کی طرف اپنے دشوار اور مشکل سفر کے اخراجات کے لیے رقم قبول کرنے میں بالکل تامل نہ کیا اور اس کا انتظام بھی نہایت کشادہ روئی سے کیا گیا۔ چنانچہ ایک ہاتھی پر لاد کر تین ہزار طلائی اور دس ہزار نقرئی سکے اس کے ہمراہ کر دیئے گئے۔ ادھت نامی راجا کو حکم ہوا کہ ایک دستے کو ساتھ لے کر سیاح کو سرحد تک پہنچا آئے۔ آہستہ آہستہ راستہ طے کرنے اور منازل میں طویل قیام کرنے کے بعد تقریباً چھ ماہ کے عرصے میں راجا اپنے فرض سے سبکدوش ہوا اور اپنے بادشاہ کے مہمان کو امن و امان سے پنجاب کے مشرق میں جالندھر کے مقام تک پہنچا گیا جہاں ہیون سانگ نے ایک ماہ قیام کیا۔ یہاں سے وہ ایک نئے بدرقہ کے ساتھ روانہ ہوا اور کوہستان نمک کو بمشکل پار کرنے کے بعد دریائے سندھ کو عبور کیا' اور انجام کار پامیر کی سطح مرتفع پر سے گذرتا اور ختن میں سے ہوتا ہوا 645ء کے موسم بہار میں اپنے وطن چین پہنچ گیا۔ [1]

اس کی موت

سیاح خالی ہاتھ وطن واپس نہ گیا تھا۔ اتفاقات یا رہزنی کی وجہ سے متعدد مرتبہ نقصانات برداشت کرنے کے باوجود وہ بدھ کے جسم کے ڈیڑھ سو ریزے بطور تبرکات اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہوا۔ ان کے علاوہ سونے اور چاندی کی بنی ہوئی بدھ کی چند مورتیں اور 657 قلمی نسخے' جو بیں گھوڑوں پر لدے ہوئے تھے' اس کے ساتھ آئے۔ اس کی باقی ماندہ زندگی ان ہی کتابوں کو ترجمے کرنے میں صرف ہوئی اور 661ء میں جب اس نے آخر مرتبہ قلم ہاتھ سے رکھا تو وہ چوہتر کتابوں کو ترجمہ مکمل کر چکا تھا۔ اس کے بعد وہ مزید تین سال عزت و احترام کے ساتھ زندہ رہا اور جب مرا تو ایسی شہرت اپنے پیچھے چھوڑ گیا کہ کبھی کوئی بدھ مذہب کا عالم اس پر سبقت نہ لے جا سکا۔

647ء: ہرش کی موت

ہیون سانگ کے سفرنامے اور اس کے سوانح نگار کے صفحوں میں راجا ہرش کی زندگی کے آخری واقعات کا پتہ ملتا ہے۔ وہ بھی اپنے دوست کے رخصت ہونے کے تھوڑی مدت بعد ہی 646ء کے آخر یا 647ء کے شروع میں مرگیا۔

چین سے تعلقات

اپنی زندگی کے زمانے میں اس نے سلطنت چین کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کیے۔ ایک برہمن سفیر جس کو 641ء میں اس نے چین کے شہنشاہ کے پاس روانہ کیا تھا 643ء میں واپس آیا اور اس کے ہمراہ ایک چینی سفارت بھی تھی جو ہرش کی مراسلت کا جواب لے کر آئی تھی۔ یہ سفارت کافی مدت تک ہندوستان میں رہی اور 645ء سے پہلے واپس نہیں گئی۔ اس کے دوسرے سال ونگ ہیون تسے کی سرکردگی میں، جو پہلی سفارت کے موقع پر افسر اعلیٰ کا مددگار تھا، تین سواروں کی معیت میں ایک اور سفارت ہندوستان کی طرف روانہ کی۔ 647ء کے شروع یا غالباً 646ء کے اوخر میں راجا لاوارث مرگیا۔ اس کی زبردست شخصیت کے غائب ہو جانے سے تمام ملک میں ابتری اور بے چینی پھیل گئی اور قحط کی وجہ سے اس میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔

متوفی بادشاہ کے ایک وزیر ارجن یا اردن نے سونے کے تخت پر قبضہ کرلیا اور "وحشیوں" کی ایک فوج لے کر چینی سفارت کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ فوج کے لوگوں کو قتل وقید کیا گیا اور سفارت کے مال واسباب کو لوٹ لیا جس میں وہ تحائف بھی شامل تھے جو ہندی راجاؤں کی طرف سے دیئے گئے تھے۔ مگر خوش قسمتی سے دو سفیر ونگ ہیون تسے اور اس کا مددگار رات کے وقت نیپال کی سرحد میں بھاگ گئے۔

چینی سفیر کے ہاتھوں غاصب کی شکست

تبت میں اس وقت مشہور و معروف بادشاہ سرانگ۔ تسن۔ گمپو برسر حکومت تھا اور اس نے چین کی ایک شہزادی سے شادی کی تھی۔ اس بادشاہ نے ان دونوں پناہ گزینوں کی مدد کی اور بارہ سو چیدہ سوار مع نیپال کی 7000 امدادی فوج کے (کیونکہ اس زمانے میں نیپال تبت کا باج گذار تھا) ان کو دے کر روانہ کیا۔ اس مختصری فوج کو لے کر ونگ۔ ہیون۔ تسے میدان میں اترا اور تین ہی دن کے محاصرے کے بعد اس نے ترہت کے صدر مقام پر بلہ کرکے قبضہ کرلیا۔ محصور فوج میں سے تین ہزر قتل کیے گئے اور دس ہزار قریب کے دریا (غالباً باگمتی) میں غرق

ہو گئے۔ ارجن مفرور ہو گیا اور ایک نئی فوج جمع کر کے پھر جنگ کا قصد کیا، مگر اس کے بعد پھر شکست فاش کھائی اور گرفتار ہوا۔ فاتح نے فوراً ایک ہزار قیدیوں کا قتل عام کیا اور بعد کی ایک جنگ میں تمام شاہی خاندان کو قید کیا اور بارہ ہزار لوگوں کو گرفتار کیا اور تیس ہزار سے زیادہ گھوڑے اور مویشی اس کے ہاتھ آئے۔ اس مہم کے عرصے میں 580 قلعہ بند شہروں نے اس کی اطاعت قبول کی اور مشرقی ہند کے راجا کمار نے، جو چند سال قبل ہی ہرش کی مجلسوں میں شریک رہا کرتا تھا، فاتح فوج کے لیے کثیر تعداد میں مویشی اور فوجی سامان سازو سامان بہم پہنچایا۔ ونگ۔ ہیون۔ تسے غاصب کو اپنے ساتھ ہی چین لیتا گیا اور وہاں اس کارنامے کے بدلے میں اس کی عزت افزائی کی گئی۔ آخر میں 650ء میں جب تنا۔ تسنگ مرا اور اس کا مقبرہ تیار ہونے لگا تو عمارت کے دروازے پر تبت کے بادشاہ سرانگ۔ تسن۔ گمپو اور اس غاصب (؟) ارجن کے بت نصب کیے گئے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے تک ترہت تبت ہی کے ماتحت رہا جو اس وقت ایسی قوی سلطنت تھی کہ چین کی مدمقابل مانی جاتی تھی۔ اس طرح اس عجیب و غریب حکایت کا خاتمہ ہوا جس سے اگرچہ ماہرین علم قدیم برسوں سے واقف تھے، مگر اب تک وہ مورخین ہند کی نظر سے اوجھل تھی۔

ونگ۔ ہیون۔ تسے کی تیسری مرتبہ آمد

ایک مرتبہ اور ونگ۔ ہیون۔ تسے اپنے پرانے کارناموں کے مقامات کی طرف آیا کیونکہ 657ء میں اس کو اس کے بادشاہ نے بدھ مذہب کے مقدس مقامات میں خلعتیں بانٹنے کے لیے نامزد کیا۔ وہ براہ لہاسہ، جو اس وقت بالکل کھلا ہوا تھا اور اس سے قبل بہت سے چینی سیاحوں نے اسے استعمال بھی کیا تھا، نیپال ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا اور ویشالی، بودھ گیا اور دوسرے مقدس مقامات کی زیارت کے بعد کپس یا شمالی افغانستان ہوتا ہوا ہندوکش اور پامیر کے راستے سے وطن واپس چلا گیا۔ [۲۲]

کشمیر ساتویں صدی میں

ہیون سانگ کے بیانات سے ہرش کی سلطنت کی حدود سے باہر ساتویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی حالت پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ شمال میں کشمیری طاقت بہت بڑھ گئی تھی اور اس نے ٹیکسلا، سنہ پور (کوہستان نمک) اور دوسری پہاڑی ریاستوں [۲۳] کو زیر نگین کر کے اپنا باج گذار کر لیا تھا۔

پنجاب

دریائے سندھ اور بیاس کے درمیان پنجاب کا بڑا حصہ ایک سلطنت میں شامل تھا جس کو سیاح تسہ۔ کیا یا چیہ کا کہتا ہے۔ اس کا صدر مقام ایک بے نام و نشان شہر تھا جو ساکل (سیالکوٹ) کے پاس تھا جو کسی زمانے میں مہر کل کا مستقر رہ چکا تھا' اور پو۔ فا۔ تو نامی ایک ملک' جس سے غالباً ملتان کے شمال مشرق میں جموں مراد ہے' اسی سلطنت کے ماتحت تھے۔

سندھ

اس وقت سندھ میں عجیب و غریب بات یہ تھی کہ وہاں کا راجا ذات کا شودر اور بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ وہاں بھکشوؤں کی زبردست تعداد تھی جن کو ملک کی طرف سے مدد پہنچتی تھی۔ یہ تعداد تخمیناً 10000 تھی۔ مگر جیسی تعداد تھی ویسی ان کی صفات نہ تھیں' کیونکہ ان دس ہزار میں بڑی تعداد کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ کاہل الوجود' عیاش اور عشرت پسند تھے۔ دریائے سندھ کا تکونی علاقہ جس کو سیاح او۔ تیئن۔ پو۔ چی۔ لو کہتا ہے' سندھ کی سلطنت ہی کا ایک صوبہ تھا۔ [۲۴]

سندھ کا دار السلطنت الور

دوسرے ذرائع سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی سلطنت' جس کے ماتحت بلوچستان کا علاقہ بھی تھا' اس زمانے میں دولتمند اور قوی تھی اور آج کل کے زمانے کی بہ نسبت کہیں زیادہ سرسبز و شاداب اور معمور تھی۔ اس میں کوہستان نمک سے لے کر سمندر تک دریائے سندھ کی تمام وادی شامل تھی۔ اصلی ہندوستان اور اس کے درمیان "گم شدہ دریا" یعنی ہاکرا یا اوہند' جس کو ہیون سانگ سن تو نے لکھا ہے' حد فاصل تھا۔ اس کا دار السلطنت جس کا نام سیاح نے پی۔ شن۔ پو۔ پو۔ لو لکھا ہے ہاکرا کے مغربی کنارے پر ارور یا الور تھا۔ یہ ایک قلعہ بند اور وسیع شہر تھا جس کے کھنڈرات اب بھی ضلع سکھر میں روہڑی کے مقام سے پانچ میل جنوب مشرق میں پائے جاتے ہیں۔ ایک حکایت کے مطابق اس شہر کو 800ء میں سیف الملک نامی ایک تاجر نے اس طرح برباد کیا کہ ایک خوبصورت لڑکی کو عیاش راجا کے پنجے سے چھڑانے کے لیے دریا کا رخ اس طرف بدل دیا اور شہر کو تباہ کر دیا۔

راجگان سندھ

ہیون سانگ نے شودر ذات کے بدھ مذہب کے راجا کا ذکر کیا ہے۔ وہ یقیناً دیوجی کا بیٹا سہرس

رائے تھا جس کے بعد اس کا بیٹا ساہسی اس کا جانشین ہوا۔ سہرس رائے کے زمانے میں ہی عربوں کی فاتح اور منصور فوج اپنے تازہ جوش و خروش کے ساتھ مکران (بلوچستان) میں داخل ہوئی۔ سہرس رائے نے ان کا مقابلہ کیا' شکست کھائی اور مارا گیا۔ اس کے تقریباً دو برس بعد 644ء کے آخر میں حملہ آوروں نے مستقل طور پر مکران پر قبضہ کر لیا اور راجا کے بیٹے اور جانشین ساہسی نے بیرونی دشمن کا مقابلہ کیا تو اس کا حشر وہی ہوا جو اس سے پہلے اس کے باپ کا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد عنان حکومت چچ نامی ایک برہمن وزیر کے ہاتھ میں گئی جس نے چالیس برس تک حکومت کی۔ سندھ پر عربوں نے 710ء یا 711ء (92ھ) میں محمد ابن قاسم کے ماتحت حملہ کیا اور اس نے جون 712ء میں چچ کے بیٹے راجا داہر کو شکست دے کر قتل کیا۔ اس سنہ کے بعد سندھ کی ہندو سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور یہ صوبہ مستقل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔[۲۵]

وسط ہند

اجین اور وسط ہند کی دوسری سلطنتوں کے راجہ' جو غالباً کم و بیش ہرش کے ماتحت تھے' برہمنوں کی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ اجین کے علاقے میں بڑی گنجان آبادی تھی اور بدھ مذہب کے پیروؤں کی تعداد بہت کم تھی۔ بہت سی خانقاہیں بالکل ویران اور غیر آباد پڑی ہوئی تھیں اور صرف تین یا چار آباد تھیں جن میں تقریباً تین سو بھکشو رہتے تھے۔ اس علاقہ میں جس کو اشوک کی زندگی سے خاص تعلق اور سانچی کی عظیم الشان عمارات سے خاص وقعت حاصل تھی' بدھ مذہب کا یہ زوال و انحطاط ایک عجیب و غریب واقعہ ہے جو اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔

کامروپ

کامروپ یا آسام کا بھاسکر ورمن یا کمار راجا بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ذات کا برہمن تھا اور باوجودیکہ ہر ایک قسم کے علماء کی سرپرستی کے لیے تیار رہتا تھا' گر بدھ مذہب سے اس کو علاقہ نہ تھا۔ لیکن شمالی ہند کے راجا ادھیراجہ کا وہ اس درجہ مطیع تھا کہ ہرش کے احکام کی خلاف ورزی نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہرش کی تمام رسوم کی ادائیگی میں وہ برابر شریک رہا تھا۔[۲۶]

کلنگ

کلنگ کا علاقہ جس کی فتح سے اشوک کو نو سو برس پہلے اس قدر روحانی تکلیف اٹھانی پڑی تھی' اب بالکل غیر آباد پڑا تھا اور اس کا بڑا حصہ گھنے جنگل سے ڈھکا ہوا تھا۔ سیاح نے اپنی دل آویز

طرز تحریر میں لکھا ہے کہ "قدیم زمانے میں کلنگ کی سلطنت میں گنجان آبادی تھی۔ ان کے ہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور ان کی رتھوں کے دھرے ایک دوسرے سے ٹکرایا کرتے تھے اور جب وہ اپنی آستینیں اٹھاتے تھے تو اچھا خاصہ ایک خیمہ بن جاتا تھا۔" اس تباہی اور بربادی کی وجہ روایتاً ایک ناراض ولی کی بددعا تھی۔

دوسری سلطنتیں

کشمیر' نیپال اور مغرب وجنوب کی سلطنتوں کا حال ہیون سانگ نے لکھا ہے۔ اس کا ذکر آئندہ ابواب میں اپنی اپنی جگہ آئے گا۔

ہرش کی موت کا اثر

ہرش کی موت نے نفاق وشقاق کی ان تمام قوتوں کا شیرازہ توڑ دیا جو ہندوستان میں ہر وقت موجود اور کام کے لیے مستعد رہتی ہیں۔ ہند کے ٹوٹنے کا جو فطری اثر ہوا کرتا ہے وہی ہوا۔ تمام سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہوگئی جن کی حدود کبھی مستقل نہ ہوئی تھیں اور ہر ایک ہمیشہ دوسری سے دست وگریباں رہتی تھی۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں جب ہندوستان اول اول یورپی اقوام کے پیش نظر ہوا تو اس کی یہ حالت تھی اور یہی حالت اس کی ہمیشہ رہی ہے' سوائے مقابلتاً" مختصر زمانوں کے جب کہ کسی قوی شوکت مرکزی حکومت نے باہم مخالف اجزاء و عناصر ملکی کو اپنی گردشوں اور انقلابات کو ختم اور کسی زبردست طاقت کی فرماں برداری کرنے پر مجبور کیا۔

ہندوستان کی طبعی حالت

ہنوں کی یورش اور حملے کی وجہ سے ملک نے اس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کی تھیں کہ ہرش کی خودمختارانہ حکومت کو غنیمت اور نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔ جب وہ مرا تو بیرونی حملہ آوروں کے آنے کی وجہ سے ملک میں جو ناسور پیدا ہوگئے تھے ان کا اندمال ہو چکا تھا۔ اور بیرونی حملہ آوروں کے خوف سے نجات کلی کے احساس نے اب لوگوں کو کسی نجات دہندہ سے بالکل مستغنی کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی موت کے بعد ہندوستان نے اپنی طبعی حالت کی طرف عود کیا اور بدانتظامانہ خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔

پانچ صدی تک بیرونی حملوں سے کلی نجات

آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کے سندھ اور گجرات میں محض مقامی حملوں کے سوا

ہندوستان کا اندرونی حصہ 528ء میں مہر کل کی شکست سے لے کر گیارہویں صدی کے اوائل میں محمود غزنوی کی یورشوں تک تقریباً پانچ صدی کے دوران کسی زبردست بیرونی حملوں سے بالکل بے خطر رہا' اور اس عرصے میں اس کو آزادی حاصل تھی کہ اپنی قسمت کا فیصلہ اپنے ہی ہاتھوں کر لے۔

انتظام مملکت' علم وادب اور مذہب

سیاسیات میں کوئی ارتقاء واقع نہیں ہوا' کوئی بادشاہ ایسا فرزانہ اور لائق پیدا نہ ہوا جو چندر اگپتا موریا' اشوک یا اس سے کم شاہان گپت اور قنوج کے راجا ہرش کی طرح تمام مخالف عناصر و اجزائے سیاسی کو ایک شیرازے میں جکڑ کے مستحکم کر دیتا۔ شمالی ہند میں سلطنت اعلیٰ قائم کرنے کی سب سے زیادہ کوشش قنوج کے راجا مہر بھوج (تقریباً 840ء سے 890ء تک) نے کی۔ مگر بد قسمتی سے اس کے نظام سلطنت یا عادات و خصائل کے متعلق ہمیں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہوئیں۔ مسلمانوں کے حملے کے بھاری صدمے نے بھی ان بے شمار ہندو ریاستوں میں کسی قسم کا اتحاد و اتفاق قائم نہ کیا۔ اس طرح یہ ریاستیں یکے بعد دیگرے عرب' ترک اور پٹھان جرگوں کا' جن میں کم از کم مذہبی جوش ایک علت مشترک تھا' بہ آسانی شکار ہو گئیں۔ علم و ادب اگرچہ بکثرت پھیلا اور مقامی درباروں کی سرپرستی میں تھا لیکن اس معیار سے کہیں گھٹ گیا تھا جو کالی داس نے کسی زمانے میں حاصل کر لیا تھا۔ بدھ مذہب کے رفتہ رفتہ انحطاط سے ہندوستان کے مذہب پر برا اثر پڑا۔ یہ بدھ مذہب نامعلوم اثرات اور تبدیلیوں کی وجہ سے ہندومت کے مختلف فرقوں میں ضم ہو گیا۔ صرف مگدھ اور گردونواح کے علاقے میں بدھ مذہب نے نئی نئی صورتوں میں چار سو سال (تقریباً 1193ء۔780ء) تک دھرم پال اور خاندان پال کے جانشینوں کی سرپرستی کی وجہ سے اپنی اصلی طاقت برقرار رکھی۔

فنون لطیفہ

فن سنگتراشی اکثر جگہ تو ہندو دیوتاؤں کے بتوں کو بنانے اور بنگال میں تبدیل شدہ بدھ مذہب کی خدمت گذاری میں صرف ہوتا تھا۔ اس کو مختلف کاریگروں نے متفرق شکلوں میں بہت کچھ ترقی دی۔ زمانہ وسطیٰ کی ہندی سنگتراشی کی خوبصورتی اب تک زیر بحث ہے۔ بعض نقادان فن تو اس کو ہندی طباعی کا انتہائی عروج سمجھتے ہیں اور دوسرے اس کو محض مضحکہ انگیز خیال کرتے ہیں۔ بد قسمتی سے زمانہ وسطیٰ کی مصوری کے نمونے بالکل ضائع ہو گئے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بالکل ناممکن ہے کہ آیا مصوری میں ترقی ہوئی تھی یا زوال۔ لیکن بہرحال سکے ڈھالنے کے فن کا

حال تو اس قدر خراب ہو گیا تھا کہ زمانہ وسطیٰ کا کوئی سکہ ایسا نہیں ملا جس کو فن لطیفہ کے محاسن کے لحاظ سے خوبصورت کہا جا سکے۔

فن تعمیر

لیکن فن تعمیر نہایت عالیشان معیار پر پہنچ چکا تھا۔ اکثر اس زمانے کی تعمیر شدہ بے شمار عمارات مسلمانوں کی طویل حکومت کے زمانے میں برباد ہو چکی ہیں' لیکن جو کچھ حصہ اب باقی رہ گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو معمار عمارت کو شان دار طریقے سے شروع کرتے اور اس عظمت و شان سے اختتام پر پہنچاتے تھے کہ خواہ مخواہ ان کی داد دینی پڑے' اور آرائش و زیبائش کے افراط سے ان کو ہدف تیر ملامت بننا پڑا۔

چھوٹی چھوٹی ریاستیں

اگلے تین ابواب میں ان چھوٹی چھوٹی ہندی ریاستوں کے نمایاں حالات بیان کیے جائیں گے جو اس وقت قائم ہوئیں جبکہ ہندوستان کو صدیوں تک اپنی قسمت اپنے ہاتھ میں لینے کا موقع ملا تھا۔ ان حالات سے شاید ناظر کتاب کو اس حالت کا اندازہ ہو سکے گا کہ جب کبھی حکومت اعلیٰ کا ہاتھ اٹھ جائے تو ہندوستان پر کیا گذرتی تھی۔ اب بھی اگر موجودہ خود مختارہ حکومت ذرا اپنا سایہ عاطفت ہندوستان سے اٹھائے تو بہت ممکن ہے کہ اس کی وہی حالت پھر ہو جائے۔

ساتویں صدی عیسوی کی جدول سنین

سن عیسوی	واقعات
600	چینی سیاح۔ ہیون سانگ کی پیدائش۔
تقریباً 600	ششانک کے ہاتھوں بدھ مذہب کی ایذاری۔
605	تھانیسر کا راجہ راجیا وردھن تخت نشین ہوا۔
606	تھانیسر کا راجہ ہرش وردھن تخت نشین ہوا۔
606–612	شمالی ہند کی ہرش کے ہاتھ فتح۔
608	پلکیسن دوم چلکیا کی تخت نشینی۔
609	پلکیسن دوم چلکیا کی تاجپوشی۔
اکتوبر 612	ہرش کی تخت نشینی۔ 606ء اس کی سمت کا آغاز۔
615	کبج وشنو وردھن (وشم سدھی) ونگی کا نائب السلطنت۔
618	چین کے خاندان تنگ کا پہلا شہنشاہ کو۔ تسو تخت نشین ہوا۔
619–20	ششانک کا گنجام کے مقام کا کتبہ۔
تقریباً 620	پلکیسن دوم چلکیا نے ہرش کو شکست دی۔
622	سنہ ہجری کا آغاز۔
627	چین کا شہنشاہ تے۔ تسنگ تخت نشین ہوا۔
628–29	بنسکھیرا کے مقام پر ہرش کا کتبہ۔
629	ہیون۔ سانگ نے اپنی سیاحت شروع کی۔
630	تبت کے بادشاہ سرانگ۔ تسن گمپو کی تخت نشینی۔
630–31	مدھوبن کے مقام پر ہرش کا کتبہ۔

سن عیسوی	واقعات
تقریباً 635	ہرش نے ولبھی کو فتح کیا۔
636	الوپن نے چین میں نسطوری عیسائیت کو سب سے پہلے روشناس کرایا۔
641	ہرش نے چین کو ایک سفارت روانہ کی۔ تبت کے بادشاہ سرانگ۔ تسن گمپو نے ایک چینی شہزادی سے شادی کی ۶۴۲ء ساسانی بادشاہ یزدگرد کو عربوں نے نہاوند کے مقام پر شکست دی۔ عربوں نے مصر کو فتح کیا۔
642	پلکیسن دوم چالوکیا کی موت۔
643	ہرش کی فوجی مہم گنجام کی طرف۔ ہیون سانگ سے اس کی ملاقات۔ لی۔ آئی ساپیو۔ اور ونگ۔ ہیون تسے کی چینی سفارت۔ ہرش کی قنوج اور پریاگ کی مجالس۔ ہیون سانگ کی واپسی۔
645	ہیون سانگ کا چین میں واپس پہنچنا۔
646	ونگ۔ ہیون۔ تسے کی دوسری چینی سفارت۔
647	ہرش کی موت۔
647–48	(؟) ارجن کا غصب' چینیوں' نیپالیوں اور تبتیوں کے ہاتھ اس کی شکست۔ ہیون سانگ کے سفرنامے کی اشاعت۔
649	چین کے شہنشاہ تے۔ تسنگ کی موت اور کو۔ تسنگ کی تخت نشینی۔
657	ونگ۔ہیون۔تسے کی تیسری سفارت۔
661–65	چینی سلطنت کی انتہائے وسعت۔
664	ہیون سانگ کی موت۔
670	تبتیوں کے ہاتھ سے چینیوں کی شکست۔
671	چینی سیاح آئی۔ تسنگ نے اپنی سیاحت شروع کی۔
675–85	آئی۔ تسنگ کا نالندا میں قیام۔
691	آئی۔ تسنگ نے اپنے "حالات" تالیف کیے۔
695	آئی۔ تسنگ چین کو واپس ہوا۔
تقریباً 698	تبت کے بادشاہ' سرانگ۔ تسن۔ گمپو کی موت۔

حوالہ جات

سلہ اس خاندان کا شجرہ نسب کتبوں میں مندرج ہے۔ یعنی (1) سون پت کی مہر (گپتا انسکرپشنز نمبر 52)۔ (2) بنسکھیرا کی تانبے کی لوح (ایپی گریفیا انڈیکا جلد 4 صفحہ 208)۔ (3) مدھوبن کی تانبے کی لوح (ایضاً جلد 1 صفحہ 67) پربھاکر وردھن کی ماں کا نام مہاسین تھا اور خود اس کا نام پرتاب شیل بھی تھا۔ اس کی ملکہ کا نام یشومتی تھا۔ ہرش کا پورا نام ہرش وردھن تھا۔ وہ سکے جو صوبہ اودھ میں فیض آباد کے مقام پر پائے گئے ہیں اور جن پر پرتاب شیل اور سیلادت کے نام یا القاب پائے جاتے ہیں' وہ معلوم ہوتا ہے کہ علی الترتیب ان پربھاکر وردھن اور ہرش کے ہی مضروبہ ہیں۔ (برن۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1906ء صفحہ 845) ڈاکٹر ہارنل کا نظریہ اس سے بالکل مختلف ہے (ایضاً صفحہ 446' 1909ء)۔

سلہ اس مالوا کے موقع کے متعلق شکوک ظاہر کیے گئے ہیں۔ تارناتھ (شیفنر صفحہ 251) نے "پریاگ میں ایک مالوا" کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ گرہورمن قنوج کا بادشاہ ہو' وہ اونتی ورمن کا بیٹا جس کا نام جنوبی بہار کے ضلع شاہ آباد کے ایک کتبے میں پایا جاتا ہے (فلیٹ۔ گپتا انسکرپشنز صفحہ 215)

سلہ گوڑ (بان)۔ یہ غالباً ہیوکرن سورن ہے (ہیون سانگ)۔ مسٹر بیورج کے خیال کے مطابق صدر مقام رنگاماٹی جو مرشد آباد سے 12 میل جنوب کی طرف واقع تھا۔ (جے۔ اے۔ ایس بی 62 حصہ اول 1893ء' صفحہ 327۔ 315) مگر منموہن چکرورتی نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ لکشمناوتی (لکھنوتی یا گوڑ) کا تھا (ایضاً جلد 4 سلسلہ نو (1908ء) صفحہ 281)

سلہ ویٹرس جلد اول صفحہ 345۔

سلہ کیلہارن (انڈین انٹی کوری جلد 26 صفحہ 32۔ ہرش کے سمت کے بیس کتبے دریافت ہوئے ہیں۔ (ایپی گریفیا انڈیکا جلد 5 ضمیمہ نمبر 547۔ 528) جب 630ء میں ہیون سانگ ہرش کے دربار میں مقیم تھا تو راجا کی حکومت کا شمار تیس سے زیادہ سال کا کیا جاتا تھا: (ریکارڈس جلد اول صفحہ 213) "کچھ اوپر تیس برس تک ہندوستان کا مالک۔" (لائف آف ہیون سانگ صفحہ 183)

644ء کی پنج سالہ مجلس کا اس کی حکومت کے عرصے میں چھٹا موقع تھا (بیل۔ لائف آف ہیون سانگ صفحہ 184)۔ ساڑھے پانچ (جولین) یا چھ (ویٹرس) برس کا وہ وقفہ جو شمال کو زیر نگین کرنے میں صرف ہوا اس میں شامل نہیں۔

ؔ گنجام کی تانبے کی لوح کا کتبہ مورخہ 300 گ س۔ 620۔619ء (ایپی گر یفیا انڈیکا جلد 6 صفحہ 143)۔ ہیون سانگ نے ششانک کا ذکر ایک قریبی زمانے کے بادشاہ کے طور پر کیا ہے۔ مگر اس کے جانشین کا حال نہیں لکھا۔

ؔ ہندوستان کے عام ذکر میں ہیون سانگ نے بیان کیا ہے کہ ہندی فوج کا سپہ سالار ایک چہار اسپہ گاڑی میں سوار ہوتا اور ایک محافظ دستے کو اپنے گرداگرد لے کے چلتا تھا۔

ؔ سیاح کا یہ بیان کہ شمالی ہند کو زیر نگین کرنے کے بعد (جو 612ء میں واقع ہوا۔) اس نے "تیس برس تک امن وامان سے بغیر ہتھیار اٹھائے حکومت کی" حرف بہ حرف صحیح نہ مان لینا چاہیے۔ کیونکہ امر واقعی یہ ہے کہ اس کے بعد پلکیسن دوم اور ولبھی کے ساتھ لڑائیاں ہوئی تھیں۔"

ؔ چین کے دائرۃ المعارف کا مصنف ما۔ تون۔ لن (میکس میولر۔ انڈیا صفحہ 287)۔ فلیٹ کی مجوزہ تاریخ 609ء یا 610ء ناممکن ہے کیونکہ ہرش اس زمانے میں شمالی ہند کی فتح میں مصروف تھا۔

ؔ بھڑوچ کے راجا ددّ کا عطیہ (انڈین انٹی کویری جلد 13 صفحہ 70)۔ اس واقعے پر ایم۔ اٹنگاسین نے اپنے دلچسپ رسالہ "ہرش وردھن۔ امپررائٹ پوئٹ ڈی ل انڈ" (لووین 1906ء) کے صفحہ 49۔47 تک بحث کی ہے۔

ؔ ایم سلوین لیوی اور اٹنگاسین (صفحہ 47، 184) نے ہرش کی فتح نیپال اور اس ملک میں اس کے سمت کے رواج سے بالکل انکار کیا ہے۔ مگر میرے نزدیک وہ دونوں اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ دیکھو انڈین انٹی کویری جلد 13 صفحہ 421۔ کیلہارن: لسٹ آف ناردرن انسکرپشنز ایپی گر یفیا انڈیکا، جلد 5 ضمیمہ، صفحہ 75۔

ؔ بیل ریکارڈس جلد 2 صفحہ 193۔ ویٹرس جلد 2 صفحہ 183۔ اٹھارویں صدی میں برما کے بادشاہوں کے ہاں بھی یہی قاعدہ جاری تھا۔ صرف ایک دن کے عرصے میں ایک فرخ اور خاصہ آرام دہ مکان شاہی عمارات کی وضع کا تیار ہوگیا تھا۔ (سائمز: ایمبیسی ٹو آوا، جلد اول صفحہ 283)۔

ؔ "لائف آف ہیون سانگ" صفحہ 183۔

ؔ ان ناٹکوں کے لیے دیکھو: ولسن ہندو تھیٹر، لیوی تھیٹر انڈین۔ ہائڈ کا ترجمہ "ناگانند۔" شاہی مصنفین کے لیے دیکھو انڈین انٹی کویری جلد 20 صفحہ 201۔ اپنی کتاب کے تیسرے باب میں

۱۵ بان کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ' مترجمہ ڈاکٹر ایف ۔ ڈبلیو ۔ ٹامس پروفیسر کاول متوفی ۔ شائع کردہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی 1897 ۔ یہ ترجمہ لیاقت کی ایک زبردست فتح خیال کی جا سکتی ہے ۔

۱۶ جے ۔ آر ۔ اے ۔ ایس 1891ء صفحہ 21 ۔ 418 ۔

۱۷ بدھ دیو تا بنا کے ذکر کرنا یقیناً درست نہیں ' لیکن جب ساتویں صدی عیسوی میں بدھ مذہب کا ذکر ہو رہا ہو تو یہ غلطی محض لفظی اور رسمی ہی رہ جاتی ہے ۔

۱۸ " فنگ ۔ چہ " (ویٹرس جلد اول صفحہ 345)

۱۹ بیل ۔ " لائف آف ہیون سانگ " صفحہ 180 ۔ اس کتاب کی طبع دوم میں تارناتھ کی ایک حکایت (شیفنر صفحہ 128) جو اس نے کسی راجا سری ہرش نای کے متعلق بیان کی ہے ' کا غلطی سے قنوج کے راجا ہرش پر اطلاق ہو گیا تھا ۔ مورخ کا بیان ہے کہ راجا سری ہرش نے بیرونی مذاہب کے 12000 آدمیوں کو بہلا پھسلا کر ایک چوبی عمارت میں بند کیا اور مع ان کتابوں کے انہیں جلا کر خاک کر دیا ۔ اس طرح اس نے ایرانی اور سک قوم کے مذاہب کو ایسا کمزور کر دیا کہ اس میں صرف ایک سو ہی آدمی بچے ۔ یہ سفاکی کہا جاتا ہے کہ ملتان کے قریب واقع ہوئی ۔ پھر تارناتھ لکھتا ہے کہ سری ہرش نے اپنے گناہ کا کفارہ اتارنے کے لیے چار عالیشان خانقاہیں تعمیر کرائیں جو علی الترتیب مارواڑ ' مالوا ' میواڑ ' پنوا ' اور چتوڑ میں واقع تھیں ۔ ان میں سے ہر ایک اتنی وسیع تھی کہ اس میں 1000 بھکشو سما سکتے تھے ۔ میں نہ تو چتوڑ اور پنوا کے موقع کا نشان دے سکتا ہوں اور نہ تاریخ ہی کا اندازہ لگا سکتا ہوں ۔ لیکن بہرحال یہ ظاہر ہے کہ سری ہرش راجپوتانے میں غالباً مارواڑ کے علاقے کا مقامی سردار تھا ۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھٹی صدی کا واقعہ ہے ۔ ہرش مارواڑ میں پیدا ہوا اور مغرب کی تمام سلطنتوں پر حکمراں تھا ۔ (ایضاً صفحہ 126) انگاسین (" ہرش وردھن " صفحہ 84) نے بھی غلطی سے اس مارواڑ کے ہرش کو قنوج کا ہرش تسلیم کر لیا ہے ۔ اس نے اس آتش زدگی کے متعلق لنکا کی کتابوں کی شہادت نقل کی ہے ۔ میں نے اب تک راجپوتانے کے بادشاہوں کی فہرست میں ہرش کا نام کہیں نہیں دیکھا ۔ مگر میواڑ میں ایک قصبہ ہرش پور کے نام سے موجود تھا ' (انڈین انٹی کوری 1910ء صفحہ 1871) جس کا نام ممکن ہے تارناتھ کی حکایت کے ہیرو کے نام پر رکھا گیا ہو ۔

۲۰ " موسم بہار کا دو سرا مہینہ تھا ۔ " (بیل ریکارڈس جلد اول صفحہ 218)

۲۱ یون ۔ چانگ چین کو واپس ہوا اور 645ء کے شروع اور تنگ ۔ تنائی ۔ شنگ کی حکومت کے انیسویں سال چننگ ۔ آن پہنچا (ویٹرس ۔ جلد اول صفحہ 11) ۔ دیکھو نقشہ جو ویٹرس کی جلد دوم کے ساتھ ملحق ہے ۔

۲۲ ڈنگ [illegible] دن لے کی حکایت نے اپنے مضمون " لیس شہزدی ڈنگ [illegible] یون تے [illegible] اند "

(جے۔ ایشیاٹک 1900ء) میں تفصیل سے بیان کی ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ انڈین انٹی کوری 1911ء صفحہ 111 وغیرہ میں شائع ہوا ہے۔ اس غاصب کا نام چینی کتاب میں ن۔ فو۔ تی۔ او۔ لو۔ ن شیون لکھا ہے جو ارجن بھی بن سکتا ہے اور ارنا سو بھی ہو سکتا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل ویڈل کے قابل قدر مضمون "تبتن انویژن آف انڈیا ان 647ء اینڈ اِٹس ریزلٹس" (ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو۔ جنوری 1911ء) میں اس زمانے میں تبت کی اصلی حالت اور حیثیت کو ظاہر کیا ہے اور ہرش کی موت کے سنہ کی تصحیح کی ہے۔

۲۳؎ ارسا (یا ہزارہ)، پرنوتس (یا پونچھ)، راجپوری (یا راجوری) یعنی قدیم ابھار۔

۲۴؎ تسہ۔ کیا اور پو۔ فا۔ تو اور او۔ تیئن۔ پو۔ چی۔ لو سے جو ہندی نام مراد ہیں ان کا صحیح اندازہ بالکل نہیں ہو سکتا۔ سندھ کے بہت سے ستوپ اور بدھ مذہب کے آثار جو بالکل نظرانداز کر دیے گئے تھے، اب دریافت ہوتے جاتے ہیں۔ (آرکیالوجیکل سروے آف ویسٹرن انڈیا۔ پروگرس رپورٹ 10۔ 1909ء صفحہ 40)۔

۲۵؎ ریورٹی۔ نوٹس آن افغانستان صفحہ 570، 566، 663۔ جے۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول (1902ء) صفحہ 233، 239، 251 ایلیٹ۔ ہسٹری آف انڈیا جلد اول، حاشیہ نمبر بی صفحہ 405۔ ریورٹی کے بیانات ایلیٹ سے زیادہ صحیح ہیں اور موخرالذکر سے بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔ صفحہ 405 پر جس نام کو ایلیٹ نے "کنوج" لکھا ہے وہ اصل میں ملتان کا ملحق علاقہ تنوج تھا۔

۲۶؎ بھاسکر ورمن کی ایک تاریخ وسنہ کا تانبے کی لوح پر کندہ کیا ہوا کتبہ "دکن ریویو" جون 1913ء میں شائع کیا گیا ہے۔ اس واقعے سے، کہ راجا کے احکام بنگال میں اس کے صدر مقام کرن۔ سورن سے نافذ کیے جاتے تھے، معلوم ہوتا کہ وہ ہرش کی ماتحتی میں بنگال پر بھی حکمراں تھا۔

۲۷؎ یہ تاریخ ویڈل اور سرت چندر داس کے بیان کے مطابق ہے۔

چودھواں باب

زمانہ وسطیٰ میں شمالی ہند کی سلطنتیں

647ء تا 1200ء

الف۔ تبت اور چین سے تعلقات

ہندوستان کی شمالی سرحد پر چینی اثر

چینی حکومت کی اپنے دور ترین افتادہ مقبوضات کو بھی زیر تصرف رکھنے میں ضد اور عزم کا ایک موجودہ نمونہ اس کے مسلمانوں سے کاشغر اور یونن' اور روسیوں سے کلج کے واپس لینے کا واقعہ ہے۔ اسی طرح ساتویں اور آٹھویں صدی کی تاریخ میں اسی عادت کی مثالیں ملتی ہیں کہ چین نے انتہاء درجے کی کوشش اپنا اثر باقی رکھنے اور ہندوستان کی شمالی سرحد کے ملکوں پر اپنی حکومت برقرار رکھنے میں کی۔

502ء۔556ء: افتالوی سلطنت

چھٹی صدی کے نصف اول میں "مغربی ممالک" میں چین کی طاقت بالکل ختم ہو گئی تھی اور افتالوی یا گورے ہنوں نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی جس میں کاشغر (جس کو چینی مصنفین چار محصور افواج لکھتے ہیں)[1] کشمیر اور پشاور کے گرد کا علاقہ گندھار شامل تھا۔

565ء: مغربی ترکوں کی حکومت

تقریباً 565ء (563ء۔567ء کے مابین "افتالوی سلطنت مغربی ترکوں اور ایرانیوں کے

ہاتھ آئی۔ لیکن دریائے سیحون کے جنوبی صوبجات پر موخرالذکر طاقت کا قبضہ بہت جلد ڈھیلا پڑ گیا اور انجام کار ترک دریائے سندھ تک کے تمام افغانوی علاقے کے مالک و وارث بن گئے۔ چنانچہ 630ء میں جب ہیون سانگ ہندوستان آ رہا تھا تو راستے میں اس کی حفاظت کا ذمہ مغربی ترکوں کے سردار "یاکزن" نے اپنا پروانہ راہداری نافذ کر کے لیا تھا جس سے کپس کے علاقے تک اس کی سلامتی کا وہ ضامن ہو گیا تھا۔ [1]

630ء: چینیوں کے ہاتھوں شمالی ترکوں کی شکست

اس سال سیاح کا زبردست مربی قتل ہوا اور چینیوں نے تنگ خاندان کے دوسرے بادشاہ تائی۔ تسنگ کی سرکردگی میں شمالی یا مشرقی ترکوں کو ایسی شکست دی کہ مفتوح پچاس برس تک کے لیے چینیوں کے مطیع بن گئے۔

648ء۔640ء: کُچا وغیرہ کی چینی فتح

شمالی ترکوں کے خطرے سے بالکل مخلصی پانے کے بعد اب چینی اس قابل ہوئے کہ اپنی طاقت کو مغربی اقوام کے مقابلے میں استعمال کر سکیں اور 8۔640ء تک وہ ترفان، کرشہر اور کچا پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح وہ مشرق و مغرب میں تعلقات اور آمد و رفت کے شمالی راستے پر متصرف ہو گئے۔

تبت سے دوستانہ تعلقات

اس وقت تبت پر مشہور و معروف بادشاہ سرانگ۔ تسن۔ گمپو (سن جلوس 630ء) حکمراں تھا جس نے 639ء میں لہاسا کا شہر آباد کیا، بدھ مت کو پہلے پہل ملک میں روشناس کرایا اور ہندی علماء کی مدد سے تبتی حروف تہجی کا اختراع کیا۔ ابھی وہ نوجوان ہی تھا کہ نیپال کے بادشاہ کی بیٹی بھرکت سے شادی کی اور دو سال بعد 641ء میں کافی مشکلات کے بعد اپنی فتوحات کے ذریعے چینی شہنشاہ تائی۔ تسنگ کی بیٹی دین۔ چنگ سے شادی کرنے میں بھی کامیاب ہوا۔ چونکہ دونوں خواتین بدھ مت کی نہایت سرگرم پیرو تھیں، اس لیے انہوں نے اپنے نوجوان شوہر کا مذہب بھی جلد بدل دیا اور اس طرح تبت کی تاریخ کا مستقبل بالکل بدل دیا۔ مذہب نے بھی اپنے مربیوں کی خوبیوں کے اظہار سے پہلو تہی نہیں کی۔ چنانچہ اس بادشاہ کو بدھ کا اوتار اولو کیتیشور یا نجات دہندہ تسلیم کیا گیا۔ اس کی نیپالی ملکہ کو "سبز تارا" اور چینی ملکہ کو "سفید تارا" کا خطاب دیا گیا۔
اس چینی شادی کا اثر ہوا کہ سرانگ۔ تسن۔ گمپو کی زندگی کے خاتمے یعنی 698ء کے قریب

اس کی موت تک چین اور تبت میں دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اسی وجہ سے جب 5-643ء میں چینی سفیر ہرش کے دربار کو آ رہے تھے تو وہ متحد ممالک کے طور پر تبت اور اس کی باج گذار ریاست نیپال میں سے با آسانی گذر سکے' اور جب ہرش کی موت کے بعد وِنگ۔ ہیون۔ تسے کو مصیبت سے سامنا ہوا تو ان دونوں ممالک نے اس کو چھڑانے کے لیے افواج روانہ کر دیں۔ [۵]

659-661ء: چینی مغربی ترکوں کی سلطنت پر قابض ہو گئے

ترکوں کو مغلوب کرنے کا کام' جسے شہنشاہ تائی تسنگ نے شروع کیا تھا' اس کے جانشین کو۔ تسنگ (649ء سے 683ء) نے جاری رکھا اور 659ء تک چین مغربی ترکوں کے تمام علاقے کا برائے نام مالک بن گیا۔ اسی سال اس کا الحاق چینی سلطنت کے ساتھ کر لیا گیا۔ 665ء -661ء میں چین کا رعب و داب بہت بڑھ گیا تھا اور اس کی شان و طاقت اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ جو پھر کبھی اس کو حاصل نہیں ہوئی۔ کپس کی۔ پن سلطنت کا ایک صوبہ بنا ہوا تھا اور شہنشاہ کے دربار میں اودیان یا وادیٔ سوات کے اور ایران سے لے کر کوریا تک کے تمام ممالک کے سفیر شامل تھے۔

670ء: کاشغر پر تبتیوں کا قبضہ

مگر سلطنت کی یہ عظمت و شان زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ 670ء میں تبتیوں کے ہاتھ سے ایک شکست فاش کھانے سے چین کو کاشغر یا "چار محصور افواج" سے محروم کر دیا گیا اور یہ علاقہ 692ء تک فاتحوں کے ہاتھ میں رہا۔ مگر اس سنہ میں چینیوں نے اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔

744ء: شمالی ترکوں کا آخری زوال

682ء اور 691ء کے درمیان شمالی ترکوں نے 630ء کی شکست سے کھوئی ہوئی طاقت کو بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مغربی قبائل پر بھی اپنی نگرانی اور حکومت قائم کرنے میں تھوڑے بہت کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر وسط ایشیاء کی قومیں اندرونی نفاق و شقاق کی لعنت سے کبھی آزاد نہیں ہوئیں اور چینیوں کو اس قومی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا ڈھنگ معلوم تھا۔ انہوں نے یوگر اور کرلک قبائل کی مدد سے ان قبائلی قصبوں میں دست اندازی کی۔ اس میں وہ یہاں تک کامیاب ہوئے کہ 744ء میں یوگر ترکی سلطنت کے مشرقی حصے دریائے ارخون پر مسلط ہو گئے' اور مغرب میں کرلک "دہ قبائل" کے علاقے پر قابض ہو گئے اور جھیل ایسک۔ کول کے مغرب میں ترکی [illegible] روں کی قدیم جائے سکونت تکمک اور تلس پر متصرف ہو گئے۔

665ء–715ء: چین اور مغرب کے مابین آمد و رفت بند ہو گئی

665ء اور 715ء کے درمیان چین کی حکومت دریائے جیحون (سیر دریا) اور دریائے سندھ کے درمیانی ممالک کے معاملات میں دخل دینے سے بالکل معذور ہو گئی۔ جنوبی جانب سے براہ کاشغر مغرب کی طرف کے راستے کو تبتیوں نے بند کر دیا تھا اور ہندوکش کا کوہستانی راستہ عرب قائد قتیبہ کی فتوحات کی وجہ سے (جو اس زمانے میں وسط ایشیاء میں اسلام اور سلطنت کی توسیع میں مشغول تھا) مسدود ہو گیا۔

715ء–747ء: ہندی سرحد پر چینی اثر کا احیاء

713ء میں ہیون تسنگ کی تخت نشینی سے چینی جدوجہد کا از سر نو آغاز ہوتا ہے۔ اب جنگ اور سیاسی حکمت عملی کے ذریعے سخت ترین جدوجہد اس امر کی کی گئی کہ پامیر کے دروں کے راستے کو کسی طرح کھلا رکھا جائے اور عربوں اور تبتیوں کے زور کا (جو اکثر متفق ہو جاتے تھے) توڑ کیا جائے۔ 719ء میں سمرقند اور دوسری سلطنتوں نے جو اسلامی افواج کی جھپٹ میں آ گئی تھیں عربوں کے مقابلے کے لیے چین سے مدد مانگی۔ اس کے برخلاف عربوں نے ہندی سرحد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ اُدیان (سوات)' کھوتل (بدخشاں کے مغرب میں) اور چترال کے سردار مسلمانوں کی باتوں میں نہ آئے اور ان کو چین کے شہنشاہ نے اس کارگزاری کے عوض میں اسناد اور بادشاہ کا خطاب عطا کیا۔ اسی قسم کی عزت افزائی ٹسن' زابلستان (غزنی)' کپس اور کشمیر کے بادشاہوں کی کی گئی۔ عربوں اور تبتیوں کے سدباب کے لیے چین نے ان سرحدی ریاستوں کی تنظیم اور تنسیق میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ کشمیر کے راجا چندراپید کو 720ء میں شہنشاہ نے بادشاہ کا خطاب عطا کیا اور اسی طرح 733ء میں اس کے بھائی مکتاپید للتادت کی عزت افزائی کی گئی۔

اس کے چند سال بعد یعنی 744ء اور 747ء میں چین کی سلطنت کا اثر اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ شہنشاہ نے بحیرہ خضر کے جنوب میں طبرستان کے بادشاہ تک کو خطابات عطاء کیے۔ 747ء میں ایک چینی فوج نے پامیر کی سطح مرتفع کو باوجود تمام مشکلات اور دشواریوں کے قطع اور ٹسن کے بادشاہ کو زیر کیا۔

751ء: عربوں اور کرلک کے ہاتھوں چینیوں کی شکست فاش

لیکن ساتویں صدی عیسوی کی طرح آٹھویں صدی میں بھی مغربی ممالک پر چینی حکومت

و تسلط کی مدت نہایت قلیل تھی۔ ان کی سلطنت 751ء میں چینی سپہ سالار سین۔ چی کی کرلک کی مدد سے عربوں کے ہاتھوں شکست کھانے سے پاش پاش ہو کر رہ گئی۔ اس شکست کا اثر بالواسطہ یورپ کی تہذیب پر بھی پڑا۔ کاغذ بنانے کی صنعت جو اب تک دور افتادہ ملک چین کا اجارہ سمجھی جاتی تھی، چینی قیدیوں کے ہاتھوں سمرقند پہنچی اور وہاں سے یورپ میں گئی جس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ظاہر ہے۔[۴]

بدھ مذہب تبت میں

تھی (یا کھری) سرانگ۔ دی۔ تسن کی مدت دراز تک حکومت (789ء۔743ء) کے دوران تبت کے ملک میں بدھ مذہب کی تبلیغ اس قدر جوش و خروش کے ساتھ کی گئی کہ اس میں ملک کے اصلی مذہب بون (یا پون) کی ایذاء دہی سے بھی کام لینے میں تامل نہ کیا گیا۔ ہندی علما سانت رکھشت اور پدم سمبھو کو شاہی دربار میں مدعو کیا گیا اور ان کی مدد سے مذہبی حکومت کا وہ نظام قائم کیا گیا جو اب تک مذہب لاما کی صورت میں باقی ہے۔ تھی۔ سرانگ۔ دی۔ تسن کا کام رلپکن (838ء۔816ء) نے جاری رکھا اور اس کو ترقی دی۔ مگر اس کا جانشین لنگدرم بدھ مذہب سے متنفر تھا اور اس نے اس کی بیخ کنی کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ 842ء میں ایک لاما نے بادشاہ کو قتل کر کے اپنے ہم مذہبوں کے مصائب اور تکالیف کا بدلا لیا۔ گیارہویں صدی (1142ء۔1013ء) کے دوران مگدھ کے مبلغین مذہب نے تبت میں بدھ مت کو مستحکم طور پر سرکاری اور عام مذہب بنا دیا۔[۵]

چین کے ساتھ تعلق

رلپکن کے زمانے میں چین کے ساتھ ایک زبردست جنگ ہوئی۔ اس کا ذکر 822ء میں بھاسا کے ایک کتبے پر کندہ کرایا گیا۔ اس کے بعد کے زمانے میں تبت کے چینی سلطنت کے ساتھ تعلقات میں وقتاً فوقتاً بہت کچھ تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ لیکن خواہ تعلقات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، ان کا اثر ہندوستان پر بالکل نہیں پڑا۔ چین کی تبت پر حکومت حقیقتاً قائم ہونے کا زمانہ آخر 1751ء میں آیا، اور اس زمانے سے چینی حکومت نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ یورپی اقوام کو تبت میں آنے جانے سے روک دے۔ اس امر میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے ایک مدت تک تبت کے تمام معاملات ہندوستان کی تاریخ سے بالکل علیحدہ رہے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اثناء میں تبت کی طاقت کے عروج کی وجہ سے ہندی اور چینی سیاسیات کا تعلق بالکل ختم ہو گیا تھا اور 1885ء میں بالائی برما کی فتح کے بعد ان تعلقات کا اعادہ اور احیاء ہوا کیونکہ اب چینی

اور ہندوستانی سلطنتوں کی حدود آپس میں مل گئی تھیں۔اسی زمانے میں تبت بھی' جو صدیوں سے کم و بیش چین کا ماتحت رہا ہے' پھر ہندی حکومت کے زیر نظر آیا اور اب اس کے معاملات انگریزی اور چینی سیاسیات کے مسائل میں گنے جاتے ہیں۔

ب۔ نیپال

نیپال کی حدود

زمانہ موجودہ کی سلطنت نیپال ایک خاصی وسیع خود مختار سلطنت ہے جو مشرق میں سکم سے لے کر مغرب میں کماؤں تک پھیلی ہوئی ہے اور ترہت' اودھ اور صوبہ آگرہ کی شمالی سرحد سے اس کا طول 500 میل ہے۔ ترائی کے تنگ میدان کے سوا پورا ملک پہاڑوں اور وادیوں کی ایک بھول بھلیاں ہے۔ حقیقی طور پر نیپال کا نام بہت محدود کر دینا چاہیے 'کیونکہ قدیم زمانے میں اس نام کا اطلاق اس چاروں طرف سے گھری ہوئی وادی پر ہوا کرتا تھا جو بیس میل لمبی اور پندرہ میل چوڑی تھی اور جس میں صدر مقام کھٹمنڈو کے علاقے اور دوسرے شہر اور قصبے آباد ہیں۔ وہاں کی موجودہ حکومت کی حکمت عملی یہ ہے کہ یوروپین لوگوں کو سوائے اس وادی کے اور تقریباً تمام سلطنت سے کسی طرح باہر رکھا جائے۔اسی وجہ سے اس ملک کے بہت ہی کم حالات معلوم ہیں۔

سمدر گپت کے وقت میں

نیپال یعنی اس مذکورہ بالا وادی کے متعلق جو بات سب سے قدیم معلوم ہوتی ہے وہ چوتھی صدی عیسوی کے سمدر گپت کا الٰہ آبادی کتبہ ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ کامروپ یا آسام کی طرح یہ ایک خود مختار سرحدی سلطنت تھی اور خاندان گپت کو صرف خراج ادا کیا کرتی تھی۔ غالباً یہ خراج محض برائے نام تھا اور اطاعت بھی سلسلہ وار نہ تھی۔ آج کل کے زمانے میں بھی اگرچہ نیپال بہمہ وجوہ بالکل خود مختار ہے لیکن پھر بھی وہ شہنشاہ چین کو تحائف اور خراج بھیجتا رہتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتا ہے۔ لیکن ایک برٹش ریذیڈنٹ اس کے دربار میں مقیم ہے اور وہاں کی حکومت کو اپنی خارجہ پالیسی میں حکومت ہند کی مرضی پر عمل کرنا پڑتا ہے۔

اشوک کے وقت میں

مقامی روایات یہ ثابت کرتی ہیں کہ سمدرگپت کے زمانے سے بہت قبل اشوک کے عہد حکومت یعنی تیسری صدی قبل مسیح میں یہ علاقہ اس بادشاہ کے زیر اثر تھا۔ اس روایت کی صحت کا ثبوت ان عمارات سے ملتا ہے جو اشوک اور اس کی بیٹے کی طرف منسوب ہیں۔ اس کے علاوہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دامن کوہ کا میدان اس کی اصلی سلطنت میں شامل تھا۔ اور کیوں کہ پاٹلی پتر اور نیپال کی وادی میں کچھ بہت فاصلہ نہیں اس لیے ممکن ہے کہ یہ علاقہ ان صوبوں میں شامل ہو جن پر اشوک بذات خود بلا واسطہ اپنے دار السلطنت سے حکومت کرتا تھا۔

مقامی تواریخ

اشوک اور سمدرگپت کے درمیانی فاصلے کے واقعات کا پتہ لگانا ناممکن ہے۔ مقامی تاریخیں بکثرت دستیاب ہوتی ہیں، مگر وہ ایسی ہیں کہ مورخانہ تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتیں اور اس کے علاوہ واقعات کو بھی بالکل روشنی میں نہیں لاتیں۔ چھٹی اور ساتویں صدی کے اوائل میں حکمراں شاہی خاندان لکھوی قبیلے سے تھا۔ لیکن ویشالی کی لکھوی قوم سے اس کا اصلی تعلق معلوم نہیں کیا تھا۔ ہیون سانگ نیپال کے لکھویوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ خوش عقیدہ اور عالم بدھ مذہب کے پیرو تھے۔[6]

ساتویں صدی اور اس کے بعد

ساتویں صدی کے دوران میں نیپال کی حیثیت شمال میں تبت جو اس زمانے میں ایشیاء کی ایک عظیم الشان طاقت تھی اور جنوب میں قنوج کے راجا ہرش کی سلطنت کے درمیان ایک حائل سلطنت کی سی تھی۔ ٹھاکری خاندان کے بانی راجا اسورمن (جو تقریباً 642ء میں فوت ہوا) کے تعلقات اس کی بیٹی کی سرانگ۔ تسن۔ گمپو کے ساتھ شادی ہو جانے کی وجہ سے تبت کے ساتھ نہایت گہرے تھے۔ یہ یاد رہے کہ یہی سرانگ۔ تسن۔ گمپو شاہ تبت ایسا طاقتور تھا کہ اس نے چین کے شہنشاہ کو 641ء میں مجبور کیا تھا کہ شہزادی وین۔ چنگ کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔[7] اس بات کے باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ نیپال کا جنوبی ہمسایہ یعنی ہرش اس سلطنت کے معاملے میں دخل اندازی کیا کرتا تھا اور اس نے وہاں پر اپنا قائم کیا ہوا سنہ بھی مروج کر دیا تھا۔ اگرچہ ایم سلوین لیوی کا یہ خیال ہے کہ تبت کے اثر و رسوخ کی زیادتی کی وجہ سے ہرش کی دست اندازی بالکل ناممکن ہو گی۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ ہرش کی موت کے بعد تبتی اور نیپالی

افواج نے چینی سفیر ونگ۔ ہیون۔ تسے کو سلطنت ہرش کے غاصب کے مقابل امداد بہم پہنچائی تھی۔ یہ بھی یقینی ہے کہ آٹھویں صدی کے شروع میں نیپال حسب سابق تبت کا زیر نگین تھا اور ایک مدت تک اس کی یہ حالت قائم رہی۔ اکتوبر 879ء سے ایک نئے نیپالی سنہ کا آغاز شاید اس قیاس وخیال کو ثابت کردے کہ اس واقعے سے نیپال کی تبت کے ہاتھ سے مخلصی مراد تھی۔ مگر اس سنہ کے آغاز یا تبت سے مخلصی کی صاف وصریح وجہ معلوم نہیں۔ آٹھویں صدی کے نصف کے بعد چین کے ہندی اور نیپالی تعلقات کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ حال میں نیپال اور چین کے درمیان جنگوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ چھوٹی ریاست نے برائے نام سلطنت چین کی ماتحتی قبول کرلی۔

گورکھوں کی فتح

ان مختلف چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی ابتر اور خون آشامی کی تاریخ میں (جو 1768ء تک برسرحکومت رہے) کسی قسم کی دلچسپی نہیں پائی جاتی۔ مگر اس سنہ میں گورکھوں نے ملک کو فتح کرلیا اور اس شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی جو آج کل ایسے مالک کل وزراء کی وساطت سے حکومت کرتا ہے جنھوں نے بادشاہوں کی حیثیت کو محض برائے نام کردیا ہے۔

نیپال کا بدھ مذہب

قدیم اور پرانی شکل کے بدھ مذہب کو اشوک نے اس ملک میں سب سے پہلے پھیلایا۔ چنانچہ روایات کے مطابق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کی بیٹی نے دارالسلطنت کے قریب بہت سی مذہبی عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ جن کے نشان اب تک پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کے سینکڑوں برس کی مدت میں ملک کی مذہبی حالت کے متعلق تقریباً کچھ بھی معلوم نہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں وہاں کا مذہب مہایان فرقہ بدھ مت کی ایک بدلی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے جو ہندوؤں کے شیو فرقے سے اس قدر مشابہ تھی کہ ان میں امتیاز مشکل ہے۔ مرور زمانہ سے مذہب میں فساد اور خرابی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اب نیپال میں یہ عجیب وحیرت ناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ خانقاہیں شادی شدہ "بھکشوؤں" سے 'جو ہر قسم کے دنیاوی کاموں میں مصروف ہیں' بھری ہوئی ملتی ہیں۔[8] نیپال میں بطور خود بدھ مذہب کے زوال وانحطاط کے جو اسباب عرصے سے بتدریج اپنا کام کررہے ہیں' ان میں گورکھا حکومت کے افعال سے اور زیادہ تیزی پیدا ہوگئی ہے کیونکہ یہ حکومت بدھ مذہب سے سخت متنفر ہے اور یقین ہے کہ چند دنوں میں نیپال کا بدھ مذہب بالکل نیست نابود ہوجائے گا۔

بدھ مذہب کا انحطاط

بدھ مذہب کے ہندوستان یعنی اپنی جائے پیدائش ہی سے ناپید اور معدوم ہو جانے کی وجوہ پر بہت کچھ بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے اور اس میں کچھ غلط فہمی بھی واقع ہو گئی ہے۔ چند سال قبل تک ہی یہ فرض کیا جاتا تھا کہ بدھ مذہب برہمنوں کے مذہبی تعصب اور ایذاء دہی کی وجہ سے نیست و نابود ہوا تھا۔ مگر یہ بالکلیہ صحیح نہیں ہے۔ ششانک جیسے بعض ہندو بادشاہوں نے وقتاً فوقتاً (مگر نہایت ہی شاذ) بلاشک و شبہ ایذاء دہی کا سلسلہ شروع کیا اور یہ ایذاء دہی برہمن مت کے ہندوستان میں دوبارہ قائم ہو جانے کی فی الجملہ وجہ ہو سکتی ہے... بعض صوبوں میں سے بدھ مذہب کے بالکل ناپید ہو جانے کا سب سے بڑا اور اہم سبب یہ تھا کہ بتدریج اور نامعلوم طور پر بدھ مذہب ہندو مت کے رنگ میں رنگتا چلا گیا' یہاں تک کہ آخر میں بسا اوقات ہندوؤں اور بدھ والوں کے علم الاوثان اور مورتوں میں امتیاز و تفریق تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی مطابقت اور اتحاد کا عمل خود آج کل ہماری آنکھوں کے سامنے نیپال میں جاری ہے۔ بعض طالبان علم کی نظر میں اس ملک کی خاص دلچسپی اسی میں پنہاں ہے کہ وہاں اس بات کا اندازہ بالکل صحیح طور پر لگ سکتا ہے کہ ہندو مذہب کس طرح اپنے حریف بدھ مت کو بتدریج جذب کیے جا رہا ہے۔[9] یہاں اس نیم مردہ مذہب پر جو دباؤ اس کے حریف مذہب کی طرف سے پڑ رہا ہے' اس میں حکومت کے طرز عمل سے بڑی مدد مل رہی ہے' جو اگرچہ عملی طور پر بدھ مذہب کے پیرو سے متعصبانہ برتاؤ نہیں کرتی لیکن اپنی تمام عنایات کا مورد ہندوؤں ہی کو قرار دیتی ہے۔[10]

ج۔ کامروپ یا آسام

سلطنت کی وسعت

کامروپ کی قدیم سلطنت اگرچہ بحیثیت مجموعی آسام کے برابر تھی' مگر بالعموم اس کا علاقہ موجودہ صوبہ آسام کی حدود سے کہیں زیادہ تھا اور مغرب میں دریائے کرتویا[11] تک پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ اس طرح اس میں کوچ بہار کی موجودہ ریاست اور ضلع رنگ پور دونوں شامل تھے۔ اس سلطنت کے متعلق قدیم ترین بیان جو مورخ کے لیے کار آمد ہو سکتا ہے وہ الٰہ آباد کے ستون پر سمدرگپت کا کتبہ ہے جو 360ء یا 370ء میں کندہ کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کامروپ کی ریاست خاندان گپت کی سلطنت کی حدود کے باہر اس کی سرحد پر واقع تھی' مگر خاندان گپت کی باجگزار اور ایک حد تک اس کی مطیع و فرماں بردار تھی۔[12]

ہیون سانگ

اس کتبے کے بعد یہ دور افتادہ صوبہ پھر چینی سیاح ہیون سانگ کی وجہ سے ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ 643ء کے اوائل میں جب وہ دوسری مرتبہ نالند کی خانقاہ میں مقیم تھا تو اس کو مجبوراً اپنی مرضی کے برخلاف کامروپ کے راجا کی دعوت قبول کرنی پڑی کیونکہ یہ راجا اس اجنبی عالم کی زیارت و ملاقات کا متمنی تھا اور دعوت سے انکار ناممکن تھا۔ کامروپ کے دارالسلطنت میں تھوڑے عرصے قیام کرنے کے بعد قنوج کے راجا ہرش شیلادت نے ایک ایلچی بھیجا کہ ہیون سانگ کو فوراً اس کے دربار میں بھیج دیا جائے۔ راجا نے جواب دیا کہ بجائے ہیون سانگ کو اس کے حوالے کرنے کے وہ اس کا سر لے سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب ہرش نے اپنے ایلچی کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ وہ اپنا سر ہی روانہ کر دے تو کامروپ کے راجا کی آنکھیں کھلیں اور اس نے سوچ بچار کے بعد یہی بہتر سمجھا کہ اپنے بادشاہ کے حکم کو بجالائے۔ چنانچہ وہ سیاح کو ساتھ لے کر ہرش سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔

بھاسکر ورمن یا کمار

اس بادشاہ کا نام بھاسکر ورمن تھا۔ مگر وہ کمار کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ وہ ایک نہایت قدیم خاندان کا رکن تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہزار قرنوں سے زندہ اور باقی ہے۔ یہ کم از کم تقریباً یقینی ہے کہ وہ ہندو مت کا پیرو اور کوچ کا دیسی باشندہ تھا۔ ہیون سانگ اس کے متعلق کہتا ہے کہ وہ ذات کا برہمن تھا۔ لیکن اس کے نام کی وضع و قطع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کو چھتری یا راجپوت سمجھتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے سے سیاح کا مطلب یہ ہے کہ وہ برہمن ہندو مت کا پیرو تھا۔ ممکن ہے کہ وہ بعد کے زمانے میں سین خاندان کے راجاؤں کی طرح برہمن چھتری ہو۔ اس کے ملک میں بدھ مذہب کا نہ تو کہیں نام و نشان تھا اور نہ وہاں کوئی خانقاہ پائی جاتی تھی۔[13]

خاندان پال

اس کے بعد کی چند صدیوں تک کامروپ کی سیاسی تاریخ کے کچھ حالات معلوم نہیں۔ یہ ریاست بنگال کے خاندان پال کے بعض راجاؤں کی سلطنت میں شامل تھی اور اس خاندان کے ایک راجا کمار پال نے بارہویں صدی عیسوی میں اپنے وزیر ودیا دیو کو یہ علاقہ شاہانہ اختیارات کے ساتھ دے دیا تھا۔[14]

قوم آہوم

تیرہویں صدی کے اوائل یعنی 1228ء کے قریب شان قوم کے ایک قبیلے آہوم کی یورشیں شروع ہوئیں۔ رفتہ رفتہ یہ آہوم سردار ملک کے مالک بن بیٹھے اور انہوں نے ایک شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی جو 1825ء میں انگریزوں کی فتح تک برابر قائم رہا۔ کامروپ کے شاہی خاندان کی تاریخ میں چونکہ محض مقامی دلچسپی ہے اس لیے اس کو یہاں نظرانداز کیا جاتا ہے۔

مذہب

دنیا کی نظروں میں اس صوبے کی عزت واحترام کے اسباب کچھ اور ہی ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس میں سے ہو کر مغربی چین کی منگول نسل کی اقوام یکے بعد دیگرے ہندوستان کے میدانوں میں داخل ہوتی رہی ہیں اور آج کل بھی یہاں آباد قبائل تقریباً خالص منگولی ہیں۔ ان اقوام وقبائل کا مذہب مقامی اہمیت کے علاوہ اور بہت زیادہ توجہ طلب ہے کیونکہ یہیں پر بدھ مذہب اور ہندو مت کے اس تنزلی ارتقاء کا اصل منبع ملتا ہے جو زمانہ وسطیٰ اور زمانہ موجودہ کے بنگال کا خاص امتیاز رہا ہے۔ گوہاتی کے قریب ساکھیا کا مندر ساکت ہندوؤں کا سب سے متبرک مقام ہے جو دیوتاؤں کو عورتوں کی صورت میں پوجنے کے عادی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تمام علاقہ ہندوؤں کی حکایات میں جادو اور سحر کا اصلی موقع تھا۔ آج کل لوگ رفتہ رفتہ قدیم قبائلی عقائد کو چھوڑ کر متعصبانہ طور پر ہندو عقائد اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اور آسام کی تاریخ میں ایسے عمل کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ برہمنوں نے رفتہ رفتہ غیر آریہ نسل کے سرداروں میں اپنا رسوخ اور ان کے دلوں پر قابو حاصل کرلیا ہو اور ان کو ہندو مت کے وسیع دائرے میں شامل کرلیا ہو۔ تبدیل و جذب مذہب کے تمام وہ مختلف طریقے جن کا ذکر سر الفرڈ لائل اور سر ایچ رسلے نے کیا ہے' یہاں وقتاً فوقتاً استعمال ہوتے رہے ہیں۔ [5]

اسلامی حملہ

آسام کی ایک اور خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے ان چند صوبوں میں شامل ہے جن کے باشندوں نے متواتر کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کی ترقی کے سیلاب کو روک دیا اور ان کی متعدد کوششوں کے باوجود اپنی خود مختاری کو برقرار رکھا۔ کامروپ پر مسلمانوں کا صرف ایک ہی حملہ ایسا ہے جو اس کتاب کی حدود میں آتا ہے۔ یہ حملہ محمد بن بختیار فاتح بنگال وبہار نے 1204ء (601ھ) [illegible] وہ دریائے کرتویا کے کنارے' جو اس [illegible] میں کامروپ

کی مغربی سرحد تھا' شمال کی طرف بڑھا اور دار جلنگ کے شمال تک کوہستان کو قطع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر کیونکہ وہاں کسی جگہ قیام نہ کر سکا اس لیے مراجعت پر مجبور ہوا۔ یہ مراجعت اس کے لیے قیامت ہوگئی۔ کامروپ کے باشندوں نے اس زبردست سنگی پل کو جو دریا کے عبور کا صرف ایک ہی راستہ تھا توڑ دیا۔ اس وجہ سے اس کی فوج کے تقریباً تمام آدمی غرق آب ہو گئے۔ خود سپہ سالار بمشکل تمام تقریباً سو سواروں کی معیت میں تیر کر کنارے پر پہنچا مگر اس ناکامیابی کا اس کو اس قدر رنج ہوا کہ بیمار پڑ گیا۔ اس کے اگلے سال (6—1205ء) 602ھ میں وہ قتل ہو گیا۔[11] اس کے بعد کے اسلامی حملے بھی ایسے ہی ناکام ثابت ہوئے اور اس ریاست نے 1816ء تک اپنی خود مختاری کو قائم رکھا۔ اس کے بعد برمیوں نے اس کو فتح کر لیا اور 1824ء تک اس پر قابض رہے۔ ان کو انگریزی افواج نے نکال باہر کیا اور 1826ء کے اوائل میں آسام سلطنت ہند کا ایک صوبہ قرار دے لیا گیا۔

د۔ کشمیر

کشمیر کی قدیم تاریخ

تاریخ کشمیر اگر بالتفصیل لکھی جائے تو اس کے لیے ایک پورے دفتر کی ضرورت ہوگی۔ مگر اس جگہ بعض مہتم بالشان واقعات کا ذکر کر دینا ہی کافی ہوگا۔ وادی کشمیر اشوک کے وقت میں خاندان موریا کی سلطنت میں اور کنشک اور ہوشک کے عہد میں سلطنت کشان میں شامل تھی۔ راجا ہرش اگرچہ اتنا قوی تو نہ تھا کہ کشمیر کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کر لیتا' لیکن پھر بھی اس نے بدھ کے ایک فرضی دانت کے تبرک کو وہاں کے راجا سے زبردستی وصول کیا اور قنوج لے گیا۔ اس سلطنت کی مستند تاریخ کرتوک خاندان کے وقت سے شروع ہوتی ہے جس کی بنیاد درلبھ وردھن نے ہرش کی زندگی میں ڈالی تھی۔ ہیون سانگ نے مئی 631ء سے لے کر اپریل 633ء تک دو برس کشمیر میں بسر کیے۔ وہاں ایک گمنام بادشاہ نے جو غالباً درلبھ وردھن ہی ہوگا اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ اس بادشاہ اور اس کے بیٹے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا زمانہ حکومت بہت طولانی تھا۔

720ء: چندرا پید' 69—733ء: مکتا پید

موخر الذکر کے تین بیٹے بالترتیب اس کے جانشین ہوئے۔ ان میں سب سے بڑے بیٹے

چندرا پید کو 720ء میں شہنشاہ چین نے خطاب شاہی عطا کیا۔ اس کے بعد اس کے تیسرے بھائی مکتا پید جو للتادت کے نام سے مشہور ہے کی بھی اسی طرح 733ء میں عزت افزائی کی گئی۔ اس بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے 36 برس حکومت کی اور اس عرصے میں کشمیر کے زبردست رسوخ کو کشمیر کی پہاڑیوں کے باہر تک پھیلا دیا۔ چنانچہ 740ء میں اس نے قنوج کے راجا یسوورمن کو ایک شکست فاش دی۔ [۱۷] اسی طرح اس نے دریائے سندھ کے کنارے پر تبتیوں' بھوٹیوں اور ترکوں کو زیر کیا۔ مشہور و معروف سورج کے مندر مارتند نے اس کی یاد اور عظمت کو فراموش نہیں ہونے دیا۔ یہ مندر جو اس نے تعمیر کرایا تھا اب تک موجود ہے۔ اس بادشاہ کے تمام کارنامے بہت کچھ مبالغے کے ساتھ کلہن کی تاریخ میں موجود ہیں۔

جیاپید۔ آٹھویں صدی کا خاتمہ

مکتاپید کے پوتے جیاپید یا ونیادت کے متعلق اس کے دادا سے بھی زیادہ بعید از قیاس باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ غالباً یہ صحیح ہے کہ اس نے قنوج کے راجا وجرایدھ کو شکست دی اور تخت سے اتار دیا تھا' لیکن بنگال کے پوندروردھن نامی صدر مقام میں' جو اس زمانے میں جینت نامی ایک راجا کا مستقر تھا' خفیہ طور پر آنے کا قصہ جس سے تاریخ کو کوئی تعلق نہیں محض خیالی معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح نیپال کے ایک بادشاہ (جس کا عجیب و غریب نام آرمدی تھا) کے برخلاف فوج کشی' اس کی گرفتاری' ایک مضبوط قلعے میں قید اور وہاں سے حیرت انگیز طور پر رہائی محض وہمی اور قیاسی حکایات پر مبنی ہیں۔ لیکن اس کی سفاکی اور تعدی کی تفصیلات' جو تمام تر اس کے حب مال پر مبنی تھیں اور جس نے آخری زمانہ حکومت میں اس کے نام کو دھبا لگایا' ایسی ہیں کہ واقعات کے لحاظ سے قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں اور خود آج کل کے کشمیری فرمانرواؤں کی بداخلاقی کے بالکل مطابق ہیں۔ مورخ نے اپنے بیان کو ذیل کی عبارت و حاشئے پر ختم کیا ہے۔

> "اس طرح اس مشہور بادشاہ کی حکومت کے اکتیس برس گذرے جو اپنے ارادے اور قوت عاقلانہ پر پورا قابو نہ رکھ سکتا تھا۔ بادشاہوں اور مچھلیوں کی علی الترتیب دولت اور گندے پانی کی پیاس کے لیے جب شدید ہو جائے تو وہ خراب راستے اختیار کرتے ہیں' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ موت کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ مقدم الذکر کا یہ حال ان کی قسمت کے سبب ہوتا ہے اور موخرالذکر کا مچھیروں کے ہاتھ سے۔

جیاپید کے وجود کا ثبوت ان بے شمار سخت وحشیانہ سکوں سے ملتا ہے جن پر اس کا خطاب "ونیادت" منقوش ہے۔ [۱۸]

83–855ء: اونتی ورمن

نویں صدی کے آخری حصے میں اونتی ورمن کا عہد حکومت علم وادب کی سرپرستی اور بدررواور آبپاشی کے اہتمام (جو اس کے وزیر تعمیرات سُیا کے ماتحت اختتام کو پہنچی) کی وجہ سے ممتاز ہے۔[19]

902ء–883ء: شنکرورمن

اس کے بعد کے بادشاہ شنکرورمن نے میدان جنگ میں نام پیدا کیا۔ مگر وہ زیادہ تر رعایا سے مال واسباب چھیننے کے لیے قواعد وضوابط کے اختراع اور مندروں کا لٹیرا ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کے اخذ بالجبر کی تفصیلات اس وجہ سے قابل ذکر ہیں کہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایشیائی خود مختار بادشاہ کن کن نئے طریقوں سے اپنی رعایا کے مال ومتاع پر قابض ہوا کرتے ہیں۔[20]

خاندان شاہیہ کا خاتمہ

اسی کے عہد حکومت کے دوران میں کنشک کی اولاد یعنی ترکی خاندان شاہیہ کے آخری بادشاہ کا ایک برہمن للیا نے خاتمہ کردیا۔ یہ ترکی شاہیہ خاندان کے بادشاہ کابل میں 870ء (256ھ) یعنی عرب سپہ سالار یعقوب ابن لیث کے اس شہر کو فتح کرنے تک حکمراں رہے۔[21] اس سنہ کے بعد دارالسلطنت دریائے سندھ کے کنارے اوہند کے مقام پر تبدیل کردیا گیا۔ وہ خاندان جس کا بانی للیا تھا اور جو ہندو شاہیہ خاندان کے نام سے مشہور ہے، 1012ء تک قائم رہا اور اس سنہ میں مسلمانوں نے اس کو بھی نیست ونابود کردیا۔[22]

18–917ء کا قحط

نوعمر راجا پارتھ اور اس کے باپ پنگو کی نظامت کے زمانے میں 18–917ء میں ایک سخت قحط پڑا جس کا ذکر ایک ہندو حکومت کے مورخ نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> ”وتستا (یعنی دریائے جہلم) کا پانی ان لاشوں کی وجہ سے دکھائی نہ دیتا تھا جو اس میں ایک مدت سے پڑی پڑی سڑ گئی تھیں۔ سرزمین پر ہر طرح ہڈیوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ایک بھیانک قبرستان معلوم ہوتا تھا۔ بادشاہ کے وزراء اور فوج کے سپاہی چاول کو گراں قیمت پر فروخت کرکے دولت مند بن گئے۔ بادشاہ اس شخص کو

اپنا وزیر بناتا تھا جو رعایا کی مصیبت کے باوجود اتنا روپیہ فراہم کر دے جس سے فوج کی تنخواہ چکائی جا سکے۔ جس طرح کوئی شخص اپنے آرام دہ گرم حمام کی کھڑکی سے ان لوگوں پر نظر ڈالے جو اس کی دیوار تلے ابر و باد کی تکالیف میں مبتلا ہوں' اسی طرح بدبخت پنگو اپنے محل میں بیٹھا عیش منا تا تھا اور رعایا بھوکوں مر رہی تھی۔ [۲۳]

وہ لوگ جو موجودہ زمانے کے طریقہ امداد قحط پر نکتہ چینی کرنے کے عادی ہیں انہیں اس ناپاک تصویر پر خاص کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اُنمتاونتی 9۔937ء

پارتھ اپنی رعایا کو صرف چابکوں سے ہی سزا دیا کرتا تھا۔ مگر اس کا بیٹا اُنمتاونتی "جو بدمعاشی کی حد کو پہنچ گیا تھا" اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا اور لوگوں کو بچھوؤں سے ایذاء دینے لگا۔ مورخ لکھتا ہے کہ "اس بادشاہ کی یادگاری حکایات کو بیان کرنے کے ڈر سے میں بہ مشکل اپنی تاریخ کو جاری رکھنے کے قابل ہوتا ہوں' کیونکہ ان حکایات ہی سے مجھ کو اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ میں گھوڑے کی طرح بدک جاتا ہوں۔" اور تمام جرائم کے علاوہ پدر کشی بھی اس راجا کے جرائم میں شامل تھی۔ اس کی وحشت کی تفصیلات اس قدر کراہت انگیز ہیں کہ ان کا اعادہ ناممکن ہے۔ خوش قسمتی سے اس کی حکومت کا عرصہ نہایت قلیل تھا۔ وہ ایک دردناک بیماری میں مبتلا ہو کر 939ء میں مر گیا۔ [۲۴]

1003ء۔905ء: ملکہ ددا

دسویں صدی کے نصف آخر میں سلطنت کا کاروبار ایک بدنیت اور بے اصول ملکہ ددا نامی کے ہاتھ میں تھا جو خاندان شاہیہ کے ایک بادشاہ کی داری تھی۔ پہلے بادشاہ بیگم پھر نائمہ اور آخر کار تیئس برس تک ایک خودمختار ملکہ کی حیثیت سے اس عورت نے نصف صدی تک اس بدبخت ملک کو برباد و تباہ کیا۔

1028ء۔1003ء: سنگرام

اس کے بھتیجے سنگرام کے زمانہ حکومت میں ملک کو محمود غزنوی کے حملے کی وجہ سے مصائب برداشت کرنے پڑے' اور اگرچہ محمود نے اس کی افواج کو شکست دی لیکن اپنی کوہستانی سد راہ کی دشوار گذاری کی وجہ سے اس کی خودمختاری برقرار رہی۔

1063-89ء: کلس‘ 1101-1089ء: ہرش

گیارہویں صدی کے نصف آخر میں کشمیر کو‘ جو بالعموم اپنے بادشاہوں کی طرف سے ناکام و ناشاد ہی رہا ہے‘ کلس اور ہرش دو ظالم بادشاہوں کے ہاتھوں ناقابل بیان تکالیف و مصائب برداشت کرنا پڑے۔ موخرالذکر نے جو بظاہر زرا دیوانہ بھی معلوم ہوتا ہے مندروں کو لوٹنے میں شنکرورمن کی تقلید کی اور بجا طور پر اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کے بہت کم ہی ملک ایسے ہوں گے جو کشمیر کے بادشاہ اور ملکہ کی سی بے حیائی کے ساتھ شہوت رانی‘ شیطنت‘ سفاکی اور بے رحمی سے تخریب حکومت کی مثالوں میں برابری کر سکیں۔

1339ء: مسلمانوں کا مقامی شاہی خاندان

1339ء میں ایک مقامی مسلمان خاندان نے اس ملک پر قابو پایا اور چودھویں صدی عیسوی کے دوران تمام ملک میں اسلام کا دور دورہ ہو گیا۔ مگر اس کی قدرتی دشوار گذار حالت کی وجہ سے وہ ہندوستان کے بادشاہوں کی حرص و آز کی آگ سے محفوظ رہا۔ تاوقتیکہ 1587ء میں اکبر نے اسے فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔[۲۵]

۵۔ سلطنت ہائے قنوج (پنچال)‘ پنجاب‘ اجمیر‘ دہلی و گوالیار اور مسلمانوں کا ہندوستان کو فتح کرنا

قنوج کا شہر

سلطنت قنوج کی تاریخ بیان کرنے سے پہلے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس مشہور و معروف مستقر سلطنت شہر کے‘ جو اب صوبہ جات متحدہ کے ضلع فرخ آباد میں مسلمانوں کی ایک بستی کے طور پر باقی رہ گیا ہے‘ مختصر سے حالات بیان کر دیئے جائیں۔ قنوج کا شہر بہت قدیم تھا۔ مہابھارت میں متعدد جگہ اس کا ذکر آیا ہے اور دوسری صدی قبل مسیح میں پتنجلی نے ایک مشہور و معروف مقام کے طور پر اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر اب اس کو اس طرح برباد کیا گیا ہے کہ سوائے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے اور کوئی چیز اس کے عالیشان محلوں‘ مندروں اور خانقاہوں کے نشان داثر بتانے کے لیے نہیں رہ گئی۔ بطلیموس (ٹولی) کے جغرافئے میں جو 140ء کے قریب تصنیف ہوئی‘ مشرحین یہ فرض کر لیتے ہیں کہ گنگورا اور کنوزکا[۲۶] کے ناموں کی صورت میں قنوج کا دو دفعہ ذکر آیا ہے۔

مگر اس بات کی صحت کے لیے کچھ بہت بڑی اسناد موجود نہیں ہیں۔ قنوج کا سب سے پہلا مستند بیان مع وہاں کے کم وبیش حالات کے چینی سیاح فاہیان کے سفرنامے میں ملتا ہے جو 405ء میں چندر گپت دوم بکرماجیت کے عہد حکومت میں وہاں گیا تھا۔ اس کے یہ لکھنے سے کہ شہر میں فرقہ ہنایان کی صرف دو خانقاہیں اور ایک ستوپ تھا' یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی کے شروع میں قنوج کو کچھ اہمیت حاصل نہیں تھی۔ [27] غالباً شاہان گپت کی سرپرستی میں اس کی ترقی کا آغاز ہوا۔ لیکن وہ اپنے انتہائے عروج کو یقیناً اس وقت پہنچا جبکہ ہرش نے اسے اپنا دارالسلطنت بنا لیا۔ 636ء اور 643ء میں جب ہیون سانگ وہاں مقیم تھا تو فاہیان کے زمانے کے مقابلے میں وہاں زمین و آسمان کا فرق ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس سیاح نے وہاں بجائے ایک خانقاہ کے سو خانقاہیں پائیں جن میں 10000 سے کچھ اوپر دونوں فرقوں کے بھکشو مقیم تھے۔ مگر ہندومت بھی بدھ مذہب کے پہلو بہ پہلو موجود تھا اور وہاں اس کے دو سو سے زیادہ مندر اور ہزاروں پجاری دکھلائی دیتے تھے۔ شہر جو نہایت مضبوطی سے قلعہ بند کیا گیا تھا' دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر تقریباً 4 میل کے پھیلاؤ میں بسا ہوا تھا اور اس میں بہت سے خوشنما باغات اور صاف و شفاف پانی کے تالاب واقع تھے۔ شہر کے باشندے بخوبی خوشحال تھے اور ان میں بعض خاندان بہت متمول تھے۔ وہ ریشم پہنتے اور علوم و فنون میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ [28]

قنوج کی فتح و بربادی

اگرچہ نویں اور دسویں صدیوں میں قنوج کو متعدد دفعہ غنیم کی افواج نے فتح اور تباہ برباد کیا' لیکن یہ بہت جلد دوبارہ اپنی اصلی حالت پر آجاتا تھا۔ جب 1018ء کے اواخر میں محمود غزنوی اس کی دیواروں تلے پہنچا تو وہ ایک زبردست اور عالیشان شہر تھا۔ جس کی حفاظت کے لیے سات قلعے تھے جو الگ الگ موجود تھے' اور جس میں کہا جاتا ہے کہ 10000 مندر تھے۔ سلطان محمود نے مندروں کو منہدم کرایا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شہر کو اسی حالت میں چھوڑ دیا۔ پنچال کے دارالسلطنت کے باری کی طرف منتقل ہو جانے کی وجہ سے قنوج کی اہمیت اور آبادی میں بہت کچھ نقصان واقع ہوا ہوگا۔ اگرچہ بارہویں صدی عیسوی میں گرواڑ راجاؤں کے زیر حکومت اس نے کچھ تلافی مافات ضرور کرلی تھی۔ 1194ء (590ھ) میں شہاب الدین کی افواج نے جب قنوج اور اس کے ساتھ راجا جے چند کی تمام ریاست کو اپنے زیر نگین کیا تو شہر کی عظمت و شان ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ اس کی آخری بربادی شیر شاہ کے ہاتھوں ہونا لکھی تھی۔ اس نے 1540ء میں ہمایوں پر فتح پانے کی یادگار میں اسی کے قریب شیر سور نام ایک نیا شہر بسایا۔ مسلمان مورخ اس بربادی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ اس بربادی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور خود

بادشاہ کا فعل لوگوں کی نظر میں مقبول نہیں تھا۔[29]

سلطنتِ پنچال

قنوج نے اگرچہ اپنی زندگی کے زمانے میں دو مرتبہ یعنی ساتویں صدی عیسوی میں ہرش کے زیر حکومت اور نویں اور دسویں صدی میں مہر بھوج اور مہندر پال کی سلطنت کے عرصے میں شمالی ہند کا دارالسلطنت ہونے کی عزت پائی لیکن درحقیقت وہ سلطنت پنچال کا صدر مقام تھا۔ مہابھارت کی حکایت کے مطابق شمالی پنچال مع اپنے دارالسلطنت اہچھتر کے دروں کے حصے میں اور جنوبی پنچال مع صدر مقام کامپلیا کے درو پد کے ہاتھ آیا۔ اہچھتر یعنی ضلع بریلی کا موجودہ مقام رام نگر جب ہیون سانگ ساتویں صدی میں وہاں گیا ہے تو وہ اچھا خاصا بڑا شہر تھا۔ کامپلیا غالباً ضلع فرخ آباد کا مقام کمپل ہے۔ اس کی تاریخ کے متعلق بالکل کچھ معلوم نہیں۔[30] لیکن یہ دونوں صدر مقام ہرش کے زمانے میں قنوج کی ترقی کی وجہ سے گمنام ہو گئے اور اس کے زمانے کے بعد قنوج ہی پنچال کا بلا شرکت غیرے دارالسلطنت قرار پایا گیا تھا۔

ہرش کے بعد کا فتنہ و فساد

647ء میں ہرش کی موت کے بعد اس کی وسیع سلطنت میں فتنہ و فساد اور ابتری پھیل گئی۔ 650ء میں تبتیوں اور نیپالیوں کی مدد سے چینی سفیر کے ہاتھوں غاصب کے نیست و نابود ہونے پر پنچال کے علاقے پر کیا گذری' اس کا حال بالکل ہمیں معلوم نہیں۔

آٹھویں صدی کے راجگان قنوج

ہرش کی موت کے بعد قدیم ترین راجا جس کا نام معلوم ہے وہ یسوورمن تھا جس نے 731ء میں چین کو ایک سفارت بھیجی اور اس کے نو یا دس برس بعد کشمیر کے مکتا پید للتادت کے ہاتھوں شکست کھا کر دربدر ہو گیا۔[31] سنسکرت ادبیات کی تاریخ میں یسوورمن کا نام اس وجہ سے روشن ہے کہ وہ مالتی مادھو کے مصنف بھوبھوتی اور اس کے کم مشہور پراکرت کی زبان کے ایک مصنف واکپتراج کا مربی اور سرپرست تھا۔ اس کا جانشین غالباً وجرایدھ تھا۔ مگر اپنے پیشرو کی طرح اس کا بھی یہی حشر ہوا کہ کشمیر کے راجا جیاپید کے ہاتھوں شکست کھائی اور تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا۔[32] اس کے جانشین اندرایدھ کا بھی (جو 783ء میں برسرحکومت تھا) بدقسمتی نے پیچھا نہ چھوڑا اور 800ء میں بنگال اور بہار کے راجا دھرم پال نے اس کو تخت سے علیحدہ کر دیا۔ اس

اپنے ہاتھ میں نہ رکھا' بلکہ اس کو چکرایدھ نامی ایک شخص جو غالباً مفتوح راجا کا عزیز تھا' کے سپرد کر دیا۔ یہ نیا راجا گرد و نواح کے تمام راجاؤں کی رضامندی اور خوشی سے تخت نشین کیا گیا۔[۳۳] لیکن اس کی قسمت بھی اپنے پیشروؤں سے کچھ بہت اچھی نہ نکلی۔ 816ء کے قریب راجپوتانہ گرجر پرتہار کے اولوالعزم راجا ناگ بھٹ (جس کا صدر مقام بھلمال تھا) کے ہاتھ سے اس کو شکست ہوئی اور اسے بھی تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا۔[۳۴]

ناگ بھٹ اور رام بھدر

اغلب یہ ہے کہ ناگ بھٹ نے اپنی سلطنت کا صدر مقام قنوج کو قرار دے دیا تھا' اور یہ یقینی ہے کہ اس کے بعد قرنوں تک یہ شہر اس کے جانشینوں کا دارالسلطنت رہا اور اس طرح وہ ایک مرتبہ پھر خاصے عرصے کے لیے شمالی ہند کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ ناگ بھٹ کے وقت میں بیرونی حملہ آوروں کی اولاد گرجر اور مقامی حکمرانوں کی اولاد یعنی دکن کے راشٹرکوٹ (راٹھور) کے درمیان متواتر جنگ جاری رہی' اور جنوبی راجا گوبند سوم کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ اس نے نویں صدی کے اوائل میں اپنے شمالی حریف پر فتح پائی تھی۔[۳۵] ناگ بھٹ کے جانشین رام بھدر (یا رام دیو) کے متعلق' جس نے تقریباً 840ء۔825ء تک حکومت کی' کوئی خاص بات معلوم نہیں۔

مہر بھوج

رام بھدر کا بیٹا اور جانشین مہر جو اپنے خطاب بھوج کے تحت زیادہ مشہور ہے' تقریباً آدھی صدی تک حکمراں رہا (تقریباً 890ء۔840ء)۔ وہ بلاشک و شبہ ایک زبردست بادشاہ تھا جس کی ریاست کو بلامبالغہ ایک سلطنت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں یقیناً پنجاب کے ماورائے ستلج کے اضلاع راجپوتانہ کا بڑا حصہ اور اگر تمام نہیں تو موجودہ صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کا معتدبہ رقبہ اور گوالیار کا علاقہ شامل تھا۔ چونکہ بعد کے دو بادشاہوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ انتہائے مغرب میں شراستریا کاٹھیاواڑ کا علاقہ ان کے زیر تصرف تھا' جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گجرات اور مالوا یا اونتی کے علاقوں پر قابض تھے' اس لیے بہت اغلب ہے کہ یہ دور افتادہ علاقے راجا بھوج کے بھی زیر نگین ہوں۔ مشرق میں اس کی سلطنت کا ڈانڈا بنگال و بہار کے راجا دیوپال کی سلطنت سے ملتا تھا۔ چنانچہ اس کے علاقے میں اس نے کامیابی کے ساتھ فوج کشی بھی کی تھی۔ شمال مغرب میں غالباً دریائے ستلج اس کی سلطنت کی حد فاصل تھا۔ مغرب میں دریائے ہاکرا یا اوہند جو اب گم ہو گیا ہے اس کے اور اس کے دشمنوں یعنی سندھ کے مسلمان سرداروں کی سلطنتوں میں

حائل تھا۔ جنوب مغرب میں اس کا زبردست راشٹرکوٹ حریف تھا (جو مسلمانوں کا حلیف تھا) جس سے متواتر اس کی افواج کو ہشیار اور مسلح رہنا پڑتا تھا۔ جنوب کی طرف اس کی ہمسایہ سلطنت جیجا کبھکتی یعنی موجودہ بندھیل کھنڈ کی ترقی پذیر سلطنت تھی، جو غالباً اس کی باج گذار بھی تھی۔ [۳۶] بھوج اپنے آپ کو وشنو کا اوتار فرض کرنے کا شائق تھا اور اسی وجہ سے اس نے اپنا لقب "آدی وراہ" مقرر کیا تھا جو اس دیوتا کا ایک اوتار متصور ہوتا ہے۔ چنانچہ شمالی ہند میں خراب قسم کے نقرئی سکے جن پر یہ لقب منقوش ہے بکثرت پائے جاتے ہیں اور ان کی اسی کثرت سے بھوج کے عرصہ حکومت کی طوالت اور اس کے راج کی وسعت کا پتہ لگتا ہے۔ [۳۷] بدقسمتی سے اس کے زمانے میں کوئی میگاستھینز یا بان کے قسم کا شخص نہیں گذرا جو اس کے اندرونی انتظام سلطنت کا حال قلمبند کر جاتا۔ اس لیے بھوج کی سیاسیات کا اس کے عالیشان پیشروؤں کے نظام سلطنت سے مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔

مہندرپال

بھوج کے بیٹے اور جانشین مہندرپال (مہندرایدھ) نے جو وسیع سلطنت اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی اس کو بلا کم و کاست محفوظ رکھا اور پنجاب اور دریائے سندھ کی وادی کے سوا بہار (یا مگدھ) کی حدود سے لے کر بحیرہ عرب تک تمام شمالی ہند پر حکمرانی کرتا رہا۔ اس کے آٹھویں اور نویں سنہ جلوس کے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مگدھ بھی تھوڑی مدت کے لیے پرہار (پرتہار) کی ریاست میں شامل تھا۔ اس کا استاد (گرو) کرپور منجری ناٹک اور دیگر کتب کا مشہور مصنف راجسکھری تھا جو آخر میں مہندرپال کے چھوٹے بیٹے کے دربار میں بھی مقیم رہا۔ [۳۸]

بھوج دوم اور مہی پال

کم و بیش دو یا تین سال تک مہندرپال کا بڑا بیٹا بھوج دوم تخت نشین رہا۔ مگر وہ جلد مر گیا اور اس کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بھائی مہی پال اس کا جانشین ہوا (40-910ء)۔ [۳۹] سلطنت قنوج کے زوال و انحطاط کی ابتداء اسی کے زمانے سے ہوئی۔ 916ء میں راشٹرکوٹ قوم کے راجا اندر سوم نے نئے سرے سے قنوج کو فتح کیا۔ اس سے پرہار خاندان کی طاقت کو سخت صدمہ پہنچا۔ [۴۰] سراشٹر 914ء [۴۱] تک مہی پال ہی کے ماتحت تھا اور غالباً اس سنہ کے بعد جنوبی بادشاہ کی کامیابی کی وجہ سے دیگر دور دست صوبوں کے ساتھ یہ بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اندر سوم اس قابل نہ تھا کہ قنوج پر قبضہ کر سکے، اس لیے مہی پال نے چندیل قوم کے راجا اور غالباً دیگر حلیفوں

دیوپال

قنوج کی طاقت کے زوال اور جیجا کبھکتی کی قوت کے عروج کا ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ راجا دیوپال (تقریباً 955ء–940ء) کو بہ جبر وشنو کی ایک قیمتی مورت چندیل راجا یسوورمن کے حوالے کرنی پڑی جس نے اس کو ایک نہایت عالیشان اور خوبصورت مندر تعمیر کرا کے کھجوراہو کے مقام پر نصب کرایا۔[43] یسوورمن نے اپنی طاقت سے کالنجر کے مضبوط قلعے کو فتح کیا اور قبضہ کر کے مستحکم کر لیا تھا اور بلاشک و شبہ وہ قنوج سے بالکل خودمختار ہو گیا تھا۔ یسوورمن کے جانشین دھنگ کے وقت میں جمنا پنچال اور جیجا کبھکتی کی ریاستوں کے مابین حد فاصل قرار دیا گیا۔[44]

وجے پال

دیوپال کے بعد اس کا بھائی وجے پال تخت پر بیٹھا (تقریباً 90–955ء) اور اس کے زمانے میں خاندان کا قدیم مقبوضہ یعنی گوالیار کا علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کو کچھواہ (یعنی کچھپ گھات) قوم کے سردار وجرا ورمن نے فتح کر لیا جس نے اس مقام میں ایک خاندان کی بنیاد ڈالی جو 1128ء تک اس قلعے پر قابض رہا۔ دسویں صدی کے تقریباً درمیان میں مولراج کے گجرات میں انہلواڑہ کے مقام پر سولنکی (چلکیا) خاندان کی بنیاد ڈالنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب قنوج کے راجا کو مغربی ہند سے بھی کوئی سروکار نہ رہا تھا۔[45] گوالیار کا سردار سلطنت چندیل کا باج گزار ہو گیا جو اپنے راجا دھنگ کی ماتحتی میں (1050ء–1000ء) بظاہر اپنے حریف قنوج سے زیادہ قوی تھی۔

اسلامی حملے

اسی زمانے میں شمالی ہند کی راجپوت ریاستوں کے سیاسی معاملات مسلمان حملہ آوروں کی دخل اندازی کی وجہ سے پیچیدہ ہو گئے۔ 712ء میں عربوں کی فتح سندھ کا کوئی اثر اندرون ملک کی سلطنتوں پر نہیں پڑا تھا اور بہ ہیئت مجموعی عربوں نے اپنے جنوبی ہمسایوں یعنی راشٹرکوٹ کی زبردست سلطنت کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ اور راجپوتانہ اور قنوج کی گرجر ریاستوں پر ان کے حملے اپنی حیثیت میں سرحدی چھاپوں سے زیادہ نہ تھے۔ لیکن اب صورت حالات بدل گئی اور اسلامی افواج زیادہ کثیر تعداد اور قوت کے ساتھ شمالی مغربی دروں میں ظاہر ہوئیں جن میں سے ہندوستان کے غنیم یکے بعد دیگرے گزرتے رہے ہیں۔

سبکتگین اور جے پال

اس زمانے میں ایک عظیم الشان سلطنت جس میں دریائے سندھ کی وادی کا بالائی حصہ اور سندھ کے شمال میں پنجاب کا بڑا علاقہ شامل تھا جو مغرب کی طرف کوہستان تک اور مشرق کی طرف دریائے ہاکرا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس پر ایک راجا جے پال نامی حکمراں تھا جس کا صدر مقام بھٹنڈا تھا جو لاہور کے جنوب مشرق اور پٹیالہ کے مغرب میں واقع ہے۔ سبکتگین امیر غزنی نے ہندوستان پر سب سے پہلے 7-986ء (376ھ) میں یورش کی۔ اس کے دو سال کے بعد جے پال نے امیر غزنی کے علاقے پر حملہ کر کے اس کا بدلہ لینا چاہا مگر شکست کھائی اور مجبور ہو کر ایک صلح نامہ لکھا جس کی رو سے کثیر مقدار روپیہ نقد' بہت سے ہاتھی اور دریائے سندھ کے مغرب میں چار قلعے اس کے حوالے کرنے پڑے۔ جے پال کے نقض عہد نامے کی وجہ سے سبکتگین نے اس کو سزا دینے کے لیے سرحد پر لوٹ مار مچائی اور لمغان (جلال آباد) پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بہت جلد (تقریباً 991ء) جے پال نے اپنے ملک و سلطنت کی حفاظت کے لیے آخری کوشش کی۔ ہندی راجاؤں کا اتحاد قائم کیا جس میں چندیل کا راجا گند' قنوج کا حکمراں راجا راجیاپال اور دیگر راجا شامل تھے۔ اس زبردست فوج کو جو اس طریقے سے جمع کی گئی تھی دریائے کرم کی وادی میں شکست فاش ہوئی اور پشاور پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ نومبر 1001ء میں جے پال کو سلطان محمود کے ہاتھ سے پھر شکست ہوئی۔ وہ اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکا اور خودکشی کر لی۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا انندپال ہوا۔[46]

راجیاپال اور سلطان محمود

قنوج میں وجے پال کی جگہ اس کا بیٹا راجیاپال' جو بیرونی حملہ آور کو روکنے کی کوشش میں شریک ہوا تھا' تخت پر بیٹھا۔ چند سال بعد (997ء) سبکتگین کا تخت و تاج ایک تھوڑے سے تنازعہ کے بعد اس کے بیٹے نامی و نامور سلطان محمود کے ہاتھ آیا جس نے اپنی زندگی کا فرض قرار دے لیا کہ ہندوستان کے "کفار" پر یورشیں کی جائیں اور ان کا مال و متاع لوٹ کر غزنی لے جایا جائے۔ اندازہ ہے کہ اس نے ہندوستان پر بے کم و کاست سترہ حملے کیے۔ اس کا دستور تھا کہ وہ اکتوبر میں اپنے دارالسلطنت سے روانہ ہوتا تھا اور تین مہینے کے متواتر سفر کے بعد ہندوستان کے سرسبز و شاداب ترین صوبے میں پہنچ جاتا تھا۔ ماہ جنوری 1019ء کے اوائل میں وہ قنوج کے سامنے نمودار ہوا۔ راجیاپال نے اپنے مستقر سلطنت کے بچاؤ کی کوئی بڑی کوشش نہ کی اور ساتوں قلعے جو شہر کی حفاظت کے لیے تھے ایک ہی دن میں محمود کے ہاتھ آگئے۔ فاتح سلطان نے مندروں

کو منہدم کرایا مگر شہر کو اصلی حالت میں چھوڑ کر مال غنیمت سے لدا پھندا غزنی پلٹ گیا۔ وقت اور موقع کی مناسبت سے راجیاپال نے بہترین شرائط حاصل کیں' اور اس کے بعد قنوج کو چھوڑ کر دریائے گنگا کے دوسری جانب باری کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ [۷]

گند اور محمود

ایسی بزدلی اور دون ہمتی سے راجیاپال کا اطاعت قبول کرلینا اس کے ہندو متحدین کو ناگوار گذرا کیونکہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس نے ان کے ساتھ دغابازی کی ہے۔ چنانچہ اسی قصور کی سزادہی کے لیے چندیل کے راجا گند کا ولی عہد ودیادھر گوالیار کے باج گذار سردار کی افواج کو ہمراہ لے کر 1019ء میں سلطان محمود کی واپسی کے بعد ہی فوراً قنوج پر حملہ آور ہوا اور راجیاپال کو قتل کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ترلوچن پال اس کی چھوٹی سی ریاست کا مالک ہوا۔ سلطان محمود کو جب راجا کی (جس کو وہ اپنا باج گذار سمجھتا تھا) شکست و سزا کا حال معلوم ہوا تو اس کے غیظ و غضب کی کچھ انتہاء نہ رہی اور اسی سال (410ھ) کے موسم خزاں میں وہ پھر ہندو راجاؤں سے انتقام لینے کی غرض سے روانہ ہوا۔ 1020ء کے اوائل میں اس نے پرتہار کے نئے صدر مقام باری کو بلا دقت و مشکل فتح کیا اور اس کے بعد چندیل کے علاقے میں بڑھا۔ یہاں گند نے بظاہر ایک مہیب فوج اس کے مقابلے کے لیے تیار کی۔ مگر چندیل راجا کا دل اندر ہی اندر بیٹھ گیا اور وہ بھی راجیاپال کی طرح بغیر لڑے بھڑے میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ اس کی چھاؤنی کا مال ومتاع' اسلحہ اور ہاتھی سلطان کے ہاتھ آئے اور اس نے بدستور سابق بہت سامال غنیمت لے کر غزنی کی طرف مراجعت کی۔ [۸]

راجیاپال کے جانشین

ترلوچن پال کی نسبت سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں کہ اس نے 1019ء کے اواخر یا 1020ء کے آغاز میں سلطان محمود کے دریائے جمنا عبور میں بے سود مزاحمت کی اور 1027ء میں الٰہ آباد کا ایک گاؤں کسی کو عطا کیا۔ [۹] ممکن ہے کہ ایک راجا یسرپال' جس کا ذکر 1032ء کے ایک کتبے میں پایا جاتا ہے' اس کے بعد ہی اس کا جانشین ہوا ہو۔ [۱۰] 1194ء میں قنوج کی آخری فتح کے بعد بھی بعض گمنام راجا جو غالباً مسلمانوں کے ماتحت تھے' قنوج کے راجا تسلیم کیے جاتے رہے۔ ان میں چند سرداروں کے نام بھی محفوظ رہ گئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جونپور کے قریب ظفر آباد کے مقام پر سکونت پذیر تھے۔ مگر یہ سردار گرجر پرتہار کے شاہی خاندان سے نہ تھے جو بالکل ہی نیست و نابود ہو چکا تھا۔ 1090ء سے ذرا قبل قبیلہ گھڑواڑ کا ایک راجا چندر دیو

قنوج کو فتح کر کے اس پر قابض ہو گیا تھا اور اسی راجا نے یقیناً بنارس اور اجودھیا اور غالباً دہلی کے علاقے کو زیر نگین کر لیا تھا۔[۵۱] شہر دہلی تقریباً ایک صدی قبل 4-993ء بسایا گیا تھا۔[۵۲]

قنوج کا گھڑواڑ خاندان

گھڑواڑ کا خاندان جو آخر میں راٹھور[۵۳] کے نام سے مشہور ہو گیا اور جس کی بنیاد چندر دیو نے ڈالی تھی' 1194ء (590ھ) میں شہاب الدین کی فتح تک قائم رہا۔ چندر دیو کا پوتا گوبند چندر مدت دراز تک حکمراں رہا۔ اس کی حکومت کا زمانہ 1155-1104ء ہے۔ اس کے بے شمار عطیات اراضی اور سکوں کے بکثرت پائے جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ایک مرتبہ پھر قنوج کی عظمت و شان قائم کرنے اور اپنی طاقت و قوت بہت کچھ بڑھانے میں کامیابی ہو گئی تھی۔[۵۴]

گوبند چندر کا پوتا جے چندر تھا جو ہندی اشعار اور شمالی ہند کی حکایات میں راجا جے چند کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بیٹی کو اجمیر کا دلیر رائے پتھورا اٹھا کر لے گیا تھا۔

وہ اسلامی مورخین میں راجا بنارس کے نام سے مشہور تھا اور غالباً یہ شہر اس کا دارالسلطنت تھا۔ اس زمانے میں وہ ہندوستان کا سب سے بڑا بادشاہ مانا جاتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس کی سلطنت چین کی سرحد سے لے کر مالوا تک اور سمندر سے لے کر لاہور سے دس روز کی مسافت تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی اس وسعت کو باور کرنا ذرا مشکل ہے۔ شہاب الدین کا اس سے مقابلہ دریائے جمنا کے کنارے اٹاوہ کے ضلع میں چنداور کے مقام پر ہوا اور اس کی مہیب اور بے شمار فوج کو سخت خوں ریزی کے ساتھ شکست دی اور قتل کیا۔ اس میں راجا بھی شامل تھا۔ وہ بنارس کی طرف بڑھتا چلا گیا جس کو اس نے لوٹا اور وہاں کا خزانہ 1400 اونٹوں پر لاد کر لے گیا۔[۵۵] اس طرح قنوج کی خود مختار سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ جب گھڑواڑ خاندان کے راجا معدوم اور نیست و نابود ہو گئے تو ان کی جگہ مہوبا کے چندیل قوم کے سرداروں نے لے لی جو آٹھ قرنوں تک قنوج اور اس کے مضافات پر حکمراں رہے۔[۵۶]

سامبھر اور اجمیر کے چوہان' دہلی

کتبات میں چوہان (چاہمان) نسل کے راجپوت بادشاہوں کا' جو راجپوتانے میں سامبھر (ساکمبھری) پر (جس میں اجمیر کا علاقہ بھی شامل تھا) حکمراں تھے' ایک طولانی شجرہ نسب درج ہے۔ ان میں سے صرف دو فرماں روا قابل ذکر ہیں۔ بارھویں صدی کے وسط میں وگرہ راجا (وسلدیو۔ یا بنسیلدیو) نے آبائی سلطنت کی وسعت میں بہت کچھ ترقی دی' اور فرض کیا جاتا ہے

اس نے تمر خاندان کے ایک راجا سے دہلی کو بھی فتح کیا۔ یہ سردار اس انگ پال کی اولاد میں سے تھا جس نے ایک صدی قبل وہ لال قلعہ تعمیر کرایا تھا جہاں آج کل قطب مینار قائم ہے' اور اس طرح اس شہر کو جو 4-993ء میں آباد ہوا تھا مستقل کر دیا تھا۔[57] یورپ کے افراد دہلی کو ہندوستان کی بادشاہت کا مترادف سمجھنے کے اس قدر خوگر ہو گئے ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ دہلی ہندوستان کے بڑے شہروں میں سب سے زیادہ جدید ہے۔ یہ سچ ہے کہ مبہم روایات نے دریائے جمنا کے کنارے اندرپت کے گاؤں کے اردگرد کی سرزمین کو قبل از تاریخ کے اندرپرست کی شان و شوکت کا مرکز قرار دے کر چار چاند لگا دیئے ہیں اور یہ حکایات ممکن ہے کہ صحیح ہوں یا شاید نہ ہوں۔ لیکن بہرحال تاریخی حیثیت سے دہلی کا شہر گیارہویں صدی کے وسط میں انگ پال کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ وہ مشہور و معروف لوہے کی لاٹھ جس پر چندر نام کے ایک راجا کی مدح کندہ ہے اس کو تمر خاندان کے سردار نے اس کی اصلی جگہ سے (جو غالباً متھرا تھی) منتقل کر کے 1052ء میں ان مندروں کے ایک مجمع میں نصب کرایا تھا جن کے سامان تعمیر سے آخر میں مسلمانوں کی عالیشان مسجد بنائی گئی۔[58]

وگرہ راجا یا وسلدیو

وگرہ راجا (چہارم) یا وسلدیو' جس کا خاندان تمر سے دہلی کا فتح کرنا ذرا مشتبہ ہے' خاص طور پر ایک ممتاز آدمی تھا۔ چند سال ہوئے کہ اجمیر کی جامع مسجد کی مرمت و ترمیم کے موقع پر سنگ مرمر کے چھ تختے پائے گئے ہیں جن پر سنسکرت اور پراکرت میں عبارتیں منقوش تھیں۔ زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ دو نامعلوم ناٹکوں کے بڑے حصے ہیں۔ ان میں سے ایک "للت وگرہ راجا ناٹک" وگرہ راجا کی مدح میں لکھا گیا تھا اور دوسرا "ہرکلی ناٹک" خود راجا کی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔[59]

پرتھوی راج یا رائے پتھورا

اس عالم فاضل سپاہی کا بھتیجا سامبھر اور اجمیر کا بادشاہ پرتھوی راج یا پرتھی راج یا رائے پتھورا تھا جو اشعار اور حکایات میں ایک دلیر اور جانباز عاشق مزاج اور بہادر و جوانمرد سپاہی کی صفات سے مشہور ہے۔ جانباز عاشق ہونے کی شہرت اس کو قنوج کے گھڑواڑ راجا جے چند کی بیٹی کو بھگا لے جانے سے حاصل ہوئی' جو 1175ء کے قریب کا واقعہ ہے۔ سپاہی ہونے کی حیثیت سے وہ اول تو چندیل راجا پرمال کی شکست اور 1182ء میں مہوبا کی فتح اور دوسرے اسلامی حملے کی مزاحمت کے سبب بجا طور پر مشہور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے پتھورا کو شمالی ہند کا ہیرو صحیح

معنوں میں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے حسن و عشق اور جنگ و جدل کے افسانے آج تک اشعار اور گیتوں میں زبان زد خلائق ہیں۔[60]

ترائن یا تلاوری کی جنگ

شہاب الدین اس سے قبل ہی پنجاب کے ایک بڑے حصے کا مالک ہو چکا تھا۔ اس کے ماتحت اسلامی افواج کا خوف شمالی ہند کی مخالف اور دشمن ریاستوں کے دل پر اس قدر غالب آیا کہ اپنے تمام قضیوں اور تنازعوں کو ایک مرتبہ برطرف رکھ کر اس غیر ملکی دشمن کی مخالفت کے لیے متحد اور کمربستہ ہوگئیں۔ شروع میں قسمت نے ہندوستانیوں کی یاوری کی اور 1191ء (578ھ) میں پرتھوی راج نے تھانیسر اور کرنال کے درمیان ترائن یا تلاوری کے مقام پر حملہ آور کو ایسی سخت شکست فاش دی کہ وہ دریائے سندھ کے اس پار پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ اس کے ایک سال بعد 1192ء میں سلطان شہاب الدین ایک نئے اور تازہ دم لشکر کے ساتھ واپس آیا اور اسی پرانے مقام پر پرتھی راج کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوا۔ پرتھی راج ایک مہیب اور زبردست فوج کا سپہ سالار تھا جس میں باج گذار راجاؤں کی فوجیں بھی شامل تھیں۔ مگر بارہ ہزار مسلمانوں سواروں کے حملے سے ہندوستانی افواج کو پھر وہی سبق ملا جو صدیوں پہلے سکندر اپنی فوج کشی کے زمانے میں ہندوستانیوں کو دے چکا تھا۔ اور یہ صریحاً ثابت ہوگیا کہ ہندوستان کی غیر تربیت یافتہ فوج مرتب و منضبط سواروں کے لشکر کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ پرتھی راج اس جنگ میں گرفتار ہوا اور بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ اس کے دارالسلطنت اجمیر کے باشندے یا تو قتل ہوئے یا غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے۔[61]

ہندوستان کی فتح

1193ء و 1194ء میں دہلی اور قنوج دونوں فتح ہوگئے۔ مقدم الذکر سنہ میں ہندو مذہب کا سب سے مقدس مقام بنارس بھی فاتحین کے ہاتھ آیا اور اب ان لوگوں کو برہمنوں کی سرزمین میں اسلام کے بول بالا ہونے کا یقین ہوگیا۔ 1196ء میں گوالیار کی حوالگی، 1197ء میں گجرات کے دارالسلطنت انہلواڑہ کی فتح اور 1203ء میں کالنجر کے اطاعت قبول کرنے سے تمام شمالی ہند کی فتح مکمل ہوگئی اور 6-1205ء (602ھ) میں جب شہاب الدین فوت ہوا ہے تو:

> "تمام ہندوستان خاص (سوائے مالوا اور اس کے مضافات کے) کم و بیش اس کے ہاتھ میں تھا۔ سندھ اور بنگال یا تو بالکل فتح ہو چکے تھے یا ان کی فتح نہایت تیزی سے جاری تھی۔ گجرات پر سوائے دارالسلطنت انہلواڑہ (نہروال) کے قبضے کے اس کو کسی طرح کا

قابو نہ تھا۔ ہندوستان کا بڑا حصہ بلاواسطہ اس کے افسروں کے ہاتھ میں تھا اور باقی علاقہ زبردست یا کم از کم باج گذار راجاؤں کے ماتحت تھا۔ ریگستان اور کچھ کوہستانی علاقہ محض غفلت کی وجہ سے خود مختار باقی رہ گیا تھا۔ [62]

قوم گھڑواڑ کا نقل مکان

مسلمانوں کے ہاتھوں قنوج کی فتح کا ایک بڑا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ قوم گھڑواڑ کثیر تعداد میں راجپوتانہ کے ریگستانی علاقہ مارواڑ میں نقل مکان کر گئی' جہاں مقیم ہونے کے بعد وہ راٹھور کے نام سے مشہور ہو گئی۔ یہ ریاست جو آج کل اپنے صدر مقام جودھ پور کے نام سے مشہور ہے' راجپوتانے کی ریاستوں میں سب سے زیادہ اہم خیال کی جاتی ہے اور [63] اسلامی افواج کے دباؤ کی وجہ سے راجپوتی قبائل کا اس طرح نقل مکان کرنا زمانہ موجودہ میں ان کی تقسیم آبادی کو سمجھنے کے لیے ایک بڑی حد تک کافی ہے۔

و۔ جیجا کبھکتی کے چندیل اور چیدی کے کلچری

جیجا کبھکتی اور چیدی

دریائے جمنا اور دریائے نربدا کے درمیانی صوبے کا نام' جو آج کل بندھیل کھنڈ کہلاتا ہے اور جس کا کچھ حصہ صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ میں شامل ہے' قدیم زمانے میں جیجا کبھکتی تھا۔ [64] اس کے اور زیادہ جنوب کا وسیع علاقہ جو آج کل صوبہ جات متوسط میں شامل ہے' تقریباً چیدی کی قدیم سلطنت کے برابر ہے۔ زمانہ وسطیٰ کی تاریخ میں یہ دونوں خاندان یعنی جیجا کبھکتی کے چندیل اور چیدی کے کلچری جن میں بعض اوقات شادی بیاہ کے ذریعے تعلقات پیدا ہو جاتے تھے اور جو عموماً بھی دوستی یا دشمنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے اکثر وابستہ رہتے تھے' بہت مشہور و معروف ہیں۔ گیارھویں صدی کے آغاز سے چیدی کا علاقہ دو سلطنتوں میں منقسم تھا۔ ایک تو مغربی چیدی یا ڈاہال جس کا صدر مقام جبل پور کے قریب ترپور' اور دوسرے مشرقی چیدی یا مہاکوسل جس کا دارالسلطنت رتن پور تھا۔

چندیل کے پیشرو

دیگر چند خاندانوں کی طرح چندیل سب سے بعد نویں صدی عیسوی میں صفحہ تاریخ پر نمودار ہوتے ہیں۔ اندازاً 831ء کے قریب ایک پرہار سردار کو مغلوب کر کے جیجا کبھکتی کے جنوبی

حصے کا مالک ہو گیا۔ بھمال کے اپنے ہم نفسوں کی طرح یہ پرہار قبیلہ بھی یقیناً ان گرجر یا گوجر اقوام سے متعلق ہو گا جو چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں۔ قبیلہ پرہار کا دارالسلطنت نوگاؤں اور چھترپور کے درمیان موسلنیا کے مقام پر تھا۔[۶۵] پرہار کے پیشرو گھڑواڑ قبیلے کے لوگ تھے جن کے بعض افراد نے قنوج میں وہ خاندان قائم کیا جس کو غلطی سے راٹھور کہا جاتا ہے۔

چندیل قوم کے منادر اور جھیلیں

راجگان چندیل عمارات تعمیر کرانے کے بڑے شوقین تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سلطنت کے بڑے شہروں جیسے مہوبا' کالنجر اور کھجوراہو میں عالیشان مندر بنوائے اور پہاڑوں کے درمیان میں زبردست بند باندھ کر خوبصورت جھیلیں بنائیں۔ اس قسم کے بند باندھنے اور جھیلیں بنانے میں چندیل نے دراصل گھڑواڑ کی نقل کی تھی کیونکہ بندھیل کھنڈ کی بعض نہایت خوبصورت جھیلوں کو موخرالذکر قوم کی طرف ہی منسوب کیا جاتا ہے۔

یسوورمن

قوم چندیل دراصل ہندو مذہب و تہذیب کا اثر لیے ہوئے گونڈ تھے جن کا قریبی تعلق اسی قسم کی ایک اور اصل باشندوں کی قوم بھر سے تھا۔ اس قوم نے پہلے پہل چھترپور کے قریب ایک چھوٹے سے علاقے پر قبضہ حاصل کیا اور پھر رفتہ رفتہ شمال کی طرف پھیلتے گئے' یہاں تک کہ دریائے جمنا ان کا اور سلطنت قنوج کا حد فاصل قرار پایا۔ ممکن ہے کہ وہ شروع میں راجا پنچال کے زبردست اور طاقتور راجاؤں بھوج اور مہندرپال کے باج گزار ہوں۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں یہ لوگ بالکل خود مختار ہو گئے تھے۔ ہرش چندیل نے غالباً دوسرے متحدین کی مدد سے مہی پال کو دوبارہ قنوج کا تخت دلوا دیا جہاں سے اندر سوم راشٹرکوٹ نے اسے 916ء میں نکال باہر کیا تھا۔ ہرش کے بیٹے اور جانشین نے کالنجر کے قلعے کو فتح کر کے اپنی قوت میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ چنانچہ وہ اس قدر طاقتور ہو گیا تھا کہ اس نے مہی پال کے جانشین دیوپال کو وشنو کی ایک مورت' جس کو وہ اپنے کھجوراہو میں تعمیر کیے ہوئے مندر میں نصب کرنا چاہتا تھا' حوالے کرنے پر مجبور کیا۔

999ء۔950ء' دھنگ

یسوورمن کا بیٹا راجا دھنگ (999۔950ء) جس نے سو برس سے کچھ زیادہ ہی عمر پائی' اس

خاندان کا سب سے زیادہ مشہور بادشاہ تھا۔ کھجوراہو کے بعض سب سے عالیشان مندر اسی کی فیاضی اور سخاوت کی وجہ سے معرض وجود میں آئے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے وقت میں سیاسی معاملات میں پوری پوری شرکت کی۔ 989ء یا 990ء میں وہ اس اتحاد میں شریک تھا جو پنجاب کے راجا جے پال نے سبکتگین کی مزاحمت کے لیے قائم کیا تھا' اور اجمیر اور قنوج کے راجاؤں کے ہمرکاب اس شکست میں بھی ان کا ہاتھ بٹایا جو ان اتحادیوں کو بنوں اور غزنی کے درمیان وادی کرم (کرمہ) میں یا اس کے قریب کہیں ہوئی۔

1025ء–999ء' گند

جب محمود غزنوی نے تمام ہندوستان کے ملک کو اپنی فوج کے پیروں سے روند ڈالنے کی خواہش ظاہر کی تو دھنگ کا بیٹا گند (1025–999ء) اس اتحاد میں شریک ہوا جو 9–1008ء (399ھ) میں جے پال کے بیٹے انند پال نے ہندو راجاؤں میں قائم کیا۔ مگر یہ اتحاد بھی پہلی مرتبہ کی طرح حملہ آور کی مزاحمت میں کامیاب نہ ہوا۔ اس کے دس سال بعد جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ گند کے بیٹے نے قنوج پر حملہ کر کے وہاں کے راجا جے پال کو (جس نے مسلمانوں کے ساتھ بشرائط صلح کرلی تھی) قتل کر دیا۔ لیکن 1033ء (413ھ) کے اوائل میں اسے خود مجبوراً کالنجر کا قلعہ محمود غزنوی کے حوالے کر دینا پڑا۔ مگر بہرحال محمود نے اندرون ملک اپنی دوسری فتوحات کی طرح اس قلعے کو بھی اپنے ہاتھ میں نہ رکھا۔

1070ء–1015ء: کانگیا دیو اور کرن دیو کلچری

چیدی کا کانگیا دیو کلچری بھی (تقریباً 1040–1015ء) جو گند اور اس کے جانشینوں کا ہمعصر تھا' ایک لائق اور اولوالعزم راجا گذرا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد اعلیٰ یہ قرار دیا تھا کہ شمالی ہند میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ زبردست طاقت بنالے۔ چنانچہ اس کام میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوا۔ 1019ء میں اس کی حکومت ترہت کے دوردست علاقے میں تسلیم کرلی گئی۔[٦٦] اس کے بعد اس کے بیٹے کرن دیو نے (تقریباً 1070–1040ء) باپ کا شروع کیا ہوا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو ترقی دی۔ چنانچہ 1060ء میں اس نے گجرات کے راجا بھیم سے مل کر مالوا کے عالم و فاضل راجا بھوج کو شکست دی۔ اس سے قبل 1035ء کے قریب وہ مگدھ کے پال خاندان کے راجا پر حملہ آور ہو چکا تھا۔

1049ء-1100ء: کیرتی ورمن چندیل

اس کے چند سال بعد کرن دیو کو دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا سبق ان پے در پے شکستوں سے حاصل ہوا جو اس نے چند غنیم بادشاہوں کے ہاتھ سے کھائیں۔ ان میں ایک شکست جو اس نے کیرتی ورمن چندیل (1049-1100ء) کے ہاتھ سے، جس نے اپنے خاندان کی سلطنت کو بہت کچھ وسعت دے دی تھی، کھائی زیادہ قابل توجہ ہے۔ چندیل قوم کے نادر الوجود سکوں کے قدیم نمونے اسی بادشاہ کے مضروبہ سکوں میں پائے جاتے ہیں جن کو اس نے چیدی کے راجا کانگیادیو کے سکوں کی نقل میں مضروب و رائج کیا تھا۔ ادبیات کی تاریخ میں کیرتی ورمن کا نام ایک عجیب وغریب تمثیلی ناٹک "پربودھ چندرودیا" (طلوع قمر عقل) کی سرپرستی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ ناٹک 1065ء میں یا اس کے قریب اس کے دربار میں دکھلایا گیا اور اس میں نہایت ہوشیاری سے ناٹک کی صورت میں ویدانت کے فلسفے کو بیان کیا گیا ہے۔[67]

1165ء-1203ء: پرمال

قوم چندیل کا آخری راجا جس نے تاریخ کی حیثیت سے کوئی کار نمایاں کیا وہ پرمودی یا پرمال (1165-1203ء) تھا۔ اس کا عہد حکومت 1182ء میں پرتھوی راج چوہان سے شکست کھانے اور 1203ء (599ھ) میں قطب الدین ایبک کے ہاتھوں فتح کالنجر کی وجہ سے مشہور ہے۔[68] شمالی ہند کی مقبول رزمیہ نظم "چندراسا" چندیل اور چوہان اقوام کی جنگوں سے بھری پڑی ہے۔

1203ء (موسم بہار)، کالنجر کی حوالگی

پرمال کی موت اور کالنجر کی فتح کا جو حال اس کے ہمعصر مسلمان مورخ نے لکھا وہ یہاں مثالاً نقل کیا جاتا ہے تاکہ اس طریق عمل کا صحیح پتہ لگ سکے جس سے کہ ہندوؤں کی سلطنتیں مسلمان فاتحین کے ہاتھوں میں آتی گئیں:-

> کالنجر کا راجہ "پرمار مردود" میدان جنگ میں نہایت تھوڑی سی مزاحمت کرنے کے بعد قلعے میں پناہ گزین ہوا اور آخر میں اپنے آپ کو حوالے کرکے "طوق غلامی" اپنی گردن میں ڈال کر وفاداری کے وعدے پر اسکے وہی اعزازت و مراتب قائم رکھے گئے جو محمود سبکتگین نے اس کے آباء واجداد کو عطا کیے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے خراج

کے بعد اج دیو نام کا دیوان اپنے آپ کو حوالہ کرنے کے لیے اس قدر مستعد نہ تھا جس قدر کہ اس کا آقا تھا۔ چنانچہ اس نے اس وقت تک اپنے غنیم کو سخت تکلیف دی جب تک کہ خشک سالی کی وجہ سے قلعے کے تمام چشمے اور تالاب نہ سوکھ گئے۔ بروز دوشنبہ 20 رجب المرجب کو محصور فوج سخت کمزوری اور بدحواسی کی حالت میں قلعے سے باہر نکلی اور مجبوراً اپنے وطن کو خالی کر دیا..... اور کالنجر کا قلعہ فتح ہو گیا جو دنیا میں اپنی مضبوطی کے لیے سد سکندری کی طرح مشہور ہے۔ مندروں کی جگہ مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ تسبیح خوانوں اور موذنوں کی آواز آسمان تک پہنچنے لگی اور بت پرستی کا نام ونشان تک مٹ گیا..... پچاس ہزار آدمیوں نے طوق غلامی پہنا اور تمام میدان ہندوؤں کی وجہ سے تیرہ و تار ہو گیا۔ ہاتھی اور مویشی اور کثیر التعداد اسلحہ بھی فاتحین کے ہاتھ آئے۔

اس واقعے کے بعد عنان فتح و نصرت مہوبا کی طرف پھیری گئی اور کالنجر کی حکومت پر ہزبرالدین حسن ارنل مقرر کیا گیا۔ جب اس نواح کے نظم و نسق سے پوری تسلی ہو گئی تو وہ بدایوں کی طرف چلا گیا جو ام البلاد ہندوستان کی سرزمین کے زبردست شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ [۶۹]

چندیل کا آخری راجہ

قوم چندیل کے راجا بندھیل کھنڈ میں محض مقامی سرداروں کی حیثیت سے سولھویں صدی تک برابر قائم رہے، مگر ان کے حالات عام طور پر دلچسپی نہیں رکھتے۔ چندیل کی قوم بھی تتر بتر ہو گئی اور موجودہ زمانے میں ان کا سب سے بڑا اور قابل ذکر نمائندہ بنگال اور منگھیر کے قریب گدھور کا راجا ہے۔

قوم کلچری کا آخری راجہ

چیدی کے کلچری یا ہیہیا راجاؤں کا ذکر آخری مرتبہ 1181ء کے ایک کتبے میں ملتا ہے۔ مگر یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ ریوا کے بھگیل قبیلے کے لوگوں نے ان کی جگہ لی تھی۔ صوبجات متحدہ کے مشرقی ضلع بلیا کے ہانبنس راجپوتوں کو صوبہ متوسط کے راجگان رتن پور کی اولاد میں سے ہونے کا دعویٰ ہے اور غالباً وہ قدیم ہیہیا نسل کی کسی شاخ سے ہیں۔ چیدی کے راجا جو بعد کے زمانے میں ہوئے وہ ایک سنہ کو استعمال کرتے ہیں جس کا سنہ 1 عیسوی سنہ کے 9-248 کے برابر ہے۔ یہ سنہ جو تریکوبھی کہلاتا ہے مغربی ہند میں ایجاد ہوا۔ چنانچہ اس کا استعمال پانچویں صدی تک پایا جاتا ہے۔ مگر راجگان چیدی کے اس سنہ کو اختیار کرنے کے اسباب معلوم نہیں

ز۔ مالوا کے پرمار (پوار)

820ء: مالوا کا پرمار خاندان

مالوا کا علاقہ دریائے نربدا کے شمال کی وہ سرزمین ہے جو قدیم زمانے میں اونتی یا سلطنت اجین کے نام سے مشہور تھی۔ یہاں کا خاندان پرمار اس وجہ سے قابل ذکر و توجہ ہے کہ وہ بعد کی سنسکرت ادبیات کی تاریخ میں بہت سے مشہور معروف مصنفین کے ناموں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس خاندان کی بنیاد نویں صدی کے اوائل میں ایک سردار اپندر یا کرشن راج نے رکھی تھی اور تقریباً چار سو برس تک یہ خاندان برابر قائم رہا۔ یہ یاد ہو گا کہ اس کے قیام کا زمانہ وہی ہے جب مختلف علاقوں میں نئے نئے خاندان قائم ہوئے دکھلائی دیتے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اپندر کوہ آبو کے قریبی اضلاع چندراوتی یا اچل گڑھ سے آیا تھا جہاں اس کی قوم مدتوں سے آباد تھی۔

974–95ء: راجا منج

اس خاندان کا ساتواں راجا منج، جو اپنے علم و فضل اور فصاحت و بلاغت کے لیے مشہور ہے، شاعروں کا نہ صرف مربی اور سرپرست تھا بلکہ خود بھی (جیسا کہ اس سے منسوب کردہ منتخبات ادبیات ثابت ہوتا ہے) ایک مشہور و معروف شاعر تھا۔ مشہور مصنف دھنجیا اور اس کا بھائی دھنک ان مشاہیر میں شامل تھے جو اس کے دربار میں حاضر رہا کرتے تھے۔ مگر بہرحال وہ اپنا تمام وقت علم و فضل کی سرپرستی اور تحصیل میں ہی صرف نہ کرتا تھا، بلکہ اس کی زندگی کا بڑا حصہ اپنے قرب و نواح سے جنگ و جدل میں گزرتا تھا۔ اس نے چھ مرتبہ چالوکیہ خاندان کے راجا تیل دوم کو شکست دی۔ مگر ساتویں مرتبہ ناکامیاب رہا اور منج نے، جو تیل کی شمالی سرحد یعنی دریائے گوداوری کو عبور کر چکا تھا، شکست کھائی، گرفتار ہوا اور 995ء کو اس کی گردن ماری گئی۔[اے]

1018–1060ء: راجا بھوج

منج کا بھتیجا مشہور و معروف راجا بھوج تقریباً 1018ء میں مالوا کے دارالسلطنت دھارا میں تخت پر بیٹھا اور چالیس برس تک شادکامی اور کامرانی سے حکومت کی۔ اپنے چچا کی طرح اس نے ملکی اور فوجی دونوں قوانین میں پوری دستگاہ حاصل کی۔ اگرچہ آج کل نواح کی سلطنتوں اور ایک دفعہ محمود غزنوی کی افواج کے ساتھ اس کی لڑائی کے حالات بالکل فراموش ہو گئے ہیں،

لیکن علم وفضل کے مربی اور خود ایک خوش سلیقہ مصنف کی حیثیت سے اس کا نام اب تک مشہور ومقبول ہے اور اس کی شہرت اب بھی ہندوؤں میں بہترین بادشاہ ہونے کی حیثیت سے زبان زد عام وخاص ہے۔ علم ہیئت' فن تعمیر' علم عروض اور دیگر علوم وفنون کی اکثر کتابیں اس کے نام سے منسوب ہیں' اور اس میں شک بھی نہیں کہ وہ سمدرگپت کی طرح ایک غیر معمولی لیاقت اور قابلیت کا بادشاہ تھا۔ دھارا میں اس جگہ جہاں کسی زمانے میں بھوج کا سنسکرت کا مدرسہ تھا اور جو غالباً ایک علم کی دیوی سرسوتی کے نام کے ایک مندر میں منعقد ہوتا تھا وہاں آج کل ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ [۲]

بھوجپور کی جھیل

بھوجپور کی عالیشان اور خوبصورت جھیل بھوپال کے جنوب مشرق میں واقع تھی۔ اس کا رقبہ اڑھائی سو مربع میل تھا اور وہ پہاڑیوں کے درمیان ایک عظیم الشان بند باندھ کر تیار کی گئی تھی۔ یہی جھیل اس کی سب سے بڑی قابل قدر یادگار تھی اور اس کے میر عمارت کی ہنرمندی اور دستگاہ پر دلالت کرتی تھی۔ پندرہویں صدی تک یہ صحیح وسالم قائم رہی۔ اس کے بعد ایک مسلمان بادشاہ کے حکم سے بند کو توڑ کر اس کو پانی سے خالی کر دیا گیا۔ چنانچہ اسکے میدان میں اب نہایت زرخیز کھیت ہیں اور اس کے درمیان سے ہو کر انڈین مڈلینڈ ریلوے گذرتی ہے۔ [۳]

آخری زمانے میں مالوا کی تاریخ

1060ء کے قریب اس لائق وفائق راجا کو گجرات اور چیدی کے متحدہ حملوں کے مقابلے میں شکست ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے خاندان کی عظمت بھی رخصت ہو گئی۔ تیرہویں صدی کے آغاز تک اس کا خاندان محض مقامی سرداروں کی حیثیت سے باقی رہا' جبکہ قبیلہ تمر کے سرداروں نے اس کی جگہ لے لی اور ان کے بعد چوہان راجاؤں کی باری آئی۔ 1569ء میں اکبر نے اس خاندان کا قلع قمع کیا اور مالوا کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کر لیا۔

ح۔ بہار و بنگال کے خاندان ہائے پال وسین

650ء' بنگال کی تاریخ ناپید ہے

ہرش نے اپنے انتہائے عروج کے زمانے میں بنگال پر حاکم اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے تھوڑی

بہت نگرانی مشرق میں دور دست سلطنت کامروپ یا آسام تک قائم رکھی تھی اور مغربی و وسطی بنگال پر تو کامل طور سے اس کے احکام و فرامین شاہی نافذ تھے۔ اس کی موت کے بعد اس میں شک نہیں کہ مقامی راجا خود مختار ہو گئے تھے' مگر ارجن اور ونگ۔ ہیون۔ تسے کی عجیب و غریب حکایت کے سوا' جس کا ذکر تیرھویں باب میں ہو چکا ہے تقریباً ایک صدی تک بنگالی کی تاریخ بالکل ناپید ہے۔ بنگال کی مقامی روایات کے مطابق وہاں کے سب سے زیادہ مشہور و معروف خاندان قنوج کے پانچ برہمنوں اور پانچ کائستھوں کی اولاد سے ہیں جن کو ایک بادشاہ آدسور نامی وہاں سے ملک میں صحیح ہندو عقائد کی تبلیغ کے لیے لایا تھا' کیونکہ بدھ مذہب کے زور و شور کے زمانے میں یہ عقائد بالکل فراموش ہو گئے تھے۔ مگر اس بادشاہ کا کوئی مستند حال اب تک دریافت نہیں ہوا۔ بہرحال آدسور کے وجود میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ وہ غالباً ایک مقامی راجا تھا اور گردونواح کے علاقے پر حکمراں تھا۔ اس کو اندازاً 700ء یا اس سے ذرا قبل کے زمانے کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ [۴ھ]

تقریباً 40-730ء: خاندان پال کا عروج

آٹھویں صدی کے آغاز (40-730ء) میں' جب کہ بنگال فتنہ و فساد کی وجہ سے پامال ہو رہا تھا' ایک سردار گوپال نامی راجا منتخب ہوا۔ اپنی زندگی کے اواخر میں اس نے اپنی سلطنت کو مغربی طرف مگدھ یا جنوبی بہار تک وسیع کیا اور کہا جاتا ہے کہ پینتالیس برس تک حکمراں رہا۔ اس نے راجپوتانے کے گرجر راجا وتسراج کے ہاتھوں شکست بھی کھائی۔ [۵ھ] وہ بدھ مذہب کا ایک دیندار پیرو تھا اور اوند پوریا اتنت پوری یعنی موجودہ شہر بہار میں (جو ایک زمانے میں پال خاندان کے آخری بادشاہوں کا دارالسلطنت بھی بننے والا تھا) ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی تھی۔ اور چونکہ بانی خاندان اور اس کے جانشینوں کے ناموں میں پال کا جزو شامل تھا اس لیے آسانی کے لیے عام طور پر اس خاندان کو (خاندان پال) ہی کہا جاتا ہے۔

800ء: دھرم پال

اس خاندان کا دوسرا راجا دھرم پال تھا۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے چونسٹھ برس حکومت کی تھی۔ مگر بہرحال اس کی حکومت کا زمانہ کم از کم اڑتیس برس ضرور رہا تھا۔ تبت کے مورخ تارناتھ نے صریحاً لکھا ہے کہ اس کی سلطنت شمال میں خلیج بنگالہ سے لے کر دہلی اور جالندھر تک' اور جنوب میں کوہستان بندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھی۔ تارناتھ کے اس بیان کی تصدیق ... کو (جس کا

دار السلطنت قنوج تھا) شکست دے کر تخت سے اتار دیا اور اس کی جگہ شمالی ہند کے دول کی رضامندی سے ' جن میں بھوج متسیا ' مدرا ' کرد ' یدو ' یون ' اونتی ' گندھار اور کیر کے راجا شامل تھے ' چکرایدھ کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ واقعہ 800ء یعنی دھرم پال کے 32ویں سنہ جلوس سے قبل (جیسا کہ اس کے عطیات کے کتبوں سے پایا جاتا ہے) ہوا۔ [۷۶] یہ بات قابل ذکر ہے کہ پوندرو ردھن کے صوبے کے چار گاؤں کے عطیہ کا فرمان پاٹلی پتر سے نافذ ہوا تھا۔ [۷۷] ساتویں صدی عیسوی میں جب ہیون سانگ اس شاہی دار السلطنت میں آیا تو اس نے اشوک کی تمام عمارات کو برباد و خستہ حالت میں پایا تھا۔ شہر میں کم و بیش ایک ہزار متنفس آباد تھے جو پرانے موقع کے محض شمالی حصے میں دریائے گنگا کے کنارے ایک جگہ بستے تھے۔ [۷۸] بظاہر جب 810ء میں دھرم پال وہاں سکونت پذیر تھا تو شہر نے اپنی گم شدہ عظمت کو ایک حد تک پھر حاصل کر لیا تھا۔ بکرم شیل کی مشہور و معروف خانقاہ جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ 107 مندر اور 6 مدرسے تھے ' دھرم پال ہی نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ دریائے گنگا کے دہنے کنارے پر تعمیر کی گئی تھی۔ مگر اس کے اصلی اور صحیح موقع کا پتہ نہیں لگا۔ [۷۹]

دیو پال ۔ نویں صدی

خاندان کا تیسرا راجا دیو پال بنگال کے قدیم ترین برہمنی ماہرین انساب کے خیال کے موافق خاندان پال کا سب سے زبردست اور طاقتور بادشاہ تھا۔ [۸۰] اس کے سپہ سالار لاؤ سین نے آسام اور کلنگ کو فتح کیا تھا۔ اس کے عطیہ کا ایک فرمان جس پر اس کے 33ویں سنہ جلوس کی تاریخ ہے مدگگریا منگھیر سے نافذ کیا گیا تھا۔ [۸۱] اپنے خاندان کے دوسرے راجاؤں کی طرح اس کو بدھ مذہب سے ایک لگاؤ اور محبت تھی۔ چنانچہ اس کی نسبت مشہور ہے کہ اس نے "کفار" کے مقابلے میں جہاد کر کے ان کے چالیس قلعے برباد کیے تھے۔ روایتاً اس نے اڑتالیس برس حکومت کی تھی۔ [۸۲]

دسویں صدی کے آخری حصے میں کامبوج نامی پہاڑی قوم کے یورش کرنے کی وجہ سے خاندان پال کی سلطنت میں رخنہ واقع ہوا ' کیونکہ انہوں نے اپنے سرداروں میں سے ایک کو بادشاہ بنا لیا۔ اس کی حکومت کی یادگار دیناج پور کا ایک ستونی کتبہ ہے جو بظاہر 966ء میں نصب کیا گیا تھا۔ [۸۳]

مہی پال اول: تقریباً 1030ء ۔ 978ء

قوم کامبوج کو خاندان پال کے نویں بادشاہ مہی پال اول نے ' جو 1026ء میں حکمراں تھا ' نکال

باہر کیا۔ اس کے متعلق یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس نے 978ء یا 980ء میں اپنی آبائی سلطنت کو نئے سرے سے حاصل کیا۔ اس کی حکومت کی مدت 52 برس قرار دی جاتی ہے۔ اس میں کچھ بہت زیادہ غلطی بھی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ کتبوں کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 48 برس تک حکمراں رہا۔[۸۴] خاندان پال کے تمام راجاؤں میں یہی راجا سب سے زیادہ مشہور ہے اور اس کے نام کے گیت چند سال قبل تک بنگال کے بہت سے حصوں میں گائے جاتے تھے اور اب بھی اڑیسہ اور کوچ بہار کے دوردست حصوں میں سنائی دیتے ہیں۔ 1023ء میں کانچی کے چول راجا راجندر نے اس پر حملہ کیا تھا۔ اسی کے عہد حکومت میں بدھ مذہب تبت میں دوبارہ زندہ ہوا جہاں وہ ایک صدی پہلے پہلے لنگدرم کے مذہبی تعصب کی وجہ سے ناپید ہو گیا تھا۔ مگدھ کے پنڈت دھرم پال اور دوسرے بزرگوں نے 1013ء میں شاہ تبت کی دعوت کو قبول کیا اور وہاں جا کر گوتم بدھ کے مذہب کی دوبارہ عزت و توقیر قائم کی۔ اس کے بعد ایک اور تبلیغی مشن 1040ء میں مہی پال کے جانشین نے پال کے عہد حکومت میں بھیجا گیا۔ اس مشن کا سرگروہ مگدھ کی خانقاہ بکرم شیل کا ایک رکن اتس تھا۔ اس نے تبت میں اپنے پیشرووں کے کام کو جاری رکھا اور تبت میں بدھ مذہب کو مستحکم طور پر قائم کر دیا۔[۸۵]

قبیلہ کیورت کی بغاوت

نے پال کے بیٹے وگرہ پال سوم نے، جس نے چیدی کے راجا کرن کو شکست دی تھی اور خود تقریباً 1080ء میں فوت ہوا، تین بیٹے مہی پال دوم، سورپال دوم اور رام پال چھوڑے۔ جب مہی پال تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے بھائیوں کو قید کر دیا اور جبر و تشدد سے حکومت کرنی شروع کی۔ اس کی اس تعدی اور ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوت پھیل گئی جس کا سرغنہ جسی کیورت قوم (یعنی کیورت ذات) کا سردار دویا یا دیوک تھا۔ یہ قوم اس زمانے میں شمالی بنگال میں بڑے زوروں پر تھی۔ انجام کار باغیوں نے مہی پال دوم کو قتل کر کے اس کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ دیوک کے بعد اس کا کام اس کے بھتیجے بھیم نے اپنے ہاتھ میں لیا اور رورندر کا بادشاہ ہو گیا۔ رام پال کسی طرح قید خانے سے بھاگ نکلا اور اپنی سلطنت کے دوبارہ حصول کے لیے مدد مانگنے کے واسطے ہندوستان کے اکثر ملکوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ آخر کار سخت جدوجہد کے بعد اس نے ایک جری فوج جمع کر لی جس میں راشٹرکوٹ (جن سے اس کا سسرالی رشتہ تھا) اور دوسرے راجاؤں کی افواج شامل تھیں۔ جنگ میں بھیم نے شکست کھائی اور رام پال نے اپنے آبائی تخت و تاج کو پھر حاصل کر لیا۔[۸۶]

رام پال کی حکومت: 1084ء۔1130ء

رام پال کے متعلق تارناتھ کا بیان ہے کہ وہ ایک تیز فہم اور زیرک آدمی تھا اور اس کی طاقت و قوت وسیع تھی۔ کیورت قوم کے غاصب کو شکست دینے کے بعد اس نے متھلا یعنی شمالی بہار کو فتح کیا جس میں موجودہ اضلاع چمپارن و دربھنگہ شامل تھے۔ یہ بھی بالکل یقینی ہے کہ کامروپ یا آسام کا علاقہ بھی اس کی سلطنت میں شامل تھا' کیونکہ اس کے بیٹے کمار پال نے اس ملک کی سلطنت مع تمام شاہی اختیارات کے ایک بہادر وزیر دویادیو کے سپرد کر دی تھی۔ بدھ مذہب اگرچہ اس زمانے کے ہندوستان میں زوال پذیر تھا لیکن رام پال کی سلطنت میں وہ زور و شور پر تھا اور مگدھ کے علاقے کی خانقاہیں ہزارہا بھکشوؤں سے بھری پڑی تھیں۔ تارناتھ اور بنگال کے بعض مورخین رام پال کو اس خاندان کا آخری یا کم از کم ایسا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں جس کی طاقت ذرا بھی وسیع نہ تھی۔ لیکن کتبات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خاندان کے پانچ راجا اور گذرے تھے۔[87]

آخری راجگان پال

1175ء میں گوبند پال حکمراں تھا اور ملکی روایات کے مطابق اسلامی فتوحات کے وقت یعنی 1197ء میں اندردیمن (پال) مگدھ کا راجا تھا۔ اس کے تعمیر کردہ قلعے اب تک منگھیر کے ضلع میں دکھلائی دیتے ہیں۔[88]

خاندان پال کی اہمیت

ہندوستان کے تمام شاہی خاندانوں میں خاندان پال نہایت عجیب و غریب خاندان ہونے کی حیثیت سے قابل یادگار ہے۔ خاندان اندھر کے سوا اور کوئی شاہی خاندان ساڑھے چار سو برس تک قائم نہیں رہا۔ دھرم پال اور دیوپال نے بنگال کو ہندوستان کی زبردست ترین سلطنت بنا دیا۔ اگرچہ بعد کے راجاؤں کی نہ تو سلطنت ہی کچھ زیادہ وسیع تھی اور نہ ان کا اثر کچھ ایسا زیادہ تھا لیکن پھر بھی ان کی سلطنت چھوٹی نہیں تھی۔ دسویں صدی کے آخری حصے میں کامبوج کے غصب اور گیارہویں میں کیورت قوم کی بغاوت نے خاندان پال کی عظمت و حکومت میں سخت رخنہ ڈالا تھا۔ اصل میں یہی دو واقعات تھے جنہوں نے راجگان سین کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مگدھ یا جنوبی بہار اور شمالی بہار میں منگھیر کا علاقہ شروع سے آخر تک (سوائے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے) برابر راجگان پال کے قبضے میں رہا۔ مگر حکومت کی آخری صدی میں سین

خاندان نے ان کو تقریباً تمام بنگال سے بے دخل کر دیا تھا۔ مقامی تاریخ کی تفصیلات ابھی تک قابل غور ہی ہیں۔[89]

علم و فن کی ترقی

دھرم پال اور دیوپال کا عہد حکومت' جو 780ء سے 892ء تک ایک صدی سے کچھ زیادہ تھا' علوم و فنون کی ترقی و تہذیب کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں دو نقاشوں دھیمان اور بتپالو (وتپال) نے مصوری' سنگ تراشی اور کانسی کی چیزیں ڈھالنے میں بڑا نام پیدا کیا تھا اور ان کے زمانے کی کچھ نایاب یادگاریں اب بھی موجود بتلائی جاتی ہیں۔[90] خاندان پال کے زمانے کی کوئی عمارت صحیح و سالم باقی نہیں رہی۔ لیکن ان کی سلطنت کے وسطی اضلاع اور خاص کر دیناج پور کے تالابوں کے آثار اور کھنڈروں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ مفاد عامہ کے کاموں کی طرف اس سلطنت کی خاص توجہ تھی۔

بدھ مذہب کی سرپرستی

بلا استثنا سب کے سب راجگان پال بدھ مذہب کے جوشیلے پیرو تھے اور علماء و فضلاء اور بے شمار خانقاہوں کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ دھرم پال (جو یقیناً ایک غیر معمولی قابلیت کا شخص تھا) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک جوشیلا مصلح مذہب تھا۔ گیارہویں صدی میں اس کے جانشین' جو تنتر کی شکل کے بدھ مذہب کے پیرو تھے' اکثر علماء کی خدمت سے مستفید ہوئے تھے جن میں ایک اتس تھا جس کا ذکر تبت کے تبلیغی مشن کے ضمن میں اس سے قبل ہو چکا ہے۔[91]

خاندان سین کی ابتداء

کیورت کی بغاوت کے قریب (تقریباً 1080ء) یا اس سے چند سال قبل کلنگ کے طاقتور راجا چور گنگا (سنہ جلوس 1076ء) نے اپنی سلطنت کو اڑیسہ کے انتہائے شمال تک وسعت دی۔ یا تو سامنت دیو نامی ایک سردار نے جو دکن سے آیا تھا اور چور گنگا کے فوجی افسروں میں شامل تھا یا سامنت دیو کے بیٹے ہیمنت سین نے کاسی پوریا کسیاری کے علاقے میں جو آج کل میور بھنج کی ریاست میں شامل ہے ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ مگر ان دونوں سرداروں میں سے بظاہر کسی کو بھی کچھ بڑی قوت حاصل نہیں ہوئی۔

وجے سین (تقریباً 58-1119ء)

لیکن سامنت دیو کے پوتے وجے سین نے یقیناً بارہویں صدی عیسوی کے آغاز (؟1119ء) میں خود مختار بادشاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور صوبہ بنگال کا بڑا حصہ خاندان پال سے فتح کر لیا تھا۔ اس طرح اس نے مستحکم طور پر خاندان سین کی بنیاد رکھ دی۔ اس کے علاوہ اور دول کے ساتھ بھی اس نے کامیابی سے لڑائیاں لڑیں اور کم و بیش چالیس برس تک حکومت کی۔ کلنگ کے راجا چور گنگا کے ساتھ، جس نے اکہتر برس تک اس ملک پر حکومت کی، اس کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہے۔

بلال سین (تقریباً 70-1158ء)

وہ سلطنت جو وجے سین نے حاصل کی تھی، تقریباً 1158ء میں اس کے مشہور زمانہ بیٹے ولال سین کے ہاتھ آئی جو بنگال کی روایات میں بلال سین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی کی بابت مشہور ہے کہ اس نے بنگال میں سب سے پہلے ذات کے قواعد و ضوابط کو رواج دیا اور برہمنوں، ویدوں اور کائستھوں میں "کلس" کا طریقہ جاری کیا۔ بعض بیانات کے مطابق اس نے گوریا لکھنوتی کو آباد کیا۔ مگر یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ یہ شہر اس سے قبل زمانے سے موجود تھا۔ ضلع ڈھاکہ میں بکرم پور کے قریب رام پال کے مقام پر اس کے محل کے نشان و آثار اب تک دکھائی دیے جاتے ہیں۔[۹۲] خاندان سین کے تمام راجا برہمنی ہندو تھے اور اس وجہ سے ان کو بدھ مذہب کے پیرو خاندان پال کے اراکین سے خاص نفرت تھی اور ذات پات کے رواج میں بھی خاصی دلچسپی تھی۔ بلال سین کا ہندو مت تنتر کی قسم کا تھا۔ برہمن انساب کا بیان ہے اس نے مذہبی داعیوں کو (جن میں سب کے سب برہمن تھے) مگدھ، بھوٹان، چٹاگانگ، اراکان، اڑیسہ اور نیپال روانہ کیا تھا۔[۹۳]

لچھمن سین (تقریباً 1200ء-1170ء)

غالباً 1170ء کے قریب بلال سین کا جانشین اس کا بیٹا لچھمن سین ہوا جس کو مسلمان مورخین نے "رائے لکھمنیا" لکھا ہے۔

بہار کی اسلامی فتح

بارہویں صدی کے آخر میں بہار اور بنگال سے پال اور سین خاندان دونوں مسلمانوں کے

حملوں کی رو میں بہ گئے' کیونکہ 1197ء یا اس کے قریب قطب الدین ایبک کے سپہ سالار محمد بن بختیار نے بہار پر بلہ کر کے اس کو فتح کیا اور اس کے ایک یا دو سال بعد نودیہ (ندیہ) پر بھی اچانک یورش کر دی۔ افواج اسلام کے سپہ سالار نے' جس کا نام اس سے قبل بھی فوجی مہموں کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کے لیے ہیبت ناک ہو رہا تھا' نہایت دلیری سے صدر مقام پر بھی قبضہ کر لیا۔ 1204ء میں ان واقعات کے تقریباً معاصر مورخ کو اس فوج کے ایک بقیۃ السیف سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اس نے اسے بتلایا کہ بہار کے قلعے پر صرف دو سو آدمیوں کے ساتھ حملہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے دلیری سے چور دروازے پر دھاوا کیا اور اس کے ذریعے سے قلعے پر قابض ہو گئے۔ بے حد مال غنیمت ہاتھ آیا اور "سر منڈے برہمنوں" یعنی بدھ مذہب کے بھکشوؤں کا اس کثرت سے قتل عام کیا گیا کہ جب فاتح سپہ سالار کو اس بات کی ضرورت ہوئی کہ کتب خانے کی کتابوں کے موضوع سے اس کو مطلع کیا جائے تو کوئی ایسا شخص میسر نہ آ سکا جو یہ خدمت انجام دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ "آخر میں معلوم ہوا کہ وہ تمام شہر اور قلعہ ایک مدرسہ تھا اور ہندی زبان میں کالج کو بہار کہتے ہیں۔[94]

بدھ مذہب کا خاتمہ

اس سفاکانہ عمل اور اسی قسم کے دیگر بے رحمی اور ظلم و تعدی کے کاموں نے بدھ مذہب کی کمر اس کے خاص وطن اور پاک زمین ہی میں توڑ دی۔ اس میں شک نہیں کہ چند لوگ اگرچہ بالکل مایوسی کی حالت میں تھے مگر چند سال تک ان قدیم مذہبی مقدس مقامات کے گرد منڈلاتے رہے۔ آج کل بھی اس مذہب کے دھندلے سے نشان بعض نامعلوم اور گمنام مذہبی فرقوں میں پائے جاتے ہیں جو کسی زمانے میں اسی علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن کوہستان ہمالیہ کے جنوب میں شمالی ہند کے علاقے میں بدھ مذہب کا آخری مرکز صرف ایک مسلمان سپہ سالار کی تلوار کی نذر ہوا اور اس کے بعد پھر کبھی اس مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔[95] بہت سے بھکشو جو اس طوفان میں کسی نہ کسی طرح سے زندہ بچ رہے نیپال' تبت یا جنوبی ہند کی طرف بھاگ گئے۔ ان پناہ گزین علماء کے اس طرح تبت میں آ جانے سے تبتی لامائے اعظم کو جسے قبلائی خاں نے مقرر کیا تھا' اس بات کا موقع ملا کہ سنسکرت کی زبان سے تراجم کے ذریعے تبتی زبان کو مالا مال کر دے۔ چنانچہ تیرہویں صدی کے آخر میں ان تمام تراجم کو تنگیر کے دائرۃ المعارف میں شامل کر دیا گیا اور ہندی پنڈتوں اور تبتی علماء کی مشترکہ محنت کو چھپائی کے ذریعے سے محفوظ رکھا گیا جس کا علم ساتویں صدی عیسوی کے دوران چین سے تبت میں آ چکا تھا۔[96]

1199ء(؟) خاندان سین کا خاتمہ

خاندان سین کا خاتمہ بھی اسی قدر یا شاید اس سے بھی زیادہ آسانی سے کر دیا گیا جس طرح کہ بہار کو فتح کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں مشرقی بنگال کا راجا لچھمن سین تھا جس کے بارے میں مسلمان مصنف نے لکھا ہے کہ وہ بہت بوڑھا تھا اور اس کے متعلق (اگرچہ غلط طور پر) یہ مشہور تھا کہ وہ اسی سال تک حکمراں رہا تھا۔ [97] اس کی پیدائش کے وقت جن خوارق عادات کا ظہور میں آنا بیان کیا جاتا ہے ان کی تصدیق راجا کی غیر معمولی لیاقت و قابلیت سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے تمام راجا اور رائے اس کی عزت کرتے تھے اور تمام ملک میں اس کی حیثیت وہی تھی جو مسلمانوں میں خلیفہ کی۔ معتبر اشخاص کا بیان تھا کہ کبھی اس نے کسی سے ناانصافی نہیں کی اور سخاوت کے لیے اس کا نام ضرب المثل ہو گیا تھا۔

اس کا دارالسلطنت نودیہ

یہ قابل احترام راجا نودیہ کے مقام پر اپنا دربار منعقد کیا کرتا تھا جو دریائے گنگا کے جنوبی علاقے میں موجودہ کلکتہ سے ساٹھ میل شمال کی جانب دریائے بھاگیرتی کے کنارے پر آباد تھا۔ انگریزی علاقے میں اس نام کا ایک ضلع نادیا اب بھی موجود ہے اور ایک مدرسے کی وجہ سے مشہور ہے جو قدیم اسلوب پر قائم کیا گیا ہے۔

1199ء: نودیہ کی فتح

غالباً 1199ء میں محمد بن بختیار نے فتح بہار سے تھوڑی سی مدت کے بعد ایک فوج بنگال کی فتح کے لیے تیار کی۔ وہ اپنی فوج سے کچھ آگے آگے چند سوار لے کر بڑھا چلا گیا اور اچانک صرف اٹھارہ سواروں کی ہمراہی میں نودیہ کے سامنے پہنچا اور درانہ شہر میں داخل ہو گیا۔ لوگوں نے اسے گھوڑوں کا تاجر سمجھ کر اس کی مزاحمت نہ کی۔ رائے (راجہ) کے محل کے دروازے پر پہنچ کر اس نے اپنی تلوار کھینچی اور اچانک محل کے نوکروں پر حملہ آور ہوا۔ راجا اس وقت کھانا کھانے میں مشغول تھا۔ وہ اس واقعے سے بالکل مبہوت ہو کر رہ گیا اور...

> (گھبراہٹ میں) ننگے پاؤں ہی محل کے پچھلے حصے کی طرف بھاگا۔ اس کا تمام خزانہ، بیویاں اور خواصیں، نوکر اور عورتیں حملہ آور کے ہاتھ آئیں۔ بے شمار ہاتھی بھی ملے اور مسلمانوں کو اس قدر مال غنیمت حاصل ہوا کہ جس کا شمار ناممکن ہے۔ جب اس (یعنی محمد) کی فوج پیچھے سے پہنچی تو تمام شہر کو قابو میں کر لیا گیا اور اس نے اسی کو اپنا صدر

مقام مقرر کیا۔

اسلامی دارالسلطنت لکھنوتی

اسی مصنف کے قول کے مطابق رائے لچھمن سین وہاں سے بھاگ کر ڈھاکہ کے بکرمپور علاقہ میں پناہ گزیں ہوا اور وہیں مرگیا۔[98] فاتح سپہ سالار نے بھی نودیہ کو برباد کر دیا اور ہندوؤں کے قدیم شہر لکھنوتی یا گور کو اپنا مستقر قرار دیا۔ سلطنت کے تمام حصوں میں اس نے اور اس کے افسروں نے مسجد' مدرسے اور اسلامی خانقاہیں قائم کیں' ان کے لیے اوقاف مقرر کیے اور مال غنیمت کا بڑا حصہ قطب الدین ایبک کے پاس روانہ کر دیا گیا۔

بنگال اور بہار کی آخری ہندو سلطنتوں کا خاتمہ نہایت بے عزتی اور بے حرمتی کی صورت میں ہوا' کیونکہ یہ یقینی ہے کہ اگر ان میں ذرا بھی زور ہوتا تو اس طرح بغیر مزاحمت کے اپنے آپ کو فنا نہ ہونے دیتیں۔[99] یہ بھی بالکل صریح ہے کہ لچھمن سین کا انتظام مملکت از حد ابتر حالت میں ہوگا کیونکہ ایک بڑی زبردست فوج بغیر اطلاع اور مزاحمت کے تمام بنگال کے علاقے سے گذر گئی اور اٹھارہ سواروں کی مختصر سی جماعت نے اس کے محل پر قابو پالیا۔

علم و ادب

مگر خاندان سین کے آخری بادشاہ کا نظم و نسق سلطنت خواہ کیسا ہی ابتر اور کمزور حالت میں کیوں نہ ہو' لیکن وہ ذاتی خوبیوں اور سنسکرت علم و ادب کے مربی و سرپرست ہونے کے لحاظ سے ہر طرح تعریف و توصیف کا مستحق ہے۔ کالی داس کے مشہور و معروف ناٹک "میگھدوت" کی تقلید میں لچھمن سین کے ملک الشعراء دھیوئی یا دھوئیک نے ایک ناٹک لکھا جو اب شائع بھی ہو چکا ہے۔ "گیتا گوبند" کا مشہور مصنف جیادیو بھی بظاہر اسی راجا کے عہد میں گذرا ہے۔ اس کے علاوہ خود راجا بھی شاعر تھا۔ اسی طرح اس کا باپ بلال سین بھی مصنف تھا۔

ط۔ راجپوت قبائل

قبائل کا ظاہری غلبہ

علم نسل انسانی کے متعلق اپنے خیالات و آراء کا اظہار یا وہمی زاویوں سے پتلی اور موٹی ناکوں' لمبے یا چپٹے سروں' ذات پات کے اسرار وغیرہ پر بحث کرنا اس کتاب کے مقاصد میں شامل

نہیں اور یہاں سرسری طور پر بھی ان کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔[۹۹] مگر اس باب کے ان حصوں کے مطالعے سے ' جن میں بہت سے راجپوت قبیلوں کا ذکر کیا گیا ہے ' ایک ہوشیار ناظر کتاب کے دل میں متعدد ایسے شکوک و سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا کسی نہ کسی طرح جواب دینا نہایت ضروری ہے۔ اولاً یہ کہ یہ راجپوت 'پرہار' پوار' چندیل وغیرہ کون تھے اور کیا وجہ ہے کہ ہرش کی موت اور مسلمانوں کے حملے کی درمیانی صدیوں میں ان لوگوں کے وجود اور معاملات سے ملک میں اس قدر ہیجان و اضطراب واقع ہو گیا؟ زمانہ وسطیٰ اور زمانہ قدیم میں تفریق کے وقت ان ہی راجپوتی قبائل کا شمالی ہند میں غلبہ سب سے زیادہ نمایاں امر ہے جس پر سب سے پہلے ہماری نظر پڑتی ہے اور ہمارا دماغ اس غلبے کی اصلیت و حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مشہور بات ہے کہ سوال کا جواب دینے سے ان کا پوچھنا زیادہ آسان ہے۔ مسئلہ زیر بحث میں واقعات اس قدر پیچیدہ اور ان کے متعلق ہماری معلومات اس قدر محدود ہیں کہ مختصراً اس کو حل کر دینا ناممکن ہے۔ لیکن پھر بھی اس موضوع پر اتنا بیان کر دینا بے کار نہ ہو گا کہ جس سے ناظر کتاب کو تمام شاہی خاندانوں کی اصلیت کو سمجھنے میں کامیابی ہو۔

کشتری

آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے دوران شمالی ہند کی سیاسی تماشہ گاہ پر راجپوت قبائل کا یک بیک نمودار ہونے کا واقعہ دراصل محض ایک دھوکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم راجاؤں کی ذات یا قوم کے متعلق کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ چنانچہ کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ اشوک یا سمدرگپت کے خاندان ہندوؤں کے معاشرتی اصول کے مطابق کس درجے اور مرتبے کے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم نہیں کہ جن زبردست بادشاہوں کے نام ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں وہ کہاں تک محض معمولی جانباز اشخاص یا کسی بڑی قوم کے سردار تھے۔ بعد کے زمانے میں تمام راجپوت خود کو کشتری خیال کرتے تھے۔[۱۰۱] یہ کشتری قوم "مکالمات بدھ" کی تصنیف کے زمانے میں بھی ہندوؤں کی سوسائٹی کا ایک جزو اعظم سمجھی جاتی تھی اور یہ لوگ اپنے آپ کو بزعم خود برہمنوں سے برتر تصور کرتے تھے۔[۱۰۲] غالباً واقعہ یہ ہے کہ نہایت قدیم زمانے سے کشتریوں کے حکمراں قبائل ' جو ہر صورت میں زمانہ مابعد کے راجپوتوں کے مماثل تھے ' ملک میں موجود تھے اور زمانہ وسطیٰ کی طرح اس وقت بھی مختلف سلطنتیں قائم کر رہے تھے۔ لیکن ان کے تاریخی حالات تمام تر ضائع ہو گئے ہیں اور صرف چند ایسے خاندانوں کے حالات باقی بچے ہیں جو غیر معمولی طور پر نمایاں اور روشن تھے۔ اس طرح یہ خاندان صفحۂ تاریخ [illegible] ضبط ہو گئے ہیں اور دوسرے بالکل فراموش ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ

کشتری کا لفظ ہمیشہ مبہم معنوں میں استعمال ہوتا تھا اور اس سے مراد ایسے حکمراں خاندان لیے جاتے تھے جو ذات کے برہمن نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات راجاذات کا برہمن ہو، لیکن شاہی دربار میں برہمن کی اصلی جگہ وزارت تھی نہ کہ تخت و تاج۔[۱۰۳] بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ چندر اگپتا موریا کو کشتری سمجھا جاتا تھا اور اس کا وزیر چانکیا یا کوتلیا یقیناً برہمن تھا۔

اس روایت میں خلل اندازی

زمانہ قدیم اور زمانہ وسطیٰ میں حقیقی فرق یہی ہے کہ مقدم الذکر کے متعلق روایات میں خلل پڑ گیا ہے اور موخر الذکر کی تمام حکایات و روایات اب تک زندہ ہیں۔ خاندانہائے موریا و گپت اس قدیم زمانے سے تعلق رکھتے ہیں کہ صرف کتابوں، کتبوں اور سکوں سے ان کے حالات معلوم ہوتے ہیں، ورنہ مدت ہوئی کہ وہ صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ قبائل جن کے خاندان زمانہ وسطیٰ سے قائم ہوئے اب تک زندہ اور موجود اور بسا اوقات موجودہ آبادی کا جز و اعظم شمار ہوتے ہیں۔

"سیتھی" عنصر

ٹاڈ اور دیگر پرانے مصنفین نے مدت ہوئی اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ راجپوت قبائل بڑی حد تک بیرونی یا غالباً سیتھی نسل کے ہیں۔ زمانہ حال کی مزید مکمل تحقیق نے ان کے خیالات کی اور زیادہ تائید کی ہے۔ اب کم و بیش صحت کے ساتھ چند بڑے قبائل میں بیرونی خون کی آمیزش کا پتہ لگ سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ راجپوت اور ان قبائل میں جو ان سے کم درجے کے تصور کیے جاتے ہیں کیا نسلی تعلق ہے۔

سک اور یو۔چی

زمانہ تاریخ میں نقل وطن کرنے کی قدیم ترین مثال قوم سک کی دوسری صدی قبل مسیح میں ملتی ہے۔ اس کے بعد پہلی صدی عیسوی میں دوسری مثال یو۔چی یا کشان قوم کے نقل وطن کی ہے۔ اغلب یہ ہے کہ موجودہ راجپوت قبائل میں کوئی بھی قبیلہ ایسا نہیں کہ جو اپنے شجرہ نسب کو اس قدر قدیم زمانے تک مرتب کر سکے۔ مجھے اس میں کسی قسم کا شک نہیں کہ جب سک اور کشان اقوام کے حکمران خاندانوں نے ہندوؤں کی تہذیب اور مذہب کو قبول کر لیا تو ان کو ہندوؤں کی کشتری ذات میں بلا تامل شامل کر لیا گیا۔ بہرحال یہ واقعہ محض قیاس کی بناء پر سمجھا جا سکتا

ہُن

مذکورہ بالا دو مثالوں کے بعد نقل وطن کا تیسرا واقعہ' جس کا ذکر تاریخ میں ہے' پانچویں صدی کے اواخر اور چھٹی صدی کے آغاز میں بیرونی وحشی اقوام کی ہندوستان پر یورش ہے۔ ایسی علامتیں ضرور موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں بھی وسط ایشیاء سے نقل وطن کرنے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ لیکن اگر ایسا ہوا ہے تو اس کے نشان بالکل مٹ گئے ہیں' اور جہاں تک حقیقی علم کی بناء پر کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ نویں اور دسویں صدی عیسوی یعنی مسلمانوں کے حملے سے قبل یہی تین بیرونی اقوام زبردست پیمانے پر ترک وطن کر کے ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا' پہلی اور دوسری تو سک اور یو۔ چی اقوام تھیں اور تیسری ہن یا سفید ہن تھے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سک' یوچی اور ہن محض ایسے نام ہیں جن سے ان گروہوں کی کثرت کو ظاہر کیا جاتا ہے' ورنہ ان میں بہت سے اور عناصر بھی شامل تھے۔ مقدم الذکر دونوں قوموں کی اولاد ہونے کا احساس مدت ہوئی کہ بالکل فراموش ہو چکا ہے۔ کابل کے خاندان ترکی شاہیہ کے بادشاہوں کو' جنہیں نویں صدی عیسوی میں ہندو شاہیہ خاندان نے نکال باہر کیا تھا' قوم کشان کے زبردست بادشاہ کنشک کی اولاد ہونے پر فخر تھا۔ مگر ان سے بعد کے زمانے میں مجھے کسی اور خاندان کے متعلق اس بات کا علم نہیں کہ وہ یو۔چی کی قرابت اور عزیز داری پر فخر و مباہات کرتے ہوں۔

ہُنوں کے حملے کا اثر

ملکی روایتوں میں جو خلل واقع ہوا اس کی بڑی وجہ تیسری وحشی قوم کی ہندوستان پر یورش ہے جس کو ہُن کہا جاتا ہے۔ ہُن کی یورشوں کا جو قلیل حال عام ادبی روایات میں پایا جاتا ہے' اس پر علم نسل انسانی' علم آثار قدیمہ اور سکوں کے ذریعے سے اس قدر روشنی ڈالی جا سکتی ہے کہ لامحالہ طالب علم کے دل و دماغ پر یہ اثر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہن قوم نے ہندوؤں کے آئین و قوانین اور رسم و رواج پر اس سے کہیں زیادہ اثر کیا تھا جتنا کہ پران اور دوسری ادبی کتابیں ظاہر کرتی ہیں۔ بالعموم ہندو مصنفین "وحشی" اقوام کی یورشوں کے بیان سے احتراز کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ان میں آپس میں "خاموشی کے لیے ایک سازش" ہو جاتی ہے۔ مثلاً وہ سکندر اعظم کے حملے یا وجود کا کبھی اشارۃ" بھی ذکر نہیں کرتے اور اسی طرح گجرات کے مورخین کی کتابوں میں محمود غزنوی کے سومنات لوٹنے کا حال نہیں پایا جاتا۔[۴] اگر اس قتل و غارت کا تفصیلی حال مسلمان مورخ نہ بیان کر دیتے تو ہندوستان کے علم و ادب یا کتبات

میں اس کا پتہ ملنا بالکل ناممکن تھا۔ اس لیے یہ امر کچھ زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز نہیں کہ ہن قوم کی یورشوں کے طوفان کا ذکر ہندوؤں کے بیانات میں بہت کم ملتا ہے اور اس کی اصلی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے ہم کو ماہرین علم آثار قدیمہ کی محنتوں اور مشقتوں پر دارومدار کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس جگہ اس پیچیدہ شہادت کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا بالکل ناممکن ہے' اور ناظرین کتاب سے اس بات کی التجا کرنی پڑتی ہے کہ وہ اس امر کو تسلیم کرلیں کہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کے دوران ہُن اور دوسری متعلقہ وحشی اقوام کے حملے نے شمالی ہند میں ہندوؤں کی معاشرت کو جڑ سے ہلا دیا' روایتوں کے سلسلے میں رخنہ ڈالا اور ذات پات اور حکمران خاندان دونوں میں نیا انتظام ضروری ہوگیا۔ اس کے علاوہ ہرش کے کارناموں کی وجہ سے (جبکہ وہ پینتیس برس تک ہندوستان میں ایک ایسی طاقت کے قائم کرنے میں کامیاب ہوا جس نے تمام مخالف عناصر کو ایک جگہ لا کر جمع کردیا اور تمام اقوام و مذاہب اس کی زبردست سلطنت کے دائرے میں آگئے) ہُن کے حملوں کے قیامت خیز اثرات بہت کچھ تاریکی میں پڑ گئے۔[۱۰۵] مگر جب اس کی زبردست شخصیت کا اثر معدوم ہوگیا تو یہ تمام عناصر ایک مرتبہ پھر بروئے کار آئے اور فتنہ و فساد کے ایک غیر معلوم زمانے کے بعد نئے سرے سے سلطنتوں کی وہ تقسیم ہوئی جس کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے۔

گرجر (گوجر)

بظاہر یہ بالکل مسلم الثبوت ہے کہ ہن قبائل یا جرگوں نے راجپوتانہ اور پنجاب میں اپنی مستقل بستیاں قائم کی تھیں۔ ہن کے بعد ان تمام لوگوں میں سب سے زیادہ غالب عنصر گرجر کا تھا جن کا نام اب بھی شمال مغربی ہندوستان میں گوجر کے لفظ میں باقی ہے اور اس کا اطلاق ایک کثیر التعداد اور منتشر قوم پر کیا جاتا ہے۔ گوجر جو ابتدائے حال میں گلہ بانی کرتے تھے' آج کل ہندوستان کی تقریباً ہر ایک ذات کی طرح زراعت پیشہ ہوگئے ہیں۔ جاٹ یا جٹ جو ان سے کہیں زیادہ کھیتی باڑی کے کام کو سرانجام دیتے ہیں بالعموم گوجروں کے ہم نسب تصور کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں کے باہمی تعلق کو ظاہر کرنا ناممکن ہے۔ جاٹ یا گوجر راجپوت یا کشتری نہیں سمجھے جاتے مگر پھر بھی پنجاب کے جٹ راجپوت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔[۱۰۶]

گرجروں کی سلطنتیں

زمانہ وسطیٰ کے آغاز میں گرجر سلطنتوں کا زور اور اہمیت کا حال زمانہ حال ہی میں معلوم ہوا

سے بڑی سلطنت کے نام سے ماہرین آثار قدیمہ برسوں پہلے واقف تھے۔ مگر نویں' دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں بھوج اور قنوج کے دوسرے زبردست راجاؤں کا گرجر قوم سے ہونا حال ہی میں تسلیم کیا گیا ہے۔ کتبوں کی تاریخوں کے پڑھنے میں چند غلطیاں واقع ہو جانے کی وجہ سے اس خاندان کی اصلی تاریخ بالکل تاریکی میں جا پڑی تھی اور چند سال قبل ہی یہ تمام غلطیاں دور کی گئی ہیں۔ اب یہ ثبوت بالکل مسلم ہے کہ بھوج (تقریباً 90-840ء)' اس کے پیشرو اور جانشین گرجر قبیلے یا ذات کے پرتمار (پرہار) فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پرہار راجپوتوں کا مشہور و معروف قبیلہ گرجر یا گوجروں کی ایک شاخ تھا۔ ۷ ؎

اگنی کل کے قبائل

"چند راسا" اور بعد کے زمانے کی دیگر کتابوں میں ایک عام روایت موجود ہے جس کی بناء پر راجپوتوں کے چاروں قبیلوں یعنی پوار (پرمار)' پرہار (پرتمار)' چوہان (چاہمان) اور سولنکی یا چولکیا کو اگنی کل کہا گیا ہے جن کا آغاز جنوبی راجپوتانے میں کوہ آبو کی قربان گاہ کے اگنی کنڈ سے ہوتا ہے۔ اس افسانے کا مقصد اس تاریخی حقیقت کو منکشف کرنا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا چاروں قبائل کا ایک دوسرے سے تعلق ہے' اور یہ کہ وہ تمام کے تمام پہلے پہل جنوبی راجپوتانہ میں ظاہر ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ' جیسا کہ مسٹر کرک نے بالکل صحیح لکھا ہے: "اس سے آگ کے ذریعہ سے پوتر کرنے کی رسم کا پتہ چلتا ہے جو جنوبی راجپوتانہ میں ادا کی گئی اور جس کی وجہ سے یہ بیرونی اقوام ہندوؤں کی ذات اور معاشرت میں داخل ہونے کے قابل ہو گئیں۔" ۸ ؎

پَرہار

یہ امر کہ ان چار قبیلوں میں سے ایک یعنی پرہار یقیناً گرجر قوم سے تھا' اس بات کے فرض کر لینے کیلئے بہت بڑی وجہ پیدا کر دیتا ہے کہ باقی تین کا سلسلہ بھی گرجر یا اسی قسم کی کسی اور بیرونی قوم سے ملتا ہو گا۔ چنانچہ اس طریقے سے راجپوتوں کے بعض مشہور ترین قبائل کی ابتداء کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ گرجروں کی نسبت یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ سفید ہنوں کے ساتھ یا ان سے تھوڑی ہی مدت کے بعد ہندوستان میں ظاہر ہوئے اور راجپوتانہ میں بکثرت بس گئے۔ لیکن کوئی شہادت ایسی موجود نہیں جس سے یہ پتہ چل سکے کہ وہ ایشیاء کے کس حصے سے آئے اور ان کا تعلق کس قوم سے تھا۔ پوار قبیلے کے صدر مقام کوہ آبو کے قریب چندراوتی اور اچل گڑھ تھے' اور ساتویں صدی عیسوی میں پرہار اپنے صدر مقام بھنمال سے (جو شمال مغرب کی سمت کوہ آبو سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع تھا) راجپوتانہ کے ایک بڑے حصے پر متصرف و قابض تھے۔

800ء کے قریب گرجروں کے علاقے کے بادشاہ ناگ بھٹ نے دریائے گنگا کے کنارے کے شہر قنوج کو فتح کیا اور اپنا دارالسلطنت وہیں منتقل کرلیا۔ اس طرح اس نے قنوج کے اس طولانی خاندان کی بنیاد ڈالی جو 1019ء میں محمود غزنوی کے شہر کو فتح کرنے تک وہاں حکمران رہا۔ اس بات کا علم کہ قنوج کے وہ راجا جو 800ء اور 1018ء کے درمیان وہاں حکمران تھے اور جن میں سے چند نے تمام شمالی ہند میں حکومت اعلیٰ حاصل کرلینے میں بھی کامیابی حاصل کرلی تھی' پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان آئی ہوئی بیرونی "وحشی" اقوام کی اولاد اور باوجود راجپوت ہونے کے دعوئ کے موجودہ گوجروں کے بھائی بند تھے' ہندوستان قدیم کی تاریخی معلومات میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھا جاسکتا ہے جو گذشتہ برسوں میں حاصل ہوا۔ اگرچہ دوسرے راجپوت قبیلوں کی تاریخ ابھی تک اس تفصیل سے معلوم نہیں ہوئی' پھر بھی یہ فرض کرلینے کی خاصی وجوہ پیدا ہوگئی ہیں کہ ان قبائل کی ابتداء بھی اسی طرح ہوئی ہوگی۔ حقیقت میں معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی بیرونی قوم ہندو مذہب اور طرز معاشرت اختیار کرلیتی تھی تو اس کے حکمراں خاندان کشتری یا راجپوت تسلیم کرلیے جاتے تھے اور ادنیٰ طبقے کے لوگ بتدریج اپنی قومی خصوصیات کو بالکل فراموش کردیتے تھے اور ان کو ہندوؤں کی ادنیٰ ذاتوں میں شامل کرلیا جاتا تھا۔

جنوبی قبائل کی دیسی ابتداء

جنوبی ملک کے بعض زبردست قبائل کی ابتداء اس سے بالکل مختلف ہے اور بظاہر یہ لوگ نام نہاد اصلی باشندوں گونڈ' بھر' کول وغیرہ کی اولاد ہیں جن کو سرہربرٹ رسلے نے "درواڑ" کے عجیب وغریب اور نامناسب نام کے تحت میں لاکر جمع کردیا ہے۔[9] چندیل اور گونڈ میں (جو آگے چل کر بھر سے مل جاتے ہیں) گہرے تعلقات کی شہادت موجود ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا کہ چندیل درحقیقت وہ گونڈ یا بھر تھے جنھوں نے ہندی تہذیب اور مذہب اختیار کرلیا تھا اور جب وہ طاقتور ہوگئے اور حکمرانی کرنے لگے جس کے لیے کشتری خاص کر مناسب سمجھے جاتے تھے تو وہ بھی کشتری یا راجپوت شمار ہونے لگے۔ اسی طرح گھڑواڑ کی شاخیں ہیں۔ دکن کے زبردست قبیلے راشٹرکوٹ کا نام' جس کی تاریخ آئندہ باب میں بیان کی جائے گی' علم اللسان کے مطابق راٹھوڑ ہی کی ایک دوسری صورت ہے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے دکن کے راشٹرکوٹ اور شمال کے راٹھوڑ میں کسی قسم کے تعلقات یا قرابت کی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقدم الذکر کی ابتداء دکن کے اصلی باشندوں کی کسی نہ کسی اصلی قوم سے اسی طرح ہوئی تھی' جس طرح چندیل ان گونڈ سے ممیز ہوگئے جو آج کل کی ریاست چھترپور کے علاقہ میں مقیم تھے۔[10]

شمالی اور جنوبی قبائل میں جنگ و جدل

زمانہ وسطیٰ کے متواتر محاربے اس بات کو سمجھ لینے کے بعد کہ وہ شمال کی بیرونی اقوام کی اولاد اور جنوب کے اصلی باشندوں کے درمیان ایک کشمکش تھی' زیادہ قابل فہم اور دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ طرفین میں نظام ہمیشہ قائم نہیں رہتا تھا اور بسا اوقات وہ دول جو فطرتی طور پر ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے آپس میں دوستانہ تعلقات بھی قائم کر لیتے تھے ۔یا سب کے سب چند روز کے لیے مسلمانوں کے مقابلے میں مجتمع ہو جاتے تھے۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ یہ کہنا بہ ہیئت مجموعی صحیح ہو گا کہ وہ قبائل جو اصلی باشندوں سے ترقی پا کر راجپوت ہو گئے تھے بیرونی اقوام کی اولاد سے بنے ہوئے راجپوتوں کے جانی دشمن رہتے تھے۔ شمالی ہند کے ان قبائل میں سے جنہوں نے اس کشمکش میں شرکت کی چوہان' پرہار' تمر اور پوار زیادہ ممتاز ہیں۔ اس کے برخلاف جنوب میں یہ شرکت کرنے والے چندیل' کلچری یا ہیہیا' گھڑواڑ اور راشٹرکوٹ تھے۔ سولنکی یا چولکیا کی ابتداء ابھی متنازعہ فیہ ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اودھ کے علاقہ سے آئے تھے۔ اغلب یہ ہے کہ وہ دوسرے تینوں قبیلوں کی طرح' جن کے ساتھ اگنی کے قصے میں ان کا نام بھی لیا جاتا ہے' دراصل بیرونی اقوام کی اولاد ہی میں سے تھے۔[۱]

خلاصہ

اس تمام مذکورہ بالا بحث میں خاص خاص باتیں جن کو یاد رکھنا چاہیے یہ ہیں کہ کشتری یا راجپوتوں کی ذاتیں حقیقی طور پر نو آبادکار ہیں جن میں وہ قبیلے شامل ہیں جنہوں نے ہندوؤں کی رسم و رواج کو اختیار کرنے کے بعد حکومت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسی وجہ سے انتہاء درجہ کی مختلف اقوام کے لوگ اس زمانے میں اور اب بھی راجپوتوں میں شامل کر دیئے گئے اور موجودہ زمانے کے اکثر زبردست راجپوت قبائل دراصل پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں آئی ہوئی بیرونی اقوام کی یا گونڈ اور بھر جیسے اصلی باشندوں کی اولاد ہیں۔ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ ہندوستان کے بہت سے ان شریف خاندانوں کو یہ ثبوت ناگوار گذرے گا جو فطرتی طور پر برہمنوں کے بنائے ہوئے ان نسب ناموں کو ترجیح دیتے ہیں جن میں چاند' سورج یا اگنی کل کو ان کے آباء و اجداد تصور کیا گیا ہے۔ اسکے باوجود مجھے یقین ہے کہ میرا بیان بہر نوع صحت پر مبنی ہے' اگرچہ شہادت کی نوعیت کے لحاظ سے اس کو سمجھانا یا مختصراً بیان کرنا ناممکن ہے۔ حاشیہ ذیل میں جو حوالے دیئے گئے ہیں ان سے طالب علم کو اس مضمون کے مزید مطالعہ میں مدد ملے گی۔[۲]

ض۔ خاندان سین کی ابتداء اور اس کا نظام سنین

موضوع کی دلچسپی

میری کتاب کے ناظرین نے بنگال کی قدیم تاریخ میں جو غیر معمولی دلچسپی لی ہے اس کی بناء پر مجھے ضروری معلوم ہوا کہ خاندان سین کے متعلق متن کتاب کے بیانات کی تصدیق کے لیے کافی جگہ نکالوں اور ان پر بحث کروں' کیونکہ یہ ایک بڑی حد تک اس کتاب کی طبع دوم کے بیانات سے مختلف ہیں اور اس وقت بہت کچھ مواد مجھے ایسا حاصل ہو گیا ہے جو گزشتہ مرتبہ دستیاب نہ تھا۔

خاندان سین کی جانشینی

سین خاندان میں علی الاتصال باپ کے بعد بیٹا اس کا جانشین ہوتا رہا۔ ان کے نام اور جانشینی کی ترتیب بلاشک وشبہ کتبوں کے بیانات سے ثابت ہو گئی ہے اور وہ یہ ہے: (1) سامنت سین (2) ہیمنت سین (3) وجے سین (4) ولال سین (بلال سین) (5) لچھمن سین (6) وسوروپ سین۔ نمبر1 و2 اڑیسہ میں محض مقامی سرداروں کی حیثیت رکھتے تھے' اور نمبر6 مشرقی بنگال میں نہایت کمزور حکمراں تھا۔ ہندوستان کی عام تاریخ میں نمبر3' 4' 5 ہی قابل ذکر ہیں کیونکہ انہوں نے وسیع علاقوں پر حکومت کی تھی اور ملک کے زبردست دول میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

معاملات جو متنازعہ فیہ نہیں

آج کل کوئی شخص یہ خیال نہیں کرتا کہ اس خاندان میں دو لچھمن سین تھے' یا وہ لچھمن سین جس کا ذکر کتبوں میں آتا ہے اس رائے لکھمینا سے جدا ہے جس کو محمد بن بختیار نے طبقات ناصری کے بیان کے مطابق نودیہ (ندیا) سے نکال دیا تھا۔ میں نے طبقات کے رائے اور کتبات کے لچھمن سین کو ایک ہی فرض کر لیا ہے۔ ایک اور معاملہ' جس کا پروفیسر کیلہارن متوفی کی مشقتوں نے فیصلہ اور بعد کی تحقیقات نے تصدیق کر دی' اس سنہ کا آغاز ہے جو لچھمن سین کے نام سے مشہور ہے۔ اس سنہ کا پہلا دن 7 اکتوبر 1119ء ہے اور اس کا پہلا سال 1120-1119ء تک شمار ہوتا ہے۔ ایک اور امر جس کو صحیح مان لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ محمد بن بختیار نے 589ھ میں جو تقریباً 1193ء کے برابر ہے مسلمانوں کے دہلی کو فتح کرنے کے بعد اور شمال مشرقی سرحد پر (جس کو

طبقات کے مصنف نے تبت لکھا ہے) حملہ کرنے سے قبل جو 601ھ (اگست 1204ء تا اگست 1205ء) میں ہوا' لچھمن سین کو نودیہ سے بے دخل کر دیا تھا۔

فتح نودیہ کی متنازعہ فیہ تاریخ

مگر نودیہ پر یورش کی صحیح تاریخ کے متعلق بہت کچھ اختلاف رائے ہے۔ کیونکہ یہ تاریخ طبقات میں مذکورہ نہیں جو تفصیلات کے لیے ہماری ایک ہی سند ہے۔ یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کتاب 658ء میں تکمیل کو پہنچی اور یہ سنہ سنہ عیسوی کے تقریباً 1260ء کے برابر ہوتا ہے۔ مصنف کتاب جو منہاج السراج کے نام سے مشہور ہے صاف طور پر لکھتا ہے کہ 641ء (جون 1243ء سے جون 1244ء) میں اس نے محمد بن بختیار کی بہار کے شہر پر یورش کا حال دو ایسے سپاہیوں سے سنا تھا جو اس حملے میں خود شامل تھے (مترجمہ ریورٹی صفحہ 552)۔ چنانچہ اس وجہ سے اس واقعہ کے متعلق اس کا تمام بیان تقریباً معاصرانہ حیثیت رکھتا ہے۔ مگر نودیہ کی یورش کے متعلق وہ اتنا زیادہ خبردار نہیں معلوم ہوتا۔

طبقات ناصری کا بیان

نہایت مختصر صورت میں مورخ کا بیان حسب ذیل ہے: بختیار کا بیٹا محمد جو ترکوں کے خلج قبیلے سے تعلق رکھتا تھا 589ھ میں قطب الدین ایبک سے ملازمت حاصل کرنے میں ناکامیاب رہا۔ ایک مدت گذرنے کے بعد جو غالباً ذرا طولانی تھی اس نے تھوڑی بہت فوجی قوت پیدا کرلی اور مرزاپور کے علاقہ میں ایک جاگیر بھی اس کو حاصل ہوگئی۔ "اسی جاگیر سے وہ منیر (مُنگھیر) اور بہار میں چھاپے مارا کرتا تھا۔" یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس نے "معتد بہ ذرائع' گھوڑے' اسلحہ اور آدمی جمع کرلیے۔" اس کے علاوہ مصنف کہتا ہے کہ "اس نے اس حصہ ملک میں برابر قتل وغارت کا بازار گرم رکھا" یہاں تک کہ اس نے بہار کے قلعہ بند شہر پر حملہ کرنے کے لیے ایک مہم تیار کی۔ چنانچہ جیسا کہ متن کتاب میں بیان کیا گیا' اس نے شہر کو فتح کیا اور اپنے آقا قطب الدین ایبک کے سامنے (جو غالباً اس وقت بندھیل کھنڈ میں مہوبہ کے مقام پر مقیم تھا) بے شمار مال غنیمت پیش کیا۔ وہ عزت واحترام جو محمد ابن بختیار کے ساتھ روا رکھا گیا لوگوں کے لیے باعث حسد ہوا۔ یہ حسد اس وقت تک زائل نہ ہوا جب تک کہ اس نے ایک مست ہاتھی کو شکست نہ دی۔ اس واقعہ کے بعد وہ بہار کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس اثناء میں نودیہ کے باشندے خوف زدہ اور اپنے بادشاہ رائے لکھمنیا یا لچھمن سین کو چھوڑ کر فرار ہوگئے۔ "اس کے دوسرے سال بعد محمد بن بختیار نے ایک فوج تیار کی' بہار پر حملہ آور ہوا اور اچانک نودیہ کے شہر کے سامنے نمودار

ہوا۔" (جیسا کہ متن کتاب میں ذکر ہو چکا ہے۔ ۱۳ اللہ)

صحیح تاریخ تقریباً 595ھ ہے

چنانچہ اب تمام شہادت پر دوبارہ غور کرنے کے بعد میں بلاک مین سے اس امر میں متفق ہوں کہ نودیہ پر حملہ کی تاریخ 590ھ (جو ریورٹی کے خیال کے مطابق ہے) نہیں ہو سکتی۔ محمد بن بختیار کے مذکورہ بالا کارنامے 589ھ میں دہلی کی فتح کے چند سال بعد وقوع میں آئے ہوں گے۔ اس کے برخلاف منہاج السراج لکھتا ہے (ریورٹی صفحہ 560) کہ "چند سال گزرنے کے بعد محمد نے "تبت" پر حملہ کے لیے فوجی مہم تیار کی۔ یہ جانکاہ اور مصیبت انگیز مہم 601ھ (اگست 1204ء سے اگست 1205ء) میں واقع ہوئی۔ اس لیے نودیہ کی فتح 589ھ کے چند سال بعد اور 601ء سے "چند سال" قبل یعنی 595ھ میں یا اس کے قریب واقع ہوئی تھی (نومبر 1198ء سے اکتوبر 1199ء)۔

رائے لکھمنیا کی 80 برس کی مفروضہ سلطنت

مگر منہاج السراج کی بیان کردہ حکایت کی مدد سے ہم سنہ کا تعین اور زیادہ صحت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ اس کو یہ معلوم ہوا تھا کہ رائے لکھمنیا اپنی پیدائش کے بعد سے اسی برس تک حکمران رہا۔ مگر یہ بیان جس کی تصدیق ایک حکایت سے بھی ہوتی ہے قرین قیاس نہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں سب سے طولانی زمانہ حکومت اڑیسہ کے راجا چورگنگا (1076ء–1147ء) کا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دنیا کے کسی ملک کی تاریخ میں اسی برس کے عہد حکومت کی مثال نہیں مل سکتی۔ ریورٹی اس اسی برس کے عہد حکومت کی تصدیق منشی شیام پرشاد کے ایک بیان سے کرتا ہے جو میجر فرینکلن کی مصنفہ حالات گور میں مذکورہ ہے کہ لچھمن سین نے اسی قمری سال (510–590ھ) حکومت کی تھی۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ منشی صاحب کے اس بیان کی سند کیا ہے۔ اس بات کی ایک اور دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ محمد نے 602ھ میں وفات پائی تھی اور بعض مورخین کے بیان کے مطابق اس نے بارہ برس لکھنوتی یا گور میں حکومت کی تھی۔ 602ھ میں سے اگر بارہ برس تفریق کر دیئے جائیں تو 590ء رہ جاتا ہے۔ مگر جیسا کہ بابو منموہن چکرورتی نے کہا ہے کہ ممکن ہے محمد کا عہد حکومت نودیہ کی فتح کے پہلے سے شمار کیا جاتا ہو۔ بہرحال نئے سرے سے تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد میں بلاک مین سے اسی برس کے عہد حکومت اور 590ھ میں نودیہ پر حملے کی تردید میں متفق ہوں۔

نودیہ پر لچھمن سین کے سنہ 80 میں حملہ ہوا

لیکن میں اب پروفیسر کیلہارن کی اس رائے کو قبول کرتا ہوں جو اس نے مدت ہوئی ظاہر کی تھی (انڈین انٹی کویری جلد 19 - 1890ء صفحہ 7) کہ اسی سالہ عہدہ حکومت کی حکایت ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ درحقیقت نودیہ پر لچھمن سین کے سنہ 80 میں حملہ کیا گیا تھا اور اس سنہ میں تاریخوں کا شمار بالعموم گذشتہ سالوں اور بعض مرتبہ سنہ حال کی بناء پر ہوا کرتا تھا۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ سنہ متنازعہ فیہ "گذشتہ" سال تھا تو 80 مساوی ہوگا 20-1119ء+80=1200-1199ء (اکتوبر سے اکتوبر تک) اور اگر سنہ "حال" تسلیم کیا جائے تو وہ 99-1198ء (نومبر سے اکتوبر تک) ہوگا۔ غالباً یہ واقعہ 1200ء کے موسم سرمایعنی 1199ء کے اواخر اور 596ھ کے شروع میں ظہور پذیر ہوا تھا اور ہم کو یقین کرلینا چاہیے کہ وہ 595ھ یا 596ھ میں نہ کہ 590ھ میں (جیسا کہ پہلے میرا خیال تھا) واقع ہوا ہوگا۔

جس واقعہ کی بناء پر یہ سنہ شروع کیا گیا

نظام سنین کو اس قدر قائم کرلینے کے بعد ہم کو اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کونسا واقعہ تھا جس کی وجہ سے 7 اکتوبر 1119ء میں نودیہ پر حملہ سے تقریباً اسی برس قبل لچھمن سین کا سنہ شروع کیا گیا۔ بابو منموہن چکرورتی کا خیال ہے کہ سنہ کا آغاز اس خاندان کے سب سے پہلے راجا جس کا نام تاریخ میں آتا ہے۔ سامنت سین کی تخت نشینی سے ہوا۔ مگر یہ شخص اس زمانے میں ایک گمنام مقامی سردار تھا اور یہ امر قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی تخت نشینی ایک نئے سنہ کا مبداء قرار دیا گیا ہو۔ لیکن ممکن ہے کہ لچھمن سین نے اپنے سنہ کا آغاز اپنے باپ بلال سین (ولال سین) کی تخت نشینی سے کیا ہو۔ مگر یہ خیال جس کے مسٹر این۔ این۔ باسو موید ہیں بلال سین کی تاریخ کی قطعی شہادت (اور وجے سین کی تاریخ میں جو تصادم واقع ہوتے ہیں جن کا ذکر ابھی کیا جائے گا) کی بناء پر رد ہو جاتا ہے۔ تیسرا خیال جس کو میں خود بھی کم و بیش صحیح ماننے کے لیے تیار ہوں یہ ہے کہ اس سنہ کا آغاز خاندان کے پہلے خود مختار راجا وجے سین کی تخت نشینی اور تاجپوشی سے ہوتا ہے۔ مگر بہرحال یہ ممکن ہے کہ اس کا شمار (جیسا کہ تارناتھ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے) اس کے باپ ہیمنت سین کے زمانے سے شروع ہوا ہو۔

اسی کا ہم مثل واقعہ

[1] اگر یہ ~~فرض~~ کرلیا جائے کہ اس سنہ کا آغاز وجے سین کی تخت نشینی سے ہوا تھا تو یہ واقعہ

شاہان گپت کے واقعہ سے بالکل مشابہ ظاہر ہوگا۔ 20-319ء کا سنہ گپت بھی چندر گپت اول کی تخت نشینی (یا تاجپوشی) ہی سے شروع ہوتا ہے کیونکہ اس خاندان کا سب سے پہلا' بڑا اور خود مختار بادشاہ یہی تھا۔ اس وجہ سے نہ تو اس سنہ کا آغاز چندر گپت کے دادا گپت کے زمانے سے جو محض ایک مقامی سردار تھا اور نہ ہی اس کے بیٹے گھاتتلچ کے عہد حکومت سے ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا امور کو فرض کر لینے کے بعد خاندان سین کا تمام نظام سنین قابل فہم اور واقعات اور سنین کے لحاظ سے اپنی اصلی جگہ پر قائم ہو جاتا ہے۔ ادبیات میں بلال سین یا ولال سین کے متعلق ہم کو دو سنہ یعنی 1169-1168ء اور 71-1170ء (سک 1090' 1091) ملتے ہیں۔[۵]

وجے سین کے متعلق تین سنہ ہم کو دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کو "چور گنگا کا دوست" بیان کیا گیا ہے۔ یہ چور گنگا نہایت غیر معمولی طور پر 1147ء سے 1076ء تک 71 برس حکمراں رہا اور میرے نظام سنین کے مطابق جس کی ایک حد تک تائید بھی ہوتی ہے اس کی حکومت کا آخری حصہ وجے سین کے اٹھائیس سالہ عہد حکومت کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دو باقی ماندہ سنہ ذرا مبہم اور نامکمل ہیں۔ ایک کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجے سین نے چار بادشاہوں یعنی نانیا' ویر رگھو اور وردھن کو قید کیا۔ اسی کتبے میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اس نے نہایت دلیری سے گوڑ کے سردار پر حملہ کیا' کامروپ کے راجا کو مغلوب کیا اور کلنگ کے بادشاہ کو شکست دی۔" مگر مشکل یہ ہے اس کتبے میں بادشاہوں اور ان کے ملکوں کی ترتیب بیان نہیں ہوئی۔ لیکن پھر بھی ہم کو تقریباً یہ یقین کر لینا چاہیے کہ رگھو سے یہاں کلنگ کے اس نام کا راجا مراد ہے جو تقریباً 1170-1156ء (سک 92-1078) میں وہاں حکمراں تھا۔ اور اغلب یہ ہے کہ نانیا سے ترہت کا راجا نانیا دیو مراد ہو جس نے 1097ء میں نمرون کی بنیاد ڈالی اور بالا خر نیپال کی وادی میں کرناٹک خاندان کا بانی ہوا۔ مگر ویر اور وردھن کی شخصیت کو میں بالکل صحیح طور پر نہیں بتا سکتا۔ ان میں سے ایک یقیناً کامروپ یا آسام کا راجا ہوگا۔ آسام کی ایک مقامی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سک 1111 (1189ء) میں ویر پال ایک شخص گذرا ہے جس کا بیٹا ایک زبردست بادشاہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بے تاریخ کی تانبے کی لوح میں کامروپ کے ایک راجا کا نام ویر باہو لکھا ہے' اس لیے ممکن ہے کہ ویر سے کامروپ کا راجا ہی مراد ہو۔

گور (گوڑ یا گورا) پر وجے سین کو غالباً شروع حکومت میں فتح حاصل ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس نے یہ فتح رامپال یا اس کے بیٹے کمار پال پر پائی ہو۔ اغلب یہ ہے کہ موخر الذکر ہی اس کا دشمن تھا جس کو اس نے شکست دی تھی۔ وردھن کا نام کسی تذکرے میں میری نظر سے نہیں گذرا' مگر ممکن ہے کہ اس سے پال خاندان ہی کا راجا مراد ہو۔ کیونکہ اس کا بھی امکان ہے کہ طویل عہد حکومت [illegible] کمزور

کر دیا ہو۔[116]

شاہان سین کے خاندان کی ابتداء دکن سے ہوئی

اس مضمون کو میں خاندان سین کی ابتداء اور عروج کے حال پر ختم کرتا ہوں۔ ان کے آباء واجداد جنوب یعنی دکن سے آئے تھے اور وہ کرنات کشتری یا برہم کشتری کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ موخر الذکر لفظ کے معنی پروفیسر کیلہارن نے غلط سمجھے تھے اور آر۔ ڈی۔ بھنڈار کر نے اس کی تصحیح کی ہے۔ ان کے خیالات جو ذات پات کی تاریخ پر بہت کچھ روشنی ڈالتے ہیں' اس قابل ہیں کہ ان کو بالکلیہ یہاں نقل کر دیا جائے۔

"ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ چاتسو کے ایک کتبے میں گلھٹ قوم کے ایک سردار بھرتری بھٹ کو "برہم' کشتر' آنوت" لکھا ہے جس کا ترجمہ میں نے یوں کیا ہے "وہ جس میں مذہبی مقتدا اور سپاہی دونوں کے صفات مجتمع تھے۔" مگر نیچے ایک حاشیہ بڑھا دیا گیا ہے۔ اس اصطلاح کا جو کچھ اور مطلب ہے وہ یہ ہے کہ بھرتری بھٹ ذات کے لحاظ سے برہم کشتری تھا۔ قدیم ہند کی تاریخ میں بھرتری بھٹ ہی ایک ایسا راجا ہے جس کو یہ لقب دیا گیا ہے۔ وجے سین کے کتبے دیوپارا میں سامنت سین کو "برہم کشتریا نام کل سرودام" لکھا ہے اور اس عبارت کا ترجمہ پروفیسر کیلہارن نے "برہمن اور کشتریوں کا سردار" کیا ہے۔ مگر میرے نزدیک اس کا ترجمہ "خاندان برہم کشتریہ کا سردار" ہونا چاہیے۔ اس بات کی تصدیق کہ پچھلا ترجمہ صحیح ہے اس سے ہوتی ہے کہ "بلال چرت" میں سین خاندان کے بادشاہوں کے لیے یہی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ چنانچہ برہم کشتریا کے قریب قریب ایک ذات برہم کشتری موجود ہے جس کے اراکین پنجاب' راجپوتانہ' کاٹھیاواڑ' گجرات اور حتی کہ دکن میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں میری رائے میں یہ لوگ نئی قوموں کے جو آخر میں کشتری بن گئیں برہمن یا مذہبی مقتدا تھے۔"

اس کے بعد مصنف نے ریاست جودھپور کے جولاہوں اور رنگ سازوں کی مثال دی ہے جو اولاً ناگر برہمن تھے اور پھر لکھا ہے کہ۔

"یہاں ہم کو ایک برہم کشتری ذات کی مثال ملتی ہے جس کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اولاً ناگر برہمن تھے۔ یہ امر اس بات کو صاف کرنے کے لیے کافی ہے کہ گلھٹ جو ابتداء میں ناگر برہمن تھے آخر میں کس طرح برہم کشتری یا کھتری ہو گئے۔ اس سے میرے اس نظریے کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ برہم کشتری کی مختلف ذاتیں ابتدا بیرونی

اقوام کی برہمن جماعت سے تعلق رکھتی تھیں اور جذب وضم کا عمل شروع ہونے کے بعد اور اس کی تکمیل سے قبل ان لوگوں نے مذہبی مقتدا کی حیثیت کو چھوڑ کر جنگ وجدل میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔"

خاندان سین اولاً برہمن تھا

مسٹر بھنڈارکر کا خیال بالکل صحیح ہے اور اسی بناء پر اس خاندان سین کا جد اعلیٰ یقیناً دکن کا ایک برہمن تھا جو غالباً ہر برہمن کی طرح وزیر کے مرتبے پر فائز ہوگا۔ جب وہ وزارت کے عہدے کو چھوڑ کر بادشاہ بن گیا تو برہمکشتری ہوگیا اور اس کی اولاد کو کشتری سمجھ لیا گیا جس کی بناء پر ان کو ملک کے دوسرے حکمران خاندانوں کے ہاں (جو کشتری سمجھے جاتے تھے) شادی بیان کرنے کے حق حاصل ہوگیا تھا۔ قیاس غالب یہ ہے کہ سامنت سین کلنگ یا اڑیسہ کے راجا چورگنگا کے ہاں ملازم تھا جس نے 1147-1076ء تک حکومت کی۔ اس بادشاہ کا دعویٰ تھا کہ وہ 1118ء سے کچھ پہلے تمام اڑیسہ کا مالک ہوگیا تھا۔ اور سامنت دیو کے شمالی اڑیسہ کے علاقہ میں نیم خود مختار سردار بن جانے کی تاریخ غالباً گیارہویں صدی کے آخر 1080ء یا 1090ء میں تلاش کرنی چاہیے۔ اور ممکن ہے کہ وہ حکمراں سردار نہ ہو اور اس کا بیٹا ہیمنت سین پہلا شخص ہو جس نے راجا کا رتبہ اور درجہ حاصل کیا ہو۔

خاندان سین کا قدیم ترین علاقہ

خاندان سین کا سب سے قدیم علاقہ جس کا ہم کو علم ہے دریائے سورنریکھا کے کنارے میور بھنج کی ریاست میں جو اڑیسہ کی انتہائی شمالی باج گذار ریاست ہے ضلع مدناپور کے پاس کاسی پوریا موجودہ کسیاری میں تھا۔ یہاں میں بابو نگندر اناتھ باسو کی قابل قدر آرکیالوجیکل سروے رپورٹ سے حسب ذیل عبارت نقل کرتا ہوں:۔

"ہم بنگال کے پس چاتیا ویدک کی تاریخ میں، جو آج سے تقریباً تین سو برس قبل کی کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی موجود ہے، پڑھا ہے کہ سین خاندان کے راجا ایک مقام کاسی پوری میں حکمران تھے جو دریائے سورنریکھا کے کنارے واقع تھا۔ اس جگہ کے ایک حکمراں وجے سین کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے بڑے کا نام مل اور چھوٹے کا سیامل تھا۔ دوسرے ہی نے مشرقی بنگال کو فتح کیا اور بکرم پور کو اپنا صدر مقام بنایا۔ "پس چاتیا کلمنجری" کے بیان کے مطابق سیامل ورم کی حکومت بکرم پور میں سک 994-1072ء سے شروع ہوئی ... [illegible]

قدیم نام ہی موجودہ کسیاری میں تبدیل ہو گیا ہے۔[۷اا]

اس عبارت میں مقامی تاریخ کے جن مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کتاب کے بیانات' جس کا وہاں حوالہ دیا گیا ہے' میری سمجھ سے باہر ہیں۔

فی الحال مجھے یہی کہنا ہے کہ کاسی پوری یا کسیاری سین خاندان کا سب سے قدیم صدر مقام تھا۔ وجے سین کے بیٹے کے لیے 1072ء مقرر کرنا ذرا پیش از وقت معلوم ہوتا ہے۔[۸اا]

تمام حوالوں کو حاشیوں میں بیان کرنے سے بچنے کے لیے ان کو مذکورہ ذیل بیان میں ترتیب وار جمع کر دیا گیا ہے۔

حوالے

اسناد

ذیل کی مرتب فہرست میں وہ تمام اسناد مذکور ہیں جن پر سین خاندان کے متعلق متن کتاب اور اس ضمیمے کے بیانات مبنی ہیں۔ بہت پرانی کتابیں نظرانداز کر دی گئی ہیں۔

عام اسناد

تارناتھ سے (شیفنر صفحہ 7 - 252) "چار سینوں" کے حالات سمجھنا اور ان کی تشریح کرنا مشکل ہے۔ اس نے بادشاہوں کے نام حسب ذیل لکھے ہیں۔ (1) نو سین' (2) کاس سین' (3) منت سین' (4) راتھک سین اور کہتا ہے کہ اگرچہ وہ ہر ایک راجا کی حکومت کا زمانہ نہیں بتا سکتا لیکن پھر بھی ان چاروں نے اسی برس سے زیادہ حکومت کی تھی۔ اگر اس عرصے کو لچھمن سین کے سنہ کے آغاز یعنی 20-1119ء سے شروع کریں جو میرے خیال میں وجے سین کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے تو 1199ء تک یہ اسی برس کا زمانہ ہوتا ہے۔ مگر اس مدت میں چار نہیں بلکہ صرف تین بادشاہوں نے حکومت کی تھی' اور ممکن ہے کہ تارناتھ نے اس مدت کا شمار منت سین کی تخت نشینی سے کیا ہو۔ اگر ایسا ہو تو کاس سین اور وجے سین (جیسا کہ گذشتہ نوٹ میں ظاہر کیا جا چکا ہے) ایک ہی شخص ہیں۔ تارناتھ کے دوسرے ناموں کا معمہ میں حل نہیں کر سکتا۔ اس نے جس ترشک بادشاہ چندر کا حال لکھا ہے کہ اس نے تمام مگدھ کو فتح کیا' بکرم پور کو برباد اور اوتنت پوری (بہار) میں بے شمار بھکشوؤں کو قتل کیا' میری سمجھ سے باہر ہے۔ اس کے بعد وہ (صفحہ 256) سین خاندان کے راجاؤں کے نام گنواتا ہے۔ (1) کو سین دوم' (2) بدھ سین' (3) ہرت سین

اور (4) پرتت سین جو نہایت کمزور اور ترشک یا مسلمانوں کے ماتحت بادشاہ تھے۔

فتح نودیہ کا سنہ

بلاک مین: ج۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 44 (1857ء) صفحہ 275۔ ریورٹی: مذکورہ بالا کا جواب ایضاً جلد 45 (1876ء) صفحہ 320 اور ترجمہ طبقات ناصری ضمیمہ ث (ڈی) منموہن چکرورتی۔ "اینڈکس آن سینا کنگس" ج۔ اینڈ پروسیڈنگس اے۔ ایس۔ بی (سلسلہ نو) جلد اول 1905ء صفحہ 50۔45 اور "سرٹن ڈسپیوٹڈ اینڈ ڈاؤٹفل ایونٹس ان دی ہسٹری آف بنگال محمڈن پیریڈ۔" ایضاً جلد 4، 1908ء صفحہ 151۔

لچھمن سین کا سنہ اور نظام سنین

مذکورہ مضامین کے علاوہ نگندر اناتھ باسو: ج۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 65 (1896ء) صفحہ 38۔6، بابو اکشے کمار متروا: ایضاً جلد 69 (1900ء) صفحہ 61۔ کیلہارن انڈین انٹی کویری جلد 19 (1890ء) صفحہ 16، ایی گریفیا انڈیکا جلد اول صفحہ 302۔ بیورج: ج۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 57 (1888ء) صفحہ 7۔1۔ آر۔ ڈی۔ بندھوپادھیا "مدھا نگر گرانٹ آف لچھمن سین" ج۔ اینڈ پروسیڈنگس اے ایس۔ بی جلد 5 (سلسلہ نو) 1909ء صفحہ 467۔

خاندان سین کے زمانے کا علم و ادب

منموہن چکرورتی: "پون ادوتم" یا (ہولی پیغامبر) بائی دھوییک اے کورٹ پوئٹ آف لچھمن سین کنگ آف بنگال" ج۔ اینڈ پروسیڈنگس اے ایس بی (سلسلہ نو) جلد اول (1905ء) صفحہ 41۔ "سپلیمنٹری نوٹس آن دی بنگال پوئٹ دھوییک اینڈ دی سین کنگس" ایضاً جلد 2 (1906ء) صفحہ 15۔ "سنسکرت لٹریچر ان بنگال ڈیورنگ دی سین رول۔" ایضاً صفحہ 157۔

چور گنگا اور وجے سین میں تطابق سنین

منموہن چکرورتی: "کرونالوجی آف دی ایسٹرن گنگا کنگس آف اڑیسہ" ج۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 72 (1903ء) صفحہ 14۔ اس میں آنند بھٹ کی کتاب "ولال چرت" کا حوالہ دیا گیا ہے۔

رگھو کے لیے دیکھو منموہن چکرورتی: ج۔ اینڈ پروسیڈنگس اے۔ ایس۔ بی (سلسلہ نو) جلد اول صفحہ 49۔ [illegible] جلد 2 صفحہ 198۔

کیلمارن: امپی گریفیا انڈیکا جلد اول صفحہ اول 313 حاشیہ 57 ـ ویرنامی آسام کے بادشاہوں کے لیے دیکھو: گیٹ ـ "رپورٹ آن دی پراگرس آف ہسٹاریکل ریسرچ ان آسام" شیلانگ 1897ء صفحہ 19,11 ـ

سین خاندان کا پرانا صدر مقام

نگندر اناتھ باسو: "آرکیالوجیکل سروے آف میور بھنج ـ" شائع کردہ ریاست میور بھنج (1911ء) صفحہ 122 ـ

برہمکشتر کے معنی

ڈی ـ آر ـ بھنڈارکر: "گہلٹ" جے ـ اینڈ پروسیڈنگس اے ـ ایس ـ بی (سلسلہ نو) جلد 5 (1909ء) صفحہ 187 ـ 167 خصوصاً صفحہ 186 ـ یہ ایک نہایت قابل قدر اور اچھوتا مضمون ہے ـ

حوالہ جات

لہ کی - پن - اس نام سے وی خاندان کے زمانے (یعنی چھٹی صدی عیسوی کے چینی مصنفین کی اصطلاح میں کشمیر مراد ہے - (چونیز "تسنگ ین" صفحہ 37)

ٹہ کی - پن - جن تسنگ خاندان کے زمانے یعنی ساتویں صدی عیسوی کے چینی مصنفین کے ہاں دریائے کابل کے شمالی علاقے یعنی کپس سے بالعموم مراد لی جاتی ہے -

سہ سرت چندر داس (جے - اے - ایس - بی - جلد اول 'حصہ اول' 1881ء صفحہ 222 - 217) ویڈل - "بدھ ازم آف تبت آرلا ماازم" (1895ء) صفحہ 204 - سرانگ - تسن - گمپو کی تاریخ پیدائش میں تبتی مورخین میں 600ء سے 617ء تک کا اختلاف ہے - لیکن موخر الذکر تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے اور اسی کو ایم - ایل ڈی ملو نے قبول کیا ہے - یہ مصنف لکھتا ہے کہ سرانگ - تسن - گمپو نے نیپالی اور چینی شاہزادیوں سے 31 - 628ء کے درمیان شادی کی تھی - اس کے برخلاف ویڈل اور سرت چندر داس 641ء پر متفق ہیں - چینیوں کے زعم میں انہوں نے تبتیوں کو شکست دی تھی - لیکن یہ یقینی ہے کہ چینی شہنشاہ کبھی کسی مفتوح دشمن کو اپنی بیٹی نہ دیتا - اور یہ تو صریح ہے کہ چینی مورخین عادتاً اپنی تمام شکستوں کو فتوحات ظاہر کرتے ہیں -

سمہ چین اور ہندوستان کی شمالی سرحدی ریاستوں کے تعلقات کا مذکورہ بالا بیان زیادہ تر پروفیسر چونیز کی عالمانہ اور قابل قدر کتاب "ڈوکیومنٹس سرلیس توکیو (ترکس) آکس ڈنٹو" (سینٹ پیٹرس برگ 1903ء) سے ماخوذ ہے - جغرافیائی حالات کے لیے دیکھو وہی کتاب یا سٹنفورڈ کا نقشہ ملحقہ ویٹرس کی "آن یون چانگ" جلد 2 - سر ایم - اے - اسٹین نے بھی اپنی این شنٹ ختن (1907ء) کے ابتدائی ابواب میں چین اور ہندوستان کی سرحدی ریاستوں کے تعلقات کا ذکر کیا ہے -

ھہ یہ سنین جو متن کتاب میں دیئے گئے ہیں' سرت چندر داس اور ویڈل سے ماخوذ ہیں - متن کتاب میں سنین وہ ہیں جن کا ذکر لیوی نے کیا ہے - ایم - ڈی - ملو کو اس میں بہت زیادہ

اختلاف ہے۔ وہ لنگدرم کی حکومت کے سنین 902-899ء بتلاتا ہے۔ (دیکھو اس کی کتاب مذکورہ بالا صفحہ 170-171)

۶؎ ویٹرس جلد 2 صفحہ 84۔ غالباً سیاح خود نیپال نہیں گیا تھا۔

۷؎ ایم۔ ڈی ملو کی رائے کے مطابق یہ واقعہ 631-628ء کے درمیان کا ہے۔ (کتاب مذکورہ بالا صفحہ 164)

۸؎ تبت کے بعض مذہبی فرقوں میں شادی شدہ بھکشوؤں کی اجازت ہے۔ (ایم ڈی ملو صفحہ 176) اور بنگال اور مشرقی ہندوستان میں وجریان فرقے نے ان کے وجود کو تسلیم کر لیا تھا۔ (این۔ این۔ والسو۔ "ماڈرن بدھ ازم اینڈ اٹس فالوورس ان اڑیسہ" کلکتہ 1911ء صفحہ 4، 13، 17)

۹؎ اسی طرح آج کل سکھوں کے فرقے کی زندگی کا بڑا انحصار سکھوں کی رجمنٹوں پر ہے ورنہ یہ بھی مدت پہلے ہندومت کا شکار ہو گئے ہوتے۔

۱۰؎ نیپال کے متعلق اکثر کتب پر ایک بڑی حد تک ایم۔ سلوین لیوی کی کتاب "لی نیپال" سبقت لے گئی ہے۔ (مطبوعہ جلد 1-2، 1905ء جلد 3، 1908ء برائٹ کی کتاب "ہسٹری آف نیپال" کیمبرج (1877ء) میں روایتی تاریخ کے ایک ملخص کا ترجمہ ہے۔ یہاں کے سکوں کے متعلق "کیٹلاگ آف کائنز آئی۔ ایم" جلد 1 صفحہ 293-280 میں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ ای۔ ایچ۔ ولش کے مضمون "دی کائنیج آف نیپال" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1908ء صفحہ 760-669) میں مع سات لوحوں کا حال ملے گا۔ ہرش کے سنہ کے نیپال میں مروج ہونے کے متعلق دیکھو بیوہلر (انڈین انٹی کویری جلد 19 صفحہ 152)۔ اولڈ فیلڈ کی "سکیچز فرام نیپال" بھی ایک عمدہ کتاب ہے۔

۱۱؎ بلاک مین نے اس نام کو کرتیا لکھا ہے اور دوسرے اس کو کرتو یا لکھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی موخر الذکر نام صحیح بھی ہے۔

۱۲؎ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1890ء صفحہ 879۔

۱۳؎ بیل: جلد اول صفحہ 217-215، جلد 2 صفحہ 198-195۔ ویٹرس: جلد اول صفحہ 349، جلد 2 صفحہ 197-195۔ "لائف آف ہیون سانگ" صفحہ 172۔

۱۴؎ کیٹلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم: جلد اول صفحہ 294۔ جے۔ ایلن: "دی کائنیج آف آسام" (نیومسمیٹک جرنل 1909ء صفحہ 31-300 مع تین لوحوں کے۔)

۱۵؎ گیٹ: "ہسٹری آف آسام" کلکتہ 1906ء۔ سر الفرڈ لائل: "ایشیاٹک سٹڈیز۔" سلسلہ اول باب 5۔ رسلے: "سنسس آف انڈیا" 1901ء رپورٹ حصہ اول صفحہ 21-519 اور 531۔

۱۶؎ ریورٹی ترجمہ طبقات ناصری 73-560۔ جے۔ اے۔ ایس۔ بی۔ جلد 45 حصہ 1

(1876ء) 3=330--بلاک مین۔ ایضاً جلد 44 حصہ 1(1875ء) صفحہ 85-276۔ میں نے ریورٹی کے سنین کی پیروی کی ہے۔

۱۷ 736ء اور 747ء کے بین بین (لیوی اور چونیز کا مضمون "انٹرپر ڈالنگ" منقول فی جرنل ایشیاٹک 1895ء، صفحہ 353۔ دیکھو وی اے سمتھ کا مضمون: "دی ہسٹری آف دی سٹی آف قنوج اینڈ آف یسوورمن۔" (جے۔ آر۔اے۔ ایس 1908ء، صفحہ 93-765)۔

۱۸ اسٹین: ترجمہ "راج ترنگنی" باب 4۔ کیٹلاگ آف کائنزان انڈین میوزیم، جلد 1، صفحہ 266 اور 269۔

۱۹ اسٹین: ترجمہ راج ترنگنی، باب 5، صفحہ 126۔

۲۰ اسٹین: راج ترنگنی باب 5۔ صفحہ 227-128۔

۲۱ ریورٹی: نوٹس "آن افغانستان" صفحہ 63، 64۔

۲۲ اسٹین: "زر گشت ڈر شاہیزفان کابل" (سٹنگرٹ 1893ء)

۲۳ اسٹین: ترجمہ راج ترنگنی، باب 5 صفحہ 277-271۔

۲۴ ایضاً باب 5، صفحہ 448-414۔

۲۵ تاریخ کشمیر کی تمام تفاصیل اسٹین کے ترجمے و شرح راج ترنگنی میں ملیں گی۔

۲۶ باب 7۔ فصل 1 حصہ 52۔ فصل 2 حصہ 22۔ مترجمہ میک کرنڈل (انڈین انٹی کویری جلد 13۔ صفحہ 32، 380)

۲۷ ٹریولز، باب 18۔

۲۸ ویٹرس، جلد 1۔ صفحہ 340، بیل جلد 1 صفحہ 206۔

۲۹ ایلیٹ: "ہسٹری آف انڈیا" جلد 4 صفحہ 419 مورخ عباس نے اپنی کتاب تقریباً 1580ء میں اکبر کے عہد میں لکھی تھی۔ دیگر تفاصیل کے متعلق دیکھو: وی اے سمتھ "اے ہسٹری آف دی سٹی آف قنوج" (جے۔ آر۔اے۔ ایس 1908ء صفحہ 793-765)۔ میرا یہ کہنا غلط تھا کہ شہاب الدین نے شہر کو لوٹا تھا۔

۳۰ کننگھم۔ آرکیالوجیکل سروے رپورٹ جلد 11 صفحہ 11۔

۳۱ اسٹین، ترجمہ راج ترنگنی باب 4 صفحہ 146-136۔ لیوی اور چونیز "انٹرپر ڈاؤکنگ" (جرنل ایشیاٹک 1895ء صفحہ 353) ان کے نزدیک اس واقعے کی تاریخ 736ء اور 747ء کے بین بین ہے۔

۳۲ کنو اور لینمین۔ "کرلوچس رامنجر" 3 تا 5 صفحہ 266۔ "پنچال کے راجا وجرایدھ کے دارالسلطنت قنوج کی طرف۔" اسٹین کے ترجمے راج ترنگنی باب 4 صفحہ 471 میں جیاپید راجا کشمیر کے ہاتھوں قنوج ... درج

ہیں۔ قنوج کا یہ راجا یقیناً وجرایدھ ہو گا۔

سے 783ء۔ جین: "ہری ومس۔" منقول از بمبئی گز-ٹیئر۔ (1896ء) جلد 1 حصہ 1 صفحہ 197 حاشیہ۔ بھاگلپور کی تانبے کی لوح (انڈین انٹی کویری جلد 15 صفحہ 304۔ جلد 20 صفحہ 188) کھالمپور کی تانبے کی لوح (اپی گر-فیا انڈیکا جلد 4 صفحہ 252 حاشیہ 3)

سے گوالیار کا کتبہ۔ آرکیالوجیکل سروے' اینوئل رپورٹ 4۔1903ء صفحہ 277۔ دیکھو ویٹرس: "آن یون چانگ" جلد 2 صفحہ 250۔ ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر۔ آرکیالوجیکل سروے۔ ویسٹرن انڈیا پروگرس رپورٹ 8۔1907ء صفحہ 41۔36 اور جے ولسن: "انڈین کاسٹ" (1877ء) جلد 1 صفحہ 109۔

سے ایک غیر مطبوعہ کتبہ جو پروفیسر ڈی آر بھنڈارکر کے پاس ہے۔ ("گرجرس" صفحہ 4 جرنل بمبئی برانچ ایشیاٹک سوسائٹی جلد 20)

سے یہ تمام واقعات کیلہارن کی فہرست (اپی گر-فیا انڈیکا جلد 5 ضمیمہ) کے نمبر 542' 544' 710 وغیرہ۔ ہندی دول کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کے لیے دیکھو المسعودی منقول فی ایلیٹ "ہسٹری آف انڈیا" جلد اول صفحہ 25۔23۔ "بمبئی گز-ٹیئر" (1896ء) جلد اول حصہ اول صفحات 506' 511' 526۔

سے کیٹلاگ آف کائنز ان انڈین میوزیم' جلد اول صفحہ 233 اور 241۔

سے کنو اور لیمین: "کرپور منجری" صفحہ 178۔ مگران کا یہ قول (صفحہ 179) کہ مہودیا کے راجا مہندر پال کو ڈگھوا۔ ڈبولی کی تانبے کی لوح کے کتبے میں اسی نام کے راجا سے ممیز سمجھنا چاہیے' اب غلط ثابت ہو چکا ہے۔

سے کتبہ نمبر 544۔ کیلہارن کی فہرست۔

سے کمیے کی لوحیں (اپی گر-فیا انڈیکا جلد 7 صفحہ 30' 43)

سے کیلہارن کی فہرست میں کتبہ نمبر 353۔

سے اپی گر-فیا انڈیکا جلد اول صفحہ 121۔

سے ایضاً جلد اول صفحہ 134۔

سے کیلہارن کی فہرست میں کتبہ نمبر 147۔

سے مولراج کے تین کتبے اگست 974ء سے جنوری 995ء تک کے موجود ہیں۔ گجرات کی تواریخ کے بموجب وہ 942 سے 997ء تک حکمراں رہا۔ اس کو قنوج کے راجا راجی کا بیٹا کہا جاتا ہے اور راجی غالباً قنوج کے بادشاہ مہی پال کا ایک خطاب تھا جس نے 940۔910ء تک حکومت کی۔ اغلب یہ ہے کہ وہ مولراج کا نائب تھا اور موقع پا کر اس نے اطاعت کا جوا گردن سے اتار کر پھینک دیا اور خود مختار ہو گیا۔ دیکھو: اپی گر-فیا انڈیکا جلد 40 صفحہ 76۔77' جے۔ آر۔

اے۔ ایس 1909ء صفحہ 272۔ 229۔ 961ء کی تاریخ جو میں نے اس سے قبل انہلواڑہ کی سلطنت کی بنیاد کی بیان کی تھی بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ مولراج کو ایک چوہان راجا وگرہراج (ثانی) نے جو 973ء میں زندہ تھا قتل کیا (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1913ء صفحہ 266، 267، 269)

۴۶ اس تمام بیان میں جہاں تک عام خیالات کی مخالفت کی گئی ہے وہ ریورٹی کی سند پر مبنی ہے۔ "نوٹس آن افغانستان" صفحہ 320۔ البیرونی ("انڈیا" مترجمہ زخاؤ' جلد اول صفحہ 135) لکھتا ہے کہ "شاہ" انندپال جو ہمارے زمانے میں برسر حکومت تھا۔ "ماگرو تھا جو اگر بھوتی نامی ایک نحوی گذرا ہے اور اس کی کتاب بادشاہ نے کشمیر میں پنڈتوں کو انعام واکرام دے کر مقبول عام کرائی تھی۔

۴۷ راجیاپال کا نام جھوسی کی تانبے کی لوح ("انڈین انٹی کویری" جلد 18 صفحہ 34 کیلہارن کی فہرست نمبر60) اور دُوبکنڈ کے کتبے (اپی گریفیا انڈیکا جلد 2 صفحہ 235) میں ملتا ہے۔ اب تک اس کو غلطی سے "رائے جے چال" پڑھا جاتا رہا (ایلیٹ جلد 2 صفحہ 45) اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت کچھ ابتری واقع ہو گئی ہے۔ ایلیٹ (ایضاً صفحہ 7۔ 425، 461) نے عتنڈ اکے خاندان کو اوہند کے شاہیہ خاندان میں ملا کر تمام بیان کو ناقابل فہم کر دیا ہے۔ جب اس نے اپنی کتاب لکھی تو کتبات کا نام ونشان نہ تھا اور اس کے بعد کے تمام مصنفین نے اس غلطی کو دور کیے بغیر اسی کی پیروی کی ہے۔ "طبقات اکبری" کا بیان بھی ایلیٹ (جلد 2 صفحہ 460) میں موجود ہے۔ باری کی سکونت کا حال البیرونی اور رشید الدین نے لکھا ہے۔ اس موضوع پر میرے مضمون "دی گرجرس آف راجپوتانہ اینڈ قنوج" میں مفصل بحث ہے۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 281۔ 276)

۴۸ یہ تاریخ چندیل کے کتبوں سے حاصل ہوئی ہے (اپی گریفیا انڈیکا جلد اول صفحہ 219' جلد 2 صفحہ 235)۔ اس کے ساتھ مسلمان مورخوں کے وہ بیانات بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو ایلیٹ (جلد 2 صفحہ 7۔ 464) میں منقول ہیں۔ انگریزی مصنفین نے اکثر تاریخیں غلط بیان کی ہیں۔

۴۹ کیلہارن کی فہرست کا کتبہ نمبر60۔ کننگھم (کائنز آف میڈیول انڈیا' صفحہ 61) نے قنوج کے راجا ترلوچن پال اور اوہند کے شاہیہ خاندان کے اسی نام کے آخری بادشاہ کو آپس میں ملا جلا دیا ہے۔

۵۰ کولبرک: اسیز جلد 2' صفحہ 246۔

۵۱ کیلہارن کی فہرست کا کتبہ نمبر75۔ انڈین انٹی کویری جلد 18' صفحہ 13۔ راجا چندر دیو کے عطیہ کی تانبے کی لوح مورخہ 1090ء ضلع بنارس کے مقام پر چندراوتی میں پائی گئی اور آج کل لکھنؤ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے (آرکیالوجیکل سروے پراگرس رپورٹ نارتھ

سرکل 8–1907ء، صفحہ 21، 39)

۵۲ "نوٹس آن افغانستان" صفحہ 320– متوفی میجر ریورٹی نے مجھے بتلایا تھا کہ اس سنہ کے لیے اس کی سند "زین الاخبار" مصنفہ سعید ابوالحق ہے جس نے اپنی کتاب محمود اور اس کے بیٹوں کے عہد حکومت میں اس سنہ کی تھوڑی مدت بعد ہی تصنیف کی تھی۔ اس کے بعد کا ایک اور مصنف شہر کے بسانے کی تاریخ 440 بکری بتلاتا ہے، مگر یہ صریحاً غلط ہے۔ لیکن اگر اس سنہ کو ہرش کا قائم کردہ سنہ تسلیم کرلیا جائے تو یہ تاریخ 1045ء اور تقریباً انگ پال کا زمانہ ہوتا ہے۔ ٹیفنیتھالٹر سے یہ کہا گیا تھا کہ دہلی کو خاندان تمر کے ایک راجا راسین نے 307ھ بمطابق 20–919ء میں آباد کیا تھا۔ (جیاگریفی ڈہندوستان۔ فرانسیسی ترجمہ برلن 1791ء صفحہ 125) بعض کتبات اور عام نظموں میں دہلی کا نام یوگنی پور بیان کیا گیا ہے۔

۵۳ قنوج کے جس "راٹھور" خاندان کا ذکر بالعموم کتابوں میں پایا جاتا ہے محض قیاسی و وہمی ہے۔ یہ راجے جیسا کہ گوبند چندر کی تانبے کی لوح مورخہ 1104ء میں جو بساہی کے مقام پر پائی گئی صاف معلوم ہوتا ہے، گھڑوال یا گھڑواڑ قبیلے سے تھے۔ (فہرست کیلہارن کا نمبر 77– انڈین انٹی کویری جلد 14، صفحہ 103) اور اس امر کو گوتم قبیلے کی روایات بھی تسلیم کرتی ہیں۔ (جے۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 56 (1885ء) صفحہ 160) قنوج کے راجاؤں کو "راٹھور" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جودھپور کے "راٹھور" سرداروں کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک لڑکے کے ذریعے سے (جو قتل عام سے کسی طرح بچ نکلا تھا) راجا جے چند (جیاچندر۔ انڈین انٹی کویری جلد 14 صفحہ 101–98) کی اولاد میں سے ہیں۔ اس قسم کی حکایات خاندانوں میں عام طور پر مشہور ہیں، مگر تاریخی حیثیت سے وہ قابل لحاظ نہیں۔ قنوج میں تمر خاندان کبھی حکمراں نہیں رہا۔

۵۴ اس خاندان کے تقریباً سات عطیات معلوم ہیں اور ان میں سے اکثر گوبند چندر کے عہد حکومت کے ہیں۔ سکوں کے لیے دیکھو۔ کیٹلاگ آف کائنز ان دی انڈین میوزیم، جلد اول صفحہ 257، 260۔

۵۵ "کامل التواریخ" "ایلیٹ جلد دوم صفحہ 251۔

۵۶ جے۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد اول (1881ء) صفحہ 48 اور 49۔

۵۷ شجرہ نسب کے لیے دیکھو: کیلہارن اپی گرافیا انڈیکا جلد 8۔ "سپلیمنٹ ٹو ناردرن لسٹ" صفحہ 13۔ اجمیر کو تقریباً 1000ء میں اجے دیو چوہان نے آباد کیا تھا۔ اس کے اور اس کی ملکہ سومل دیوی کے سکے پائے جاتے ہیں (انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 209)۔

۵۸ خیالی انگ پال اول کے ہاتھوں دہلی کی بناء پڑنے کی روایت غلط ہے۔ یہاں کے قدیم ترین آثار [illegible] لوہے کی لاٹھ کے گیارہویں صدی عیسوی کے ہیں (جے۔ آر۔ اے۔

الیس 1897ء صفحہ 13)۔ لال قلعہ (یا لال کوٹ) کے لیے دیکھو کننگھم کی رپورٹس جلد اول صفحہ 153۔ اندرپت کے لیے دیکھو سٹیفن: آرکیالوجی آف دہلی۔(1876ء) صفحہ 108۔ فنشا: "دہلی پاسٹ اینڈ پریذنٹ" (1902ء) صفحہ 228۔ قنوج میں کوئی تمر خاندان نہ تھا۔ کننگھم کے تمام دلائل العتبی میں بجائے راجیاپال کے غلط طور پر رائے جے پال پڑھنے پر مبنی ہیں (رپورٹس' جلد اول صفحہ 150)

۵۹ کیلہارن: "برخسنگ انڈ شرشو سپل ان انسفٹن زواجمیر۔" (برلن 1901ء)۔

۶۰ پرتھی راج کے متعلق مشہور ترین کتاب ایک ہندی رزمیہ نظم "چندرائسا" یا "پرتھی راج رائسا" ہے جو آج کل بھی صوبہ جات متحدہ میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ یہ نظم پرتھی راج کے ملک الشعراء چند بردائی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس شاعر کی اولاد میں سے ایک شخص اس وقت تک جودھپور میں ان اراضی کی آمدنی پر اپنی زندگی بسر کر رہا ہے جو پرتھی راج نے اس کے جد اعلیٰ کو دی تھیں۔ اسی کے پاس ایک قلمی نسخہ ہے جس میں صرف 5000 اشعار ہیں۔ مگر اکبر کے وقت تک اس کی اولاد اس میں اضافہ کرتی چلی گئی' یہاں تک کہ اشعار کی تعداد 125000 تک پہنچ گئی۔ اصل کے ایک حصے کی نقلیں لی جا چکی ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ وہ تمام کی تمام جلد شائع ہو سکے گی (جرنل اینڈ پروسیڈنگس اے۔ ایس۔ بی فروری 1911ء اینوئل رپورٹ صفحہ 30)۔ "رائسا" کے سنین کی ظاہری غلطی کا ازالہ اس دریافت سے ہوتا ہے کہ مصنف نے بکرمی سمت کے انندی قسم کو اختیار کیا ہے جو تقریباً 33ء یعنی 58۔57 ق م کے معمولی سنہ بکرمی سمت سے نوے یا اکانوے برس بعد شروع ہوتا ہے۔ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1906ء صفحہ 500) "انند" اور "سنند" کی اصطلاحات کا مطلب "بغیر" اور "مع" نند ہے اور نند کا لفظ مترادف ہے 90 یا 91 کا۔ اصل میں یہ "نو نندوں" کے لحاظ سے 9 کا مترادف ہے اور 100۔9=91۔ (گریئرسن) سنسکرت کی کتاب "پرتھوی راجا وجے" جو کشمیر میں بوہلر نے دریافت کی تھی' تاریخ کی نظر سے مقدم الذکر کی نسبت زیادہ مستند ہے۔ یہ 1200۔1178ء کے درمیان غالباً 1191ء کے بعد لکھی گئی تھی۔ شجرہ نسب کے متعلق اس کے بیانات کی تصدیق کتبوں سے بھی ہوتی ہے۔ اس کتاب کے مطابق پرتھوی راج کا صحیح شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔

ارنو راج

سمیشور = ایک چیدی شہزادی | وگرہ راجہ (یا ویسلدیو) | بے نام و نشان بیٹا۔ پدر کش (جگدیو)

ہری راجہ | | پرتھی راج اول
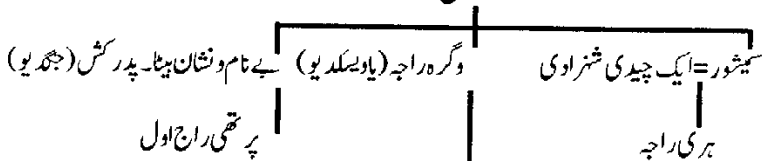
چند کا یہ بیان غلط ہے کہ رائے پتھورا دہلی کے بادشاہ اننگ پال کا نواسا تھا۔ "پرتھوی راج وجے" کا نادر الوجود نسخہ مع اور قدیم حوالہ جات کے جے۔ آر۔ اے۔ اس 1913ء صفحہ 81–259 میں مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔ وگرہ راجا کے متعلق اس بات کی صحت کہ اس نے دہلی کو فتح کیا تھا بہت مشتبہ ہے (بیوہلر۔ پروسیڈنگس اے۔ ایس۔ بی 1893ء صفحہ 94)۔ اور علو بجولی کے کتبے کے بائیسویں شعر سے اس کی تردید ہوتی معلوم ہوتی ہے (جے۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 55، 1886ء صفحہ 31)۔

۶۱ ریورٹی: ترجمہ طبقات ناصری 456، 459، 467، 468، 485، 486 اور ضمیمہ الف۔ بہت سی انگریزی کتابوں میں اس جنگ کی تاریخ غلط لکھی ہے اور میدان جنگ کا نام تراوڑی بھی غلط ہے۔ 587ھ، 588ھ، 589ھ تقریباً 93–1191ء کے برابر ہیں۔ جو 29 جنوری 1911ء سے شروع ہو کر 26 دسمبر 1193ء میں ختم ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کی ایک یہ روایت کہ پرتھوی راج کو شہاب الدین اپنے ہمراہ غزنی لے گیا تھا جہاں اس نے سلطان کو قتل کیا اور خود کام آیا، بالکل غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ سلطان شہاب الدین کو 602ھ (6–1205ء) میں دلمیک کے مقام پر فرقہ ملاحدہ کے ایک مخبوط الحواس شخص نے قتل کیا تھا۔ قتل کی اصل جگہ مسٹر۔ جی۔ پی۔ ٹیٹ کی دیکھی ہوئی ہے اور اب اس کو پنجاب کے ضلع جہلم میں دھمیاک کا مقام قرار دیا گیا ہے (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 168)۔

۶۲ ایلفنسٹن: "ہسٹری آف انڈیا" طبع پنجم صفحہ 338۔ شہاب الدین مختلف ناموں اور لقبوں سے مشہور ہے۔ وہ محمد ابن سام، محمد غوری یا معزالدین کہلاتا ہے۔ اسی طرح اس کا بڑا بھائی اور شریک حکومت جس کا نام بھی محمد تھا شمس الدین اور غیاث الدین دونوں ناموں سے مشہور ہے۔ (ریورٹی: جے۔ اے۔ ایس۔ بی جلد 45 حصہ اول صفحہ 328) اس مضمون سے اس نظام سنین کی صحت کی پوری تصدیق ہوتی ہے جو اس کتاب میں اختیار کیا گیا ہے۔ راجا جے چند دریائے جمنا کے قریب ضلع اٹاوہ میں چنداور کے مقام پر شکست کھا کر مارا گیا تھا۔ مسٹر بینرجی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ اس موقع پر قنوج کو لوٹا گیا تھا۔ اسلامی فوج اس کے بعد بنارس چلی گئی، لیکن قنوج کا علاقہ مع شہر کے ضرور مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا ہوگا۔ اغلب یہ ہے کہ فوج قنوج میں داخل نہیں ہوئی کیونکہ یہ شہر گنگا کے کنارے پر واقع تھا۔ مگر 1226ء کے قریب یہ شہر یقیناً التمش نے فتح کیا تھا (جرنل اینڈ پروسیڈنگس اے۔ ایس۔ بی 1911ء صفحہ 761، 765، 769)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1194ء میں قنوج اس قدر غیر اہم مقام متصور کیا گیا تھا کہ فاتحین نے اس کو اپنے عقب میں چھوڑنے کو کسی طرح خطرناک محسوس نہیں کیا۔

۶۳ "امپیریل گزیٹیر" جلد 14 صفحہ 183۔ اصل راٹھور مارواڑ میں بالی کے مقام پر دسویں صدی

میں ہی آباد ہو گئے تھے (ایضاً جلد 6 صفحہ 287)۔

۶۴ یعنی صوبہ جیجاک۔ جیجاک یا جیجا کا نام کتبوں میں مذکور ہے (اپی گریفیا انڈیکا جلد اول صفحہ 817)۔ اس نام کا مقابلہ تر بھکتی اور ترہوت سے کریں۔ حکمراں قوم کا نام ہندی میں چندیل اور سنسکرت میں چنڈیلا ہے۔

۶۵ جے۔ ایس۔ بی 1881ء' حصہ اول صفحہ 6۔

۶۶ بنڈل: "ہسٹری آف نیپال۔" (جے۔ اے۔ ای۔ بی 1903ء حصہ اول' صفحہ 18 طبع ثانی) ایم۔ سلوین لیوی نے بنڈل کی تشریح کو رد کیا ہے (نیپال جلد 2 صفحہ 202 حاشیہ) مگر تردید کی وجوہ قابل تسلیم نہیں۔ دیکھو آر۔ ڈی۔ بینرجی کا مضمون "دی پالاز آف بنگال" (میمائرس اے۔ ایس۔ بی 1913ء)

۶۷ اس ناٹک کا مفصل ملخص ایم۔ سلوین لیوی نے دیا ہے ("تھیٹر انڈین" صفحہ 235 و 229)۔

۶۸ "تاج المآثر" کے متن کتاب میں ایک اور تاریخ 597ھ (1201۔1200ء) بھی درج ہے۔ ریورٹی' ترجمہ طبقات۔ ضمیمہ ث (ڈی)۔

۶۹ تاج المآثر' جس کا ملخص ایلیٹ جلد 2 صفحہ 231 میں درج ہے۔ ریورٹی' ترجمہ طبقات صفحہ 523۔ فاضل مترجم جو بالعموم صحت کا سختی سے پابند ہے یہاں پر ایک سخت غلطی کا مرتکب ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے پرمار کو جو ایک شخص کا نام ہے "پرمارہ" قوم کا نام قرار دے دیا ہے۔ کالنجر ضلع باندا میں واقع ہے۔ مہوبا ہمیر پور کے ضلع میں ہے۔

۷۰ قوم کلچری کی تاریخ کے لیے دیکھو کننگھم کی رپورٹس 9' 10' 21 اور کتبات جو اپی گریفیا انڈیکا میں درج ہیں۔ سنہ کے لیے دیکھو فلیٹ (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1905ء صفحہ 566) اور کیلہارن (اپی گریفیا انڈیکا جلد 9 صفحہ 129)۔ ہانبس' راجپوتوں کے لیے دیکھو کرک: "اتھنوگریفی کل ہینڈ بک" (الہ آباد 1898ء) صفحہ 156۔ "ٹرائبس اینڈ کاسٹس آف نارتھ ویسٹ پرانونسز اینڈ اودھ" جلد 2 صفحہ 493۔

۷۱ منج کے نام بہت مختلف ہیں: وا کپتی (اول)' اتپل راج' اموگھورش' پرتھوی ولبھ اور سری ولبھ۔ وہ 974ء میں تخت پر بیٹھا اور بیس برس بعد اس کی موت 997۔994ء کے درمیان واقع ہوئی (بیوہلر۔ اپی گریفیا انڈیکا' جلد اول صفحہ 222' 294' 302۔ فلیٹ: "ڈائنا سٹیز آف کنریز ڈسٹرکٹس'" طبع دوم صفحہ 432 منقول فی بمبئی گزیٹیر 1896ء جلد اول حصہ دوم۔ بھنڈارکر: "ارلی ہسٹری آف دی دکن" ایضاً صفحہ 214۔ یہ حملے تعداد میں صرف چھ تھے نہ کہ سولہ جیسا کہ بیوہلر نے غلطی سے فرض کرلیا ہے۔

۷۲ آرکیالوجیکل سروے اینوئل رپورٹ 4۔1903ء صفحہ 43۔238۔ جو کتابیں بھوج کے نام پر منسوب کی جاتی ہیں۔ ان سب کی زیادہ مفصل اور مکمل فہرست یوفرکٹ کی "کیٹلاگس

کیٹلوگرم" جلد 1 صفحہ 418، جلد 2 صفحہ 95 میں پائی جاتی ہے۔ بھوج کے سنین اور اس کے پیشرو سندھراج کے تاریخی حالات کے لیے ملاحظہ ہو انڈین انٹی کویری 1907ء صفحہ 1702۔ اس کے دو کتبے دریافت ہوئے ہیں۔ اول کی تاریخ 1019ء اور دوسرے کی 1020ء (انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 201)۔

۷۳ ملکم سنٹرل انڈیا، جلد اول صفحہ 25۔ انڈین انٹی کویری جلد 17 صفحہ 52۔350 مع جھیل کے نقشے کے۔

۷۴ اس وقت تک آدسور کا کوئی قابل اعتبار حال دریافت نہیں ہوا۔ برہمنی حسب ونسب کے قدیم ترین مصنف، جن کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں، ہری مسرا و رایرو مسر آدسور کو پال راجاؤں سے قبل کا بتلاتے اور وہ کہتے ہیں کہ قنوج سے پانچ برہمنوں کے آنے کے بعد سلطنت گورپال خاندان کے قبضے میں آگئی تھی۔ (یو۔سی۔بٹویل۔جے۔اے۔ایس۔بی حصہ اول جلد 63 (1894ء) صفحہ 41)

"جنوبی رادھ (یعنی ضلع بردوان) کا راجا آنسور بنگال کے اس خاندان کے سور سے متعلق معلوم ہوتا ہے جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ قنوج سے پانچ برہمنوں کو لائے تھے۔ یہ امر کہ ان کو پال خاندان نے سلطنت کے ایک بڑے حصے سے بے دخل کر دیا تھا، بنگال کے شجرہ نسب سے معلوم ہوتا ہے۔" آنسور ان بادشاہوں میں سے تھا جنھوں نے مہی پال کو کانچی کے راجا راجندر کے حملے کو روکنے میں مدد دی تھی (ایچ۔پی۔شاستری: میمائرس اے۔ایس۔بی۔ جلد 3 نمبر1۔ (1910ء) صفحہ 10) آدسور کے محل کا موقعہ گور کے کھنڈروں کے شمال میں لکھنوتی کی فصیل کے برابر بیان کیا جاتا ہے۔ (ای۔انڈ۔ جلد 3 صفحہ 72)

۷۵ راشٹرکوٹ کے عطیات (انڈین انٹی کویری جلد 11 صفحہ 160۔132، جلد 12 صفحہ 164 اپی گرافیا انڈیکا جلد 6 صفحہ 240)۔ مسٹر آر۔ڈی۔بینرجی گوپال کی تخت نشینی کو چالیس یا پچاس برس قبل کا واقعہ بتلاتے ہیں۔ مگر مجھے ان کے بیان کی صحت میں کلام ہے۔

۷۶ بھاگل پور کی تانبے کی لوح (انڈین انٹی کویری جلد 15 صفحہ 304، جلد 20 صفحہ 308) کھالپور کی تانبے کی لوح (اپی گرافیا انڈیکا جلد 4 صفحہ 252)۔

۷۷ جیا سکندھ اوار سے محض چھاؤنی مراد نہیں ہوتی (ڈی۔آر۔بھنڈارکر)۔

۷۸ ویٹرس: جلد 2 صفحہ 87، 88۔ بیل: جلد 2 صفحہ 82، 86۔

۷۹ ممکن ہے کہ اس کا موقعہ ضلع بھاگلپور میں پتھرگھاٹ کے مقام پر ہو (جرنل اینڈ پروسیڈنگس اے۔ایس۔بی 1909ء صفحہ 13)

۸۰ جے۔اے۔ایس۔بی۔جلد 63 حصہ اول (1894ء صفحہ 41)

۸۱ انڈین انٹی کویری جلد 21 صفحہ 254۔

۸۲ شیفنر: تارناتھ صفحہ 14 ــ 208 ـ تارناتھ لکھتا ہے کہ دیوپال نے ورندر یعنی ضلع مالداوغیرہ کو فتح کیا تھا ـ مگر اس کا ماننا ذرا مشکل ہے کیونکہ یہ علاقہ اس سے قبل بھی پال خاندان کے زیر تصرف ہوگا ـ

۸۳ "دیناج پور پلر انسکرپشن" (جے ـ اینڈپروسیڈنگس اے ـ ایس ـ بی 1911ء صفحہ 615) اس پر 888ء کی تاریخ ہے اور اگر اس کو سک سن سمجھ لیا جائے تو وہ 966ء کے برابر ہے ـ

۸۴ سارناتھ کا کتبہ مورخہ 1083ء ـ شمالی بہار یا ترہوت کے ضلع مظفر پور میں کانسی کی چند مورتیں پائی گئی ہیں جن کے کتبات مہی پال کے اڑتالیسویں سال کے ہیں ـ کننگھم نے آرکیالوجیکل سروے رپورٹ' جلد 14 صفحہ 153 میں صحیح تاریخ بیان کی ہے ـ

۸۵ سرت چندرداس (جے ـ اے ـ ایس ـ بی' جلد اول حصہ صفحہ 236 اور 237) ـ تارناتھ کہتا ہے کہ مہی پال کی موت کی تاریخ اندازاً تبت کے ایک بادشاہ کھرال کے سنہ وفات کے برابر ہے ـ مگر اس موخرالذکر بادشاہ کا نام فہرستوں میں نہیں ملتا (شیفنر صفحہ 225) ـ نظام سنین کے لیے دیکھو' جے ـ اے ـ ایس ـ بی جلد 29 حصہ اول (1910ء) صفحہ 192)

۸۶ بھیم کے قتل اور متھلا کی فتح کے حالات وِدیادیو کے کمولی کے عطیہ میں مذکور ہیں ـ (اپی گرافیا انڈیکا جلد 2 صفحہ 355) دیگر تفصیلات ایک متحدالعصر تاریخی نظم "رام چرت" سے حاصل ہوتی ہیں جس کا مصنف سندھیا کرنندی ہے اور جو نیپال میں پائی گئی تھی ـ وہ میمائرس اے ـ ایس ـ بی جلد 3 نمبر 1 (1910ء) میں شائع ہوئی ہے ـ

۸۷ جے ـ اے ـ ایس ـ بی حصہ اول جلد 63 (1894ء) صفحہ 42' جلد 41 (1882ء) صفحہ 12 ـ شیفنر: ترجمہ تارناتھ صفحہ 250 ـ اس خاندان کے نظام سنین کو نہایت مستحکم طور پر مصنف کے مضمون "دی پال ڈائناسٹی آف بنگال" (انڈین انٹی کوری 1909ء صفحہ 48 ـ 233) میں بتیس کتبات کی بناء پر قائم کیا گیا ہے ـ اس مضمون کے معرض تحریر میں آنے کے بعد جو سب سے زیادہ اہم کتبہ شائع ہوا ہے وہ دیناج پور کا ستونی کتبہ ہے جس کا حوالہ اوپر بھی دیا گیا ـ راج شاہی کی ورندر ریسرچ سوسائٹی بنگال کی قدیم تاریخ پر بہت کچھ توجہ مبذول کر رہی ہے ـ اس کے آنریری سکریٹری نے بنگالی زبان میں پال اور سین خاندانوں کے متعلق ایک کتاب شائع کی ہے ـ اسی طرح اس کے ناظم اکشے بابو کمار مترا ـ بی ـ ایل نے اسی زبان میں کتبات کی ایک جلد بھی شائع کی ہے ـ مگر میں نے یہ کتابیں نہیں دیکھیں ـ سوسائٹی نے میرے پاس تین انگریزی کتابیں بھیجی ہیں جن میں سے دو کے نام "دی سٹونز آف ورندر" اور "گائیڈ بک" ہے' جس میں آثار قدیمہ کی اس نمائش کا حال ہے جو راج شاہی میں 1912ء میں منعقد ہوئی تھی ـ ان کتابوں سے میں نے استفادہ کیا ہے ـ مسٹر آر ـ ڈی ـ بینرجی نے مجھ کو اپنے پال خاندان کے مضمون کا پروف بھیجا ہے جو میمائرس اے ـ ایس ـ بی 1913ء میں شائع ہوئے ـ

ہے۔ مہندرپال کے تین کتبے، جیسا کہ میرا اور دوسروں کا پہلے خیال تھا، پال خاندان کے اس نام کے راجا کے نہیں ہیں، بلکہ وہ دراصل گرجر۔ پرتہار کے اسی نام کے راجا کے ہیں۔

۸۸ بوچنن: ایسٹرن انڈیا، جلد 2 صفحہ 23۔ کننگھم رپورٹس جلد 3 صفحہ 135، 159، 162۔

۸۹ گرجر پرتہار قوم کے مہندرپال راجا قنوج (تقریباً 850ء) نے تھوڑی مدت کے لیے مگدھ پر قبضہ کر لیا تھا۔

۹۰ "ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون" صفحہ 7۔305۔ ورندر ریسرچ سوسائٹی ان دونوں مصوروں کے مطالعے کی کوشش کر رہی ہے۔

۹۱ دیکھو مسٹر این۔ این باسو کی کتاب "ماڈرن بدھ ازم اینڈ اٹس فالوورس ان اڑیسہ" پر مہامہو پادھیا ہرپرشاد شاستری کا عالمانہ مقدمہ (کلکتہ 1911ء) جس کا ایک حصہ دراصل "آرکیالوجیکل سروے آف میور بھنج" جلد اول سے نقل کیا گیا ہے۔

۹۲ جے۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 47 (1878ء) صفحہ 400۔ امپیریل گزیٹیئر مضمون رام پال۔ مہامہوپادھیا ہرپرشاد کے بیان کے مطابق بلال سین "نے کیورت کی مدد سے شمالی بنگال کو فتح کیا اور انھیں پوتر ذات بنانے کی جدوجہد کی۔" (مقدمہ صفحہ 15) کتاب ماڈرن بدھ ازم اینڈ اٹس فالوورس ان اڑیسہ مصنفہ این۔ این باسو) اسی مصنف کا مضمون پروسیڈنگس اے۔ ایس۔ بی 1902ء صفحہ 7۔2 ملاحظہ ہو۔

۹۳ آرکیالوجیکل سروے آف میور بھنج جلد اول، صفحہ 64 حاشیہ۔

۹۴ ریورٹی: ترجمہ طبقات اکبری صفحہ 552۔

۹۵ دیکھو، ایچ پی شاستری کے مضامین: "بدھ ازم ان بنگال سنس دی محمڈن کانکوسٹ" اور شری دھرم منگل: "اے ڈسنٹ ایکواف للتوستر" (جے۔ اے۔ ایس۔ بی۔ جلد 64، حصہ اول 1895ء صفحہ 68۔55)۔ اور این۔ این باسو کی کتاب "ماڈرن بدھ ازم" جس کا حوالہ پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔

۹۶ جرنل اینڈ پروسیڈنگس آف اے۔ ایس۔ بی فروری 1911ء، صفحہ 43۔

۹۷ لچھمن سین نے 1199ء تک اسی برس تک حکومت کی ہو یا نہ کی ہو، مگر یہ ممکن ہے کہ وہ ضعیف ہو گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب وجے سین کی طولانی حکومت کے بعد اس کا باپ بلال سین تخت پر بیٹھا ہو تو وہ بھی کمسن نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ لچھمن سین سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے تخت پر نہیں بیٹھا۔

۹۸ ریورٹی: "ترجمہ طبقات ناصری۔" صفحہ 557، ایلیٹ۔ ہسٹری آف انڈیا صفحہ 309، جلد دوم۔

۹۹ خاندان سین ایک مقامی خاندان کی حیثیت سے مزید چار نسلوں تک مسلمانوں کے ماتحت قائم

رہے۔ اس خاندان کی تاریخی اسناد پر ضمیمہ ص میں مفصل بحث کی گئی ہے۔ مگر نظام سنین اب تک پورے طور پر معین نہیں ہوا۔ اس میں سب سے بڑی مشکل بلال سین کے عہد حکومت کی طوالت کا تعین کرنا ہے۔ باقی چھوٹے چھوٹے خاندانوں کے متعلق جن کا ذکر اس کتاب میں نہیں آیا' دیکھو وف کی "دی کرانالوجی آف اینشنٹ انڈیا۔" کانسٹیبل 1899ء۔

[۱۰] دیکھو رسلے اور گیٹ کی "منس آف انڈیا" 1901ء' جلد اول۔ روز "منس رپورٹ فار دی پنجاب 1901۔" اور مردم شماری کی دوسری رپورٹیں۔ ابٹسن کی آوٹ لائنز آف پنجاب اےتھنوگرفی۔ اور بیڈن پاول کا مضمون "نوٹس--- آن دی راجپوت کلینز" جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1899ء' صفحہ 63'533۔

[۱۱] یعنی چار ورن کا نظریہ: برہمن' کشتری' ویش اور شودر۔ برہمن خود اسی قدر مخلوط النسل معلوم ہوتے ہیں جتنا کہ راجپوت۔ ویش کی قوم کا تعین یقینی طور پر نہیں کیا جا سکتا' اور شودر شمالی ہند میں تقریباً بالکل ناپید ہیں۔ لفظ ورن کے صحیح معنوں کے لیے (یعنی "ذاتوں کا ایک گروہ" نہ کہ "ذات") دیکھو کیتکر کی قابل قدر کتاب "ہسٹری آف کاسٹ ان انڈیا۔" بالخصوص جلد 1' 1906ء صفحہ 77۔ اس کی دوسری جلد 1911ء میں طبع و شائع ہوئی۔

[۱۲] رہس دیوڈس: "ڈائلاگس آف بدھا" 1899ء صفحہ 59'119۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1894ء صفحہ 342۔

[۱۳] ہیون سانگ نے چند برہمن راجاؤں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً اجین' بھوبھوتی اور میشور پور کے راجا (بیل جلد 2 صفحہ 270'271)۔ براہمکشتر کے لفظ کے معنوں کے لیے دیکھو ضمیمہ ض۔

[۱۴] بمبئی گزیٹیئر جلد اول' حصہ اول (1896ء) صفحہ 164 حاشیہ ۵۔

[۱۵] ہرش کی حکومت 606ء میں شروع ہوئی۔ مگر اس کی زبردست سلطنت کا آغاز 612ء سے ہوتا ہے اور یہ طاقت اپنے فنا ہونے یعنی 647ء تک برابر قائم رہی۔

[۱۶] یہ قوم صوبہ جات متحدہ میں جاٹ اور پنجاب میں جٹ کہلاتی ہے۔ پنجاب منس رپورٹ 1901ء صفحہ 324'326۔

[۱۷] یہ دریافت اے۔ ایم۔ ٹی۔ جیکسن (بمبئی گزیٹیئر جلد اول حصہ اول (1896ء) خصوصاً صفحہ 467' ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر "گرجرس" (جے۔ بمبئی برانچ آر۔ اے۔ ایس جلد 20 "اےپی گرےفیکل نوٹس" (ایضاً جلد 21) اور پروفیسر کیلہارن "اےپی گرےفیکل نوٹس" نمبر 17 کا کام ہے۔ اس اہم کتبے کو ہیرانند نے بھی بعد تصحیح "آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا اینوئل رپورٹ" 4۔1903ء میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر ہارنل نے اس دریافت پر اپنی مختصر ہسٹری آف انڈیا اور جے۔ آر۔ اے۔ ایس (5۔1903ء) کے مضامین میں بہت زور دیا ہے۔

[۱۸] "راجپوت اینڈ مرہٹہ" (جرنل رائل انتھروپالوجیکل انسٹیٹیوٹ' 1911ء صفحہ 42)۔

۹۰؎ "دراوڑ" سے مطلب وہ شخص لیا جاتا ہے جو "دراودیا تامل علاقے کا رہنے والا ہو۔" اس نام کا اطلاق بالکل مناسب طور پر انتہائے جنوب کی سرزمین' آبادی یا زبان پر کیا جاتا ہے۔ مگر اس کو شمالی اور متوسط ہند کی نام نہاد غیر آریا اقوام گونڈ' بھر' کول وغیرہ پر لاگو کرنا بالکل نامناسب ہے۔ "دراود" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سنسکرت میں "تامل" کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور زبان کے لحاظ سے اس کے معنی شیریں کے ہیں (انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 229)۔

۹۱؎ چندیلوں کی ابتداء کے لیے دیکھو میرا مضمون جے۔ اے۔ ایس۔ بی جلد 46 حصہ اول (1877ء صفحہ 233) اور میرا رسالہ "دی ہسٹری اینڈ کائنیج آف دی چندیل ڈائناسٹی آف بندھیل کھنڈ (جیجا کبھکتی) 1203ء—831ء" (انڈین انٹی کویری 1908ء صفحہ 148—14)۔ گھڑواڑ کے لیے دیکھو ہیمز اور ایلیٹ "ریسز آف دی نارتھ ویسٹرن پراونسز" اور شمال کی تمام دیگر اقوام کے لیے دیکھو مسٹر کرک کی کتاب چار جلدوں میں: "ٹرائبز اینڈ کاسٹس آف این۔ ڈبلیو۔ پی۔" راشٹرکوٹ کے متعلق مختلف خیالات کے لیے دیکھو بمبئی گزیٹیئر جلد اول حصہ اول (1896ء) صفحہ 134' 119' ایضاً حصہ دوم صفحہ 178' 384۔

۹۲؎ بمبئی گزیٹیئر جلد اول حصہ اول (1893ء) صفحہ 465 وغیرہ۔ مخالف بیان کے لیے دیکھو اوجھا: ہسٹری آف دی سولنکیز (ہندی میں) صفحہ 12' 14۔

۹۳؎ دوسرے حوالے حسب ذیل ہیں: وی اے سمتھ "دی گرجرس آف راجپوتانہ اینڈ قنوج۔" (جے آر اے ایس 1909ء جنوری و اپریل)۔ "وائٹ ہن کائن فرام دی پنجاب" (ایضاً جنوری 1907ء)۔ "وائٹ ہن کائن آف دیا گھرا کھا" (ایضاً اکتوبر 1907ء)۔ "دی آؤٹ لائیرس آف راجستھان" (انڈین انٹی کویری 1911ء) اور ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر "دی گرجرس" (جے۔ بمبئی برانچ۔ آر۔ اے۔ ایس جلد 21)۔ اسی مصنف کا مضمون "سہلاس" (جرنل اینڈ پروسیڈنگس اے۔ ایس۔ بی۔ (نیو سیریز) جلد 5۔ 1909ء) بہت قابل قدر ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ میواڑ یا اودے پور کے رانا جو ہمیشہ راجپوتانے کے راجاؤں کے سردار تسلیم کیے جاتے رہے ہیں۔ دراصل ناگر برہمنوں کی اولاد ہیں اور ان کے آباء و اجداد بادشاہ ہو جانے کے بعد برہمکشتری مشہور ہو گئے۔ اور رولبھی کے راجاؤں کے ساتھ (جو ہن گرجر قوم سے تھے) ان کا بہت گہرا تعلق تھا۔ مسٹر کینڈی کا فاضلانہ مضمون "میڈیول ہسٹری آف انڈیا ہندو پیریڈ 1200ء—650ء" (امپریل گزیٹیئر 1908ء جلد 2 باب 8) غور سے پڑھنا چاہیے۔ اس میں ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو اکثر جگہ صحت طلب ہیں اور اس کے نظری خیالات پر رد و قدح کی جا سکتی ہے۔ مسٹر کینڈی نے گرجروں کی طاقت اندازہ کم لگایا ہے۔ مگر اس مضمون کے ساتھ جو فہرست کتب لگا دی گئی ہے وہ مفید ہو سکتی ہے۔

۹۴؎ مذکورہ بالا بیان کے لکھے جانے کے بعد مسٹر ایس۔ کمار نے اپنی یہ رائے شائع کی ہے کہ طبقات

کی شہادت کو بالکل نظر انداز کر دینا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ لچھمن سین 1119ء میں تخت پر بیٹھا اور مسلمانوں کی یورش سے ایک زمانہ قبل مر گیا۔ مگر میرے نزدیک یہ خیال درست نہیں (انڈین انٹی کوری 1913ء صفحہ 188)۔

۱۱۴ مسٹر آر۔ ڈی۔ بینرجی کو مسٹر ایس کمار سے اتفاق ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ سنہ لچھمن سین ہی کی تخت نشینی سے شروع ہوا تھا' اور یہ کہ وہ محمد ابن بختیار کے حملے سے ایک مدت قبل مر چکا تھا۔

۱۱۵ مسٹر آر۔ ڈی۔ بینرجی ان تاریخوں کو بھی رد کرتے ہیں۔

۱۱۶ ان تمام امور مذکورہ بالا کو مد نظر رکھتے ہوئے خاندان سین کا نظام سنین میرے نزدیک حسب ذیل ہے:

سامنت سین	(مقامی سردار)	تخت نشینی	1080-90ء
ہمنت سین	(" ")	"	1100ء
وجے سین	(بادشاہ)	"	1119ء
ولال سین	(")	"	1158ء
لچھمن سین	(")	"	1172ء یا 1180ء

۱۱۷ اس بات کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے کہ کاسی پوری کس طرح تبدیل ہو کر کسیاری ہو گیا۔ ممکن ہے کہ کاسی واری کے نام کا بھی کوئی شہر موجود ہو اور معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا نام کاس سین کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ یہ شخص تارناتھ کے بیان کے مطابق "چار سینوں" میں سے دوسرا تھا اور اس کو ہمنت سین یا وجے سین کہہ سکتے ہیں۔ مگر اغلب یہ ہے کہ اس سے دوسرا مراد ہے' کیونکہ اس کے نام سے کاسی پوری کا تعلق ہے۔

۱۱۸ جب کتاب چھپ رہی تھی تو ذیل کا بیان ایک رسالے میں شائع ہوا تھا۔ "یہ باور کیا جاتا ہے کہ خاندان سین کے راجاؤں نے' جنہوں نے بارہویں صدی عیسوی میں خاندان پال کے بے دخل کیا تھا' ورندر کو فتح کر لینے کے بعد اس علاقہ جنوب مغرب میں گوداگری کے قریب بیجا نگر کو اپنا صدر مقام بنایا تھا اور یہ کہ بعد میں وہ لکھمناوتی میں جو آخر میں گوڑ ہو گیا منتقل ہو گئے۔" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1914ء صفحہ 101) ورندر یا موجودہ برندر راج شاہی کے ضلع کے علاقہ ہے۔ گوداگری دریائے گنگا کے کنارے پر تجارت کی بارونق منڈی ہے اور اس جگہ واقع ہے جہاں کلکتہ اور مالوا کی سڑکیں ملتی ہیں۔ گوڑ سنسکرت میں گور لکھنے کا ایک طریقہ ہے۔

پندرہواں باب

دکن کی سلطنتیں

دکن

دکن کی اصطلاح یا لفظ کا اطلاق دریائے نربدا کے جنوب کے تمام حصہ ملک پر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات ایسا کیا بھی جاتا ہے' لیکن بالعموم اس سے ایک محدود علاقہ مراد لی جاتی ہے جس میں مالابار اور تامل قوم کے ممالک شامل نہیں ہیں۔ اس طرح محدود ہو جانے کے بعد اس اصطلاح کا اطلاق صرف اس حصہ ملک پر ہوتا ہے جس میں تلنگی بولنے والے لوگ آباد ہیں اور اس میں مہاراشٹر کے ملک کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ میسور کے بعض حکمراں خاندانوں کا حال' جن کا تعلق انتہائے جنوب سے اتنا نہیں جتنا کہ دکن سے' آسانی کے لیے اس باب میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ موجودہ سیاسی تقسیم کے لحاظ سے دکن کا علاقہ اپنے محدود معنوں میں زیادہ نواب نظام الملک کے ممالک محروسہ میں شامل ہے۔

آب و ہوا کے لحاظ سے یہ ملک بہ ہیئت مجموعی ایک خشک اور کوہستانی سطح مرتفع ہے جس کو دو بڑے دریا گوداوری اور کرشنا سیراب کرتے ہیں' اور جنوب میں پہنچ کر موخر الذکر کے ساتھ اس کا معاون دریا تنگبھدرا مل جاتا ہے۔

550–225ء تاریخ بالکل تاریکی میں ہے

اس حصہ ملک میں ساڑھے چار صدی یعنی 225ء تک خاندان اندھر حکمران رہا جس کی تاریخ آٹھویں باب میں بیان کی جا چکی ہے۔

پروفیسر آر۔ جی۔ بھنڈارکر نے 1896ء میں اپنی کتاب لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ اندھر

خاندان کے خاتمے کے بعد تین سو برس تک "ہم کو ان خاندانوں کا کچھ حال معلوم نہیں جو اس ملک میں برسر حکومت تھے۔" اگرچہ اس وقت کے بعد اب تک اس سطح مرتفع کے جنوبی حصے کے حکمرانوں اور خاص کر خاندان کدمب (جو تیسری اور چھٹی عیسوی کے درمیان کنترا اور میسور کے شمالی اضلاع پر حکمراں تھا) کا مزید حال معلوم ہوگیا ہے' لیکن ماہرین آثار قدیمہ نے جو کچھ پتہ لگایا ہے اس کو اس کتاب میں بالتفصیل بیان کیا جائے گا۔ اس علاقہ کا مغربی حصہ یعنی مہاراشٹر معلوم ہوتا ہے کہ راشٹرکوٹ یارٹ قوم کے راجاؤں کے زیر نگین تھا۔ یہی قوم تھی جو ایک مدت دراز کے بعد آٹھویں صدی کے درمیان میں تھوڑے زمانے کے لیے تمام دکن پر حکمراں ہوئی۔[1]

چلکیا خاندان کا عروج

پہلے کی طرح اب بھی یہ کہنا بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ دکن کی سیاسی تاریخ چھٹی صدی عیسوی کے درمیان میں خاندان چلکیا کے عروج سے شروع ہوتی ہے۔ اس خاندان کے دعویٰ تھا کہ ان کی ابتداء شمالی ہند کے راجپوتوں سے ہوئی تھی جنھوں نے دکن کی سطح مرتفع کے دراوڑ باشندوں پر (جو چلکیا خاندان کے عروج سے پہلے ہی شمال کے آریہ خیالات و اوضاع و اطوار میں رنگے جانے شروع ہوگئے تھے) اپنا تسلط جما لیا تھا۔[2] چلکیا خاندان کے آخری زمانے کے کتبات' جن میں ان کا تعلق اجودھیا سے ثابت کرنے اور ایک خاص شجرہ نسب کے اختراع کرنے کی کوشش کی گئی ہے' تاریخی حیثیت سے بالکل بے کار ہیں۔ یہ باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ چلکیا یا سولنکی قوم چاپ کے قرابت دار تھے۔ اس طرح ان کا تعلق گرجروں کے قبیلے سے تھا کیونکہ چاپ اسی کی ایک شاخ تھے۔ یہ بھی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وہ نقل مکان کرکے راجپوتانہ سے دکن آکر آباد ہوگئے ہوں۔

550ء' پلکیسن اول

اس خاندان کی بنیاد ایک سردار پلکیسن اول نامی نے ڈالی اور تقریباً 550ء میں واتاپی یعنی ضلع بیجاپور میں موجودہ بادامی کے مقام پر قابض ہوکر ایک چھوٹی سی ریاست قائم کرلی۔ مگر وہ اور زیادہ وسیع سلطنت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اشومیدھ کی رسم ادا کرکے حاکم اعلیٰ ہونے کا دعویٰ بھی کیا تھا۔

کیرتی ورمن اور منگلیس

[illegible] کیرتی ورمن [illegible] منگلیس [illegible] سلطنت [illegible] مشرق و مغرب کی طرف

وسیع کیا۔ موخر الذکر نے جن اقوام و قبائل کو کم و بیش زیر نگین کیا ان میں کونکن (یعنی ساحل سمندر کا وہ حصہ جو مغربی گھاٹ اور سمندر کے درمیان واقع ہے) کے موریا بھی شامل تھے' جو ممکن ہے کہ قدیم موریا خاندان کی اولاد ہوں۔

608ء' پلکیسن دوم

منگلیس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے اور کیرتی ورمن کے ایک بیٹے میں جانشینی کے متعلق جھگڑا ہوا۔ موخر الذکر اپنے حریف پر غالب آیا اور واتاپی کے تخت پر 608ء میں پلکیسن کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ اگلے سال اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ بیس برس یا اس سے کچھ زیادہ مدت تک اس قابل راجا نے اپنی تمام ہمسایہ سلطنتوں کے مقابلے میں جارحانہ جنگ جاری رکھی۔ مغرب و شمال کی جانب لات یا جنوبی گجرات' گرجر یا شمالی گجرات اور راجپوتانہ' مالوا اور کونکن کے موریا قبیلے کو پلکیسن کی جارحانہ کارروائیوں سے مغلوب ہونا پڑا۔

609ء' ونگی کی فتح

مشرق میں اس نے دریائے کرشنا اور گوداوری کے درمیانی علاقہ ونگی پر قبضہ کیا اور 609ء میں اپنے بھائی کبج وشنو وردھن کو وہاں نائب السلطنت مقرر کیا۔ اس کا صدر مقام پشٹپور بنایا گیا جو آج کل ضلع گوداوری میں پتھاپورم کے نام سے موجود ہے۔[۳] اس کے چند سال بعد تقریباً 615ء میں یہ شہزادہ خود مختار بادشاہ بن بیٹھا اور مشرقی خاندان چلکیا کا بانی ہوا جو 1070ء تک قائم رہا۔ یہ خاندان بالاخر خاندان چول میں ضم ہو گیا۔

جنوبی جنگیں

جنوبی ہند کے تمام خاندان چول' پانڈیا' کریل یہاں تک کہ پلو خاندان چلکیا کے اس اولوالعزم راجا کی وجہ سے لڑائی پر مجبور ہوئے اور یہ یقینی ہے کہ 630ء میں وہ نربدا کے جنوب کے تمام جزیرہ نما میں سب سے زیادہ طاقتور راجا تھا۔

620ء' ہرش کی پسپائی

ونگی کی فتح کے تقریباً دس برس بعد اس نے شمالی ہند کے راجا دھیراجا ہرش کے ایک حملے کو جس میں راجا بذات خود شامل تھا کامیابی سے پسپا کیا۔ شمالی ہند کا یہ راجا تمام ہند کو ایک چھتر کے نیچے جمع کرنا چاہتا تھا مگر پلکیسن کی ہوشیاری اور فوجی قابلیت کے سامنے اس کے تمام منصوبے خاک

میں مل گئے اور اب دریائے نربدا ان دو سلطنتوں میں حد فاصل قرار پا گیا۔

625ء' ایران کے ساتھ تعلقات

دکن کے اس راجا کی شہرت ہندوستان کے باہر پہنچی اور ایران کے شہنشاہ خسرو دوم نے بھی اس کا نام سنا۔ چنانچہ اس شہنشاہ کے 36ویں سنہ جلوس یعنی 6--625ء میں پلکیسن دوم کی ایک سفارت اس کے دربار میں آئی۔[4] اس کے بدلے میں ایک سفارت ایران سے ہندوستان بھیجی گئی اور ہندی دربار میں کماحقہ اس کی خاطر و مدارات بھی ہوئی۔ اجنتا کے غار نمبر ایک میں استرکاری کے ایک بڑی تصویر میں' جو اب بدقسمتی سے خراب ہو گئی ہے' اب بھی ایرانی سفیر کے ہندی بادشاہ کے سامنے اپنے وکالت نامے کے پیش کرنے کا منظر اور اس کی رسوم دیکھی جا سکتی ہیں۔

اجنتا کی نقاشی

یہ تصویر ہندوستان اور ایران میں باہمی گہرے تعلقات کا ایک پرتو ہونے کے علاوہ ہندوستان کی فنون لطیفہ کی تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے نہ صرف اجنتا کی بہت سی تصاویر کی تاریخ معین ہوتی ہے بلکہ اس طرح اس کے معیار کو اختیار کر کے دوسری تصاویر کی تاریخ کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے۔ یہ اس بات کے امکان کو بھی پیش کرتی ہے کہ ممکن ہے اجنتا کی مصوری براہ راست ایران اور اس طرح یونان قدیم کے فن کی تقلید سے پیدا ہوئی ہو۔[5]

641ء' ہیون سانگ کی آمد

جب 641ء میں ہیون سانگ پلکیسن دوم کے دربار میں آیا تو اس نے اجنتا کے غاروں کی کماحقہ تعریف کی۔ اس وقت راجا کا صدر مقام واتاپی نہیں' بلکہ ایک اور شہر تھا جس کو اب ناسک بتلایا جاتا ہے۔ سیاح کے دل پر پلکیسن دوم کی فوجی قوت کا گہرا اثر پڑا۔ خود اس کی رعایا بھی بدل و جان اس کی مطیع تھی۔

642ء' پلو کے ہاتھوں پلکیسن دوم کی شکست

مگر پلکیسن کی خوشحالی اور خوش قسمتی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ 642ء میں طولانی جنگ کا (جو 609ء سے ... جاری تھی) پانسہ پلٹا اور

اس کا نتیجہ پلکیسن کی تباہی اور موت ہوا۔ پلو راجا نرسمہورمن نے اس کے دارالسلطنت کو فتح کرکے لوٹا اور غالباً اسے قتل کردیا۔ اس کے بعد تیرہ برس تک چلکیا خاندان کا اقتدار، جس کو پلکیسن نے اس قدر جدوجہد کے ساتھ قائم کیا تھا، معرض "التواء" میں پڑا رہا اور پلو تمام جنوبی ہند کے مالک ہو گئے۔

655ء، بکرماجیت اول

655ء میں پلکیسن کے ایک بیٹے بکرماجیت اول نے اپنے خاندان کی سلطنت کو نئے سرے سے آراستہ کیا اور پلو کو شکست فاش دینے کے بعد ان کے قلعہ بند شہر کانچی پر قبضہ کرلیا۔ اس جنوبی سلطنت کے ساتھ ایک مدت تک جنگ جاری رہی۔ جس میں کبھی ایک فریق غالب رہتا تھا اور کبھی دوسرا۔ اس کے عہد حکومت میں خاندان چلکیا کی ایک شاخ نے گجرات میں اپنے قدم جمائے اور یہاں آئندہ صدی میں عربوں کا جان توڑ مقابلہ کیا۔

740ء، بکرماجیت دوم

اس کے بعد کے عہد حکومت کا سب سے زیادہ نمایاں واقعہ اسی خاندان پلو کے ساتھ جنگ ہے۔ چنانچہ 740ء کے قریب بکرماجیت دوم نے ان کے دارالسلطنت پر نئے سرے سے قبضہ کیا۔

753ء، راشٹرکوٹوں کی فتح

آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان میں دنتی درگا نامی ایک سردار نے جو قدیم اور بظاہر اصلی قوم راشٹرکوٹ سے تعلق رکھتا تھا، شہرت و قوت حاصل کی اور بکرماجیت دوم کے بیٹے اور جانشین کیرتی ورمن دوم چلکیا کو مغلوب کیا۔ اس واقعہ کے بعد خاندان چلکیا کی اصلی شاخ معدوم ہو گئی اور دکن کی بادشاہت راشٹرکوٹ کے ہاتھ میں آگئی۔ چنانچہ آئندہ سوا دو صدی تک وہ وہاں کے بادشاہ ہوا کیے۔

570ء۔550ء، مذہبی حالت

واتاپی کے قدیم خاندان چلکیا کی حکومت کے دو صدی کے دوران میں ملک کے اندر مذہبی لحاظ سے زبردست تغیرات وقوع میں آرہے تھے۔ بدھ مذہب اگرچہ اس وقت بھی باثر اور آبادی کے ایک بڑے حصے میں قائم تھا لیکن بتدریج اس میں زوال آرہا تھا اور وہ برہمنی ہندو مت اور جین مذہب کے مقابلے میں معدوم ہوتا جاتا تھا۔ ہندو مت میں بھی قربانی کی طرف زیادہ توجہ

کی جاتی تھی اور اس پر بے شمار کتابیں اور رسالے تصنیف ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ پرانی شکل کا ہندو مت عوام میں مقبول تھا۔ چنانچہ پرانوں کے دیوتا وشنو' شیو وغیرہ کے ناموں پر ہر جگہ مندر تعمیر ہو رہے تھے جو اجڑی حالت میں بھی اس زمانے کے راجاؤں کی شان و شوکت کی یادگار ہیں۔ اسی زمانے میں راسخ الاعتقاد ہندوؤں نے بدھ اور جین مذہب والوں سے غاروں میں مندر کھودنے کا فن سیکھا۔ اس قسم کا قدیم ترین مندر چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں منگلیس چلکیا نے بادامی کے مقام پر وشنو کے نام پر بنایا تھا۔ مرہٹوں کے ملک کے جنوبی حصے میں جین مذہب بالخصوص عوام الناس میں مقبول تھا۔ اس کے علاوہ آٹھویں صدی کے دوران زرتشتی مذہب بھی ہندوستان میں مروج ہوا۔ خراسان کے جلاوطن پارسیوں کی پہلی آبادی 735ء میں بمبئی کے ضلع تھانہ کے مقام سنجان پر قائم ہوئی۔[6]

تقریباً 760ء' کرشنا اول

واتاپی کی فتح کے بعد دنتی درگا راشٹرکوٹ نے دوسری فتوحات بھی حاصل کیں۔ مگر کیونکہ عوام میں اس کی طرف سے ناراضی پھیل گئی اس لیے اس کے چچا کرشنا اول نے اسے تخت سے اتار دیا اور خود راشٹرکوٹ قوم کی بادشاہت قدیم چلکیا کے علاقے میں مستحکم کر دی۔

کیلاش کا مندر

کرشنا اول کا عہد حکومت اس وجہ سے خاص کر مشہور ہے کہ اس کے زمانے میں کیلاش کا مندر ایلورا میں ایک چٹان میں تراشا گیا جس کو ہندوستان کی فن تعمیر کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی مندر سنگی عمارتوں میں سب سے زیادہ ممتاز اور قابل قدر ہے۔ اس کو بہت سے مصنفین نے مع تصویروں کے بالتفصیل بیان کیا ہے اور ان سب میں ڈاکٹر برگس اور مسٹر فرگوسن سب سے زیادہ قابل توجہ ہیں۔[7]

گوبند دوم اور دھرو

کرشنا کا جانشین اس کا بیٹا گوبند دوم ہوا جو ایک مختصر سی حکومت کے بعد غالباً تخت سے بے دخل کر دیا گیا اور اس کا بھائی دھرو تخت و تاج کا مالک بن گیا۔ یہ ایک لائق اور جنگجو بادشاہ تھا اور اس نے نزاعی جنگوں کو جو ہندوستانی راجاؤں کو اس قدر عزیز ہوتی ہیں کامیابی کے ساتھ جاری رکھا۔[8] اس کو بالخصوص بھنمال کے گرجر راجا وتسراج کو شکست دینے پر بڑا فخر تھا۔ چنانچہ اس راجا [illegible] چھین لیے جن کو تراج [illegible] گوڑ (بنگال) [illegible] حاصل کیا تھا۔[9]

تقریباً 815-793ء گوبند سوم

دھرو کا بیٹا گوبند سوم اس زبردست خاندان کا سب سے زیادہ قابل تعریف راجا خیال کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی سلطنت کو شمال میں بندھیا چل اور مالوا تک اور جنوب میں کانچی تک وسیع کیا۔ کم ازکم دریائے تنگبھدرا تک کا علاقہ براہ راست اس کے زیر نگیں تھا۔ اس نے اپنے بھائی اندر راج کو لات یا جنوبی گجرات میں نائب السلطنت (وائسرائے) مقرر کیا۔

تقریباً 877-815ء اموگھورش

اگلے بادشاہ اموگھورش نے باسٹھ برس حکومت کی اور اس کے عہد کا طولانی زمانہ زیادہ تر ونگی کے مشرقی چلکیا راجاؤں کے ساتھ متواتر جنگ وجدل میں صرف ہوا۔ اس نے اپنا دارالسلطنت ناسک سے مانیاکھیت میں بدل دیا اور یہی شہر ہے جس کو عرب مورخین مانکیر لکھتے ہیں اور جو آج کل مالکھیر کے نام سے نواب نظام الملک کی قلمرو میں موجود ہے۔[1] بڑھاپے میں یہ راجا تخت سے دست بردار ہوگیا اور باقی ماندہ زندگی کو ریاضت وعبادت میں بسر کیا۔ اس کا بیٹا کرشنا دوم اس کا جانشین ہوا۔ جینیوں کے دگمبر (یا ننگے) فرقہ کی اموگھورش نے فیاضی سے سرپرستی کی۔ نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے شروع میں جن سین، گنبھدرا اور دیگر علماء کی سرپرستی میں (جو ترقی جین مذہب کے اس فرقے کو حاصل ہوئی) اس کو بدھ مذہب کے تنزل اور زوال کی ایک بڑی وجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ موخرالذکر رفتہ رفتہ اپنی قوت کو کھوتا رہا، یہاں تک کہ بارھویں صدی عیسوی میں دکن کے علاقے سے بالکل معدوم ہوگیا۔

16-914ء اِندر سوم

اندر سوم نے مختصر عرصہ حکومت (916-914ء) میں قنوج کے دور افتادہ مقام پر حملہ کیا اور کامیاب ہوا، اور پنچال قوم کے راجا مہی پال کو (جو اس وقت شمالی ہند میں سب سے بڑا بادشاہ تھا) تھوڑی مدت کے لیے تخت سے اتار دیا۔ اس جنگ کی وجہ سے سراشتر غالباً مہی پال کے قبضے سے نکل گیا اور اس کے علاوہ دوسرے مغربی صوبوں سے بھی اس کو دست بردار ہونا پڑا جو اندر سوم کی تخت نشینی کے وقت اس کے زیر تصرف تھے[1]

949ء چول راجا کا قتل

کرشنا سوم راشٹرکوٹ کے زمانے کی جنگ چول خاندان کے ساتھ اس وجہ سے مشہور ہے کہ

اس میں 949ء میں چول خاندان کا راجا راجادت میدان جنگ میں کام آیا تھا۔ اس زمانے کی جنگوں میں ہندو اور بدھ مذہبوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے بہت کچھ وحشیانہ اطوار و طریقوں کی بنیاد پڑی تھی۔

973ء' چلکیا کی بحالی

راشٹر کوٹ کا آخری راجا کک دوم تھا جس کو قدیم خاندان چلکیا کے ایک فرد تیل یا تیلپ دوم نے 973ء میں شکست دے کر مغلوب کیا' اپنے خاندان کی قدیم شان و شوکت کو نئے سرے سے قائم کیا اور اس خاندان کا بانی ہوا جو کلیانی کے چلکیا خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا خاندان بھی اپنے قدیم ہم نام خاندان کی طرح سوا دو سو برس تک برسر حکومت رہا۔

راشٹر کوٹ کی فوقیت

آٹھویں صدی کے اوائل میں محمد ابن قاسم کے سندھ کو فتح کر لینے سے اس صوبے میں پورے طور پر اسلام کا سیاسی غلبہ قائم ہو گیا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی اصلی سرزمین اور اس صوبے میں "گم شدہ" دریائے ہاکرا یا وہند حد فاصل تھا۔ اس دریا کے مشرق میں بھنمال کی گرجر ریاست نویں صدی کے شروع سے قنوج کے ساتھ متحد تھی اور دریا کے مغربی کنارے کی اسلامی ریاست سے ہمیشہ برسرپیکار رہتی تھی۔ مگر اس کے برعکس راشٹر کوٹ راجاؤں نے معلوم کیا کہ ان کے مفاد کا ذریعہ کچھ اور ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے عربوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات برابر قائم رکھے اور گرجروں کے ساتھ متواتر جنگ کرتے رہے۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مسلمان سوداگر اور سیاح ہندوستان کے مغربی حصے میں وارد ہوئے۔ ان کا سلسلہ نویں صدی کے درمیان میں مسلمان تاجر سلیمان سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے اور بعد کے دوسرے سیاحوں نے اپنے حالات شائع کیے ہیں۔ یہ تمام لوگ اس امر میں متفق ہیں کہ "بلہرا" ہندوستان کا سب سے بڑا راجا ہے۔ راشٹر کوٹ کے راجاؤں کو بلہرا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ ولبھ (یعنی محمود) کا لقب دیا کرتے تھے اور یہ لفظ رائے کے ساتھ مل کر بہ آسانی "بلہرا" بن گیا تھا۔[12] راشٹر کوٹ راجاؤں کی تعریف و توصیف مسلمان سیاحوں نے کی ہے جس کے وہ اپنے کارناموں کی وجہ سے ہر طرح مستحق ہیں۔ خواہ ایلورا کی صنعت بہترین ہو یا نہ ہو لیکن کیلاش کا مندر دنیا کے عجائبات میں شامل ہے۔ وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر ہر قوم و ملت کو فخر اور بجا فخر ہو سکتا ہے۔[13] اس سے اس بادشاہ کی عظمت و شوکت کا پورا پورا پتہ لگتا ہے جس کی سرپرستی میں وہ تعمیر کیا گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مندر شاہی خرچ اور فیاضی کی بدولت

تعمیر ہوئے اور سنسکرت علم و ادب کی ہمت افزائی کی گئی۔

995ء' منج کا قتل

خاندان چلکیا کو دوبارہ قائم کرنے والا راجا تیل چوبیس برس تک حکمراں رہا اور اس مدت میں اس نے اپنے خاندان کے تمام پرانے علاقے کو نئے سرے سے حاصل کر لیا۔ پھر بھی گجرات کا صوبہ اس کے ہاتھ نہ آیا۔ اس کا بہت سا وقت دھارا کے پوار (پرمار) راجا کے خلاف لڑنے میں گذرا اور اس راجا کا دعوٰی ہے کہ اس نے تیل کو چھ مرتبہ شکست فاش دی۔ مگر اپنی سلطنت کے آخر زمانے میں آخر کار تیل نے اپنی اگلی شکستوں کا بدلا لے لیا۔ اس کا دشمن دریائے گوداوری کو' جو دونوں سلطنتوں کے درمیان حد فاصل تھا' عبور کر کے تیل کی حدود سلطنت میں داخل ہوا' مگر شکست کھائی اور قید ہو گیا تھوڑی مدت تک تو اس کے مرتبے کے موافق اس کی بڑی خاطر و مدارات کی گئی' مگر جب ایک مرتبہ اس نے قید سے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا اور در بدر بھیک منگوانے کے بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔ یہ تمام واقعات غالباً 995ء میں ظہور پذیر ہوئے۔

تقریباً 1000ء' راج راجا چول کا حملہ

اس کے دو سال بعد تیل مر گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ستیا سرایا راجا ہوا۔ اس کے عہد حکومت کے دوران میں سلطنت چلکیا کو خاندان چول کے "راجا راج" راجا اعظم کے حملے کی وجہ سے سخت نقصان اور صدمہ اٹھانا پڑا۔ اس راجا نے ایک لشکر عظیم کے ساتھ' جس کی تعداد نو لاکھ بتائی جاتی ہے' تمام ملک کو روند ڈالا اور قتل و غارت کا اس قدر بے رحمی سے بازار گرم کیا کہ بچوں' عورتوں اور برہمنوں تک کو بھی اس ظالم کے پنجے سے نجات نہ ملی۔

1052ء' راجا ادھیراج چول کی وفات

1052ء میں سمیشور اول نے جو آہومل کے نام سے بھی مشہور ہے دریائے تنگبھدرا کے کنارے کپم کے مقام پر حکمران چول راجا ادھیراج کو شکست دی اور وہ اس جنگ میں جان سے مارا گیا۔ [1] اس کے علاوہ سمیشور کا یہ بھی دعوٰی ہے کہ اس نے مالوا کے علاقے میں دھارا اور جنوبی کانچی پر حملہ کر کے دونوں شہروں کو فتح کیا تھا اور چیدی کے دلیر راجا کرن کو شکست دی تھی۔

1068ء سمیشور چلکیا کی خودکشی

1068ء میں سمیشور ایک مہلک قسم کے بخار میں مبتلا ہوا اور جب اس کو اپنی جان سے بالکل مایوسی ہوگئی تو وہ شیو شیو کر کے تنگبھدرا میں کود پڑا اور ڈوب کر مرگیا۔ ایسی حالت میں خودکشی کرلینا ہندو رسم و رواج کے بالکل موافق ہے۔ اس قسم کی اور مثالیں بھی ایسے راجاؤں کی دستیاب ہوتی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ اس طریقہ سے کرلیا تھا۔

1076ء—1126ء' بکرمانک کا عہد حکومت

بکرماجیت چہارم یا بکرمانک نے جو بلہن کی تاریخی نظم کا ہیرو ہے' اپنے بھائی سمیشور دوم کو تخت سے بے دخل کردیا اور 1076ء میں تخت و تاج کا مالک ہوگیا۔ اس نے نصف صدی تک امن و امان سے حکومت کی۔ مگر اس امن میں بھی بعض دفعہ رخنہ پڑ ہی جاتا تھا۔ اس کے متعلق مذکور ہے کہ اس نے جنوب میں کانچی کو فتح کیا اور حکومت کے آخری حصے میں میسور کے شہر دوار سمدر کے خاندان ہیوسل کے راجا وشنو کے ساتھ ایک سخت تیز و تند جنگ میں مبتلا ہوگیا۔ بکرمانک کی نظر میں اس کے کارنامے ایسے وقیع تھے کہ اس نے ایک نئے سنہ کے آغاز کرنے کا اپنے آپ کو بہمہ وجوہ مستحق سمجھا۔ چنانچہ اس کا سنہ 1076ء سے شروع ہوتا ہے اور اس کے نام پر مشہور ہے' مگر وہ عوام میں کبھی متبول نہیں ہوا۔ اس کا دارالسلطنت کلیان یا ممالک محروسہ حیدر آباد دکن میں آج کل کا کلیانی شہر تھا جس کو سمیشور اول نے آباد کیا تھا۔ یہیں پر مشہور و معروف قانون داں وجنانیشور کا وطن تھا اور اس کی کتاب متاکشرا بنگال سے باہر ہندو قانون کی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔

1156ء' بجل کا غصب

بکرمانک کی وفات کے بعد خاندان چلکیا کی طاقت میں زوال آنا شروع ہوگیا اور 1156—62ء کے درمیان یعنی راجا تیل سوم کے عہد حکومت میں سپہ سالار افواج بجل یا دجن کلچری نے بغاوت کی اور تمام سلطنت پر متصرف ہوگیا۔ چنانچہ 1183ء تک وہ اور اس کے بیٹے اس پر حکمراں رہے۔ اس سنہ میں خاندان چلکیا کے ایک شہزادے سمیشور چہارم نے بجل کے جانشینوں سے ملک کا ایک حصہ از سر نو حاصل کرلیا۔ مگر وہ ہمسایہ سلطنتوں کے حملوں کو روکنے کی طاقت نہ رکھتا تھا' اور چند ہی سال کے عرصہ میں اس کی سلطنت کا بڑا حصہ مغرب میں دیوگری کے خاندان

1190ء' خاندان چلکیا کا خاتمہ

کہا جا سکتا ہے کہ کلیان کے خاندان چلکیا کا خاتمہ 1190ء میں ہو گیا اور اس کے بعد یہ راجا مقامی سرداروں کی حیثیت سے رہ گئے۔

1167ء' فرقہ لنگایت

غاصب بجل کا عہد حکومت نہایت مختصر تھا اور وہ 1167ء میں تخت و تاج سے دست بردار ہو گیا۔ مگر اسی مختصر سے زمانے میں ایک مذہبی انقلاب واقعہ ہوا جس سے شیو کے مذہب نے دوبارہ زندگی پائی اور ایک نیا فرقہ قائم ہوا جس کا نام ویر سیوس یا لنگایت ہے اور جو اس وقت پورے زوروں پر قائم ہے۔ بجل مذہبا" جین تھا اور روایت کا ایک پہلو یہ نکلتا ہے کہ اس نے فرقہ لنگایت کے دو ولیوں کو بلا وجہ اندھا کر دیا اور اس کے بدلے میں 1167ء میں وہ خود قتل کیا گیا۔ اس کے بعد جیسا کہ بالعموم ہمیشہ ہوتا آیا ہے ان دونوں ولیوں کی خونریزی سے اس نئے مذہبی فرقے کی بنیاد پڑی جس کو بجل کے برہمن وزیر بسو نے قائم کیا تھا۔ مگر دوسری روایات میں یہ حکایت بالکل مختلف طور سے بیان کی گئی ہے اور حقیقت پر ایسا گہرا پردہ پڑ گیا ہے کہ اصلی بات کا ظاہر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ اس مذہب کے ماننے والے بالعموم کنٹری زبان بولنے والے اضلاع میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ شیو کو مبدائے حیات کی حیثیت سے مانتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں' ویدوں کو قبول نہیں کرتے آواگون (تناسخ) کے منکر ہیں' بچپن کی شادی سے محترز رہنا چاہتے ہیں' بیواؤں کی شادی پر زور دیتے ہیں اور باوجود اس کے کہ ان کے مذہب کا بانی ایک برہمن تھا' برہمنوں سے سخت متنفر ہیں۔

بدھ اور جین مذاہب کا زوال و انحطاط

یہ نئے مذہبی فرقے جن میں وہ تجارت پیشہ لوگ بکثرت شامل ہو گئے تھے جن کی وجہ سے اس وقت تک جین اور بدھ مذاہب کو تھوڑی بہت قوت حاصل تھی' مقدم الذکر مذہب کی ترقی اور توسیع میں سد راہ ہوئے۔ بدھ مذہب کی بھی دم شماری ہو رہی تھی۔ چنانچہ بارہویں صدی کے نصف کے بعد دکن میں اس کے وجود کا پتہ شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔[15]

دوار سمدر کا خاندان ہیوسل

بارہویں صدی کے دوران ہیوسل یا پوسل خاندان یا قبیلے کے سرداروں نے

میسور کے ملک میں بہت طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس خاندان کے شروع کے بادشاہوں میں سب سے بڑا بادشاہ بٹی دیو یا بتگ (تقریباً 1141۔1111ء) تھا۔ اس نے اپنا دارالسلطنت دوار سمدر موجودہ ہلیبد کو مقرر کیا جہاں وہ مشہور و معروف مندر واقع ہے جس کو دیکھ کر مسٹر فرگوسن خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ اس کی حکومت کے اوائل میں اس کے وزیر گنگراج کے زیر حمایت جین مت کا خوب بول بالا رہا اور اس مذہب کے وہ مندر جن کو متعصب راسخ الاعتقاد چول حملہ آوروں نے برباد کر دیا تھا نئے سرے سے تعمیر کیے گئے۔ مگر آخر کار مشہور مصلح رامانج کے زیر اثر آ کر بادشاہ نے خود وشنو کا مذہب اختیار کر لیا۔ بلور اور ہلیبد کی عالیشان عمارتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ اس نے اپنے نئے مذہب کی خدمت کس قدر دریادلی اور فیاضی سے کی تھی۔[16]

تبدیل مذہب کے بعد اس نے اپنا نام وشنو وردھن یا وشنو مقرر کیا اور اسی نام سے وہ زیادہ مشہور ہے۔ اپنے تذکروں میں وشنو نے بہت سی فتوحات کا ذکر کیا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے جنوبی ہند کے چول' چیرا اور پانڈیا خاندانوں کے راجاؤں کو شکست دی تھی۔ 1223ء کے قریب اس کے جانشین نرسمہ دوم نے جو اس وقت چول خاندان کے ساتھ متحد تھا در حقیقت ترچناپلی پر قبضہ کر لیا تھا۔[17]

1173۔1220ء' ویر بلال

وشنو کے پوتے ویر بلال نے اپنے طولانی عہد حکومت کے اثناء میں اپنی سلطنت میسور کے شمال تک وسعت دی۔ اس کو خصوصیت کے ساتھ اس بات پر فخر تھا کہ اس نے 2۔1191ء میں دیوگری کے خاندان یادو کے راجا کو' جس کی سلطنت شمال کی طرف واقع تھی' شکست دی تھی۔ اس کی فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہوسل جنوبی ہند میں (جس میں دکن کے جنوبی علاقے بھی شامل تھے) سب سے بڑی طاقت ہو گئی۔

1310ء' خاندان ہوسل کا خاتمہ

اس خاندان کی طاقت 1310ء تک برابر قائم رہی۔ مگر اس سنہ میں مسلمان سپہ سالار ملک کافور اور خواجہ حاجی ہوسل کی سلطنت میں داخل ہوئے' ملک کو تاخت و تاراج کیا' حکمران راجا کو گرفتار کیا اور اس کے دارالسلطنت کو لوٹ لیا۔ آخر کار 1326ء یا 1327ء میں ایک اسلامی فوج نے اسے بالکل تباہ و برباد کر ڈالا۔ اس کے چند سال بعد راجا کے بیٹے کا ذکر بعد کی تاریخوں میں محض ایک مقامی راجا کی حیثیت سے ملتا ہے۔

دیوگری کا خاندان یادو

دیوگری کے شاہان یادو سلطنت چلکیا کے باج گزار امراء کی اولاد میں سے تھے۔ وہ علاقہ جس پر وہ متصرف ہو گئے دیوگری (دولت آباد) اور ناسک کے درمیان واقع تھا اور اس زمانے میں سون کہلاتا تھا۔ اس خاندان میں سے پہلا شخص بھلم تھا جس نے کچھ سیاسی اہمیت حاصل کی۔ یہ 1191ء میں ہیوسل خاندان کے بادشاہ کے برخلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔

1210ء' راجا سنگھن

ان کا سب سے زبردست راجا سنگھن تھا جو 1210ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے گجرات وغیرہ ممالک پر فوج کشی کی اور ایک ناپائیدار سلطنت قائم کر لی جو وسعت میں چلکیا اور راشٹرکوٹ کی سلطنتوں کے ہم پلہ تھی۔

1294ء' سلطان علاؤ الدین کا حملہ

خاندان ہیوسل کی طرح یادو خاندان بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے تباہ ہوا۔ 1294ء میں جب دہلی کے سلطان علاؤ الدین نے دریائے نربدا کو (جو سلطنت یادو کی شمالی حد تھا) عبور کیا تو حکمران راجا رام چندر سے اس کے سوا اور کچھ نہ بن پڑی کہ اپنے آپ کو حملہ آور کے حوالے کر دے اور بے شمار خزانہ دے کر جان بچائے جس میں کہا جاتا ہے کہ چھ سو من موتی' دو من ہیرے' لعل' زمرد اور نیلم وغیرہ شامل تھے۔

1309ء' ملک کافور

1309ء میں جب ملک کافور نے سلطان کے حملے کا اعادہ کیا تو پھر رام چندر ہر قسم کے مقابلے سے باز رہا اور حملہ آور کی اطاعت قبول کر لی۔ وہ دکن کا آخری ہندو خود مختار راجا تھا۔ دریائے کرشنا کے جنوب کے وسیع علاقوں میں سلطنت وجے نگر نے جو 1336ء میں قائم ہوئی 1565ء تک ہندوؤں کے آداب سلطنت کو نہایت آب و تاب سے جاری رکھا اور انجام کار مسلمان بادشاہوں کے متحدانہ حملوں سے برباد ہو گئی۔

1318ء' خاندان یادو کا خاتمہ

رام چندر کی وفات کے بعد اس کے داماد ہرپال نے غیر ملکیوں کے مقابلے کے لیے 1318ء

میں ایک بغاوت برپا کی، مگر شکست کھائی۔ اس کی کھال اتارنے کے بعد اس کی عضو تراشی کی گئی۔ اس طرح آخر کار خاندان یادو کا خاتمہ ہو گیا۔[18]

ہمادری یا ہمادنپت

سنسکرت کا مشہور و معروف مصنف ہمادری جو بالعموم ہمادنپت کے نام سے مشہور ہے رام چندر اور اس کے پیشرو مہادیو کے عہد حکومت میں گذرا ہے۔ اس نے خاص کر اپنی توجہ ہندو مذہب کی رسوم اور دستور کے بیانات کو سلسلہ وار ایک جگہ جمع کر دینے پر خرچ کی اور اسی بات کو مد نظر رکھ کر اس نے ہندوؤں کے قانون پر نہایت اہم کتابیں تالیف کیں۔ اسی کے متعلق (اگرچہ غلطی سے) یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے مودی طرز تحریر کو لنکا سے لا کر اس ملک میں مروج کیا۔[19] اس نے اپنی ایک کتاب کے مقدمے میں اپنے مربی کے خاندان کا نہایت قابل قدر تذکرہ قلمبند کیا ہے۔

ضمیمہ ط

دکن کے بڑے بڑے شاہی خاندان[۲۰]

الف) واتاپی (بادامی) کے شاہان چلکیا 550-753ء

کتبوں سے معلوم شدہ سنین	تخت نشینی کا قرین صحت سن	نام	سلسلہ نشان
کتبات بالکل ناپید ہیں۔ (ولبھ کا خطاب یا لقب بعض دفعہ الگ اور بعض دفعہ دوسرے الفاظ مثلاً سری وغیرہ کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے)	550ء	پلکیسن اول (ستیاسریا' رن بکرم' ولبھ)	1
578ء	566-7ء	کیرتی ورمن (ولبھ' رن پراکرم وغیرہ)۔	2
601-2ء	597-8ء	منگلیس (ولبھ' رن وکرانت وغیرہ)	3
612ء و 634ء تاجپوشی 609ء	608ء	پلکیسن دوم (ولبھ' ستیاسریا وغیرہ)	4

سلسلہ نشان	نام	تخت نشینی کا قرین صحت سن	کتبوں سے معلوم شدہ سنین
5	بکرماجیت اول (ولبھ' سیتاسریا وغیرہ)	(642ء سے 655ء تک وقفہ) 655ء	659ء
6	ونیادت (سیتاسریا' ولبھ وغیرہ)	680ء	689ء' 691ء' 692ء و 694ء۔
7	وجیادت (سیتاسریا وغیرہ)	696ء	699ء' 700ء' 705ء و 709ء۔
8	بکرماجیت دوم (اَبوارت وغیرہ)		735ء (؟)
9	کیرتی ورم دوم (نری پسمہراج' وغیرہ)	733ء 746ء	754ء' 757ء' (753ء میں راشتر کوتوں کی فتوحات واقع ہوئیں۔ اور کیرتی ورمن محض ایک مقامی سردار رہ گیا)

ب) مانیا کھیت (مالکھیڑ) کے شاہان راشٹر کوٹ 753-973ء

سلسلہ نشان	نام	تخت نشینی کا قرین صحت سن	کتبوں سے معلوم شدہ سنین
1	دنتی درگا (کھدگا ولوگ وغیرہ)	753ء	753ء
2	کرشنا اول (اکال ورش وغیرہ)	760ء	770ء (گوبند یوراجا)
3	گوبند دوم (پربھوت ورش وغیرہ)	775ء	779ء
4	دھرو (نرپم 'سری ولبھ' یہ خطاب خاندان چلکیا سے لیا گیا تھا وغیرہ)	780ء	783ء (جینوں کی کتاب ہری ومس)
5	گوبند سوم (پربھوت ورش وغیرہ)	793ء	794ء '804ء '808ء و 813ء
6	اموگھ ورش اول (نرپ تنگ وغیرہ)	815ء	817-877ء
7	کرشنا دوم (کرشنا ولبھ وغیرہ)	880ء	902-11ء
8	اندر سوم (نتیاورش وغیرہ)	912ء	914ء و916ء
9	امورگھوش دوم	916-7ء	ناپید
10	گوبند چہارم (سورن ورش وغیرہ)	917ء	918-33ء
11	امورگھوش سوم (بدگ وغیرہ)	935ء	ناپید
12	کرشنا سوم (اکثر وغیرہ)	940ء	940-961ء
13	کھتگ (ملتیاورش وغیرہ)	965ء	971ء
14	کک دوم (ککل وغیرہ)	972ء	972ء و973ء (خاندان چلکیا کا 973ء میں تیل کے ہاتھوں احیاء)

ج) کلیانی (کلیان) کے شاہان چلکیا۔ 973-1190ء

سلسلہ نشان	نام	تخت نشینی کا قرین صحت سن	کتبوں سے معلوم شدہ سنین
1	تیل دوم (تیلپ، آہو ملی وغیرہ)	973ء	993-97ء
2	سیتاسریا (ستگ وغیرہ)	997ء	1002ء اور 1008ء۔
3	بکرماجیت پنجم (تربھون مل)	1009ء	1009ء
4	جیاسمہ دوم (جگدیک مل اول)	1016ء	1018(?) سے 1040ء تک
5	سمیشور اول (اہومل وغیرہ)	1042ء	1044-68ء
6	سمیشور دوم (بھوناتک مل)	1075ء	1071-5ء
7	بکرماجیت چہارم (بکرمازک وغیرہ)	1075-76ء	1077ء۔ 1125ء
8	سمیشور سوم (بھولک وغیرہ)	1125-26ء	1128ء اور 1130ء
9	پرم جگدیک مل دوم	1138ء	1139ء اور 1149ء
10	تیل سوم (تیلپ، ترلوکیامل وغیرہ)	1149ء	1154ء اور 1155ء
11	سمیشور چہارم (تربھون مل وغیرہ)	1162ء	1184ء اور 1189ء (بجل کلچر یا کا غصب 1156-62ء میں۔ 1167ء میں وہ تخت سے دستبردار ہوا۔ اور اس کی اولاد 1183ء تک سمیشور چہارم کے حریف رہی)

حوالہ جات

۱؎ خاندان کدمب کے لیے دیکھو، رائس کی کتاب "میسور اینڈ کرگ فرام دی انسکرپشنز" (لنڈن - کانسٹیبل اینڈ کو 1909ء) - نواب نظام الملک کے علاقے میں آثار قدیمہ کی تحقیقات کا کام بہت ہی کم ہوا ہے - مگر میسور میں ایک نہایت قابل عملہ اس کام کے لیے مقرر ہے جس کا افسر پہلے مسٹر رائس اور اب مسٹر آر - نرسمہچار ہے -

۲؎ جہاں کہیں کہ بالخصوص بیان کر دیا گیا ہو، اس کے علاوہ یہ تمام باب ڈاکٹر فلیٹ کی "ڈائنا سٹیز آف دی کنڑیز ڈسٹرکٹ" اور پروفیسر آر - جی - بھنڈارکر کی "ارلی ہسٹری آف دی دکن" (بمبئی گزیٹیئر - (1896ء) جلد اول حصہ اول) کی طبع دوم پر مبنی ہے - اصلی اسناد کے حوالے ان دونوں کتابوں میں بالتفصیل ملیں گے - پروفیسر کیلہارن کے "سپلیمنٹ ٹو دی لسٹ آف انسکرپشنز آف سدرن انڈیا" (اپی گرافیا انڈیکا جلد 8 ضمیمہ 2) میں خاندانوں کی بہترین فہرستیں اور جنوری 1906ء تک کتبات کے مطالعہ کے بہترین نتائج جمع کر دیے ہیں - چلکیہ اور دوسرے بہت سے اشخاص کے نام جن کا ذکر آگے آئے گا مختلف قسم کے ہیں اور ان کے طریق تحریر میں بھی اختلاف ہے - یہ نام چاپ کے نسب نامے میں پایا جاتا ہے اور ڈاکٹر فلیٹ کو صرف یہی ایک ایسی مثال ملی ہے جہاں یہ نام چلکیا خاندان کے سوا اور کہیں بھی مستعمل ہوا ہو - اس امر سے مسٹر جیکسن کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ سولنکی یا چلکیا گرجر کے ہم قوم تھے - کیونکہ چاپ قوم ان ہی (گرجر) کی ایک شاخ تھی (بمبئی گزیٹیئر 1896ء) جلد اول حصہ اول صفحہ 127، حاشیہ 2، صفحہ 138، صفحہ 463، حاشیہ 2 صفحہ 467 -)

۳؎ "رپورٹ آن اپی گریفی" مدراس - جی - او - نمبر 574 جولائی 17، 1908ء -

۴؎ اس بات کی سند مسلمان مورخ طبری ہے جس کا مسٹر فرگوسن نے اپنے مضمون جے - آر - اے - ایس - اپریل 1879ء میں ترجمہ اور اس کی عبارت کو نقل کیا ہے - اور دیکھو برگس - - - "نوٹس آن دی بدھا ٹمپلز آف اجنتا" (آرکیالوجیکل سروے ویسٹرن انڈیا نمبر 9، بمبئی 1897ء) صفحہ 92 - 190 اجنتا کی استرکاری کی نقاشی کے لیے دیکھو مذکورہ بالا کتاب کی لوح

4۔ اور ج۔ اے۔ ایس۔ بی حصہ اول جلد 67 (1878ء) کی لوح 2، 3، 4۔ اجنتا کی نقاشی کی انڈیا آفس کی اٹلس اور "ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون" صفحہ 290 شکل 210۔

۵ دیکھو۔ "ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون" صفحہ 388۔

۶ انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 174۔

۷ "کیو ٹمپلز" اور "آرکیالوجیکل سروے ویسٹرن انڈیا" جلد 5۔ قدیم نام کی اصلی شکل دلورایا ایلاپور ہے۔

۸ گوبند کا سنہ جلوس 770ء اور 779ء کے درمیان ہے۔ (سک سنہ 701-602) (پروگرس رپورٹ آرکیالوجیکل سروے ویسٹرن انڈیا 4-1903ء صفحہ 60)

۹ ج۔ آر۔ اے۔ ایس 1909ء صفحہ 225۔

۱۰ دیولی کی لوحیں (اپی گریفیا انڈیکا جلد 5 صفحہ 193)۔ ڈاکٹر فلیٹ نے غلطی سے مانیاکھیت کی تعمیر کو گوبند سوم کے زمانے کا واقعہ بتلایا ہے۔

۱۱ کھیے کی لوحیں (اپی گریفیا انڈیکا جلد 7 صفحہ 32۔ لسٹ نمبر 91)۔

۱۲ ولبھ کا لقب یا خطاب جو جدا اور سری یا پرتھوی جیسے الفاظ کے ساتھ مل کر بھی استعمال ہوتا ہے، راشٹرکوٹوں نے اپنے پیشرو خاندان چلکیا کی نقل میں اختیار کیا تھا۔ مسلمان مورخین ہندو راجاؤں کو "رائے" کہتے ہیں۔ (بمبئی گزٹیئر 1896ء) جلد اول حصہ دوم 209)۔ قدیم عرب جغرافیہ دانوں اور سندھ کے مورخوں کا ترجمہ ایلیٹ نے ہسٹری آف انڈیا جلد اول میں کیا ہے۔ سب سے پہلے پروفیسر بھنڈارکر نے بلہرا کے لفظ کا صحیح مفہوم ظاہر کیا تھا۔

۱۳ "لیکن مسلمان شرک اور بت پرستی پر کبھی فخر نہیں کر سکتے: اس سے ان کی بیزاری بجا اور قابل فخر ہے۔" (ناظر صاحب مذہبی)۔

۱۴ ڈاکٹر فلیٹ نے غالباً غلطی سے جنگ کیم کو 20 جنوری 1020ء کا واقعہ قرار دیا ہے۔ (کنریز ڈائناسٹی صفحہ 441)۔ 1052ء کی تاریخ پروفیسر کیلہارن نے دریافت کی ہے۔ کیم سے مراد بظاہر تنگبھدرا کے کنارے کا گاؤں ہے نہ کہ دریائے پالار کا اسی نام کا گاؤں۔

۱۵ آچار سار میں بدھ مذہب کی طرف بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ "اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کنڑی زبان کے علاقے میں سک 1076 (1154ء) میں بدھ کے ماننے والے بکثرت تھے۔" (پاٹھک۔ انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 89)

۱۶ فرگوسن اور میڈوز ٹیلر کی کتاب "آرکی ٹیکچر ان دھروار اینڈ میسور" (مرے 1866)۔ وشنو کی حکومت اور عمارات کی تفصیل کے لیے دیکھو مسٹر رائس کا مقدمہ اپی گریفیا کرناٹکا جلد 5 صفحہ 1 اور خصوصاً صفحہ 36۔ مسٹر ایس۔ کے۔ آئینگر نے خاندان ہیوسل کا نہایت عمدہ حال ماہنامہ لکھنؤ میں ... 1905ء ... انڈیا

میں دوبارہ شائع ہو گیا ہے۔

کلہ اسپی گریفیا انڈیکا جلد 7 صفحہ 162۔

ملہ خاندان ہیوسل کے متعلق سب سے نیا بیان رائس کی کتاب "میسور اینڈ کرگ فرام انسکرپشنز" 1909ء میں ملے گا۔

ولہ مودی طرز تحریر دراصل مشہور و معروف مرہٹہ سردار شیواجی کے سیکرٹری بالاجی اوجی نے دریافت یا کم از کم مروج کیا۔ (بی۔ اے۔ گپتے۔ انڈین کویری 1905ء صفحہ 27۔ سرجی۔ گریئرسن نے اس کے حروف تہجی "لنگوسٹک سروے" جلد 7 صفحہ 20 میں نقل کیے ہیں۔

نلہ ان فہرستوں میں صرف بڑے خاندان کا ذکر ہے اور خاندان کی باقی شاخوں اور رشتہ داروں کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کی یہ فہرستیں ان فہرستوں سے ماخوذ ہیں جو پروفیسر کیلہارن نے اسپی گریفیا انڈیکا کی جلد 8 ضمیمہ ب (1906ء) میں شائع کی تھیں۔ ہر ایک خاندان کو اس کے اصلی بانی سے شروع اور خیالی افراد کو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔

سولھواں باب

جنوبی ہند کی سلطنتیں

حصہ الف — "تین سلطنتیں"

تامل قوم کا ملک

جنوبی ہند اور دکن سطح مرتفع کے درمیان دریائے کرشنا اور تنگبھدرا حد فاصل ہیں۔ اس کی حیثیت اور تاریخ ہندوستان کے اور ممالک اور علاقوں سے بالکل جدا واقع ہوئی ہے۔ زمانہ حال کی اصطلاح میں اگر ذکر کیا جائے تو اس وسیع علاقہ میں احاطہ مدراس "شمالی سرکار" کے اضلاع وزیگاپٹم اور گنجام کو نکال کر اور میسور، کوچین اور ٹراونکور کی دیسی ریاستیں شامل ہیں۔ یہ حصہ درحقیقت تامل قوم اور اس زبان کے بولنے والوں سے آباد ہے اور اسی وجہ سے قدیم زمانے میں یہ تاملکم یعنی "تامل قوم کا ملک" کے نام سے مشہور تھا۔ قدیم ترین روایات کے بموجب تاملکم کی شمالی حد مدراس سے ذرا اوپر کی طرف مشرقی ساحل پر پلی کٹ تھی۔ مغربی ساحل پر بدگر کے قریب سفید چٹان اور جنوب میں مہی واقع تھا اور ان دونوں مقاموں کے درمیان سرحدی خط کوہ ونکٹ یاترپتی کے پاس (جو مدراس کے شمال مشرق میں سو میل کے فاصلے پر واقع تھا) گزرتا تھا اور پھر بدگر سے جنوب کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔[1] بعد کی روایات کے موافق شمال مشرقی حد شمالی دریائے پنار کے کنارے شہر نلور[2] تک اور شمال مغربی حد منگلور کے جنوب میں دریائے چندرگری تک وسیع ہو گئی تھی۔[3] اس باب میں صرف تامل اقوام کی سلطنتوں اور خاندان پلو پر بحث کی جائے گی۔ اس سے قبل پندرھویں باب میں میسور کے شاہی خاندانوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ دکن کی سطح مرتفع کی سلطنتوں کے ساتھ ان کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔

ٹولمی کا دمریکے

یونانی جغرافیہ داں ٹولمی جس نے 140ء میں اپنی کتاب تصنیف کی تھی جنوبی ہند سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اس ملک کا نام دمریکے بتلاتا ہے اور یہ لفظ تاملکم کی محض ایک اور صورت ہے کیونکہ "ل" اور "ر" میں تبادلہ ہو سکتا ہے۔ مگر دو یونانی حروف (Δ' Λ) میں اکثر التباس ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے کتابی نسخوں میں وہ نام خراب ہو کے لمریکے پڑھ لیا گیا ہے۔[4] اس کے زمانے میں اس تمام وسیع علاقہ میں صرف ایک زبان یعنی تامل بولی جاتی تھی۔ ملایالم زبان جو اب مالابار میں بولی جاتی ہے چند صدی بعد تک اس قابل نہ ہوئی تھی کہ اس کو ایک جدا زبان کہا جا سکے۔ آبادی میں مختلف عناصر شامل تھے۔ مگر ان میں سے دنوریا تیرانداز (بھیل) اور ماہی گیر (نپاس) سب سے زیادہ قدیم مانے جاتے ہیں' اور تامل قوم بظاہر بعد کے آئے ہوئے لوگ ہیں۔

زمانۂ قدیم میں معاشرتی حالت

تامل زبان کی قدیم نظمیں' جو قابل ماہرین فن کے خیال کے مطابق سنہ عیسوی کی پہلی تین صدیوں میں کہی گئی تھیں' اس زمانے کی معاشرت کا بہت ہی اچھا ہو بہو نقشہ پیش نظر کرتی ہیں۔ تامل قوم کی تہذیب و تمدن کی نشوونما بالکل جداگانہ ہوئی تھی اور شمالی ہند کے تمدن پر اس کی بناء نہ تھی۔ شمالی علاقے سے آئے ہوئے لوگوں نے جو مدراو غیرہ کے شہروں میں آباد ہو گئے تھے' یہ کوشش کی تھی کہ یہاں بھی شمالی ہند کی ہندو رسوم اور ذات پات کے جھگڑوں کو مروج کریں۔ مگر ان کو سخت مخالفت کا سامنا ہوا۔ چنانچہ ذات کا نظام جو اب چند گزشتہ صدیوں سے جنوب میں اس قدر سختی سے مروج ہے اس زمانے میں نامکمل اور محض ابتدائی حالت میں تھا۔[5] عوام الناس کا مذہب "دیوپرستی" کی ایک صورت تھی اور یہی اب بھی دوسرے ناموں سے جنوب میں مروج ہے۔ مثلاً قدیم زمانے میں جنوبی ہند کی سب سے زبردست دیوی کتوئی یعنی "فاتح" تھی اور اب اس نے ہندوؤں کے بتوں میں شیو کی بیوی اوما یا درگا کے نام سے جگہ حاصل کر لی ہے۔[6]

خوں خوار جنگیں

تین زبردست سلطنتوں کے علاوہ (جن کا ذکر عنقریب آئے گا) ایک سو بیس کے قریب ایسے سردار موجود تھے جو ملک میں کم و بیش خود مختاری کا دعویٰ رکھتے تھے اور ہر وقت ایک دوسرے سے خونریز جنگ و جدال میں مشغول رہتے تھے۔ ان جنگوں کا ظلم و تشدد اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ جاتا تھا کہ طرفین اصلی باشندوں کو فوج میں بھرتی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان ہی لوگوں کی

اولادیں مرور، کلر وغیرہ کے نام سے اب بھی موجود اور ملک میں فتنہ وفساد برپا کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ ڈاکٹر پوپ کہتا ہے کہ "ان برباد کن جنگوں کے نشان آج کل بھی ان ویران قلعوں کی صورت میں نظر آتے ہیں جن کے کھنڈر اب بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے معتبر زمانہ تاریخی کے شروع ہونے کے وقت آبادی نسبتاً قلیل اور منتشر تھی۔"

مذہب

اصلی باشندوں کا مذہب "دیوپرستی" تھا۔ جب وہ شمالی ہند کے تین مذاہب یعنی برہمنی، جین اور بدھ مت کی زد میں آیا تو ان کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس کو مجبوراً ان زیادہ مہذب مذاہب کے پس پردہ ہٹ جانا پڑا۔

جین مذہب

جین مذہب کی روایات کے مطابق اس مذہب کو شمالی ہند کے ان نقل مکان کرنے والوں نے جنوب میں پھیلایا جو چندر اگپتا موریا کے زمانے کے بارہ سال کے قحط سے تنگ آکر اپنا وطن ترک کر کے جنوب میں چلے آئے تھے۔ بعض اسناد کے بیان کے مطابق یہ 309 ق م کا واقعہ ہے۔ یہ اجنبی میسور کے علاقے میں سرون بلگون کے مقام پر آباد ہو گئے اور یہیں پر ان کے مذہبی مقتداء بھدر باہو نے جین کے پسندیدہ قاعدے کے مطابق اپنے آپ کو فاقے سے ہلاک کیا۔ سرون بلگون کی جین آبادی کے موجودہ مذہبی پیشوا کو بھدر باہو کے جانشین ہونے کا دعویٰ ہے اور جنوبی ہند کے تمام جین اس کو اپنا مذہبی پیشوا سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں، یہ حکایت چندر اگپتا موریا کی زندگی کے آخری دنوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس کو بعض نقاد تسلیم اور بعض رد کر دیتے ہیں۔ بہرحال بھدر باہو کی خودکشی کے متعلق خواہ کچھ ہی خیال کیوں نہ ہو مگر جینوں کے اس نقل مکان کی روایات کو رد کرنے کے لیے کوئی کافی وجہ دستیاب نہیں ہوتی۔ یہی وہ نقل مکان ہے جس کے ذریعے سے جنوب میں مہابیر کا مذہب بدھ مت کے مبلغوں یا واعظوں کے ظہور سے نصف صدی قبل مروج ہو گیا۔ راجا اشوک کے پوتے سمپرتی کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے سہستن کے زیر اثر آکر اپنا مذہب تبدیل کیا، جنوب میں ایک جماعت جین مذہب کی اشاعت کے لیے روانہ کی اور وہاں یہ مذہب اس قدر مقبول ہوا کہ مسٹر رائس یہ کہنے میں بالکل حق پر ہیں کہ 1000ء کے اندر میسور کے علاقہ میں یہی مذہب سب سے زیادہ مروج تھا۔ اس کے علاوہ اور علاقوں میں بھی یہ کم وبیش پھیل گیا۔ خاندان پانڈیا کی سلطنت میں جین مت کو ... بعد تک

برابر زور و شور کے ساتھ جاری رہا۔

بدھ مت:

اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں کہ اس علاقہ میں بدھ مت کو روشناس کرانے کا کام مہاراجا اشوک کے بھائی مہندر اور ان دوسرے مبلغین نے کیا جن کو اشوک نے اس طرف تیسری صدی قبل مسیح میں روانہ کیا تھا۔ اگرچہ آئندہ چند صدیوں میں اس نے مقبولیت عامہ حاصل کر لی تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب کبھی بھی جنوب میں حکمراں مذہب کی حیثیت حاصل نہ کر سکا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اس کا زوال وانحطاط شروع ہو گیا تھا اور جین مت اور ہندو مت بتدریج اس کی جگہ لے رہے تھے۔ اس صدی کے بعد موخر الذکر دونوں مذہبوں کی آپس میں کشمکش جاری تھی اور بعض دفعہ یہ رقابت نہایت وحشیانہ صورت اختیار کر لیتی تھی۔ جنوبی ہند میں شروع شروع کے زمانے میں بدھ مت نے ذات پات سے گلو خلاصی حاصل کر لی تھی۔ مگر برہمنی مذہب کے خیالات اور عقائد کا اثر ایسا گہرا تھا کہ آخر کار بدھ مت کو نیچا دیکھنا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا شمالی ہند سے کہیں زیادہ جنوب میں ذات کے متعلق تمام قواعد و ضوابط پر عمل در آمد ہو رہا ہے۔ اس مقام پر ہم اس موضوع پر اور زیادہ تفصیل سے بحث نہیں کر سکتے۔ بہر حال بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ تامل اور کنٹری زبانوں کے ممالک میں اس مذہبی کشمکش اور رقابت کے متعلق ایک نہایت دلچسپ کتاب کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔

غلامی مفقود تھی' پانچ زبردست مجلسیں

کہا جاتا ہے کہ قدیم تامل قوم میں غلامی بالکل مفقود تھی۔ میگا ستھینز کا یہ قول کہ "بڑی بات یہ تھی کہ تمام ہندی آزاد تھے اور ہندوستان میں غلام بالکل نہ پائے جاتے تھے۔" غالباً صرف جنوبی علاقہ کی خبروں ہی پر مبنی تھا اور اس کو جلدی میں تمام ہندوستان پر عائد کر دیا گیا تھا۔[8] اسی نے تمام آبادی کو سات جماعتوں میں تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں۔ (1) فلسفی' (2) کاشتکار' (3) گوالے اور چرواہے' (4) صناع اور تجار' (5) فوج کے لوگ' (6) ناظرین اور (7) مشیر سلطنت۔ ان کا مقابلہ ہم ان "زبردست پانچ مجلسوں سے کر سکتے ہیں جو شاہان قوم تامل کے اختیارات کو محدود کرتی تھیں اور جن میں عوام الناس' مذہبی پیشوا' منجم' اطباء اور وزراء شامل تھے۔[9]

صلح و جنگ

قدیم تامل ~~علم ادب~~ میں جن ہولناک اور مہیب جنگوں کی کثرت اور وحشت کے تذکرے

پائے جاتے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم تامل سلطنتوں میں امن کے تمام فنون اور معاشرتی زندگی کی تمام خوبیاں بالکل عنقا ہوں گی۔ مگر یہ خیال غلط ہے کیونکہ اس میں کسی قسم کا شک نہیں کہ نظم اور دوسرے مہذب فنون نہایت اعلیٰ درجے پر پہنچ گئے تھے' اور کم از کم شہر کے باشندوں کے لیے وہ تمام آرام و آسائش کے سامان مہیا تھے جن کو مال و دولت سے خریدا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر بھی میگاستھینز کے ایک بیان سے ہم کو اس ظاہری تضاد کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ باوجود متواتر جنگ و جدل کے تجارت اور زراعت پیشہ لوگوں کی نہایت خوشحال اور دولتمند جماعت وہاں موجود تھی۔ یونانی سفیر کہتا ہے:

"دوسری جماعت میں زراعت پیشہ لوگ شامل ہیں۔ تمام آبادی کا بڑا جزو یہی لوگ ہیں اور طبیعت کے لحاظ سے یہ نہایت نرم مزاج اور بزدل واقع ہوئے ہیں۔ ان کو فوج میں داخل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا' مگر یہ لوگ بلا خوف و خطر اپنی زمینوں کی کاشت میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ لوگ فسادات اور وہاں کے معاملات میں حصہ لینے کے لیے کبھی شہر میں نہیں جاتے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ملک کے ایک حصہ میں ایک ہی وقت جنگ کی صف بندی ہوتی ہے اور لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں' مگر دوسری طرف کاشت کار بالکل امن و اماں سے اپنے ہل چلانے اور زمین کھودنے میں مشغول ہوتے ہیں اور سپاہی ان کی حفاظت کرتے ہیں۔"

ممکن ہے کہ اس دل آویز تصویر میں تھوڑا بہت مبالغہ کیا گیا ہو۔ بہر حال ہندوستان کے جس حصے سے میگاستھینز بخوبی واقف تھا' اس کے متعلق تو یہ ضرور درست ہو گا کیونکہ یہاں جنگ میں صرف وہ لوگ شریک ہوتے تھے جنھوں نے جنگ کو اپنا پیشہ قرار دے لیا ہو' اور یہ لوگ مرنج و مرنجان کاشت کاروں سے سروکار نہ رکھتے تھے۔ بالعموم قلعہ بند شہر بھی دروازوں اور فصیلوں سے گھرے ہوئے ہوتے تھے' اور شاذ و نادر ہی ایسا واقع ہوتا تھا کہ فاتح ان میں داخل ہو کر ان کو تہ و بالا کر دے۔ متذکرہ بالا امور کی وجہ سے تامل قوم کے لیے یہ ممکن تھا کہ زمانہ وسطیٰ کی فلورنس اور پیسا ریاست کے لوگوں کی طرح جنگ و جدل سے بھی سیر ہو لیں اور ساتھ ہی ساتھ تجارت اور زراعت کے سود مند پیشوں کو بھی جاری رکھیں۔

موتی' مرچیں' پنا

تامل قوم کی سرزمین میں خوش قسمتی سے ایسی تین چیزیں یعنی مرچیں' موتی اور پنا پائی جاتی تھیں جو کسی اور جگہ دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ یورپ کے بازاروں میں مرچیں سونے کے مول بکتی تھیں [illegible] الارک نے

روما پر تاوان جنگ عائد کیا تو اس تاوان میں 3000 پاؤنڈ مرچیں بھی شامل تھیں۔[10] جنوبی سمندر سے موتیوں کے نکالنے کا کام جواب بھی سودمند ثابت ہو رہا ہے مدت سے برابر جاری ہے۔ اس کی وجہ سے بیرونی ممالک کے تاجر جوق در جوق یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ پنا کے متعلق پلائنی نے صحیح کہا تھا کہ وہ زمرد سے ملتا جلتا ایک پتھر ہے۔ یہ ہندیوں اور رومیوں کے ہاں نہایت قابل قدر سمجھا جاتا تھا اور بسا اوقات صناعوں کی صناعی اس پر ختم کردی جاتی تھی۔ کیونکہ ہندوستان کے سوا اور سب جگہ یہ نایاب تھا' اس لیے ہندیوں نے اس کی نقلیں بھی اتار کر فروخت کرنی شروع کردی تھیں۔ پنے کی تین ہندوستانی کانوں کا حال معلوم ہوا ہے۔ ان میں سے ایک تو (1) پنات کے مقام پر تھی جو میسور کے جنوب مغرب میں کتور کے قریب دریائے کاویری کی معاون کبنی ندی پر واقع تھا۔ (2) پدیوریا پٹیالی جو شہر کوئمبٹور کے مشرق جنوب مشرق میں چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور جہاں سے 1820ء تک برابر پنا نکالا گیا۔ اور (3) وانم باڑی جو ضلع سیلم کے شمال مشرق میں کولر کی سونے کی کانوں کے قریب واقع ہے۔ جن علاقوں میں ان کانوں کا نشان پتا ملتا ہے وہاں رومی سکوں کی کثرت اور بہتات سے قدیم زمانے میں جنوبی ہند کے جواہرات کی مانگ اور تجارت کی وسعت کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس واقعے سے کہ اضلاع سیلم اور کوئمبٹور میں جو کرنڈم کا قیمتی پتھر پایا جاتا ہے اور اس کا نام بھی تامل زبان ہی میں ہے' یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم یورپ ہندوستان کی جواہرات کی کانوں کی پیداوار سے بخوبی واقف تھا۔[11]

بحری تجارت اور بیرونی نو آبادیاں

تامل سلطنتوں کے پاس جہازوں کے زبردست بیڑے تھے اور ان کے ساحلوں پر مشرق اور مغرب سے برابر بلا روک ٹوک جہاز آتے جاتے رہتے تھے۔ ان جہازوں میں بیرونی تاجر مرچیں' موتی' پنے اور ہندوستان کی دوسری اشیاء کی خرید کے لیے آتے اور ان کی قیمت یورپی سکوں یا دوسری اشیاء کی صورت میں ادا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں رومتہ الکبریٰ کا سکہ "اوری" جنوبی ہند میں اسی طرح ہر جگہ چلتا تھا جس طرح کہ آج کل انگریزی ساورن تمام براعظم یورپ میں رائج ہے۔ اس کے علاوہ رومتہ الکبریٰ کا کانسی کا چھوٹا سکہ (جو کچھ تو یورپ سے آتا تھا اور کچھ مدرا کے شہر میں مضروب ہوتا تھا) بازاروں میں خرید و فروخت کیلئے مستعمل تھا۔[12] اس امر کے باور کرنے کی بھی وجوہ موجود ہیں کہ رومی رعایا کی ایک بڑی تعداد جو تجارت پیشہ تھی جنوب ہند میں پہلی دو صدی عیسوی کے دوران مستقل طور پر آباد ہو گئی تھی۔ یورپین سپاہی جن کو "زبردست یون اور گونگے ملیچھ" کہا گیا ہے' تامل بادشاہوں کی محافظ دستہ فوج میں داخل تھے اور "یونوں کے [illegible] زبردست جہاز کرنیگنور کے قریب مرچ [illegible] والا [illegible] کے لیے

پڑے رہتے تھے اور ان کی قیمت رومی سکوں کی صورت میں ادا کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں یہ بھی بیان کیا گیا ہے اور صحیح ہے کہ مزرس (کرنیگنور) کے مقام پر آگسٹس کے نام کا ایک مندر بھی موجود تھا۔ ایک بیرونی (یون) نو آبادی کاوری پدنم یا پُہار کے مقام پر قائم تھی۔ یہ شہر اس زمانے میں ایک بارونق بندرگاہ تھا اور مشرقی ساحل پر دریائے کاویری کی شمالی شاخ کے دہانے پر آباد تھا۔ مگر مدت ہوئی کہ یہ شہر اور بندرگاہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں اور اب ریت کے وسیع تودے کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ [13] نظموں سے یونوں کی شراب' چراغوں اور گلدانوں کی درآمد کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کے اس بیان کی تصدیق نیل گری کے ناتراشیدہ پتھروں کی قبروں کے ان برتنوں سے بھی ہوتی ہے جو کانسی کے بنے ہوئے ہیں اور بعینہٖ اسی نمونے کے ہیں جیسا کہ شروع سنہ عیسوی میں یورپ میں بنتے تھے۔ اس کے علاوہ پری پلس کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ [14]

قدیم علم وادب اور فنون لطیفہ

جہاں تک میں اس معاملے میں رائے دے سکتا ہوں' میرا اندازہ ہے کہ تامل زبان کی نظموں کی قدامت کے متعلق علماء وماہرین فن کا خیال بالکل درست ہے۔ اور بہ ہیئت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ تامل زبان کے علم وادب کا بہترین زمانہ پہلی تین صدی عیسوی میں گذر چکا ہے۔ ایک عالم کی رائے کے مطابق یہ زمانہ پہلی صدی عیسوی ہی کا تھا۔ بہرحال اور ذرا بعد کا زمانہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ [15] نظم کے علاوہ دیگر فنون مثلاً موسیقی' ڈراما' مصوری اور سنگتراشی میں بھی کافی ترقی ہوئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بت اور تصاویر سب کی سب ایسی چیزوں پر بنائی گئی تھیں جو اب فنا ہو چکی ہیں اور ان کا نام ونشان تک مٹ چکا ہے۔ ڈرامے کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ دو قسم کا ہوتا تھا۔ اول تامل یا خاص ملکی رنگ کا جس کی مختلف قسمیں تھیں اور اس میں حسن وعشق کے افسانے جگہ پا سکتے تھے۔ دوسرے آریائی یا شمالی جو اس سے زیادہ محدود ہوتے تھے اور ان میں صرف گیارہ مقررہ مضامین پر طبع آزمائی کی جاسکتی تھی۔

"تین سلطنتیں"

متذکرہ بالا بیان سے جنوبی ہند کی تینوں سلطنتوں کے تمدن وتہذیب کا اندازہ' جیسی کہ وہ شروع سنہ عیسوی میں تھی' بخوبی ہو سکتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جبکہ یہ سلطنتیں پہلی مرتبہ تاریکی سے ذرا نکلنے لگتی ہیں اور ان کا تذکرہ قدیم دیسی علم وادب اور یونانی ورومی مصنفین کی مختصر تحریر دلالت ہے... بھی بعض اوقات تین

دستیاب ہوتی ہیں۔ مگر اشوک کے فرامین' بھٹی پرلو کے صندوقچہ کے کتبے اور ان کے علاوہ چند اور کتبوں کے سوا اس قسم کی شہادت کچھ بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ تامل سرزمین میں صرف تین زبردست سلطنتیں بیان کی جاتی ہیں: یعنی پانڈیا' چول' چیرا کریل۔ ایک شاعر کہتا ہے...

خوشگوار سرزمین تامل کی حدود اربعہ وسیع و فراخ سمندر اور ایسا بلند آسمان ہے جس تک طوفان کا اثر نہیں پہنچتا اور سرزمین پر وہ بطور تاج کے قائم ہے۔ ان کی زمینیں وسیع اور زرخیز ہیں اور اس سرزمین پر تین بادشاہ حکمران ہیں۔ [لہ]

اشوک نے چیر سلطنت کو کریل پتر یعنی "ابن کریل" لکھا ہے۔ اسی نام کی بگڑی ہوئی صورت پلائنی کی کتاب اور "پری پلس" میں بھی موجود ہے۔ موخرالذکر کتاب نے ستیاپتر کا نام بھی لکھا ہے' مگر یہ نام اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ یہ ثابت نہیں ہوا مگر اغلب ہے کہ یہ دوسرا نام دراصل مغربی ساحل پر کریل یا مالابار کے شمال میں تلور سلطنت کا نام ہے۔ تلور سرزمین کا صدر مقام منگلور ہے۔ اس علاقہ میں تلو زبان بولی جاتی ہے جو کنٹری سے بہت زیادہ قریب ہے۔

سلطنت پانڈیا کا محل وقوع

اگر ملکی روایات کو صحیح مان لیا جائے تو سلطنت پانڈیا شمال اور جنوب میں جنوبی دریائے ولارو (پدکوئی) سے لے کر راس کماری تک اور مشرق و مغرب میں ساحل کارومنڈل سے لے کر درہ اچھنکوول تک پھیلی ہوئی تھی جس میں سے ہو کر جنوبی کریل تا ٹراونکور میں داخل ہوتے تھے۔ اس طرح اس میں مدرا اور تناولی کے موجودہ اضلاع شامل تھے۔ بعض اوقات ٹراونکور کے جنوبی حصے بھی اس میں شامل ہو جاتے تھے۔

سلطنت چول کا محل وقوع

سب سے زیادہ معتبر روایات کے مطابق سلطنت چول (چول منڈلم) کے شمال میں دریائے پنار اور جنوب میں جنوبی دریائے ولارو واقع تھا۔ بالفاظ دیگر یہ مشرقی یا ساحل کارومنڈل کے ساتھ تلور سے پدکوتی تک چلی جاتی تھی اور یہاں سلطنت پانڈیا سے اس کا ڈانڈا مل جاتا تھا۔ مغرب میں یہ کرگ کی سرحد تک چلی گئی تھی۔ ان حدود کے اندر مشرق میں مدراس' چند اور برطانوی اضلاع اور ریاست میسور کا ایک بڑا حصہ آ گیا تھا۔ مگر قدیم علم و ادب کی رو سے تامل قوم کی سرزمین کی حدود شمال میں پلیکٹ اور کوہ ترپتی سے جو مدراس کے شمال مغرب میں 100 کے فاصلے پر واقع تھا آگے نہیں بڑھیں۔ اس کے برعکس ساتویں صدی عیسوی میں جس سلطنت چول سے [illegible] واقف تھا وہ قریب قریب ضلع کڈپہ کے برابر تھی اور جنوب کی طرف نہیں

پھیلی ہوئی تھی۔ چول منڈلم یا ساحل کارومنڈل' جس کو چینی درویش نے دراوڑ لکھا ہے' اس زمانے میں شاہان پلو کے ہاتھ میں تھا جن کا دارالسلطنت کانچی یا کانجی ورم مدراس سے 45 میل جنوب مغرب کی سمت واقع تھا۔

کریل سلطنت کا محل وقوع

علماء کو اب اس امر میں پورا پورا اتفاق ہے کہ چیرا اور کریل ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں ہیں۔ کریل کا نام اب بھی خاصا زبان زد خلائق ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ سلطنت جنوبی کونکن یا ساحل مالابار میں قائم تھی جس میں موجودہ ضلع مالابار مع ٹراونکور اور کوچین کے شامل تھا۔ ٹراونکور کا جنوبی حصہ جس کا نام اس زمانے میں وین یا ویناد تھا پہلی صدی عیسوی میں پانڈیا سلطنت کا جزو تھا۔ بعد کے زمانے میں چیر سلطنت میں سرزمین کونگو یعنی موجودہ ضلع کومبٹور اور سیلم کا جنوبی حصہ بھی شامل تھا۔ مگر اس میں شک ہے کہ آیا قدیم زمانے میں بھی یہی حال تھا یا نہیں۔ بالعموم کریل کے لفظ کا اطلاق مغربی گھاٹ کی ناہموار سرزمین پر کیا جاتا ہے جو چندر گری دریا کے جنوب میں واقع ہے۔ بہر حال تینوں سلطنتوں کی حدود میں وقتاً فوقتاً اختلاف ہوتا رہتا تھا۔

پلو خاندان

تقریباً چوتھی صدی سے آٹھویں صدی تک خاندان پلو نے جنوبی ہند میں خوب عروج حاصل کیا۔ مگر خاندان پلو کی کوئی خاص سرزمین نہ تھی جس سے وہ وابستہ ہوں۔ جب تک یہ خاندان برسر حکومت رہا اس کی سلطنت بعض دفعہ چند اختلافات کے ساتھ تینوں سلطنتوں پر حاوی تھی۔ مگر اس کی حدود کا انحصار پلو بادشاہ کی قوت اور ہمسایہ سلطنتوں کی کمزوری پر ہوا کرتا تھا۔ اس واقعہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پلو بعد کے زمانے کے مرہٹوں کی طرح ایک لٹیری قوم' قبیلہ یا ذات تھی جس نے بزور شمشیر قوت و سلطنت حاصل کی اور صاحب ملک و مال راجاؤں کی گردنوں پر اپنی فرماں برداری اور اطاعت کا جوا رکھ دیا تھا۔ خاندان پلو کی حکومت کی روایات اس قدر دھندلی ہیں کہ 1840ء سے قبل یورپی علماء کو ان کے وجود کا بھی علم نہ تھا۔ مگر اس سال تانبے کی لوح کے ایک کتبے نے سب سے پہلے ان کو دنیا میں روشناس کرایا۔[18] اس کے بعد اور بھی بہت سی دریافتیں ہو چکی ہیں اور خاندان پلو کی تاریخ کے لیے بہت کچھ مواد بہم پہنچ گیا ہے پھر بھی اس خاندان کی ابتداء اور تعلقات اب تک تاریکی ہی میں ہیں۔

جنوبی ہند کی تاریخ کی عام صورت

اس باب کے آئندہ حصوں میں تینوں تامل سلطنتوں کے سیاسی حالات جہاں تک کہ وہ اب تک معلوم ہو سکے ہیں' بیان کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ پلو خاندان کا بھی تذکرہ ہو گا۔ ان حکومتوں کے موقعے اور صورت احوال پہلے تذکرۃ" بیان کر دی گئی ہے۔ بہرحال ان جنوبی سلطنتوں کے ایسے مختصر حالات بیان کرنے کا زمانہ ابھی تک نہیں آیا جو تسلی کے قابل ہوں۔ اس وقت جو خاکہ پیش کیا جا رہا ہے نامکمل اور عارضی ہے۔ مگر اس کتاب کی طبع اول و دوم کے اس بیان سے اگر اس کا مقابلہ کیا جائے تو یہ کہیں زیادہ مکمل نظر آئے گا۔ لیکن جب تک اس خطہ کی زبانوں اور روایتوں کے عالم ہر ایک خاندان کی الگ الگ تاریخوں کی تفصیل پر بحث نہ کریں گے اس وقت تک جنوبی ہند کی ایسی تاریخ لکھی جانی ناممکن ہے جس کو ہندوستان کی عام تاریخ میں جگہ دی جا سکے۔ خواہ ہماری کوشش کیسی نامکمل کیوں نہ رہ جائے' پھر بھی کوشش کرنا ضروری ہے۔ میرے خیال میں کوئی کتاب دنیا میں اب تک ایسی نہیں لکھی گئی جو مسلمانوں کی فتح سے پہلے کے جنوبی ہند کا حال' جو اب تک جمع ہو چکا ہے' عام ناظرین اور شائقین کے لیے یکجا جمع کر دے۔ [19]
اس لیے مجھ کو اطمینان ہے کہ میری یہ کوشش خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو رائیگاں نہ جائے گی' اور ماہرین فن جو موضوع کی مشکلات سے پوری طرح واقف ہیں میری فروگذاشتوں کی پردہ پوشی کریں گے۔

مشکلات

یہ تاریخ لکھنے والے کو درپیش مشکلات نہایت سخت ہیں۔ نویں صدی عیسوی سے قبل کی جنوبی ہند کی تاریخ کے ماخذ شمالی ہند کے ماخذ سے کہیں کم ہیں۔ اٹھارہ پرانوں میں جنوب کا ذکر خال خال ہی ملتا ہے۔ قدیم کتبات نادر الوجود ہیں۔ سکوں سے بہت کم مدد ملتی ہے۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات کے نتائج مکمل طور پر ابھی شائع نہیں ہوئے اور قدیم علم و ادب کی چھان بین پوری نہیں ہوئی۔ [20] اس کے برعکس نویں صدی کے بعد کتبات کی اس قدر بہتات ہے کہ ان کا سلجھانا ناممکن ہے۔ جنوبی ہند کے بادشاہوں اور رعایا نے آنے والی نسلوں کے لیے ہزارہا کتبے چھوڑے ہیں جن میں سے بعض نہایت طویل ہیں۔ چنانچہ مسٹر رائس کی "اپی گرے فیا کرناٹکا" کی آٹھ جلدوں میں جو دکن اور تامل سلطنتوں کے متعلق ہیں' 5800 کتبے یکجا جمع ہیں۔ مدراس کے محکمہ آثار قدیمہ نے ایک سال کے دوران میں 800 کتبے نقل کیے ہیں اور ان میں سے غالباً ایک بھی ایسا نہیں جو رائس کی کتاب میں شامل ہو۔ اسی طرح ہر سال اس مجموعہ میں بے شمار اضافہ ہوتا

رہتا ہے۔ ان میں سے بعض کتبات کے طول کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک کتبہ تانبے کی اکتیس لوحوں پر کندہ ہے اور اس کو حلقے کی شکل میں مضبوط باندھ دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنوبی ہند کی قدیم تاریخ کے متعلق کتبوں کی تحقیق میں ہی علماء اور ماہرین فن کے سالہا سال خرچ ہو جائیں گے اور روزانہ علم میں ترقی ہوتی رہے گی۔ ان تمام باتوں کو ناظرین کے گوش گذار کرنے کے بعد میں اب تینوں تامل سلطنتوں کے حالات (جیسے کہ اس وقت ممکن ہے) بیان کرنا شروع کرتا ہوں اور ساتھ ہی خاندان پلو کو بھی روشناس کرائے دیتا ہوں جس نے ایک مدت تک ان سلطنتوں کو اپنے زیر اثر رکھا۔

حصہ ب۔ سلطنت ہائے پانڈیا' چیر یا کریل اور ستیا پتر

"پانچ پانڈیا"

بالعموم سلطنت پانڈیا میں تقریباً موجودہ اضلاع مدرا اور تناولی مع ترچناپلی کے کچھ حصے اور بعض اوقات ٹروانکور کے بعض حصص شامل رہتے تھے۔ یہ پانچ ریاستوں میں منقسم تھی اور ان کے سردار "پانچ پانڈیا" کے نام سے مشہور تھے۔ مگر ان مختلف سرداروں کی حکومت کی حدود اربعہ کا حال بالکل معلوم نہیں۔

کورکئی

مشہور مورخ پلائنی کے جیسے قدیم زمانہ یعنی پہلی صدی عیسوی ہی میں سلطنت کا مستقر مدرا یا کودل تھا۔ یہ بات باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ اس سے بھی قدیم زمانے میں حکومت کا صدر مقام کورکئی تھا۔ علاوہ ازیں اس امر کی بھی تھوڑی بہت شہادت ملتی ہے کہ زمانہ ماقبل کی تاریخ میں پانڈیا سرداروں کا دارالسلطنت ضلع مدرا کے مشرقی ساحل پر ایک شہر جنوبی منلور تھا۔[1] تمام ملکی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کورکئی یا کولکئی ہی وہ شہر ہے جہاں جنوبی ہند کا تمدن پھلا پھولا تھا اور یہ ان تین خیالی بھائیوں کا وطن تھا جنھوں نے پانڈیا' چیرا اور چول سلطنتوں کو قائم کیا۔ یہ شہر جس کا نشان اب ضلع تناولی میں دریائے تامراپرنی کے کنارے پر ایک حقیر گاؤں کی صورت میں باقی رہ گیا ہے' اپنی عظمت کے زمانے میں ایک زبردست بندرگاہ اور موتیوں کی تجارت کا مرکز تھا جس کے ذریعے سے خاندان پانڈیا کے خزانے ہمیشہ بھرپور رہتے تھے۔ جب شاہی دربار پرانے شہر سے مدرا کو منتقل ہو گیا تو ولی عہد سلطنت محاصل اور تجارتی اغراض کی نگہداشت کے لیے وہیں

کورکئی کے مقام پر مقیم رہا۔ امتداد زمانہ سے کورکئی میں سمندر اس قابل نہ رہا کہ جہاز وہاں آکر ٹھہر سکیں۔ اسی وجہ سے انگلستان کے سنک بندرگاہوں کی طرح رفتہ رفتہ یہ شہر برباد ہو گیا۔

کایل

اس کا تجارتی کاروبار ایک اور نئے بندرگاہ کی طرف منتقل ہو گیا جو دریا کے کنارے تین میل جنوب میں کایل کے مقام پر قائم کیا گیا تھا۔ یہ بندرگاہ صدیوں تک ایشیاء کی سب سے بڑی منڈی رہا۔ یہیں تیرہویں صدی عیسوی میں مارکوپولو غالباً متعدد مرتبہ اترا اور عوام الناس اور بادشاہ کی شان و شوکت اور دولت و حشمت سے بہت کچھ متاثر ہوا۔[۲۲] مگر جن قدرتی قوانین کے عمل سے کورکئی برباد ہو چکا تھا ان کا اثر یہاں بھی ظاہر ہوا اور کایل کو بے کار سمجھ کر چھوڑنا پڑا۔ پرتگیزوں نے مجبور ہو کر تتی کورن کو اپنی تجارت کا مستقر قرار دیا جہاں ریت کی کمی کی وجہ سے وہ خرابیاں پیدا نہ ہوتی تھیں جو قدیم بندگاہوں میں تھیں۔ کایل کے موقعے پر اب مسلمان اور دیسی عیسائی مچھیروں کی چند ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں باقی رہ گئیں ہیں۔[۲۳]

قدیم بیانات' میگاستھینز

کورکئی کو بطور بندرگاہ کے چھوڑ دینے کی اصل تاریخ کا پتہ لگانا بالکل ناممکن ہے۔ لیکن یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس کی دارالضرب میں مضروب کئے گئے تقریباً 700ء تک کے سکے دستیاب ہوتے ہیں۔ کورکئی کے بادشاہوں کا خاص طغرائے امتیاز ایک گرز تھا جس کے ساتھ بسا اوقات ہاتھی کی بھی شبیہہ ہوتی تھی۔ اس کے برخلاف مدرا کے بادشاہوں کا خاندانی نشان ایک یا دو مچھلیاں ہوا کرتی تھیں۔[۲۴]

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے' پلائنی کے وقت میں سلطنت کا صدر مقام مدرا تھا۔ مگر سلطنت کا قیام اس وقت سے کہیں پہلے ہو چکا تھا۔ پانڈیوں کا نام مشہور سنسکرت نحوی کاتیاین کو معلوم تھا جو غالباً چوتھی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے۔[۲۵] اور اسی صدی میں چندراگپتا موریا کے دربار میں سائلوکس نیکیٹر کے ایلچی مگاستھینز سے اس جنوبی سلطنت کے متعلق بہت عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی تھیں۔ چنانچہ اس کی نسبت مشہور تھا کہ اس پر عورتیں حکمراں ہیں۔ اس سے کہا گیا تھا کہ "ہرقل کے ہندوستان میں ایک لڑکی ہوئی تھی جس کا نام اس نے پانڈیا (Pandaia) رکھا تھا اور اس نے اس کو ہندوستان کا وہ حصہ دے دیا تھا جو جنوب کی طرف واقع ہے اور سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ جن لوگوں پر کہ اس کی حکومت تھی ان کو 365 گاؤں میں تقسیم کر دیا اور حکم دیا کہ ہر روز ایک گاؤں کے باشندے ملکہ کے پاس شاہی خراج لے کر حاضر ہوا کریں تاکہ ملکہ کو ہر وقت

ایسے آدمی میسر آسکیں جن سے کہ وہ ان لوگوں کو خراج ادائی کے لیے مجبور کرے جو اس کے ادا کرنے سے انکار کر چکے ہوں۔" اس ملکہ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے 500 ہاتھی' 4000 سوار اور 130000 پیادے دیے تھے۔ اس کے پاس ایک معمور خزانہ تھا جو موتیوں کی تجارت سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ ایرین کہتا ہے کہ یونانیوں اور اس کے بعد رومیوں نے اس تجارت پر قبضہ کرنے کی بے سود کوشش کی تھی۔[۲۶]

رومتہ الکبریٰ کے ساتھ تعلقات

قدیم تذکروں سے ایک سفارت کا پتہ چلتا ہے جو "شاہ ٹیڈیان نے 20 ق م میں آگسٹس سیزر کے پاس روانہ کی تھی"[۲۷] اور کتاب "پری پلس آف دی اریتھرین سی" (تقریباً 80ء) کا مصنف اور مشہور و معروف جغرافیہ داں ٹولی (تقریباً 140ء) دونوں سلطنت پانڈیا کی منڈیوں اور بندرگاہوں کے موقع اور نام سے پوری طور پر واقف تھے۔ 315ء میں کرکال کے سکندریہ میں قتل عام کرانے سے جنوبی ہند اور مصر[۲۸] کی وساطت سے رومتہ الکبریٰ کے ساتھ تجارت میں یا تو نقص پیدا ہو گیا یا وہ بالکل ہی بند ہو گئی۔ اسی وجہ سے صدیوں تک سلطنت پانڈیا کی تاریخ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

قدیم بادشاہ

زبان تامل کی قدیم ادبیات' میں جس کی تحقیقات جنوبی ہند کے چند محب وطن حضرات نہایت تندہی سے کر رہے ہیں' بے شمار بادشاہوں کے ناموزوں اور بھدے نام یا القاب ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو نہایت ہی قدیم زمانے میں گذرے ہیں۔ لیکن سب سے پہلا پانڈیا بادشاہ جس کے سنین کا تعین کسی قدر صحت کے ساتھ ہو سکتا ہے وہ نیدم چیلین ہے۔ وہ دوسری صدی عیسوی میں گذرا ہے اور کرکال چول کے پوتے نیدمُدی کلی' زبردست چیر بادشاہ چین کتون اور لنکا کے راجا گجباہو اول کا کم و بیش ہمعصر تھا۔ جیسا کہ بالعموم ہندوستان کی قدیم تاریخ میں ہوتا ہے کہ ہندی راجاؤں کے سنین کا تعین یہاں بھی بیرونی راجاؤں کی تاریخ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ لنکا کی تاریخ سنین کا تعین مستقل طور پر ہو چکا ہے۔ لیکن پھر بھی پروفیسر گیگر کا بیان کردہ سنہ تقریباً صحیح سمجھ لینا چاہیے۔ اس کے خیال کے مطابق گجباہو کی حکومت 173ء اور 191ء کے بین بین تھی۔

مدرا کا دار العلوم

اس زمانے میں سلطنت پانڈیا کی ایک نمایاں خصوصیت مدرا میں ایک دار العلوم یا سنگم کا قیام تھا جس کے اراکین نے تامل زبان کا بہترین علم و ادب پیدا کیا۔ تروولوا کی مشہور و معروف کتاب "کرل" جو تامل قوم کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئی ہے غالباً 100ء سے ذرا قبل یا بعد کی لکھی ہوئی ہے۔ "پازیب کی رزمیہ نظم" اور "مرصع کمربند" اس سے ایک صدی بعد کی ہیں۔ موجودہ حالت میں سنہ عیسوی کے شروع صدیوں کی شاہان پانڈیا کی مسلسل تاریخ لکھنا بالکل ناممکن ہے اور بہر حال ناظرین کو ان ہی چند باتوں پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ؎

ہیون سانگ

640ء میں جب ہیون سانگ جنوبی ہند میں آیا تو اس نے غالباً موسم برسات سمیت اپنے وقت کا ایک بہت بڑا حصہ کانچی (کانجی ورم) میں صرف کیا تھا۔ یہی شہر اس زمانے میں خاندان پول کے راجا نرسمہور من کا مستقر سلطنت جو اس وقت جنوب کا سب سے زیادہ زبردست راجا تھا۔ مگر چینی سیاح نے اور زیادہ جنوب میں پانڈیا سلطنت کے علاقے میں سفر نہیں کیا تھا' بلکہ محض اپنے بدھ مذہب کے دوستوں کی کہی سنی روایات کے نقل کرنے ہی پر اکتفا کیا تھا۔ اس نے اس ملک کا نام ملکوت یا ملکت بیان کیا ہے اور دار السلطنت کا نام نہیں لکھا جو اس وقت غالباً مدرا تھا۔ علاوہ بریں وہ نظام حکومت کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ اس وقت راجا پانڈیا کانچی کے زبردست پلو راجا کا باج گذار تھا۔ ملکوت کے علاقے میں بدھ مذہب تقریباً بالکل نیست و نابود ہو چکا تھا اور قدیم خانقاہوں کے محض کھنڈر باقی رہ گئے تھے۔ ہندوؤں کے دیوتاؤں کے نام کے مندر سینکڑوں کی تعداد میں تھے اور ننگے (دگمبر) جین بھی تعداد کثیر میں پائے جاتے تھے۔ باشندوں کے متعلق مشہور تھا کہ ان کو علم و فضل کی تحصیل سے کچھ ذوق نہیں' بلکہ وہ اپنا سارا وقت تجارتی اور خاص کر موتیوں کی تجارت اور بیوپار میں خرچ کرتے ہیں۔ ؎

آٹھویں سے دسویں صدی تک

ایک کتبے سے ان شاہان پانڈیا کے ناموں کی ایک فہرست دستیاب ہوئی ہے جو آٹھویں صدی کے درمیان سے دسویں صدی کے شروع تک حکمران تھے۔ مگر ناموں کے سوا ان کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں۔ آرکیسرن کی بابت جو آٹھویں صدی میں گذرا بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے پلو راجا کو شکست دی تھی۔ اس امر کے باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ ورگنور من جس کو

خاندان گنگ پلو کے راجا اپراجت نے سری پر بیا کے میدان میں شکست دی تھی' یقیناً 3-862ء میں تخت پر بیٹھا تھا۔ [۳۱] اس زمانے میں سلطنت چول جو پلو اور پانڈیا کی دو زبردست سلطنتوں میں پسی جا رہی تھی' کمزور اور بے کار محض تھی۔ چنانچہ پلو خاندان کی دست درازیوں کی روک تھام کا کام تمام تر شاہان پانڈیا ہی پر جا پڑا تھا۔ 740ء میں جب بکرماجیت چلکیا نے نندی ورمن کو شکست دی تو اس کی وجہ سے پلو خاندان کی طاقت میں بہت کچھ ضعف آ گیا تھا۔ نویں صدی کے آخری حصے میں آدتیا چول سے شکست کھانے کی وجہ سے یہ خاندان اور زیادہ کمزور ہو گیا تھا۔ [۳۲] دسویں صدی کے شروع سے شاہان پانڈیا نے مجبوراً چول سلطنت کے زور اور عروج کو تسلیم کیا۔ (خود مختار یا باج گذار خواہ کسی حالت میں ہو) خاندان پانڈیا مدتوں تک برابر قائم رہا اور کتبوں میں ہمسایہ سلطنتوں سے اس کی جنگوں کا حال برابر ملتا ہے۔ مگر ان واقعات میں کوئی ایسا واقعہ نہیں جو یادگار ہو۔

سلطنت چول کا عروج

سلطنت پانڈیا کو جنوب کی دوسری سلطنتوں کے ساتھ غالباً 994ء میں چول بادشاہ راج راجا اعظم نے اپنا باج گذار بنا لیا اور وہ تقریباً دو صدی تک چول سلطنت کے زیر سیادت ہی رہی۔ مگر اندرونی معاملات و نظم و نسق دیسی راجاؤں ہی کے ہاتھ میں تھے۔ اور دونوں سلطنتوں کے تعلقات میں وقتاً فوقتاً تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ تیرہویں صدی کے نصف اول میں سلطنت پانڈیا نے پھر ایک دفعہ کروٹ لی اور اپنی کھوئی ہوئی طاقت تھوڑی بہت حاصل کر لی۔

جینوں کی ایذا دہی

640ء میں جب چینی سیاح ہیون سانگ نے جنوبی ہند کا سفر کیا تو دگمبر فرقے کے جین اور اس مذہب کے مندر سلطنت پلو (دراوڑ) اور سرزمین پانڈیا (ملکوت) میں بکثرت موجود تھے۔ اس کے تمام بیان سے کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانے میں مذہبی تعصب اور ایذا دہی (جو تقریباً اسی زمانے میں ہو رہی تھی) سیاح کے وہاں آنے کے بعد شروع ہوئی ہو گی۔ یہ امر ثابت اور مسلم ہے کہ راجا کون سندر یا نیدمارن پانڈیا شروع میں جین تھا اور اس کی تربیت اسی مذہب کے مطابق ہوئی تھی۔ اس کی شادی ایک چول شہزادی سے ہوئی اور اس کی بیوی نے مشہور سنیاسی ترجنا نسمبندر کی مدد سے اس کا مذہب شیو فرقے میں تبدیل کرایا' جس کے خاندان چول کے راجا سرگرم حامی تھے۔ راجا سندر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک نو مذہب کے معمولی جوش سے کہیں زیادہ جوش کا اظہار کیا اور اپنے پرانے ہم مذہبوں کو جنہوں نے تبدیل مذہب سے انکار کیا' سخت

وحشیانہ سزائیں دیں۔ چنانچہ کم وبیش آٹھ ہزار بے گناہوں کو زندہ کھال کھنچوا کر قتل کرا دیا۔ ارکاٹ کے علاقہ میں تروتور کے مقام پر ایک مندر کی دیواروں پر سنگتراشی کے چند ایسے نمونے موجود ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس ایذاء دہی کے دکھلانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ ان نمونوں پر اس روایت کی صحت کا دارومدار سمجھا جاتا ہے۔ [۴۳] اس ایذاء دہی کی اصلیت سے انکار کیا جا سکتا۔ مگر یہ ممکن ہے کہ اس کے بیان و اظہر میں مبالغے سے کام لیا گیا ہو۔ اس کی وجہ سے جنوبی ہند میں جین مت کی حالت نہایت ہی ضعیف اور کمزور ہو گئی۔

لنکا کے ساتھ جنگیں

شاہان پانڈیا اور لنکا کے راجاؤں کے درمیان اکثر جنگ میں سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ تقریباً 1166ء میں سلطنت پانڈیا پر فوج کشی کا ہے۔ یہ حملہ لنکا کے اولوالعزم راجا پراکرم باہو کی فوج نے اس کے دو سپہ سالاروں کی سرکردگی میں کیا تھا۔ اس واقعے کے دو مفصل بیان جو مختلف نقطہ نظر سے لکھے گئے ہیں دنیا میں موجود ہیں۔ لنکا کی تاریخ مہاومس میں قدرتی طور پر حملہ آوروں کی فوج کشی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ان کو کہیں شکست سے سابقہ نہیں پڑا۔ مگر اس کے برخلاف مخالف بیان سے 'جو کانچی کے قریب ارپکم کے مقام پر ایک طولانی کتبے کی صورت میں محفوظ رہ گیا ہے اور جو زیادہ قابل اعتبار ہے' پتہ چلتا ہے کہ حملہ آوروں نے شروع شروع میں معتدبہ کامیابی حاصل کی۔ مگر انجام کار ان کو جنوبی راجاؤں کے متحدہ حملے کے سامنے پسپا ہونا پڑا۔ لنکا کی فوج کشی کی وجہ سے مدرا کے شاہان پانڈیا کی وراثت تخت و تاج کے متعلق ایک تنازع تھا اور اس کے دعویدار دو شخص ویرا اور سندر [۴۴] تھے۔ یہی دو نام ہیں جو اس خاندان میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک نام کے بار بار اعادے سے خاندان پانڈیا کی تاریخ کا خاکہ کھینچنا اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔

بعد کے زمانے کے شاہان پانڈیا

پروفیسر کیلہارن نے بہت محنت و مشقت کے بعد سترہ شاہان پانڈیا کے سنین کا پتہ لگایا ہے جو کم وبیش وسیع علاقے پر ایک طویل عرصہ یعنی 1567ء – 1100ء تک حکمراں تھے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ ناموں کی یہ فہرست اب بھی نامکمل ہے اور ان میں سے اکثر راجا محض مقامی سرداروں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ [۴۵] زمانہ وسطی کا سب سے زبردست پانڈیا راجا جتاورمن سندر اول تھا جس نے 1251ء سے کم از کم 1271ء تک حکومت کی اور مشرقی ساحل کے تمام حصے پر نلور سے راس کماری تک قبضہ کر لیا۔ اس کے بعض سکے اب بھی دریافت ہوئے ہیں [۴۶] 1310ء اور

اس کے بعد کے سنین میں ملک کافور اور دوسرے سرداروں کی کارکردگی میں اسلامی فتوحات عمل میں آئیں ان کی وجہ سے یہاں کی مقامی ریاستیں بالکل برباد نہیں ہوئیں۔ اگرچہ سیاسیات میں اس قدر تغیر و تبدل ضرور ہو گیا کہ اس سے تاریخی حدود قائم کرلی جائیں۔

سلطنت چیریا کریل کا قدیم ترین ذکر

سلطنت کریل یا چیر کا سب سے قدیم ذکر اشوک کے فرامین میں کریل پتر کے نام سے آیا ہے اور یہی نام کچھ بگڑی ہوئی صورت میں پلائنی اور "پری پلس" کے مصنف کی جوانی کے زمانے یعنی پہلی صدی عیسوی میں مستعمل تھا۔ قدیم تامل ادبیات سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطنت چیر میں پانچ اضلاع یا نادو شامل تھے۔ یعنی (1) پولی "رتیلا" جو اکلپلا سے دریائے پونانی تک پھیلا ہوا تھا' (2) کدم (مغربی) جو دریائے پونانی سے ارنا کلم تک محیط تھا جو دریائے پریار کے انتہائے جنوب کے قریب واقع ہے' (3) "جھیلوں کی سرزمین" جو کوتیم اور کیولن کے گردونواح میں واقع تھی' (4) وین ے جو کیولن کے جنوب سے راس کماری تک چلا جاتا تھا اور (5) کرکا" کوہستانی۔ "یہ نمبر 2 کے مشرق میں واقع تھا پلائنی نے جس کوتنر کا ذکر کیا ہے اس سے مراد نمبر 3 ہے۔

بندرگاہیں

سنہ عیسوی کے شروع میں سب سے بڑے بندرگاہ جہاں سے مرچوں اور دوسری نادر اشیاء کی تجارت ہوا کرتی تھی مزرس یعنی دریائے پریار کے دہانے پر موجودہ کرنیگنور تھا' اور دوسرا بکرئی یا ویکرئی کوتیم کا بندرگاہ تھا۔ جنوب مشرق کی طرف اگر ہوا موافق ہو تو جولائی اور اگست میں عرب سے مزرس کا راستہ چالیس دن کا تھا اور تاجر دسمبر یا جنوری میں اپنے کاروبار کے بعد وطن واپس جاسکتے تھے۔

یہ تمام بیانات جو یونانی اور رومی مصنفین نے وسعت اور طریقہ تجارت کے متعلق محفوظ کرلیے ہیں بہت دلچسپ ہیں۔ مگر ان سے سلطنت کریل کی سیاسی تاریخ لکھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خاص موضوع پر اس وقت تک کسی قسم کا مواد دستیاب نہیں ہوتا' جب تک کہ سلطنت کا تعلق دسویں صدی میں ریاست چول سے قائم نہیں ہو جاتا۔ اس وقت کے بعد سلطنت چول کے کتبوں سے مغربی یعنی کریل کی حکومت پر بھی کچھ کچھ روشنی پڑتی ہے۔

دارالسلطنت

کہا جاتا ہے کہ سلطنت چیر کا سب سے قدیم دارالسلطنت ونجی' ونجی یا کرور تھا۔ ایک جگہ آج

کل ایک گاؤں ترکرور واقع ہے جو دریائے پریار پر کوچین سے تقریباً 28 میل شمال مشرق کی سمت میں ہے۔ اس کے بعد دریائے پریار کے دہانے پر ترونجی کلم دارالسلطنت مقرر ہوا۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ ضلع کوئمبٹور میں کرور کا مقام سلطنت چیر کا دارالسلطنت تھا۔ مگر اس میں کسی قسم کا شک نہیں کہ یہ خیال غلط ہے۔[۳۸]

سرزمین کونگو

قدیم ترین زمانے میں جس کا کہ ہم کو علم ہے سرزمین کونگو (جس میں ضلع کوئمبٹور اور سیلم کا جنوبی حصہ شامل تھا) سلطنت کریل سے بالکل جدا تھی۔ مگر بعد کے زمانے میں معلوم ہوتا ہے کریل اور سرزمین کونگو دونوں مل کر ایک ہی سلطنت بن گئی تھیں اور اس کے بعد صرف سرزمین کونگو ہی کو سلطنت چیر کہا جاتا تھا جبکہ کریل کا علاقہ اس سے جدا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ صورت حالات میں ان تغیرات کے سنین معین نہیں کیے جاسکتے۔ خود کریل بھی ہمیشہ ایک ہی سلطنت نہیں رہا اور آج کل بھی اس کا برطانوی علاقہ ضلع مالابار اور ٹراونکور اور کوچین کی دیسی ریاستوں میں منقسم ہے۔

ایک قدیم بادشاہ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے' زبان تامل کی ادبیات کے بیان کے مطابق چین کتون جو سلطنت چیر کا ایک زبردست راجا تھا' پانڈیا راجا نیدم چلین کرکال کے پوتے نیدمدی کلی چول اور لنکا کے گجباہو اول کا ہمعصر تھا۔ اس لیے دوسری تامل سلطنتوں کی تاریخ کی طرح سلطنت چیر یا کریل کی بھی صحیح سیاسی تاریخ دوصدی عیسوی سے آگے کی نہیں لکھی جاسکتی۔ اصل تو یہ ہے کہ اس زمانے کے واقعات بھی بہت کم مذکور ہیں۔

ٹراونکور یا جنوبی کریل

ایک عالم وفاضل مصنف مسٹر پی۔ سندرام پلے کا' جو ٹراونکور کے باشندے تھے' بجا طور پر یہ دعویٰ تھا کہ ان کا ملک ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے' کیونکہ یہاں اسلامی فتوحات کے سیلاب کا بہت ہی کم اثر پڑا ہے۔ اس لیے یہ رقبہ ایسا ہے کہ ہندوستان بھر میں یہاں کسی بیرونی اثر نے کام نہیں کیا اور یہیں ہندوستان کو خالص دیسی حیثیت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یہ ریاست ایک قسم کا عجائب خانہ ہے جہاں ہندوستان کی قدیم ترین اقوام کے مذاہب' قوانین' رسوم اور اوضاع واطوار کے زندہ جاوید نمونے موجود ہیں اور اس محدود رقبے میں قدیم اور جدید کا مطالعہ

اس خوبی سے ہو سکتا ہے کہ جس کا کسی اور جگہ میسر آنا ناممکن ہے۔ میں نے اس سے قبل بھی ایک جگہ اس خیال کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرائی تھی کہ ہندی آئین و قوانین کے صحیح مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ اس کا آغاز بجائے شمال کے جنوب سے کیا جائے۔

ٹراونکور کے راجہ

ٹراونکور کی سیاسی تاریخ پر سب سے پہلے صحیح معنوں میں مذکورہ بالا عالم نے ہی غور و فکر شروع کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے 100 سے زیادہ کتبے جو قدیم ویٹلو تو حروف میں لکھے ہوئے تھے جمع کیے اور ان کی مدد سے وہاں شاہی خاندان کا سراغ 1125ء تک نکالا۔ اس سنہ کے بعد دو صدیوں تک کے راجاؤں کی تقریباً مکمل فہرست بھی تیار کر لی۔[۹] ان بیانات سے جو شائع ہو چکے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی کے شروع میں ٹراونکور یا جنوبی کریل راجا راجندر چول کلنگ کی سلطنت چول کا ایک حصہ تھا اور بظاہر اس پر نہایت خوبی سے حکومت ہوتی تھی۔ بالخصوص وہاں کے گاؤں کی قدیم پنچایتوں کے طریق عمل کی تفاصیل نہایت دلچسپ ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کسی صورت میں مرکزی نہ تھی۔ گاؤں کی پنچایتوں کو بہت کچھ انتظامی اور عدالتی اختیارات حاصل تھے جن کو وہ شاہی عمال کی زیر نگرانی عمل میں لایا کرتے تھے۔

سلطنت چیر کے سکے

شاہان چیر کا طغرائے امتیاز کمان تھی۔ انکے سکے بہت نادر الوجود ہیں اور صرف بعد کے زمانے کے دو نمونوں کے سکے جن پر کمان کا طغرا ہے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ سیلم اور کوئمبٹور کی سرزمین کونگو میں پائے گئے ہیں۔ مجھے کریل یا ساحل مالابار کے سکوں کا کوئی حال معلوم نہیں۔[۱۰]

مواد کی کمیابی

موجودہ صورت احوال میں میں سلطنت چیر یا کریل کی قدیم تاریخ کے متعلق صرف متذکرہ بالا سطور ہی پر اکتفا کر سکتا ہوں۔ کالی کٹ کے زمورنوں کی تاریخ اس کتاب کی حدود سے باہر ہے۔ پروفیسر کیلہارن نے سلطنت کریل کے آخری زمانے کے راجاؤں اور سرداروں کے کتبوں کی ایک فہرست مرتب کر دی ہے اور اس میں اکثر وہی کتبے شامل ہیں جو مسٹر سندر رام پلے نے جمع کیے تھے۔[۱۱] مگر فاضل پروفیسر نے خاندان کی فہرست مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

سلطنت ستیاپتر

سلطنت ستیاپتر کے متعلق (جس کا ذکر راجا اشوک نے بھی کیا ہے) اپنے قیاس اغلب کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اور اس موضوع پر کچھ زیادہ بحث نہیں۔ یہ نام صرف اشوک کے فرامین میں ہی آتا ہے۔

حصہ ج۔ سلطنت چول

سرزمین چول کی روایتی حدود

ملکی روایات کے مطابق سرزمین چول (چول منڈلم) کے شمال میں دریائے پنار اور جنوب میں جنوبی دریائے ولارو واقع تھا۔ بالفاظ دیگر وہ مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ نلور سے پدکوٹی تک پھیلی ہوئی تھی جہاں اس کا ڈانڈا پانڈیا کی قلمرو سے مل جاتا تھا۔ مغرب میں یہ کرگ کے علاقے تک جاتی تھی۔ ان متذکرہ بالا حدود میں مشرق کے چند برطانوی اضلاع کے علاوہ مدراس کا ضلع اور ریاست میسور کا ایک بڑا حصہ شامل تھا۔[۲] جہاں تک کہ یقینی طور پر معلوم ہے سلطنت کا سب سے قدیم دارالسلطنت اریور "یا قدیم ترچناپلی" تھا۔ ایک شہر شمالی "منلور" جس کا موقع و محل اب معلوم نہیں، زمانہ قبل تاریخ میں چول سلطنت کا مستقر تھا۔[۳]

سیاسی حدود کا تغیر و تبدل

متذکرہ بالا حدود کے تعین سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ سلطنت چول کی سرحد ہمیشہ متعین رہی ہے۔ اس کے برعکس ان میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے۔ سلطنت چول کی روایتی حدود دراصل نسلی حدود ہیں نہ کہ سیاسی۔ شمال اور مغرب میں تو یہ سرحد کم از تامل اور دیگر دراوڑ اقوام کی زبانوں میں حد فاصل ہے۔ مگر پھر بھی تامل زبان سلطنت پانڈیا اور قلمرو کی دیسی زبان ہے اور دریائے ولارو کے شمال و جنوب کے رہنے والوں کی نسلوں میں کسی قسم کا امتیاز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سلطنت چول کا قدیم ترین ذکر

سلطنت چول نے حکومت پانڈیا کی طرح پانتی بالکل ناواقف تھا۔ مگر کاتیاین کو کم از کم اس کا نام معلوم تھا ~~اور~~ اشوک نے اس کی خود مختارانہ حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور چونکہ اس کا

ثبوت مسلم ہے کہ اس عظیم الشان راجا کی سلطنت کی حدود جنوب میں میسور کے شہر چتل درگ میں کم از کم چودہ شمالی عرض بلد تک پھیلی ہوئی تھی‘ اس لیے قیاس اغلب یہ ہے کہ راجگان موریا کے زمانے میں دریائے پنار سلطنت چول کی شمالی حد فاصل تھا۔ اس کے بعد کے زمانے میں یہ حدود شمال اور جنوب دونوں سمتوں میں زیادہ وسیع ہوگئیں اور ان دونوں زمانوں کے درمیان میں خاندان پلو کی عظمت و شوکت کی وجہ سے اس کی حدود بہت مختصر رہ گئی تھیں۔

قدیم زمانے کی تجارت

قدیم ادبیات اور یونانیوں و رومی مصنفوں کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ سنہ عیسوی کی پہلی دو صدیوں کے دوران ساحل کارومنڈل یا چول کے بندرگاہ مشرق و مغرب کی تجارت کی منڈی بنے ہوئے تھے۔ سلطنت چول کے جہازوں کے بیڑے بجائے ساحل کے متوازی سفر کرنے کی دلیری سے خلیج بنگالہ کو عبور کرنے‘ دریائے گنگا اور ایراودی کے دہانوں اور بحر ہند کو طے کرکے ملایا کے مجمع الجزائر میں پہنچتے تھے۔ ہر قسم کا مال و اسباب جو مصر سے کریل یا ساحل مالابار پر آتا تھا‘ سرزمین چول میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتا تھا۔ اس کے برخلاف مغربی ساحل کے بندرگاہ اپنی تجارت کا تمام سامان ساحل کے بازاروں سے‘ جہاں سوتی کپڑا بکثرت تیار ہوتا تھا‘ حاصل کیا کرتے تھے۔ چول کا سب سے بڑا بندرگاہ کاوریپدنم دریائے کاویری کے دہانے پر واقع تھا۔ یہ شہر کسی زمانے میں عالیشان اور متمول تھا۔ یہاں بادشاہ کا ایک عالیشان محل واقع تھا اور بیرونی تاجر آکر اترتے اور آسائش و آرام کے علاوہ ہر قسم کا منافع حاصل کرتے تھے۔ یہ اب بالکل نیست و نابود ہوگیا ہے اور آج کل اس کے بقایا آثار ریت اور مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں۔[۴۴]

کرکال

سلطنت چول کا پہلا تاریخی یا نیم تاریخی راجا کرکل ہے۔ اس کے متعلق قدیم شاعروں نے لکھا ہے کہ اس نے لنکا پر حملہ کیا تھا اور وہاں سے ہزارہا قلی قید کرکے دریائے کاویری کا بند باندھنے کے لیے لایا تھا جس کا طول سو میل تھا۔ اس کا عہد حکومت طولانی تھا‘ مگر اس کا بڑا حصہ اس نے اپنے ہمسایوں پانڈیا اور چیر سے لڑنے بھڑنے میں صرف کیا۔ وہ غالباً پہلی صدی عیسوی کے نصف آخر یا شاید دوسری صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ کرکال کے بعد اس کا پوتا نیدمدی کلی اس کا جانشین ہوا اور اس کے عہد حکومت میں کاوریپدنم کو سمندر نے تباہ کردیا۔ یہ راجا چین کتون چیر

مدت کے لیے چیر راجا تمام جنوبی ہند میں سب راجاؤں سے زبردست ہو گیا تھا اور سلطنت چول کی عظمت ایسی رخصت ہوئی تھی کہ صدیوں بعد تک اس کی قسمت نے پلٹا نہ کھایا۔

خاندان پلو کا عروج

مختلف ادبی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ عیسوی کی دوسری یا تیسری صدی میں سلطنت چول اور دوسرے تامل راجاؤں کی قوت وصولت میں ضعف آنا شروع ہوا اور اروکریا اسی قسم کے دوسرے قبیلوں نے (جو بظاہر تامل قوم سے بالکل ممیز تھے) ان کی جگہ لینی شروع کی۔[45] خاندان پلو کے قدیم ترین کتبات سے جو چوتھی صدی عیسوی کے شروع کے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہی پلو خاندان کا ایک راجا سرزمین چول کے عین درمیان میں کانچی کے مقام پر حکمراں تھا۔ یہ تقریباً بالکل ممکن ہے کہ یہ پلو خاندان بھی متذکرہ بلا قبائل ہی میں سے ہو۔ اصلیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ یقینی ہے کہ جب تقریباً 350ء میں سمدرگپت نے جنوب پر یورش کی تو کانچی میں ایک پلو راجا برسر حکومت تھا اور اسی وجہ سے خاندان چول کی سلطنت اس زمانے میں بہت مختصر رہ گئی ہو گی۔ اس کے بعد ساتویں صدی عیسوی تک سلطنت چول کی تاریخ کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔

ہیون سانگ

اسی صدی کے نصف اول میں ہیون سانگ کے چول سلطنت کے متعلق بیانات بہت دلچسپ ہیں۔ مگر اس کے سفرنامے کے شارحوں کو ان کی اہمیت کا پورا اندازہ اور احساس نہیں ہوا۔ جنوبی ہند کی طرف اس کا سفر جس میں کہ وہ خاندان پلو کے صدر مقام کانچی تک چلا گیا تھا، یقیناً 640ء میں ہوا تھا۔ اس وقت سلطنت چول (چو-لی-یا) ایک مختصری ریاست تھی اور رقبہ میں 400 یا 500 میل سے زیادہ نہ تھی۔ اس زمانے میں اس کا مستقر ایک ایسا چھوٹا سا شہر تھا جس کا قطر صرف دو میل تھا۔ ملک بہت کچھ ویران اور برباد پڑا ہوا تھا۔ اس میں جگہ جگہ گرم دلدلیں اور جنگل تھے جن میں معدودے چند وحشی لوگ رہتے اور دن دہاڑے لوٹ مار کرتے تھے۔ بدھ مذہب کی چند خانقاہیں تھیں مگر سب ویران اور برباد حالت میں، اور جو بھکشو ان میں مقیم تھے وہ بھی ان خانقاہوں کی طرح تباہ و خستہ حال تھے۔ جین مت بالعموم مقبول تھا مگر خال خال برہمنی مذہب کے مندر بھی پائے جاتے تھے۔ ملک کا موقع اس طرح بتلایا گیا ہے کہ وہ امراوتی سے کم وبیش دو سو میل جنوب مشرق میں تھا اور اسی وجہ سے اس میں اضلاع مفوضہ کا ایک حصہ اور بالخصوص ضلع کڑپہ شامل ہو گا۔ چونکہ اسی علاقہ میں سخت گرمی اور وہ تمام خصوصیات پائی جاتی

ہیں جن کا ذکر چینی درویش نے کیا ہے اور اس کے علاوہ 1800ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آنے تک وہ برابر لوٹ مار کے لیے بدنام تھا۔ سیاح نے محض چول "سرزمین" کا ذکر کیا ہے مگر بادشاہ کا نام نہیں لکھا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ مقامی راجا بالکل عضو معطل اور کانچی کے زبردست پلو راجا نرسمہورمن کا (جس نے دو سال بعد ہی چلکیا کی قوت کو توڑا تھا) باج گزار ہو۔ [6] سرزمین چول کے متعلق چینی سیاح کے بیان کے مطلب کی صحت کی تصدیق ضلع کڈپہ میں مقامی راجاؤں کے سنگی کتبوں کی دریافت سے ہوتی ہے جو آٹھویں صدی سے پہلے کے حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔ [7]

خاندان پلو کا زوال

آٹھویں صدی کے شروع میں جنوب کی سلطنت اعلیٰ کی حکومت کے لیے دکن کے خاندان چلکیا اور کانچی کے خاندان پلو میں برابر بازار کارزار گرم رہا اور چول بیکار محض سمجھے گئے۔ مگر 740ء میں جب خاندان چلکیا کے راجا بکرماجیت نے کانچی کے پلو راجا کو شکست دی تو موخر الذکر کی طاقت ٹوٹ گئی۔ اب چول کو، جو اس سے قبل شمال میں پلو اور جنوب میں پانڈیا خاندان کے درمیان پسا جا رہا تھا، اس بات کا موقع ملا کہ پھر اپنی پرانی عظمت کو قائم کر لے۔ اسی زمانے میں ہم کو ایک چول راجا وجیالیا کا حال معلوم ہوتا ہے جو نویں صدی کے درمیان میں تخت پر بیٹھا اور چونتیس برس تک حکمراں رہا۔ اس کے بیٹے آدت نے (تقریباً 907-880ء) اپراجت پلو کو شکست دی اور خاندان پلو کی عظمت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

پرانتک اول

907ء میں آدت کے بیٹے اور جانشین پرانتک کی تخت نشینی سے مورخ کو متین کا پورا پورا مواد حاصل ہو جاتا ہے اور وہ ایک بارگی کتبوں کی کثرت کی وجہ سے ایک جال میں پھنس جاتا ہے۔ صرف ایک سال یعنی 7-906ء میں ہی پرانتک کے چالیس سے زیادہ ایسے کتبے نقل کیے گئے جو اس کے تیسرے سنہ جلوس (10-909ء) سے لے کر اکتالیسویں سال (48-947ء) تک پہنچتے تھے۔ اس اولوالعزم راجا نے صرف خاندان پلو کی طاقت ہی کے توڑنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جنوب کی طرف اپنی فتوحات کو اور زیادہ وسیع کرتے ہوئے سلطنت پانڈیا کے دارالسلطنت مدرا کو فتح کیا، اس کے راجا کو بالکل بے خانماں کر دیا اور پھر لنکا پر فوج کشی کی۔

چول سلطنت کا نظام حکومت

پرانتک اول کے بعض طویل کتبے گاؤں کے آئین و قوانین کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے خصوصاً قابل توجہ ہیں۔ کیونکہ ان میں مقامی معاملات کے تصفیہ اور گاؤں کی پنچایتوں کے تمام حالات تفصیل سے پائے جاتے ہیں۔ یہ پنچائتیں شاہی احکام کے ماتحت عدالتی اور انتظامی کام انجام دیتی تھیں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مقامی حکومت خود اختیاری کی یہ صورت جو اس طرح مقبول خاص و عام تھی' ایک مدت ہوئی کہ بالکل ناپید ہو گئی ہے۔ موجودہ حکومتوں کو بھی اگر ایسی ہی قابل دیہاتی پنچائتیں میسر آجائیں' تو ان کے لیے بہت سہولت اور آرام کا باعث ثابت ہوں۔ اس موضوع پر دو ہندی علماء نے غور کیا ہے اور اس کے متعلق ان کی کتابوں کا مطالعہ سود مند ثابت ہو گا۔ آئندہ زمانے میں جب کبھی جنوبی ہند کی تاریخ تمام و کمال لکھے جانے کے قابل ہو جائے گی تو یقیناً چول کے نظام سلطنت کے بیان کو اس میں نہایت نمایاں جگہ دی جائے گی۔[۸]

پرانتک کے جانشین

پرانتک اول 949ء میں فوت ہوا۔ اس کا بیٹا راجادت راشٹرکوٹ راجا کرشنا راجا سوم کے مقابلہ میں لڑتا ہوا تکلا کے مقام پر مارا گیا۔ اس کے بعد پانچ راجا یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور ان کی حکومتوں کا زمانہ قلیل اور فتنہ و فساد سے پر تھا۔

راج راجا دیو اعظم' سنہ جلوس 985ء

985ء میں راج راجا دیو اعظم کی تخت نشینی سے خاندانی تنازعات اور سازشوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اب سلطنت چول کا مالک ایک ایسا راجا ہوا جس میں اتنی قابلیت تھی کہ اس سلطنت کو جنوب کی سب سے بڑی سلطنت بنا دے۔ تقریباً اٹھائیس برس کے عہد حکومت کے دوران اس نے متواتر فتوحات حاصل کیں اور جب وہ فوت ہوا تو سلطنت چول بلا شرکت غیرے جنوبی ہند کی حکومت اعلیٰ تھی اور اس میں احاطہ مدراس کا تقریباً تمام حصہ اور لنکا اور میسور کا ایک بڑا حصہ شامل تھا۔

لنکا وغیرہ کی فتح

اس نے اپنی فتوحات کا آغاز چیر بیڑے کی بربادی سے کیا۔ چودھویں سنہ جلوس میں اس کی فتوحات میں [illegible] کے مشرقی خاندان چلکیا کی سلطنت کا علاقہ (جس پر اس سے [illegible] پلو قابض تھے)'

کرگ، سرزمین پانڈیا اور دکن کی سطح مرتفع کے وسیع علاقے شامل تھے۔ اس کے بعد تین سال کے عرصہ میں ساحل مالابار پر کیولن (کلم) اور شمال میں ریاست کلنگ بھی اس کی قلمرو سے ملحق کی گئی۔ اس کے بعد راجا نے اپنی توجہ لنکا کی طرف مبذول کی اور مدت کی فوج کشی کے بعد بیسویں سنہ جلوس میں یہ جزیرہ بھی اس کی سلطنت میں مل گیا۔ 1005ء یا اس کے قریب اس نے اپنی تلوار ہاتھ سے رکھی اور باقی ماندہ زندگی امن وامان سے گذار دی۔ 1011ء سے اس کا بیٹا راجندر خاندان چول کے دستور کے مطابق سلطنت میں اس کا شریک قرار پایا۔

خاندان چلکیا کے ساتھ جنگ

چلکیا اور پلو کے خاندانوں میں عہد قدیم ہی سے سلطنت میں دشمنی اور رقابت چلی آتی تھی۔ جب پلو خاندان کی طاقت ٹوٹ گئی اور چول نے حکومت اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے ان کی جگہ لی تو یہ رقابت بھی ان کو ورثہ میں ملی۔ اسی وجہ سے چول اور چلکیا میں چار سال تک میدان کارزار گرم رہا اور انجام کار چلکیا کو شکست ہوئی جنہیں راشٹرکوٹوں کی غلامی سے آزاد ہوئے بہت زمانہ نہ گذرا تھا۔

بحری جنگیں

راجا کے پاس ایک زبردست بیڑا تھا اور وہ اس کو نہایت کامیابی سے استعمال کیا کرتا تھا۔ چنانچہ انتیسویں سنہ جلوس میں اس نے بہت سے گمنام جزیوں پر، جن سے مراد غالباً لکادیو اور مالدیو ہے، قبضہ کرلیا تھا۔ یہ اس کا آخری کارنامہ تھا۔

تنجور کا مندر

اس نے اپنے دارالسلطنت تنجور (تنجوڈور) میں مندر تعمیر کرایا۔ اس کی دیواروں پر اس کے 26ویں سنہ جلوس میں اس کی تمام فتوحات کی تصاویر کندہ کرائی گئیں۔ یہ مندر اب تک راجا کی عظمت وشان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے باقی ہے۔

بدھ مت

اگرچہ وہ بذات خود شیو کا پرستار تھا، مگر اس میں مذہبی رواداری کا اتنا مادہ ضرور تھا کہ اس نے نیگپٹم کے بندرگاہ پر برمیوں کے بدھ مت کا مندر تعمیر کرادیا۔ چنانچہ ایسے دو مندر پندرہویں صدی تک مقدس اور مرجع خاص وعام بنے رہے۔ ان میں ایک جو غالباً راجا کا

بنایا ہوا تھا' 1867ء تک تباہ وخستہ حالت میں باقی رہا۔ مگر اس سال یسوعی فرقے کے پادریوں نے اسے برباد کیا اور اس کے ملبے سے یسوعی عمارتیں تعمیر کرالیں۔ [۴۹]

راجندر اول گنگئی کوند' سنہ جلوس 1018ء

راج راجا کا بیٹا راجندر چولدیو اول ملقب بہ گنگئی کوند اس کا جانشین ہوا اور اس نے اپنے باپ سے بھی زیادہ جوش و خروش اور کامیابی کے ساتھ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسکے بیڑے نے خلیج بنگالہ کو عبور کر کے پردم یا پیگو سے قدیم پایۂ تخت کدارم (کدرام) کو بلہ کر کے فتح کیا اور اس کے علاوہ اسی ساحل پر تکلم اور متم یا مرتبان کے بندرگاہوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان شہروں کی فتح کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی مدت کیلئے تمام سلطنت پیگو چول سلطنت کا ایک حصہ بن گئی۔ [۵۰] پیگو کے شہر میں سنگ سرخ کے جو دو ستون اب بھی موجود ہیں ان کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ راجا چول نے اپنی فتح کی یادگار میں نصب کرائے تھے۔ یہ فتوحات 27-1025ء کے درمیان واقع ہوئی تھیں۔ [۵۱] پیگو کی فتح کے بعد نکوبار (نک وارم) اور انڈیمان کے جزیرے فتح ہوئے۔

اس کی جنگیں اور پایۂ تخت

اپنے عہد حکومت کے شروع سالوں میں راجندر چول دیو نے شمالی دول کے ساتھ متواتر جنگیں کیں۔ یہاں تک کہ اس کا مقابلہ بہار و بنگال کے راجا مہی پال سے ہوا اور اس کی فوجیں دریائے گنگا کے کنارے تک پہنچ گئیں۔ اس کارنامے کی یادگار میں اس نے گنگئی کوند کا لقب اختیار کیا۔ گنگئی کوند نے چول پورم کے نام سے ایک نیا دارالسلطنت بسایا۔ اس نئے شہر کے قرب وجوار میں اس نے ایک مصنوعی جھیل بنائی جس کا بند سولہ میل کا تھا اور اس میں ایک وسیع رقبہ کی آبپاشی کے لیے سب ضروری وسائل موجود تھے۔ اس شہر میں ایک عالیشان محل اور ایک زبردست مندر بھی تھا جس میں ایک بت دس گز اونچا سنگ موسیٰ کے ایک ٹکڑے سے تراشا ہوا موجود تھا۔ ان عمارتوں کے کھنڈر' جن کو موجودہ زمانے کے کفایت شعاروں کے ہاتھ سے بہت گزند پہنچ چکے ہیں' اب بھی ضلع ترچناپلی کے ایک ویران میدان میں اپنی پرانی شان وشوکت کو پہلو میں لیے ہوئے تن تنہا کھڑے ہیں۔ مندروں کی سنگتراشی کے نمونے نہایت قابل تعریف ہیں۔ [۵۲] راجندر گنگئی کوند کی حکومت کے دوران میں قلمرو پانڈیا چول خاندان کے زیر حکومت رہی اور اسی راجا کا بیٹا چول پانڈیا کے لقب سے اس علاقہ پر بطور نائب السلطنت کے حکمراں رہا۔ [۵۳]

راجا ادھیراجہ یُوراج' 1018ء - راجہ' 1035ء

راجندر کا سب سے بڑا بیٹا راجا ادھیراجہ' جو 1018ء سے امور سلطنت میں اپنے باپ کا شریک تھا' 1035ء میں اس کا جانشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے ہمسایوں کے ساتھ جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رکھا۔ ⁵⁴ آخر کار وہ 1052ء یا 1053ء میں جنگ کپم کے موقعہ پر چلکیا فوج کے ساتھ ایک گھمسان کے معرکہ میں مارا گیا۔ اس جنگ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ دریائے تنگبھدرا چول اور چلکیا سلطنتوں کے درمیان حد فاصل رہے۔ مگر باوجود راجا ادھیراجا کی موت کے اس سلطنت کا بدلہ اس کے بھائی راجندر پرکیسری درمن نے لے لیا جو وہیں میدان جنگ میں تخت نشین کر دیا گیا تھا۔ اس راجا اور اس کے تین جانشینوں کے عہد میں معمولی لڑائیاں برابر جاری رہیں۔ مگر ان کی تفاصیل میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل یادداشت ہو۔

جنگِ کودل سنگم

ان میں سب سے زیادہ مشہور واقعہ جنگ کودل سنگم ہے جو دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کے مقام اتصال پر ہوئی تھی۔ اس میں ویر راجندر چول (سنہ جلوس 63-1062ء) کے ہاتھوں چلکیا راجا کو سخت شکست ہوئی۔ جب سلطنت چلکیا میں سلطنت کے دو دعویدار بھائیوں سمشور دوم اور بکرماجیت کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی تو ویر راجندر چول نے موخر الذکر کا ساتھ دیا اور اس سے اپنی بیٹی بیاہ دی۔

سیاسی انقلاب: ادھراجندر

1070ء میں ویر راجندر فوت ہوا۔ اس کے بعد سلطنت کے متعدد دعویدار پیدا ہو گئے اور ان میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ بکرماجیت چلکیا جب اپنے دکن کے تخت و تاج پر پورے طور پر متمکن ہو گیا تو اپنے برادر نسبتی ادھراجندر کی مدد کے لیے آمادہ ہوا اور 1072ء میں اس کو چول سلطنت کا مالک بنا دیا۔ مگر یہ نیا راجا ہر دلعزیز ثابت نہ ہوا اور دو سال کے بعد 1074ء میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ اس کی موت سے زمانہ وسطیٰ کی عظیم الشان خاندان چول کی براہ راست حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

خاندان چلکیا چول کلوتنگ اول 1118ء - 1070ء

معلوم ہوتا ہے کہ ادھراجندر نے کوئی ایسی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی جو اس کے بعد تخت

د تاج کو سنبھالتی۔ چنانچہ اس کا جانشین اس کا ایک عزیز راجندر ہوا جو بعد میں کلوتنگ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ راجندر کی ماں گنگئی کوند چول کی بیٹی تھی اور وہ ونگی کے اس مشرقی خاندان چلکیا کے راجا بیٹا تھا جو 1062ء میں مرا۔ مگر راجندر نے چول دربار میں رہنا پسند کیا اور چند سال تک اپنے چچا کو ونگی پر حکمراں رہنے دیا۔ 1070ء میں وہ ونگی کا راجا ہوا۔ اس کے چار سال بعد جب ادھراجندر کو قتل کیا گیا تو وہ تمام چول سلطنت پر بھی متصرف ہوگیا۔ اس طرح وہ ایک نئے خاندان چلکیا چول کا بانی ہوا اور کلوتنگ چول کا لقب اختیار کیا۔ مگر وہ اس نئے منصب کا پورا اہل ثابت نہ ہوا اور 49 برس تک نہایت کامرانی کے ساتھ اس وسیع سلطنت پر حکومت کی۔ اس نے مشرقی گنگ راجا اننت ورمن کو شکست دے کر کلنگ کو دوبارہ فتح کیا۔ اندرونی انتظامات میں اس کی حکومت کا زمانہ اس وجہ سے خاص کر مشہور ہے کہ 1086ء میں تمام سلطنت کی اراضی کی پیمائش لگان کی تشخیص کے لیے نئے سرے سے کی گئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہی سنہ تھا جس میں انگلستان میں ڈومزڈے بک تیار ہوئی۔

رامانج

مشہور معروف ہندو فلسفی رامانج نے، جو جنوب میں وشنو کے طریق کا سب سے بڑا بزرگ مانا جاتا ہے، کانچی میں تعلیم پائی اور ادھراجندر کے زمانے میں ترچناپلی کے قریب سری رنگم کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ مگر خود راجا شیو طریق کا معتقد تھا اور اس کو رامانج سے دشمنی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ادھراجندر کی موت تک میسور کے علاقے میں رہا۔ اس کے بعد یہ فلسفی سری رنگم میں واپس آگیا اور زندگی بھر وہیں رہا۔[55]

بکرم چول، سنہ جلوس 1118ء

کلوتنگ کا بیٹا اور جانشین بکرم چول اپنے آباؤ اجداد کی روایات کے بموجب اپنے ہمسائیوں سے لڑتا بھڑتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے خاندان کو حکومت اعلیٰ بنا دیا تھا۔[56] اس کے بعد کے تین بادشاہ کسی طرح مشہور نہیں اور ان کا زمانہ بھی کم تھا۔

کلوتنگ سوم، سنہ جلوس 1287ء

خاندان چول کا سب سے آخری بڑا بادشاہ کلوتنگ سوم تھا۔ اس نے 1287ء سے تقریباً چالیس برس حکومت کی۔ اس کے بعد جانشینی کے متعلق خانہ جنگی شروع ہوئی اور چول راجاؤں کی حیثیت بالکل گر گئی۔ 1310ء تک کی قلیل مدت کے لیے پانڈیا خاندان نے جنوب میں پھر اپنی

پرانی حیثیت کو قائم کر لیا۔ مگر اس سال اور اس کے بعد کے زمانے میں ملک کافور کی اسلامی فوج کی فتوحات کے سامنے جنوبی ہند کی تمام ہندو ریاستوں کا زور ٹوٹ گیا۔ چودھویں صدی میں سلطنت وجے نگر کی ترقی سے جزیرہ نمائے ہند میں ہندوؤں کا نئے سرے سے دور دورہ ہو گیا اور تقریباً 1370ء میں انتہائی جنوب کا علاقہ سلطنت وجے نگر کے ہاتھ میں آگیا۔[۵۷]

حصہ د۔ خاندان پلو

خاندان پلو کی ابتداء

پلو کون تھے' کہاں سے آئے اور کس طرح انہوں نے جنوب ہند میں اپنے آپ کو اتنی بڑی طاقت بنا لیا؟ یہ ایسے سوال ہیں۔ جن کا موجودہ حالات میں شافی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

پلو اور پہلو کے دونوں الفاظ میں اس قدر مشابہت ہے کہ بعض مصنفوں نے اس قیاس کو بہت کچھ مان لیا ہے کہ پہلو اور پلو ایک ہیں۔ اس طرح وہ آگے چل کر یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ کانچی کے پلو راجا ایرانی نسل تھے مگر زمانہ حال کی تحقیقات سے اب تک کوئی ایسے تاریخی واقعات معلوم نہیں ہوئے جن سے اس قیاس کی تائید ہو سکے۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ پلو یہیں ہندوستان کی کوئی ذات' قبیلہ یا قوم تھی۔[۵۸] بعض اوقات ان کو "کرمب" سمجھ لیا جاتا ہے جو روایت کے مطابق ایک زمانے میں ایک سمندر سے لے کر دوسرے سمندر تک تمام دراوڑی ملک پر متصرف تھے۔ لیکن مسٹر ونکیا نے بالکل درست کہا ہے کہ "اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا کرمب واقعی پلو تھے یا ان سے بالکل جدا تھے۔" مگر اول تو پلو ہمیشہ تامل سلطنتوں کے جانی دشمن تھے اور دوسرے روایات ان کی سلطنت کی حدود کی تصریح نہیں کرتیں۔ ان دونوں واقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تامل قوم سے بالکل مختلف تھے اور ان کی حکومت پانڈیا' چول اور چیر راجاؤں کے علی الرغم ان تینوں سلطنتوں پر پھیلی تھی' کیونکہ روایات کے مطابق یہی تین حکومتیں تھیں جن میں جنوبی ہند کا تمام علاقہ منقسم تھا۔ لیکن اگر ہم ان تمام قیاسات پر نظر کر کے یہ فرض کر لیں کہ پلو اٹھارویں صدی کے مرہٹوں کی طرح ایک غارتگر اور لٹیری قوم تھی جس نے بزور شمشیر تقریباً چول سلطنت کو ہضم کر لیا اور باقی تامل حکومتوں پر اپنا سکہ جما دیا' تو میرے نزدیک واقعات ایک بڑی حد تک اس قیاس کی تائید میں پائے جائیں گے۔

وہ ذاتیں جن کا تعلق پلو سے تھا

پد کوئی کی باج گزار ریاست کا راجا (جو کلر قبیلہ کا مسلم سردار ہے) اب تک اپنے آپ کو راجا پلو کہتا ہے اور اس قدیم شاہی خاندان کی اولاد میں سے ہونے کا دعویدار ہے۔ بقول سر والٹر ایلیٹ کلر "ان قبائل میں سے ہیں جن کا پیشہ غارت گری اور لوٹ مار ہے۔" اس کے علاوہ ان کی "دلیرانہ، ان تھک اور فوجی عادات و خصائل" ایسے ہیں جو قدیم پلو خاندان کے تاریخی حالات سے بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں۔ زمانہ حال سے ذرا قبل ہی کلر کرناٹک کے ضلع جو باشندوں پر غالب تھے اور مرہٹوں کے چوتھ کی طرح ان سے بھی روپیہ وصول کیا کرتے تھے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ پلو بھی اپنی تمام سیاسی طاقت کو اسی طرح کام میں لاتے تھے اور ان کی وسعت میں تامل سلطنتوں کی کمزوری اور غاصب قبیلہ کی طاقت کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ پلی ذات اور وللال کی زراعت پیشہ ذات کے بعض طبقے بھی، جو کلر اور مرو ذاتوں کے ساتھ تعلق رکھنے میں مشہور ہیں، پلو کی اولاد ہونے کے مدعی ہیں[59] ممکن ہے کہ "جرائم پیشہ" اقوام، جن میں غالباً پلو شامل تھے، عام آبادی کے اس حصہ سے تعلق رکھتی تھیں جو تامل سے مختلف اور غالباً ان سے زیادہ قدیم تھا۔[60]

قدیم ترین پلو راجہ

اس خاندان کے قدیم تذکرے چند تانبے کی لوحوں پر لکھے ہوئے عطیات کے کتبے ہیں جو ضلع گنتور میں پائے گئے ہیں۔ ان سے ایک راجا کا حال معلوم ہوتا ہے جو کانچی میں حکمران تھا اور جس کی سلطنت امراوتی یعنی دریائے کرشنا کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ عطیات تقریباً چوتھی صدی عیسوی کے شروع کے ہیں اور پراکرت زبان میں لکھے ہوئے ہیں۔ مگر ان میں سلطنت کی ابتداء کے متعلق اشارتاً بھی کچھ نہیں ملتا۔ بہرحال یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سلطنت تیسری صدی عیسوی ہی میں قائم ہوئی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کا قیام اندھروں کی سلطنت کے بقایا پر ہوا ہوگا۔ مگر یہ ممکن ہے کہ اس کی ابتداء اس سے ذرا قبل ہوئی ہو۔ تمام مصنف اس امر میں متفق ہیں کہ کانچی کا راجا وشنو گپت، جس کو 350ء میں سمدر گپت نے شکست دی تھی، خاندان پلو ہی کا راجا تھا۔ غالباً ونگی کے راجا کا ہمعصر ہستی ورمن بھی پلو ہی تھا۔ وشنو گپت اور ہستی ورمن دونوں نام خاندان پلو کے شجرہ نسب میں ملتے ہیں۔ کانچی کا راجا نرسمہور من (سنہ جلوس 437ء) بدھ مت کا پیرو تھا۔[61] اسی قسم کے چند پراگندہ واقعات ہی خاندان پلو... قدیم راجاؤں کے متعلق معلوم ہیں۔

نرسمہو وشنو

چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر یعنی چلکیا خاندان کی تاریخ کے آغاز سے '753ء یعنی راشٹرکوٹوں کے ہاتھوں ان کی بربادی تک پلو اور چلکیا خاندانوں کا (جو ایک دوسرے کو "فطرتی دشمن" سمجھتے تھے) ہمیشہ تعلق رہا اور ان میں اکثر جنگ و جدال ہوتی رہی۔ ہر ایک خاندان کا اصلی مقصد یہ تھا کہ کسی طرح جنوبی ہند کی سلطنت کو بالکلیہ حاصل کر لے۔ اس تقریباً دو صدی کے عرصہ میں نو بادشاہوں تک شاہی خاندان کا شجرہ نسب بالکل یقینی ہے۔[۶۲] ان راجاؤں کا آغاز نرسمہو وشنو (سنہ جلوس 575ء) سے ہوتا ہے۔ نرسمہو وشنو کا دعویٰ ہے کہ اس نے لنکا کے راجا اور تینوں تامل سلطنتوں کو شکست دی تھی۔

مہندر ورمن اول' اس کے رفاہ عام کے کام

نرسمہو وشنو کا بیٹا مہندر ورمن اول (تقریباً 625-600ء) اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ترچنا پلی' چنگل پت' شمالی ارکاٹ اور جنوبی ارکاٹ کے اضلاع میں بہت سے سنگی مندروں کو کھدوا کر اپنا نام ہمیشہ کے لیے روشن کر دیا۔ اس کے علاوہ اس کی شہرت ارکاٹ اور آرکونم کے درمیان مہندر وادی کے شہر کے کھنڈروں میں بھی باقی ہے۔ اسی شہر کے قریب اس نے ایک بڑا زبردست تالاب مہندر بھی تعمیر کرایا تھا۔ چنانچہ وشنو کے نام کا ایک سنگی مندر اس تالاب کے کنارے پر اب بھی باقی ہے۔[۶۳]

اس کی جنگیں

جنگ و جدل کے معاملے میں مہندر ورمن کو چلکیا راجا پلکیسن دوم جیسے سخت دشمن سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے 609ء یا 610ء میں پلو راجا کو شکست فاش دی تھی۔ اسی زمانے کے قریب چلکیا راجا نے ونگی کے صوبے کو (جو پلو سلطنت کا شمالی حصہ تھا) اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کر لیا اور اپنے چھوٹے بھائی کو اس کی حکومت سپرد کر دی۔ یہی شخص ہے جس نے مشرقی خاندان چلکیا کی بنیاد ڈالی۔ قیاس غالب یہ ہے کہ ونگی کے ہاتھ سے نکل جانے کے احساس ہی سے پلو خاندان کو جنوب کی طرف اپنی سلطنت کی وسعت کا خیال پیدا ہوا اور یہ یقینی ہے کہ مہندر ورمن ترچنا پلی پر قابض تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع شروع میں جین تھا اور تامل قوم کے مشہور مذہبی پیشوا نے اس کو شیو کا پرستار بنایا تھا۔ تبدیل مذہب کے بعد راجا نے جنوبی ارکاٹ کے مقام پاٹلی پتر کی زبردست جین خانقاہ منہدم کرا دی اور اس کی جگہ شیو کے نام کا ایک مندر تعمیر

کرا دیا۔ غالباً جین فرقے کے لوگ قدیم دارالسلطنت کے نام کو جنوب میں لے آئے تھے اور مدراس کے قریب اس نام کا شہر آباد ہوا تھا۔ بہرحال یہ واقعہ دلچسپ ضرور ہے۔

نرسمہورمن، تقریباً 645ء۔625ء

مہندرورمن کے جانشین نرسمہورمن اول (تقریباً 45۔625ء) کے زمانے میں خاندان پلو کی طاقت انتہائے عروج کو پہنچ گئی۔ 642ء میں اس نے اپنے دشمن پلکیسن دوم کا پایۂ تخت واتاپی فتح کر کے گذشتہ شکستوں کا بدلا لیا اور غالباً اس جنگ میں خود پلکیسن دوم بھی مارا گیا۔ مگر یہ یقینی ہے کہ شکست ایسی سخت تھی کہ تیرہ برس تک خاندان چلکیا اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو پھر حاصل نہ کر سکا۔ اس کے برعکس پلو راجا جنوبی ہند کا سب سے زبردست راجا ہو گیا اور اپنی سلطنت میسور اور دکن کے علاقوں تک وسیع کر لی۔ پلو راجا کو اس مہم میں لنکا کے ایک شہزادے مانوم سے بہت کچھ مدد ملی۔ چنانچہ آخر میں شکر گذار ہندی راجا کی فوج کی مدد سے اس شہزادے نے اپنے ملک کے تخت و تاج کو حاصل کر لیا۔[۶۴]

ہیون سانگ کا کانچی میں قیام

ہیون سانگ 640ء میں نرسمہورمن اول کے زمانے میں کانچی آیا اور ایک مدت تک وہاں قیام کیا۔ اس نے اس ملک کا نام جس کا پایۂ تخت کانچی تھا دراوڑ لکھا ہے اور اس کا محیط ایک ہزار میل بتلایا ہے۔ اس لیے یہ علاقہ بہ ہیئت مجموعی حسب روایت "سرزمین چول" کے برابر تھا اور شمالی پنار اور جنوبی ولارو دریاؤں کے درمیان واقع تھا۔ زمین زرخیز تھی اور اس کی کاشت باقاعدہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس میں ہر قسم کا غلہ اور پھل پھول افراط سے پیدا ہوتے تھے۔ دارالسلطنت پانچ یا چھ میل کے محیط کا زبردست شہر تھا اور تمام سلطنت میں سیاح کو ایک سو سے زائد بدھ مذہب کی خانقاہیں ملیں۔[۶۵] اور ان میں اندازاً دس ہزار سے زیادہ بھکشو مقیم تھے۔ یہ سب کے سب لنکا کے لوگوں کی کثیر تعداد کے ستھوور فرقے کے پیرو تھے۔ ہندو اور جین مذہبوں کے مندر تعداد میں کم و بیش 80 تھے اور جنوبی ہند کے اکثر اقطاع کی طرح یہاں بھی دگمبر یعنی ننگے جینوں کا زور تھا۔ زیادہ جنوب کی طرف سلطنت پانڈیا سے بدھ مذہب تقریباً ناپید ہو چکا تھا۔ کانچی ہندوؤں کے سات سب سے مقدس مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ اسے بدھ مذہب والے اس وجہ سے مقدس مانتے تھے کہ وہاں ان کا ایک مشہور و معروف فلسفی دھرمپال پیدا ہوا تھا۔ یہ شخص نالند کی خانقاہ کے ناظم کی حیثیت سے ہیون سانگ کے استاد شیل بھدر کا پیشرو تھا۔[۶۶]

عمارات

چٹانوں میں کھدے ہوئے قدیم ترین مندر مالک پورم کے مقام پر "سات مندر" (سیون پیگوڈاز) کے نام سے مشہور ہیں۔ یہی جگہ آج کل دھرم راج رتھ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مندر مہندر ورمن کے بنائے ہوئے ہیں کیونکہ اس نے مہامل یعنی "شجاع اعظم" کا خطاب اختیار کیا تھا اور اسی لقب پر شہر کا نام رکھا گیا۔ اسی قسم کے اور مندر بھی اس وقت تک جب کہ پلو کے موروثی دشمنوں نے ان کے دارالسلطنت کانچی پر قبضہ کر لیا تھا' برابر پلو راجا بناتے رہے۔ ۶۷ اور غالباً ان میں سے بعض مندروں کے ناتمام رہ جانے کی وجہ یہی آفت ساوی ہوگی۔

وہ خوبصورت اور عالیشان مندر' جو اب کانچی میں کیلاش ناتھ کے نام سے مشہور ہے' نرسمہور من دوم ملقب بہ راجسمہر نے تعمیر کرایا تھا۔

پرمیشور ورمن

655ء یا اس کے قریب پلکیسن کے بیٹے بکرماجیت اول چلکیا نے اپنے خاندان کی کھوئی ہوئی عظمت کو پھر سے حاصل کر لیا اور نرسمہور من کے جانشین پرمیشور ورمن سے اپنے باپ کی سلطنت پھر فتح کر لی۔ اس جنگ کے دوران میں پلو کے پایۂ تخت کانچی پر چلکیا خاندان والے تھوڑی مدت کے لیے قابض و متصرف ہو گئے۔ دوسری طرف پلو کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے پیرو للور مقام پر اپنے دشمنوں کو شکست دی تھی۔

نندی ورمن

یہ دوامی جنگ بعد کے راجاؤں کے زمانے میں بھی برابر جاری رہی۔ 740ء میں بکرماجیت دوم چلکیا نے ایک مرتبہ پھر کانچی پر قبضہ کیا اور نندی ورمن پلو کو ایسی سخت اور قطعی شکست دی کہ اس واقعہ کو پلو کی حکومت اور عروج کے خاتمہ کا آغاز سمجھنا چاہیے۔ نندی ورمن' جو تقریباً 720ء میں نرسمہور من دوم کا جانشین ہوا' نرسمہو شنو کے ایک بھائی کی اولاد ہونے کی وجہ سے اس راجا کا رشتہ کا بھائی تھا۔ اس طرح جانشینی کے قواعد و ضوابط میں جو ایکبارگی تغیر و تبدل واقع ہوا ہے' اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عام انتخاب پر مبنی تھا اور کانچی ورم (کانچی) کے مقام پر ویکنٹ پیرمال کے مندر میں ایسی سنگتراشی کے نمونے خستہ حالت میں موجود ہیں جن کے ساتھ ان کا موضوع سمجھانے کے لیے عبارتیں بھی موجود ہیں۔ ان نمونوں کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس خاندانی انقلاب کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ۶۸

اَپَراجت

نندی ورمن نے کم و بیش نصف صدی تک حکومت کی اور اپراجت اس کا جانشین ہوا۔ اس نے سری پر میا کی جنگ میں پانڈیا راجا ورگن دوم کی شکست دی مگر نویں صدی کے آخری حصے میں خود آدت چول سے مغلوب ہو گیا۔[69] اس واقعہ کے بعد پلو کی عظمت' جو اس سے قبل (740ء) خاندان چلکیا کی کامرانیوں کی وجہ سے بہت کچھ کمزور اور ضعیف ہو گئی تھی' اب بالکل ٹوٹ گئی اور چول نے ان کی جگہ لی۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے' انہوں نے دسویں اور گیارہویں صدی کے دوران کم و بیش مکمل طور سے جنوب کی تمام سلطنتوں کو اپنے حیطہ اقتدار میں لے لیا۔

راشٹرکوٹوں سے جنگ

اپنے زوال و انحطاط کے زمانے میں بھی پلو سرداروں نے جنگ و جدل کا سلسلہ برابر قائم رکھا۔ آٹھویں صدی کے وسط میں جب خاندان چلکیا کی بربادی پر راشٹرکوٹوں نے ان کی جگہ لی تو دکن کی سلطنت اعلیٰ اور ان کے جنوبی رقیبوں میں عناد اور کشمکش کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ نئے فرمانرواؤں نے خاندان پلو کے ساتھ فوراً اپنے تنازعات کی یاد کو تازہ کیا۔ خاندان چلکیا کے دنتی درگا کے چچازاد بھائی راجا دھرو نے 775ء میں پلو خاندان کو شکست فاش دی اور اس کے بیٹے گوبند سوم نے 803ء میں کانچی کے راجا دنتگ سے خراج وصول کیا۔

شاہان گنگ

دسویں صدی کے دوران ہم کو شاہان پلو اور گنگواڑی یا میسور کے شاہان گنگ کے درمیان جنگوں کا پتہ چلتا ہے۔ مؤخر الذکر خاندان مغربی گنگ کے نام سے مشہور ہے تاکہ ان کو اسی نام کے راجاؤں سے تمیز کیا جا سکے جو مشرق کی جانب کلنگ پر حکمراں تھے۔ کلنگنگرم یعنی ضلع گنجام میں موجودہ مکھلنگم کا مقام ان کا صدر مقام تھا۔ کلنگ کے مشرقی خاندان گنگ کا سب سے زبردست مشہور راجا اننت ورمن چوڈ گنگ تھا۔ اس نے 1076ء–1147ء تک اکہتر برس حکومت کی اور گنگا سے لے کر دریائے گوداوری تک کے خاصے وسیع علاقے پر تسلط جما لیا۔ اسی نے جگناتھ پوری کا مندر تعمیر کرایا تھا۔[70]

آخری پلو راجہ

خاندان پلو کے آخری راجا بڑی بڑی سلطنتوں کے محض باج گذار امراء اور عمال رہ گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ راجا بکرم چول کے باج گذاروں میں بارہویں صدی کے اوائل میں پلو راجا کی حیثیت سب سے زیادہ سمجھی جاتی تھی۔[1] پتہ لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ محدود مقامی راجاؤں کی صورت میں وہ تیرہویں صدی تک باقی رہے۔ پلو امراء کے نام تو سترہویں صدی تک سننے میں آتے ہیں' مگر اس صدی کے بعد پلو کا نام امتیازی نسل یا قوم ہونے کے لحاظ سے بالکل مٹ جاتا ہے اور وہ کلر' پلی اور رولال ذاتوں میں ضم ہو جاتے ہیں۔[2]

مذہب

پانچویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے تاریخی پلو راجا نے امراوتی میں ایک مورت مندر میں بطور نذرانہ پیش کی تھی۔ اس کے متعلق صریحاً یہ بیان موجود ہے کہ وہ بودھ چیلا تھا۔ غالب قیاس یہ ہے کہ اس خاندان کے دوسرے اراکین بھی ضرور بدھ مذہب کے پیرو ہوں گے۔[3] مگر چند شہزادے بالخصوص شیو کے مذہبی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔[4] مہندرورمن شروع زندگی میں جین تھا اور شیو کے فرقے والوں کو اذیتیں پہنچاتا تھا۔ مگر آخر کار اس نے شیو کا مذہب اختیار کرلیا' اپنے پرانے دوستوں کو ستانا شروع کیا اور ان کی سب سے بڑی خانقاہ کو منہدم کرا دیا۔[5]

مگر ان خاص خاص واقعات کو نظرانداز کر دینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بالعموم حریف اور مدمقابل مذاہب کے پیرو پہلو بہ پہلو صلح و آشتی سے رہتے تھے اور حکومت ہر ایک کی پوری پوری حفاظت کرتی تھی۔ کم از کم ہیون سانگ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ 640ء میں یہی حال تھا۔ بعد کے تمام پلو راجا بظاہر شیو کے پرستار تھے اور اس کی علامت یعنی بیل کو انہوں نے اپنے خاندان کا طغرا مقرر کیا تھا۔ ان میں دو بادشاہ مذہب کے معاملے میں ایسے جوشیلے تھے کہ ان کو 63 شیوا کابر مذہب کے زمرہ میں جگہ دی گئی ہے۔[6]

خاتمہ

میں نے جو کام محض شوقیہ اپنے ذمے لے لیا تھا ختم ہوگیا ہے اور یہ کتاب اب اپنی نئی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ جہاں تک مصنف کا تعلق ہے تو یہی شکل اس کی آخری شکل معلوم ہوتی ہے۔ پچیس برس ہوئے کہ اس کا خاکہ تیار ہوا تھا اور اس کے سولہ برس بعد وہ نہایت

ناتمام صورت میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس ناتمام کتاب کو ناظرین نے جس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اس سے امید بندھتی ہے کہ اسے بھی وہی عزت و شرف حاصل ہوگا اور اس سے ہند قدیم کی تاریخ کے مطالعہ میں (جس میں اب ہندوستانی اور بیرونی علماء کثرت سے منہمک ہیں) مدد ملے گی اور اس میں دلچسپی پیدا ہوگی۔ مورخ کے تنگ و تاریک راستے پر روزانہ اس قدر روشنی کی شعاعیں پڑ رہی ہیں کہ مجھے قوی امید ہے کہ میرے بعد کے علماء ان مقامات سے جہاں ہر قدم پر میرا پیر پھسلتا تھا اور لغزش پیدا ہوتی تھی' نہایت اطمینان قلب کے ساتھ گذریں گے۔

اس کتاب میں ہندوؤں کے ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔ یہی ملک واقعی طور پر برہمنوں کا وطن ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور اس میں اس کے عجیب و غریب تمدن و تہذیب کی وجہ سے ایک خاص کشش اور فریفتگی پیدا ہوگئی ہے۔ ہندوؤں کے ہندوستان کی یہی اجنبیت بمقابلہ اسلامی یا برطانوی فتوحات کے اس کی تاریخ کو یورپی اور امریکی تمام ناظرین کے لیے خشک بنا دیتی ہے۔ مگر جو شخص ہندوستان کی موجودہ حالت کو کماحقہ سمجھنا چاہتا ہو اس کو چاہیے کہ اپنا تھوڑا بہت وقت قدیم تاریخ کے مطالعہ میں بھی صرف کرے۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ یونان' روم یا موجودہ یورپ کی تاریخوں سے اس معاملے میں مقابلہ نہیں کر سکتی کہ اس میں شہروں یا سلطنتوں کے آئین و قوانین کا ارتقاء پایا جاتا ہو۔ دوسری ایشیائی اقوام کی طرح ہندوستانی بھی ہمیشہ خود مختار حکومت پر ہی قانع رہے ہیں اور ان دو حکومتوں کے درمیان فرق صرف خود مختار بادشاہوں کے مزاج اور قابلیتوں کا فرق ہی متصور ہو سکتا ہے۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہوتی کہ آئین میں کسی بھی قسم کا ارتقاء پیدا ہوا تھا۔ چندراگپتا موریا' اشوک اور اکبر جیسے لائق و فائق بادشاہوں کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط بالعموم ان کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو جایا کرتے تھے۔ حکومت ہند کا وہ دستور العمل جو اب بتدریج تیار ہو رہا ہے' بیرونی اثرات سے متاثر ہے۔ جن لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے اس کو اختراع کیا جا رہا ہے یہ ان کی سمجھ سے باہر ہے اور ممکن ہی نہیں کہ وہ بالعموم ہردلعزیز ہو جائے۔

تاریخ ہند کی سب سے اہم شاخ اس کی علمی ترقیوں کی تاریخ ہے۔ مگر کسی ملک کے فلسفہ' مذہب' علم و ادب اور فنون لطیفہ کی صحیح معنوں میں تاریخ لکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کے سیاسی واقعات و انقلابات کی تاریخ مکمل کر لی جائے۔ وہ ناظرین جن کو ایسی تاریخ خشک یا بعض مرتبہ نفرت انگیز معلوم ہوتی ہو' ان کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے وجود سے وقت دسنہ کے لحاظ سے مزید دلچسپ کتابوں کو لکھا جانا ممکن ہوگا۔

حوالہ جات

۱؎ "دی تاملز1800ایئرس ایگو" صفحہ 10،17۔

۲؎ ایلیٹ: "کائنز آف سدرن انڈیا" صفحہ 108۔

۳؎ دریائے چندرگری کریل اور تلو کے درمیان حد فاصل تھی۔

۴؎ ٹولمی: باب 7 فصل 1 صفحہ 85، مترجمہ میک کرنڈل، انڈین انٹی کویری جلد 13 صفحہ 367۔ ہیوئنگیرین فہرستوں میں اس کا نام دمریکے بالک لدرست لکھا ہے۔(انڈین انٹی کویری جلد 8 صفحہ 144)۔

۵؎ "دی تاملز1800ایئرس ایگو" صفحہ 3،10،39۔

۶؎ پوپ "اکسٹر کٹس فرام دی تامل پرپورل دنبا مالیا اینڈ دی ٹرنا ٹور۔" (جے۔آر۔اے۔ ایس 1899ء صفحہ 242) پوپ کا خیال جنوبی ہند کی نظموں کی قدامت کے متعلق اتنا دور تک نہ پہنچتا تھا جتنا کہ جنوبی ہند کے علماء کا۔ لیکن بہرحال بعد کی تحقیقات سے قدیم تامل نظموں کا بہت قدیم ہونا مسلم الثبوت ہو گیا ہے۔

۷؎ جین مت کی تاریخی روایات اور اختلاف کے لیے دیکھو جیکوبی۔ ایس۔بی۔ای۔ جلد 22 اور اس کے علاوہ بے شمار مضامین جو انڈین انٹی کویری جلد 2،9،11،13،17،20،21 میں بارنل اور دوسرے علماء کے لکھے ہوئے ملیں گے۔ دیکھو رائس کی کتاب "میسور اینڈ کرگ فرام دی انسکرپشنز۔"

۸؎ یہ بیان مالا بار یا کریل کے متعلق صحیح نہیں ہے (دبو آکی ہندو مینرس۔ "کسٹمز اینڈ سیریمنیز" طبع سوم صفحہ 56)۔

۹؎ دی تاملز1800ایئرس ایگو صفحہ 108،114۔

۱۰؎ گبن باب 31۔

۱۱؎ پٹے کی تجارت کے متعلق حوالے حسب ذیل ہیں:۔۔۔ٹولمی، جغرافیہ باب 7 فصل 1 صفحہ 86، مترجمہ انڈین انٹی کویری جلد 13، صفحہ 367۔ پلائنی، ہسٹری نیچرل باب 37 فصل 5۔ ولہاؤس:

"اکو میرنیا جمز- این شنٹ اینڈ ماڈرن" (انڈین انٹی کوری جلد 5 صفحہ 237 اسی میں پدیور کی کان کا مفصل حال بھی ملے گا)- وانم باڑی کی کان کا بیان مسٹر- آر سیول کی سند پر کیا گیا ہے (ج- آر- اے- ایس 1904ء صفحہ 595)- ٹولمی نے پنات کو بالکل صحیح طور پر پونات لکھا ہے- یہ ایک مختصری قدیم ریاست تھی جس کا ذکر پانچویں یا چھٹی صدی کے ایک کتبے میں بھی آتا ہے، اور 931ء کی کتاب ہرہنکتھاکوس مصنفہ ہریشین میں بھی اس کا نام پایا جاتا ہے- کتور دریائے کبنی کے کنارے کا ایک گاؤں ہے اور میسور کے جنوب مغرب میں واقع ہے- (دیکھو رائس "میسور اینڈ کرگ فرام انسکرپشنز" (1909ء) صفحہ 4، 10 اور انڈین انٹی کوری جلد 13،12 و جلد 18 صفحہ 366)- فیروزے کی کانوں کے متعلق تفصیلات کے لیے دیکھو بلفور کی انسائیکلوپیڈیا-

۲؎ سیول "رومن کائنز فاؤنڈ ان انڈیا" (ج- آر- اے- ایس 1904ء صفحہ 591- 637 اور بالخصوص صفحہ 613- 609)

۳؎ مسٹر ایس کے، آئینگر کے خیال کے مطابق یہ تباہی تیسری صدی عیسوی میں واقع ہوئی-

۴؎ "دی تاملز 1800 ایرس ایگو-" صفحات 16،25،31،36،38- پُہار کو پکار بھی لکھا جاتا ہے- "پیوٹن گیرین ٹیبلز" سے جو تقریباً 226ء کے قدیم نقشوں کا ایک مجموعہ ہے- اس بات کی سند ملتی ہے کہ آگسٹس کے نام کا ایک مندر مزرس کے مقام پر موجود تھا- چونکہ نقشے پر ایک عمارت کا خاکہ ہے اور اس پر "آگسٹس کا مندر" لکھا ہوا ہے اور یہ خاکہ مزرس کے پاس ہی واقع ہے- مزرس کا کرینگنور ہونا ثبوت مسلم ہو چکا ہے- کانسی کے برتنوں کے لیے دیکھو وہ مجموعہ جو برٹش میوزیم میں موجود ہے اور اس پر نام کے پرچے لگے ہوئے ہیں- انڈین انٹی کوری 1905ء صفحہ 229 بریکس "این اکاؤنٹ آف دی پریٹو ٹرابس اینڈ مانیومنٹس آف دی نیلگریز" لندن 1873ء- فٹ کی کتاب کٹیلاگ پری ہسٹارک انٹی کوٹیز مدراس میوزیم 1901ء لوح 10 اور 13- پری پلس (باب 56) میں لکھا ہے کہ "ان بندرگاہوں میں آنے والے جہاز بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں کیونکہ مرچوں اور لونگوں کے پتوں کا حجم اور مقدار زیادہ ہوتی ہے-" اس کے بعد درآمد کی تمام چیزوں کی مکمل فہرست درج ہے- 215ء میں جب کرکلانے سکندریہ میں قتل عام کرایا تو اس وقت اس بندرگاہ کی ہندوستان کے ساتھ براہ راست تجارت بہت کم ہو گئی تھی (ج- آر- اے- ایس 1907ء صفحہ 954)

۵؎ گوور کا خیال تھا کہ "کورل" کا مشہور و معروف مصنف ترولوا غالباً تیسری صدی عیسوی کے قریب گذرا ہے- "(دی فوک سانگس آف سدرن انڈیا 1872ء صفحہ 217) مسٹر گوور جس طرح ہندوؤں کے دل و دماغ کی تہہ تک پہنچا تھا اس طرح اور کوئی یوروپین مصنف اب تک نہیں پہنچ سکا- کوئی جنوبی ہند کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شائق ہو تو اس کو چاہیے کہ اگر

ممکن ہو تو اس کتاب کو ضرور پڑھ لے ۔ مگر یہ کتاب اب بہت نادر الوجود ہو گئی ہے ۔

۱۶ پر نور ۔ نمبر 35 ' تامل انٹی کویری جلد 1 نمبر 6 صفحہ 50 ۔

۱۷ کریل کنٹری زبان میں تامل لفظ چیرل کی صورت میں ہے ۔ قدیم زمانے میں یہ ملک چیرلم یا چیرل نادا اور اس کے بادشاہ چیرل آندن یا چیرل ارم پورئی کہلاتے تھے ۔ چیرل کے لفظی معنی سلسلہ کوہستان ہیں اور اس طرح یہ لفظ مالابار کا مترادف ہے (پنڈت ڈی سیویا رر ائن ' تاملین انٹی کویری نمبر 1 صفحہ 71 ۔ 69)

۱۸ ایلیٹ :--- "کائنز آف سدرن انڈیا" صفحہ 39 ۔

۱۹ مسٹر ایس کے ۔ آئینگر کے مجموعہ مضامین موسومہ "این شنٹ انڈیا" (لوزک 1911ء) اگرچہ قابل قدر ہیں اور آئندہ صفحات میں ان سے بہت کچھ استفادہ کیا گیا ہے ' مگر کتاب مطلوبہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے ۔

۲۰ جنوبی ہند کے پُران شمالی پرانوں سے بالکل جدا ہیں ۔

۲۱ پلائنی ' باب 6 فصل 23 (26) ۔ اس نے ساحل مالابار کے بندرگاہ بکرے کی نسبت (جس کو ٹولمی (باب 7 فصل 1 ۔ 8) نے بکرئی یا برکرے لکھا ہے) تحریر کیا ہے کہ وہ کوئیتم قیام گاہ ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ "وہاں پنڈیاں بر سر حکومت تھا اور بندرگاہ سے دور ایک شہر میں جس کا نام مودرا تھا سکونت پذیر تھا ۔ " اس کی تصنیف کے وقت وہاں کے راجا کا نام لیکو بتھراس (کریل پترا) تھا جو ساحل مالابار پر حکومت کرتا تھا ۔ کتاب پر یپلس (باب 54 فصل 55) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مزرس کو کریل پتر کی سلطنت میں شامل تھا اور جنوب میں بکرے سلطنت پانڈیا کا جزو تھا ' اس لیے اس میں یقیناً موجودہ ریاست ٹراونکور کے جنوبی اضلاع شامل ہوں گے ۔ اس علاقے کو وین یا دینا کہا جاتا تھا ۔ بکرے اور دوسرے شہروں کے موقع و محل کے لیے دیکھو "دی تالمز 1800 ایرس ایگو" صفحہ 20 ۔ 17 ۔ پلائنی کی کتاب 77ء میں شائع ہوئی تھی اور اس انتساب سے معلوم ہوتا ہے جو بادشاہ ٹیٹس کی تخت نشینی سے قبل اس کتاب کا کیا گیا ۔ پر ی پلس 80ء اور ٹولمی 140ء میں شائع ہوئیں ۔ منلور کے لیے دیکھو انڈین انٹی کویری 1913ء صفحہ 66 ۔ 72 ۔ شمالی منلور کے متعلق جس کا موقعہ اب تک معلوم نہیں ہوا ' فرض کیا جاتا ہے کہ وہ سلطنت چول کا سب سے قدیم مستقر تھا ۔

۲۲ ٹڈلی کاٹ :--- "انڈیا اینڈ دی اپاسٹل ٹامس" صفحہ 85 ۔ 87 ۔ مارکوپولو پہلی مرتبہ غالباً 1288ء میں اور دوسری مرتبہ 1293ء میں یہاں آیا تھا ۔

۲۳ بشپ کلڈ ول :--- انڈین انٹی کویری جلد 6 صفحہ 83 ۔ 80 ' 279 ۔

۲۴ لوین تھل :--- "دی کائنز آف تناولی" (مدراس 1888ء) صفحہ 9 ۔

۲۵ [illegible] "ارلی ہسٹری آف [illegible]" طبع دوم ' بمبئی گزیٹیر (96)

اول صفحہ 139- میں پروفیسر بھنڈارکر اور گولڈ سٹکر کی رائے متعلقہ پلائنی اور کاتیاین کی قدامت کے بالکل متفق ہوں کیونکہ پتنجلی (150ق م) کی تاریخ کے تعین سے ان کے سنین بھی دریافت ہو جاتے ہیں۔

لاھ میگاستھینز:--- فریگمنٹ 1-16 بی 58- شوبنبک کا متن اور میک کرنڈل کا ترجمہ- آریان کی کتاب انڈیکا باب 8- ممکن ہے کہ یہ حکایت مالابار کے قانون وراثت کی وجہ سے جہاں ورثہ ماؤں کی طرف سے ملتا تھا رفتہ رفتہ گھڑلی گئی ہو- مسٹر ایف' فاسٹ نے مجھے بتلایا ہے کہ جزائر لکادیو میں جب مرد سمندر کو چلے جاتے ہیں تو عورتیں ہی وہاں کا انتظام کرتی ہیں-

ےلھ سٹریبو: باب 15 فصل 4-73- میریویل: ہسٹری آف دی رومنز انڈر دی امپائر- جلد 6 صفحہ 118' 175-

ٹلھ جے- آر- اے- ایس- اکتوبر 1907ء صفحہ 954-

ولھ "دی تاملز 1800 ایئرس ایگو" صفحہ 88,81,80- مسٹر گوورنے لکھا ہے کہ ترودلوا تیسری صدی میں گذرا ہے- (نوک سانگس آف سدرن انڈیا' صفحہ 217)- دیکھو "این شنٹ انڈیا" مصنفہ ایس- کے- آئینگر باب 14- "دی آگسٹن ایج آف تامل لٹریچر-" ڈاکٹر جے- لزارس نے "کرل" کے متعلق کچھ لکھا ہے (تامیلین انٹی کویری جلد 2 (1913ء صفحہ 72-53)- اس کے علاوہ اس کی پہلی جلد میں اور بھی مفید مطلب مضامین ہیں-

نلھ بیل: جلد دوم صفحہ 230-228- ویٹرس: 233-228' جلد دوم' دیکھو اس کے متعلق ہلٹش کے خیالات (انڈین انٹی کویری جلد 18 صفحہ 242)- اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ ساتویں صدی عیسوی سے پہلے کے بدھ اور ہندو مندروں کا کیا حشر ہوا-

لاھ "پروگرس رپورٹ اپی گریفی" 7-1906ء- مدراس- جی- او پبلک نمبر 503 جون 1907ء صفحہ 70-62- اس رپورٹ میں جو متوفی رائے بہادر دی نکیا اور گل نے لکھی تھی' قدیم شاہان پانڈیا کے متعلق تمام معلومہ حالات کا ملخص موجود ہے اور اس میں مسٹر ٹی- اے- گوپی ناتھ راؤ نے "ٹراونکور آرکی آلوجیکل سیریز" بالخصوص نمبر 7 (1911ء) میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے-

لاھ "پروگرس رپورٹ- اپی گریفی 6-1905ء- "مدراس جی- او- پبلک نمبر 492' 2 جولائی 1906ء- فقرہ 10' 16-

لاھ ترجنا سمبندر اور کون پنڈیا کے سنین کا تعین 5-1894ء میں ہلٹش نے کر دیا تھا (اپی گریفیا انڈیکا جلد 3 صفحہ 277)- اس کے علاوہ دیکھو تامیلین انٹی کویری جلد 1' (1909ء) نمبر 3 صفحہ 65- اس تاریخ کا تعین جنوبی ہند کی قدیم سیاسی اور علمی تاریخ کے لیے نہایت ہی اہم ہے-

اس مذہبی ایذاء دہی کا ذکر 62 ویں اور 63 ویں "ترو ئیادل" (ولسن' کینزی

مینو سکرپٹ طبع دوم' کلکتہ 1828ء صفحہ 41) میں ہے اور اس کا اعادہ روڈرگز نے بھی کیا ہے۔ (دی ہندو پتھیان' مدراس صفحہ 5-841) اس میں لوح کے ذریعے سے ان بے گناہوں کے عقوبتوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ اس کے علاوہ دیکھو:--- گربل ("کلکتہ ریویو" 1875ء صفحہ 70) اور ایلیٹ (کائنز آف سدرن انڈیا (1885ء) صفحہ 126)۔ تمام جنوبی بادشاہوں کے بہت سے نام اور القاب ہوتے تھے اور اسی وجہ سے اس میں بہت خلط واقع ہو جاتا ہے۔ سنگتراشی کے لیے دیکھو سیول کی "لسٹس" جلد اول صفحہ 167۔

ہے۔ اس واقعے کی تمام تفاصیل اس مضمون میں ملیں گی جو مدراس جی۔ او۔ پبلک نمبر 922' 923 مورخہ 19 اگست صفحہ 14-8 کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیکھو ہلٹش:--- "کنٹریبو شنز ٹو سنگھالیز کرانالوجی" (جے۔ آر۔ اے۔ ایس 1913ء صفحہ 31-517)۔

ھے۔ "سپلیمنٹ ٹو دی لسٹ آف انسکرپشنز آف سدرن انڈیا۔" اپی گریفیا انڈیکا جلد 8 ضمیمہ 2 صفحہ 24۔

لاہے۔ انڈین انٹی کویری 1911ء صفحہ 137' 138۔

ے۔ بلائنی اور پری پلس نے جنوبی صوبے کو سلطنت پانڈیا کا حصہ بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہان پانڈیا مغربی ساحل کے چند بندرگاہوں پر قبضہ کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات ان کو اپنے زیر تصرف کر بھی لیتے تھے۔

ٹہ۔ "دی تامل 1800 ایئرس ایگو" صفحہ 15۔ "انڈین انٹی کویری" جلد 18 صفحہ 259' جلد 31 صفحہ 343۔ اپی گریفیا انڈیکا جلد 4 صفحہ 294۔ "ساؤتھ انڈین انسکرپشنز" جلد 3 حصہ اول صفحہ 30۔ قدیم شاہان چیر میں سے چند کے نام معلوم کیے گئے ہیں' مثلاً تھانو راوی جو پرانتک اول کے باپ آدت چول کا ہمعصر اور دوست تھا (اپی گریفی صفحہ 61-8' مدراس جی او پبلک نمبر 919 مورخہ 29 جولائی 1912ء)۔

فہ۔ "سم ارلی ساورنز آف ٹراونکور۔" (انڈین انٹی کویری جلد 24 (1895ء) صفحہ 249' 277' 305' 333 ایضاً جلد 26 صفحہ 109) "مسلینس ٹراونکور انسکرپشنز" ایضاً جلد 26 صفحہ 113' 141۔ اس کے بعد کی تمام نئی تحقیقات کے نتائج مسٹروی ٹم ایا کی "ٹراونکور سٹیٹ مینوئل" (تین جلد۔ تروندرم 1906ء) اور "ٹراونکور آرکیالوجیکل سیریز" (از 1910ء) میں ملیں گے۔

نلہ۔ مفصل: ہٹس ٹو کائن کلکٹرس ان سدرن انڈیا۔ "(مدراس 1889ء) صفحہ 17۔

الہ۔ اپی گریفیا انڈیکا جلد 7 ضمیمہ 1 نمبر 66-939۔ ان کتبات میں بالعموم کلم یا ملابار کا سنہ جو 824-5ء سے شروع ہوتا ہے مستعمل ہے۔ اور وہ تمام باتیں ان کتابوں میں ملیں گی جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ مگر یہ تفصیلات کچھ زیادہ دلچسپ نہیں۔

۴۲ے کائنز آف سدرن انڈیا" صفحہ 108- چول کو چور' شول یا شور بھی لکھا جاتا ہے- کارومنڈل "چول منڈلم" کی ہی بگڑی ہوئی صورت ہے- (یول اور برنک لی اینگلو انڈین گلاسری' مضمون کارومنڈل) چول کے لفظ کا اطلاق قوم اور شاہی خاندان دونوں پر ہو سکتا ہے- مگر چول قوم کے متعلق کچھ معلوم نہیں' یہ لوگ موجودہ آبادی میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہ گیا-

۴۳ے انڈین انٹی کویری 1913ء صفحہ 70' 72-

۴۴ے "دی تاملز 1800 ایئرس ایگو-" صفحہ 25' 26' 38-

۴۵ے "دی تاملز 1800 ایئرس ایگو-" صفحہ 78- 64- ایس کرشنا سوامی آئینگر کا مضمون "سم پوائنٹس ان تامل لٹریری ہسٹری" (مالابار کوارٹرلی ریویو 1904ء)- مسٹر کنکسبھائی کی کتاب میں سنین کو بہت قدیم قرار دیا گیا ہے- مسٹر ایس- کے- آئینگر کی کتاب "این شنٹ انڈیا" (1911ء) کا باب 6 سلطنت چول کی بہترین تاریخ ہے- مسٹر کے- وی- ایس- ایر نے اپنے مضمون "کرکال اینڈ ہز ٹائمز" (انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 146) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ چھٹی صدی عیسوی کے نصف اول میں گذرا ہے' مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے- میرے نزدیک یہ خیال شروع ہی سے بالکل غلط اصول پر مبنی ہے اور اس سے تامل علم وادب کے تمام سنین غلط ہو جاتے ہیں-

۴۶ے ئیل: جلد دوم صفحہ 227' 230- ویٹرس: جلد دوم صفحہ 224-

۴۷ے "رپورٹ آن اپی گریفی" مدارس جی او پبلک نمبر 518' مورخہ 18 جولائی 1905ء صفحہ 48- اور نمبر 503 مورخہ 27 جون 1907ء فقرہ 43- 1800ء میں ریاست کڈپہ کی حالت کے متعلق دیکھو' ہملٹن کی کتاب "ڈسکرپشن آف ہندوستان" 1820ء جلد 2 صفحہ 323-

۴۸ے ایس کرشنا سوامی آئینگر:--- دی چول ایڈ منسٹریشن 1300- 900ء (مدراس ریویو 1903ء) اور "این شنٹ انڈیا" صفحہ 91' 158- وی ونکیا:--- "اری گیشن ان سدرن انڈیا ان این شنٹ ٹائمز" (آرکیالوجیکل سروے اینول رپورٹ 4- 1903ء صفحہ 11- 203)-

۴۹ے انڈین انٹی کویری جلد 7 صفحہ 224 مع لوح- مدراس- جی- او- پبلک نمبر 23- 22 مورخہ 19 اگست 1899ء-

۵۰ے دی کنکسبھائی- دی کانکوسٹ آف بنگال اینڈ برما بائی دی تاملز" (مدراس ریویو 1902ء صفحہ 251) کدارم کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پروم سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھرے کھیتر کا مقام ہے (انڈین انٹی کویری جلد 22 صفحہ 6- 160)- تکولم = (ٹولمی کے) تکول (باب 7 فصل 6- 5 انڈین کویری جلد 13 صفحہ 373) یہ اب اتھیما کہلاتا ہے (ایضاً جلد 21 صفحہ 383) اور موجودہ ساحل سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے-

۵۱ آرکیالوجیکل سروے آف برما پروگرس رپورٹ 7-1906ء صفحہ 19-

۵۲ "ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون" شکل 161-159- اس عمارت کی تفصیلی پیائش اور حال مع تصاویر نہایت ہی دلچسپ ثابت ہو گا-

۵۳ "رپورٹ آن اپی گریفی" مدراس جی-او- پبلک نمبر503' مورخہ 27 جون 1907ء فقرہ 25-

۵۴ ولی عہد سلطنت یا یُوراجا کو شریک حکومت بنانے کے چول خاندان کے دستور سے سنین جلوس اکثر مبہم ہو جاتے ہیں- مگر تاریخوں کا تعین مکمل طور پر پروفیسر کیلہارن نے کر دیا ہے- (اپی گریفیا انڈیکا جلد 8 ضمیمہ 2 صفحہ 26)- کتبوں کے متعلق تمام تفاصیل کا پتہ مضمون مذکورہ بالا سے لگ سکتا ہے- بعد کی تمام دریافتوں کا پتہ "رپورٹس آن اپی گریفی" مدراس جی-او- نمبر492 مورخہ 20 جولائی 1906ء اور نمبر503 مورخہ 26 جون 1907ء اور بعد کے نمبروں سے لگ سکتا ہے-

۵۵ ادھراجندر' کلوتنگ اور رامانج کے حالات لکھنے میں میں نے بھٹ ناتھ سوامن کے مضمون "دی چولاز اینڈ چلکیاز ان دی الیونتھ سنچری" (انڈین انٹی کویری 1912ء صفحہ 27-217) سے استفادہ کیا ہے- ان کا یہ مضمون تمام تر ایک منظوم تاریخ "دیویا سورچرت" سے ماخوذ ہے اور ان کا ارادہ ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ جلد بعد تصحیح شائع کر دیں- متن کتاب 1885ء میں میسور میں شائع ہوا تھا- کلوتنگ کے لقب کے معنی "خاندان کا بزرگ ترین فرد" ہیں-

۵۶ بکرم چول کے کارناموں کا بیان تامل زبان کی ایک نظم "بکرم چول اُلا" میں پایا جاتا ہے (انڈین انٹی کویری جلد 22 صفحہ 142)-

۵۷ مدرا کے مسلمان سلاطین کے سکے 30-1329ء سے 8-1377ء تک پائے جاتے ہیں- (ہلٹس-جے-آر-اے-ایس 1909ء صفحہ 682)-

۵۸ مسٹرری کا خیال ہے کہ یہ نام تامل زبان سے مشتق ہے- پل بمعنی "دودھ" مذکر "اون" (واحد) اور "آور" (جمع)- اس طرح پلو کی وہی ذات ہے جو شمالی ہند میں گوالوں اور اہیروں کی ہے-

۵۹ "کاسٹنز آف سدرن انڈیا" صفحہ 44'40- کلر (یا چوروں) کی ذات جو اس پیشہ کو آبائی سمجھتی تھی' صرف سرزمین مرد (ساحل کے پاس کا علاقہ) یا ان اضلاع میں پائی جاتی ہے جہاں مچھلیاں بکثرت دستیاب ہوتی ہیں- ملک کے حکمراں بھی [illegible] ذات کے تھے- یہ لوگ چوری کے پیشے کو اپنے یا اپنے ساتھیوں کے لیے باعث ننگ و عار نہیں سمجھتے کیونکہ وہ چوری کو محض اپنا ذریعہ معاش اور موروثی پیشہ تصور کرتے ہیں- نہ ان کو اپنی ذات یا پیشے سے شرم آتی ہے- اگر

ذات مدراس کے علاقے میں (جہاں یہ بکثرت پائے جاتے ہیں) شودروں میں سب سے زیادہ معزز مانی جاتی ہے۔ (دبو آ:--- ہندو مینرس 'کسٹمز اینڈ سیریمینز' طبع سوم صفحہ 17)۔

۶۰ کڈون (یعنی جنگل کا باشندہ) تامل زبان میں پلو کا مترادف ہے (انڈین انٹی کویری صفحہ 43 جلد 22)۔ اگر پلو واقعی غیر ممالک اور ایرانی نسل کے تھے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کڈون کے جائیں اور کلر اور مرور ذاتوں سے ان کا تعلق بھی ہو۔

۶۱ یہ تاریخ (سک سنہ 359) اس سنہ کی سب سے قدیم تاریخ ہے اور اس کو جین مت کی ایک کتاب کے خاتمہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ (آرکیالوجیکل سروے آف میسور۔ رپورٹ 9-1908ء صفحہ 31۔ 10-1909ء فقرہ 115) قدیم پلو راجاؤں کے متعلق دیکھو:---ایلیٹ:---"کائنز آف سدرن انڈیا۔" صفحہ 39 اور کیلہارن (ایپی گریفیا انڈیکا جلد 8 ضمیمہ 2 صفحہ 19)

۶۲ تفصیلات پروفیسر کیلہارن نے دی ہیں (کتاب مذکورہ بالا صفحہ 20) ذیل کا تمام بیان (ان مقامات کے سوا جہاں خصوصاً تصریح کردی گئی ہو) تین کتابوں پر مبنی ہے۔ یعنی (1) ونکیا "دی پلو" (آرکیالوجیکل سروے انڈیا اینوئل رپورٹ 7-1906ء صفحہ 43-217) (2) ہلش کا "دی پلو انسکرپشنز آف دی سیون پیگوڈاز" (ایپی گریفیا انڈیکا جلد 10 (جولائی 1909ء صفحہ 14-1) ری:---"پلو آرکی ٹکچر" مع 1909ء 124 لوحوں کے۔ یہ کتاب "آرکیالوجیکل سروے" کی 34 ویں جلد ہے۔ مسٹر ونکیا کی قبل از وقت وفات سے دنیا کو سخت نقصان پہنچا ہے۔

۶۳ "رپورٹ آن ایپی گریفی" مدراس جی۔ او۔ پبلک نمبر 518 مورخہ 18 جولائی 1905ء صفحہ 47۔ "آرکیالوجیکل سروے اینوئل رپورٹ" 4-1903ء صفحہ 203-1882ء میں جب مسٹر سیول نے اپنی کتاب "لسٹس آف انٹی کوٹیز (مدراس۔ جلد اول صفحہ 162) میں مہندر وادی پر نوٹ لکھا ہے تو اس وقت یہ علم نہ تھا کہ اس شہر کی بناء پلو خاندان نے رکھی ہے۔

۶۴ مہاومس: حصہ دوم 'باب 47۔

۶۵ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان خانقاہوں کے کھنڈر کہاں ہیں؟ ایک زبردست عمارت "جہاں ملک کے تمام مشاہیر جمع ہوا کرتے تھے" کانچی کے جنوب میں واقع تھی اور راشوک کا بنایا ہوا سو فٹ بلند ایک ستوپ اس کے قریب ہی تھا۔

۶۶ ریکارڈس: جلد 2 صفحہ 30-228۔ لائف: صفحہ 40-138۔ ویٹرس: جلد 2 صفحہ 6-226۔ آئی سنگ:---ریکارڈس آف دی بڈھسٹ ریلیجن۔ مترجمہ تککسو۔ مقدمہ 57-58۔ متن کتاب صفحہ 179، 181۔

۶۷ اس شہر کا نام مختلف طور پر لکھا جاتا ہے مثلاً مادلی ورم 'مہابلی پور' مہاولی پور وغیرہ۔ مگر متن

کتاب میں صحیح نام درج کیا گیا ہے ۔ "بلی" یا "ولی" کا لفظ غلطی پر مبنی ہے ۔۔

۵۵ "رپورٹ آن اپی گریفی ۔ "مدراس جی ۔ او ۔ پبلک نمبر 492' مورخہ 2 جولائی 1906ء فقرہ 4 ۔ 2 ۔۔

۵۶ "رپورٹ آن اپی گریفی ۔ "مدراس جی ۔ او ۔ پبلک ۔ نمبر 492' مورخہ 2 جولائی 1906ء ۔ فقرہ 6 ۔ 5 اور نمبر 502' مورخہ 27 جون 1907ء فقرہ 8' 24 ۔ 19 ۔

۵۷ من موہن چکرورتی :۔۔۔ کرانالوجی آف دی ایسٹرن گنگا کنگس آف اڑیسہ (یہ ایک نہایت ہی اچھا مضمون ہے)۔ ۔ جے ۔ اے ۔ ایس ۔ بی جلد 72 حصہ 1 (1903ء) ۔۔ مکھلنگم کے لیے جو پر لکمیدی سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ دیکھو اپی گرفیا انڈیکا جلد 4 صفحہ 93 ۔ 183 ۔ اور مدراس جی ۔ او ۔ پبلک نمبر 829 ۔ 827 مورخہ 25 اگست 1902ء ۔ مغربی گنگ خاندان کی تاریخ پر ڈاکٹر فلیٹ نے "کنریز ڈائناسٹیز" میں بحث کی ہے ۔

۵۸ انڈین انٹی کویری جلد 22 صفحہ 143 ۔

۵۹ پلو کے کتبات کے مضامین ایک ملخص فلیٹ "بمبئی گزیٹیر" (1896ء) جلد 1 حصہ 2' ڈائناسٹیز آف دی کنریز ڈسٹرکٹس" طبع دوم میں جمع کر دیا ہے ۔ یہ کتبے وہ ہیں جو 1896ء تک دریافت ہوئے تھے ۔ اس کے بعد کی تمام دریافتوں پر "ساؤتھ انڈین انسکرپشنز" (انیول پروگرس رپورٹس آف دی آرکیالوجیکل سروے) کیلارن کی "لسٹ" اور "سپلیمنٹ" (اپی گرفیا انڈیکا جلد 7' 8 ضمیمہ) اور دوسری کتب مذکورہ میں بحث کی گئی ہے ۔

۶۰ امراوتی کا کتبہ نمبر 39 (ساؤتھ انڈین انسکرپشنز جلد اول صفحہ 25)۔ اس کتبے کو نیچے سے اوپر کی طرف پڑھنا چاہیے ۔ میں نے راجا نرسمہو رمن اور اس بادشاہ کے ایک ہی ہونے کو فرض کر لیا ہے جو 437ء (سک 359) میں تخت پر بیٹھا تھا ۔ ممکن ہے کہ یہ کتبہ کسی قدیم تر کتبے کی نقل ہو ۔ (دیکھیا: کتاب مذکورہ بالا صفحہ 240 حاشیہ 9) ۔

۶۱ مثلاً ہستی ورمن (اتورما)' وجے سکند ورمن' وشنو گوپا ورمن ۔

۶۲ دیکھیا: کتاب مذکورہ بالا' صفحہ 235 مع حواشی ۔

۶۳ ایضاً صفحہ 229' حاشیہ 11 ۔

علی پلازہ، 3 مزنگ روڈ، لاہور، فون نمبر: 7238014
E-Mail: takhleeqat@yahoo.com